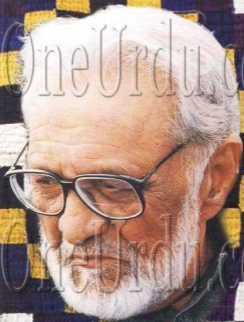


# راہِ رواں



بانو قدسیہ



راہِ رواں

# راہِ رواں

---

بانوقدسیہ

نگ مہل پبلی کیشنز، لاہور

923.5 Bano Qudsia  
Raah-e-Rawaan / Bano Qudsia.-  
Lahore : Sang-e-Meel Publications,  
2011.  
636 + 55pp. : with pictures.  
1. Urdu Literature - Biography.  
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز / مصنف سے باقاعدہ  
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اگر اس قسم کی  
کوئی بھی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2011

نیاز احمد نے  
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور  
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2315-6

ISBN-13: 978-969-35-2315-7

**Sang-e-Meel Publications**

25 Shahjahan-Pakistan (Lahore/Mail) Lahore-54000 PAKISTAN  
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101  
<http://www.sang-e-meel.com> e-mail: [smpp@sang-e-meel.com](mailto:smpp@sang-e-meel.com)

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

اینق۔ انیس۔ اشیر احمد کے نام

## گھر سے گھر تک

(آغازِ کتاب)

آج کل کے بچے جب سو پزل کا مشغلہ بڑی دلچسپی، انہماک، جوش و خروش اور خوش اوقاتی سے اپناتے ہیں۔ اُن کے سامنے کسی تصویر کا ماسٹر پلان موجود ہوتا ہے۔ پھر اس منظر کو دیکھ دیکھ کر وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو اس سلیٹے سے جوڑتے جاتے ہیں کہ ہو بہو عین مین ٹکڑیوں کا منظر ماسٹر پلان کا منظر بن جاتا ہے اور وہ اس طرح کی کامیابی پر اپنے آپ کو یہ نام حل کرنے والی کسی بڑی شخصیت جیسا اہم محسوس کرنے لگتے ہیں۔

لیکن جب بھی کوئی سوانح نگار بائیوگرافی لکھتا ہے یا کسی شخص کی زندگی کی جگہ سو پزل تیار کرتا ہے تو اُسے بہت سی ٹکڑیاں غائب ملتی ہیں۔ پورا ڈیٹا نہ ہونے کے باعث نہ کوئی تیار شدہ ماسٹر پلان ہوتا ہے نہ کوئی روڈ میپ ہی جس پر چل کر ہم اُس کی بااد نگاری کر سکیں۔ تاریخ اور سوانح نگاری کے لیے عموماً ڈائریاں تلاش کی جاتی ہیں۔

لوگوں کے انٹرویو صاحب ذکر کی کتابیں، موصوف کے خاندان کے لوگوں سے ”سی آئی اے“ قسم کی چھان بین ملازموں کی جانچ پڑتال کا مآثر آتی ہیں، لیکن بائیوگرافی پھر بھی نامکمل، حواشی کی محتاج اور صورت گری کے دھندلے پن میں متج ہوئی ہے۔ پورا انسان اپنی قلبی، روحانی، نفسیاتی، ذہنی زندگی کو اپنے ساتھ ہی لے کر رخصت ہو جاتا ہے... اُس کی کھیل کا راز اب صرف روز قیامت ہی کھل سکتا ہے۔

میں نے بھی ایک معمولی سی کوشش خاں صاحب کو آپ سے روشناس کرانے کی خاطر کی ہے۔ ساتھ رہتے ہوئے بھی خاں صاحب ہر انسان کی طرح میرے لیے مانوس اجنبی تھے۔ میں انہیں کالج میں ملی۔ پھر ہم نے گھر بسایا۔ کرائے کے مکان بدلے اور آخری مرحلے میں اپنا گھر 121- سی ماڈل ٹاؤن میں بنا لیا۔ جہاں سے وہ اپنے اصلی گھر کو روانہ ہو گئے۔ یہ گھر اُن کی رخصتی کے بعد گھر نہ رہا، شہرت مابعد کا خزینہ بن گیا۔

میں بھی اپنے طور پر اُن کی مہربانیوں، شفقت اور شاگردی کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں لیکن میں تحقیقی مجتہد میں میخ نکالنے والی نہیں ہوں۔ میں عموماً سنی سنائی پر ایمان لے آتی ہوں۔ میں سرہنگ زادوں کی طرح حکم مان کر اُٹھ نکلتی ہوں،

لیکن کسی جہادی کی طرح ایمان کی قوت میرے ہمراہ نہیں ہوتی بلکہ صرف کرگزر نے کا جذبہ ساتھ رہتا ہے۔ ایسی مہم پر ماسٹر پلان کے بغیر نکلنا عموماً فیروز مندری کا موجب نہیں ہوتا۔

پھر بھی ”ہر کسے را بہ ہمت اوست“ کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے قلم اٹھایا ہے۔ منظر کشی کے لیے میرے پاس خاں صاحب تک ترسیل کے کئی ذرائع تھے۔

ایک ذریعہ گھر تھا جہاں ہم دونوں نے بسیرا کیا۔ اسے خاں صاحب نے ہمیشہ کبوتر کی کا بک سمجھا کہ اڑتے اور ہراڑان کے بعد اپنی اپنی کا بک ہی راس آتی۔ دوسرے میرے پاس حسن اتفاق سے دو یا دو اشیاں جو ساتھ رہنے کے باعث میسر آئیں موجود ہیں۔

ان کے اندر کے موسم کے ساتھ ساتھ بیرونی اطراعات بھی تھیں۔ شہروں کی نقشہ نویسی اپنی تفسیر و حرکت کا ہم کی وابستگی ذمہ داری کی تفصیلات بھی میسر آتی رہتی تھیں۔ میں نے پورا سال یہ سوچنے میں بسر کیا کہ یہ مجھے خاں صاحب کو بے نقاب کرنے کا حق ہے؟ کیا خاں صاحب اس بے تکلفی اور نقاب کشائی پر برا فروختہ نہ ہوں گے؟ کیا ان کو آپ کے سپرد کرنے کی اس وجہ خود ستائی تو نہیں؟ کیا میں اس غلطی کی مرتکب تو نہیں کہ یہ قدم میں نے اپنی شخصیت کا تاج محل بنانے کی خاطر اٹھایا ہے؟

سال بھر سوچنے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے اس بات پر اپنے آپ کو راضی کیا ہے کہ آپ کے ساتھ اپنے ہم سفر کو کسی بات کی ایک تینچ پر بیٹھ کر یہ دکراؤں۔ اوپر سے خزان دیدہ پتے درخت سے گرین ہوا میں نومبر کے مہینے کی خشکی ہو..... ذور ان میں میرے بچوں کا بچپن آپ کو نظر آئے آخری فوارے کے کنارے بیٹھے آپ کو خاں صاحب کے دوستوں کا جھرمٹ دکھائی دے..... ہولے ہولے شام کی سرخی غائب ہو جانے پر ندے گھروں کو لوٹ جائیں اور اندھیرے میں کسی گوشے سے خاں صاحب آگے بڑھیں اور مجھے میری غلطیوں سمیت اپنے گھر اپنی کا بک میں واپس لے جائیں۔

یہاں ایک اندیشہ اور بھی اجرتا ہے جو مجھے ان یادداشتوں کو پیک کی پر اپنی بنانے سے روکتا رہا۔ وہ کھٹکا یہ ہے کہ لوگ عموماً مین شیٹ نکالنے والے ہوا کرتے ہیں۔ کسی کی نیت سے نا آشنا ہونے کے باعث وہ کچھ سے کچھ اور جی مطالب اخذ کر لیتے ہیں۔ ان کی وابستگی چونکہ معروضی اور مزاحمتی ہوا کرتی ہے بسا اوقات وہ ایسے ایسے کیزے نکال کر تھیل پر دھردیتے ہیں جن کا وہ ہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔

بدیر سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ایک طور سے تو یہ اور بڑی نقاب کشائی کا عمل ہوگا۔ میں عرفان ذات کے مرحلوں سے نہیں گزری اسی لیے مجھ پر اپنی اور خاں صاحب کی اندرونی جبلت، فطرت، طبیعت، کردار کے اصل بھید نہیں کھلے۔ خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ عصر اور مغرب کے درمیان کسی ستون کے ساتھ سر لگا کر آنکھیں موند آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ اور صرف اپنے متعلق سوچو..... اپنے ارادے، خواہشات، دوسروں کے ساتھ تعلقات کے الجھے دھاگے، عمل اور علم کی دُوری، ماضی کے پچھتاوے، مستقبل سے وابستہ امیدیں، ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور ان سے بگٹ بھاگ کر آزادی پانینے کی حسرت، کردہ اور نا کردہ گناہوں کی ورق گردانی، اندر کے موسموں کی چھان بین..... غرض

یہ کہہ سکتے ہیں کہ پرت در پرت حقیقت اور خواب کے درمیان کا فاصلہ کم ہوتا جائے گا اور تمہیں اصلی شخص سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا جو تمہارے اندر جتنا سنگ کرتا رہتا ہے۔

میں سماجی نہ لگا سکتی ہوں نہ عرفانِ ذات کے جھنجھٹ میں پڑ سکتی ہوں کیونکہ عرفانِ ذات کے لیے دباؤ سے گزرنا پڑتا ہے خواہی کو جاننا ایک لمبا پُر خطر راستہ ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی سمت معلوم کرنے کے لیے کسی اجنبی شہر میں کسی نامانوس شخص سے رابطہ قائم کر لینا آسان ہے بہ نسبت لندن میں نقشہ نکال کر کسی سڑک پر اپنے دوست کا گھر معلوم کرنے کا شغل۔

میں نے ہر پڑھنے والے کے سامنے خاں صاحب سے وابستہ کچھ یادیں رکھ دی ہیں۔ اب آپ لوگ ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میری لن ترازیوں کی اصل حقیقت کیا تھی؟ ہم کس قدر گھبے فرشتے تھے اور کس حد تک سفید پتروں میں سے کتنی گھریں جھکائے خوشامدی ایشی خورے، منکبہ خود غرض، کسی شیطانی ٹونے کے رفیق تھے۔

ہر انسان اول و آخر کھنکھاتی مٹی سے بنا ہے اور ٹوٹ کر پھر مٹی ہی کا حصہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں بشریت کے جملہ حصے نہیں ہیں تو حتمی طور پر یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ میں بھی ان لوگوں کی احسان مند رہوں گی جو اس کتاب سے معروضی انداز سے تحمیل لگائیں گے۔ اگر ان کی آواز بھگت تک جیتے جی پہنچتی تو میں ان کی شکر گزار رہوں گی۔ اگر میرے بعد ان کی رائے دوسروں تک پہنچ پائی تو بھی گھانے کا سود نہیں کیونکہ وہ بہت شگنی کر کے بت پرستی کے شغل سے مشغول رہیں گے اور خاں صاحب جن کے چاہنے والے ان سنت ہیں اپنی رائے میں تھوڑے سے محتاط ضرور ہو جائیں گے۔

ایک سب سے بڑی وجہ آپ تک یہ مواد پہنچانے کی یہ بھی ہے کہ آج کے نوجوان آزادی کے مفہوم کو نہ سمجھتے۔ نئے آزادی کے درپے ہیں۔ جب کبھی آزادی آتی ہے اسی تناسب سے آزادی دینا بھی پڑتی ہے۔ اگر حقوق کے لیے بیٹھنا پڑے تو حقوق ادا کر کے ہی جان چھوٹی ہے۔ کھنے کی آزادی ہم دونوں نے بغیر کسی سے اجازت لیے ہتھیاری تھی۔ اس کتاب سے اب ہم دونوں Commitment کے بند دائرے میں آزگے ہیں۔ مسلسل اتنے سال اشارے کنائے اعتراف و ارتکاب کی فضا میں رہتے ہوئے ہم نے خود فرار کی راہیں، فیصلے کی آزادی اور ایک دوسرے سے عذر خواہی کا حق چھین لیا تھا۔

ہمارے باہمی نور والے کہا کرتے تھے کہ جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات تو عمر کے آخری حصے میں سمجھ میں آئی لیکن اس وقت خاں صاحب کو خط لکھ کر خط پانچ کر کے کچھ ایسا سرور متا تھا کہ اس شغل سے چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ محبت کا دماغ میں وہیں وقوف ہے جہاں عادت نشہ، کسمپٹ اور لذت کا مقام ہے۔ سگریٹ، ہیروئن، چرسا، بھنگ، ایون یہ سارے شوق ہل من مزید کا نعرہ لگاتے ہیں۔ کچھ ایسی کیفیت محبت کی بھی ہے..... یہ آخری بار مل لوں..... آخری بار دیکھ لوں..... بس یہی آخری لمس ہوگا۔ غالباً جنس اور محبت دو علیحدہ دماغی حصوں میں بسرام کرتے ہیں۔ محبت تسلسل کی آرزو مند ہے جبکہ Sex اہال کی شکل میں گھیراؤ اتنی ہے..... محبت کا متلاشی کبھی کبھی جان سے گزر جانے کو بھی کھیل سمجھتا ہے۔ مشکل تب پیش آتی ہے جب محبت میں اعتراف کی گانٹھ دونوں رسیوں میں مضبوط ہو جاتی ہے.....

اب اس محبت کو دائمی بنانے کی الجھن شادی کا کہا اور ان کہا وعدہ بن جاتی ہے..... روز ازل سے مرد اور عورت جب کبھی محبت کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سفر جو انہیں ایک دوسرے سے commit کر رہا ہے لمبا



بھی ہے اور پُر خطر بھی۔ اس میں وعدے کا پاس بسا اوقات گلے کا پھندا بن جاتا ہے۔ جس طرح کبھی کبھی منشیات بڑی قیمت وصول کرتی ہیں ایسے ہی محبت اور شادی پر منج ہونے والی محبت ایک بہت بڑا چیلنج بن کر زندگی میں داخل ہوتی ہے۔۔۔۔۔

جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان کر چکنے کے بعد آدمی کو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ روزمرہ کی زندگی میں نشہ آور سرور کہاں گم ہو گیا؟ وہ ربط باہمی کس مقام پر کیوں اور کیسے Clash میں بدل گیا۔۔۔۔۔ انسان چونکہ فطرتاً آزاد ہے۔ اس شادی کے بندھن میں جو سب سے بڑا چیلنج اسے پیش آتا ہے وہ یہی Free Will کی آزادی ہے۔

شادی کے بعد اپنا ارادہ ذات اور فیصلے کسی کی خاطر اپن کر کے مسرت محسوس کرنا ہر ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اللہ بھی کسی شخص کو اس وقت تک ہدایت نہیں دیتا جب تک انسان اپنی خوشی یا فیصلے سے اللہ سے ہدایت طلب نہ کرے۔ شادی میں بھی مکمل سرور اسی وقت ملتا ہے جب اپنے فیصلے سے اپنی قوتِ ارادی کو ساقی کی خواہش پر قربان کرنے کا شوق، دلور اور جوش نہ ہو۔ اس سلسلے میں آج کل کے نوجوانوں کے لیے یہ کتاب رہنمائی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

جس قدر بڑی Commitment ہو اگر اعلان بھی اتنا ہی بند بٹ ہو جائے گا تو اسی تناسب سے اپنی Free Will بھی چھوڑنا ہوگی۔ پھر رشتہ محمود وایا زکا بن جائے گا نہ شوق و معشوق کا نہ رہے گا۔ پھر نمرود کی آگ میں کود بھی جائیں تو آگ جلانہ سکے گی، لیکن عام طور پر محبت اور نشے کی اومین حالت میں انسان نڈست داری کو سمجھتا ہے نہ دورانِ اندیشی ہی سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔

اس لیے محبت کی شادیاں عموماً Disillusionment پر ختم ہوتی ہیں اور ساقی تو تعات لگانے کے بعد اپنا اپنا خیمہ اٹھا کر یا تو طلاق کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں یا پھر Extra-marital تعلقات میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ تعلقات خلع یا طلاق کسی صورت بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتے کہ غلطی تو انسان کی اپنی شخصیت اس کے اپنے مرکز میں ہوتی ہے۔ وہ کسی صورت بھی اپنا ارادہ فیصلہ تجویز چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔۔۔۔۔

دوئی ہوتے ہوئے بچائی پر اصرار کیوں؟ یہ کتاب اس اُمید پر چھاپ رہی ہوں کہ آج کل کے تیز رفتار جلد اکتا جانے والے ہمہ وقت تبدیلی کے آرزو مند سوچ سمجھ کر اس دریا میں قدم ڈالیں۔ ہو سکتا ہے کہیں کہیں پانی گہرا ہو اور آپ کو تیرنا بھی نہ آتا ہو۔

میری شادی ہر سے دونوں گھر والوں کے لیے ایک لائٹل مسئلہ تھا۔ خاں صاحب کے خاندان والے روایات کے پابند سکندری طبیعتوں کے مالک، خود اعتماد لوگ تھے۔ اُن کے خاندان میں کبھی کسی نے روایات توڑ کر باہر کی کسی لڑکی سے شادی کا سوچا بھی نہ تھا۔

جب خاں صاحب کی آدمی جاوی کالج کے بعد 24- کینال پارک تک بڑھی تو گھر والے بے طور متوجہ ہوئے۔ اُن کے گھر میں ریڈارٹ جاری ہو گیا۔ گھر والے منہ سے تو کم بولے لیکن تیل اور تیل کی دھار دیکھتے رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اونٹ چاہے کسی کروٹ بیٹھے اُن کی روایات کو پامال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ادھر جب میری والدہ نے اپنی معاملہ فہمی سے معاملے کا پڑتا لگایا تو ایک روز وہ چرخہ خرید لائیں۔ اسے

تعمیرات میں لگایا۔ ساتھ روٹی کی پونیاں ایک نوکری میں رکھیں اور کہنے لگی ”کاکی..... میں بی بی اے بی بی ہوں..... انسپکٹرس آف سکولز ہوں، لیکن میں سمجھتی ہوں مسائل کے سوچنے اُن کی کتر بیونت کے لیے چرنے سے اچھا کوئی مشعلہ نہیں۔ اتنی سنی بات لو کہ تمہارے کھیس تیار ہو جائیں اور تم اپنے شوہر کو دکھا سکو کہ تم سلیقہ شعرا بھی ہو اور پڑھی لکھی بھی.....“

پھر میری امی نے مجھے چرنے کی ہتھی پکڑا پونی اٹھا کر دھاگے کو نہ ٹونے دینے کا فن مال پر نظر رکھنے کے گر سکھائے۔ میں جلد ہی چرخہ کا تے کا ہنر سیکھ گئی۔ کروڑیے پر تو عبور حاصل نہ کر سکی جس میں میری والدہ ماہر تھیں اور اپنے ہاتھ سے انہوں نے بہت سی جالیاں، ٹوپیاں، میز پوش بنا رکھے تھے، لیکن مجھے ٹیو کا شوق پیدا ہو گیا اور میں گرہیں ڈالنے اور ان سے دوپٹے کی نیس بنانے میں ماہر ہو گئی۔ مجھے سلیقہ شعرا بنانے کے دوران ایک روز انہوں نے کہا..... ”میرے پاس اس وقت دور شتے ہیں۔ بسوں کا سرکاری نیت ورک نیا بنایا کھلا ہے وہ اس کا کرتا دھرتا ہے..... دوسرے ایک کرتل صاحب ہیں۔ یہ شہر تمہاری سبلی محمود منظور زائی ہے۔ فیصلہ کر لو۔ زبانی نہ بتا سکو تو محمود کے ذریعے بتا دینا.....“

میں نے خبرات کر کے کہا..... ”مجھے اگر شادی کرنا ہے تو اپنی مرضی کی کرنا ہوں۔ اگر بوجہ وہاں میری شادی نہ ہو سکی تو میں ساری عمر نوکری کروں گی..... لاہور کا کالج فار ویمن میں اردو کی لکچرار بن جاؤں گی۔ کنیر ڈ میں پڑھا لوں گی۔“ انہوں نے میری مرضی نہ پوچھی اور رساں سے بولیں ”دیکھو کاکی! جب بھی آدمی اپنی مرضی کرتا ہے اسے کچھ قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے..... اچھی طرح کا تے دقت سوچ لو..... بھاری قیمت ادا کر لو گی؟“

تو قارئین! یہ کتاب دو خام مواد ہے جس کو کوئی ثقہ مشاق گہرائی سے موتی نکالنے والا تحقیق نگار جناب اشفاق احمد پر ایک جامع کتاب لکھتے وقت کچھ کچھ استعمال کر سکتا ہے۔

کبھی کبھی وقت کی گرو خود شخصیت کی تصویر پر اس طرح پڑ جاتی ہے کہ اُس پر نہ تو کسی کو مزید کام کرنے کی سوجھتی ہے نہ ہی پود کو اپنے مشا میر ہی کو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بہر کیف میں نے یہ ساری یادداشتیں بہت سینت سینت کر لیا تاکہ میں کیونکہ میرا خیال ہے کہ یادوں میں قلبی ذہنی نفسیاتی کیفیات بڑی واضح ہو جاتی ہیں۔ انسان قلم اور کاغذ سے آگے اظہار کی ایک اور سرحد چھونے لگتا ہے جو انگلو میں فروغی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔

انسان نے اظہار کے لیے ہمیشہ خطوط، پھول، سنہالی، کپڑے، زیورات استعمال کیے ہیں۔ مشرق میں گجرے، موتی، چنبیلی کے گتھے ہوئے اور گونے کناری سے بچے زیبائشی ہار ہم سب کی یادوں میں پنہاں ہیں۔ مغرب کے لوگ گلدستے دینے کے عادی بن گئے ہیں۔ کارڈ بھیجے اور اس پر خوبصورت عبارتیں لکھنے کے شوقین ہیں۔ اب تو ہم لوگ بھی گلدستے اور کارڈ بھیجنے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن ارتکا زرار اور دولت کے شیدائی ہونے سے پہلے مشرق میں اپنا آپ اپن کرنے کا رواج تھا۔ جس قدر تعلق خاطر ہوتا اسی تناسب سے اپنا وجود ہاتھ جوڑ کر پیش کر دیا جاتا اور آرتی اُتارنے کے لیے یاد سے بہتر کوئی تھا ہی نہ تھی۔

عجیب سی بات ہے کہ سارے بہن بھائیوں کی لکھائی اور گفتگو ایک سی ہے۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ خاں صاحب کے والد ڈاکٹر ہابا محمد کے آٹھوں بچے ایک ہی طرح سوچتے تھے۔ ایک ساڑھے پتے اور ایک سے الجھاؤ کا شکار تھے۔ ویسے تو زندگی گزارنے کا کوئی حتمی نسخہ بھی ایجاد نہیں ہوا، لیکن ہر فرد اپنی Genetics اور ماحولیات سے جو کچھ

اخذ کرتا ہے وہی اُس کا خام مواد ہے۔

پھر اس مواد سے وہ کوڑہ بنائے یا لونا، صراحی، طبلے یا سوہنی کا کچا گھڑا۔ بہر کیف اُسے راستہ خود ہی بنانا پڑتا ہے۔ ان بہن بھائیوں نے بھی اپنے اپنے جینے کا ڈھنگ، علیحدہ علیحدہ بنایا لیکن اس علیحدگی کے باوجود ان میں ایک مشابہت ہے جو نئے ملاقاتی کو بہت متاثر کرتی ہے..... یہ جا دو گرفتہ کے لوگ ہیں جو نظر بندی کا فن جانتے ہیں، لیکن کسی کو اندر کے انتشار کی خبر نہیں ہونے دیتے.....

ان یادوں سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ان کے اندر متضاد جذبات کی جنگ ہمیشہ جاری رہی۔ ان ہی جذبات کے باعث خاں صاحب کٹکٹاش اور اسی منزل پر پہنچ کر بھی منزل سے مایوسی کا چسکا پانٹے رہے۔ انہیں منیر نیازی کی طرح کوئی موسم، کوئی جلد، کوئی شہر، کوئی طور پر اس نہیں آیا۔ یہ موسم جناب اشفاق احمد پر تو اُس وقت تک طاری رہا جب تک وہ جناب ضیف راے کے بڑے بھائی رشید احمد چودھری کی وساطت سے باباجی فضل شاد نوروالے کے پاس نہ پہنچے۔

اپنے کسی خط میں انہوں نے اپنے والد بابا محمد خاں کو تحریر کیا ہوگا کہ وہ احسان مٹری کا شکار ہیں۔ یہ خط چونکہ باباجی کو لکھا گیا مجھے معلوم نہیں، انہوں نے اسے محفوظ رکھا یا تلف کر دیا، لیکن اشفاق صاحب نے ایک بار مجھے اس خط کا متن بتایا تھا۔ باباجی کا خط اُس باپ کی رائیگاں کوششوں کا یہ نہیں ہے جس نے ہر طرح سے بچوں میں خود اعتمادی، زندگی سے دست چھڑ کرنے کی صلاحیت اور تعلیم کو ہتھیار بنا کر استعمال کرنے کی کوشش میں دن رات ایک کر دیا تھا، لیکن کیا کیا جائے یہی تو زندگی ہے۔ سائنس اصول بناتی ہے اور اُس پر کار بند رہتی ہے، لیکن زندگی کوئی اصول نہ گھڑتی ہے نہ تجویز کرتی ہے..... کسی نتیجہ پر قہر نہیں۔ یہاں مثبت سے منفی اور منفی سے مثبت نتائج نکلتے رہتے ہیں۔ زندگی بہر حال اصول کے ساتھ نہیں، اوپر والے اصول ساز کے ساتھ چلتی ہے۔

خاں صاحب کی Genetics کو سمجھنے کے لیے اُن کی فیملی بیک گراؤنڈ کو سمجھنا مفید رہے گا۔ میں جو کچھ سنی سنائی جانتی ہوں وہی گوش گزار کر سکتی ہوں۔ لیے ساتھ کی وجہ سے بہت کچھ جان گئی ہوں، لیکن مجھے بخوبی علم ہے کہ ہر انسان سربست راز ہے حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنے وجود سے کئی طور پر آگاہ نہیں ہوتا۔ صرف عرفان ذات کے ماہر صوفی واقعی بڑی سہولت سے اپنے آپ کو جان کر اپنے رب کو پہچان لیتے ہیں، لیکن یہ کسی نصیب والے کو آگاہی ملتی ہے کہ عرفان ذات ہی عرفان حق ہے۔

دراصل میں جب گورنمنٹ کالج میں تھی تو میں 1- مزنگ روڈ سے واقف نہ تھی، لیکن جب ہماری رہائش 24- ایس کینل پارک میں ہوئی اور خاں صاحب میرے بڑے بھائی پرویز سے سرورق بنوانے کے سلسلے میں آنے جانے لگے تو 1- مزنگ روڈ میری زندگی میں کسی انجانی سلطنت کے دار الحکومت کی سی کشش اختیار کر گیا۔

بہار کا موسم ہو یا خزاں کی رت، کچھ پودے اور درخت اپنے اپنے مقررہ وقت پر پتے ہوا کے دوش پر اُچھالنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی طرح درختوں، پھولوں سے بھی پولن جھڑ کر ہوا میں اُڑا کرتا ہے۔ سنبل کے پھوئے روئی کا پولن، چیز کے درخت سے جھڑنے والے جنگلی چلغوزے..... اور اسی طرح کیتھلی اُتار چھینکے والے سانپ، جھبرے بالوں والے

جانوروں کے بال مرغابیاں اور کچھ مختلف قسم کی بطنیں اور migrate کرنے والے پرندوں کی سرشت میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ بھرت آتی ہے۔ وہ ڈاروں کی شکل میں پڑاؤ ڈالتے، سستاتے، نئے چشموں، سرد ہواؤں سے بچتے غیر شعوری طور پر سخت نئی باغوں اور ریٹیلے ساحلوں (Beaches) پر اترتے ہیں۔

ایک مدت انسان صحرا نورڈ خانہ بدوش گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا رہا ہے۔ پہلے یہ ہجرت کا سلسلہ گروہ کی شکل میں بنا کرتا تھا اور جب ڈنڈا ڈولی کر کے خانہ بدوش ساتھ ساتھ چلتے تو خوف، خوشی اور Excitement میں اُس کا موڈ بدل جاتا تھا۔ ہجرت کی روایت بہت پرانی اور انسان کے لہو میں ارتعاش اور تبدیلی پیدا کرنے والی رہی ہے۔

لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہجرت کرنے والا عموماً اکیلا وطن چھوڑتا ہے۔ پردیس کی صعوبتیں سہتا، نئے ماحول اور موسم کے تقییرے کھاتا ہے۔ عموماً تحریک تلاشِ معاش ہوتی۔ اب گرمی گرمی گھومنے والے کو بنیادی طور پر فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ گروہی ہجرت یا Migration میں فیصلہ عموماً پورا قبیلہ یا گروہ کے سربراہ کیا کرتے تھے لیکن اب ہجرت ایک فرد کا فیصلہ ہے۔

خال صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اُس تضاد کو زیرِ غور رکھنا بے حد ضروری ہے جو ہر اقلیت کو درپیش رہتا ہے۔ ہر اقلیت جب ہجرت کر کے کسی نئے دیس میں بسرا کر لیتی ہے تو وہ اپنے رسم و رواج، بولی، اندازِ زیست و اقدار ساتھ لاتی ہے۔ نئے ماحول میں اُسے عجیب قسم کی Insecurity کا سامنا رہتا ہے۔ وہ خوف اور احساسِ کمتری کا اس لیے شکار ہوتی ہے کہ کہیں اکثریت میں اُس کی شناخت گم نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ لاشعوری طور پر اُسے ہموار اور متوازن زندگی کے لیے وہ بہوئیت، مراعات اور رعایتیں بھی درکار ہوتی ہیں جو کسی اکثریت کو اس طرح پیدا کنی طور پر ملتی ہیں جس طرح دریا میں بسنے والی مچھلی کو پانی۔ اکثریت کو کبھی اپنی خوش نصیبی کا شعوری احساس پیدا نہیں ہوتا۔

اشفاق احمد کے بڑے بچوں نے فیصلہ کیا کہ وہ افغانستان چھوڑ کر ترائی کی جانب پنجاب کی طرف جا سیں۔ خدا جانے مہمند قبیلہ جنسوں کی شکل میں عازم سفر ہوا کہ چھوٹے چھوٹے خاندان اپنا اٹھارہ بار بردار جانوروں پرنا و مشکل راستوں سے ہو کر مختلف جغرافیائی حدود میں ہونٹ سبزے کچھ اُداس، کچھ پُر امید، کچھ ہراساں چلتے چلتے پنجاب میں آجسے۔ ہوشیار پور کے مقام پر انہوں نے جو تلوں کے تھے کھول دیئے اور اپنی کاشکاری کی روایت کو قائم رکھا۔

مہمند قبیلہ موروثی طور پر کھیتی باڑی کے پیشے سے منسلک تھا، لیکن چونکہ یہاں زمین دستیاب نہ تھی، محمد مستقیم خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مقامی بار اتوں کے ساتھ حفاظتی جتھہ بنا کر چلا کرتے۔ رفت رفتہ وہ تجارتی قافلوں کے ہمراہ اسلحہ سجا کر حفاظتی گروہ بنا کر سفر کرنے لگے۔ دو تین بیڑھیوں کے بعد اسی خاندان میں محمد معظم خاں نے جنم لیا جو اشفاق صاحب کے دادا کے والد تھے۔

جناب اشفاق احمد مہمند پٹھان تھے۔ وہ اپنی اس شناخت کو چھپاتے تھے۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ خاں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ پاکستان مسلمانوں کا دیس ہوگا۔ وہاں نہ نسبی نہ علاقائی زبانوں ہی کا تقاضا ہوگا۔ یہ دھرتی مہاجر اور انصار کی سانجھی ہوگی اور انصاف کے تحت چلنے والا نظام رائج ہوگا۔ اسی خواب میں گم انہوں نے 39 برس تکین شاہ لکھا، لیکن اصل تضاد یہی تھا کہ انہیں اپنے مہمند قبیلے سے بھی عشق تھا۔ وہ اپنی روایات سے بھی محبت

کرتے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ ذات برادری سے باہر شادی کر کے ان روایات کو توڑنا بھی نہ چاہتے تھے۔

ان کے پڑکھ جب ہجرت کر کے پنجاب میں پہنچے تو تمام اقلیتوں کی طرح انہوں نے اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے مٹھی بند معاشرہ قائم کیا۔ یہ لوگ نہ مداخلت کرتے تھے نہ مداخلت برداشت کرتے تھے۔ انہما کے مہمان نواز لیکن دوستی کو دسترخوان سے آگے نہ بڑھنے دیتے۔ میل جول میں اس درجہ محتاط کہ ذات برادری سے باہر شادی کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہی تضاد اندر ہی اندر خاں صاحب کو دیمیک کی طرح چاٹنے لگا۔

جب انہوں نے مجھ سے شادی کا ارادہ کیا تو یہی تضاد آری کی طرح ان کے اندر چلنے لگا۔ اسی سے فرار حاصل کرنے کے لیے انہوں نے کئی راستے اختیار کیے۔ کبھی مری، کبھی جہلم، کبھی کراچی اور آخر میں اٹلی ٹھکانا بنا کر ایک اور ہجرت کر لی۔

خاں صاحب کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ خاں صاحب کے دادا دوست محمد خاں خاندان کی آبرو اور پہلے قابل ذکر آدمی تھے۔ بے انتہا خوبصورت ذہین اور دھن کے پکے تھے۔ بد قسمتی سے ان کی شادی ایک کریمہ صورت سانولی بد ہیئت پٹھان لڑکی سے کر دی گئی۔ نہ انہیں شادی سے پہلے دلہن دکھائی گئی نہ کسی نے آمادگی ہی پوچھی۔ دوست محمد خاں صاحب کے دادا جہان پرست تھے۔ بیوی کو دیکھ کر دل ٹوٹ گیا۔ یہ پٹھان بچہ حسن میں بے مثال وجاہت میں لاشائی تھا۔

ویسے تو شکل و صورت اُوپر والے کی دین ہے۔ انسان اپنے آپ کو اس سلسلے میں تبدیل کرنے سے قاصر ہے لیکن نیا کیا جائے سفید تو میں سیاہ اور براؤن جلد کو بھی معاف نہیں کرتیں اور عموماً اس درجہ خود پرست ہوتی ہیں کہ وہ سیاہ شکل و صورت والے فرد کو مکمل طور پر ہی رو کر دیتی ہیں۔ یہی مسئلہ دوست محمد خاں کو درپیش ہوا۔ بیوی کا گھونگھٹ اٹھاتے ہی انہیں ابکائی آئی۔ بیوی کو پٹھانی تھی لیکن سانولی بھی تھی اور بد شکل بھی۔ اُدھر دوست محمد خاں کا حسن رُیکہ مجسمے کا سا تھا۔

دوست محمد خاں نے دل میں ہجرت کی ٹھانی۔ چپ چاپ حیدرآباد کا قصد کیا لیکن رو میں تو اُوپر والے کے حکم سے رحم میں اترتی ہیں۔ باباجی محمد خاں کو اس دنیا میں دوست محمد خاں جیسا پڑھا لکھا خوبصورت باپ ملنا تھا سو وہ اپنی بد صورت ماں کی گود میں پروان چڑھنے لگا۔ دوست محمد خاں کے بیٹے اور خاں صاحب کے والد اپنی ماں سے مشابہ تھے۔ باباجی محمد خاں کا قد چھوٹا رنگ گہرا سانولا چہرے پر چیچک کے داغ، ناک نقشہ بھدا تھا۔ وہ اپنے نستعلیق باپ دوست محمد خاں سے ہر طور مختلف تھے۔

باباجی دوست محمد خاں کی پذیرائی حیدرآباد کن میں سرخ قالین پر ہوئی۔ وہ دربار میں اپنی فضیلت، فارسی دانی اور علم دوستی کے باعث جلد اتالیق کے عہدے پر پہنچ گئے اور نواب زادوں کی تربیت خوب نبھانے لگے۔ گو ان کا تعلق اپنی بیوی کے ساتھ نہ تھا لیکن دوست محمد خاں باقاعدگی سے اپنی بیوی اور بچے کی کفالت کرتے تھے اور بیٹا گورنمنٹ کالج سے ملحق Montmorancy College میں جسے عوام ڈنگر ہسپتال کہتے تھے، تعلیم پانے لگے۔ باباجی محمد خاں شکل و صورت میں والدہ کی طرح تھے اور ذہانت، علم دوستی اور استقامت میں اپنے علم دوست باپ پر گئے تھے۔

میں یہ باتیں آپ کو کسی طور پر کسی دعویٰ کے ساتھ پیش نہیں کر رہی۔ یہ ساری سنی سنائی مندر منہ کی کہانیاں ہیں۔ سارے بہن بھائی ایک ہی کہانی مختلف انداز لب و لہجہ اور بناوٹ میں سنا تے تھے لیکن ہر ایک کے لہجے میں وہی تقاضا

تاریخ میں ممتاز تھی ہے۔ اس سارے خاندان کو اپنے دادا دوست محمد خاں کے حسن پرنازا اور اپنے پیرزاوے ہونے پر فخر ہے۔ پروفیسر بسنے والے والد کی ساری توجہ کا نتیجہ تھا کہ خاں صاحب کے والد محمد خاں پڑھتے چلے گئے اور Montmorancy College سے ڈگریڈ اگزیٹنگ کر نکلے۔ اب انہیں اپنی کلا جگانے کے لیے دو چیزیں درکار تھیں۔ ایک تو اپنی بد صورتی چھپانے کے لیے خوبصورت بیوی دوسرے اپنے پروفیشن میں نام پیدا کرنے کے لیے مناسب مقام۔ باباجی محمد خاں نے خاں صاحب کی والدہ بی بی سردار بیگم سے شادی کی جو اس درجہ خوبصورت تھیں کہ ابھی تک ان کے سارے خاندان میں ان کے مد مقابل کوئی صورت نہیں آسکی۔

قدرت ہر انسان کو اس کے عمل کی کچھ جزایا سزا تو نہیں عطا کر دیتی ہے، کچھ حساب کتاب کے لیے اس نے عذرت کی شرط لگا رکھی ہے۔ جس طرح آواگان کا فلسفہ بہتر عمل کی طرف راغب کرنے کا ایک نسخہ ہے۔ ایسے ہی قیمت کا اندیشہ بھی انسان کو نیک عمل کرنے پر اکساتا ہے اور اللہ کو قرض حسد سے کر اپنا اعمال نامہ دیکھیں ہاتھ میں لے کر نکلنے کی خواہش ہر مسلمان کے دل میں دھڑکنے لگتی ہے۔

باپ کے رویے کی وجہ سے ڈاکٹر محمد خاں میں بھی ایف گہرے تضاد نے ہولے ہولے جزیرے پکڑ لیں۔ انہوں نے بہتر پالنے اور پیٹنگ بازی کا مشغلہ جو انہیں دل سے پسند تھا، چھوڑ دیا۔ ذمہ داری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا، لیکن جس باپ کے احسان تلے وہ پیکر رہے تھے اس کے شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی عدم موجودگی کے باعث وہ اسی سے شدید نفرت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے تیر کر لیا کہ وہ زندگی میں باپ سے بڑھ کر کچھ کر دکھائیں گے۔ ایک طرف تو وہ شادی کے بعد حسن سے نفرت کرتے تھے اور دوسری طرف انہوں نے خاندان کی سب سے خوبصورت لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔

کسی وقت کسی مقام اور لمحے نے فیصلہ کیا اور باباجی نے منتہی جذبات کو نیام میں بند کیا اور فیصلہ کے موجود بن گئے۔ مکتبہ میں ایسے مشہور ڈگریڈ اگزیٹنگ ہوئے جو سوڑے کو نیک لگا کر اکیلا ہی ڈھانستا تھا۔ بڑے بڑے سکھ سرداران کے مرید ہو گئے۔ ان کی خوبصورت بی بی سردار بیگم ان کی کارکردگی کے باعث ان کی مطیع ہو گئیں۔ ہولے ہولے انہوں نے جانور پھوڑ انسانوں کا علاج شروع کر دیا۔ شفا شامل حال رہی اور ان کے مریض دور دور سے آنے لگے۔

باباجی محمد خاں بھی ایک بڑی نومند شخصیت تھے۔ وہ ہر کام کرنے سے پہلے اپنی دور رس دانش سے اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے نتائج اخذ کر لیتے۔ تجویز ان کی بیساکھی اٹانھی چوب ہنا ڈچھاؤ تھی۔ شاید ڈاکٹر محمد خاں کو علم نہ تھا کہ انسان تو انسان کا علم قبیل ہے۔ پھر اس کی تجویز پانی دینے پر مامور ہے، لیکن پھل پھول لانے پر قادر نہیں۔ انسان کو رزق عدل کمانے کا حکم ضرور ملا ہے، لیکن وہ کس قدر رزق کما سکے گا اس کا کسی شخص کو علم نہیں۔ باباجی محمد خاں بھی ہر منتہی ترقی پسند نکت کی سیدھ چلنے والے آدمی کی طرح اپنی محنت کو حرف آخر سمجھتے تھے۔ انہیں Genetics کی کھیل کا علم نہ تھا نہ ماحول میں چھپے ہوئے شکست دینے والے عناصر ہی کا کوئی جھاؤ تھا۔

شاید ڈاکٹر صاحب کو علم نہ تھا کہ کئی بار بغیر ڈگریاں حاصل کیے انسان اللہ کی مہربانی سے فلسفی، شاعر، مجتہد عالم بن کر وقت پر اثر انداز ہو جاتا ہے، لیکن اسے علم نہیں ہوتا کہ یہ طاقت غیب سے کیونکر آئی۔ کیا اس کی تحریک کوئی دعوت تھی یا وہ خود آرزو شوق اور خواہش تھی جو آسمان چیرتی اللہ کے حضور پہنچتی رہی۔

بہر کیف اپنا پیشہ چکانے کی خاطر انہوں نے ملکشر مشرق پنجاب کا قصبائی گاؤں چنا۔ یہاں سکھ سرداروں کی لہہاتی زمینوں پر گھوڑے، بھینسیں، بکریاں، موہر قسم کے جانور تھے۔ ڈگر ڈاکڑ کی لحاظ بہ لحاظ احتیاج رہتی تھی۔ ہوتے ہواتے وہ خالق خدا کی بنفیس بھی دیکھنے لگے۔ عورتوں کے امراض پر بھی حاوی ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ایک حویلی نما گھر بھی بنا لیا، جس میں باہر ایک باغ تھا جس کو باباجی پائیں باغ کہتے تھے۔ اب گھوڑوں کا اصطبل بھی وجود میں آ گیا۔ بھانت بھانت کے اعلیٰ نسلی گھوڑے بندھے نظر آنے لگے۔

بپاجی کو گھڑ سواری کا بے حد شوق تھا۔ اُن کا خیال تھا اعلیٰ نسل کی بیوی، اعلیٰ نسل کا ستا، اعلیٰ Pedigree کا گھوڑا، اعلیٰ نسل کے اشراف کی نشانی ہے۔ دراصل مرد کو ازل سے سواری کا شوق رہا ہے۔ آج کل کے زمانے میں گھوڑے نہیں چرانے جاتے اب کاریں اس شوق کے زیرِ غتاب آچکی ہیں۔ بڑی گاڑیاں Status اسمبل بن چکی ہیں اور ان کے بغیر مرد اپنے آپ کو مرد سمجھنے لگتا ہے۔ ہر بینک رہن پر گاڑی فروخت کر کے خلیق کی گھڑ سواری کا شوق exploit کر رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد خاں نے اپنے آٹھ بچوں کو گھڑ سواری سکھائی۔ آپا فرخندہ اور آپا فرحت تک یہ فن جانتی تھیں۔ حالانکہ مسلمان گھرانوں میں تب پردہ سخت تھا۔ آفتاب بھائی اور خاں صاحب پڑھنے لکھنے والی شخصیتیں تھیں۔ انہیں اس ہولعب کا کوئی شوق نہ تھا لیکن ان کو بھی بابا محمد خاں نے بد بدی گھڑ سواری سکھائی۔ مارے باندھے یہ بھی باپ کے شوق میں شامل ہوتے رہے، لیکن گھڑ سواری نہ بن سکے نہ پولو جیسی کھیل ہی میں دلچسپی لے سکے۔ حالانکہ اسٹیج بھائی نے دیہاتی بچوں کی پولو ٹیم بنا رکھی تھی اور رات کو پولو کی گیند کوشی کا تیل لگا کر جلاتے اور دیہاتی ٹونڈوں کو پولو کھیلنا سکھاتے۔

دوسری تجویز باباجی نے علم کے پیچھے سردھڑ کی بازی لگانے میں صرف کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ پڑھ لکھ کر ہی انسان دوست محمد خاں بن سکتا ہے۔ باباجی محمد خاں اپنے تعلقات میں ہر بڑے آدمی کی طرح خندا کا شکار رہتے تھے۔ جس والد سے احساسِ محرومی کے تحت انہوں نے نفرت پال رکھی تھی وہی والد کہیں اُن کا رول ماڈل بھی بن گیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بغیر تعلیم کے کوئی شخص نہ عمل ہو سکتا ہے نہ اسے خاندان یا معاشرے میں کوئی مقام ہی حاصل ہونے کے امکانات تھے۔

اسی تجویز کے تحت انہوں نے گھر پر بیوشن سنٹر کھولی لیا۔ صبح سویرے چار بجے ہسپتال جانے سے پہلے اپنے بیٹوں کو اٹھانے کا حکم تھا۔ ماسٹر جی آجاتے۔ وہی ماسٹر جی جو خاں صاحب کو ”گولومولو“ کہتے تھے اور دسویں میں پہلی بار فیل ہو جانے کے بعد ان ہی داؤ جی کے گھر جناب اشفاق احمد خاں صاحب کو منتقل کر دیا گیا اور یہیں سے اُس ”گڈ ریا“ کی شخصیت اخذ کی گئی جو بعد میں اردو ادب کے کلاسیک کا حصہ بن گئی۔

مارے باندھے جمائیاں لیتے آفتاب بھائی، افتخار بھائی، اقبال بھائی، اسٹیج بھائی اور خاں صاحب اٹھتے۔ رات کو گھر سے چوری چوری نکل کر اسٹیج بھائی کی ایجاد کردہ پولو کھیلنے سے ویسے ہی جسم چور ہوتا لیکن باباجی کا خوف غالب رہتا اور مارے باندھے اٹھتے۔

زندگی کی کروٹوں کو لاکھ جوش سے سمجھنے کی کوشش کریں استخارے نکالیں فال ڈال کر مستقبل تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کریں۔ یہ اپنی کروٹیں اپنی مرضی سے لیتی ہے۔ حیدرآباد میں نواب صاحب کے بیٹے کا اتالیق اچانک بیمار ہو گیا۔ لاکھ درباری حکیم نے مجبوعین شربتیاں، عرق پلانے، لیکن افاق نہ ہوا۔ دوست محمد خاں پر فالج کا حملہ ہو گیا۔

بابا دوست محمد خاں نے اپنی بیوی کی بد صورتی کے ہاتھوں اپنے آپ کو فرار کے عمل سے دوچار کیا تھا لیکن اللہ تو  
تو ان کا کم کرنے پر تیار بیٹھا ہے۔ حیدرآباد میں جب بابا دوست محمد خاں پر اچانک فالج کا حملہ ہوا تو بابا جی محمد خاں جو بے  
یاد اپنے گھر کی چھت پر کبوتر اڑایا کرتے تھے اور لا ابالی طبیعت کے مالک تھے اچانک سنبھل گئے۔ ایک فالج کی آفت  
سے اللہ نے باپ بیٹا دونوں کے رخ موڑ دیئے۔ تو ازن کے پلڑے برابر کر دیئے گئے۔ بابا جی محمد خاں اپنی بے حد  
بد صورت بیوی سردار بیگم کے پاس آئے اور بولے ”میرے والد حیدرآباد میں بیمار پڑے ہیں۔ میں انہیں گھرانہ چاہتا  
ہوں۔“ یہ عہد بیویوں سے ڈرنے کا نہیں تھا۔ مرد ابھی اپنی فضیلت کے نشے میں سرشار صیہونیت کو خوبی سمجھتے تھے۔  
”لے آئیں جی..... جیسی آپ کی مرضی.....“ دراز قد اماں جی نے کہا۔

بابا جی نے حج کھا کر کہا ”اس بار میری مرضی نہیں تمہاری رضا چاہیے۔ بابا جی فالج کے مریض ہیں۔ ان کو نہانا  
جسٹا بول و براز کئی گندے کام ہوتے ہیں کر لو گی؟..... میں تو ہسپتال میں رہتا ہوں۔ زیادہ بوجھ تو تم پر ہی ہوگا۔“  
”میں بچوں کی ماں ہوں..... میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں.....“

اب ڈاکٹر محمد خاں مکتسر سے حیدرآباد پہنچے۔ مردہ صورت باپ کو لے کر گھر پہنچے اور اپنی چاندی بیوی کو ان کی نرس  
بنا دیا۔ اماں جی سننے بھی یہ خدمت دل و جان سے قبول کی۔ باپ بیٹے میں تو مفاہمت کے دروازے نہ کھلے لیکن بہونے  
پنے سر کا دل جیت لیا۔ کچھ خوبصورتی سے کچھ خوبصورت نسل کے ہاتھوں۔ واقعی اماں جی سردار بیگم کے لیے اپنے سر کی  
نہمداری کوئی مسئلہ نہ تھی۔ انہوں نے اپنی کھی ہوئی مسکراہٹ پھر تیلے ہاتھوں اور لبتک لبتک کی سپرٹ کے ساتھ بابا جی  
دوست محمد خاں کی سیوا کا بیڑہ اٹھایا اور خوب نبھایا۔

مکتسر میں بابا جی محمد خاں کا حویلی نہ گھر تھا۔ اس کا آنگن کشادہ اور اس کے ویئرے میں ڈرائنگ روم کی تمام  
تعمیرات تھیں۔ دیہاتی ماحول کی ساری خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اصل میں ملازمین، اماں جی کی دیہاتی سہیلیاں،  
مزارعوں کی بیویاں بیٹیاں اپنی رشتہ دار خواتین کا آنا جانا لگ رہتا۔ تنور سلگ رہے ہوتے۔ چولہے کے توڑے پر بھی روٹیاں  
دھپ دھپ پکتی چلی جاتیں۔ چار پائیاں اٹھتی چلی جاتیں۔ بچھانے کا عمل بھی اسی سرعت سے جاری رہتا۔ ان ہی  
چار پائیوں کو ڈرائنگ ٹیبل کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ پھر ان ہی چار پائیوں پر بچوں کو تھلانے، سکھانے، مالش کرنے کے  
مرحلے پیش آتے۔ ان ہی چار پائیوں پر سکول سچ جاتا اور مولوی صاحب قرآن پڑھانے لگ جاتے۔ استاد صاحب کے  
آنے پر یہی نوٹری کچھ ادوائس والی چار پائیاں کتب کی صورت اختیار کر لیتیں۔ تختیاں دھو کر ان ہی کے پائیوں کے ساتھ  
سکھانے کے لیے لگا دی جاتیں۔ ان ہی کے گردا گرد ایک دوسرے کو پکڑنا چور سپاہی کھینا بچوں کا معمول ٹھہرتا۔ دیواروں پر  
پوتڑے سوکھتے، رضائیاں کھیس دھوپ سینکتے۔ دوپٹے لہکتے، لمبی ڈوریوں میں مہزیاں سوکھنے کے لیے لٹکتی نظر آتیں۔ ازار بند  
موباف پراندے، کمر بند ہر نوع کی کھینچنے کسنے والی چیز نظر آتی۔

اسی آنگن سے ملحق فالج زدہ بابا جی دوست محمد خاں کا کمرہ تھا۔ فارسی اردو کی کتابوں سے آراستہ حیدرآباد دکن  
کے دربار کی تصویروں سے سجے کمرے میں نفیس کشمیری دوشالے، کبل سے آراستہ بستر۔ اس نستعلیق کمرے کی فضا میں  
..... جامی، حافظ مولانا روم کی دانش مہکتی تھی۔ جب کبھی دو مختلف کچھراپس میں ٹکراتے ہیں تو ایک دوسرے پر اثر انداز



ہوئے بغیر نہیں رہتے یا اللہ تعالیٰ اسی طرح جمود توڑنے کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

ہولے ہولے باہر کے اثرات اندر والے کمرے پر مرتب ہونے لگے۔ کام کرنے والیوں کی محبت نے باباجی دوست محمد خاں صاحب کولسی، بیسی روٹی، سرسوں کا ساگ، کڑی بڑیاں کھانے کا شوق ڈال دیا۔ وہ کچی سبزیوں کو پسند کرنے لگے۔ مٹی لپی انگیٹھی میں جلتے اپلوں کی گرمی پر ہاتھ سینٹنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ سر میں اماں جی سردار بیگم سے سرسوں کا تیل جھسوانے پر آمادہ ہو گئے۔

ادھر باہر کی آبادی بھی باباجی دوست محمد خاں کی پرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ہولے ہولے ”جھا کا“ اترنے لگا۔ دیہاتی عورتیں آنے بہانے باباجی کو سلام کرنے اندر جانے لگیں۔ کبھی گرم پانی کی بوتل، کبھی بانٹی، کبھی چادر تبدیل کرنے کی خاطر، کبھی جھاڑو بیمار کو دیرا بنا کر لڑکیاں بارڈر کر اس کرنے لگیں۔

نئے کلچر نے ان کے اندر چکا چونڈ پیدا کر دی۔ باباجی نے جامی حافظ مولانا روم کے اشعار انہیں رنانے شروع کر دیئے۔ تنگد خود سکھایا۔ آواز میں سے ڈنگر پن نکالی کر شائستگی کی چونڈ لگا دی۔ اب تو لڑکیاں بالیاں ڈھولک پر فارسی غزلیں گانے لگیں۔ عورتوں نے مولانا روم کے کلام سے بند و نصح اٹھا کر نئی پود کو عقل مت سکھانا شروع کر دی۔ گھر میں حیدر آبادی کھانے تو پکتے ہی تھے سلام دعا کا طریق بھی بدل گیا۔ اب ہاتھ کا چپو بنا کر ذرا سا کمر کو پکا کر آداب کہنے میں لطف آنے لگا۔

یہ اللہ کی عجب کار سازی ہے کہ وہ اچھے میں سے بُرا اور غلیظ میں سے پاکیزہ برآمد کرنے پر پوری طرح سے قادر ہے۔ باباجی محمد خاں کے اندر بھڑکتے کونکے دہکتے رہے۔ پھر سرد پڑ کر دباؤ سہہ کر چمکدار ہیروں میں بدل گئے۔ ان کی ساری توجہ رنگ گورا کرنے، کیل مہا سے چھائیوں کے بندنما داغ دُور کرنے کی طرف مبذول ہو گئی۔

دوست تہہ سنگ نے ایک بڑی ایجاد کو جنم دیا۔ باباجی محمد خاں نے فیسرین کریم بنائی اور جا بجا اس کی سپلائی شروع کر دی۔ اب ذاتی غم و غصہ خلق کی ایک بڑی تکلیف رفع کرنے میں صرف ہونے لگا۔ پہلے یہ کریم معمولی کونڈی میں بنی۔ اسے ملانے گھوٹنے کے لیے ایک عام ڈنڈا لیا جاتا۔ ہولے ہولے جب اس کی سپلائی سارے ہندوستان میں پھیل گئی تو باباجی نے مشینوں کا سہارا لیا۔ اماں جی پیکنگ کرنے والی عورتوں کے مابین سردار قائم ہو گئیں اور کھنا کھٹ پھنسا پھٹ فیسرین کی بوتلیں جن پر نہایت معمولی لیبل اور اُس سے بھی ناقابل ذکر انداز میں فیسرین لکھا ہوتا تھا، پیک ہونے لگیں۔ ککتر میں سنا ہے بصری تیلن اس کام میں پیش پیش تھیں۔ لاہور میں جب فیسرین پیک کی جاتی تو رجمونا کین بڑی پھرتی سے ڈبیاں موڑتی جوڑتی اور اس میں سلیقے سے فیسرین کی بوتل پیک کر دیتی۔

لیکن باباجی دوست محمد خاں اور بابا محمد خاں میں دُوری کی فضا قائم رہی۔ بابا محمد خاں کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ میرے والد نے نہ کبھی میری والدہ کو اور نہ کبھی مجھے ہی قبول کیا۔ یہ زخم اتنا گہرا اور کاری تھا کہ ان کی زندگی کا سارا تار و پود اسی زخم میں رنگا گیا۔

باباجی محمد خاں دل کے انتہائی نرم تھے، لیکن ان کے رویے میں ایک ہیرے جیسی سختی تھی۔ کسی سے بغلگیر ہونا، مصافحہ کرنا، دوستانہ انداز میں ایک ہی تھالی سے کھانا، کسی لطیفے پر مل کر ہنسنا باباجی کے لیے بڑا مشکل کام تھا۔ وہ الگ تھلگ

لیے ویسے پتھر ملی نظروں سے دیکھتے۔ باباجی دوست محمد کے کمرے میں آتے جاتے رہے۔ اپنے سانولے رنگ چھوٹے  
تہہ چنگ زدہ چہرہ اُن کو یاد دہانی کراتا رہا کہ ان ہی کی وجہ سے تمہارے والد کا دل تمہارے لیے ہمیشہ بند رہا۔

بڑے باباجی کسی بچے کو فارسی کی غزل رنا کر آنگن میں ایک کرسی پر چڑھا دیتے۔ گھر کے ملازمین حاشیہ بردار  
ناظرین ارد گرد اکٹھے ہو جاتے۔ شخصیت مانجھنے خود اعتمادی پیدا کرنے میں یہ تحریک خوب کام آتی۔ بچہ بولنے کا فن جلد سیکھ  
جاتا۔ اُس کی زبان کھل جاتی اور جب وہ ہندوستان و ہرم سکول میں اپنے سکھ اور ہندو ہم مکتبوں سے ملتا تو ایسے بات کرتا  
گو یا سکندر کسی پورس سے ہمہ کلام ہو۔ بچوں میں خود اعتمادی کا یہ سارا فن باباجی دوست محمد خاں کا عطا کردہ تھا۔ سکھ استاد بھی  
ان فارسی آشنا شاہین بچوں سے ڈرتے تھے جو فر فر جامی حافظ اور رومی کا کلام لحن کے ساتھ پڑھتے تھے۔

بابا محمد خاں کے گھر نو بچوں نے جنم لیا۔ عجیبی بات ہے کہ یہ بچے سب کے سب دو دو سال کے وقتسے کے بعد  
22 مئی کو پیدا ہوئے۔ صرف اشفاق صاحب 22 اگست 1925ء میں اس دنیا میں تشریف لائے۔ سنا ہے اس دن بابا  
دوست محمد خاں دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ اشفاق صاحب اور اشفاق کے درمیان ایک بچہ اور بھی تھا جسے سب کالی  
بھونڈی کہتے تھے لیکن وہ دو سال بعد فوت ہو گیا۔

سنا ہے کہ خاں صاحب ہو ہو اپنے دادا سے مشابہ تھے۔ اگر لفظ بھر ”آواگون“ پر اعتبار کر لیں تو لگتا ہے بابا  
دوست محمد دو بارہ دنیا میں آگئے..... اُرا سلامی روایات کے مطابق ہم اپنے باپ دادا کے گناہوں کے وارث ہیں تو میں  
مکمل ہے کہ اُن کی موروثی خوبیوں کے بھی امین ہیں جو، ری Genetics میں چلن آتی ہیں۔  
مرنے سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے اشفاق صاحب قدرے آرام میں تھے۔ کہنے لگے قدسیہ! شہنشاہِ بابر اور  
گورونانک جی کا مکالمہ سنو گی۔

”کونسا مکالمہ؟“ میں نے سوال کیا۔

”بھائی سرور انزل..... منشی تلوک چند محروم کا تحریر کردہ۔“

”اچھا اچھا وہ والا۔“

”اچھی ایم اے پاس ہو اس قدر ناواقفیت۔“

”یاد تو ہے پر کچھ کم کم۔“

”جب گورونانک شہنشاہِ بابر کے دربار میں پہنچے تو بابر نے بڑی شان سے بابا گورونانک کو اپنی مہمان نوازی میں

شامل کیا اور گویا ہوا۔

بابر: ہماری بزمِ عشرت میں جو لے آیا خدا بابا

تو بسم اللہ جامِ بادهِ احمر چڑھا بابا

جہاں میں آبِ زر سے کون ہے پاک تر پانی

کہ دُھل جاتا ہے جس سے دفترِ مادشا بابا

ندے خانے کو دیکھا چاہیے چشمِ حقارت سے

کہ ہوتی ہے یہیں سے بے خودی کی ابتدا بابا  
 نہ یونہی میکشوں کو خاک پر بیٹھا ہوا دیکھو  
 پہنچتی ہے نظر ان کی سرفوق السما بابا  
 صداحق حق کی سنتے ہیں سداود شیشہ سے  
 اسی سے دل ہیں زندوں کے حقیقت آشنا بابا  
 جزا تھی کھولتی ہے راز دل جب باگب تفتل سے  
 فنک سے پکار اٹھتے ہیں ملائک مرحبا بابا  
 نہ ہو گلہا نگ مستوں کی تو دنیا بزمِ ماتم ہے  
 ہمارے دم سے کچھ کچھ زندہ ہے دارالفنا بابا  
 غنیمت جان صحبت کو اک دو جو مہ پیتا جا  
 میانِ محفلِ رنداں در و آشام پیتا جا

خاں صاحب اس لہک سے زبانی پڑھ رہے تھے گویا وہی بابر ہوں۔ پھر انہوں نے ناک پر انگلی رگڑ کر پوچھا

’کچھ یاد ہے بابا گورونانک نے کیا جواب دیا تھا؟‘

’ہاں جی۔‘

’اچھا سنو..... بابا نانک بولے:

مبارک ہو مئے امر تھے صاحبزاد تیری  
 رکھے بس سرور تجھ کو شرابِ ارغواں تیری  
 دل فرخندہ تیرا واقفِ رمزِ حقیقت ہے  
 اگر ہے ترجمانِ دل حقیقت میں زباں تیری  
 مگر جب کیفیتِ دل میں ہے کیفِ مے کی حاجت کیا  
 غرض محفل سے کیا خلوت ہو جب رشکِ جہاں تیری

مئے انگور پی کر اگر کوئی متواں ہوا تو کیا

نہ آئی دل میں مستی ہاتھ میں پیالہ ہوا تو کیا؟

وہ مئے اپنی ہے جس سے بن پے مخمور رہتے ہیں  
 خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں پُور رہتے ہیں  
 وہ میکش ہیں کہ مہر و ماہ اپنے با مہ ساغر ہیں  
 جو صہبائے مروق سے سدا بھریا جتے ہیں  
 ہمارا دور مے ہر سر نفس کے ساتھ پہنا ہے

اسی سے ہر نفس ہر لفظ ہم سرور رہتے ہیں  
کثافت روح میں آلائش دنیا سے آتی ہے  
شراب ظاہری سے اہل باطن دُور رہتے ہیں  
چڑھا دو ان کو سولی پر بھی تو حق حق سناتے ہیں  
جو ن شق ہیں وہ سرشار مئے منصور رہتے ہیں  
لنذھائے ہوں جنہوں نے خم کے خم صہبائے عرفان  
کہاں وہ طالب افشردۃ انور رہتے ہیں

مناسب ہے یہی ترک مئے انور شاہا  
ہمارے ہاتھ سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا

نظم سنانے کے بعد انہوں نے تپائی پر پڑے ہوئے گلاس کو میری طرف بڑھایا۔ میں نے گلاس میں باقی ماندہ چند قطرے پی کر کہا..... ”خاں صاحب! آپ کا کمان کا کمان فظ ہے۔ آپ کو اس نعمت کا تحفہ پتہ نہیں کہاں سے ملا ہے۔“  
”باباجی دوست محمد خاں سے اور کہاں سے..... کہتے ہیں کہ ہماری Genetic Coding ہی دراصل ہماری قسمت ہے۔ شاید اسی لیے اللہ کہتا ہے کہ گناہ سے بچو۔ ہم تمہارے گناہ تمہاری آنے والی نسلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ مجھے بابا دوست محمد خاں کا کمان فظ ملا ہے..... سنا ہے جس روز وہ فوت ہوئے اسی دن میں اس دنیا میں آیا۔ انہوں نے جانے سے پہلے اپنی وراثت Genes کی شکل میں مجھے سونپ دی تھی۔“

آفتاب بھائی اور خاں صاحب کے اندر علم کی ایسا بھوک تھی جو کورس کی کتابوں سے ماورا تھی۔ وہ دونوں ڈگریاں حاصل کرنے کے ورپے اس لیے رہتے کہ کہیں اندر وہ ڈاکٹر محمد خاں سے خوفزدہ تھے اور انہیں خوش کرنے کے لیے محنت کرنا چاہتے تھے۔ آفتاب بھائی نے اپنے کمرے میں یہ تختی آویزاں کر رکھی تھی۔

”اپنے باپ کی خاطر“

یہی تختی اُن کی تحریک کا باعث بنی اور وہ L.L.B کر گئے۔

اسی خوف تلے خاں صاحب نے ایم اے اردو کیا۔ پھر اٹنی چلے گئے۔ وہاں فرانسیسی میں ڈپلوما لیا۔ اٹانوی سیکھی۔ اُن کا پڑھنا لکھنا مسلسل تھا۔ لیکن وہ خالی علم کے قائل نہ جوانی میں تھے نہ بڑھاپے میں۔ اُن کے نزدیک علم ہمیشہ نوانوے تلنڈ تہہ کر کے مودب ہو کر اپنا آپ مرشد کو ارپن کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک کوئی اپنی Will سرنڈ نہیں کرتا تربیت یافتہ نہیں ہو سکتا۔ مرشد کا یہی تصور ہر عمر میں اُن کے ساتھ ساتھ رہا حتیٰ کہ مرشد ہی کی تلاش انہیں باباگری میں لے گئی۔ جب وہ اردو بورڈ میں ڈائریکٹر تھے تو اُن کے رفیق کارضیف رامے کے بڑے بھائی رشید احمد چودھری انہیں دھرم پورہ میں بابا فضل شاہ صاحب کے ڈیرے پر لے گئے جہاں سے انہیں بابوں کی فضیلت تربیت انداز زیست کا چسکا پڑ گیا۔ بابوں کی تربیت کا جزو اعظم یہی ہے کہ پہلے انہیں خلق سے علیحدہ کر کے اللہ کی رضا تلاش کرنا ہوتی ہے۔ باباجی اسے مستی پہرہ کہا کرتے تھے۔ جب وہ کسی انسان کے قریب نہ تھے۔ جانوروں پرندوں کے ساتھ حشرات الارض اور

فطرت کی بولی سیکھتے تھے، بھوک پیاس سہتے تھے۔ پھر جب مستی پہرہ مجاہدہ، مشقت، خود اذیتی کا باب ختم ہو جاتا پھر انہیں خلق کی طرف لوٹا دیا جاتا۔ یہی کچھ خاں صاحب کے ساتھ ہوا۔ پہلے وہ اپنے اندر گم ہوئے۔ اندر اندھ کونٹوں میں گرے رہے۔ پھر انہیں خلق کی طرف لوٹا دیا گیا۔

خاں صاحب کے چھ بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ جس طرح آج لوگ نیویارک دیکھے بغیر اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں اسی طرح 1- مزنگ روڈ دیکھے بغیر میں اس کے طلسماتی سحر میں مبتلا ہو گئی۔ خاں صاحب کی سب سے بڑی بہن فرخندہ آپا تھیں۔ دراز قد، کھلے کھلے ہاتھ پاؤں والی گوری چٹی مردانہ وجاہت، لیکن بڑی نرم دل خاتون جو زندگی کو ساری عمر روڈ کرگزارتی رہیں۔ اُن کی آنکھ میں بڑا لحاظ تھا۔ وہ خود بھی رسالہ ”مخزن“ اور ”عصمت“ میں مضمون لکھتی رہی تھیں اور انہوں نے ہی اشفاق احمد کو سیٹی پرنگا کر افسانہ نگاری کی طرف مائل کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں میں اور خاص طور پر عورتوں میں مذموم رسم و رواج اور جہالت پر قلم کاری کیا کرتی تھیں۔ وہابی خیالات کی خاتون تھیں اور تعویذ گنڈے قبر پرستی، مزاروں پر حاضری وغیرہ کو مسلم سوسائٹی کے لیے دیمک کی طرح بگاڑ کی وجہ سمجھتی تھیں۔

آپا فرخندہ کی شادی ڈاکٹر ایوب احمد خاں سے ہوئی تھی جو جنگ اسپین میں شرکت کر کے اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ انہوں نے ایک بڑی بصیرت افروز کتاب بھی لکھی جس میں Zionists کا پول کھولا اور ایسے ایسے سلوگن ایجاد کیے:

Democracy is demon-crazy

Tis sale money and weapons of war

Which corrodes the nations through.

Axe down the curse of usury!

And the world blooms, with you,

Like the beautiful flowers, red and blue.

(The Sages of Ages)

وہ مغربی طاقتوں کا پول کھولنے اور ان کی منافقت سے مشرقی ممالک کو آگاہ کرنے والوں میں بہت پہلے سے واویلا مچا رہے تھے۔ ان ہی کے صاحبزادے جووا احمد خاں ہیں۔ ایوب بھائی آدرشوں سے محبت کرنے والے، لکھنے پڑھنے کی تحریکیں چلانے، اسرائیل کو مسلمانوں کا دشمن سمجھنے والے آدمی تھے۔ جب وہ لندن میں اپنی پڑھائی کے سلسلے میں گئے تو آپا فرخندہ مزنگ روڈ پر منتقل ہو گئیں اور یہیں پر اُن کی بیٹی ناہیدہ اشفاق احمد اور دوسرے بہن بھائیوں کی بہن بن کر چلی۔ اُن سے خاں صاحب کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ ناہیدہ کو شہد سے بیٹھی اور چاند سے پیاری جیسے القاب دے کر خط لکھا کرتے تھے۔ آپا فرخندہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں اور اپنی خوبصورتی کے باعث باپ کی لاڈلی تھیں۔ اُن کے لیے نوکرانیاں مقرر تھیں۔ ڈاکٹر صاحب آپا جی کے لیے لاہور سے Pears کے صابن منگواتے تھے۔ ان کے پیروں کو مساج کے لیے اٹلی سے زیتون کا تیل امپورٹ کیا جاتا۔ ہر قسم کی کولڈ اور Vanishing کریمیں گھر میں آتیں حتیٰ کہ باباجی اپنی ذہانت کے باعث فیسرین کریم بنانے میں کامیاب ہو گئے جو آج بھی مہاسوں، چھائیوں اور دانوں کے لیے

سنگینی جاتی ہے۔ آپاجی کی اولاد میں ڈاکٹر جواد ساجد قابل ذکر ہیں جو نامور مصری ڈاکٹر مگدی کے دستِ راس رہے اور ٹورنٹو بڑے نامور ہارٹ سرجن ہیں۔ ڈاکٹر جواد احمد اس وقت ہارٹ کے سرجن ہیں اور PIC میں CEO ہیں۔ اُس کے کام کی اتنی شہرت ہے کہ اُسے بلال پاکستان بھی مل چکا ہے لیکن اُس کا طرہ امتیاز اُس کے اپنے نزدیک کچھ اور ہے۔

جواد کے آباؤ اجداد کا گاؤں جہان خیل ہے جہاں اُن کی ایک بڑی متبرک درگاہ ہے۔ جہاں خیل ہوشیار پور میں واقع ہے۔ یہ درگاہ سکھوں اور مسلمانوں دونوں کے لیے متبرک ہے۔ ابھی سال بھر پہلے کی بات ہے درگاہ کے سکھ عقیدت مندوں نے جواد کو وہاں مدعو کیا۔ اُس کے ساتھ مل کر درگاہ پر چور چڑھائی۔ جواد کے سر پر پگڑی باندھی۔ عظمیٰ کے سر کو پچا در سے ڈھانپا اور بارڈر تک اُسے چھوڑنے آئے۔ وہ جس فخر سے اُس واقعے کا ذکر کر رہا ہے اُس کے سامنے اُس کی ہارٹ سرجری ماند پڑ جاتی ہے۔

آپا فرخندہ کے بعد آپ فرحت کا نمبر آیا۔ دونوں بہنیں لکھنے پڑھنے کی شوقین تھیں۔ بابا محمد خاں چونکہ آپا فرخندہ کو سبکی بھراولیت بخشے رہے اور آپاجی ہی کی خاطر انہوں نے فیروز آباد کی اس لیے ایک طرح سے دونوں بہنوں میں Sibling جیلسی کا رشتہ قائم ہو گیا جو ساری عمر آپا فرحت کے لیے احساس کمتری کا باعث بنا رہا۔ آپا فرحت حسن میں آپا فرخندہ سے کمتر تھیں۔ اس لیے انہیں گھر پر ہی کلاس سٹیزن سمجھا جاتا تھا لیکن اس درگزی کی وجہ سے اُن میں اصول پرستی اور انصاف طلبی بڑھی اور انہیں پاکستان کی تحریک سے گہری محبت ہو گئی۔ ان ہی آپاجی سے خاں صاحب کا گہرا رشتہ تھا اور وہ بروقت ان کا دم بھلا بنے رہتے۔ دسویں جماعت کے بعد وہ ان ہی کے پاس فیروز پور میں منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے ڈی اے وی کالج میں بڑے مشاعرے مباحثے اور پڑھائی میں توجہ دی۔

آپاجی کے میاں ڈاکٹر عبدالقادر گائے طبیعت آدمی تھے۔ کلینک پر مریضوں کا دم بھلا اور گھر پر آپا فرحت کے کھونٹے سے بندھے رہتے۔ مسلم لیگ کے جلوہوں میں خاں صاحب مائیک پکڑ کر اونچی اونچی تقریریں کرتے۔ آپاجی کو ایک تقریر کے موقع پر قید کر لیا گیا۔ وہ اپنے آدرش کی خاطر خندہ پیشانی سے جیل چلی گئیں۔ یہی پاکستان سے آدرشی محبت دونوں بہن بھائی کو پاکستان ساتھ لے آئی اور اسی کے باعث خاں صاحب نے پورے 39 سال تک شاہ لکھا۔

آپاجی کو اپنے بڑے بیٹے جاوید طارق (جو ان دنوں ہائی نون لیبارٹری کے چیئر مین ہیں) کی بہت فکر تھی۔ جاوید بی اے میں تھا اور پڑھائی سے مکمل طور پر بے پرواہ۔ دائیں بائیں دوستی یارہاشی کا چمکاؤ وقت کا ضیاع اس کے مشغلے تھے۔ آپاجی نے جاوید کو میری شاگردی میں دے دیا۔ میں اُسے زیادہ تر انگریزی پڑھاتی تھی۔ 1951ء میں اشفاق صاحب اٹلی جا چکے تھے اس لیے آپاجی کے پاس آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جاوید جب پڑھنے آتا تو بیشتر وقت اپنا چھوٹا سا کتا ساتھ لے آتا اور نوٹس بنانے کے بجائے صرف زبانی لیکچر سننے پر اکتفا کرتا۔ کتے کو گود میں لے کر پڑھنا اور پھر نائے بھی کرنا اس کا معمول تھا لیکن یہی جاوید آگے چل کر ہائی نون لیبارٹری کا خالق بنا اور میرے بیٹے انیس احمد خاں کو اپنی دامادی میں قبول کیا۔ میں ان دنوں اپنی خالہ فیروزہ کے پاس 60۔ فیروز پور روڈ میں رہتی تھی۔ جاوید اور ناہید جہاں ہی پڑھنے آتے رہے۔

ان دو بہنوں کے بعد آفتاب بھائی کا نمبر آتا ہے۔ وہ چھ فٹ لمبے دبلے پتلے لڑکیوں کی طرح شرمیلے میٹھی

مسکراہٹ اور ہلکی کھلکھلاہٹ والے آدمی تھے۔ وہ کورٹ سے نکلنے کے بعد کبھی کسی کے متعلق تجسس، کھوج نہ لگاتے۔ نسبت جیسے مشاغل سے دور رہتے۔ خاں صاحب کا تعلق جب ایم اے میں مجھ سے پیدا ہوا اور انہوں نے میری تربیت پرورش اور خود اعتمادی کو سہارے دینا چاہے تو آفتاب بھائی اس محبت میں گپ چپ شامل ہو گئے۔ وہ کبھی کبھی پکھری سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج کے سامنے والی میز سے ہو کر اپنے گھر 1- مزنگ روڈ جاتے۔ راستے میں مجھ سے مٹھہ بھیسڑ ہو جاتی اور ایک ہی ملاقات کے بعد انہیں مزید تعارف کی ضرورت نہ رہی۔ میری والدہ کو وہ آچا جان کہتے تھے۔ جب میرا پہلا مضمون Our Men چھپا تو پہلا تعریفی خط ان ہی کا تھا۔ جب خاں صاحب اٹلی پھے گئے اور ہم سمن آباد میں منتقل ہوئے تو آفتاب بھائی اور آ پافرست بھی سمن آباد آدے گئے تھے۔

آفتاب بھائی کے بعد افتخار بھائی اس دنیا میں آئے۔ ان میں بغاوت کا مادہ تھا۔ انہوں نے غالباً اپنے والد صاحب کو چرانے کے لیے پڑھائی اور پوری چھوڑی اور بی اے نہ کیا۔ جب ڈاکٹر محمد خاں اپنے بیٹوں کو مارتے تو یہی بھائیوں کو چھڑاتے۔ سب سے زیادہ انہوں نے خاں صاحب اور اشتیاق کو چھڑایا۔ وہ انوکھا راستہ انوکھی بات انوکھا رویہ اختیار کر کے سب کو چونکا دیتے تھے۔ جب شادی کا مسئلہ چھڑا تو اپنی خالہ کی بڑی بیٹی باجی ضیاء کے ساتھ بیاہ کرنے سے منکر ہو گئے اور چھوٹی بہن آ پی منیر کو دلہن بنا لیا۔ فیسرین کا کہہ والد کی حیاتی میں نہ کیا اور بخش خان کی زمینوں کی دیکھ کر کچھ کرنے چلے گئے۔

افتخار احمد خاں بقول ساری دنیا کے ”ڈیڈی جی“ اور ”نچے لمبے براؤن آنکھوں اور براؤن بالوں والے دیہاتی عادتوں والے ڈیڈی جی بڑے سمن موہن تھے۔ ہر انسان کا چلتے چلتے ہاتوں ہاتوں میں دل چرانے کا فن جانتے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر طارق بن افتخار شکاگو میں بڑے نامور آرٹھرو پیڈک سرجن ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے اشفاق صاحب اور میری وہ تصویریں بنائی ہیں جو آپ ہماری کتابوں کے پچھلے صفحے پر دیکھا کرتے ہیں۔

لیکن بیٹوں کی تعلیم و تربیت کا سہرا ڈیڈی جی کی بیگم آ پی منیر کو جاتا ہے۔ ڈیڈی جی اور اقبال بھائی نے اپنی خالہ کی دو بیٹیوں سے شادی کی، لیکن یہاں بھی تھوڑا سا گھپلا ہوا۔ باجی ضیاء بڑی بہن تھیں۔ انہیں اصولاً افتخار بھائی کی بیگم بنایا جانا چاہیے تھا لیکن دونوں بھائیوں نے دونوں بہنوں میں باجی رضا مندی سے اس طرح شادی کی کہ چھوٹی آ پی منیر تو بڑے بھائی افتخار سے بیاہی گئیں اور باجی ضیاء کی شادی اقبال بھائی سے طے پائی۔ ڈیڈی جی کو بچپن سے کتوں کا شوق کھیتی باڑی سے دلچسپی تھی۔ اس کا آ پی منیر کو دلی قلق تھا۔

خاں صاحب نے روم سے واپسی پر شادی کا ارادہ کر لیا تو اس گم گم شہزادے کا کوئی مددگار 1- مزنگ روڈ میں نہ تھا۔ ان دنوں ڈیڈی جی چلی منزل میں مقیم تھے۔ نہ جانے کیسے انہوں نے بھائی کی مشکل کو بھانپ لیا۔ یا پھر مفتی جی نے انہیں راز داں بنایا۔ وہی میری والدہ تک پہنچے۔ وہی نکاح خواں لائے۔ ان ہی کے دستخط نکاح نامے پر ہوئے۔

455- این سمن آباد میں ہماری شادی بڑی سادگی سے ہوئی۔ میں نے پرانا سفید شلوار قمیض پہنا، خاں صاحب

معمولی کپڑوں والے گرتے میں بیوس تھے۔ مفتی جی، محمد حسین آرنٹ اور ڈیڈی جی براتی تھے۔ ریزی اور محمودہ اصغر میری والدہ سمیت ماٹیکہ والے تھے۔

تہ کوئی ڈھولک بجی نہ کوئی مہندی کی رسم ہی ہوئی۔ نکاح کے بعد خاں صاحب نے اپنی پاس بک میرے ہاتھوں سے چپ چاپ تھما دی۔ اس میں نو سو روپے جمع تھے۔ محمودہ اصغر کی شناخت کا ایک حوالہ خالدہ حسین سے جو اس وقت چھوٹی تھی خالدہ اصغر تھی۔ محمودہ اور خالدہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اصغر صاحب کی صاحب زادیاں تھیں۔

اس شادی کی خبر جب پھیلی تو باباجی نے خاں صاحب کو کچھ نہ کہا۔ البتہ افتخار بھائی اور آپی جی کو گھر سے نکال دیا۔ اپنا بوریا بستر اٹھا کر اپنے بچوں سمیت ڈیڈی جی میری خالہ کے پاس 450- این سمن آباد آ گئے۔ آپی جی بڑی ہمت دینے لگی۔ ماما تھ بھانے والی خاتون تھیں۔ اُن کے بیٹے طارق صاحب رٹ اور عدنان کرینٹ ماڈل سکول میں پڑھتے تھے۔ آپی جی نے بڑی محبت کا ثبوت دیا۔ اپنے بیٹے طارق کو میری گود بٹھا کر گود بھرائی کی رسم ادا کی اور اس طرح طارق بن افتخار میرا متبھی بن گیا۔ یہ بھانے والے لوگ ہیں۔ طارق نے رسم کی لاج رکھی اور آج تک اُس نے اپنے چچا اور میری ایسی عزت اور محبت کا مظاہرہ کیا جو اس رسم کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

کچھ دیر تک ڈیڈی جی اور آپی میری خالہ کے پاس رہے۔ اتنا بڑا حادثہ یا واقعہ رونما ہوا۔ گھر بدری کے باوجود آپی نے ہمت نہ ہاری اور بچوں کو اسی زور شور سے پڑھاتی رہیں جیسے وہ 1- مزنگ روڈ پر کمر بستہ رہتی تھیں۔ میری خالہ بھی بچوں کو حساب پڑھانے میں آپی جی کی مدد کرتی رہیں۔

اور جب کچھ عرصہ بعد قتلِ شفا کی پڑوس میں ڈیڈی جی 427- این ٹاپ میں منتقل ہو گئے تو آپی جی بچوں کی تحیم کی طرف اور بھی مستعد ہو گئیں۔ وہ بچوں کو بڑے جوش و خروش سے پڑھاتیں۔ محبت اپنی جگہ وہ کئے گونے اور ٹھنڈے مارنے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔ میں آپی جی کے اس پہلو سے بہت متاثر تھی۔

میں نے بھی کہیں اندر یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ اولاد ہونے پر خود انہیں تعلیم دوں گی، لیکن ایم اے پاس ہونے کے باوجود معمولی ایف۔ اے پاس آپی میر کا میں مقابلہ نہ کر سکی کیونکہ مجھ میں نہ وہ ڈسپن تھا نہ میں سائنسی علوم ہی سے واقف تھی نہ پڑھانے کے علم سے آگاہ۔ آپی نے بچوں کو علم میں خود کشیل کر دیا۔ میں نے بچوں کے ہوم ورک خود کر کے انہیں اپنے اوپر انحصار کرنے کا طریقہ سکھا دیا۔

اس کی وجہ میری شخصیت کا نقص ہے جس کا علم اب مجھے حاصل ہوا۔ میں خدمت کر کے اپنا جھنڈا بلند کرنا چاہتی ہوں۔ میری شہی مجھے یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتی کہ میں اُس شخص کی فلاح کا سوچ سکوں جس کی مدد کرنے پر میں مصر ہوتی ہوں..... خیر!

میں اور خاں صاحب روز شام کو آپی جی اور ڈیڈی کے گھر جاتے۔ وہاں کھانا کھاتے۔ اُن کی بڑی بیٹی لبتی مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور کبھی کبھی میرے ساتھ سو جاتی تھی۔

مکتر میں اقبال بھائی ایک طور پر باباجی سے بغاوت پر آمادہ رہتے، لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ کبھی بھی مندر منہ بحث کر سکتے۔ افتخار بھائی کی طرح انہیں بھی پڑھائی سے نفرت تھی۔ اقبال بھائی خاں صاحب سے مشابہہ بڑی من موہنی شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کے گرد حسیناؤں کا گھیرا رہتا۔ انہیں لوگوں کی توجہ لینا مشکل نہ تھی۔ گھر کی ماما میں سیلیں مہریاں سب اُن کی بات جندی مان لیتیں۔ سب سے پہلے اُن کے کپڑے ڈھلتے۔ اُن کا بستر جھاڑا جاتا۔ انہیں لسی



ایسی دی جاتی جس میں مکھن کا بیڑا تیرتا۔ اسی وجاہت کے باعث وہ جلد اپنی خالہ زاد باجی ضیاء کی آنکھ کا تارا بن گئے۔

اخلاق بھائی بھائیوں میں ماسٹر ماسٹر تھے۔ انجینئر طبع سوچ اور عمل کے بندے تھے۔ اُن کے متعلق کچھ کہانیاں سب بہن بھائی اپنے اپنے رنگ میں سناتے ہیں۔ مکتسر میں ٹیلی فون صرف ڈاک بنگلے میں تھا۔ یالدهارام کے گھر تھا جو ہندو سینٹھ تھا اور کاشن کا بزنس کرتا تھا۔

حسن اتفاق سے اس ٹیلی فون کی تار باباجی کے گھر سے گزرتی تھی۔ جو بھائی کے دل میں سمائی کہ گھر کے اوپر سے گزرنے والی تار پر ذاتی تار پھینک کر ٹیلی فون اپنے مصرف میں لایا جاسکتا ہے۔ اب ٹیلی فون کی تار کا مسئلہ اٹھا۔ مکتسر سے کوٹ کپورہ سات میل دور تھا۔ وہاں ٹیلی فون کی تار ملنے کے امکانات تھے۔ اس کام کے لیے خاں صاحب کو چنا گیا کیونکہ جو بھائی کا خیال تھا کہ ان کا چہرہ بھولا بھالا ہے۔ کوئی تار کے متعلق سوال جواب نہ کرے گا۔

سکول سے فرار ہو کر خاں صاحب کوٹ کپورہ پہنچے۔ بڑی مشکل سے تار چرائی اور گھر آئے۔ اب جو بھائی نے اوپر گزرنے والی تار پر کاشی مار کر اپنی تار کا Connection لگایا۔ لیکن چرایا ہوا فون اور کھسکائی ہوئی تار کا میاب رہے اور لدھارام کی دکان سے فون مل گیا۔ اب فون پر کپاس کی خرید و فروخت اور روٹی کے بھاؤ آنے لگے۔

اخلاق بھائی نے سوچا کہ بم بنانا چاہیے۔ اس بم کا مصرف کیا ہوگا۔ یہ انہوں نے نہ سوچا۔ ایک طبی سائنسدان کی طرح انہیں صرف بم کی ایجاد سے غرض تھی۔ اب گھریلو بم کے لیے منجھل پناس اور پارے کی ضرورت تھی۔ منجھل پناس تو بازار سے مہیا کی جاسکتی تھی لیکن پارہ کیاب بھی تھا اور اس کے خریدنے کی پسلی بھی نہ تھی۔ سکول میں سائنس لیبارٹری میں قریباً دو سیر پارہ پڑا تھا۔

اب یہ سوچنا تھا کہ پارہ وہاں سے کیسے اُڑایا جائے؟ بڑے بھائیوں سے بات چیت مشکل تھی۔ اشتیاق ابھی چھوٹا اور بے سمجھ تھا۔ طے یہ ہوا کہ خاں صاحب اور کوٹ چکن کر جائیں اور پارہ لیبارٹری کی بوتل سے چرا کر کوٹ کی جیب میں ڈالیں اور گھر لے آئیں۔

جب شقو اور کوٹ چکن کر سکول پہنچے تو سب حیران کہ اتنی گرمی میں یہ کوٹ کیوں؟ بہانہ بھی پہلے تراش کر دیا گیا تھا۔ خاں صاحب نے سب سے کہا کہ ملیریا بخار ہے بہت سردی لگ رہی ہے۔ مشکل سے لیبارٹری تک رسائی ہوئی۔ پارہ کوٹ کی جیب میں ڈال کر چوروں کی طرح باہر نکلے۔

دو ڈھائی سیر پارے کی وجہ سے ایک سائڈ جھکی ہوئی تھی۔ بہر کیف جیسے کیسے پارہ اوپر والے کمرے میں جہاں سائنسی تجربہ گاہ تھی پہنچایا گیا۔ جو بھائی نے منجھل پناس پارہ اور جانے اور کیا اجزاء ملا کر ایک چھوٹا سا تجرباتی بم تیار کر لیا گیا۔ بد قسمتی سے یہاں ہی کبوتروں کی چھوٹی چھوٹی کابکس تھیں۔ ماچس کی خالی ڈبیاں ایک چھوٹا سا بم بنا کر رکھ دیا گیا۔

یہ بھائی مزے لے لے کر غلط انفرمیشن بم پہنچاتے۔ لدھارام علیحدہ پریشان۔ ڈاک بنگلے میں کسی نہ کسی افسر کی آمد کی اطلاع دیتے، کمرے بک کر دیتے، متعلقہ افسر کبھی نہ پہنچ پاتا۔ ڈاک بنگلے کے کارندے بسترے تو لیے تبدیل کرکھانا وانا پکا کر منتظر رہتے۔ یہاں تک تو خیر ذہانت کی چمکار دکھانا مقصود تھا، لیکن ایک اور سائنسی تجربہ خطرناک صورت اختیار کر گیا۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اوپر والی منزل میں چھوٹی چھوٹی کابکس باباجی کے کبوتروں کے لیے تھیں۔ ان میں کبوتر بھی اڑانوں کے بعد سرام کرتے۔ ان کابکوں کو صاف کرنے پر ملازم مامور تھا۔ ججو بھائی کا تجرباتی ہم ایک کابک میں پھنپایا گیا تھا۔ جس وقت طوطی ان کابکوں کو صاف کر رہا تھا تو اس نے ماچس کو گندی چیز سمجھ کر اپنے پیروں سے دوفٹ دیر بیٹھا۔ یوں تو شاید ہم دیر تک پڑا رہتا اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی.....

اب جو اسے زور سے فرش پر دے مارا تو ہم فعال ہو اور اس نے یہ کرتب دکھایا کہ طوطی کے دائیں پاؤں کا انگوٹھا لٹکایا۔ لہو کی دھار ناک تک پہنچی۔ طوطی نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ باباجی کو بچھے پر بھاگے آئے۔ مرہم پٹی کرنے کے بعد بچوں کو لائن اپ کر لیا۔ ایسی قرار واقعی مزاد کی کہ سب کی سٹی گم ہو گئی۔ نانی اماں ہاتھ جوڑتی پھریں۔ اماں جی نے بچوں کی طرف سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگیں لیکن باباجی نہ مانے۔ اوپر کے کمروں تک اٹھنے، اشفاق اور اشتیاق کی سہیلی ہند ہو گئی۔

لیکن اس سزا کا سارا فائدہ بچوں ہی کو پہنچا۔ خاں صاحب اپنی ادبی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور ججو بھائی کو بھی ادبی خمیر لگا دیا۔ تقو پیدا آئی ایتھنیٹ تھے۔ وہ کھیلوں کی طرف راغب ہو گیا اور یوں ان تینوں کو اپنی صلاحیتوں کا سراغ نہ لگایا۔

اشتیاق اپنی فوجی صلاحیتوں کو بھانپ کر فوج میں چلا گیا۔ اٹھن بھائی کو ہوائی جہازوں نے متاثر کیا اور وہ یہ فوج میں بھرتی ہو گئے لیکن جب وہ سکواڈرن لیڈر تھے تو اچانک فوکر کی چھوڑ کر مزنگ روڈ آ بسے۔ واپسی کا چکر ان کی عیادت کی صلاحیت اور اٹھن تھی۔ وہ فیسرین کریم کو نیا Get up اور خوبصورتی عطا کرنا چاہتے تھے۔ اس کا لیبل ماڈرن کرنے کے آرزو مند تھے۔ یہ میری شادی سے بہت پہلے کی باتیں ہیں۔

ججو بھائی یہ جانتے ہوئے بھی کہ باباجی پورے امر ہیں انہوں نے مغربی ممالک کی کریم ساز کمپنیوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان میں نیویا، الزبتھ آرڈن، کی نائیٹ اور وینسنگ کریم پیش پیش تھیں لیکن باباجی پرانے خیالات کے تھے۔ وہ کسی مارکیٹنگ کی خاطر نہ تو فیسرین کی شیشی بدلنا چاہتے تھے اور نہ اس کا لیبل ہی۔ اس دوغلی حکومت میں انجام کاروں کو ہی خوش ہو کر رہ گئے۔

پھر اماں جی سردار نیگم اور اٹھن بھائی کی نیگم ذکیہ جی میں بھی خیالات کے ٹکراؤ کی فضا پیدا ہو گئی۔ مزنگ روڈ میں کسی قسم کا تہوار سا نگرہ عیدیں منانے کا رواج نہ تھا۔ ذکیہ جی نے داصف کی سا نگرہ بڑے دھوم دھڑکے سے منائی۔ باباجی تو خیر شریک ہی نہ ہوئے۔ اماں جی موجود تو رہیں لیکن شریک نہ ہوئیں۔ اس سرد جنگ کے نتیجے میں ججو بھائی نے بوریا بستر بنوا اور مین روڈ پر واقعہ ایک بنگلے میں جا بسے۔

یہاں ایک نئے ماحول میں ججو بھائی نے نیوسما کریم ایجاد کی۔ اس کی مارکیٹنگ کے لیے کوشاں رہے لیکن ایک نیمر مشیت ایزدی بھی ہوا کرتا ہے۔ نیوسما نہ چل سکی۔ ذکیہ جی ایک ایسی با حوصلہ بیوی تھیں جس نے ہر جگہ پر کام میں اٹھنے والی کا ساتھ دیا۔ نیوسما کریم بنانے پیک کرنے میں ساتھ لگی رہی۔

جب نیوسما فیل ہو گئی تو یہ میاں بیوی کینیڈا چلے گئے۔ شادی سے پہلے ذکیہ جی نے ہال روڈ پر واقعہ نگرہ کے

سکول سے سلائی اور کشیدہ کاری کا کورس کیا تھا۔ جب یہ دونوں کینیڈا پہنچے اور روزگار کی تلاش ہوئی تو ذکیہ جی نے اسی کورس کا فائدہ اٹھا کر وہ سلائی کی کہ دہن کا سفید لباس سینے پر جلد ہی مامور ہو گئیں۔ وہاں بھی ججو بھائی نے نیو سیما بنائی، لیکن مقابلہ سخت رہا اور یہ کریم مسابقت کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

بچپن میں خاں صاحب اور تقو اپنے رنگ لیڈر ججو بھائی کے اشاروں پر ناپتے تھے۔ اقبال بھائی کی شرارتوں میں شریک رہتے تھے۔ آفتاب بھائی سے فاصلے پر مودب رہ کر ان کی عزت کیا کرتے تھے۔ ان کی بہنوں نے انہیں گودوں کھلا پاتا تھا۔ ان سے رشتہ چھوٹی امی کا سا تھا۔

بچپن میں جب ان کے کانوں میں پھانوں کی روایات اور رسم و رواج کا چرچا پڑا۔ انہیں معلوم تھا کہ پھانوں کے دو قبیلے ہجرت کر کے پنجاب میں وارد ہوئے تھے۔ نیازی قبیلہ ہوشیار پور میں قیام پذیر ہوا۔ ان میں عمران خاں نے نیازی قبیلہ کا نام روشن کیا۔ یہ لوگ مہمند قبیلے سے زیادہ پڑھے لکھے اور فارغ البال تھے۔ مہمند قبیلے نے جائیداد میں پڑاؤ ڈالا اور ان کی شہرت کا باعث اشفاق احمد بنے۔

باباجی ضلع فیروز پور میں مکتسر آ گئے۔ یہ سکھوں کا ایک مقدس قصبہ ہے۔ ان کے ایک گرو یہاں مقیم رہے۔ مکتسر کے لفظی معنی بکتی کا تالاب ہے۔ امرتسر میں امرت کا تالاب ایک بہت متبرک جگہ مانی جاتی ہے۔ باباجی نے اپنے سارے بچے میونسپل بورڈ سکول میں داخل کروائے لیکن شاید اپنی شناخت کی فکر میں شتو جی کو اسلامیہ دینی مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ یہ سکول مسجد میں قائم تھا۔ یہاں ہی خاں صاحب نے بچپن ہی میں بہت سے دینی مسائل رٹ لیے۔ اس سکول میں نائوں پر بیٹھے۔ قلمیں گھر کے دوایت میں کپڑے کا سوفا وال کرکالی سیاہی بنا کر قلم سے لکھا جاتا۔ خاں صاحب کو تختی پر لکھنا، تختی کو دھو کر گاچنی مل کر صاف کرنے کے لیے سکھانا بڑے تخلیقی عمل لگتے۔

پھر نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر پانچویں جماعت میں خاں صاحب کو بھی انگریزی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ سرکاری سکول میں پہنچتے پہنچتے خاں صاحب کے پاس تقابلی مقابلے کا مواد بجم ہو گیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انگریزی پڑھنے والوں میں ایک خاص قسم کا تمبر تھا اور وہ مقامی لوگوں کو بیچ بکھتے تھے۔ انہیں تجربہ تھا کہ ان کی دانئی مائی کا بیٹا مسجد سکول میں ان کے ساتھ پڑھتا تھا اور اس کی خطاطی بہت خوبصورت تھی اور شتو جی اس سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

خاں صاحب کے گھر میں ایک ملازم بھینسوں کی دیکھ رکھیہ پر مقرر تھا۔ وہ دور سے آتی ہوئی بھینس کو دیکھ کر بتا دیتا کہ بھینس کس کی ہے اور آٹھویں مہینے میں ہے اور اس بار کفادے گی۔ پھر جب اگلے مہینے بھینس تقادتی اور اس کی پیشانی پر ویسا ہی سفید داغ ہوتا جس کی پیش گوئی ملازم کر چکا ہوتا، تو شتو جی حیران نہ ہوتے۔

بادلوں کو دیکھ کر بارش کے متعلق جو کچھ ملازم بتاتے عموماً ٹھیک نکلتا۔ چھوٹی عمر میں خاں صاحب اس حقیقت سے دوچار ہو گئے کہ پڑھے لکھوں کا علم اپنی جگہ لیکن دانش و فراست میں تجربے اور زندگی سے سیکھنے کے عمل میں ان پڑھ بھی اپنا ایک جداگانہ علم اور مقام رکھتے ہیں۔

دسویں مکتسر سے کرنے کے بعد خاں صاحب اپنی بہن آپا فرحت کے پاس فیروز پور چلے گئے۔ یہاں پر آپا جی کے شوہر ڈاکٹر عبدالقادر پرائیویٹ پریکٹس کرتے تھے۔ شروع میں تو ان کی فیس چار آنے تھی اور پریکٹس میں بڑی دقت

لیکن رفتہ رفتہ ان کی انسان دوستی اور اخلاق نے رنگ دکھایا۔ ڈاکٹری کا دھندا چھل نکلا۔

خاں صاحب کو فیروز پور میں رام سکھ داس کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں ان کی نصابی کارکردگی تو نہ چمکی لیکن یہ غیر معمولی جامہ زیبی، طرح داری کی وجہ سے ہم جماعت طالب علموں میں ان کا نام ابھرنے لگا۔ ان ہی دنوں ان میں ستر مگروٹ لے کر بیدار ہوا جو پھر نثر کی طرف مڑ گیا اور پھر لمبا چکر کاٹ کر اردو بورڈ سے ریٹائرمنٹ کے بعد پنجابی تھیں کی شکل میں بیدار ہوا۔ وہ شاعری جو رام سکھ داس کالج میں جاگی اور ساری جوانی سلپنگ بیوٹی کی طرح سوئی رہی، بھرنے لے کر ”کھلیا دینا“ کی شکل میں دوبارہ بیدار ہوئی۔

سنا ہے جب وہ بنی اسے میں تھے تو کالج میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ خاں صاحب کالی شنوار قمیض میں کمر بھون پر پہنچے اور اپنی غزل پڑھ کر مشاعرہ ٹوٹ لیا۔ اس غزل کا ایک شعر جو سارے کالج میں زبان زد عام ہوا یہ تھا:

ع کہکشاں بن گئی ہررا ہند آج کی رات

لیکن گورنمنٹ کالج پہنچ کر جو کچھ ہوا وہ تو آپ تک بولے بولے ہی پہنچ پائے گا۔

تقو بیچو رہ نہ تین میں تھا نہ تیرہ میں۔ بڑے بھائیوں کا ٹولہ اسے قابل اہتانا نہ سمجھتا تھا۔ اٹل بھائی اور شتو جی سے ساتھ ساتھ لیے پھرتے لیکن اس کی حالت کتنی برادر کی سی تھی۔ دراصل خاں صاحب اور تقو کے درمیان ایک بیٹا اور بیٹی باباجی کو عطا ہوا تھا۔ وہ دو سال کا ہو کر اللہ کو پیارا ہوا۔ اس کا کے کواشتیاق ”کالی بھونڈی“ کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ خاں صاحب پورے چار سال تقو سے بڑے تھے۔ وہ اور جو بھائی تقو کو ساتھ ساتھ رکھتے لیکن جب وہ صبح کو کلاس کے تالاب میں نہانے جاتے تو تقو کو سونا چھوڑ جاتے۔

تقو کو اس بے وفائی پر بہت ملال تھا۔ وہ خاں صاحب سے ساتھ سو یا کرتا تھا۔ تقو نے ہانا خرید کر کیس سوچی کہ رات کو اس وقت تک جاگتا رہتا جب تک شتو جی سو نہ جاتے۔ پھر وہ مال آہستگی سے اپنا آزار بند خاں صاحب کے کمر بند سے باندھ دیتا۔ شتو جی جب تانا ب پر جانے کے لیے اٹھتے تو آزار بند کی کھینچ پڑتے ہی تقو جاگ جاتا۔

اب بڑے بھائی تقو کو ساتھ لے جانے پر متامل ہوتے لیکن تقو وہمکنی دیتا کہ اگر مجھے ساتھ نہیں لے جائیں گے تو میں باباجی کو جگا دوں گا۔ مارے باندھے تقو کو ساتھ لے جانے لگے اور بہت جلد تقو ان دونوں سے بہتر تیراک بن گیا۔

یوں تو ہر شخص پر بچپن کی چھاپ بھری ہوا کرتی ہے لیکن خاں صاحب اپنے اس آبائی وطن کو کبھی نہ بھولے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ کہیں اور پردہاں چڑھے ہوتے تو شاید ان کی تخلیقی قوتوں کو یوں پنپنے کا موقع نہ ملتا۔ وہ ساری عمر اپنے اسی بچپن کی شکرگزاری میں مبتلا رہے جس نے انہیں کچھ باتیں ذہن نشین کرا دیں۔

وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ بچپن میں عام انسان کے اس قدر قریب نہ رہے ہوتے تو وہ کبھی سمجھ نہ پاتے کہ غریب آدمی کا بنیادی مسئلہ ضروریات زندگی کی فراہمی ضرور ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ ”عزت نفس“ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر عام آدمی کو روٹی، کپڑا اور مکان میسر آ جاتا ہے لیکن وہاں عزت نفس نہیں ملتی تو وہ بظاہر زندہ رہتا ہے لیکن اندر سے مر جاتا ہے۔

ان کا یقین کامل تھا کہ پاکستان کا خواب دراصل اسی خواہش کی تکمیل کے لیے دیکھا گیا تھا کیونکہ 1947ء سے پہلے اوپچی ذات کا ہندو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک ہندوستان کی باقی ساری جاتیں شور

تھیں۔ مسلمان تو خاص طور پر ایسے پیچھے تھے جن کے برتنوں میں کھانا پینا اپنا مذہب بھرشت کرنے کے مترادف تھا۔ ہر حکومت، تحریک، سیاست کا بنیادی مسئلہ دراصل عزت نفس کی بحالی ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب نعرہ بازی ہے۔ پتہ نہیں وہ اپنے نظریے میں حق بجانب تھے بھی یا نہیں؟

ان آٹھ بہن بھائیوں کے ساتھ آپا فرخندہ کی سب سے بڑی بیٹی ناہید بھی مزنگ روڈ میں ہی پلی بڑھی اور پروان جڑھی۔ خاں صاحب اُس سے بہت محبت کرتے تھے۔ ناہید کی شادی جہلم میں پرائمری گلاس فیکٹری کے سانچے مالک رشید احمد خاں سے ہوئی۔ اُس کے چار بچے ہیں۔ بڑی بیٹی ربیعہ بڑی صالح روح ہے۔ وہ عورت کی نو حاصل کردہ آزادی اور مذہب کی حدود کے امتزاج کو معتدل سے سمجھ گئی ہے۔ حجاب بھی پہنتی ہے اور جہلم میں انگریزی میڈیم سکول کی منتظم بھی ہے۔ گاڑی بھی چلاتی ہے۔ اے لیون اولیوں کی تیاری بھی کراتی ہے لیکن آزادی کے ہمراہ بے راہ روی کو اپنے اُد پر جائز نہیں سمجھتی۔

ایک بیٹی ثانیہ جو ماں کی طرح آرٹسٹ نکلی۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ کینیڈا چا بسی۔ مغربی ماحول نے اُسے صیقل کیا۔ وہ اپنی تصویروں کی نمائش لگاتی ہے۔ فرانس جرمنی جا کر اُس نے اپنے کام کی بدولت بڑا نام پیدا کر لیا ہے۔ ایک بیٹا میمون رشید اور اُس کی من موہنی بیوی از کالاکاہور میں سینٹل ہو گئے ہیں اور بڑی خاموشی سے ایک بڑی کمپنی کے کرتا دھرتا ہیں۔

لیکن ناہید کی اصل وجہ شہرت ڈاکٹر حسنا احمد خاں ہیں جو غالباً آج کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حسنا اور ڈیانا کی محبت اب پبلک پراپرٹی ہے۔ اس پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کئی پروگرام ٹیلی ویژن پر بھی آچکے ہیں جن میں ایک انٹرویو خاں صاحب کا بھی بڑی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

میں نے تعارف کے طور پر آپ کو خاں صاحب کے گھر والوں سے ملا دیا ہے۔ اس گھر میں جا بجا چراغ، فانوس، شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ خاں صاحب کے علاوہ اس گھرانے میں طارق بن افتخار جیسے قابل سرجن ہیں جو انٹرنیشنل فوٹو گرافر بھی ہیں۔

جس طرح جواد ساجد نے آپا فرخندہ اور ڈاکٹر ایوب کا نام روشن کیا اور جیسے آپا فرحت کے بیٹے جاوید نے دو ایوں کی دنیا میں تہلکہ مچایا ایسے ہی ڈاکٹر طارق بن افتخار نے بڑی انٹرنیشنل شہرت پائی ہے۔ دو سال پہلے جب باغ میں زلزلہ آیا تو طارق اپنے ساتھ کچھ امریکی سینٹر لے کر باغ پہنچا۔ سینٹر تو رفاہی کاموں میں مصروف ہو گئے لیکن طارق نے ان گنت ہڈیاں جوڑیں..... لیکن خاندان میں اس کا چرچا نہ کیا۔ وہ کامیاب بھی ہے اور بڑا انسان بھی..... یہ دونوں خوبیاں ایک ہی انسان میں کم ہوتی ہیں۔

اور پھر حسنا ہے۔ وہ بھی بنیادی طور پر بچوں کے دل کا آپریشن کرتا ہے اور لندن میں اُس کی شہرت کا ڈنکا بجتا

ہے۔

میں نے خاں صاحب کے خاندان اور اُن کے چیدہ چیدہ مشہور آدمیوں کو آپ سے اس لیے روشناس کرایا ہے

تشتقی ان لوگوں کی محبت میں گندھے ہوئے تھے۔

اشفاق صاحب نے دنیا کمائی تو بیوی بچوں کے لیے لیکن یقین جاننے وہ دنیا سے وابستہ نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ  
صفت کی علام گردشوں میں پھرتے رہے۔ ایک مدت انہوں نے رشتے ناٹوں کو اپنا سرمایہ سمجھا۔ خاں صاحب کو سمجھنے کے  
سے اس وقت بھی یہ دھاگے ہاتھ سے چھوڑے نہیں جاسکتے۔ گو آخر میں غالباً وہ بھی جان گئے تھے یہ سب بتان و ہم وگماں  
یہ ہرآن کی تلاش کا راستہ اور جانب چاٹھا تھا لیکن ان رشتوں کی اہمیت کو سمجھے بغیر ایک قاری اشفاق احمد کی تصویر میں لگی  
ہے گراؤ نڈ کو نہیں سمجھ سکتا!

اسی لیے میں نے ان کا شجرہ نسب بھی ساتھ منتقلی کر دیا ہے کیونکہ یہ نام یہ رشتے چاہجائیں گے، کبھی کبھی تو اتر کا  
بھی دو ہرانی بات دو بارہ بیان کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن کیا کیا جائے زندگی ہمیشہ سیدھی لائن کا سفر نہیں کرتی۔  
کبھی اس کا سفر دائرے کا بھی ہوتا ہے۔

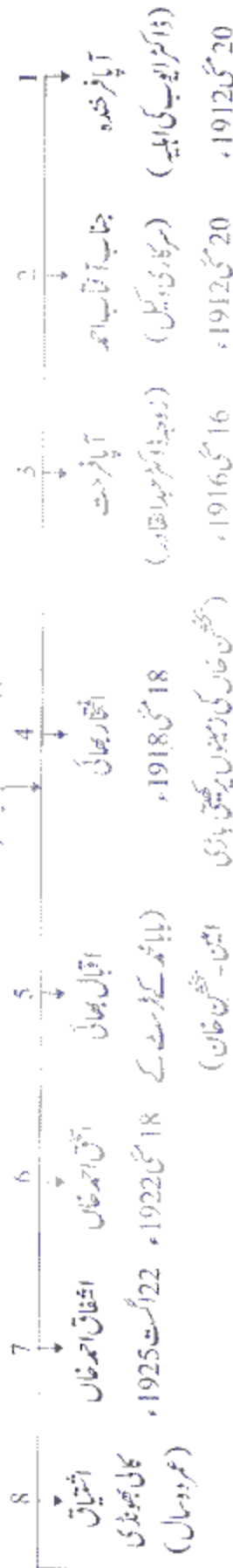


محمد مستقیم خاں (ہجرت کر کے آنے والے)

محمد معظم خاں

دوست محمد خاں

بابا محمد خاں + بی بی سردار بیگم



جلوید طارق خاں  
اقبال بھائی کے ہم عمر ڈاکٹر طارق بن  
افتخار سر جنس کے والد

ندیم کی والدہ

ریٹائرڈ بریگیڈیئر اشتیاق احمد خاں  
(کوٹکا بندر) 1929ء

جلوید طارق خاں ہائی ٹون لیبارٹری  
اشتیاق صاحب کے ہم عمر

ٹولید مشین سے جناب ایس احمد خاں کی شادی ہوئی

## لیڈی میکلیگن کالج سے ساندہ کلاں تک

قیام پاکستان کے بعد لفظ ابھی ایسی باتوں سے جو جمل تھی جن سے مسلمانوں کے نا آسورہ سوالات اُن کی بے چارگی کی کہانیاں اور چھوڑے ہوئے گھروں کے Nostalgia کی خوشبو آتی تھی۔ کچھ لوگ بہادر تھے جو جملہ قربانیوں کو اس ملک کے قیام کے مقابلہ میں بیچ سکتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنہیں پچھلے گھر آبائی وطن وہاں کے موسم، رہن بہن، دوست و احباب بھولنے نہ بھولتے تھے۔ وہ پاکستان میں رہتے ہوئے یہاں کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کے باوجود سداہن پانی کے پودے کی طرح سسکتے رہتے۔ کچھ ایسے لوگ تھے جو ابھی مین مین چل رہے تھے۔ کبھی نئے وطن کی عافیت اور راحت کے شکر گزار ہوتے، کبھی پچھلی یادوں میں ڈوب کر گلہ گزار رہن جاتے۔

کئی پشتوں سے اشفاق صاحب کا گھرانہ تعزیم یافتہ اور سیاست سے وابستہ رہا تھا۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپا فرحت نے جدوجہد پاکستان میں برا عملی حصہ لیا تھا۔ تقریریں کی تھیں۔ قائد اعظم کے موقف کو پاکستان کی اہمیت کو لوگوں تک پہنچانے میں ریزہوں پر چڑھ چڑھ کر مخاطب کیا تھا اور اس کے نتیجے میں جیل بھی جھگنی تھی۔

جب لوگ نعرے لگاتے ”پاکستان کا مطلب کیا؟“

تو خاں صاحب اُن کے ساتھ مل کر جواب دیتے ”الاء الا اللہ“

پھر وہ مجمع کو دونوں ہاتھوں سے شانت کرتے اور اپنی تقریر کرتے جس میں ایک ہی بات پر زور ہوتا کہ پاکستان میں لوگ وسائل کے حصول کے لیے دیوانہ وار نہیں بھاگیں گے۔ چونکہ معاشرہ اسلامی اقدار پر قائم ہوگا اس لیے انصاف کی بنیاد پر قائم کیا جائے گا، لیکن سب سے بڑی بات پاکستان میں یہ ہوگی کہ اس دلیں میں سب کی عزت نفس محفوظ ہوگی۔ وہ ذلت جو ہندو اکثریت کے ہاتھوں مسلمانوں کا نصیب تھی اب ایسی ذلت سے کوئی مسلمان دوچار نہیں ہوگا۔

وہ جانتے تھے کہ قائد اعظم نے جداگانہ حق خود ارادیت کے لیے بہت کوشش کی۔ وہ صرف اس قدر چاہتے تھے کہ جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں سے اُن ہی کا نمائندہ منتخب کیا جائے۔ پنڈت نہرو چودہ نکات پر مشتمل دستاویز پر کئی طور پر متفق تھے لیکن پھر اسی سے منکر ہو گئے..... قائد اعظم نہ دھرنہ مارتے تھے نہ جھگڑا کرنے کے قائل تھے نہ



جیل جا کر وقت ضائع کرنے کے ہی شوقین تھے۔ انہیں آئینی جنگ جیتنے کا خیال رہتا۔ انہوں نے مسلمان اقلیت کو ایک نئے ملک کا سندیسہ دیا جس میں جا کر یہی اقلیت راتوں رات اکثریت میں بدل جائے گی۔

خاں صاحب پر قائد اعظم کی تعلیمات اور ترغیبات کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر نہ کبھی دھرنا اختیار کیا نہ باواز بلند احتجاج کیا نہ کبھی اپنے قلم کو مزاحمتی ادب کی طرف راغب کیا۔ وہ اپنے میں تو انانی، تقویت خود ارادیت اور لگن پیدا کرتے اور بڑی ثابت قدمی سے استقامت کے ساتھ منزل کی طرف چلتے رہتے۔

اُن کا ہیرو گاندھی نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی سوال کرتے کہ مہاتما گاندھی تو فلسفہ عدم تشدد کے پیروکار تھے۔ اُن کے چاہنے والوں نے سرکار انگلیہ کی لائیں کھائیں، آنسو گیس کے ہاتھوں روئے، لیکن پلٹ کر ایک پتھر ریزا بھی ان مظالم توڑنے والوں پر نہیں پھینکا۔ پھر یہی ہندو جٹا جس کا ”ابسا“ پر چارک مسلک تھا، مسلمانوں کے خون سے کیوں داغ دار ہوا؟ ان کے ہاتھوں مسلمان خواتین کی عصمتیں کیوں واغدار ہوئیں؟ بہار کے مسلمانوں پر جب تشدد ہوا تو مہاتما گاندھی نے زبان کیوں نہ کھولی؟ وہ بہار کے مسلمانوں کی دلجوئی کے لیے کیوں نہ پہنچے؟ اس معاملے میں اُن کا فلسفہ عدم تشدد کیوں خاموش رہا؟ پھر جب ہندو جو اہل عمل نہرو اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں خود جا کر کشمیر یوں کا حق ارادیت مان آئے تھے تو پھر ہندوستان نے اس وعدے کا پاس کیوں نہ کیا؟ شیخ عبداللہ کو میر جعفر کا جیتا جاگتا روپ دے کر اسے کشمیر پر مسلط کیوں کیا؟ کشمیر یوں کی جنگ آزادی کو بغاوت کا نام دے کر اس پر فوج کشی کیوں کی؟ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے سباز باز کر کے گوروا سپور کا علاقہ جہاں مسلم اکثریت تھی ہندوستان کے حوالے کیسے کر دیا؟

گلی کوچوں میں واٹن کیمپ میں جہاں جہاں ریفوجی پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے، کہانیاں خون آشام تفصیل سے واغدار گھوم پھر رہی تھیں۔ تیج بہادر سپرو مظہر علی خاں، علی برادران، حسرت موہانی ابھی زندہ ہیرو تھے، لیکن اس آدرشی گفتگو کے ساتھ دنیاوی مسائل حل کرنے کی ضرورت بھی بہت اہم تھی۔ مقامی انصار کی ہر جوش مددنا کافی تھی۔ لوگ مال غنیمت سمیٹنے لگے تو زلے گھروں پر نجانا قبضہ جانے کا شعار بھی اپنائے ہوئے تھے۔ روزگار کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ حکومت ابھی استوار نہ ہوئی تھی۔ روزمرہ کے مسائل ماوی ضرورتیں، صبح وشام کے مسائل بھولے نہ بھولتے۔

اسی فضا میں جو تضاد تھا، نیکی اور ہمدردی کی جو آمیزش تھی، گندے اور صاف لہو کا بیک وقت دل میں رہنے سے جو آری ہر وقت لوگوں کے اندر چلتی تھی، اس سے خاں صاحب بھی مستثنیٰ نہ تھے۔

خاں صاحب کا خاندان لٹا لٹا پانچ پانچا۔ باباجی اس چھوٹے سے قافلے کے سربراہ تھے۔ باباجی کے چھ بیٹے اور دونوں بیٹیاں ساتھ تھیں۔ بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اتنے سارے لوگ کہاں سے کھائیں گے؟ کہاں سوئیں گے؟ ایسے میں یہ لوگ یہ سارا لاؤشکر ماڈل ٹاؤن پہنچا۔

یہاں 96- ڈی ماڈل ٹاؤن میں اماں جی سردار بیگم کی بہن رشیدہ بیگم کے ساتھ رہتی تھیں۔ اُن کے شوہر بھائی فیاض پولیس میں آئی جی تھے۔ ماسی رشیدہ کا رشتہ گو بہن کا تھا، لیکن ماسی رشیدہ ہمیشہ اماں جی کو اپنی ماں جانی سمجھتی تھیں۔ ثانی اماں جو باباجی کے قافلے کے ساتھ آئی تھیں، عجیب صابر شا کر عورت تھیں۔ انہوں نے کبھی زندگی سے کوئی توقعات وابستہ نہ کی تھیں۔ عین جوانی میں اُن کا شوہر ایک گائے کو ساتھ لے کر کوئٹہ چلا گیا، لیکن انہوں نے کبھی شوہر کے خلاف

تو نے نہ کھولی۔ آپا فرخندہ کے شوہر ڈاکٹر ایوب احمد خاں لندن میں تھے اور آپا جی نے کبھی نہ پوچھا تھا کہ اُن کی واپسی کب ہوگی؟ بھائی ایوب ایف آرسی ایس کرنے کی غرض سے لندن گئے تھے لیکن وہاں سے وہ ہسپانیہ کی جنگ آزادی میں بھرتی ہوئے لیکن آپا فرخندہ نے کبھی کوئی سوال نہ اپنے سے نہ کسی سے پوچھا۔ آپا فرحت کے شوہر ڈاکٹر عبدالقادر ان دنوں سہیل میں تھے اور وہیں آپا فرحت بھی چلی گئیں۔

کچھ دیر تو اماں جی اپنے کنبے کے ساتھ ماڈل ٹاؤن میں رہیں، لیکن پھر انہیں پتہ چلا کہ موج دریا کے قریب ’گٹ روڈ پر ایک ڈھنڈا رہتا تھا۔ کئی اس کاوانی وارث نہیں۔ اس وقت جب لوگ بوٹھوں کے تالے توڑ رہے تھے یہ لوگ 1۔ مزنگ روڈ پہنچے جس کے سارے دروازے کھڑکیاں چوہٹ کھلے تھے۔ اینٹیں جا بجا بکھری تھیں۔ پانی کے ٹل سوکھے اور بجلی کے میٹر غائب تھے۔ ایسے میں یہ لٹا پٹا کتبہ یہاں پڑاؤ ڈالنے پر مجبور تھا۔ حالانکہ رشتہ داروں نے بڑی پر تہمت لگائی کہ انٹیس یہاں سے ایک سیف ملا جس میں لاکھوں کی نقدی تھی، لیکن افواہ گمان اور شک تو مشرقی سوشلزم کا ضمیر ہیں۔ ہر لوگ ان ہی تین جذبوں کے تحت اخبار بینی کا شوق پالتے ہیں اور نسبت کے چسکے لیتے ہیں۔

آفتاب بھائی سرکاری وکیل تھے، لیکن ابھی ان کا پگھری سے رابطہ استوار نہ ہوا تھا۔ اقبال بھائی نے بانڈی روٹی چرانے کے لیے ایک انوکھا روزگار تلاش کیا۔ وہ بکر منڈی سے بکرا خریدتے اسے اپنے مضبوط کندھوں پر سوار کرتے۔ دن بھر اسے بیچنے کے لیے گاہک تلاش کرتے اور پھر جب بکرا بک جاتا تو پیسے اماں جی کی ہتھیلی پر لا کر رکھتے۔ ان کی اس ترکیب سے سب کو روٹی میسر آ جاتی۔ باباجی روز صبح اتار کلی جاتے۔ یہاں بیلی رام کی دکان تھی۔ اس تا جر بیچنے نے باباجی سے بہت دھار لے رکھا تھا۔ باباجی کی آرزو تھی کہ کچھ رقم انہیں مل جائے لیکن دکان بند تھی اور ادھار ملنے کے کوئی آثار نہ تھے۔

کھکو بھائی جنہیں سب ڈیلر جی کہتے تھے، ادھر ادھر نوکری تلاش کرنے کی بے سود کوشش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ”داستان گو“ کے دفتر سے بھی چھٹی لی جائے اور بخش خاں جا کر باباجی کی زمینوں کی جمع بندی پر توجہ دی جائے اور اس اراضی سے جو روپیہ حاصل ہو اسے خاندان کی بھائی میں لگایا جائے، لیکن ابھی یہ سیم بھی سرے نہ چڑھ سکی اور وہ بے کار صورت گھر والوں پر بوجھ بنے رہے۔

اشتقاق سب سے چھوٹا تھا۔ اُس سے کوئی توقع نہ کی جاسکتی تھی لیکن اُس نے کشمیر فرنٹ پر جانے کا پروگرام بنالیا۔ اماں جی اندرونی زخموں سے نہ حال تھیں اور ویسے بھی ”تقو“ چھوٹا ہونے کے ناطے انہیں سب سے پیارا تھا لیکن جب مسلمان ماٹیس بچوں کو جہادنی سبیل اللہ سے نہ روکتی تھیں۔ یہ جہاد نفس کی شکل میں ہوتا یا کسی فرد یا معاشرے کے حقوق بحال کرنے کے لیے پیش آتا، بخوشی اجازت مل جاتی۔ اسی جذبے کے تحت تقو آزاد کشمیر سدھارا اور غازی بن کر لوٹا۔

خاں صاحب کی مشکل اُس وقت سامنے آئی جب وہ متواتر محکمہ روزگار کے دفتر جاتے اور ناکام لوٹتے۔ ایک روز خاں صاحب نے وہاں ایک مہربان صورت کھرک سے پوچھا ”بھائی! میں روز آتا ہوں۔ آپ بغیر کسی وعدے کے لوٹا دیتے ہیں۔ آخر وجد کیا ہے؟“

کھرک تھوڑی دیر زیر لب مسکرایا۔ پھر بولا ”جناب! آپ کے پاس بی اے کی ڈگری ہے اور ہمیں دسویں پاس دیکھا ہے۔ بی اے پاس نتمین میں نہ تیرہ میں.....“

”یہ تو آسان سا مسئلہ تھا۔ آپ میری دسویں کی ڈگری رکھ لیں اور مجھے نوکری دے دیں۔“

کھرک بادشاہ نے خاں صاحب کو والٹن کیمپ میں جو نیئر کلرک کی آفر دی۔ اُن کی تنخواہ 65 روپے ماہانہ تھی۔ انہیں والٹن کیمپ میں مائیکروفون پر گم شدہ رشتہ داروں کے پیغامات بے گھروں گم شدہ لوگوں تک براڈ کاسٹ کرنا تھے۔ خاں صاحب صبح ایک پوٹلی میں دو روٹیاں اچا ریا کچھ بچا کچھا سالن لے جاتے اور رات تک اس پر گزارہ کرتے۔ کچھ راستہ تو بس لے جاتی۔ باقی وہ پیدل چلتے۔ نہ کبھی وہ کوئی حرف شکایت منہ پر لائے نہ کبھی اپنی Contribution بی پریشانی ماری۔ اس طرح کی شیخی اُن کے گھر میں حرفِ ممنوع تھی۔

یہیں انہیں ممتاز مفتی نے جو اس یونٹ کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ مہاجروں کی مشکلات کو رقم کرتے ان کے حل تلاش کرتے اور ہر روز افسران بالا کو رپورٹ کرتے۔ مفتی جی اور خاں صاحب کی دوستی Instant کافی کی طرح تھی..... فوراً تیار۔ فوراً استعمال کے قابل.....

دونوں ادیب تھے۔ دونوں لوگوں کے ہمدرد تھے۔ دونوں کو عادت تھی کہ توجہ کی سرچ لائٹ اپنے تک نہ آنے دیتے۔

میری والدہ بھائی پر ویز چھٹھ اور میں گورداسپور سے ہجرت کر کے لاہور پہنچے تھے۔ ہمارے دل میں گورداسپور چھوڑنے کا برا قلق تھا۔ کیونکہ ہم اطمینان سے اس امید پر بیٹھے تھے کہ گورداسپور مسلم اکثریت کا علاقہ ہے یہ تو یقیناً پاکستان کا حصہ بنے گا، لیکن سیاسی جھوٹ تو سیاست کا ناگزیر حصہ ہوا کرتے ہیں۔ اصل حقیقت برسوں بعد چھان پھٹک کر سامنے آتی ہے جب اس سچ کا فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔

گورداسپور میں ہمارا گھر اُس سڑک پر واقع تھا جو پتین کی طرف جاتی تھی۔ اُس گھر کا کالا پھانک عین سڑک پر کھلتا۔ پھر بائیں جانب چھوٹا سا کچن گاڑڈن تھا جس میں پودینہ دھنیا، گاجریں، کھیرے اور دو چادر بونے بیر یوں کے نظر آتے۔ دوسری طرف ایک لیٹرین اور اُجاڑ صورت جگہ تھی جس کی دیکھ کر کبھی کے نیے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ دونوں بانچوں میں لمباراستہ آگے چل کر ایک ڈیوڑھی میں کھلتا جس کے آگے پھر پھانک تھا اور اس کے دائیں بائیں دو کمرے تھے۔

ایک کمرہ تو ملازموں کے لیے مختص تھا اور دائیں جانب مہمان خانہ تصور کیا جاتا۔ اس کے بعد ایک کھانا کھن تھا جس میں بائیں ہاتھ ہادر پی خانہ تھا جس میں ہمارا خانساں چرائغ دین کام کرتا تھا۔ وہ عادتاً کام چور اور ویسے بھی چور تھا۔ تمام مراعات ملنے کے باوجود وہ ہیرا پھیری سے باز نہ آتا۔ ایک روز جب اُسے میری والدہ نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو وہ طیش میں آ کر بولیں ”چرائغ! میں بیوہ ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے بچے پالے ہیں۔ میری دعا تو پتہ نہیں لگتی ہے کہ نہیں لیکن میری بددعا تمہیں ضرور لگے گی۔“

جب ہم لیڈی میٹکلیکن میں مقیم تھے تو ایک دن میری والدہ کو چرائغ مانگتا ہوا انارکلی میں ملا۔ میری والدہ کو پہچان کر بولا ”بی بی جی..... یہ میری آنکھیں نہیں گئیں آپ کی بددعا لگی ہے..... دیکھتی ہیں.....“

میری امی کئی دن پشیمان صورت پھرتی رہیں لیکن یہ بھی نیک لوگوں کے عمل کا ایک خاص منفی قسم کا اجر ہے۔

تو میں آپ کو گورداسپور کے گھر کے متعلق بتا رہی تھی۔ باورچی خانے اور صحن کے عین سامنے تین بڑے کشادہ کمرے غسالخانوں سمیت بنے تھے۔ ایک میں میری والدہ اور میں رہتے تھے اور دوسرے کمرے میں میرا بھائی ریزی رہا کرتا تھا۔ لاہور میں جس روز بی بی متھس کے اے کورس کا پرچہ تھا کنیئر ڈی کالج کے پچھواڑے آگ لگ گئی۔ ممتحن اعلیٰ نے سرکاری لڑکیوں سے پرچے اکٹھے کیے۔ ہمیں ایف سی کالج پہنچایا اور وہیں ہم کنیئر ڈی لڑکیوں نے باقی پرچے دیئے۔ امتحان کے گزرتے اور ریزی افراتفری میں گورداسپور پہنچے۔ امی انسپکس آف سکولز تھیں، لیکن حالات کے پیش نظر انہوں نے کچھ دیر کے لیے دورے منسوخ کر دیئے تھے۔

گورداسپور ہندوستان کا حصہ بن گیا۔ ہندو اکثریت و کشمیر تک راہداری مل گئی۔ گورداسپور کی مسلم آبادی جان بچاتی کروہ درگروہ تین کی طرف جانے لگی۔ میرے بھائی کے دل میں پاکستان کے تصور سے عمیق محبت تھی۔ ایک روز اُس نے باہر جانے کے لیے ہاؤسنگ کا ایٹ کھولا تو چند بے آسرا غریب لوگوں کو کئی تواریں سے قتل کرنے کے غزم میں چند سکھ ٹوٹ پڑے۔ ریزی نے پچانک کھوں کر ان چند نفوس کو اندر دھکیلا اور گیت لاک کر دیا۔ ریزی کی یہ عملی مدد اُس وقت بھی جاری رہی جب ہم عافیت کے ساتھ لاہور پہنچ چکے تھے۔ وہ قاتلوں کی مدد کرنے کے لیے ہسپتال پر آیا کرتا۔ جو کچھ اُس سے سن رہتی کرتا۔ اُس وقت جب سب لوگ جان بچانے کی فکر میں تھے یوں جان بچانے پر رکھ کر قاتلوں کے ساتھ آنے جانے کی ہم وفا میں نے صرف ریزی میں دیکھی۔ وہ سی طرح جان چھڑکنے والوں میں شمار ہوا کرتا تھا۔

گورداسپور اب ہمارا گھر ایک طرح سے ریفریجی کیپ بن گیا۔ ان لوگوں میں ایک زینب تھی جو پیالہ کے کسی تحصیلدار کی بیوی تھی اور جو بہت بعد میں کئی برس ہمارے گھر کھانا پکانے پر مامور رہی۔ اُس کے ساتھ اُس کا چھوٹا سا بیٹا نانو تھا اور جب میں 24۔ انیس کینال میں تھی تو یہی راجو میرے ساتھ کالج جایا کرتا تھا۔

شاید ہم تین والے گھر سے نکلنے کا نہ سوچتے اگر ایک واقعہ نہ ہو جاتا۔ ہمارے گھر سے عین ملحق بائیں جانب ایک کھلی سی گراؤنڈ اور آرمی افسروں کی چند بیرکیں تھیں۔ یہاں اُن دنوں رونق تھی۔ پریڈ کی آواز بھی آتی تھی اور رنگ بھی بجا کرتا تھا۔ ایک روز چراغ لہبا سا چہرے کر میری والدہ کے پاس آیا ”بی بی! ایک بات ہے.... اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ آپ یوریا ہسپتال میں اور لہور چلیں۔“

”کیوں وجہ.....“

”وجہ یہ ہے بی بی.....“ اُس نے رازداری سے ادھر ادھر نظر میں دوڑائیں۔

”میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے جی۔ ساتھ والے لفوجی افسر بات کر رہے تھے۔“

”کیا بات کر رہے تھے لفوجی افسر؟“

”وہ جی کیسے عرض کروں وہ کہہ رہے تھے کہ تھوئی بی بی کو اغوا کر کے بیرکوں میں لے جائیں گے۔“

”کیا کیا کیا.....“ امی گزبوائیں

”ہاں جی وہ تو اور بھی بڑی پلید باتیں کر رہے تھے جی.....“

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا، لیکن امی سٹ پنا گئیں۔ پاکستان آنے کا فیصلہ آنا فانا ہو گیا۔ جب محافظ ہی لومڑی صفت

ہوں تو حفاظت کیا معنی..... کونو اے کبھی کا چاچا تھا۔ امی نے اپنا تمام اثر و رسوخ لگا کر ایک ٹرک لیا۔ اس میں وہ چند فیوجی چڑھائے جو ہمارے گھر میں مقیم تھے۔ مجھے ایک رضائی میں لپیٹ کر ڈرائیور کے پیچھے والی روک کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ حکم تھا کہ کسی قیمت پر کبھی رضائی سے باہر سر نکال کر جھانکنا نہیں ہے۔ میرے بھائی کے پاس دھرمسالے کی ایک ڈیزی گن تھی جس سے وہ پرندے پھڑکایا کرتا تھا۔ اسی گن کو تو اُس نے ”جھاکے“ کے طور پر تھوڑا سا سچت سے نکال کر سارا سفر کسی فوجی کی ہی مستعدی سے طے کیا۔

دو چار مرتبہ ٹرک کوراہتے میں روکا گیا، لیکن عافیت گزری اور ہم بالآخر یونیورسٹی کیمپس پہنچے۔ یہاں یونیورسٹی بند تھی۔ ہم نے یونیورسٹی کی میز صیوں پر بیٹھ کر روٹی کے ساتھ کریوں کا اچھا رکھنا جو چراغ کی تقبندی سے ساتھ چلا آ یا تھا۔ لاہور شہر ہمارے لیے اجنبی تھا اس لیے ہماری والدہ نے اپنی بہن فیروزہ خاں کے گھر کو تلاش کیا۔ وہ لئے پٹے لاہور کی مین فیروز پور روڈ پر رہتی تھیں۔ یہ گھر مسز گیلانی کا تھا جو سکول میں پونا چھا (خالہ فیروزہ) کے نیچے پڑھاتی تھیں۔ ہم ان کے گھر پہنچے۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ میری واندہ کولینڈی میکینک کالج کی پرنسپل بنا دیا گیا۔ یہ کالج اساتذہ تیار کرنے کی درس گاہ تھی۔ یہاں بے وہی اور بی بی کی سندیں حاصل کر کے لڑکیاں پڑھانے کے قابل ہو جاتی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی انڈر ٹریننگ نیچرز کے عملی کام کے لیے ایک باقاعدہ سکول بھی تھا، جس میں دسویں تک جماعتیں تھیں۔ ایک اور اضافی کام یہاں یہ جاری ہوا کہ سکول میں مہا جڑا وارث چھوٹے بچوں کا کیمپ بھی کھول دیا گیا۔ یہاں بچوں کو مانی، طبی امداد دینے کے بعد ان کے وارثین کی تلاش کی جاتی یا پھر بچوں کے آرزو مند والدین کے حوالے کر دیا جاتا۔

کالج سے ملحق پرنسپل لاج تھا۔ کالج کا احاطہ ختم ہوتے ہی ایک بڑی بختہ دیوار تھی جس میں ایک دروازہ کالج اور پرنسپل لاج کے درمیان کھلتا تھا۔ اس دروازے کو صرف پرنسپل لاج کی طرف سے زنجیری کھنڈی لگ سکتی تھی۔ پرنسپل لاج دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں پرنسپل اور دوسرے حصے میں ہیڈ مسٹریس رہا کرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے دوران امریکن پرنسپل مس رائس چلی گئیں اور ہیڈ مسٹریس بھی غائب ہو گئیں۔

اب پورا پرنسپل والا ہمارے قبضہ قدرت میں تھا۔ میرے بھائی اُن دو کمروں میں منتقل ہو گئے جو ہیڈ مسٹریس کے لیے مختص تھے لیکن وہ ان کو استعمال نہ کرتے تھے۔ ایک چھوٹا کمرہ جس کا دروازہ برآمدے میں تھا اسے گودام بنا لیا گیا۔ ریزی بھائی ہمارے ساتھ ہی کھاتے پیتے اور سوتے تھے۔ لمبے سے برآمدے کے پیچھے تین بڑے کمرے تھے۔

دائیں طرف پہلا کمرہ ڈائننگ روم، پھر ڈرائنگ روم، آخر میں بیڈ روم۔ اس کے ساتھ ڈریسنگ روم اور غسل خانے کے علاوہ ایک گودام سے مشابہہ ایک اور کمرہ تھا، جس میں غیر ضروری چیزیں پڑی رہتیں۔ ہمارا زیادہ وقت برآمدے میں گزرتا تھا۔ یہاں کالج کی پروفیسریں لڑکیوں کے والدین اور لواحقین فسادات میں پھنڑے ہوئے ملاقاتی آتے رہتے۔

برآمدے کو آپ ایک طرح کا Visitors روم کہہ لیجئے۔ یہاں پاکستان کے حالیہ مسائل، سرکاری افسران کی مشکلات اور عوام کی بے چارگی، سیاست کے الجھاؤ، وسائل کی کمی اور نہ جانے کیا کچھ زیر بحث آتا۔ ابھی امن کی وہ شکل پیدا

نہیں تھی جہاں پہنچ کر لوگ گھروں کی زیبائش، فرد کے لباس اور بچوں کی تعلیم کے پیچھے دیوانہ وار مسابقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ابھی دولت کی پوجا سے لوگ قریب قریب نا آشنا تھے۔

میری والدہ کو کالج کی مشغولیات مصروف رکھتیں اور وہ زیادہ وقت اپنے دفتر اور سٹاف روم میں گزارتیں۔ میرے بھائی ریزی ابھی تک اپنے سوشل ورک میں مصروف تھے۔ وہ کبھی امرتسر سے مہاجروں کے کونوائے لاتے۔ کبھی جان تھمپلی پر رکھ کر جالندھر اور لدھیانے کی طرف سے آنے والی لاوارث سی بسوں کے ساتھ ہوتے۔ ریزی بھائی نے کبھی فن سفروں میں اپنے لیے کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی دو سارا دن کے بھوکے پیاسے گھر پہنچتے۔ اُن کے ساتھ مہاجروں کی کئی کہانیاں ہوتی تھیں، لیکن میری والدہ کے پاس ان کو سننے کا وقت نہ تھا۔

میں ویسے ہی کھلنڈری طبیعت کی مالک تھی۔ جب تک مسد میرے جڑے میں گھونٹے مار کر مجھے متوجہ نہ کرے میں پریشان نہیں ہوتی۔ مجھے بھی ریزی کی کہانیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مجھے اپنا دل لگانے کے لیے پروفیسران میں بڑا وقت راستہ مل گیا تھا۔

کالج کی جانب پینتہ دیوار میں بنے ہوئے دروازے کو میں کھولتی اور کالج کے اوقات کے بعد ہاتھ میں بیڈ منٹن کیٹ لے کر کالج میں چلی جاتی۔ عین پرنسپل ورا سے ملتی بیڈ منٹن کے کورٹس تھے۔ یہاں عموماً میرے ساتھ کوئی نہ کوئی کہیلنے پر آمادہ مل جاتا۔ پرنسپل کے دفتر اور پی اے کے کمرے سے محققہ دو کمرے سٹاف کی رہائش گاہ تھے۔ یہاں میں رات کا کھانا کھا کر چلی جاتی اور یہ پروفیسران کچھ مجھے پرنسپل کی بیٹی سمجھ کر اور کچھ وقت کئی کی خاطر میری دوستی کا دم بھرتی تھیں۔

ان میں سب سے پیش پیش جمیلہ ظفر تھیں۔ یہ میری ہم عمر، ہم مزاج اور ہم مشغلہ ساتھی بن گئیں۔ جمیلہ کا مزاج خشک اینٹھا تھا۔ ان کا خاندان بھی مہاجر تھا۔ بہن بھائی سب راولپنڈی میں تھے۔ رات گئے تک ہم باتیں کرتے ناچنے گانے کا شوق پالتے۔ اُن دنوں مجھے گانے کا اس قدر شوق تھا کہ آپنی ملک نے میرا نام 'کوئل' رکھ دیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ صرف 'کو' میں بدل گیا۔

جمیلہ ظفر کی شادی کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر زیدی سے ہوگئی جو ایک بہت بڑے ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ بد قسمتی سے زندگی نے وفاندگی اور جمیلہ بیوہ ہو گئیں..... لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ تب ہماری دوستی میں تیز چشمے کا سا بہاؤ تھا۔ اسی جوش کے تحت ہم نے کالج کے ہال میں ایک ناچ کو مرتب کیا جس میں ہم نے زندگی کا رول کیا اور جمیلہ نے موت کا رول دھارا۔

اس نیبلونما ناچ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ زندگی چاہے کیسی ہی کیوں نہ اترائے، کد کڑے مارے پاتا خر موت اُسے سر کر لیتی ہے۔ جب کالج میں ڈرامہ ہوا تو ہمیشہ کی طرح میں نے ڈرامہ ڈائریکٹ کیا اور اسی میں یہ ناچ زندگی اور موت کے نام سے دکھایا گیا۔ جمیلہ سے میرا رابطہ ساری زندگی رہا۔ گو ہم دونوں رہیں غم روزگار رہے لیکن ایک دوسرے کو طاق نسیاں میں رکھ کر بھولے بھی نہیں۔

دوسری دلآویز شخصیت اقبال ملک تھیں، جنہیں ہم سب آپنی ملک کہتے تھے۔ یہ وائس پرنسپل تھیں اور عمر میں ہم سے بڑی تھیں۔ بڑی شفیق، سادہ طبیعت اور کام کر خاتون تھیں۔ وہ خود تو میرے اور نوٹوں کے مشاغل میں حصہ نہ لیتیں، لیکن

بڑی گرم جوشی سے تالیاں بجانے والوں میں شامل رہیں۔

آپی ملک نے ساری عمر شادی نہ کی۔ پہلے وہ نیڈی میٹکلیکن کالج میں پڑھاتی رہیں۔ پھر ملتان میں گورنمنٹ کالج کی پرنسپل بن گئیں جہاں ان دنوں میری والدہ انسپکٹر آف سکولز تھیں۔ ملتان میں میری والدہ نے زمینوں کے چکر میں پھنس کر استعفیٰ دینے کی کوشش کی تو آپی ملک وہ واحد رکاوٹ بن گئیں جنہوں نے انہیں استعفیٰ دینے نہیں دیا۔ امی کا ارادہ لینڈ لارڈ بننے کا تھا۔ وہ برج جوزا کی پیدائش تھیں۔ یہ عموماً بہت خیال پرست ہوتے ہوئے تو امی بچوں کی صورت ہمیشہ تضاد اور دوئی کا شکار رہتے ہیں۔ مکو آپی کے پاس ایک طرح سے امی کا گھر ہی بن گیا تھا۔ وہ زمینوں سے نوسنتیں تو آپی کے پاس ٹھہرتیں..... دورے سے آتیں تو اپنے گھر میں قیام کرنے کے بجائے سیدھا آپی کے پاس چلی جاتیں۔

یہ باتیں بہت بعد کی ہیں۔ اس وقت یہ سمان وگمان میں بھی نہ تھا کہ آپی ملک ملتان چلی جائیں گی۔ ابھی تو وہ واکس پرنسپل تھیں۔ ہمارے میں جمیلہ آپی ملک کے علاوہ یہاں ایک اور معتبر پروفیسر امینہ ملک تھیں۔ دراز قد، گوری چٹی کشمیری خاتون، جن کی شادی بعد میں نوریب شفیق الرحمن سے ہوئی۔ اللہ نے انہیں بڑے خوبصورت دو بیٹے عطا کیے جن میں سے ایک بیٹے کا نیک انجامت ہوا اور اس کی خودکشی کے بعد شفیق الرحمن بھی زندہ نہ رہ سکے..... لیکن ابھی یہ کھیرے قبضہ قدرت سے منظر عام تک نہ آئے تھے۔ امینہ آ پابند منٹن سے لے کر گانا بجانا، پارٹی، ڈراموں میں شمولیت اور گپ بازی کی شوقین تھیں۔ ایک بار جب سکول میں مغل اعظم کا ڈرامہ سٹیج کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو انہیں شہزادہ سلیم بنانے کی تجویز ہوئی۔

میرے ساتھ خصوصی رعایت ہوا کرتی تھی اس لیے مجھے نور جہاں کارول دیا گیا۔ افسوس چند ریہرسلوں کے بعد یہ ڈرامہ پتہ نہیں کیوں بغیر سٹیج کیے ڈراپ سین کو پہنچ گیا، لیکن عجیب بات تھی کہ ہمارا گروپ ملال آشنا نہیں تھا۔ جو ہو گیا وہ بھی ٹھیک، جو نہ ہو سکا وہ بھی قابل قبول۔

اس گروپ میں ایک شخصیت انور کی بھی تھی۔ انور آرٹ کی پروفیسر تھیں اور ان کے والد سے میری والدہ کی جان بچان تھی۔ انور رشید کے والد ملتان کے ڈی سی تھے اور ان ہی نے سب سے پہلے میرے بھائی کو اس کی خدمات کے عوض سات مربع سرکاری زمین کے الاٹ کیے تھے اور پھر میری والدہ ان ہی مربعوں کی وجہ سے نناوے کے چکر میں پھنس گئی تھیں اور انہوں نے پورے تیس مربع الاٹ کرا لیے تھے۔

لیکن ابھی انور صرف سوینی تھی اور گروپ میں چینی کی طرح حلول کیے ہوئے تھی۔ وہ نہ بید منٹن کھینچی تھی نہ ناچتی گاتی تھی۔ اسے اپنی بہنوں کی طرح ڈراموں میں شرکت کا شوق بھی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی محفل اس کے بغیر مکمل نہ تھی۔

یہ باتیں بیان کرنے سے فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ میں کیسی بے فکری کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں، لیکن میری والدہ یقیناً میرے لیے پریشان تھیں۔ جسے میں خوش وقتی سمجھ رہی تھی اسے وہ تعطل سے تعبیر کر رہی تھیں..... ایک روز ہمارے گھر زبیدہ آ پآ آ گئیں۔ غالباً وہ لاہور کے ڈی سی کی بیگم تھیں اور امی سے کسی تقریب میں ملی ہوں گی۔ لمبے برآمدے میں آ پاز زبیدہ بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ وہ لاوارث بچوں کا سروے کرنے آئی تھیں۔ اس وقت میں کالج کی طرف سے ریکٹ لے کر وارد ہوئی۔ شاید میں لان میں بیٹے ہوئے ٹیوب ویل کا معائنہ کرنے چلی جاتی لیکن امی

نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔

”یہ میری بیٹی قد سید ہے.....“

آپاز بیدہ نے میرے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیا۔

”آؤ بیٹھو..... کیا کرتی ہے؟“

امی نے تعارف کرایا ”بی اے کیا ہے، کنیئر ڈکالچ سے۔ بے چاری کی فسٹ ڈویژن ماری گئی۔ بڑی افراتفری

میں امتحان دیا ہے۔ اب کوئی ڈھنگ کا بندہ مل جائے تو یہاں ڈالوں.....“

پتہ نہیں کیوں آپاز بیدہ جھنجھلاہٹ سے بولیں، ”ایویں شادی کرائیں گی۔ چھوٹی سی ہے..... پہننے اسے ایم اے

کے لینے دیں آرام سے..... کیا عمر ہے اس کی؟“

”انیس سال.....“ امی نے بتایا۔

”توں نان مسز چھٹھہ نان ایسا ظلم نہ کریں۔ پلیز..... اسے ایم اے کرنے دیں۔ شادی کوئی بھائی جاتی ہے۔ ذرا

بھیڑ ہو لینے دیں..... ساری عمر بڑی سبے شادی کے نیسے.....“

اگر آج کا عہد ہوتا تو زبیدہ آپ ضرور تحریک Feminism کی سرگرم کارکن ہوتیں۔ ابھی عورتوں کی جاگرتی

کی پوچھنے والی تھی اور کوئی عورت بھی زنا نہ حقوق کی غلبہ دار بن کر آواز نہ اٹھاتی تھی۔

”اچھا ایم اے تو سزاؤں لیکن کنیئر ڈکالچ میں تو صرف بی اے تک تعلیم ہے.....“

”کنیئر ڈکالچ کیوں؟ گورنمنٹ کالج بھیجیں۔ وہاں ایم اے اردو شروع کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں

نے داخلہ لے لیا ہے۔ پطرس بخاری سارا کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اچھی پڑھائی ہوگی۔ آپ بے فکر رہیں۔“

امی کچھ متذبذب ہو کر بولیں ”لیکن جب یہ کنیئر ڈکالچ میں پڑھتی تھی تو اس کے ریاضیات کے پروفیسر سرداری لعل کہا

کرتے تھے کہ اسے ایم اے Mathematics کرنا چاہیے۔“

”مس مستحالی کہتی تھیں امی کہ میں اتنا مکس میں ایم اے کروں۔“ میں نے اضافہ کیا۔

”چلو جی اس بات کو جانے دیں مسز چھٹھہ..... دو پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب تو اردو قومی زبان

ہے..... پاکستان حقیقت ہے۔ ہم نے انگریز اور ہندو کی غلامی سے آزادی حاصل کی ہے۔ آپ تو خود بڑی

Educationist ہیں۔ محبت وطن ہیں۔ مہاجرہوں کی خدمت کرتی ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ اردو کے بغیر پاکستانی کی

شناخت ممکن نہیں..... وطن کا تصور اردو سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم نے سندھ میں سندھی بلوچستان میں بلوچی پنجاب

میں پنجابی اور صوبہ سرحد میں پشتو کو اولین جگہ دی تو ہماری شناخت بھی اتنے ہی حصوں میں بت جائے گی۔“

”نہیں بابا! تو بات کو کہاں سے کہاں لے گئی..... مجھے تو صرف اس قدر فکر ہے کہ گورنمنٹ کالج میں

Co-education ہے اور..... میں.....“

”جی جی کیسا فکر؟“

”اس نے جب بی اے کا امتحان دیا تو بڑے مشکل حالات تھے۔ جس روز کا کی کا حساب کا پرچہ تھا کنیئر ڈکالچ



میں کچھ فسادیوں نے آگ لگا دی۔ پرنسپل نے فوراً لڑکیوں کو امتحان گاہ سے نکالا اور ایف سی کالج لے گئیں۔ وہاں ہی انہوں نے حساب کا پرچہ دیا۔“

”پھر جی یہ تو حالات سب کے ہیں۔ پھر؟“

”میرا کہنے کا مطلب ہے کہ میری بیٹی مخلوط تعلیم کو صرف اتنا جانتی ہے اس سے زیادہ اس کا Exposure نہیں

ہے۔“

پتہ نہیں امی کو میری نیت پر شبہ تھا یا وہ مخلوط تعلیم کے حوالے سے لڑکیوں کو غیر محفوظ سمجھتی تھیں۔ وہ کچھ چپ سی ہو گئیں اور حامی نہ بھری۔ امی کا تذبذب بھانپ کر مزیدہ آپا پولیس“ بیچے میں وہاں ہوں۔ مرغی کے پروں تلے قدم سیر رہے گی۔ آپ خدا کے لیے فکر نہ کریں.....“

ریزی نے مزاحمت کی کیونکہ وہ خود ان دنوں گورنمنٹ کالج میں ایف ایس سی کر رہا تھا، لیکن امی نے اس کی پروا نہ کی۔ دوسری مزاحمت باجو محمد یعقوب کی طرف سے آئی۔ باجو محمد یعقوب ان دنوں نیڈی میکلیکن کالج میں ہیڈ کلرک تھے۔ پی اے کا لفظ تو ابھی ایجاد نہ ہوا تھا، لیکن یوں سمجھئے کہ وہی صاحب کی تائریں کھینچنے والے اور اُسے پتلی کی طرح نچانے والی طاقت تھے۔

ایک اچھے Executive کے لیے ایک قابل پی اے نہایت اہم ہوتا ہے۔ اگر وہ آئین اور اصولوں کو زبانی Quote کر سکتا ہے۔ افسر کو نکلنے کے راستے بتا سکتا ہے۔ حد و حد میں رکھنے اور حد کو سلیقے سے توڑنے کی ترکیبیں سمجھا سکتا ہے تو ایسا افسر بڑی جلدی ٹیک نامی کو پہنچ جاتا ہے۔

باجو محمد یعقوب جالندھر میں ہماری زمینوں کی دیکھ رکھ کرتے تھے۔ جب 1936ء میں میری والدہ جالندھر سے تبدیل ہو کر دھرم سالہ گئیں تو ان کے پاس جالندھر شہر میں کچھ زمین تھی جس پر سٹرو بیری ارس بھری اور دیگر پھلوں اور سبزیوں کی کاشت ہوتی تھی۔ باجو محمد یعقوب جالندھر کے سکول میں بھی امی کے ہیڈ کلرک تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی زمینیں اور ہماری زمینوں کی دیکھ رکھ بھی کرتے تھے۔

اب نیڈی میکلیکن میں باجو محمد از سر نو امی کے ہیڈ کلرک بن گئے۔ یہی باجو جی بہت بعد میں پشتیہ مسلک کے پیر بن گئے۔ ان کے دربار پر قوائی ہوتی تھی۔ لوگ نذرانے پیش کرتے تھے اور وہ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے..... ”بھائی رجوع کرو۔ رجوع کرو۔ سب جواب مل جائیں گے۔ سب شکوک رفع ہو جائیں گے۔ تم صرف رجوع کرو۔“ سنت مگر میں جہاں ان کا ڈیرہ بن گیا بڑی محظنین ہوئیں لیکن امی ریزی اور میں نے کبھی رجوع نہیں کیا..... ہمارے لیے وہ ہمیشہ باجو جی رہے..... امی جی کے شفیق ہیڈ کلرک۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں ایم اے اردو کرنے گورنمنٹ کالج جانا چاہتی ہوں تو انہوں نے چند جسٹ اٹھائے امی کے دفتر کی چٹ اٹھائی اور مے آئی کم ان پلیز کہے بغیر اندر داخل ہوئے۔

”جی ایک عرض کرنا تھی..... اگر آپ کے پاس وقت ہو۔“

”جی باجو جی۔“

”ویسے تو جی مجھے دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن میں چھوٹی بی بی کو تب سے جانتا ہوں جب میں

سر سارے آیا کرتا تھا۔ وہ بہت بھولی روح ہے۔“

”ایسی روحوں کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔“

”بابو جی! میں نے ایسی تربیت کی ہے کہ وہ بھٹک نہیں سکتی۔“

اب سامنے ایک افسر بول رہا تھا۔ بابو جی کچھ گھبرا گئے ”دیکھ لیجئے آپ بہتر سمجھتی ہیں۔ لیکن مخلوط تعلیم میں بیٹی کو

بھی پتہ میرا خیال ہے کہ..... عقلمندی نہیں ہے۔“

امی نے پتہ نہیں اندر کیا محسوس کیا لیکن معاملے کو Dismiss کر دیا اور تنخواہوں کے کاغذ سامین کرنے میں

شغول ہو گئیں۔

گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے امی کو ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے بھی منایا۔ وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے

تھے۔ عربی کے سکالر تھے اور اردو ایم اے کے پہلے Batch میں عربی کی بکلاس اُن ہی کی ذمہ داری تھی۔ ایک روز وہ بی بی

کی کھانسی کو لیکچر دینے آئے تو بڑے ہال میں لیکچر کے بعد ہاتوں ہاتوں میں امی نے اُن سے ایسا اے اردو کا ذکر کیا۔

”آپ جی آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ فوراً قید سید کو داخل کرائیں۔ وقت بدل گیا ہے۔ اب لڑکیوں کا وقت بھی قیمتی

ہے۔ پاکستان کو تعلیم یافتہ خواتین کی ضرورت ہے۔“

”لیکن میں اُس کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”ذرا سوچیں اگر آپ تعلیم یافتہ نہ ہوتیں.... تو آج آپ بیوگی کے بعد بچوں کو لے کر کس کے پاس جاتیں؟

تعلیم تو جتنی ہو تم ہے۔ اس کی خاطر تو چین بھی جانا پڑے تو حکم سمجھ کے جانا چاہیے۔“

فیصلہ بڑی آسانی سے ہو گیا۔ ہمارے گھر میں فیصلے عورتوں کے ہاتھ میں تھے۔ اس بابا چھندریں میں ریزی اور

بی بی کی آواز ڈوب گئی۔ امی جی نے پرنسپل کرامت صاحب کو فون کیا اور میں کالج پہنچ گئی۔

کچھ باتیں گویا مقدر کا حصہ ہوتی ہیں۔ مجھے گورنمنٹ کالج میں اشفاق احمد سے ملنا تھا۔ میرے مستقبل کا تعین

وقت امکانات سب اس بات میں پوشیدہ تھے کہ میں گورنمنٹ کالج پہنچوں۔ اس مقام پر پہنچنے کے لیے مجھے بی اے کرایا

گیا۔ حالانکہ 1947ء میں جب پاکستان معرض وجود میں آیا، حالات دگرگوں تھے۔ جس روز میرا ریاضیات کا پرچہ تھا

کھمبہ ڈکالچ کے اُس بلاک میں جو لب سڑک تھا آگ لگ گئی۔ اصولاً تو کالج بند ہو جانا چاہیے تھا، لیکن مجھے ایم اے کرنا

تھا۔ مجھے خاں صاحب سے ایک مقررہ مقام پر ملنا تھا، اس لیے بی اے کا پرچہ دینا پڑا۔

اُس وقت کالج کی پرنسپل مس مکلیئر (Macnaire) تھیں۔ قریباً چھ فٹ اونچی لمبی، سخت قسم کی منظم خاتون نے

بی اے کی لڑکیوں کو کمرہ امتحان سے نکالا۔ کالج بس میں سوار کیا۔ خود ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی اور سیدھی ایف سی

کالج پہنچیں۔ یہاں لڑکے بی اے کے پرچے دے رہے تھے۔ انہوں نے ممتحن سے ساز باز کی۔ ہمیں ہنھایا اور خود بکریوں

کا کھولا بن کر کمرہ امتحان میں بیٹھ گئیں.... مخلوط تعلیم کا یہ پہلا منظر میری نگاہ نے دیکھا۔

ادھر اشفاق صاحب کو گویا حکم ملا کہ وہ ایم اے اردو کر لیں۔ وہ اس وقت تک منشی فاضل کر چکے تھے۔ مکتبہ

عہدے سے اُن کی کتاب ’ایک محبت سوانح نامے‘ چھپ رہی تھی اور انہیں ہرگز ایم اے اردو کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ

حب الوطنی کے سلسلے میں بڑی پُر جوش تقاریر کر چکے تھے اور جانتے تھے کہ تبدیلی زندگی کا اہم حصہ ضرور ہے لیکن ساتھ ہی جانتے تھے ۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے

مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

فیضہ میری تقدیر نے کیا یا میری والدہ نے۔ بہر کیف میں کالج پہنچی۔ پرنسپل آفس میں پروفیسر کرامت موجود تھے۔ اُن کی شخصیت میں بڑا میٹھا سا زعب تھا۔ جیسے وہ پہلے آپ کی مان کر پھر اپنی منوانے کے عاوی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد تعلیم ایک بڑے انقلابی دور سے گزر رہی تھی۔ مسائل ان گنت تھے۔ وسائل کی کمی تھی۔ بھانت بھانت کے لوگوں اپنے ذاتی مسائل میں الجھ کر اپنے آپ کو غفلت بخننے میں مصروف تھے۔ ہر ایک کی اپنی شناخت کے چکر میں تھی۔

پروفیسر کرامت صاحب نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے مہینے کو کہا۔

میں ہر خوف زدہ انسان کی طرح کرسی پر آگے ہو کر بیٹھی۔

”آپ نے بی اے کہاں سے کیا؟“

”کنینرڈ کالج سے جی۔“

”اور فیسٹ ڈویژن آئی؟“ سوال ہوا۔

”جی فیسٹ ڈویژن ضرور آتی..... لیکن جس روز میرا ریاضیات کا پرچہ تھا اُس دن جنیل روڈ پر آگ لگ گئی۔ ہمیں بس میں بیٹھا کرایف سی کالج لے گئے۔ بڑی افراتفری میں ہنگامی سٹریٹنا..... ہم لڑکیاں اتنی زوریں تھیں کہ پر پے زیادہ اچھے نہیں ہوئے ورنہ تو جی.....“ میں نے بار بار بتائی ہوئی حقیقت بیان کی۔

”اور بی اے میں کون کون سے سبجیکٹ لیے۔“

میں لجاجت سے بولی ”اے کورس Maths اور اکنائٹس۔“

”اور میتھس کون پڑھاتا تھا؟“

”پروفیسر سرداری نعل۔“

”اچھا اچھا..... وہ تو ہمارے ہی پروفیسر ہیں اور اکنائٹس۔“

”مس مٹھائی۔“

”جی۔“

”ساؤتھ سے آئی ہیں۔ اُن کے بھائی نے اکنائٹس پر بڑی معرکے کی کتاب لکھی ہے۔ وہی مس مٹھائی۔“

”جی۔“

”پھر بھائی اتنے قابل پروفیسروں سے پڑھ کر تم ایم اے اردو کر کے کیا کرو گی..... Math میں ایم اے کرو گی۔“

Economics میں۔“

”جی مجھے اردو کا شوق ہے۔ میں رائٹر بننا چاہتی ہوں۔“

وہ ہلکا سا مسکرائے اور پھر کچھ وقفے کے بعد بولے "کیا تمہیں معلوم ہے کہ پطرس بخاری صاحب نے اس سبکیٹ میں ایم اے کا اجراء کیا ہے، لیکن اب وہ یونیورسٹی چلے گئے ہیں۔ ہم کچھ تجرباتی سا کام کر رہے ہیں۔ ابھی پروفیسروں کا بھی اجتماع مکمل نہیں ہوا۔ بہر کیف تم برسر صاحب سے مل لو۔ فیس وغیرہ داخل کروادو..... فارم احتیاط سے بھرنا..... تھینک یو۔"

پرنسپل صاحب کھڑے ہو گئے یعنی مجھے درخواست کر دیا۔ میں نے وہی زبان میں شکر یہ ادا کیا اور اُن کے کلرک کے پاس پہنچی۔ کھڑکی کے ساتھ لگ کر ایک نوجوان کھڑا تھا۔

گورا چنانہ خوبصورت لڑکا جس نے کھڑکی کے ساتھ کبھی ٹیک رکھی تھی۔ جس وقت میں وہاں پہنچی وہ فوراً مڑوب اٹھا اور ایک طرف ہو گیا۔ نظریں نیچی رکھیں اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ جب میں فیس دے چکی تو برسر صاحب نے تعارف کے انداز میں کہا "بی بی یہ اشفاق احمد ہیں۔ یہ آپ کے ساتھ ایم اے اردو کریں گے۔ ان کی فیس میں نے ابھی جمع کی ہے....."

یہ میرا خاں صاحب سے پہلا تعارف تھا.....

لیڈی میٹلکین سے گورنمنٹ کالج تک دو چوراہوں کا راستہ تھا۔ پہلے سیکرٹریٹ کو جانے والا چوک آتا۔ اس کے بعد وہ چوک جس پر ہنگیوں کی توپ نصب تھی۔ اُس مای رود کی طرف رخ کر کے دیکھیں تو وہاں ہاتھ وہ نمائت آتی جو بعد میں NCA کی درس گاہ بنی اور یہیں لاہور کا مشہور میوزیم تھا۔

بھنگیوں کی توپ کے دائیں ہاتھ ایک اور چوک آتا جو انارکلی بازار کا سنگھم تھا۔ گورنمنٹ کالج کے عین سامنے چھوٹا سا باغ تھا اور یہی سڑک بائیں ہاتھ لڑکوں کے ہوٹل کی طرف بھی جاتی تھی۔

گورنمنٹ کالج کا پھانک کھلتے ہی وہ پکی سڑک آتی جس کے بائیں ہاتھ تھیٹیب میں اول کی گراؤنڈ تھی جس میں ہر سال سپورٹس ڈے منایا جاتا۔ لڑکیوں کا چٹائی ریس میں حصہ لینا ایک بڑا بڑا لطف Event تھا۔ اول سے دوسری تک سائیکلو لوجی ڈیپارٹمنٹ تھا۔ پھر یہ سڑک ذرا سی چڑھائی چڑھ کر پرنسپل آفس تک پہنچتی۔

پرنسپل صاحب کی کارپوریٹ میں کھڑی نظر آتی تو طالب علم خاموشی سے گزرتے ورنہ ہنسنا بولنا فترے کسنا آوازیں دینا تو اس عمر کا خاصا ہے۔ پرنسپل کے دفتر کے ساتھ ہی بائیں طرف ایک چھوٹا سا لان تھا اور اس کے عین سامنے بھی کھلی جگہ تھی جس پر بعد میں اوپن ایئر تھیٹر تعمیر کیا گیا۔ اس لان سے ملحق سوئمنگ پول تھا جس میں سپورٹس کے دنوں میں بڑی جوش و خروش کی رہتیں ہوتیں۔

ففتھ ایئر کے آخر میں جب سوئمنگ Events ہوتے تو اس میں ایک ریس اپنی نوعیت کی اختراع تھی۔ ایک ترکیب سوئی دھاگہ پکڑ کر ٹینک کے آخری سرے پر پہنچتی اور فری سٹائل میں تیرنے والا اُس تک پہنچتا۔ لڑکی سوئی میں دھاگہ پکڑ کر Contestant کو پکڑاتی۔ وہ اسے واپس لے جا کر ریفری کو پکڑاتا۔ اگر سوئی سے دھاگہ نکل جاتا تو اُس کے ٹینک ٹھیک جاتے۔

اُن دنوں جب ہمارا ففتھ ایئر ختم ہوا تو ریزی بھائی کا دوست بھی کالج میں پڑھتا تھا۔ ان کے ساتھ ہمارے گورنمنٹ سپورٹس مراہم چلے آتے تھے۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر اس ریس میں شرکت کی اور ریاض فٹس آیا۔

لیڈی میٹکلین سے دوراستے گورنمنٹ کالج کو جاتے تھے۔ ایک راستہ تو میں اوپر بیان کر چکی ہوں۔ دوسرا راستہ پرنسپل لاج کے سامنے سے گزر کر باہر نکلتا تھا۔ سامنے بہت بڑی گراؤنڈ تھی جس میں ہر سال انٹرا کالجیٹ مقابلے ہوتے تھے اور بڑی بڑی ٹرافیوں لڑکیوں کو ملتی تھیں۔

حسن اتفاق سے دو مرتبہ ان کھیلوں کی اناؤنسمنٹ کرنے کا مجھے موقع ملا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اناؤنسمنٹ کرنے سے پہلے عموماً اشعار پڑھ کر ناظرین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم نہ تھا کہ Master of Ceremony کو کیا کرنا چاہیے چونکہ ایم اے کی وجہ سے اشعار سے واقفیت تھی اس لیے میں نے از خود یہ طریقہ رائج کر لیا تھا۔

اس گراؤنڈ میں ملحق خواتین کے لیے سوئمنگ ٹینک تھا اور اس کے بعد سڑک پار کر کے ایم اے او کالج کی بلڈنگ آتی تھی۔ میں نے اس ٹینک کا بھی فائدہ اٹھایا اور سوئمنگ سیکھی اور بالآخر مقابلے میں حصہ لے کر فٹس آئی اور کلر بولڈر بنی۔

میں نے آپ کے لیے بساط بھرا پنی رہائش گاہ کی تفصیل بیان کر دی ہیں۔ میری والدہ مجھے اس محاصرے سے نکال کر سڑکوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ جب ہم دھرمسالہ میں تھے تو دسویں کرنے کے بعد مجھے تعینم حاصل کرنے کے لیے یا تو بوائز کالج بھیجنا پڑتا یا پھر لاہور میں داخلہ لینے کی ضرورت پیش آتی لیکن میری والدہ مخلوط تعلیم کے حق میں نہ تھیں۔ انہوں نے چند معتبر لوگوں سے مل کر ایک چھوٹے سا پرائیویٹ کالج بازار میں کھول دیا۔ یہاں پر وہ تمام لڑکیاں داخل ہو گئیں جو لاہور جانے سے معذور تھیں۔

یہاں ہی موسیٰ کو چہڑا سی کی نوکری دی گئی۔ تھنی انسل خاموش طبع، فزہی ماہل درمیانے قد کا موسیٰ عموماً بے رنگ سے کپڑے پہنتا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ موسیٰ نے امی کو تلاش کر لیا اور لیڈی میٹکلین آ پہنچا۔ اسے فوراً چہڑا سی کی نوکری مل گئی اور اسی کو مجھے کالج لانے لے جانے کی ڈیوٹی دے دی گئی۔

موسیٰ نے کبھی میرا نام نہ لیا۔ ہمیشہ بی بی جی کہہ کر بست پڑ لیتا۔ بولے بولے ایک دو قدم پیچھے چلتا لیکن جب ہم پرنسپل کراچی کے دفتر کے قریب پہنچتے تو یکدم موسیٰ میرے آگے آگے چلنے لگتا۔ گورنمنٹ کالج کے برآمدے بڑے بڑے خوبصورت اور گوتھک آرٹ کا نمونہ تھے۔ ایسا ہی ایک لمبا سا برآمدہ اردو کلاس کے سامنے بھی تھا۔ یہاں پہنچ کر عموماً موسیٰ کمرے کا دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ جاتا اور جب میں اندر داخل ہو جاتی تو دروازہ بند کر کے غائب ہو جاتا۔ اس کے بعد اوول کے گروہنی ہوئی سڑک پر ہمیشہ ایک ہی بیچ پر بیٹھتا جو پرنسپل کے دفتر سے ذرا سی ڈور تھی۔

جس روز پہلے دن میں ایم اے اردو کی کلاس میں داخل ہوئی۔ میں تھوڑی سی نروس تھی۔ ہر نئی چیز عموماً ہیبت کا باعث بن جاتی ہے۔ کلاس کے کمرے میں ایک لمبی مستطیل میز بچھی تھی۔ اس کی لمبائی کے دونوں رُخ پر کرسیاں تھیں۔ میز سے قریباً چار سیزھیاں اُونچا ایک ڈائس تھا جس پر ایک روسٹرم اور دیوار کے ساتھ لمبا سا بلیک بورڈ لٹکا تھا۔ اس بلیک بورڈ پر عموماً عربی، فارسی اور انگریزی لکھی نظر آتی۔ بہت کم اردو کے الفاظ لکھے جاتے۔

پہلے دن کمرے میں کوئی پروفیسر موجود نہ تھا۔ لمبی میز پر سامنے کی طرف مولوی طوطا، قمر صاحب بیٹھے تھے۔

تھی۔ کی پشت دروازے کی طرف تھی اور اس وقت یہاں آواز بیدہ اور ذکیہ بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر آپا نے مجھے اپنے ساتھ لے کر کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ابھی کا بیاں کتابیں رکھ کر سیٹل ہو ہی رہی تھی کہ ایک خوبصورت گورا چٹا اطالوی شکل و صورت کا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس نے لٹھے کی شلوار نیلی لکیروں والا سفید کرتا اور پشادری چپل پہن رکھی تھی۔ وہ بڑی ملائمت کے ساتھ آگے بڑھا۔ مردانہ قطار میں مولوی طوطا کے ساتھ بیٹھ گیا۔

چند لمبے خاموشی رہی۔ پھر نوجوان نے اپنا تعارف کرانے کے انداز میں کہا..... "خواتین و حضرات! میرا نام اشفاق احمد ہے۔ میں مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور سے آیا ہوں۔ ہمارے نسب بانی شہر کا نام منتر ہے۔ میرے والد وہاں پتھر کٹتے۔ پھر رفتہ رفتہ حیوان ناطق کا علاج بھی کرنے لگے..... ہم آٹھ بہن بھائی ہیں اور اس وقت میں موج دریا کے پلنگ 1- مزنگ روڈ میں رہتا ہوں۔ میرے پاس ایک سائیکل ہے جس پر میں اس وقت آیا ہوں....."

یہ کہہ کر اشفاق احمد نے کلاس کے لڑکے لڑکیوں پر نظر دوڑا آئی۔ سب خاموش تھے۔ ابھی Orientation کی کلاس کا رواج نہ تھا۔ نوگ اپنا تعارف حدوداً ربع ہسٹری بتاتے ہوئے شرماتے تھے۔ صرف اشفاق احمد نے سب کی سہمت کو مد نظر رکھ کر اپنا آپ تھانی میں رکھ کر پیش کر دیا۔

آواز بیدہ اور مولوی طوطا نے نہ کہا اسے شوخی سمجھا۔ ذکیہ جو بلند شہر سے آئی تھی اشفاق احمد جیسے صاحب حسن و جمال سے متاثر ہوگی۔ مجھے تو ویسے ہی متاثر ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن میرے اندر بھی تھوڑا سا رد عمل پیدا ہوا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مقابلہ سخت ہی لیکن میں محنت کروں گی اور بالآخر ضرور جیت جاؤں گی۔

سب سے پہلے غلام محی الدین کمرے میں آئے۔ انہوں نے اپنا تعارف آتے ہی انگریزی میں کر لیا۔ بلیک جین صاف کر کے کیمپبل لیگز میں اپنا نام لکھا۔ پھر روسٹرم پر آئے اور اپنا تعارف جاری رکھا۔ کچھ دیر انگریزی میں بولنے کے بعد وہ اردو میں جاری ہو گئے۔

اُن کا لب و لہجہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اُن کی اردو اکتسابی ہے۔ وہ زیادہ وقت انگریزی بولتے لیکن جب اردو میں بچھڑ دیتے تو ایسی نکسانی اردو اور اس قدر روانی کے ساتھ جاری ہوتی کہ فلسفہ خوبی "اسرار و رموز"، "ارمغان حجاز" کے متن بن جاتی۔ سمجھنے میں کچھ دشواری نہ ہوتی۔

دُبے پتلے بری نیلی آنکھوں والے اثر صاحب انگریزی میں بولے..... "میں مدراس سے آیا ہوں اور اس وقت کنٹرولر آف Examinations ہوں۔ میرا کمرہ لیڈیز روم کے بالکل سامنے ہے جہاں برآمدہ مڑتا ہے عین..... آپ میں سے کسی کو کسی قسم کا مسئلہ درپیش ہو تو وہ میرے پاس آئے..... میں دیکھوں گا کہ آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

مجھے معلوم نہ ہو۔ کہ اس پہلی ملاقات میں ہی کس بنا پر اثر صاحب اور خاں صاحب نے ایک دوسرے کو بے ستمی کے لیے چن لیا۔ بہت جلد خاں صاحب اثر صاحب کے گھر آنے جانے لگے لیکن کالج میں کبھی کسی کو شک تک نہ لگا کہ اشفاق صاحب اور اثر صاحب میں کالج کے بعد ایک بے تکلفی کا رشتہ بھی ہے۔ اس دوستی کی گہرائی اور گیرائی کو بس

یہی دونوں جانتے ہیں۔

اثر صاحب مدراس میں ڈپٹی کمشنر تھے لیکن مہاجر بن کر یہاں آ گئے اور ڈپٹی کمشنری کا رعب کبھی نہ جھازا۔ صرف میں انہیں ڈپٹی صاحب بلاتی تھی اور بلاتی رہی۔ وہ بیڈن روڈ کے عقب میں کشمی مینشن کی ایک چلی منزل میں اپنی اہلیہ آپ کے ممتاز کے ساتھ رہتے تھے۔

کالج کے اوقات کے بعد وہ ’سول اینڈ ملٹری گزٹ‘ کے لیے کالم لکھتے۔ رفتہ رفتہ وہ اسی اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ خان صاحب بھی وہاں پہنچ جاتے۔ اثر صاحب آئی سی ایس تھے لیکن ان میں وہ شیخی خوب نہ تھی جو عموماً اس کلاس میں ہوتی ہے۔

اثر صاحب کو اقبال اور پاکستان کی محبت کھینچ لائی تھی۔ پاکستان آ کر ڈپٹی صاحب نے بڑی طوفانی زندگی گزاری۔ ان کے بچے جاہیز کمال سعید و تمہید اور سلمی اپنے اپنے مقام پر گھمیں تھے لیکن اثر صاحب میں عورتوں کے لیے بڑی کشش تھی۔ ایک امیر کبیر بیگم ان پر لانا ہو گئیں اور دوسری شادی پر آمادہ کر لیا۔ ممتاز آپا کا کمال ہے کہ انہوں نے کبھی اُف تک نہ کی اور بیگم صاحبہ جب گھر کے اوپر والے پورشن میں منتقل ہو گئیں تو بھی وہ خاموش رہیں۔

سعیدہ بیلیویشن کی بڑی آرٹسٹ بنی۔ تمہید کے نعیب میں ممتاز مفتی کی بہو اور عسی مفتی کی بیوی بنتا لکھا تھا۔ سلمی ابھی بھی بیلیویشن سے منسلک ہے اور جاوید اثر نے امریکہ جا کر ایک امریکن خاتون سے شادی کر لی اور کمال پی آئی اے میں بڑا فسر بن گیا۔

اثر صاحب ایک آرٹسٹ تھے۔ ان کی زندگی طوفانی تھی اور آخر تک رہی..... آرٹسٹ لوگ لہروں کی طرح ساحلوں پر پہنچنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم ان کی حالت کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک باپ کی طرح میری حفاظت کرتے تھے اور کرتے رہے۔

خان صاحب ایم اے اردو میں منشی فاضل کر کے پہنچے تھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ’ایک محبت سو انسانے‘ چھپ چکا تھا۔ وہ کالج کے بعد عام طور پر مکتبہ جدید چلے جاتے، لیکن ہم سب ہم جماعت کم تجسس اُس سے کم انفرمیشن اور بے حد کم علم طالب علموں کا گروہ تھا۔

آپا زبیدہ ڈپٹی کمشنر کی بیگم ضرور تھی لیکن علم سے ان کا کوئی ناٹھ نہ تھا۔ ذکیہ لب ولہجہ کو اردو زبان پر عبوری کا سرٹیفکیٹ سمجھتی تھی۔ مولوی طوطا شاید اپنی عربی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو اردو دان سمجھتے تھے۔ رہ گئے قمر انماں یہ بڑے سادہ لوح انسان تھے۔ نہ انہیں کسی بات پر مان تھا نہ کسی بات کی شیخی ہی تھی۔ وہ بچوں کے سے تحیر کے ساتھ پروفیسروں کو دیکھا کرتے۔

یہ عجیب سی بات ہے کہ جو کوئی بھی ان دنوں کونونٹ یا کسی مشنری سکول کی شکل دیکھ لیتا تھا اس میں مغربی کلچر انگریزی زبان اور رہن بہن کی شدہ بدھ پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ مقامی کچھ ’علم‘ زبان والے کو کمتر سمجھنے لگتا تھا۔ یہ احساس غالباً فاتح کے ساتھ مل جانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اب انگریز تو زخمت ہو چکا تھا اور وجہ بھی وہ نہیں رہی کہ فاتح کا کلچر اپنا کر انسان اپنے آپ کو برتری کی خلعت

حاصل کرنے لیکن سفید فام قوموں کا تہور پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ امریکہ بہادر کے ہاتھ میں مشرقی قوموں کو سجدہ ریز رکھنے کا سحر ہے۔ جاپانی، چینی تو اس رعب تلے اس قدر دبے ہوئے نظر نہیں آتے لیکن مسلمان تو میں آنکھیں بھی دکھا رہی ہیں اور یہ بھی حسبِ توفیق خوب کھا رہی ہیں۔ اگر وہ اٹھتے ہیں تو بنیاد پرست کہلاتے ہیں۔ دہشت گرد بن جاتے ہیں اور اگر ختم ہو جاتے ہیں تو لبرل تو بن جاتے ہیں لیکن بی کلاس شیمن کی طرح اُن کی اپنی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔

کالج میں مجھے ان باتوں کا قطعی احساس نہ تھا۔ میرے پاس ”فسانہ آزاد“ کی ساری جلدیں تھیں اور میرا مبلغ عمر جی تک محدود تھا۔ میری عقل ملاحظہ فرمائیے کہ اتنی تعلیمی استعداد پر مجھ میں خود اعتمادی سب سے زیادہ تھی۔ جس اشفاق مرحوم ”گلستان“، ”بوستان“ حفظ تھی جو فارسی عربی کا سا کلمہ ہونے کے باوجود اردو کی ان گنت کتابیں کھنگال چکا تھا۔ میں اُسے اندر ہی اندر Underrate کر رہی تھی۔

اب مجھے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا ایک مسئلہ تھا۔ وہ اپنے کسی ہم جماعت کو احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ احساسِ کمتری میں مبتلا انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ وہ دہشت گردوں سے جا ملے یا خود کش بم کے سارے اپنا آپ ختم کر ڈالے۔ ذہنی مریض بن کر کسی ہسپتال میں جا پہنچے یا کسی قتل کا مرتکب ہو جائے۔ بہر کیف زندگی اُن کے لیے مٹی کھودتی ہے۔

وہ ہم سب کی تھوڑی تھوڑی مدد پر ہمنمائی کرتے رہتے تھے لیکن ہمیں کسی شکرگزاری میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ میں ”ہمد دی“ لفظ کو ”ہمد دری“ لکھا کرتی تھی۔ اشفاق صاحب اپنی کاپی پر ہمد دری لکھ کر یوں آواز بیدہ کو دکھاتے گویا صدمہ چاہتے ہیں۔ میری نظر بڑھاتی تو میں اپنی اصلاح کر لیتی، لیکن مجھ میں اتنی عقل نہ تھی کہ اعتراف شکست کرتی۔

ابھی Self-projection کی بیماری عام نہ ہوئی تھی اور خود ستائشی اندازِ زیست کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔ خاں صاحب تو اس معاملے میں بہت ہی شرمیلے اور گونگے تھے۔ وہ اپنا سارا وقت اپنے جملہ نالائق ہم مکتیوں سے اپنا آپ کمتر ثابت کرنے میں صرف کیا کرتے۔ زیادہ جانتے اور کم ظاہر کرتے۔ اُن کی کتاب ”ایک محبت سو افسانے“ چھپ چکی تھی لیکن اُن کے منہ سے اس کتاب کا ذکر بھی نہ سنا۔

اُن کی ذاتی لائبریری تھی جس میں ان گنت کتابیں تھیں۔ اُن کی ملاقات اویوں سے تھی۔ کافی ہاؤس میں تعلیمی سے جڑا کرتے تھے۔ کالج سے مکتبہ جدید جانا اُن کے معمولات میں سے تھا۔ اثر صاحب سے ملاقاتیں عام تھیں لیکن ان ساری Activities کا خاں صاحب نے کسی کلاس میں کبھی ذکر نہ کیا۔ کلاس میں انہوں نے کبھی ذہانت کا سکہ تاننے کے لیے مشکل سوالات نہ پوچھے۔

ایک بات البتہ اُن کی علم دوستی کی غماز تھی اور وہ لائبریری کی کتابیں تھیں۔ ان کو بھی کوئی شمارے بغیر وہ کسی نیچے کی طرح اٹھائے پھرتے۔ میں نے بوہورسٹی لائبریری کا نیا نیا کارڈ بنوایا تھا۔ یہ لائبریری انارکلی جانے والے راستے پر تھی اور عام طالب علم کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

ایک روز جب میں لائبریری سے باہر نکلی تو برآمدے میں مجھے اشفاق احمد ملے۔ انہوں نے نہ مجھے سلام کیا نہ خوش لیا۔ بس آہستہ سے بولے..... ”کیا میں آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟“



میں نے کتابیں پیش کر دیں۔ انہوں نے چند لمحے اور اراق اُلٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر بولے ”دیکھنے اگر آپ چاہیں تو ہم کتابیں Exchange کر لیتے ہیں۔ میں چند دن کے بعد آپ کو یہ ساری لوٹا دوں گا۔“

جب میں کتابیں لے کر گھر آئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے کورس کے متعلق درست چوائس نہیں کی تھی اور میں درست نئج پر کتابیں نہیں پڑھ رہی تھی۔ اشفاق صاحب نے مجھ سے جو کتابیں تبادلے کے طور پر لی تھیں ایم اے کے مطالعے کی غرض سے بے کار تھیں، لیکن انہوں نے میری عزت نفس کا پاس رکھا۔ یوں میری اندمجروح کیے بغیر مجھ پر اپنی علیست کا زعب ڈالے بغیر خاں صاحب نے مجھے تاریخ ادب اردو، موازنہ ادبیں و دبیر، مولوی عبدالخلیم شرر کے ناول، محمد حسن عسکری کے افکار پیش کر دیئے۔

عورتیں کن بلندیوں کو چھو سکتی ہیں اس کی طرف توجہ دلانے کے لیے انہوں نے عصمت چغتائی کی ”سبزھی لکیر“ اور قرۃ العین حیدر کے انسا نے بھی ساتھ تھی کر دیئے۔ میں نے اس کے بعد پنجاب لائبریری جانا چھوڑ دیا۔ مجھ تک کتابوں کی ترسیل مسلسل ہو گئی تھی۔ وہ اگر اپنی ذاتی لائبریری سے کتابیں مستعار دیتے تو ہمیشہ ظاہر کرتے گویا یہ بھی پنجاب پبلک لائبریری کی کتابیں ہیں۔

ان کتابوں کی آمدورفت سے اچانک میں خوفزدہ ہو گئی۔

ایک روز میں گھر جانے کے لیے برآمدے میں لگی بی تھی کہ اشفاق احمد کہیں سے آ گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں حسب معمول کتابیں تھیں۔ چہرے پر جتنی بھگتی مسکراہٹ تھی۔

”آپ نے یہ خطوط پڑھے ہیں؟“

مجھے معنوم نہ تھا کہ وہ کن خطوط کی بات کر رہے تھے؟

”جی نہیں.....“

”یہ کورس کی کتاب نہیں ہے۔ ملینا (Malina) کے نام خطوط ہیں لیکن بڑے خوبصورت.....“

وہ آؤٹ آف کورس بات کر رہے تھے چونکہ مجھے اُن کی کتابوں سے فائدہ پہنچ رہا تھا۔ میں نے ملینا کے خطوط بھی پکڑ لیے۔

یہ خط جذبات میں بھیلے ہوئے بلکہ آنسوؤں میں سننے ہوئے تھے۔ لکھنے والے نے بڑی عاجزی سے ملینا کے حضور عرض کی تھی کہ ”جس کرسی پر تم بیٹھ کر جاتی ہو وہ تمہارے جانے کے بعد بھی تمہارے وجود سے بھری رہتی ہے۔ جس کمرے میں سے تمہارا وجود گزر جاتا ہے وہاں تمہاری خوشبو سانس لینا دشوار کر دیتی ہے۔ ہر موسم میں ہر جگہ تمہاری چھاپ لگی ہے۔ بتاؤ میں اس دیوانگی سے کیسے نجات پاؤں؟“

ان خطوں کو پڑھنے کے بعد میں چورسی بن گئی..... اب مجھے کتابیں پکڑتے ہوئے خوف سا آتا تھا۔ وہ نہ ہو کسی دن کسی کتاب میں سے کوئی محبت نامہ نکل آئے اور پھر وہ خط مجھے اپنی والدہ کو دکھانا پڑے۔ اب میں نے اس کا یہ راستہ نکالا کہ کبھی کتابیں لے لیتی کبھی انکار کر دیتی۔ رفتہ رفتہ جب کتابوں کی ترسیل میں تو اترا ندر ہا تو اشفاق صاحب نے ایک اور راستہ نکالا۔

مجھے برآمدے میں روک کر انہوں نے سوال کیا ”آپ کے پاس دوئی ہوگی؟“

جی..... ہے۔“

”دے دیجئے میری سائیکل پتھر ہوگئی ہے۔“

میں نے دونی نکال کر دے دی۔

بغیر شکر یہ ادا کیے وہ چپکے سے چلے گئے۔

انہوں نے ہتھیلی بڑھائی۔ دونی یوں وصول کی گویا کسی دربار میں خلعت سے نوازے گئے ہوں۔ پھر شان

استقامت سے بغیر شکر یہ ادا کیے لوٹ گئے۔ سفید ہتھیلی کے آگے پست سوال صورت بڑھنا اور بگڑے دل شہزادے کی طرح

لوٹ جانا..... دونی کا مثل جزیہ کے پیش کرنا اور برتھ ڈے ایک کی طرح قبول کیے جانا..... ایک کندھا جھکا کر پشاوری

تھیں پر بوجھ ڈالتے ہوئے براؤن رنگ کی آنکھوں والے کاٹیکھی نظر سے دیکھتا اور پھر روہانسا ہو کر لوٹ جانا.....

یہ سب میری یاد کی چھمن پر بنی ہوئی تصویریں ہیں۔ جب میرا جی چاہتا میں چلمن گرا کر اس کی سکرین پر بنی پرانی

یہ تصویریں دیکھ لیتی۔ جب جی نہ چاہتا اس چمن نما چلمن کو پیٹ کر اوپر کر دیتی۔

آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں یادیں نیک، عجیب و غریب رول ادا کرتی ہیں۔ ہر انسانی

عمل کی طرح یاد کا طباغ پر مختلف اثر پڑتا ہے..... اس کے خاصا نھیں بھی انسانی اعمال کے جملہ خاصا نھیں کی طرح اچھے بھی

مرتب ہوتے ہیں اور ان میں برائی کا نمک بھی شامل رہتا ہے۔

بائے لوگ کہا کرتے ہیں جو لوگ ماضی کی یاد اور مستقبل کے اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں وہ اپنے حال کو برباد

کریتے ہیں۔ وہ حال کی گھڑی پر جو کچھ میسر ہے اس کا نہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں نہ حالیہ نقصان سے بچنے کی امید رکھ سکتے ہیں۔

لیکن اس امر کو بھی کیا کیا جائے کہ ماضی اپنی گہری چھاپ یاد کی صورت چھوڑ ہی جاتا ہے اور اس کی گرفت سے

تازگی ممکن نہیں۔ جیسے ساحل سمندر پر گیلے پیروں کے نشان ریت پر وہ رتک نکل جائیں۔

یاد کا اپنی اپنی طبیعت کر دار، جملہ جراثیم ہسٹری سے گہرا تعلق ہے جو لوگ معمولی درمیانی سطح کی زندگی گزارتے

ہیں جن کی وابستگی روح سے کم اور جسم سے زیادہ ہوتی ہے، جن کے Genes خوش رہنے کا فن جانتے ہیں اور جنہیں

صحت میں کام کر دوہ ہنکار نہیں ملا ہوتا انہیں یادوں کا Lasso پکڑ کر زرخیز نہیں بنا سکتا۔

یہ لوگ کھانے پینے، پہننے اور ہننے، نسل آگے بڑھانے اور سیر سپانے میں مگن زندگی کو بیہودہ یادوں کے حوالے

تھیں کرتے..... ایسے لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ نہ یہ خود ارتقائے انسانی میں حصہ لیتے ہیں نہ ارتقائے حیات کی

لچھوس روڑے اٹکاتے ہیں۔ ان کے لیے واقعات، حادثات، واجبات آئے اور چلے گئے۔ بیٹھ کر ان پر تاسف کرنا، حساب

کتاب کرنا، جمع جتھا ملانا ان کی عادت نہیں۔ جب تک ان کی جسمانی ضرورتیں بمقدار وافر سہولت کے ساتھ پوری ہو رہی

ہیں انہیں کسی سنگ میل کنارے کھڑے ہو کر پُرانے راستے کو دیکھتے رہنے کی حاجت پیش نہیں آتی۔

یعنی نوع انسان زیادہ تر ایسے ہی انبوہ کثیر کی کثرت سے بنا ہے۔ یہ نہ ماضی کی یاد میں بے قرار ہوتا ہے نہ مستقبل

کے تریشے میں مبتلا ہوتا ہے۔ حال میں رہتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس کی حال میں مشغولیت بابوں جیسی نہیں ہوتی۔

بس جب حال میں مشغول ہوتے ہیں تو غالباً وہ حال کی گھڑی کو رب سے منسوب کر کے راضی برضا ہونے کو زندگی کا

کندن بناتے ہیں۔

عام دنیا دار آدمی کو نہ رب کی آگہی ہوتی ہے نہ راضی برضا ہونے کا فن آتا ہے۔ وہ گویا خالی الذہن ہو کر اپنی زندگی میں خوشی خوشی مگن، جسم کی ضرورت سے آگاہ چھوٹے بڑے کپڑے کو ناپتا چلا جاتا ہے۔ نہ اُسے مابعد کا خوف ہوتا ہے نہ نروان کا بھلیکا ستا تا ہے۔ نہ اُسے جنت اور دوزخ ہی کے دوسوں کا کوئی اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہری ہری دھوپ کی طرح حد نظر تک سبزہ پھیلائے رکھتے ہیں اور آنکھ کا حالیہ منظر حسین رکھتے ہیں۔

ان لوگوں سے ہٹ کر کچھ لوگ فنون لطیفہ کے شیدائی، امر ہو جانے یا امر کر دینے کے شائقین، بے قرار و مضطرب..... ایسے لوگوں کے لیے یادیں تخلیق کا باعث بنتی ہیں..... ان کے لیے گزرے موسم ان کہی باتیں ان چھوئے جسم، ادھورے واقعات و ہندلے چہرے چھوٹی چھوٹی دارواتیں، غیر محسوس حد تک ابھرنے والی خوشبوئیں، مسکراہٹیں، آنکھوں سے لوٹ جانے والے آنسو..... بسترؤں کی سلوئیں، کھونٹیوں سے ننگے ہوئے پرانے کپڑے پرانا ٹوتھ برش، ٹونا ہوا پن، کاغذوں پر ادھوری سطر میں سوکھے پن ہمیشہ با معنی رہتے ہیں۔

یوں سمجھئے جو کچھ گزر گیا ان کے اندر کسی پتھر کی سل پر موہنوداز و کی عبارت بن کر مرتب ہو گیا..... تخلیق کار اس عبارت کو پڑھنے میں برسوں صرف کرتا ہے۔ وہ ان ہی یادوں کے سہارے ان لوگوں تک پہنچتا ہے جو تخلیقی عمل میں تو داخل نہیں ہو پاتے لیکن یادوں کے ڈے سے ہوئے رہتے ہیں۔

ان ہی یادوں کی کھنکھاتی مٹی سے آرٹسٹ کبھی شعر لکھتا ہے کبھی مجسمہ بناتا ہے۔ کبھی صفحہ قرطاس پر شناسا چہرہ بھولی بسری لگی اداس دریچہ بنا لیتا ہے۔ گانے والے کی نئے میں اُس کے سوز و گداز میں یہی یادیں ابھرتی ہیں اور سننے والے اور اُس کے مابین ایک رشتہ استوار کر لیتی ہیں۔

یادوں کے ایندھن کے بغیر کبھی با اثر آرت جٹ نہیں لیتا۔ اس گندھی مٹی کے نہ ہونے پر کوئی مہا تمادھ کا مجسمہ نہیں بنتا۔ جسے صدیوں بعد لوگ حیرت سے دیکھیں۔ یادوں کے بغیر کبھی ایسی Levitation ممکن نہیں جس سے ارض زمین کا گھیر ڈور تک نظر آسکے.....

کچھ عاشقوں کے لیے یادز ہر ہلا بل ہے۔ وہ محنتوں ہو یا سسی ہیر ہو یا ماروی..... اُن کے لیے ایک چھوٹی سی یاد ساری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔ وہ اس یاد کے گرد اب سے نکل نہیں پاتے۔ یہی اہل یادیں انہیں امر کر دیتی ہیں۔ پھر وہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک تو سفر کر سکتے ہیں، لیکن ان لحوں سے نکل کر عام روایت، رسم و رواج، اقدار، مسلک کی پیروی نہیں کر سکتے۔ اُنٹھے بیٹھے اُن کے لیے ان ہی یادوں کا تریاق اور ان ہی کا زہر ہلا بل ساتھ ساتھ دونوں کی طرح چلتا ہے جن میں آڑ تو رہتی ہے لیکن وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

یاد ایک عمومی، اساسی بنیادی کیفیت ہے جو ہر دل پر اپنا وار کرتی ہے۔ محبت کی طرح یہ بھی ہر در پر دستک دیتی ہے۔ پھر ہر انسان اپنی طبیعت، کردار، جینز کی انجینئرنگ، موروثی افتاد، طبع، تلاش کے مطابق اس یاد کو اپنے فائدے یا نقصان میں ڈھال لیتا ہے..... کچھ لوگ یادوں سے ایسے ڈے سے جاتے ہیں جیسے کوڑیا لے ناگ کا ڈسا پانی نہ مانگے..... کچھ در پیچہ کھولتے ہیں۔ دُور کا منظر دیکھتے ہیں اور کھڑکی بند کر کے آرام سے سو جاتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ اس ”دونی“ کی وجہ سے کہیں بات نہ بڑھ جائے..... لیکن ہر بار وہ دونی مانگتے لوٹانے کا وعدہ کرتے اور بغیر شکر یہ ادا کیے آگے چلے جاتے..... بات کبھی آگے نہ بڑھی کیونکہ اشفاق احمد لڑکیوں کی طرح شرمیلے اور بچہ خوں کی طرح غیرت مند تھے۔

اشفاق احمد خاں اپنی خاندانی روایات کے تحت کسی غیر پٹھانی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو اپنے گھر والے فرد افراد اور مجموعی طور پر اتنے پسند تھے کہ وہ ان کی گرفت سے نکلنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ ایسے میں وہ ایک قدم میری جانب بڑھتے تو دس قدم پسپائی کے اختیار کر لیتے۔ اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے انہوں نے ایک بہانہ طور پر Defense mechanism اپنالیا تھا۔

ایک روز صبح کے وقت جب وہ کالج آئے تو اُن کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں شادی کا چھلا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح شادی شدہ ہونے کا اعلان تمام لڑکیوں کو اور خاص کر مشنری سکول کی پڑھی لکھی لڑکی کو دُور باش رہنے کی نال بھنڈی دکھا دے گا..... وہ کبھی کبھی نوٹس لینے سے پہلے چھلے کو انگلی میں گھما کر ہاتھ میز پر بھی اعلانیہ انداز میں رکھ دیتے تھے۔ مجھ پر اس اعلان نے خاطر خواہ اثر نہ کیا۔

میں ایسا فقیر تھی جو مانگنے تو نکلے لیکن اپنی عزت نفس بچانے کے لیے کاسہ چھپائے رکھے۔ قرض مانگنے کی اشد ضرورت ہو لیکن ساتھ ہی یہ آرزو بھی پال رکھے کہ یہ قرض کبھی واپس نہ مانگا جائے۔ بیٹی کا رشتہ خود ہاتھ جوڑ کر کرانے پر مجبور ہو لیکن مشہور یہ کہ دے کے لڑکے والوں نے پھیرے ڈال ڈال کر دہنیز توڑ دی ہے..... میں وہ لڑکی تھی جو عاشق کو اغوا پر مجبور کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ گھر والے معاشرہ قانون سب عاشق کو مورد الزام ٹھہرائیں..... ہنس ہنس کر یاری لگانے والی اور دور درگسار اچھا بیان کرنے والی کا تضاد بڑا کرناک ہوتا ہے.....

ہم دونوں کے بنیادی تضادات نے ہماری شخصیت پر خوف کی مہر لگا دی تھی۔

اس خوف کا رنگ ہم دونوں میں یکساں نہ تھا۔ اشفاق خاں کا خوف شام کی دھندلی روشنی سے مشابہ تھا جس میں نظر تو سب سمجھ آتا ہے لیکن واضح کچھ نہیں ہوتا۔ میرے خوف کا رنگ بستی تھا۔ سارے میں سرسوں کھلی تھی۔ مجھے سارا ج سروسوں کے کھیت کی طرح نظر آتا تھا۔ اسے ماننے کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن اس سے مقابلہ کرنے سے میں بدکتی تھی۔

میں ہر روز کسی مجوزے کا انتظار کرتی اور پھر خوف کی چادر اوڑھ کر سو جاتی۔ خاں صاحب شام ڈھلے پر بچکے مارتی روٹین کے لیے تیل خریدنے جاتے، لیکن دکان پر پہنچ کر وہ دونی دیتے ہوئے خوفزدہ ہو جاتے اور اپنے آپ کو غالب کی طرح سمجھاتے کہ اب میری آرزو ہے کہ زندہ نہ رہوں۔ خواہش اور گریز آری کی صورت اُن کے انداز چلتے۔ نہ وہ خواہش کے میدان میں نبرد آزمانی کرنے کے اہل تھے نہ مکمل طور پر بھاگ جانے کے اہل ہی..... پہلے انہوں نے چھوٹے چھوٹے سفر اختیار کیے اور پھر اسی گریز کی خواہش نے انہیں روم پہنچا دیا۔

اپنی اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے وہ نوٹس لکھا کرتے تھے جواب ملے ہیں۔ اُن کی شادی کا چھلا تو آپ کو دکھایا نہیں جاسکتا کہ اب وہ عکسی مفتی کی ملکیت ہے اور وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں شادی کا سبیل نہیں بلکہ اشفاق احمد سے وابستگی کے طور پر پہنتا ہے لیکن خوف کے متعلق اُن کی کاپی سے یہ خیالات برآمد ہوتے ہیں۔

فیصلے دو تھے اور دونوں پر عمل پیرا ہونا خطرناک بھی تھا اور ناممکن بھی لیکن جب انسان اپنی بساط بھر دو فیصلے کر کے ان دونوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے تو عموماً اُسے دوہری ناکامی ملتی ہے۔ خاں صاحب نے بھی محبت کو شطرنج کی بازی سمجھ کر بار بار مہرے بدلے۔

جب اشفاق صاحب کی انگوٹھی نے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ کیے۔ کتابوں کا رابطہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ دوئی بار بار مانگنے کا کھیل بھی پھپکا پڑ گیا تو انہوں نے ایک اور سوانگ بھرا۔ وہ ایک دن کلاس میں آئے اور مولوی طوطا سے کہنے لگے..... "کیا آپ نے اپنی اصلی عمر فراموش میں بھری ہے؟"

"ہاں تو اور کیا....."

"بڑی غلطی کی۔ آخر دو چار سال تو نوکری کی تلاش میں نگ جائیں گے۔ کیا پتہ ذمہ اے دو سالوں میں نہ ہو سکے تو پھر تو آپ سروس کے لیے Over age ہو جائیں گے۔"

سارے طالب علم چونکے ہوئے سننے لگے۔

"میری عمر چھتیس سال ہے لیکن میں نے ساری باتوں کا پڑتا نگا کر سچ نہیں لکھا..... یہ حکمت ہے۔ جھوٹ نہیں ہے....."

یہاں اُن کا مقصد ایک بار پھر نئیوں کو بڑھاپے کا خوف دلا کر بھگانا تھا۔ اب کبھی کبھی وہ کلاس میں کندھے پر مکیاں مارتے۔ اسپرو کی گولیاں پھاکتے..... چلتے میں لنگڑانے کی ایکٹنگ کرتے۔ مجھ سے آواز بیدہ نے ایک روز کہا..... "ہائے اشفاق! تو بڑھاپے، لیکن گنتا نہیں ہے..... ہے نا....."

میں چپ رہی۔ اُس زمانے میں واقعی چھتیس برس کا نو جوان بوڑھا لگتا تھا۔ مجھے سارے پروفیسراں ٹپی عمر کے ناکارہ بوڑھے لگتے تھے، لیکن خاں صاحب کے متعلق مجھے شبہ بھی نہ ہوا کہ وہ دوہرے فیصلے میں گھر کر یہ تھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ اُن کی عملی اور علمی مدد نے میری نالائقی کو اور مستحکم کر دیا تھا۔

اب بڑھاپا اُن کا نیا Defense mechanism بن گیا۔ اب بات بے بات بڑھاپے کا ذکر بڑھاپے کا ڈھونگ بڑھاپے کا رونا دھونا علامیہ اور اشارتا ہونے لگا۔

اسی بڑھاپے کا ذکر انہوں نے اُن خطوں میں بھی کیا ہے جو انہوں نے اپنی بھانجی نابید کو لکھے۔ اسی کا فرود دیکھ کر جینا جس پر دم نکلے اُن کا وطرہ حیات بن گیا۔ وہ محبت کو انسان کی معراج بھی سمجھتے تھے اور اس محبت سے کنارہ کشی بھی چاہتے تھے۔

بڑھاپے نے ابھی اصل صورت بھی نہ دکھائی تھی لیکن پوداجو "زاویہ" تک پہنچتے پہنچتے پورا چھننا درخت بن گیا تھا اس کا بیج بہت پہلے بویا گیا۔ ان دنوں وہ اپنی نوت بک میں بڑھاپے کے متعلق جو کچھ ارشاد کرتے رہے حاضر خدمت ہے:

## بڑھاپا

آج ایسا دن پھر پتہ نہیں کب آئے گا۔ اس وقت مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے اونچے اونچے گاتا ہوا باہر سڑک پر نکل جاؤں اور ہر نو جوان کو روک کر اس کے بالوں کو غور سے دیکھ کر ٹھنڈے مار کر ہنسون اور چلا چلا کر کہوں جاؤ اپنی

بھتی سے کہانیاں سنو۔ اپنی اماں کو دھمکیاں دو۔ اپنے باپ سے پیسے مانگو!

صبح صبح شیو بناتے ہوئے آئینے میں ایک لمحے کے لیے میں نے صابن کے پھین سے نظریں ہٹا کر اپنے چہرے کو دیکھا۔ اپنی چنیاں سی آنکھوں کا جائزہ لیا اور اچانک میری نگاہ بائیں کینٹی پر جا پڑی۔ میں نے دیکھا وہاں ایک سفید بال بچہ۔ اور سیاہ بالوں کے درمیان تکمیں تاری طرح چمٹا ہوا تھا۔ دوسرے بالوں کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اچھی طرح اس کا جائزہ لیا کہ کہیں مجھے دھوکا نہ ہوا ہو۔ لیکن واقعی وہ ایک سفید بال تھا۔ سفید بال۔ Gray hair۔ میری امیدوں کا۔ میرے ارمانوں کا روپائی چنا۔ میرا جی چاہا کہ میں اُسے ایک مرتبہ تو چوم ہی لوں۔ بائیں ہاتھ کی سیدھی انگلی سے اُسے چھو کر میں نے اپنا پونا چوم لیا۔ صابن کے جھاگ کو اپنے چہرے پر اتنی حالت میں چھوڑ کر میں جلدی جلدی نیچے گتوں پر بیٹھ کر بچے کو قیر ل گیا۔ میں نے اُسے اپنی کینٹی دکھا کر کہا ”دیکھنا یہاں ایک سفید بال بھی ہے؟“

تھوڑی سی تلاش کے بعد تو قیر نے اُسے ڈھونڈ نکالا اور کہا ”ہاں ہے! کیا میں اسے اُکھا ڈروں؟“  
میں نے فوراً اپنے سر کو جھک دے کر ہٹا لیا اور کہا ”نہ انا! کہیں ایسا ظلم نہ کرنا۔ میری جان نکل جائے گی۔ میری صحت خراب ہو جائے گی۔“

اپنے کمرے میں واپس آ کر میں نے جھاگ کو چہرے سے پونچھ ڈالا اور شیو نہیں بنائی۔ پھر میں کرسی کھینچ کر شیشے کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا ”میری پیری کے پیامبر! تو دبے پاؤں میرے گھر آیا ہے ڈرتے ڈرتے جھپکتے جھپکتے لیکن میں ایک مفلس اور نادار ادھیڑ عمر کا آدمی ہوں۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خاطر کروں؟ لیکن اس قدر مسرور ہونے کے ساتھ ساتھ تم میں تم سے ناراض بھی ہوں۔ بتاؤ تو تم اتنی دیر سے کیوں آئے۔ تمہاری راہ تکتے تکتے میں نے حشر سے کئی دن گزار دیے۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے میں نے کئی راتیں سیاہ کر ڈالیں اور تم اتنی دیر کے بعد آئے اور اگر تمہیں دیر ہی سے آتی تھی تو اسکیلے کیوں آئے؟“

کیا تمہارے گروہ کو یقین نہ تھا کہ میرا سر تسلیم تمہارے لیے ہمیشہ خم رہتا ہے۔ کیا تمہارے قہید کو اعتبار نہیں آتا تھا کہ میرا سر نیاز اُن کے آستانے پر ازل سے جھکا ہوا ہے؟  
بتاؤ تا تم اسکیلے کیوں آئے؟

میں اپنے سفید بستر پر سواری رنگ کی پلش کی رضائی لپیٹے بیٹھا تھا کہ میرا سب سے چھوٹا پوتا محمود میرے پاس آ کر کھینچ لگا ”بابا جان! کئی دو میں لتو لوں گا۔“ میں نے نیچے کے نیچے ہاتھ پھیر کر اُسے دونی نکال کر دی۔ وہ دونی لے کر تین دن سے دوڑا۔ میں نے پکار کر کہا ”جان بابا آہستہ“ اُس نے میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا پر اس نے اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ اُسے اس طرح دوڑتے ہوئے دیکھ کر مجھے اس کے ابا کا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بھی اسی طرح دوڑا کرتا تھا۔ اسی طرح ضد کیا کرتا تھا اور ایسے ہی روتا تھا۔

اور میرا سب سے بڑا پوتا کالج میں داخل ہو کر کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا ہے۔ بلیزر پہنے ٹینس کا ریکٹ بغل میں دبائے میرے پاس سے گزرا کرتا ہے اور مجھے بڑے ادب سے سلام کیا کرتا ہے۔ میں اس کے سلام کا جواب ہمیشہ ”جیے یو“ کہہ کر دیا کرتا ہوں۔ مجھے بس یہی ایک دعا آتی ہے اور یہی اچھی لگتی ہے۔ کبھی کبھار وہ میرے پاس رُک کر

پوچھا کرتا ہے ”بابا جان! آپ کے زمانے میں بھی کالج میں ٹیلیویشن تھی نہ تھا؟“ تو میں مومن کا دیوان بند کر کے اور اپنی عینک اتار کر آہستہ سے کہا کرتا ہوں ”جب ہم تمہارے کالج میں پڑھتے تھے بیٹا تو سنا کرتے تھے کہ ٹیلیویشن ایجاد ہو چکا ہے اور امریکہ میں اس کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اس وقت تھیٹر کہاں سے بنتا۔ یہ ہمارے بہت بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو اس تھیٹر کی جگہ لائبریری ہوتی تھی اور اس کا لائبریرین اچھی عمر کا ایک سندھی تھا جو کب کا مرکھپ چکا ہوگا۔“

میرا چھوٹا پوتا آ کر کہتا ہے ”بابا میرا تو دیکھو! تمہیں گھمانا آتا ہے بابا؟“

میں چمکار کر کہتا ہوں ”اچھا ہے جان بابا۔ بڑا اچھا۔ اب مجھے گھمانا نہیں آتا۔ اب تم گھماؤ۔“

اور میرا پوتا اپنا منٹا ہاتھ کھول کر میری طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ”لو اتنے بڑے ہو گئے اور تو گھمانا نہیں آتا۔“

میں ہنس دیتا ہوں اور میرا پوتا بھی ہنسنے لگتا ہے۔

میری پوتلی آ کر کہتی ہے ”بابا سا راون لینے کیا کرتے رہتے ہو۔ مجھے ”دیوان غالب“ ہی پڑھا دیا کرو۔“

اور میں کہتا ہوں ”دیوان غالب“ کسی سے پڑھا نہیں کرتے بیٹا! خود ہی سمجھا کرتے ہیں اور پھر تمہارے

”دیوان غالب“ کو میں کیا پڑھاؤں گا۔ ہزارے زمانے میں تو ”دیوان غالب“

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

کاغذی ہے پیر بن ہر پیکر تصویر کا

سے شروع ہوا کرتا تھا اور تمہارے ”دیوان غالب“ کی سب سے پہلی غزل

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

کے شعر سے شروع ہوتی ہے۔“

اور میری پوتلی روٹھ جاتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پچھنے دیوان کی ترتیب غلط تھی اور مجھ سے یہ برداشت نہیں

ہوتا۔

بہت دنوں کی بات ہے جب وہ اپنا دیوان میرے بستر پر چھوڑ گئی تھی اور میں نے اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا

تو اُس کے ہر صفحے پر ایس (S) لکھا ہوا تھا اور ایک جگہ (Shahid) لکھ کر کاٹا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بلا کر کہا ”اپنی کتابیں

اس طرح خراب نہیں کیا کرتے بیٹا اور کتاب پر صرف اپنا ہی نام لکھا کرتے ہیں!“

یہ سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اپنی کتاب لے کر واپس چلی گئی۔

میرے ان جگر گوشوں کا ابی شام کو دفتر سے آ کر ہر روز پوچھا کرتا ہے ”اباجی! گلوڈین پی تھی؟“ اور میں مسکرا کر

کہتا ہوں ”پی تھی بیٹا۔ پی لی تھی!“ اور وہ میری مسکراہٹ سے بھانپ جاتا ہے کہ میں نے دوا نہیں پی۔ چڑ کر کہتا ہے ”بابا

جی! پتہ نہیں آپ کو کیا ہوا ہے۔ میری بکواس پر تو آپ توجہ ہی نہیں دیتے۔“ میں پھر ہنس پڑتا ہوں اور کہتا ہوں ”تیری

بکواس سننے کے لیے ہی تو زندہ ہوں۔ بھلا مجھے اب اور یہاں کیا کرنا ہے؟“

اس دوران میں میرا بڑا پوتا پھر آ کر پوچھنے لگتا ہے ”بابا جان! آپ کے زمانے میں کالج کی مسجد اتنی ہی بڑی

تھی۔ تو میں پچھلے دن یاد کر کے کہتا ہوں ”مسجد کہاں تھی بیٹا! ایک چبوترہ ساتھ۔ اُس کے پاس یو۔ او۔ ٹی۔ سی کے لڑکے چاندی کیا کرتے تھے۔ اس کے پہلو میں انگریز پرنسپل کے نام پر ڈنکلف ملک بار تھی اور اس کے ساتھ پھل فروش کی ایک چھتری دکان۔ میں اس چبوترے پر نماز پڑھنے تو کبھی نہیں گیا تھا لیکن اپنے ہم درسوں سے سنا کرتا تھا کہ وہاں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے۔“

پھر وہ پوچھنے لگتا ہے کہ انا مک ریسرچ لیبارٹری میں.....

تو میرا بیٹا بات کاٹ کر کہتا ہے ”کیا فضول چیزیں پوچھتے رہتے ہو۔ تمہیں کالج کی تاریخ لکھتے ہے کیا؟“  
میرا پوتا خاموش ہو جاتا ہے اور میں اپنے بیٹے کو جھڑک کر کہتا ہوں ”پوچھنے دو تمہیں کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہے نا!“

اپنے زمانے کی ساری مشعلیں ایک ایک کر کے بچھ گئیں۔

اثر مر گیا۔ قمر سب کا جنازہ نکل گیا۔ ممتاز کی ہڈیاں بھی گل چکیں..... کو تہدق نے آ لینا اور وہ وہ بچے چھوڑ کر مر گئی..... اپنی عمر کو پہنچ کر ختم ہو گئی..... کا پتہ نہیں۔ مری نہ ہوگی تو مرنے والی ہوگی۔ ایک ایک کر کے سارے ساتھی چھوٹ گئے۔ بس زوہبی اور میں رہ گئے۔ دیکھوں ہم میں سے پہلے کون چلتا ہے!

گزر تے ہوئے سال ہم سب کو بوڑھا بنا دیتے ہیں لیکن دانشمند کسی کو بناتے ہیں۔

بڑھا پا بھی دراصل پتھر اور دھات کے زمانے کی طرح دھات کا زمانہ ہوتا ہے۔ دانٹوں میں سونے کے تار لگے ہوتے ہیں۔ بالوں میں چاندی ہوتی ہے۔ آنکھوں میں قمی کا رنگ ہوتا ہے۔ (اور شلواریں سکہ لٹک رہا ہوتا ہے۔)

انسان کی تین عمریں ہوتی ہیں۔ جوانی، درمیانی عمر اور ”ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے ہو۔“

بوڑھے آدمی اس لیے اچھے اچھے ہو جاتے ہیں کہ اُن سے بُرے بُرے ہوا نہیں جاتا۔

وہی بچے ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں جنہوں نے ہمیں بوڑھا بنایا ہوتا ہے۔

جوانی میں ہم مشکلات میں پھنسے رہتے ہیں بڑھاپے میں مشکلات ہمارے اندر پھنسی رہتی ہیں۔

جب آپ تجربات سے بھر جاتے ہیں تو اس قدر بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں کہ کوئی بھی آپ کے تجربے کو ملازمت نہیں دیتا۔

بھرپور بڑھا پا اس وقت آتا ہے جب آپ کی کالی ڈائری میں صرف ڈاکٹروں کے فون نمبر ہوتے ہیں۔

بڑھاپے میں ہر روز دو دن کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

بوڑھا ہونے میں یوں مزا نہیں کہ اُس کا مستقبل روشن نہیں ہوتا۔

بڑھاپے کا اندازہ اس وقت لگتا ہے جب چلے بغیر آپ کے پاؤں دُکھنے لگیں اور بستر سے اترے بغیر آپ کی ٹانگیں تھک چکی ہوں۔

بڑھاپے کا ایک مزا یہ بھی ہے کہ جس قدر شور کالیول اونچا ہوتا جاتا ہے سماعت کالیول نیچا ہوتا جاتا ہے۔



- ☆ جب آدمی جھولا کرسی میں بیٹھا ہو اور اُس کو ہلانا نہ سکتا ہو اس وقت وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔
- ☆ مجھے اس وقت یقین آ گیا کہ میں واقعی بوڑھا ہو چکا ہوں جب ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس نے پوچھا آپ چائے پیئیں گے یا کافی یا ماہ اللہ عم؟
- ☆ بوڑھے ماضی میں رہنا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ ماضی بڑھاپے کے مقابلے میں کھلا وسیع و عریض اور لمبا چوڑا ہوتا ہے۔
- ☆ جب آدمی بس میں اپنی سیٹ چھوڑ کر کسی خاتون کو دینی چاہے اور اس سے کھڑے نہ ہو جائے تو سمجھئے بوڑھا ہو چکا ہے۔
- ☆ سو سال زندہ رہنے کا ایک راز ہے.... سانس نیتے جاؤ!
- ☆ اکیلے بوڑھے ہونا بڑی دردناک بات ہے۔ میری بیوی ابھی تک وہیں کھڑی ہے جہاں کئی سال پہلے کھڑی تھی۔
- ☆ سڑک میں اپنے ہاتھ دھونے اور سیدھے چلنے پر جس قدر کوشش کرنی پڑتی ہے اس سے ایک بوڑھے کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔
- ☆ بوڑھا ہونے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جلدی نہ کرے۔ بس آہستہ آہستہ بڑھاپے میں داخل ہو۔
- ☆ آدمی اس وقت پورا بوڑھا ہو جاتا ہے جب اپنے سارے دانت ایک گلاس میں ڈالنے کے قابل ہو جاتا ہے۔
- ☆ کئی بڑھے جوانی میں رہنا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہاں سب کچھ سستا پڑتا ہے۔
- ☆ لمبے سفر پر جب ابھی نقدی ہو اور طاقت ختم ہو جائے تو سمجھو کہ بوڑھے ہو گئے۔
- ☆ بڑھاپے کا کچھ طے نہیں ہے۔ آدمی ایک صبح اٹھتا ہے۔ منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے اور وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔
- ☆ آدمی بوڑھا کب ہوتا ہے:
- ☆ جب بول میں جا کر ادھر ادھر جنود لینے کے بجائے سینود کیٹھنے لگ جائے اور قیمتوں کا موازنہ کرے۔
- ☆ جب اس کو 8 کا ہندسہ 3 نظر آنے لگے۔
- ☆ سیر کے لیے جائے اور جا کر بیچ پر بیٹھ جائے اور سارا وقت بیٹھ کر یہ سمجھے اُس نے میری کرلی۔
- ☆ جب اس کو سارے سوالوں کے جواب آتے ہوں اور کوئی بھی اس سے سوال پوچھنے والا نہ ہو!
- ☆ جب ہڈیاں سخت ہو جائیں۔ ناڑیاں سخت ہو جائیں..... نہیں جناب دل سخت ہو جائے!
- ☆ جب آدمی اٹھنا چاہے اور اٹھ نہ سکے۔ ہنس کے دکھا دے۔
- ☆ آدمی اُس وقت جوان ہوتا ہے جب صبح گیاراج میں سے نکال کر سٹارٹ کرے تو سوئی صفر پر پہنچی ہوئی ہو اور بوڑھا اُن دنوں ہو جاتا ہے جب گیاراج میں پہنچے ہمیشہ پیروں کی ٹینگی فل پائے۔
- ☆ جب آرام کرنے میں زیادہ وقت لگے اور تھکنے میں کم تو سمجھو کہ بڑھا پا آ گیا۔
- ☆ بوڑھا ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہر وقت چھوٹوں کی نصیحتیں سننا پڑتی ہیں۔

بڑھاپے سے گریز کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی چند نئے احمقانہ رویے سیکھ لے۔  
جب آدمی یہ سیکھ جاتا ہے کہ اُسے سوچ کر قدم اٹھانا چاہیے اُس وقت قدم اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔  
بڑھاپے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کوئی تمہاری کہانی نہیں سنتا اور کوئی تمہاری نصیحت پر عمل نہیں کرتا۔  
بہت سے آدمی بس زندگی میں بوڑھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جیسے جیسے آدمی بوڑھا ہوتا جاتا ہے ویسے ہی اس کی دواؤں کی انماری بڑی ہوتی جاتی ہے۔  
بڑھاپے میں ہرانگ میں درد ہونے لگتا ہے اور جس میں نہیں ہوتا وہ کام کانٹیس رہتا۔  
بڑھاپے میں جب آپ اس بلندی پر پہنچ جاتے ہیں کہ کوئی کچھ ہی کہے آپ کو تکلیف نہیں ہوتی اس وقت کوئی  
بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا کوئی کچھ بھی نہیں کرتا۔

زندگی میں بس ایک بڑھاپا ہی ایسی کمال کی چیز ہے جو بغیر کسی محنت اور کوشش کے خود بخود آ جاتا ہے۔  
دادا بننے سے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ دادا کی کاخاند بننے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔  
آدمی اس وقت پورا بوڑھا ہو جاتا ہے جب ایئر ہوٹس کی طرف دیکھنے کے بجائے کھانے کی ٹرے پر غور کرنا  
شروع کر دیتا ہے۔

ہر شخص لمبی عمر کا خواہاں ہے لیکن بوڑھا ہونا کوئی نہیں چاہتا۔  
بڑھاپے سے دور رہنے کے لیے نئے خیالات اپناتے رہنا چاہیے اور پرانی عادتیں چھوڑتے جانا چاہیے۔  
آدمی زندگی گزارنے سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ زندگی میں دلچسپی نہ لینے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔  
بوڑھا ہونے سے بھی ایک بُری بات یہ ہے کہ بڑھا بوڑھے ہونے سے انکار کر دے۔

بوڑھے ہونے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آدمی دیر سے بوڑھا ہوتا ہے۔  
اگر پرانے فرنیچر کی طرح پرانے بڑھوں کی بھی ایسی قدر افزائی ہوتی تو پھر بڑھاپے کا مزہ تھا۔  
ایک شادی شدہ جوڑے کو بڑھاپے کے لیے صرف اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا چاہیے۔  
جو لوگ بڑھاپے میں مزے کی زندگی گزارتے ہیں انہوں نے جوانی میں ضرور چھوٹی چھوٹی خوشیاں خیرات کی  
ہوں گی۔

آدمی سالوں کے گزرنے سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ اپنے اصول چھوڑ دینے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔  
چالیس برس کی عمر جوانی کا بڑھاپا ہے اور پچاس برس کی عمر بڑھاپے کا بچپنا ہے۔  
میں بوڑھا آدمی ہوں اور میں نے بڑے خوفناک دن اور دردناک راتیں گزاری ہیں اور کئی کئی سال بڑے  
بھیا تک اندیشوں میں گھرا رہا ہوں..... لیکن یہ سارے واقعات مجھ پر گزرے نہیں۔ بس مجھے دور سے ہی  
ڈراتے رہے اور میری زندگی اجیرن کرتے رہے۔

بوڑھے ہونا ایک بُری عادت ہے جو انسان بڑی عمر میں پہنچ کر سیکھ جاتا ہے۔ اگر وہ مصروف رہے اور مسجد آتا  
جاتا رہے تو پھر یہ بُری عادت پڑ ہی نہیں سکتی۔

- ☆ اگر کوئی شے "بوڑھی" یا "پرانی" یا "عمر رسیدہ" ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ یہ چیز رہنے کے قابل تھی۔ اس لیے رہتی چلی آ رہی ہے اور رہتی چلی جائے گی۔
- ☆ جو شخص بیس برس کی عمر میں خوبصورت نہیں اور تیس برس کی عمر میں مضبوط اور طاقتور نہیں اور چالیس برس پر پہنچ کر امیر نہیں اور پچاس برس پر دانشمند نہیں تو پھر سمجھ لیجئے کہ وہ کبھی بھی خوبصورت امیر سمجھدار اور طاقتور نہیں رہا۔
- ☆ بڑھاپے میں جب نیلفون کی گھنٹی بجتی ہے تو بڑھا کبھی بھی فون نہیں اٹھاتا کہ میرے لیے تھوڑی ہوگا!
- ☆ دل کی عمر کار از سفید بالوں سے لگایا جاسکتا ہے۔
- ☆ عورت اپنی عمر کے بارے میں اُس وقت جھوٹ بولنا شروع کرتی ہے جب اس کا چہرہ سچ بولنا شروع کر دے۔
- ☆ جب آدمی میڑھیاں چڑھتے وقت اور میڑھیاں اُترتے وقت ایک سارے جوان ہوتا ہے اور جب میڑھیاں اُترتے وقت بھی اس کی سانس پھول جائے تو وہ بڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔

## بزرگ افراد کا یوم

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے شروع تک تو بزرگوں کی عزت اور بزرگوں سے محبت مغرب میں بھی ایسے ہی تھی جیسے ہمارے یہاں مشرقی ممالک میں ہے۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد یورپ اپنی دھن میں مصروف ہو گیا۔ بہت زیادہ مصروف۔

وہاں رشتوں میں رخنے پڑنے لگے اور خاندان اور گھریلو زندگی اور کنبے کی زندگی میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ صنعتی ریل پیل اور دولت کی افراط نے جہاں سارے انسانی رشتوں پر شیون مارے وہاں بوڑھے بزرگوں بوڑھے عزیزوں اور بوڑھے لوگوں پر مصروف معاشرے کی توجہ سب سے کم ہو گئی۔

مافی اور معاشی طور پر تو بوڑھے لوگ.... کسی قسم کے "خطرے" کا شکار نہ ہوئے لیکن جذباتی اور "تعلقاتی" پر انسانی گردہ سے پھٹ گئے اور تقریباً آدھی صدی تک بے توجہی کا شکار رہے۔

اس کے بعد مغرب کے مفکروں اور دانشوروں اور سیاستدانوں نے اپنے بزرگوں کی طرف دوبارہ توجہ دی اور انہیں "سینئر سٹیزن" کا نام دے کر دوبارہ معاشرے میں.... اُن کا کھویا ہوا مقام دلانے کی جدوجہد شروع کر دی۔

وہ دن اور آج کا دن اب وہاں سینئر سٹیزن ڈے اور Senior Function اور..... سینئر سٹیزن Occasion بڑے شوق سے منایا جاتا ہے.... مشرق کے لوگ اور تیسری دنیا کے باسی بھی چونکہ ولایت کے مہذب دنیا کی پیروی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اس لیے وہ بھی اس قسم کے تہوار منانے ضروری سمجھتے ہیں جو ترقی یافتہ دنیا میں منائے جاتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ بوڑھے اور بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ ہمارے معاشرے کا ایک اٹوٹ جزو ہیں اور ان کے بغیر ہمارا معاشرہ مکمل نہیں ہوتا۔ ہم بہ امر مجبوری اس قسم کے ڈے منانے پر مجبور ہیں....

اب یہ تو ہوئی ناں میری جذباتی بات اور وابستگی کی بات.... لیکن اگر ہم اپنی کچی روایت کے باوصف اپنے

ہیں کی حالت پر نگاہ ڈالیں تو بڑے معاشرے کی مختلف ٹکڑیوں میں..... کہیں کہیں..... ان کی زندگی ویسی پُر وقار نہیں محسوس کی جاتی کہ ہمارے باپ دادوں کے زمانے میں تھی۔ وہ بالکل بھلائے تو نہیں گئے البتہ..... بے توجہی کا شکار ضرور ہیں۔ مجھ سے ابھی کوئی پوچھ رہا تھا کہ بزرگ کب ہوتا ہے۔ یعنی کوئی سینئر سٹیزن کب ہوتا ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ عزت میں جب وہ ریٹائر ہو کر گھر آ جائے۔

اور دوسرا کام کاج، تجارت، صنعت، دکانداری کرتے ہوئے وان پرست دور میں داخل ہو جائے۔ ایک تو بچپنا ہوتا ہے۔ ایک گھر بہت دور ہوتا ہے اور اس کے بعد وان پرست دور ہوتا ہے۔ جب گھر کا بڑا دکان کی چابیاں بیٹے کے ہاتھوں میں آتی ہیں اور باقاعدگی سے محلے کی مسجد میں جانے لگتا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد یا وان پرست دور کے بعد یا سینئر سٹیزن بن جانے کے بعد محلے کی مسجد میں جا کر نماز شروع کرتے ہیں ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہاں سینئر سٹیزن کو ایک روحانی اور معاشرتی کلب میں مشاقت داخل جاتا ہے۔

## ”خوبی“

1- جب انسان میں کوئی چیز گنوانے کے قابل نہ ہو میرے آقا تو پھر اُسے سال ہی گنوانے پڑتے ہیں۔  
2- جو شخص یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس نے کمال حاصل کر لیا ہے اور نکتہ عروج پر پہنچ گیا ہے تو سمجھنے کہ وہ فوت ہونے کے قریب ہے۔

3- بڑے درخت پھل زیادہ نہیں دیتے، سایہ زیادہ دیتے ہیں۔  
4- لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ تم نے کتنی جلدی کام کیا۔ یہ یاد رکھتے ہیں کہ کیسا کام کیا۔  
5- دنیا میں سب سے بڑی لذت اُس کام کے کرنے میں ہے جس کو لوگ مشکل سمجھیں اور یہ کہیں کہ یہ کام نہیں ہو سکتا۔

## "Old"

1- بالوں کے گرنے سے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا میرے آقا! جب وہ اپنے اصول چھوڑتا ہے اور Ideal چھوڑتا ہے پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ سال چہرے پر چھریاں ڈال دیتے ہیں اور ہمت اور امید کو چھوڑ دینے سے روح پر چھریاں پڑ جاتی ہیں۔ پریشانی، خوف، حزن و ملال، نا اُمیدی، مایوسی یہ انسانی سر کو جھکا دیتی ہیں اور روح خاک میں ملنے لگتی ہے۔

2- ایک پُر سکون بڑھا پا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان نے جوانی اچھی گزاری اور شرافت سے گزاری۔  
3- میرا تاج محلہ زراعت میں بیلدار تھا اور اپنی ماہوار تنخواہ میں سے بھی ہر مہینے کافی کچھ بچا لیتا تھا۔ (اس کے بچے اُس کو Old کہتے ہیں)۔

4- بڑھاپے کا ایک یہ فائدہ بھی ہے جی کہ انسان ایک بار جھکنے میں دو چیزیں اٹھا لیتا ہے (ایک پڑی ہوئی ہو تو سوچتا

ہے جب دو اکٹھی ہو جائیں گی اس وقت اٹھاؤں گا۔

5- جو عورتیں اپنی زندگی میں صرف خوبصورت رہی ہوتی ہیں ان کے لیے تو بڑھاپا موت ہے جی (شمسی) بیگم صاحبہ۔

6- جب دوست ایہ کہن لگ جان کہ شاہ جی آج تاں بہت جوان نظر آ رہے او سمجھو بڑھاپا آ گیا اے اور چھا گیا اے۔

7- میں بوڑھا آدمی ہوں اور میں نے بڑے خوفناک دن اور سہناک راتیں گزاری ہیں اور کئی کئی سال انڈیشوں نے مینوں مارکٹ کے فنا کر دتا لیکن یہ سارے واقعات میرے پر وارد نہیں ہوئے بس ڈرانڈے ای رہے۔

## "Old Age"

☆ بڑھے ہونا ایک نہایت ای بُری عادت اے جو نسلی انسان بڑی عمر ماں پہنچ کے سکھ جاتا اے۔ اگر اوہ مصروف رہے اور مسجد آندا جاندا رہے تاں ایسے بُری عادت پے ای نہیں سکدی۔

☆ ڈاکٹر نے کہا "اماں! میں تیریاں سب بیماریاں سن لیاں ایں۔ میں آپ نوں جوان نہیں بنا سکدا۔" اماں بولی "میں کد کہندی ایں جوان بنا دے۔ میں تاں کہندی ایں بڑھا کی بنا دے۔ ایہ راہ ماں کیا پھسار رکھیا اے۔" دل کی عمر کا اندازہ سفید بالوں سے نہیں لگایا جاسکتا جی۔

☆ واہ جی واہ ایہہ عینک آپ پر بہت ای سوہنی لگدی اے۔ دس سال جوان لگدے او اپنی عمرتے۔ پھر میں یہ نہیں لوں گی۔ کیونکہ جب بھی اُتاروں گی عمر میں دس سال کا اضافہ نظر آیا کرے گا۔

☆ لڑکیوں نے پوچھا "اماں! آپ اس عمر میں پہنچ کر بھی اتنی خوبصورت نظر آتی ہیں تو آپ کونسا میک اپ استعمال کرتی ہیں۔" کہنے لگی "میں ہونٹوں پر سچائی کی سرخی لگاتی ہوں۔ آواز میں دعا کے الفاظ استعمال کرتی ہوں۔ آنکھوں میں ترس کا اور شفقت کا سرمہ ڈالتی ہوں۔ ہاتھوں پر خیرات کا لوشن استعمال کرتی ہوں۔ جسم کے لیے اپنے فکر کے لیے صداقت اور راستی استعمال میں لاتی ہوں اور دل کے لیے محبت کی ٹانک استعمال کرتی ہوں اور اب میں آپ کے سامنے ہوں۔"

☆ دیکھیں جی! اگر کوئی شے بوڑھی ہے یا پرانی ہے یا عمر رسیدہ ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چیز رہنے کے قابل تھی اس لیے رہی اور رہتی چلی جا رہی ہے۔ پُرانے خاندان ہیں۔ پُرانی رسمیں ہیں۔ پُرانی روایتیں ہیں یہ سب اس لیے زندہ ہیں کہ زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ ان کے تسلسل کے ساتھ قائم رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی یہ گارنٹی والی چیزیں تھیں۔ (ان کے تسلسل کی گارنٹی اس بات کی ضامن ہے کہ کوالٹی اچھی تھی) آپ ایک اعلیٰ پُرانی قدر کوئی چیزوں کے طوفان میں غرق کر دیں تو نئی چیزوں سے جب زمانہ اچھائیاں اخذ کرے گا تو وہ پُرانی اعلیٰ قدر بھرا بھرا کمر ساتھ آ ملے گی۔ پرانی وضع کی مہمان نوازی پُرانی شرافت، اخلاقی تقاضے، تجارت

میں ایمانداری یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ مر نہیں سکتیں۔ لوٹ لوٹ کر پھر واپس آئیں گی۔

☆☆☆

خاں صاحب اپنے خیالوں میں غلطیاں و بچپاں رہتے تھے، لیکن مجھ پر اللہ کی خصوصی رحمت تھی۔ ہر مقام پر ہر جگہ جو بخت مجھے خصوصی توجہ بڑے وقار سے مفتا مفتا مل جاتی۔ اس کی نہ میں حقدار تھی نہ میرا کوئی میرٹ ہی تھا۔ بس کچھ اوپر تھے رحمت تھی جو توجہ خاص بن کر مجھ پر ہلکی ہلکی پھوار بن کر برستی رہتی۔

یہاں ہی سے میرے اس اعتقاد کی پیروی لگی کہ صحت، عزت اور رزق خصوصی طور پر اللہ کی دین ہے اور وہ جنسوں کو بعض پر ترجیح دیتا ہی چلا آیا ہے۔ اس کے باوجود جو سعی اور جہد کا حکم بھی ہے کہ انسان اپنی محنت سے ان نعمتوں کو اپنے نو پر حلال کرتا ہے۔

جب میں گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے چکی تو مجھ پر پروفیسراں کی توجہ نارنج کی طرح پڑنے لگی۔ مجھے کالج میں پروفیسر سعید سے دوبارہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں ان سے دھرمسالے میں پہلے بھی پڑھ چکی تھی۔ دسویں کا امتحان دینے کے بعد میری والدہ مجھے اسٹی لڈ ہو رہی تھیں نہ چاہتی تھیں۔

دھرمسالہ میں لڑکوں کا کالج تھا جہاں میرا بھائی فٹ ایئر میں داخل تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اُن کے ساتھ کالج میں مخلوط تعلیم کی باتوں کے حوالے ہو جاؤں۔ میری والدہ مجھے آگے پڑھانا بھی چاہتی تھیں اور نظروں سے دور بھی بھیجتے نہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے لبرل تعلیم یافتہ والدین کا ایک گروپ بنایا اور ان کی اعانت اور حوصلہ افزائی سے لورڈ دھرمسالہ میں بازار سے کچھ ہی اوپر ایک کوچھی کرائے پر لی اور ایف اے تک کلاسیں شروع کرویں۔

اس کالج میں صرف ہمارا Batch زیر تعلیم تھا۔ ہمارے گروپ میں مولانا گیان سنگھ، مہندر کالسی اور طیبہ لکا بڑے سچے مہرانوں کی سادہ سی لڑکیاں تھیں۔

ہمارے کالج سے وہ سڑک گزرتی تھی جو اوپر دھرمسالہ کی طرف رواں دواں تھی۔ اوپر دھرمسالہ انگریزوں کے گورکھا پٹنن کی چھاؤنی تھی اور یہاں ہی ایک بڑا وی آئی پی قسم کا بازار تھا، جس میں ایک پارسی تاجر ناروجی کی دکان تھی۔ یہاں ٹین کے ڈبوں میں پیک پھل، جیم چیز، مکھن، Sausages اور وہ سارا الم غلم ملتا تھا جو انگریزوں کے سوجر کھانا پسند کرتے تھے۔

گورکھا سپاہیوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ رہ رہ کر ساری شیخیاں اور Tatste اپنا لیے تھے جن کی وجہ سے وہ ہر قوموں سے مختلف ہو گئے تھے۔ ترائی کی یہ سڑک کو تو والی بازار کے چوراہے سے بائیں ہاتھ تھی۔ دائیں ہاتھ نکلنے والی سڑک گھنٹیا کی طرف جاتی تھی جہاں ایک چھوٹی وائر فال گھنٹیا تھی۔

اس سڑک پر کو تو والی بازار سے کوئی دو سو میٹر دور ”ہالیڈ ٹا کیٹ“ سینما تھا۔ سینما سڑک سے اتر کر بنایا گیا تھا، لیکن Bill Board کے لہجے میں لگتے تھے اور بازار میں بھی عین چوراہے پر بڑا بورڈ نصب ہوتا جس پر لکھا ہوتا

اس ”آج شب کو“ ہم نہ جانے کیوں کبھی سمجھ نہ پائے اور اسے ملا کر آجسکو ہی پڑھتے رہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ

آجسکو کے کیا معنی ہیں اور کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ اس سینما کے مالک دھر مسالے میں ہمارے ہمسائے تھے اور پشاور کے ہندو Settlers تھے۔ اپنی وضع قطع سے یہ بھائیہ گھرانہ پٹھان لگتا تھا۔ ان کے مرد سروں پر پٹھانی پکے پہنتے اور لڑکیاں باہر نکلنے پر سروں پر چادریں اوڑھ کر جایا کرتیں۔

وملا گیان سنگھ کا گھر ہمارے یعنی 1۔ ٹھیل روڈ جانے والی سڑک کی بائیں طرف تھا۔ اس سے اوپر گھنا جنگل اور لیڈیز کلب تھا۔ گیان سنگھ بزنس میں تھے۔ اُن کی بیس دھرمسالہ سے کاگٹڑہ اور دھرمسالہ سے پٹھان کوٹ کی طرف شیڈول سے چلتی تھیں۔ وملا کا ایک بھائی سندھ میں حرمتا بنے میں مارا گیا تھا، لیکن یہ عہد نہ میڈیا کا تھا۔ نہ ٹیلی کا۔۔۔ وہ اپنی امارت کا اظہار گفتگو میں نہیں کرتے تھے۔ وملا اور میں نے بی اے تک اکٹھے ہی تعلیم پائی۔

دوسری اہم لڑکی مہندر کالسی تھی۔ وہ کالسی سٹیٹ کی مہارانی کی بیٹی تھی اور مہارانی بھی وہ ٹھسے دار خاتون جو مردانہ لباس پہنتی تھی۔ برجس چڑھا کر سر پر سولو ہیٹ لے کر وہ بینڈ ماسٹروں جیسی تھڑی بنگل میں دبا کر وائسرائے کے دربار میں جایا کرتی اور وائسرائے بہادر اُس کے لیے کھڑا رہتا۔

مہندر کالسی سکول سے کچھ ہی اوپر ایک خوبصورت سی کوٹھی میں رہتی تھی۔ پیدل کالج آتی اور میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا کرتی۔ نہ کبھی اُس کے ہونٹوں پر کالسی ریاست کا نام آیا نہ اُس نے اپنی پھوپھی صاحبہ کی کبھی کوئی ذکر کیا۔ وہ عہد Status کو بگھارنے کا نہیں تھا۔ لوگ اپنی خوبیوں کو چھپانے اور عوام کا حصہ بنے رہنے پر مان کرتے تھے۔

تیسری وی آئی پی لڑکی طیبہ بنتی اللہ تھی۔ ان کے والد کی بھی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اگر کبھی آپ کو دھرمسالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو یا آپ نے اس کا نقشہ دیکھا ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شہر پہاڑی پر آباد تھا۔ ایک سڑک تھی جو لوز دھرمسالہ سے آہٹ دھرمسالہ کی طرف کوٹوالی بازار کے چوراہے سے ہو کر جاتی تھی۔

اس شہر سے نشیب کی طرف بہت بڑی وادی تھی جس میں بھیدی خانہ اور ریاست نکا قتیق اللہ تھی۔ طیبہ کا خاندان دھرمسالہ میں ہی قینی موڑ والی سڑک پر تھا۔ طیبہ کالج بھی پیدل ہی آتی تھی حالانکہ اُن کے گھر میں کار تھی۔

میں نے ان لڑکیوں کا تعارف آپ سے اس لیے کرایا کہ ان کے خیر والدین کی بددلت میری والدہ نے ایک پرائیویٹ کالج کھولا۔ جس میں نائم صرف ایک پروفیسر مس متھانی تھی جو کیرالا سٹیٹ سے آئی تھی۔ ان کے علاوہ باقی تمام پروفیسر گورنمنٹ کالج فار بوائز سے چل کر آتے تھے۔

یہاں پر مجھے پروفیسر سرداری نعل سے ریاضیات پڑھنے کا اتفاق ہوا اور حسن اتفاق ملاحظہ کیجئے کہ بعد میں کنیئر ڈ کالج میں بھی میں اور وملا گیان سنگھ ان سے میٹھ پڑھتے رہے۔ مس متھانی بھی ہمیں دوبارہ کنیئر ڈ میں اکنامکس پڑھاتی رہیں، لیکن پروفیسر سعید سے کنیئر ڈ میں ساتھ چھوٹ گیا۔

کشمیری النسل خواجہ سعید نے ہمیں ایف اے میں غالب کی چاٹ لگا دی۔ انہوں نے ہمیں پورا دیوان غالب شعر بہ شعر ترکیب در ترکیب، حرف بہ حرف پڑھایا۔ غالب کے ذومعنی، ابہام سے پر اور باعث بحث شعروں پر وہ عموماً کہا کرتے ”یہ بات یوں ہے اور وہ بات یوں ہے۔ سمجھ نہیں آتی۔“ یہ جملہ ہماری تفریح کا باعث تھا۔ تب ہمیں علم نہ تھا کہ اصلی تحقیق کی روح سمجھنے والے کا یہی رویہ اُسے زندگی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

”سائنس یوں کہتی ہے۔ مذہب یوں کہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ بات یوں ہے اور یہ بات یوں ہے۔“  
 ”ماں باپ یوں کہتے ہیں۔ بیوی یوں کہتی ہے۔ سمجھ نہیں آتی۔“  
 ”بہن بھائی یوں کہتے ہیں۔ دوست یوں کہتے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی۔“

پروفیسر خواجہ سعید سے دوبارہ گورنمنٹ کالج میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے نہ تو کبھی دھرمسالے کا ذکر کیا۔ نہ کسی قسم کی خاص مراعات ہی دیں۔ باقی تمام طالب علموں کی طرح انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ وہ ہر لیکچر میں عام طور پر چوتھی صدی ہجری کا ذکر نہیں نہ کہیں ضرور لاتے اور اُسے بیسویں صدی تک کھینچ کھانچ کر ایک ہی لڑی میں پرو دیتے۔ اُن کے سامنے ہم نے چوتھی صدی ہجری کا ذکر اتنی مرتبہ سنا کہ لڑکوں نے اُن کا نام ہی ”چوتھی صدی ہجری“ رکھ دیا۔ جب بھی وہ بھٹک کر آتے.... ہولے ہولے ”چوتھی صدی ہجری“ کی کھسر پھسر سنائی دیتی۔

دوسرے پروفیسر جن کا ذکر میں ذرا پہلے کر چکی ہوں اثر صاحب تھے۔ اثر صاحب بھی میرے معاملے میں Protective تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میری اردو کمزور ہے اور اردو ادب کی معلومات ناکافی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ جتنی حد تک میں میرے عیب و منفرت بائند رہیں۔ اُن دنوں میں لیڈی میٹیکل کالج سے سائنس کلاس میں شفٹ ہو چکی تھی۔ کرشن عمر سے بس لے کر گورنمنٹ کالج آتی۔ سائنس میں موی کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اب میرے ساتھ باڈی گارڈ کے طور پر لاہور آئے۔

مجھے اثر صاحب کی ایک خصوصی مہربانی آج تک یاد ہے۔

ففتھ ایئر کے امتحان تھے۔ جب میں کمرہ امتحان میں پہنچی تو مستمن اعلیٰ نے مجھے ہال میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ پتہ نہیں کیوں خاں صاحب اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن نہ وہ میری طرف بڑھے نہ مستمن اعلیٰ ہی کی طرف۔ شاید کسمسا کر رہ گئے۔

میں بھاگی بھاگی کنٹرولر امتحانات کے دفتر میں پہنچی.... وہ اقبال پر انگریزی میں کوئی مقالہ لکھ رہے تھے۔ مجھے حیرت سے پردستک دیتے دیکھ کر بولے ”کم ان چائلڈ۔“

میں اندر گئی اور لجاجت سے بولی.... ”سر میرا پرچہ ہے اور وہ مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔“

”بٹ چائلڈ! آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے۔ پرچہ آؤٹ ہو چکا ہے۔ انڈر ورا ب کوئی ہال میں داخل نہیں ہو سکتا....“

”میں کیا کرتی سر.... کرشن نگر سے بس نہیں ملی نام پر۔“

”کم ودی.... آؤ۔“

وہ آگے آگے چلے۔ میں میسنی صورت پیچھے پیچھے ہوئی۔ اس وقت اُن کی عمر بمشکل تمام چالیس یا پچاس برس تھی۔ لیکن وہ مجھے خزاں رسیدہ بوڑھے نظر آئے۔ پھر چائلڈ چائلڈ کہنے والا میرے لیے فادر فلدر بن گیا۔ پتہ نہیں انہوں نے مستمن اعلیٰ سے کیا کہا مجھے پرچہ بھی مل گیا۔ سیٹ بھی اور جوابات رقم کرنے والی خالی کا پی بھی۔

عجیب سا اتفاق ہے کہ اپنی نالائقی کے باوجود میں ففتھ ایئر میں فٹ آئی اور خاں صاحب سکینڈ.... پتہ نہیں یہ خاں صاحب کی کرم نوازی تھی کہ پروفیسروں کی مہربانی، لیکن ایک بار پھر مجھے اہلیت نہ ہونے کے باوجود اللہ کی مہربانی سے



عزت مل گئی۔

سعید صاحب اور اثر صاحب کے علاوہ دوسرے پروفیسراں بھی ہمیں زیادہ تر انگریزی میں پڑھاتے تھے اور بڑی اعلیٰ Guidance دیتے تھے۔

پروفیسر آفتاب احمد ہمیں تنقید کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ وہ زیادہ تر ایسی انگریزی کتابوں کا ذکر کرتے جن کا نام بھی ہم نے نہ سنا تھا۔ کبھی کبھی کچھ ایسی کتابیں اُن کے پاس ہوتیں جو وہ خاں صاحب کو اُدھار دے دیتے اور ایک طرح سے عمومی رابطے میں خصوصی توجہ کے مرتکب ہوتے۔ پروفیسر صاحب نے بہت بعد میں غالب پر بہت کام کیا اور انگریزی اور اردو دونوں میں معرکے کی کتابیں لکھیں، لیکن یہ باتیں بعد کی ہیں۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ہمیں عربی کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ وہ لیڈی میٹلیکن میں بی بی ٹی کی کلاسوں کو لیکچر دینے آئے کرتے تھے اور میری والدہ سے اُن کی واقفیت تھی۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے امی نے ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سے ہی استدعا کی کہ وہ میرا خیال رکھیں۔ جب بھی وہ ہماری کلاس لیتے ایک ہی جیسے سے لیکچر کا اجراء کرتے..... ”قدسیہ تو جدو.....“

جاتے وقت بھی وہ ہمیشہ پوچھتے..... ”قدسیہ کیا تمہیں سمجھ آئی؟“

کبھی کبھی جب وہ دروازے تک ہی پہنچے ہوتے تو کوئی نہ کوئی لڑکا ہولے سے کہتا..... ”قدسیہ تو جدو۔“

وہ بلیک بورڈ پر عربی حروف لکھتے۔ عربی میں جمع بنانے کے طریقے اور مثبتیہ کے لیے خصوصی انداز سمجھاتے..... مجھے شاید ایک حرف بھی پلے نہ پڑتا لیکن فقہ امیر میں چھٹیوں کے دوران جب میں کونے لگی تھی جہاں مجھے میری ڈاکٹر خال نے پروفیسر محمد صادق سے عربی کی ٹیوشن لگوا دی تھی۔ اتنے بڑے سکاڑھی محنت اور توجہ سے میں عربی کی گرانر کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔

لیکن سب سے زیادہ محبت ہمیں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے ملی۔

کلاس میں آ کر حکم لگاتے ”اٹھو اشفاق! یہ غزل پڑھو۔“

کبھی کہتے..... ”قرآن اس شعر کی تشریح کرو۔“

”بتاؤ تنازع فیہ کے ججے کیا ہیں؟“

اس کلاس میں خاں صاحب خوب کھل کھیلتے۔ جان جان کر اٹک اٹک کر شعر کو بے وزن کر کے پڑھتے۔ صوفی صاحب جھڑکیاں دیتے۔ وہ جھڑکیاں سہہ کر منہ بناتے۔ دوبارہ شعر پڑھتے اور زیادہ خرابی بسا پیدا کرتے اور لعن طعن سہتے۔ کسی اور کی باری بھی ہوتی تو خاں صاحب اُٹھ کر شعر پڑھنے لگ جاتے۔ یہاں ہی سے خاں صاحب اور صوفی صاحب کی چھیڑ چھاڑ سے گزر کر دوستی کی بنیاد رکھی گئی۔

صوفی صاحب ہمارے ساتھ پانچویں جماعت کے طالب علموں کا سا سلوک کرتے۔ ہم کسی پروفیسر کی آمد پر کھڑے نہیں ہوتے تھے، لیکن صوفی صاحب کے آتے ہی فوراً سیلوٹ کرنے کے انداز میں اُٹھ جاتے اور باجماعت سلام کرتے۔ ہمیں کھڑا پا کر وہ وعلیکم السلام وعلیکم السلام کہتے اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ پھر دو ایک شعر

پڑھ کر ان اشعار کی تقطیع کرتے

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

اُن کے منہ سے اشعار کی بندر بانٹ بڑا آسان سا کام لگتا، لیکن گھرا کر جب شعروں کو طبلے کی تھاپ میں سے کسی کوشش کی جاتی تو شعر کا ستیاناس ہو جاتا۔ صوفی صاحب جانتے تھے کہ کلاس میں ایک ہی گنیا آدمی ہے باقی سارا بھرت مال ہے۔ اُن کا من چاہا شاگردو اشفاق احمد ہی تھا..... عموماً جملہ یوں شروع کرتے..... ”اوائے پٹھانا ٹرن ٹو پیج تیسرے نمبر (52) اور غزل پڑھ۔“ خاں صاحب بڑی مشکل سے انہی کو تھوک لگا کر صفحہ باون نکالتے اور شعریوں پڑھتے کہ کوئی سمجھتا محنت احساس کسٹری میں مبتلا نہ ہو جائے۔

صوفی صاحب سے محبت اور دوستی کا رشتہ بھی ہمیشہ قائم رہا۔ جب خاں صاحب دیال سنگھ کالج میں پروفیسر لگ گئے تو کبھی کبھی صوفی صاحب سے اولیٰ محفلوں میں متحہ بھیڑ ہو جاتی۔

صوفی صاحب کہتے..... ”اوائے اشفاق! ملازم ہو گئے ہیں؟“

”جی صوفی صاحب۔“

”تنخواہ ملتی ہے؟“

”ہاں جی۔“

”پھر؟“

”جی..... پھر کیا؟“

صوفی صاحب دیکھا ہی جھڑکا لگاتے جیسا ایم اے میں صادر کرتے تھے..... ”اوائے تیری کمائی میں سے میرے لیے چھوٹی گوزی نہیں۔“

پکا سامند بنا کر خاں صاحب کہتے..... ”صوفی صاحب! خرچے ہی پورے نہیں ہوتے۔“

”ہاں تیرے جیسوں کی اپنی ضرورتیں کب پوری ہوتی ہیں۔ اوائے کم عقلو! تم نے تو ماں باپ کی خدمت نہیں

سمجھی۔ اللہ کا شکر یہ کبھی قرض حسنہ کی شکل میں ادا نہیں کیا۔ تم کو کیا پتہ استاد کے کیا حق ہیں؟“

”جی..... واقعی۔“

”واقعی کے بچے دفع ہو جاؤ۔“

اور جب خاں صاحب واقعی دفع ہونے لگتے تو صوفی صاحب کہتے..... ”اوائے اشفاق گھرا جانا..... کلچے اور

کشمیری چائے ملے گی..... میرے جیسے نان کلچے کوئی سارے شہر لاہور میں لگا کر تو دکھائے.....“

صوفی صاحب نے کبھی اپنی شاعری کی تعریف نہ چاہی تھی، لیکن کشمیری چائے اور نان کلچے کھا کر جوتالی نہ بجا

سکتے تھے۔ صوفی صاحب ناراض ہو جاتے۔

جب ایران کلچرل کپلیکس سے صوفی صاحب وابستہ ہو گئے تو ان کا ایک چھوٹا سا دفتر مال روڈ پر تھا۔ یہاں خاں

صاحب، تھم گئی سے جاتے تھے۔ میں بھی شادی کے بعد دو ایک مرتبہ اُن کے ساتھ گئی۔ صوفی صاحب نے بڑی مزیدار

کشمیری چائے کے ساتھ کچھ کھلائے۔

”صوفی صاحب! پلیز مجھے بھی ایسی چائے بنانا سکھا دیجئے.....“

وہ کچھ دیر متاثر رہے پھر مرے ہوئے لہجے میں ساری ترکیب سمجھائی۔ پھر مجھ سے اس ترکیب کا اعادہ کرنے کو

کہا۔ میں نے اعادہ کر دیا۔

بس کر کہنے لگے..... ”زبانی تو ترکیب ٹھیک ہے لیکن عمل کا مرحلہ سوچ سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ کیا تمہارا

ہاتھ میں ذائقہ ہے؟“

میں نے اپنے ہاتھوں پر نگاہ ڈالی۔

”ہاں جی ہے..... ہے صوفی صاحب۔“ خاں صاحب نے ہر زور سفارش کی۔

”لو پھر تو بات بن گئی..... ذائقہ اللہ کی دین ہے اشفاق یار۔ کوئی کوئی ساری عمر پکاتا ہے پر لذت پیدا نہیں

ہوتی۔ کوئی کوئی دو دن میں ماٹریک بن جاتا ہے۔“

صوفی صاحب نے مجھے خاص بات بھی مرحمت فرمائی۔ طریقہ بھی دل لگا کر سمجھایا، لیکن کھانا پکانا ایک پریم ریتی

ہے۔ کچھ ہاتھوں سے ایسی نہیں نکلتی ہیں جو کھانے پینے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ قبوہ بنانے میں جس محبت کی ضرورت تھی

مجھ میں اُس کی کمی تھی۔ نہ میں ویسارنگ پیدا کر سکی نہ خوشبو۔ یہی حال میرا تب ہوا جب اے حمید نے مجھے قبوے کی

خوبصورت پیالیاں، کشمیری قبوہ اور چینی تک دی، لیکن میرا رزلٹ پاس پاس ہی رہا۔

لوگوں کو کھانا کھلا کر خود خوشی حاصل کرنا پریم ریتی کا جزو عظیم ہے۔ میں اس کام کو ساری عمر کرتی رہی ہوں لیکن

سرت حاصل کرنا کبھی بھی میری نیت نہ تھی۔ میں تو اس نظریے سے لوگوں کے آگے کھانا پروستی رہی کہ وہ میری تعریف

کریں۔ میرے بچے ہوئے کھانے کو سہلائیں۔ خود تعریفی کی یہ خواہش پوری ہوتی رہی..... لوگوں میں میری خدمت کے

چرچے رہے.....

لیکن صوفی صاحب اور اے حمید جیسی چائے کبھی نہ بن سکی۔ شاید اسی وجہ سے میں نے کبھی نان کچھے بنانے کی

ٹرائی نہ لی۔ زندگی کے آخری دنوں تک خاں صاحب اصرار کرتے رہے کہ گیس کا تنور لے لو۔ کچھ نان، خمیری روٹی سب

سہولت سے بن جائیں گے، لیکن میں نے اس سکیم پر کبھی آمادگی کا اظہار نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھ میں پریم ریتی کی کمی

ہے۔ میرے ہاتھ میں ذائقہ نہیں۔

اب کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس معاملے میں نہ صوفی صاحب کی شاگردی کی نہ خاں صاحب کے

کہنے ہی پر گیس کا تنور لگایا۔ میں نے کچھ نیا سیکھنے کا موقع نہ نوادیا۔ انسان اسی طرح نئے مواقع کھو کر سوچتا رہتا ہے کہ اس

میں کشش پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کی توجہ سہولت سے حاصل کیوں نہیں کر سکتا۔ اصلی پرکشش انسان تو فعال پائینوں

کی طرح شکل بدلتا جاتا ہے۔ کبھی بھنور کبھی لہر..... کبھی گرداب اور کبھی پُر سکون تال۔

ان مہربان پروفیسر حضرات کے علاوہ ڈاکٹر محمد صادق کا ذکر بھی بہت ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنی توجہ کو

توازن میں رکھنے والے منظم اعتدال پسند اور بڑے ہی ڈسپلن والے تھے۔ کلاس میں کوئی کاغذ، چھلکا، بورڈ پر کوئی عبارت

بھی کھڑکی آڑے ترچھے بیٹھے لڑکے سب اُن کو پریشان کر دیتے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ کہتے لیکن اُن کی نظریں خشکیاں  
ہو جاتیں۔ اُن کے لیے لڑکے اور لڑکیاں سب برابر تھے۔ وہ کسی سے رورعایت نہیں برتتے تھے۔

آپ سے میں ذکر کر چکی ہوں کہ مجھے پہلے موسیٰ پھر لالو کا لُج چھوڑنے آیا کرتا تھا۔ پھر وہ کسی بیخ پر بیٹھ کر وقت  
گزراتا۔ ابھی مرد حضرات اپنی عزت نفس اور شرافت کی پاسبانی لڑکیوں کی طرح کیا کرتے تھے لیکن اتنی احتیاط کے  
بغیر پیر سے چھیڑ چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھی جب میں گھر جانے کے لیے ادول کے ساتھ ساتھ دھلوان کی طرف جانے والی  
تھی کہ پرچھتی تو موسیٰ میرے ساتھ سائے کی طرح ہوتا۔ کچھ مچلے پیچھے سے قوالی کرتے..... ”سگِ لیلیٰ سب لیلیٰ.....“ کہہ کر آیا  
میرا بھولا.....“

موسیٰ یہ تو نہ سمجھتا تھا کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں اور ان کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ لیلیٰ کون ہے اور سگِ لیلیٰ  
کس کو پکارا جا رہا ہے لیکن اپنی چھٹی حس سے وہ اس قدر جان گیا تھا کہ لڑکوں کی ازلی شرارت رنگ لارہی ہے۔ وہ پہلے  
سے زیادہ محتاط ہو گیا۔

ابھی مرضی کی شادی یینگ ریپ بغیر نکاح کے کسی کے ساتھ رہنا مُذَق لیے بغیر دوسری شادی کر لینا..... ایسے  
تصویرات اور ان سے وابستہ آزادی دُور کا خواب تھی لیکن لڑکے بالے تو ازل سے شوخ ہوا کرتے ہیں۔ غلیل کا نشانہ بنانا  
سنا پر پانی کا چھیننا چانک مارنا بلا وجہ کھانسنی سیٹی بجا کر توجہ لینا یہ تو بند بند سوسائٹی میں بھی رائج تھے۔

اب آپ آزادی کا فقدان کہہ لیجئے یا مشرقی اقدار کی سر بلندی۔ ابھی کالجوں میں مخلوط تعلیم کے باوجود طالب  
معلموں میں بڑے فاصلے تھے۔ معصوم چھیڑ چھاڑ چھپی ہوئی لگاؤ، تعلق جنس سے پاک تھا۔ محبت اگر ہو جاتی تو وہ ملنے  
مرنے کے ناجائز راستے تلاش نہ کرتی۔ ابھی محبت اور جنس الگ الگ تھیں۔ ابھی ایسی این جی اوز نہ بنی تھیں جو سکولوں میں  
جنس کی تعلیم پر اصرار کرتیں۔ کالج میں ایسے سوالنامے بھیجتیں جن میں پوچھا گیا تھا کہ بچپن میں کس کس نے آپ کو  
Child abuse کیا؟ کیا قریبی رشتہ دار بھی اُن کے ساتھ جنسی تعلقات رکھتے تھے..... ابھی ٹاپ سٹار بھی مائیکل جیکسن کی طرح  
Child abuse کے مقدموں میں ملوث نہ تھے۔ اگر تھے بھی تو میڈیا نے انہیں گھر گھر کی کہانی نہ بنا دیا تھا۔ انٹرنیٹ پر  
Child abuse کا تصور دُور کی بات تھی۔ ٹیلیفون ابھی سلف فون کے دور میں شامل نہ تھا۔ ابھی باتوں کے دوران ٹیپ ریکارڈر پر  
کھٹکھٹو کو ریکارڈ کرنے اور بعد ازاں اسے بلیک میل کرنے کی سہولت موجود نہ تھی۔ فون کے دوران تصویر بھی کھینچی جاسکتی  
ہے۔ اس کی ٹیکنالوجی انسان کے ہاتھ نہ آئی تھی۔ سائنس کی برکات ابھی اسلئے کی جدید تخریب کاری سے نا آشنا تھیں۔ ایسی  
رنگ برنگی ایجادات سے زندگی میں نیرنگی رنگارنگی اور تجرباتی عیاشی کی رفتار ہلکی تھی۔ ابھی آزادی کا تصور کم کم اور حیا میں لپٹی  
خوشی کا حصول زیادہ اہم تھا۔

اس روز ڈاکٹر صاحب کا لیکچر لہا ہو گیا تھا۔ پرنسپل صاحب کے دفتر سے کچھ دُور دھلوان کی طرف لڑکوں کی ٹولی  
دھنڑوں پر طبلہ بجا کر قوالی کی پریکٹس کر رہے تھے۔ پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کی طوالت وجہ بنی کہ لڑکوں کی قوالی نے  
موسیٰ کو گھبرا دیا۔ وہ گھبرایا ہوا ہمارے کمرے تک پہنچا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔ موسیٰ نے آج تک ایسی  
حرکت نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج جانتے ہوئے میں کچھ گھبرا گئی۔

اس وقت خاں صاحب کھانتے ہوئے باہر چلے گئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انہوں نے باہر جا کر موسیٰ کو سمجھا دیا ہوگا کیونکہ جب میں باہر نکلی تو موسیٰ نے ہلکا سا کھانس کر کہا..... ”وہ بی بی جی! آپ کی کلاس کا لڑکا آیا تھا۔ بولتا تھا کہ میں اندر نہ جاؤں.....“

اس سے زیادہ موسیٰ اور مجھ میں گفتگو نہ ہوئی۔

لیکن پروفیسر محمد صادق کے ساتھ کچھ دیر بعد ایک اور پھنڈا ہو گیا۔

میرے بڑے بھائی ریزی بھی کالج میں داخل تھے اور ایف ایس سی کر رہے تھے۔ ہم ان دنوں لیڈی میڈیکل کالج چھوڑ کر ساندھ کلاں میں جا بسے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ریزی شکاری آدمی تھا۔ پتہ نہیں اُس کے دل میں کیا ترنگ سمائی۔ اپنی ڈیزی گن اٹھا کر گورنمنٹ کالج پہنچا۔

گورنمنٹ کالج کے اونچے مینارے پر کبوتر باہر کرتے تھے۔ اتوار کے دن کالج قریباً سنسان تھا۔ ریزی نے دو تین کبوتر گن فار کر کے مار گرائے۔ اتنے میں کہیں سے ڈاکٹر محمد صادق آ گئے۔ انہوں نے ریزی سے گن چھین لی۔ دوسرے دن کلاس میں بھینٹتے ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا..... ”پروفیز چھٹہ تمہارا بھائی ہے.....؟“

”جی سر.....“

”وہ اتوار کے روز کالج میں کیا کر رہا تھا۔ وہ بھی سائنس سٹوڈنٹ۔“

مجھے علم نہ تھا کہ ریزی اتوار کے روز بھی کالج آیا تھا۔

”اُس نے کالج کے Rules violate کیے ہیں۔ کوئی لڑکا کالج کے کبوتر مار نہیں سکتا اور تمہارے بھائی نے پورے تین کبوتر مار دیئے۔“

میں حیران اُن کا چہرہ دیکھنے لگی۔ خاں صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے..... جیسے وہ مارنے مرنے پر تلے بیٹھے ہوں۔

”سر..... آہستہ سے خاں صاحب نے کہا ”سر! قدسیہ کا بھائی شکاری ہے۔ یہ لوگ پہاڑوں کے رہنے والے ہیں۔ یہ اپنے گورکھا استاد کے ساتھ شکار کیا کرتا تھا۔ سر! ریزی نے ایک بار میسرغ بھی مارا تھا۔“

نہ جانے انہیں یہ سب کیسے معلوم تھا۔

پروفیسر محمد صادق کو اور بھی غصہ چڑھ گیا۔

”شکاری ہوگا اپنے گھر۔ رولز آرولز۔“

”پہلی بار تو معافی ملنی چاہیے۔“ اشفاق صاحب نے لجاجت سے کہا۔

”نو..... There is no first time ہر بار Last time ہوتا ہے۔ قدسیہ..... کل سے اپنے بھائی کو کالج

نہ بھیجنا۔ اس کا نام Strike off کر دیا ہے.....“

خاں صاحب چپکے سے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ اُن کے لیے بے عزتی کا یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں احساس ہوا کہ نیلی لکیروں والی سفید قمیض پہننے والا میرا گارڈین اٹخیل ہے..... وہ کیسے

دینا چاہتا تھا؟ اُس نے لالو سے کیا کچھ پوچھ رکھا تھا..... وہ کون تھا؟ کیا تھا؟..... کیا چاہتا تھا؟ اور کیا چاہنے سے گریز کرتا تھا؟ یہ بہت سے سوال مجھے سمجھ میں نہ آئے۔ اتنی بات ضرور پتہ چل گئی کہ اُس کی نیت نیک ہے اور وہ مجھے کسی مشکل سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے.....

گھر واپسی پر زینب کے پاس باورچی خانے میں بیٹھ کر جب میں روٹی کھا رہی تھی تو لالو نے کہا..... ”صوفی صاحب! وہ جو گورے صاحب آپ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا دروازے سے کبھی مت جھانکا کرو..... جب جھانکے میں خود تمہیں بتا جاؤں گا۔ تم برا مدے میں نہ آنا۔“

”صوفی صاحب کس کی بات کرتا ہے لالو؟“

”مجھے کیا پتہ کون کون ہے اب تو نئی لفٹھی ایئر بھی آگئی ہے..... کیا پتہ چتا ہے کون کہاں سے آیا ہے۔ رنگ رنگ کی بولی..... رنگ رنگ کے لوگ۔“

”یہ تو ٹھیک ہے صوفی صاحب۔“

پتہ نہیں کیوں زینب نہ مجھے آ پاجی کہتی تھی نہ باجی..... بس اُس نے اپنے سے میرا نام صوفی صاحب رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے ریزی سے کبوتروں والی بات بھی نہ کی۔ میرا خیال تھا کہ اُس کا دل ڈاکٹر محمد صادق کی بات سن کر پریشان ہوگا ویسے بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے تھے، لیکن کم آ میرا اور کم گورا بٹے میں ہر بات Share کرنے کی عادت نہ تھی۔

اُن دنوں جب میں گورنمنٹ کالج میں اپنا مقام تلاش کرنے میں مگن تھی اور لیڈی میٹلیکن کالج سے موسیٰ کے ساتھ مل کر کالج پہنچتی تھی۔ خاں صاحب اپنے کنبے سمیت 1- مزنگ روڈ میں رہتے تھے۔ موج دریا کے سامنے اور ٹھیل روڈ کے آخر میں یہ رہائش گاہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ گھر کا ماتھا کمروں پر مشتمل تھا اور اس کے پہلو سے سیڑھیاں اوپر تیسری منزل کو جاتی تھیں جہاں خاں صاحب کا بیہرا تھا۔

سینٹ کی چکی دیوار بائیں طرف اُس چھوٹے سے مستطیل آئین کے سامنے تھی جس میں ماں جی کا کھلا بھرتی خانہ تھا۔ ہولے ہولے اس کھلے باورچی خانے کو چھت اور دیوار میں نصیب ہو گئیں۔ اماں جی یہاں فراخ دلی سے صحت روٹیاں کھلے شور بے پکائی رہیں۔ جب وہ بیمار پڑ گئیں تو بی بی خیر جان جنہیں سب بی بی (نئے جان) کہتے تھے سب پر اسے سنبھال کر گھریلو نظام کی سو پر مبنی بن گئیں۔

باورچی خانے کے عین سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ اور اُس کے پیچھے بابا جی محمد خاں کا کمرہ اور اُس کے بائیں طرف اماں جی کا عوامی ڈرائنگ روم اور بائیں طرف ایک ڈرائنگ روم قسم کا لمبا کمرہ تھا جس میں کچھ دیر کے لیے اسحق بھٹو کی تصویر لگی رہی اور باقی وقت یہ لمبا کمرہ اقبال بھائی کی تحویل میں رہا۔

دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا جس میں بارشوں کے علاوہ بہت کم گوندھنا ریندھنا ہوتا تھا۔ اماں جی کو پکن گارڈن کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے انہوں نے کھلے باورچی خانے کے ساتھ جامن کا درخت، دو ایک بھرتی کے قد آور پودے، کیاری میں دھنیا، پودینہ، آگ رکھا تھا۔ مہند لوگ بنیادی طور پر کاشتکار ہوتے ہیں۔ ان کی رگ

پنجاب کے کاشتکاروں سے ملتی جلتی ہے۔ تھوڑی سی جگہ دیکھ کر کچھ نہ کچھ بوڈا لے کر کسانوں سے ملتی ہے۔

دوسری منزل پر باہر والی میٹریاں بھی جاتی تھیں اور اندر سے بھی اُوپر راستہ جاتا تھا۔ یہاں اقبال احمد خاں اپنے زوجہ حاجی ضیاء کے ساتھ رہتے۔ ان کے بچے فاروق، نیلو اور داء بھی چھوٹے تھے۔

تیسری منزل پر صرف ایک کمرہ اور چھوٹا سا آگن تھا۔ یہاں خاں صاحب، بیوا کرتے تھے۔ کمرے میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ وہ فرش پر سوتے۔ کمرے میں جا بجا کتابوں کے ڈھیر اور سگریٹوں کے ٹوٹے۔ پیالیوں میں کافی اور چائے کا پس ماندہ پڑا رہتا۔ یہاں نہ کوئی صفائی والا چڑھتا نہ کوئی ملازم ہی آ کر خبر لیتا۔

اپنے چھوٹے سے سٹو پر خود ہی چائے کافی بناتے۔ کھانے کی طلب ہوتی تو نیچے اماں جی کے پاس جا کر کھانا کھا لیتے۔ اماں جی اپنے اس درویش صفت بیٹے کے لیے پریشان رہتی تھیں؛ لیکن یہ بند بند لوگ تھے۔ اظہار محبت ان کے ضابطہ حیات میں موجود نہ تھا۔

تیسری منزل پر کمرے سے نکل کر ایک چھوٹا سا آگن تھا جس میں ایک مٹی کے ٹکے و خاں صاحب نے حمام صورت بنایا تھا۔ بیتل کی ٹونٹی مٹکے میں فٹ کی تھی اور اسی کے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر باسی برتنوں کو اٹھان کر کے خود کھیل رہنے کا فن خاں صاحب نے سیکھ لیا تھا۔

لیکن میرے لیے یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ میں کبھی خاں صاحب کے کمرے تک نہ پہنچ پائی۔ میرے لیے 1- مزنگ روڈ جادوگری تھا۔ یہاں ایک ایسا خاندان آباد تھا جس کے رسم و رواج، اقدار، کلچر مقامی لوگوں سے مختلف تھے۔ وہ کسی کھڑکی، دروازہ کھلے دروازے سے جھانکنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

مہندلوگ کھیتی باڑی کرتے آئے تھے۔ یہاں آ کر بھی ان ہجرت کرنے والوں نے مٹی کی دیواریں بنانا، ٹائل پر لکڑیاں بیچنا یا پھر کسی زمین کے ٹکڑے پر آباد کاری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ عزت نفس، ہجرت کرنے والوں کا بنیادی مسئلہ بنا کر رہتا تھا۔

جب بھی کوئی وطن چھوڑ کر کسی نئی بستی میں آباد ہو جاتا ہے تو ہر وقت اُسے یہی خوف گھیرے رکھتا ہے کہ مقامی لوگ اُسے کتنے سمجھ بیٹھیں۔ اپنے میں جذب کرنے کی کوشش نہ کرنے لگ جائیں۔ ہجرت کرنے والوں کو اپنے رسم و رواج کی پاسپانی کرنا پڑتی ہے۔ اپنے آگے ڈھال لے کر چلنے کے عمل میں اُن کی سوشل لائف سکڑتی جاتی ہے اور ان کے ارد گرد حصار دیواریں اونچی ہوتی جاتی ہیں۔

اسی لیے اظہار کے معاملے میں ہجرتی پٹھان گونگا ہو جاتا ہے۔ مزیر نیازی ہمیشہ دیر کر دیتا ہے۔ اشفاق احمد چپ رہتے رہتے صوفی راستوں پر پڑ جاتا ہے۔ احمد فراز شاعری میں پناہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ خاں صاحب کو شادی کے فیصلے پر پہنچنے میں پورے سات سال لگے۔ اگر ممتاز مفتی، محمد حسین اُن کے پاس 1- مزنگ روڈ نہ آتے جاتے.... ڈیڈی جی اُن کا جیک نہ بننے تو شاید خاں صاحب یہ قدم کبھی اٹھا ہی نہ سکتے! وہ کبھی کالج میں مجھے روک کر نہ پوچھ سکتے کہ ”قدیر! تم مجھ سے سرگراں کیوں ہو؟“

ادھر مجھ سی سبک سر سے بھی کوئی فیصلہ نہ پڑتا تھا۔ میری والدہ نے مجھے مخلوط تعلیم کے حوالے کر تو دیا تھا لیکن وہ

مجھے سوچنا شروع کرتی رہتی تھیں..... ”کاکی! تم ایک بیوہ کی بیٹی ہو۔ تمہارے سر پر کوئی باپ نہیں جو تمہاری عزت کا تحفظ کرے۔ پھر تمہارے بھائی کا مسئلہ ہے۔ وہ انجینئرنگ نہیں کر سکا۔ بی اے بھی اچھی فقط خواب ہے۔ تمہارا ایک غلط قدم تمہاری زندگی کے لیے پٹری سے اتار دے گا۔“

غلط قدم اٹھانا تو ڈور کی کوڑی لانا تھا۔ میں تو سیدھے سبھاؤ کسی سے بات کرنے کی بھی اہل نہ تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے کونوں میں اپنی اپنی موٹر سائیکل چلاتے رہتے۔ موت کے کونوں سے باہر نکلنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ بیوقوفوں میں اعتراف کرنے، قبول کرنے یا پھر کچھ کر گزرنے کی ہمت نہ تھی۔

مجھے یہ وثوق سے علم نہ تھا کہ اشفاق صاحب مجھے پسند کرتے ہیں۔ وہ بھی غالباً میرے متعلق وثوق کی حد تک نہ جانتے تھے۔ دن میں کالج آنا جانا پڑھنا پروفیسروں کی توجہ میں لگن رہنا جاری رہتا۔ شام کو میسکلیکن کالج کی پروفیسروں کے ساتھ میڈمنٹن کھیلتی۔ کالج کے سامنے یونیورسٹی کے سوسائٹنگ پول پر چلی جاتی۔ میری والدہ بڑی ڈسپین کی عادی تھیں۔ وہ میرے اس میل جول سے خوش تو نہ تھیں، لیکن چپ رہتیں کہ زیادہ روک ٹوک سے کہیں بیٹی کی زبان نہ نکل جائے۔

اُن کی پتہ نہیں خدا نے کیسے سنی کہ محترمہ فاطمہ جناح کالج کی وزٹ پر آئیں۔ امی کے کام کو سراہا اور پھر انہیں حیرت دیا کہ دیانندار لوگوں کو کسی ایک ادارے میں جکڑ بند نہیں کرنا چاہیے۔ پاکستان میں ہیومن Resources کی کمی ہے۔ نیا ملک ہے ہر جگہ بہتر افراد کی کمی ہے اس لیے اگر آپ کی تبدیلی کی جائے تو آپ انکار نہ کیجئے.....

امی کی تبدیلی شیخوپورہ میں انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر ہو گئی۔ میں اور میرا بھائی دونوں اُن کے ساتھ شیخوپورہ گئے۔ لیکن ہم دونوں کی پڑھائی کا مسئلہ تھا۔ میرا بھائی ابھی ایف اے کلیئر نہ کر سکا تھا۔ میں ایم اے کے فائنل میں تھی۔

بڑی بہت ذہین اور فطین تھا لیکن استقامت سے عاری..... وہ مکمل آرنٹ تھا۔ نہ تو ڈور اندیش تھا نہ مالی حوصلہ ہی کی اُسے سمجھ آتی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھ کر حیرت میں چلا جاتا۔ اُسے خوش کرنے یا خوش ہونے کے لیے۔ کونٹ ایورسٹ کی ٹرونی درکار نہ تھی۔ بس زندگی ہی اُس کے لیے بڑی Excitement کا باعث تھی۔

اسی ریزی نے بڑی محبت کے ساتھ 1980ء میں میرے ناول ”راجہ گدھ“ کا سرورق بنایا۔ جس طرح ڈاکٹر طارق بن افتخار نے خاں صاحب کی اور میری وہ تصویر کھینچی جو ہماری قریباً ہر کتاب کے پیچھے پرنٹ کی ہوئی ہے۔ ریزی نے نروید سائنس بورڈ کی ان گنت کتابوں کے سرورق بنائے۔ سکھی گھر رسالے کا آرٹ ڈائریکٹر رہا۔ امریکہ گیا۔ وہاں اپنے آرٹ کی نمائش کیں اور بغیر کسی دقت اور پریشانی کے آکر سن آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے لگا۔

ریزی میں ایک بے قرار آرٹسٹ کی روح تھی۔ ایک شکاری سائنس کے معجزات سے مسحور پہاڑوں کو تسخیر کرنے والا ستارہ پر زمرے بجانے والا۔ وہ ان گنت سمتوں میں سفر کر کے ہنسی خوشی لوٹ آنے والا آرٹسٹ ہے۔

ابھی ہم لیڈی میسکلیکن میں ہی تھے کہ ایک روز ریزی یونیورسٹی کلرز لے کر گھر آیا۔  
 ”یہ کیسی ٹرونی ہے.....“ امی نے پوچھا۔  
 ”میں سائیکل ریس میں سیکنڈ آیا ہوں۔“



اس ٹروفی پر امی خوش ہوئے کے بجائے اُلتار یزی پر برس پڑیں..... ”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ مجھ سے اجازت کیوں نہ لی؟“

ابھی آپ اتھارٹی سے پوچھے بغیر خدا کو بھی تلاش نہ کر سکتے تھے۔

جب میری والدہ شیخوپورہ چلی گئیں تو ہم کو رہائش کی تکلیف کا اندازہ ہوا۔ ہمارا اب پرنسپل لاج پر کوئی حق نہ تھا۔ امی کی یہ خواہش تو پوری ہوئی کہ پروفیسراں سے گھٹے جو ختم ہونے کی صورت نکل آئی، لیکن ایک اور مشکل یہ آن پڑی کہ اب گورنمنٹ کالج میں پڑھنے والے بچے کہاں سر چھپائیں۔ کرائے کا مکان اتنا مہنگا بھی نہ ہو کہ امی کرایہ نہ بھر سکیں۔ ایک روز میری والدہ نے مجھے اور ریزی کو سامان باندھنے کا حکم دیا۔

”ساندہ کلاں میں گھر بن گیا ہے..... تم دونوں وہاں ٹھیک رہو گے۔ تمہارے پاس زینب اور لالو رہیں گے۔ کرشن گھر سے بس گورنمنٹ کالج تک آتی ہے..... کوئی فخر کی بات نہیں۔ میری تہذیبی شیخوپورہ میں انسپکٹرز آف سکولز ہو گئی ہے۔“

انہوں نے کوئی سہا پوڑا اور دلہنہ نہیں دیا۔ بس ہمارا سامان ساندہ کلاں پہنچا دیا۔ ساندہ کلاں کا یہ گھر ایک گلی میں تھا اور قریباً آخری گھر تھا۔ گورنمنٹ کالج سے بس لے کر میں پہلے کرشن گھر پہنچی۔ پھر وہاں سے عمو ما پیدل ہی ساندہ کلاں پہنچ جاتی۔

ساندہ کلاں میں ہمارے گھر کی دو سیزھیان چڑھ کر اندر دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ دائیں ہاتھ باورچی خانہ اور دو چھوٹے کمرے زینب اور لالو کی تحویل میں تھے۔ صحن پار کر کے چھوٹا سا برآمدہ اور دو بڑے کمرے تھے..... یہ گھر ہماری ضرورت کے لیے کافی تھا۔

یہاں ہمارے ساتھ زینب اور لالو کہیں سے آ گئے..... زینب ہمارے ساتھ گوروا سپور سے آئی تھی۔ وہاں جب گروہ درگروہ، قافلہ در قافلہ ہے آسرا لوگ ستائے ہوئے در ماندہ پتھن کی طرف جاتے تو ان بے سرو سامان لوگوں پر حملے ہو جاتے..... ہندو لوگ خود تو نہ اتنا چاری بنتے تھے نہ انسا کا پر چار کبھی چھوڑتے تھے، لیکن ان کا کام سکھوں کو ابھارنا اور پرانی دشمنی کو ہوا دینا تھا۔

یہاں پھر نہایت کا معاملہ تھا۔ نہ جانے کیوں محسوس ہوتا تھا کہ کہیں اندر وہ اس نئے ملک کے قیام پر خوش نہ تھے۔ ہمارا گھر گوروا سپور میں ترسورد پر تھا جو پتھن کی طرف جاتی تھی۔ اس گھر کے بڑے پھانگ سے ایک لمبی روش گھر تک جاتی تھی۔ پھر ڈیوڑھی کا دروازہ آتا۔ یہ بیٹھک نما ڈیوڑھی اندر صحن میں کھلتی، جس کے چاروں طرف اور اوپر بھی کمرے تھے۔

جب بھی سڑک پر شور و غوغا ہوتا میرے بھائی ریزی بھاگ کر باہر والے پھانگ تک جاتے اور کبھی کبھی دو تین لوگوں کو پچانے میں کامیاب ہو جاتے۔ میرے بھائی پر ویز میں دو خوبیاں تھیں۔ ایک تو وہ سو فیصد آرسٹ تھا دوسرے نڈر تھا۔ اسے شاید اپنے نفس سے جہاد کرنا نہیں آتا تھا لیکن ظلم ہوتا دیکھ کر وہ کبھی بیٹھانہ نہ سکا۔

اُس شام زینب اور لالو پتھن کی طرف جا رہے تھے جب سکھوں کا حملہ ہوا۔ نگلی کر پان میں نیم دھندلکے میں لشک رہی تھیں۔ ”جو بولے سونہال“ کا نعرہ فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ ایسے میں ریزی نے زینب اور لالو کو اندر گھسیٹ کر

تے بہت کوتاہی لگا دیا۔

زینب جیسے کچھ اور بے آسرا بھی اندر بیٹھک میں ڈرے بیٹھے تھے۔ یہاں سے زینب اور لالو ہمارے ساتھ آئے اور لاہور آ کر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اُن دنوں لوگ اپنوں کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بہہ جاتے تھے۔ پھر تلاش بسیار کے بعد جب زینب کو پٹیلے والے لوگ نہ ملے تو وہ ہمارے پاس ساندہ میں آ گئی..... ملنا اور جیسے تو زندگی کے کھیل میں شامل ہے لیکن اس میں بھی جو اسرار ہے وہ بھی کئی طور پر انسان کو سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ زینب پٹیلے میں کسی نمبر وار کی بیوی تھی لیکن اب اُسے میرے گھر کی ور کر بننے میں کوئی عار نہ تھا۔

ادھر ساندہ کھلاں میں ہم دونوں مکمل طور پر آزاد تھے اور کسی کو جواب دہ نہ تھے۔ اپنے عمل، کردار اور وقت کے تحت طرح سے ضامن ہم دونوں خوش تھے، لیکن خاں صاحب 1- مزنگ روڈ میں ایک بھرے پڑے خاندان میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی آزادی کی ایک معکوس شکل تیسری منزل کے الگ تھلگ کمرے میں نکالی لی تھی۔

خاں صاحب ایک ایسے ماحول کی پیداوار تھے جہاں سزا میں کھلم کھلا اظہار تھا، لیکن جزا کے سلسلے میں منہ بند رکھنے کا سلیقہ جاری تھا۔ شاید اس گھر کے بڑوں کا خیال تھا کہ تعریف و توصیف سے بچے سر پڑھ جاتے ہیں اور پھر وہ آسمان میں تھکنے لگانے چل نکلتے ہیں اور اس طرح فرعون صفت بچوں کو کنٹروں کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُس زمانے میں بچوں کے لئے ہتھیار ڈالنا اُن کی رائے طلب کرنا درست پرورش کے منافی تھا۔

ایسے میں خاں صاحب اظہار کو احساس شکست سمجھتے تھے۔ جب انہیں کئی یقین تھا کہ محبت کا ہلکا سا اعتراف بھی ان کی عمل شکست پر منج ہوگا۔ ابھی تو وہ اپنے خاندان کی روایات میں جکڑ بند تھے۔ پھر قدسیہ بیگم کی جھنجھڑی بھی لگ جائے گی، لیکن اندر کا تضاد انہیں کسی طور جینے نہ دیتا تھا۔ ایسے میں وہ عجیب طرح سے خوفزدہ ہو کر رہ گئے۔

1- مزنگ روڈ میں مفتی جی محمد حسین زوبی صاحب اور کبھی کبھار شہاب صاحب آتے جاتے رہتے۔ لیکن خاں صاحب رفتہ رفتہ وہ گھر سے گونگے بن گئے جو اپنے کونوں کے پانیوں میں نہ تو کسی کو جھانکنے دیتا ہے نہ تھنڈے پانی کا جھرا پینے کی اجازت ہوتی ہے۔

اب یہ داستان گونسوڑ بھر لحد دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کرنے والا مفتی جی کا گونگا بن گیا تھا۔ ایسے میں لبوں پر آنے والے تھن نے کاغذ قلم کی سرنگ بنائی اور خیالات کی گاڑی اندر ہی اندر چننے لگی۔ کچھ نوت جواب ان کے کاغذات سے نکلے جیسے آپ کے درشنوں کے لیے حاضر خدمت ہیں۔ ذرا دیکھئے اُن کی قوت متخیل نے کیسے حال سے مستقبل کا نقشہ کھینچا ہے۔

”خوف“

پتہ نہیں ڈر کیا ہے۔ کیوں لگتا ہے۔ کیسے لگتا ہے اور آج مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے رات کو کوئی آواز سے اٹھا گھونٹ دے گا۔ میں سمجھوں گا میں مر گیا لیکن میں مروں گا نہیں۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں مر گیا ہوں اور وہ نہ مرے! ایسی خوفناک بات ہے۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں زندہ ہوں اور وہ جی نہ رہا ہو کس قدر کرناک بات ہے! باجی اوپر کے کمرے میں اس لیے نہیں جاتی کہ اُسے ڈر لگتا۔ میں نے اُسے ڈرا رکھا ہے کہ ڈاکٹر آپا کی روح اوپر کے کمروں میں بھٹکتی رہتی ہے۔

مرے ہوئے ”ڈپٹی“ کی روح اوپر کے کمروں میں یونہی گھوما کرتی ہے اور وہ آدھی رات کو دہلی دہلی جینیں مارا کرتا ہے لیے باجی کبھی اوپر نہیں جاتی۔ ظفر کہہ رہا تھا کہ دھر مسالے میں چڑیلیں رہتی ہیں۔ کاغزہ آوارہ روحوں کا مسکن ہے۔

ایک دن اُس نے ایک کہانی سنائی کہ وہ اپنے کسی دوست کے بھائی کی شادی پر دھر مسالے گیا تھا۔ یہ گرمیوں کے دنوں کی بات ہے۔ وہ رات گئے تک ایک کمرے میں بیٹھے تاش کھیتے رہے اور جب آدھی رات گزر گئی اور انہوں نے بے راہی کے لیے ادھر ادھر کسی چارپائی کو دیکھا تو تمام چارپائیاں دوسروں کے تصرف میں آچکی تھیں۔ ظفر کے دوست نے کہا یہاں سے ایک میل دور گھائی کی طرف ایک گاؤں ہے۔ وہاں میرا ایک دہقانی دوست رہتا ہے۔ چلو اُس کے پاس چل کر رات بسر کریں۔ سیر بھی ہو جائے گی۔ رات بھی کٹ جائے گی اور تمہیں ایک کردار سے بھی ملائیں گے۔ پڑھنے پھاڑی راستوں پر قدم اٹھاتے وہ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ آدھی رات گئے پر ایک فقیر کی جھونپڑی نظر آئی۔ یہ لوگ جب اس کے قریب سے گزرے تو فقیر نے ظفر کے دوست کا نام لے کر کہا ”شاد جی جا رہے ہیں؟“ اور شاہ جی نے اثبات میں جواب دیا۔ فقیر گڑگڑی بجاتے ہوئے ظفر کے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ دیر تک ان کی اس بے معنی گفتگو نے ظفر کو آہستہ آہستہ چھٹے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی راہ لگ گیا۔ اگلا موڑ گزرنے پر ظفر نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے گھاس میں پاؤں چھپائے ایک نہایت جمیل عورت کھڑی ہے۔ اس میں اور ظفر میں کوئی آدھ فرلانگ کی دوری ہوئی۔ ظفر ٹھٹھکیا گیا۔ اس عورت نے مسکرا کر ظفر کو آنکھ ماری اور یہ دم بخود ہو گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اپنی بھووں اور چتونوں سے بڑے لطیف اشارے کر رہی تھی۔ دفعۃً ظفر کو خیال آیا کہ رات اندھیری ہے اور میں اس عورت سے کافی دور کھڑا ہوں۔ پھر پھر اس کے چھوٹے چھوٹے اشارے کیسے نظر آ رہے ہیں۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے کے دامن سے چھٹے ہوئے پہاڑ اپنا وجود بالکل کھو چکے تھے۔ اس نے پھر اس عورت کو دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی اور اس کی کلائی سے لے کر کہنیوں تک سنہری بالوں کی لوائیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ظفر نے کہا یہ سوائے چڑیل کے اور کوئی نہیں۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی خوبصورت روپ دھار کر راگبیروں کو قتل کیا کرتی ہے لیکن چڑیل کا تصور آتے ہی اس نے اُس کی چھاتیوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ بچپن میں چڑیلوں سے متعلق دو ہی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُن کے پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ انہوں نے اپنے پستانوں کو اٹھا کر کندھوں پر ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ ظفر کو اس کے پاؤں تو نظر نہیں آئے کیونکہ وہ گھاس میں کھڑی تھی لیکن اس کا سینہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کے پھولوں والی قمیض پہن رکھی تھی اور اُس کی چھاتیاں انسانوں کی سی تھیں۔

اپنی مسکراہٹوں کو ادھر ادھر بکھیر کر وہ عورت آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنے لگی۔ ظفر نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو وہ تیزی سے قریب آنے لگی اور جب اس نے بھاگنا چاہا تو وہ اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ سڑک کے کنارے چند بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ ظفر اچک کر ایک پتھر پر چڑھ گیا اور پھر وہاں سے کھسک کر اُس کے ساتھ والے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس عورت نے پتھروں پر چڑھنے کی کوشش میں جب اپنا پاؤں زمین سے اٹھا کر پتھر پر رکھا تو وہ اُلٹا تھا۔

اُس دن کا کہہ رہی تھی کہ ”اشفاق صاحب رات کو میں کمرے سے پھل لینے گئی تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اندھیرے کو نے میں ہلکی سی سیٹی بجا کر انگلی چٹائی ہو۔ میں چپ چاپ اسی طرح واپس آ گئی۔ مجھے ڈر تو لگتا ہے جی! پر کوئی

میں نے یہ سچے سچے تو میں ذرا بھی خوف نہیں کھاتی۔“

اشتیاق خالص فوجی آدمی ہے۔ جسمانی تکلیفوں سے خائف نہیں ہوتا۔ روحانی مصائب اس کا کچھ بگاڑ نہیں دیتے۔ یہ وہ گھیس والی کونھڑی سے اب بھی بہت ڈرتا ہے۔ آپا فرخندہ بچارے کو کس قدر تنگ کیا کرتی تھیں۔ بات بات پر گھیس والی کونھڑی کی طرف گھسنتیں۔

لیکن میرا ڈر تو کچھ عجیب سا ہے۔ میں اس لیے نہیں ڈرتا کہ اوپر کے کمروں میں ڈاکٹر آپا کی روح پھرتی ہے اور مجھے مارا کرتا ہے۔ مجھے ایسا خیال کم ہی آیا ہے کہ ظفر کی طرح میں بھی کسی خوبصورت عورت سے دوچار ہوں گا اور وہ عورت اس وقت آئے گی کہ میں پھل پڑے ہوں تو چاہے وہاں انجن و سل دینے لگے۔ میں تو سب اور تجھ سے ڈرتا تھا کہ وہی آؤں گا۔ اشتیاق کی گھیس؟ فیل ہوگی! مجھے یقین ہے کہ ڈر خارجی حالات سے کبھی بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ امکان ہے کہ ماحول کی مہیب صورتیں کسی کو بھی ڈرا نہیں سکتیں۔ ڈر تو اندر پیدا ہوتا ہے۔ ڈر تو ایک داخلی کیفیت ہے لیکن یہ کیفیت جس میں نے اپنے کمرے کی چھنی آج پہلی مرتبہ کیوں چڑھائی ہے۔ میں نے سیزھیوں کا دروازہ کیوں بند کیا ہے۔ یہ سب اسی طرح سے جانتا ہوں کہ کوئی بھی باہر سے نہیں آئے گا۔

میرے کمرے میں میرے بکس سے میری الماری سے ایک صورت آگے بڑھے گی اور میرا گلابا دے گی اور تمہیں گا کہ میں مر گیا اور میں مرانہیں ہوں گا۔ اب بھی یہ سطور لکھتے ہوئے میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری میں پیچھے مڑ کر دیکھوں گا میرے پیچھے کھڑے ہونے والا وجود اسی تیزی سے پھر میرے پیچھے ہو جائے گا۔ شام کا تھوڑا سا کھانا کھانے میں ہاتھ دھو کر گیلری میں جس ٹوٹی ہوئی کرسی کے پاس سے ہر روز گزار کر میں سیزھیوں چڑھنے لگتا ہوں۔ وہی ٹوٹی ہوئی کرسی اس وقت میرے ذہن پر سوار ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں اسی ٹوٹی ہوئی کرسی کے ہاتھوں قتل ہوں گا۔ میں مر گیا نہیں! مجھے اس ٹوٹی ہوئی کرسی پر کبھی کوئی بیٹے نظر نہیں آیا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کرسی کسی کے نیچے ہے۔ یہ پر اس وقت کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا۔ پتہ نہیں یہ کیسا ڈر ہے۔ نہ باجی کا نہ ظفر کا نہ کاکی اور نہ اشتیاق کا..... میرا خیال ہے کہ خوف ایک ایسی خشک ہے جس کا تعلق نہ تو انسان کے جسم سے ہے اور نہ روح سے۔ بلکہ اس کا تعلق اس کے مقدر سے ہے۔

خشک = جذبات + کیفیات + تاثرات = وجدانیات

خلوص = خوف + کرب + ہیبت + ترس

☆☆☆

اس خوبصورت گونگے آدمی کو معلوم نہ تھا کہ ساندہ کلاں سے پیدل کرشن نگر آنے والی اور کرشن نگر سے بس لے کر ٹرینسٹ کالج کے مقابل ہوسٹل کے آگے بس سٹاپ پر جوڑکی آتی جاتی ہے اُس کے دماغ میں بھی ایک خناس بھرا ہوا ہے۔ اس قدر آزادی پسند ہے کہ کسی کو اپنا رازواں بنا کر اعتراف شکست نہیں کر سکتی۔

مجھ میں سرانندی کی سروب لیکھا جیسا حوصلہ نہ تھا کہ سبک سربن کر مہاراجہ رام چندر کے چرنوں میں پہنچ کر کہیں حال دل سناتی اور اپنی ناک کٹوا کر ناکا کوٹ لوٹ سکتی۔ اعتراف شکست بڑے لوگوں کا کام ہے۔ وہ عموماً انا کا بُت

توڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی ہیرو کے بجائے ویلن بن جاتے ہیں لیکن ایسے بڑے لوگوں کو پرواہ نہیں ہوتی۔

ادھر خاں صاحب اپنی خواہش کے پیچھے سرپٹ بھاگنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی اس خواہش سے گریزاں بھی تھے۔ اس تضاد نے انہیں بیکل کر رکھا تھا۔ وہ خواہش کو چھپانے اور اس کا پرچم لہرانے سے روکے نہیں جاسکتے تھے۔ ایک طرف وہ پوری طرح Commitment کے آدمی تھے اور ساتھ ہی فرار کی راہیں بھی انہیں کشاں کشاں کھینچتی تھیں۔

یہ ان کے جعلی جرثوموں میں موجود تضاد تھا۔ اس Genetic Coding کو ان کے تمام گھروالوں میں بآسانی شناخت کیا جاسکتا ہے۔ جو بھی اس جعلی تضاد سے رہائی پاسکا اس نے دنیا میں بڑا نام اور مقام پیدا کیا۔ اس کی مثال خالد آفتاب (وائس چانسلر جی سی یونیورسٹی) ڈاکٹر طارق بن افتخار (ہڈیوں کے سرجن شکاگو) ڈاکٹر جواد مساجد (ہارٹ سرجن) اور پھر خود اشفاق احمد ہیں لیکن اس تضاد سے نکلنے کے لیے انہیں قریباً سات سال لگے۔

وہ خاندان سے باہر ایک جاٹ لڑکی سے شادی کرنے کے آرزو مند تھے اور ساتھ ہی خاندانی شناخت اور روایات کی پاسداری قریبی بہن بھائیوں بھتیجیوں کی غیر مشروط محبت انہیں کوئی قدم اٹھانے نہ دیتی تھی۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہانو قدسیہ انہیں بے وقاہری چب سبھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کے بھی آرزو مند تھے کہ گھروالوں کے دل کو ٹھیس نہ لگے اور وہ اس اعتماد کو مجروح نہ کر بیٹھیں جو باجی اماں جی سردار بیگم اور بہن بھائی ان پر رکھتے ہیں۔ آری کیا یہ کیفیت دن رات ان پر گزرتی تھی۔ اوپر جاتی تو بھی کاتھی نیچے آتی تو بھی ذبح کرتی۔

ان کے جانے کے بعد سب رشتہ داروں سے میں نے تصویریں اور خط مانگے۔ اخبار میں اشتہار دیا لیکن کسی نے خاطر خواہ مدد نہ کی۔ مجھے یقین ہے کہ کتاب چھپ جانے کے بعد داویلا بعد از مرگ ہوگا لیکن یہی آج کی تیز رفتاری زندگی کا المیہ ہے۔ نہ ہم ماضی کو محفوظ کرنے کے اہل رہے ہیں نہ مستقبل کے لیے کسی مثبت پلان پر استقامت سے عمل کیا ہوئے کی قوت رکھتے ہیں۔ سب کچھ حال کی افراتفری کی نذر ہو گیا ہے۔

اشفاق صاحب 1۔ مزنگ روز سے کالج کبھی اپنی سائیکل پر کبھی پیڈل راستہ ناپتے رہے لیکن دونوں طرف اعتراف شکست قسم کی کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک روز میں اوول والی مرگ پر آ رہی تھی۔ میرے دماغ میں ”سیب کا درخت“ کہانی گھوم رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی کہہ رہا ہو ”پہاڑوں سے اترتی ہوئی میگن سن۔“

جب میں لڑکوں کے ہوسٹل بمقابلہ بس سٹاپ کے قریب پہنچی تو مجھے لگا جیسے کوئی پیچھے آ رہا ہے۔ مزکر دیکھ تو اشفاق صاحب بڑی لجاجت اور بظاہر لالعلقی سے چلے آ رہے تھے۔ میں سمجھی شاید کچھ کتابیں مستعار دینا ہوں گی۔ میرے ساتھ ہی لالو بھی رُک کر سر کھجانے لگا۔

میں نے بات کا آغاز نہ کیا۔ پاس آ کر وہ بولے ”قدسیہ! ادھر کچہری ہے۔ میرے بڑے بھائی آفتاب کا یہی راستہ ہے۔“

میں سمجھ نہ پائی کہ آفتاب کون ہے اور ان کا ذکر کیوں کیا جا رہا ہے۔ میرے چہرے پر So what? قسم کا ہنسنے لگا۔ دیکھ کر وہ بولے۔

”اگر انہوں نے مجھے آپ سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی!۔ مزنگ روڈ میں۔“  
 ”تو آپ مجھ سے بات نہ کریں پلیز۔“

وہ چپ ہو گئے۔ ہم دونوں نے پھر کوئی بات نہ کی۔ راجہ رام چندر نے نہ۔ بردان دیا نہ جے مالا میرے پاس سے ڈالی۔ سروپ نکھا کی ناک ہی کاٹی۔ میں نے پلٹ کر کچھ نہ پوچھا اور بس پرائی۔ نئی۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھ کر نہ دیکھا نہ ہاتھ ہی بلایا، لیکن میں جانتی ہوں بس سٹاپ خالی ہو جانے کے بعد بھی دیر تک اشفاق احمد وہیں کھڑے رہے۔ تب تجربہ اہم تھا۔ تجربہ کرنا ممکن نہ تھا۔ مجھے سمجھ نہ آئی تھی کہ میرے ہم جماعت کے اندر وہ کون سی بارگاہ تھی جسے وہ پھاند نہیں سکتا۔

بہر کیف تبدیلی تو چلی آ رہی تھی۔ تبدیلی زندگی کا ناگزیر حصہ ہے۔ کچھ لوگ شعوری طور پر کچھ لاشعوری طور پر تبدیلی سے نا آشنا ہوتے ہوئے بھی اپنی معصومیت کے سہارے اس تبدیلی کے آگے سر جھکا کر قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے صاحب دماغوں کو نہ کسی فلسفی کی رہنمائی درکار ہوتی ہے نہ کسی صوفی کی دانش ہی۔ بیشتر لوگ تبدیلی سے دوچار ہوتے ہی بھونچکا ہوتے ہیں پھر ان میں زندگی کے ساتھ نپٹنے (Cope) کی سکت باقی نہیں رہتی۔

کچھ تبدیلیاں موسم کے ساتھ آتی ہیں۔ کچھ عمر بڑھنے کے ساتھ چپکے سے در آتی ہیں۔ گود کا بچہ ہمیشہ گود بالک سے چپکے کھیلنے کودنے کھانے پینے کی عمر نو بالغ کی آرزو بدلتے ہی جنس کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کیفیت بھی یہاں پہنچاؤ کی تلاش میں ایک نئی تبدیلی سے آشنا ہو جاتی ہے اور ہر بالغ اپنا گھونسلہ ساتھی اور بچوں کے تصورات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جونہی بچوں کی کفالت کی ڈگریاں ہی ڈگر پر چلتے چلتے عادت سی بن جاتی ہے۔ ایک نئی تبدیلی انسان کے لیے پر دستک دیتی ہے۔

ہر انسان چالیس کے لگ بھگ پہنچ کر Midlife کے کرائسس (Crisis) اور اس سے جنم لینے والی تبدیلیوں کا تجربہ سوجاتا ہے۔ اس عمر کو پختگی کی عمر کہہ لیجئے لیکن یہی عمر ہے جب عام آدمی بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہے اور عمل میں نا پختگی کا تجربہ دیتا ہے۔ تبدیلی کو خاموشی سے قبول نہ کرنے کی وجہ سے کئی بار انسان کا image سوسائٹی میں بالکل برباد ہو جاتا ہے۔ بے درپے شادیاں، معاشرتی معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں، ماں باپ سے بیچانی تصادم، بے توازن رابطہ غرضیکہ اس عہد کی تبدیلی میں زلزلے کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ہندو دھرم نے ان تبدیلیوں کے تجربے سے چاروں طرف سے کر دیئے ہیں۔ بال آشرم..... گرہست شرم..... وان پرست آشرم اور بالآخر سنیا س آشرم.....

آخری تبدیلی عموماً بڑھاپے کے ساتھ آتی ہے۔ جب نہ اشیاء سے لگاؤ رہتا ہے نہ انسانی رشتے ہی با معنی رہتے ہیں۔ جب طمینان قلب صرف ذکر الہی سے حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ بھی نصیب کی بات ہے۔

صوفی حضرات ان تبدیلیوں سے نپٹنے کے لیے شناسائی اور قبولیت پیدا کرنے کے لیے ”ماننے“ کا درس دیتے ہیں۔ انیس مہم ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ کی بتائی ہوئی حدود کو جانتے ہیں ان کے لیے ماننا مشکل نہیں ہوتا اور وہ اللہ تعالیٰ کے امر کوٹ میں قلعہ بند رہتے ہیں۔ ان کی عافیت اور راحت کچھ ایسی طاقتوں کے ذمے ہوتی ہے جو کبھی دغا نہیں دیتے۔ لیکن یہاں تھوڑی سی از جن لوگ اپنے لیے خود پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی تجویز اور فیصلے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں

دنیاوی مشکلات کا حل درکار ہوتا ہے۔ انہیں مادی زندگی میں لائٹری نمائل کی تلاش ہوتی ہے اور ڈیرے پر وہ ان خواہشات کو چھپا کر یوں ظاہر کرتا ہے جیسے وہ اللہ کی تلاش میں ہو۔

صوفی حضرات اللہ کا راستہ صعوبتیں سہنے مجاہدے اور ریاضتیں کرنے کا علم جانتے ہیں لیکن ان کے پاس ایسے نسخے موجود نہیں ہوتے جو لوگوں میں راتوں رات عزت اور امارت کی خوش کن تبدیلی لے آئے۔ عام خواہش کے آدمی اس لیے ماننے کا حکم دل سے مان نہیں سکتے۔ روز قیامت پر فرشتوں اور جنات کے وجود پر نبیوں کے علم پر پورے یقین اور ایقان کے ساتھ چلنے والے کے لیے ماننا کچھ ایسا مشکل نہیں.....

خاں صاحب بھی اندر کے تضادات کا شافی حل ڈھونڈنے کے لیے بالآخر ڈیروں تک جا پہنچے لیکن ابھی وہ وقت دور تھا۔ ابھی وہ اپنے اندر کے تضادات میں خود گھسن گھیر یاں کھا رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے وہ مضمون بھی نہ لکھا تھا جو میں یہاں پیش کر رہی ہوں..... کیونکہ اس مضمون کے بغیر ان کی گورنمنٹ کالج سے وابستگی مکمل نہیں ہوتی۔

### چاند کا سفر

گورنمنٹ کالج کی طرف مراجعت کے کئی راستے ہیں اور سارے راستے اپنے اپنے رخ پر چل کر اس منزل تک پہنچتے ہیں جو ہر راہین کے من کا مندر ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے مشہور شیر شاہی اور جرنیلی سڑک تو برتری تحفظ منفعت اور پاور کی سڑک ہے جس پر ایک جم غفیر رواں ہے۔ لیکن کچھ راستے جذباتی واویلوں سے ہو کر بھی اس منزل کی طرف جاتے ہیں..... ہم دونوں کا گورنمنٹ کالج سے بندھن ایک بہت ہی کمزور اور کچے سے دھاگے سے بندھا ہے۔ ایک گمنام اور بے نام پگڈنڈی ہے جو خود رو جھاڑیوں اور کھنگریلے رستوں سے الجھ الجھ کر بڑی مشکل سے من مندر تک پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے تب تک اٹھنے کو جی نہیں چاہتا جب تک کہ کوئی وہاں سے اٹھانہ دے! نکال نہ دے!!

بانو قدسیہ نے اور میں نے گورنمنٹ کالج کو کبھی بھی ایک درس گاہ نہیں سمجھا۔ نہ کبھی ہم اس کی علمی روایت سے متاثر ہوئے اور نہ کبھی اس کے استادوں کے تجرب علمی سے مرعوب ہوئے۔ اس کی قدامت اس کی عمارت اور اس کی شخصی وجاہت بھی ہمیں مسحور نہیں کر سکی۔ اس سے کبھی کچھ لیا نہیں مانگا نہیں دیا نہیں دلوایا نہیں۔ پھر بھی اس کے ساتھ ایک عجیب سا تعلق قائم ہے جسے ہم آج تک کوئی نام نہیں دے سکے۔ دراصل ہم دونوں گورنمنٹ کالج کو درس گاہ نہیں مانتے..... اس میں ”سین“ کے حرف کو وافر سمجھتے ہیں!

جب ہمارا پہلا بیٹا پیدا ہوا تو ہم من آباد میں رہتے تھے اور اپنے مکان کا کرایہ بڑی مشکل سے ادا کرتے تھے۔ میں ریڈیو میں ملازم تھا اور بانو پشاور کے لیے درسی کتابیں لکھ کر ساٹھ ستر روپے مہینہ گھر بیٹھے کمالیتی تھی۔ بچے کے دودھ کا ڈبہ بیالیس روپے میں آتا تھا اور وہ ایک مہینے میں تین ڈبے ختم کر جاتا تھا۔ اس زمانے میں مٹی کے تیل کا چودہ بتیوں والا چولہا آ گیا تھا اور ہمارا ایندھن کا خرچ کم ہو گیا تھا۔ بانو جب گورنمنٹ کالج کی سٹوڈنٹ تھی تو اس کو روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ میں جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو گھر کا سودا لانے کے علم سے ناواقف تھا۔ شادی کے بعد ہم دونوں نے یہ دونوں فن سیکھ لیے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جب انیق ڈیڑھ سال کا ہوا تو جون کے مہینے میں سخت بیمار ہو گیا۔ اسے اسہال

سوتنے کی شکایت ہوئی جو دو تین دنوں کے اندر اندر بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ محلے کی بڑی بوڑھیوں کے کئی سے سہارے لیکن کسی سے افاتہ نہ ہوا۔ بچے کی حالت تشویش ناک ہو گئی تو ہمیں کسی نے بتایا کہ اسے ڈاکٹر بروچہ کے پاس لے جائیں۔ وہی سخت گرمی میں سہ پہر کے چار بجے ہم ”سالم تانگہ“ کرا کر اسے ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر میکوڈ روڈ لے گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے بچے کو الٹا پلٹا کر دیکھا۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے پوٹے کھول کر معائنہ کیا اور پھر اسے بچھڑا ہوا ہو کر بولے ”بابا تم لوگ کیسا پیرنٹ ہے جو اب اس کو ہر سے پاس لایا ہے۔ اس کا میں کیا ٹریٹ منٹ کروں گا؟“ پانچ روز زور سے رونے لگی اور جاہل فقیر نیوں کی طرح ہاتھ باندھ کر سسٹیاں بھرنے لگی۔ اس کے منہ سے کوئی سہ نہ بھئی تھی اور وہ خوف کے مارے رونے جا رہی تھی..... ڈاکٹر صاحب نے کاؤنٹر پر جا کر پانچ چھ دو اؤں کے امتزاج سے بروسیا ریٹنگ کا ایملشن تیار کیا۔ اپنی میز کی دراز سے وہیں پڑیاں نکال کر دیں اور پھر ایملشن کی ایک خوراک میں ایک یہ کھول کر مجھے بچے کو مضبوطی سے پکڑ کر گود میں لٹانے کا حکم دیا۔ بڑی بیدردی کے ساتھ انہوں نے اینٹک کے جڑے میں لٹائیاں کھود کر اس کا منہ سون اور دوئی اس کے منہ میں اندر لے دی۔ بچہ اپنی نجیف آواز میں بڑے کرب کے ساتھ رو رہا تو سوتنے اسے کندھے سے لگائیا۔ گود میں لے کر تو میں اسے کھڑا تھا لیکن بانو قدسیہ خوف سے کانپتی ہوئی اسے تھپکے جا رہی تھی۔ استے میں بچے نے منہ بھر کر تے کی۔ گرم اور بدبودار۔ تھوڑی سی میرے کندھے پر گرمی اور باقی کی ساری فرش پر۔

ڈاکٹر صاحب نے جھوٹا کر کہا ”بابا تم کیسا پیرنٹ ہے بچے کو سنبھالنا نہیں جانتا سارا فرش خراب کر دیا۔ یہ کلینک سے منہ تھوڑے لوگ کا گھر نہیں۔“ ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کی ڈانٹ سے گھبرا گئے۔ ہمیں ڈاکٹروں کا اور ہسپتالوں کا کوئی تجربہ کبھی تھا۔ پھر ہماری مالی حالت بھی معمولی سی تھی۔ شکل و صورت سے بھی ہم سہم ہی سہم تھے اور بچہ کافی بیمار تھا۔ بانو قدسیہ نے بتا دیا وہ پشہ تو سر پر محفوظ رکھا اور باقی کے آدھے دوپٹے سے ڈاکٹر صاحب کا فرش صاف کرنے لگی۔

اس نے دونوں گھنٹے زمین پر نیکے ہوئے تھے اور ہائیں ہاتھ کو آگے بڑھا کر جھکے ہوئے بدن کا سارا بوجھ اس پر اتار رکھا تھا۔ وہ روئے بھی جا رہی تھی شرمندگی سے سر بھی جھکائے جا رہی تھی اور سسٹیوں سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے نارنجی اور کاسنی پھولوں والی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ سبز رنگ کی شلووار تھی اور پاؤں میں ہوائی سلپر تھے جس میں نیسہ نزل پرنا کی مارتے ہوئے اتر گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا فرش پرانی اینٹوں کا تھا جن کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ کچھ اینٹیں نیچے کو ہو گئی تھیں کچھ سیم کی سیڑھی سے اوپر کو ابھرائی تھیں۔ اس اونچ نیچ کے درمیان دوپٹے سے جگہ صاف کرنا کافی مشکل کام تھا لیکن بانو نے اپنے ہر سہ پہر کے زور پر ساری جگہ اچھی طرح سے صاف کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے چور آنکھ سے اپنے فرش کو اس کی اصل حالت میں دیکھ کر کہا ”بابا تم کیسا لڑکی لوگ ہے سارا دوپٹہ خراب کر لیا۔ اب اس کو باہر جا کر دھوؤ۔ اچھی طرح سے صاف کرو۔ اس میں جراثیم چلا گیا ہے۔ بچے کے پاس نہیں لانا یہ کپڑا۔“

میں نے کہا ”ڈاکٹر صاحب باہر نکلا ہے؟“

کہنے لگے ”کیوں نہیں ہے۔ یہ ساتھ باجو میں گھوڑوں کے پانی پینے کا حوض ہے نہیں۔ اس میں پانی ہی پانی



ہے۔ جا کر دھوؤ۔“ میں بچے کو کندھے سے لگا کر کھڑا رہا۔ بانو نے آدھا دوپٹہ کھیل میں ڈال کر کھنگال لیا۔

ایسے وقت میں اور اس قدر شدید گرمی میں سڑک کنارے پیدل چلنا تو شاید اس قدر مشکل نہیں تھا لیکن ایک بچے کو کندھے سے لگا کر کلینک سے ذلیل و خوار ہو کر اور زمین سے بوٹ کے پرانے ڈبے کا گتا اٹھا کر اور اس سے مرہم بچے کے چہرے کو چھاؤں کر کے چلنے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کچے پڑے ہوئے تھے اور شرمندگی کی وجہ سے ہمارے سراور نہیں اٹھتے تھے۔

سڑک پر کوئی سواری نہیں تھی اور ہمیں بس پکڑنے کے لیے ابھی بہت دور تک چلنا تھا۔ بچے کا بخار گرمی کی وجہ سے بڑھ رہا تھا اور بانو بار بار اس کے ماتھے اور نکتی ہوتی بے جان ناگوں کو چھو رہی تھی کہ بخار کم ہو رہا ہے یا بڑھ رہا ہے۔ اس دھوپ اور گرمی میں ہم اسی طرح سے چلتے رہے۔ تھکے تھکے خوفزدہ مایوس بے مراد اور اکیلے۔ بیمار بچے کی سر تہہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن گرمی کی شدت اور روشنی کی چلکور نے اس کے پونے کھلنے نہ دیے۔ ہم چہرے چلتے سوچتے سوچتے چپ چاپ تے جی پی او کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں تار گھر کے پاس کئی تانگے کھڑے تھے۔ درخت کی چھاؤں تلے بیمار بچے نے آنکھیں کھول کر ایک سفید گھوڑے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈونٹا ہوا سر ساکن کر لیا۔ سر نے تانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا ”گورنمنٹ کالج“ اور بانو حیرانی سے میرا منہ تکتے لگی۔

کالج چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ پرندے شاخوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اونچی بندنگ کے سائے دور دور تک پھیل کر درختوں کے سائے سے مل گئے تھے۔ سارے میں ایک خوشگوار خاموشی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اپنے کلاس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ اہنق بانو کی گود میں لیٹا ہوا ایک اونچے درخت کی شاخوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں کو قریب سے دیکھنا چاہا تو مجھے بانو کے دوپٹے سے کھٹی کھٹی بوی آئی۔ میں نے بچے کے چھوٹے سے ماتھے پر اپنا سر ساتھ کا ماندہ چہرہ رکھا تو مجھے ایک بیماری ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بچے نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو ماں کی جنت گشتہ لوٹ کر اس کی جھولی میں آ گئی۔ بانو نے اس کے پاؤں کو ماتھے کو اور گلے کو چھو کر خوشی سے میری طرف دیکھا اور کہا ”بالکل خواجہ منظور کی طرح مسکرایا ہے۔“ خواجہ صاحب اپنی ساری زندگی میں صرف ایک بار مسکرائے ہوں گے لیکن بانو کے ذہن میں ان کی مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے مثل ہو کر ایک فریم میں جڑی جا چکی تھی۔ پھر ہمارے ذہنوں میں اپنے ایام طالب علمی کا ایکشن ری پلے شروع ہو گیا اور طوطے اپنی چونچوں میں ڈالیاں پکڑ کر ہاتھ چھوڑ کر کرتب دکھلانے لگے۔

بیمار بچہ اپنی ماں کی گود سے پھسل کر پہلے ایک سیڑھی پر کھڑا ہوا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر دوسری پراتر اور پھر خود ڈگمگاتے قدموں سے روش پر چلا گیا۔ وہ کوئی ڈیڑھ گز تک ایک طرف اور کوئی دو گز کے قریب دوسری جانب چلا اور پھر تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

ابھی ہمیں سیڑھیوں پر بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ نیلی گکڑی باندھے اور ہاتھ میں چایوں کا موٹا سا گچھا اٹھائے ایک شخص ہماری طرف آیا اور قریب آ کر پوچھنے لگا ”کون لوگ ہو تم؟“

میں نے کہا ”ہم لوگ ہیں۔“

اس نے کہا ”یہاں آنے کا اور بیٹھنے کا حکم نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”کس کا حکم نہیں۔“

”پرنسپل صاحب کا“ اس نے درشت لہجے میں کہا اور ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اٹھانے لگا۔ میں کچھ کہنے والا تھا کہ... ہونے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے بچے کو اٹھایا اور آہستہ سے چلنے لگی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا اور ہم تینوں آہستہ آہستہ پھانک کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم آگے بڑھ رہے تھے اور گورنمنٹ کالج پیچھے کو ہٹا جا رہا تھا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے سامنے مسلسل بڑھ رہا ہے۔ کئی بیہودہ نکتے بد ہیئت اور بے کار لوگ درگا ہوں سے اٹھا دیئے جاتے ہیں اور ان کے بعد فرش صاف کیے جاتے ہیں لیکن ان کے دلوں کے فرش پر درگا ہوں کی صورتیں ویسے ہی قائم رہتی ہیں۔

اصل میں گورنمنٹ کالج تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ اس کی طرف رخ نہ بھی ہو تو بھی یا تری اسی کی طرف کا رخ ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جب سپیس شٹل زمین سے چاند کی طرف چھوڑا جاتا ہے تو اس کا رخ چاند کی طرف ہوتا ہے۔ پھر بھی اس کا سفر چاند ہی کا ہوتا ہے اور اس کی منزل چاند ہی ہوتی ہے۔

خالدہ نے کچھ تاثرات اپنی محبت کے تحت لکھے ہیں۔ یہ اس کی سعادت مندی ہے۔ اللہ اے میرا دل رکھنے کی دعا ہے۔ ایسی محبت والی رو میں ہر روز کہاں پیدا ہوتی ہیں؟

”اے ترک غمزہ زن“

کتاب زندگی کے کچھ اوراق ہم سینت سینت کے رکھتے ہیں۔ اُن کا ہماری روح کے ساتھ ایسا گہرا رشتہ ہوتا ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اور تقدس کے پانیوں سے نمو پاتا حاصل حیات کا جزو بن جاتا ہے۔

قدسیہ آپا میری کتاب زندگی کا ایسا ہی ورق ہے مگر اس اعتراف کی وضاحت کے لیے مجھے گزرے وقت میں بہت دیر تک جانا ہوگا۔

یہ سن پچاس باون کے آس پاس کی بات ہے۔ لاہور کے لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج کے خاموش بارعب مدرسہ میں دوسرے سبزیوں پر دہاں کی پُر وقار پرنسپل مسز چٹھہ اپنی چاق و چوبند چال کے ساتھ آتی جاتی نظر آتیں۔ گریس فیل سٹوڈی تھنگر یا لے کا لے سفید بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا تک تک کرتے کورٹ شوز۔ ہم جنرل منتر کی باز کے اس پیرا سکول سیکشن کی بے بضاعت، جھٹی ساتویں جماعت کی لاغر لڑکیاں دم سادھے جھانکا کرتیں۔ سانولے چہرے پر حسرت و رنج میں رلے ملے نقوش۔ ہمیں سب کچھ کسی اور ہی دنیا کا نظر آتا۔ وہ ہاڑھ کے پار ہمارے بہت قریب سے گزر رہے تھے مگر ہم وہیں منتظر کھڑے رہتے کیونکہ ان کے بعد کبھی کبھار ان کی چمپنی رنگت، کچھ نیپالی نقوش والی گیلی سی بیٹی اپنے سیدھے بالوں کی لمبی چوٹی جھلاتی، چھوٹے چھوٹے گورے پاؤں کے ساتھ کبوتری کی چال چلتی ادھر سے گزرتی اور جلد سے جھٹکتی۔ جس روز ہم اُسے دیکھ لیتے باقی ماندہ دن کتنا اچھا گزرتا۔

پھر وہ سکول میں سبج ہونے والے ایک نیبلو ”عشق اور موت“ میں ایک قدسی روپ میں نظر آئی۔ موتی رنگ حسینہ بوس میں۔ عشق کی قوت سے مردوں میں زندگی کی لہر دوڑاتی۔ آج میں سوچتی ہوں کہ قدسیہ آپا کے ساتھ میرا کیسا

علامتی تعارف ہوا جس نظریہ کی عملی تفسیر میں انہیں اپنی زندگی بسر کرنا تھی وہ کس طرح مجھ تک پہنچا۔

تب مجھے معلوم نہ تھا کہ یہی کامی میری بہن کی عزیز ترین دوست ہوگی۔ میں اسے اتنا قریب سے دیکھوں گی بلکہ شب و روز کا ساتھ رہے گا اور ایک نئی دنیا کا دروازہ مجھ پر کھلے گا۔ لکھنے کی دنیا۔

پڑھنے کا خط تو مجھے تھا ہی۔ کبھی نو خیز لڑکیوں جیسا اُلٹا سیدھا لکھ بھی لیتی تھی۔ قد سیدہ آ پاتب لکھتی تھیں مگر ابھی چھپنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی تخلیق فن کا پورا کلچر ان کی ذات میں سانس لیتا تھا۔

تب مجھے اتنی باریکیوں کی سمجھ کہاں تھی۔ بس اتنا احساس ہوتا تھا کہ یہ جو قد سیدہ آ پاتب کسی کھلی بے تحاشہ بڑی طلسماتی دنیا سے آتی ہیں۔ باجی اٹھلے بھائی اور میری تو خیر بات ہی کیا اسپنے کاموں میں بے حد مصروف رہنے والی اماں تک ان کی گردید ہو گئیں۔

سمن آباد میں خود ان کا اپنا گھر ہر ایک کے لیے کھلی آغوش کی مانند تھا۔ صاف ستھرا سادہ سے سامان سے مزین کمرے جہاں ہر کوئی بے تکلف چلا آتا۔ قد سیدہ آ پاتب کے مصور بھائی پرویز (کیا کمال کے آرٹسٹ تھے) اور امی۔ یوں لگتا یہ سب پیدائشی میزبان ہیں۔ یہ لوگ محبت اور ناز اٹھانے میں اپنا تخیلی نہ رکھتے تھے۔ سر اپا شفقت اُٹھتے بیٹھتے میں آپ کی آسائش و آرام کا خیال اور پھر باتیں۔ ایسی باتیں جو سارے غم فگر بھلا دیں۔ دل میں دھچکھڑیاں ہی چھوٹے لگیں۔

ان دونوں (بھائی بہن) میں نریشن کا مہیوت کر دینے والا کمال تھا۔ انگریزی اور دو پنجابی سب میں یکساں رواں۔ رفتہ رفتہ مجھے قد سیدہ آ پاتب کے بچپن کے بہت سے واقعات اور گفتگو کر دار بانگل چشم دید محسوس ہونے لگے۔ گورداس پور ڈھرم سالہ شملہ جنہیں کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا اپنے اپنے گئے گئے۔ معلوم نہیں آج بھی ہم ان کی وضع کردہ کئی اصطلاحیں اور روزمرے انجانے میں بولتے رہتے ہیں۔

درد مندی کے باوجود ان میں زندگی کی خوشگوار چیزوں سے محبت اور ناخوشگوار کو نظر انداز کر دینے کی تہذیب تھی۔ شاید یہ دل کے غمی لوگ تھے۔ ان کے ہاں خصوصی طور پر لڑکیوں کی گرومنگ کا ایک تصور تھا۔ ایسی تربیت جو لڑکیوں کو سراپا خدمت و ایثار و دوسروں کے لیے باعث راحت اور ماحول کو خوبصورت بنا دے۔

بزرگم خود..... مجھے لگتا ہے کہ قد سیدہ آ پاتب کی صلاحیتوں کا جو شعور اور انداز مجھے ہے کسی اور کو شاید ہی ہو۔ انہوں نے میری بہن اور چند اور دوستوں کے ساتھ مل کر ان دنوں لاہور کے چھوٹے سے انجمن میں 'انارکلی' سٹیج کیا۔ ڈائریکشن ان کی اپنی تھی جنہوں نے میری بہن ایسی چھوٹی موٹی، معمولی سی ہستی سے شہزادہ سلیم کا کردار ادا کر دیا۔ مناظر کے سیٹ اور کرداروں کے ملبوسات۔ ان سب کے لیے کتنا تاریخی و تہذیبی شعور اور ڈرامے کے فن پر دسترس حاصل ہونی چاہیے۔ انارکلی کے کردار میں قد سیدہ آ پاتب خود تھیں۔ ڈرامہ بہت ہو گیا۔ (جو صرف خواتین کے لیے تھا)۔

وہ جو انہوں نے ریڈیو اور ٹی وی اور سٹیج کے لیے لازوال ڈرامے تخلیق کیے تو وہ ٹیلنٹ اور کرافٹ کے قابل رشک تال میل کا نتیجہ تھے۔ انہیں رقص، موسیقی، فنوک اور اردو فارسی پنجابی اور عالمی شعر و ادب کا جو وسیع و عمیق علم حاصل ہے غیر معمولی کے زمرے میں آتا ہے۔ ایک بہت ہی نادر مرکب جو قدرت کبھی کبھار ہی عطا کرتی ہے۔ صلاحیت اور محنت کا امتزاج ہے۔ عام طور پر یہ دونوں اتنی وافر مقدار میں ایک ساتھ نظر نہیں آتے مگر قد سیدہ آ پاتب میں ان تھک محنت لگن پتہ مارنے کی صلاحیتیں کچھ

جوتے۔ یہ سب بھارتی ایشیا زاپنے آپ کو مٹانے کا اتنا حوصلہ..... مشکل..... بہت مشکل..... قدسیہ آپا آپ نے لکھنے والوں بلکہ لکھنے والوں کے لیے کیا امتحان کھڑا کر دیا۔

ایک روایتی مسلم خاندان کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی خارجی دنیا کے ساتھ Exposure حیران کن تھا۔ اس سے میں ریڈیو پاکستان کی سالانہ محفل موسیقی نہایت اعلیٰ سطح کی تقریب ہوتی تھی۔ قدسیہ آپا کے ساتھ ہم نے روشن آراء، تجزیہ و پرہیزگار مہدی حسن سائیں مرزا، اقبال بانو فریدہ خانم اور بہت سے مشاہیر کو سنا۔

اوپن ایئر تھیٹر کے بے مثال ڈرامے تھے۔ ہالی ووڈ کی شاہکار فلموں سے انہوں نے ہمیں روشناس کرایا۔ تب کی فلمیں جتنی معنوں میں ایک تخلیقی تجربہ ہوتی تھیں۔ گون وودو، انڈیا پلیس، بانڈا، کم پتھر، داجا سزافرو، مہیر، نو، اترنی، ایڈ شو، ہر دواز، سب سے زیادہ پروسی کیوشن اور ایسی درجنوں فلموں نے ہمارے فنی ذوق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس بھرپور تہذیبی اور ثقافتی دور میں یہ کچھ تھا اور ہم قدسیہ آپا کے ساتھ اس میسے میں گھومتے پھرتے۔ عالم کی سیر میری صحبت میں اس طرح ہوتی ہے۔

اس وقت تک انہوں نے بہت کچھ لکھا تھا مگر اشفاق صاحب کی ہدایت کے مطابق چھوٹا شروع نہیں کیا تھا۔ ان دنوں وہ غالباً روم میں تھے۔ پھر وہ آئے اور قدسیہ آپا کو چھین لے گئے۔ بانو قدسیہ بنا کر..... معاف کیجئے گا قدسیہ آپا کو میری یہ بات بار خاطر گزری ہو۔ مجھے معلوم ہے اشفاق صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ تمام دنیا سے دست کش ہو گئیں۔ پھر آپ وہ نہیں جو انہوں نے آپ کو بنانا چاہا۔ جو آپ کے نزدیک عورت کا حاصل حیات ہے۔

بانو قدسیہ ہو کر آپ مت زہنتی اور قدرت اللہ شہاب جیسے بڑے اور باکرامت لوگوں کے حصار میں چلی گئیں۔ یہ سب بات ہے ”گذریا“ ایسی کہانی لکھنے والا حال و حال کی دنیا میں نکل گیا اور قلمی ریاضت اور ایثار و خدمت کی سفیر بن گئے۔ انشان ادبی انشاد ہم ایسوں کو دیا مگر انسان واقعی بڑا ناشکر ہے۔ انارکلی کی صدا۔ اے ترک غمزہ کہ مقابل نشست“ مجھے سب بھی مضطرب کر دیتی ہے اور میں گزرے وقت کی گلیوں میں اتر جاتی ہوں۔

میری سب دعائیں عقیدت اور محبت آپ کے لیے۔ قدسیہ آپا۔

(خالد حسین)

ایک خط جمیڈ فلپس نے مجھے لکھا۔ میرے ساتھ ناچنے والی جمیلہ شادی کے بعد کہیں کھو گئی۔ خالد فوج میں تھا۔ کشمیر پر شہید ہو گیا۔ پھر مجھے یہ خط ملا۔

Sunny Bano

Murree.

11-9-48

پیاری قدسیہ بہن

السلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ جواب کیا دوں۔ حیران ہوں دیکھ جو اللہ میاں کی بے نیازی۔ خواہ مخواہ میری دُنیا برباد کر ڈالی۔

سمجھ نہیں آتی کس گناہ کی سزا ملی ہے۔ پھر بھی ہر دم اُس کی شکر گزار ہوں۔

میرا خالد مجھ سے چھین کر آخر خدا کو کیا مل گیا۔ بالکل... نہیں آتا۔ کچھ سوچ نہیں سکتی۔ دل یہی کہتا ہے وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ رہے گا۔ بھلا مجھے اکیلا چھوڑ کر وہ کیسے جاسکتا ہے لیکن یہ میرا وہم ہے۔ سراسر پاگل پن۔ سب سمجھتی ہوں لیکن سمجھتے ہوئے نہیں سمجھتی۔

قدسیہ! وہ اپنے وطن اپنے اسلام پر قربان ہو گیا۔ اللہ یہ قربانی قبول کرے اور اس کے عوض کشمیر ہمیں مل جائے تو پھر بھی کچھ تسلی ہو جائے۔ وہ تو شہید ہے۔ تمہاری جیلہ بہن اب ایک شہید کی ڈلہن ہے۔ ہمارا ایمان ہمیں کہتا ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ تو پھر وہ مجھے کیوں دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے کیوں ملنے نہیں آتا۔ میں تو اُس کا انتظار کر کر کے بھی تھک گئی۔ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں۔ کیسے پکڑ لاؤں۔ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ سب چپ ہیں کوئی نہیں بولتا۔

وہ تو مجھے ضرور یاد کرتا ہوگا۔ اپنے پاس بلاتا ہوگا لیکن کوئی اُس کے پاس جانے نہیں دیتا۔ مجھے صینے کی آرزو نہیں۔ زندگی کی تمنا نہیں لیکن کیا کروں۔ مجبور ہوں سخت مجبور۔ کیا معلوم تھا خالد اس قدر بے وفا نکلے گا۔ اتنی جلدی مجھ سے روٹھ جائے گا۔ وہ تو مجھ سے کبھی خفا نہ ہوا۔ معلوم نہیں ایکدم کیوں بدل گیا۔ جب آیا تو میں نے اُسے اس قدر بلایا۔ آوازیں دیں۔ روٹی چلائی لیکن وہ چپکے لیے رہا۔ جیسے اُس کو کچھ خبر نہیں۔ بھلا اتنی بھی لاپرواہی کیا ہوتی۔ میں نے اب پکارا وہ کر لیا ہے کہ چاہے وہ مجھے کتنا ہی بلائے۔ منٹیں کرے۔ میں بھی اُس سے نہ بولوں گی۔ خوب ستاؤں گی۔ دیکھنا پھر وہ خود بخود سیدھا ہوتا ہے یا نہیں۔

بس اب لکھا نہیں جاتا۔ سر چکر رہا ہے۔ خط لکھتی رہتا۔

بد نصیب

جیلہ

جنوری 1951ء

31 دسمبر کی آدھی رات گزر جانے کے بعد روشنی کے ایک ٹکڑے نے میرے کمرے میں آ کر مجھے جگایا اور کہا ”میں تمہارے محبوب کے مقدر کا ستارہ ہوں۔“ میں نے لحاف سے سر نکال کر کہا ”چائے تھر موس میں پڑی ہے اور بسکٹ میرے میز کی دراز میں اور سینما کا پاس میری پتلون کی جیب میں رکھا ہے۔“ پھر میں نے اپنا منہ رضائی کے اندر کر لیا۔

کڑوی دوا میرے حلق میں یوں اترتی ہے جیسے ریاضی داں لڑکی کا سنگیت کانوں میں!

دریائے جہلم میں چاند ستارے والے ایک روپے کو پڑے ہوئے دیکھ کر ایک کچھوے نے کہا ”اچھا تو سکندر

جب زندگی کے سارے باب بند ہو جاتے ہیں اور فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں تو موت چور دروازے سے آ کر کھتی ہے ”آؤ بھاگ چلیں۔“

میرے نیے میری ماں کا وجود اُس ناظمِ پیس کی طرح ہے جسے میں نے مدت سے چاہی نہیں دی، لیکن جسے میں کسی تھمسِ صبح کو جاگنے کے لیے چلا بھی دیتا ہوں اور لارم بھی لگا دیتا ہوں۔

ایک ماں نوجوانوں کی نگہداشت کر سکتی ہے لیکن نو بچے ایک ماں کی نگہداشت نہیں کر سکتے۔ (ترکی مقولہ)

اس سے بڑھ کر اور کوئی احمق نہیں ہو سکتا جو ساری دُنیا کو اور اپنے باپ کو خوش کرنے کے ارادے رکھتا ہو۔

(La Fontaine)



## 1- مزنگ روڈ سے کینال پارک 24- ایس

ابھی ہمارے ایم۔ اے کے امتحان نہ ہوئے تھے کہ ایک اور تبدیلی نے سر نکالا۔

میری والدہ ساندو والے گھر میں تشریف لائیں اور نادر شاہی حکم فرمایا کہ ”یہ گھر خالی کر دو۔ میں نے تمہارا انتظام کینال پارک میں کر دیا ہے۔ اچھی کھٹی جگہ ہے۔۔۔ تم لوگ بیڈمنٹن کا کورٹ بھی بنا سکو گے۔“

ان دنوں والدین کو جواب دینے کا رواج نہ تھا، نہ اپنے حکم کو مضبوط کرنے کے لیے کسی قسم کی تاویل ہی دینے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی پوریا بستر باندھ 24- ایس کینال پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیل روڈ سے جو راستہ گلبرگ کی طرف جاتا ہے، اسی پر نہر کے پلے سے گزرتے ہی دائیں ہاتھ ایک راستہ نہر کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ دوسرے راستے سے کینال پارک کی بہتی شروع ہو جاتی ہے۔

ایک سڑک کینال پارک کی کوٹھیوں سے گزر کر جاتی ہے۔ دوسرا راستہ کچا تھا اور کچھ دوکانوں سے ہوتا ہوا آگے چل کر پکی سڑک سے مل جاتا تھا۔ میں اسی راستے سے شہر ماٹھی۔ یہی سڑک اور کچا راستہ مل کر ہمارے 24- ایس کینال پارک کے سامنے سے گزر کر آگے بازار میں جا نکلتا تھا۔

24- ایس کینال پارک ایک چھ کینال کی کوٹھی تھی، جس کا کلا پچ نیک تھا۔ جیسا پھانک اب 121- سی کے سامنے ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کالے پھانک کے ساتھ کچھ میری تقدیر کا گہرا لٹک ہے۔ جب بھی میرے گھر کے آگے ایسا پھانک ہوتا ہے، میں بڑا تحفظ محسوس کرتی ہوں۔

یہ پھانک کھلتے ہی بائیں ہاتھ ایک بڑا سا درخت تھا۔ اس سے آگے ساری جگہ ڈھنڈار، اُجاڑ، جڑی بوٹیوں اور جنگلی پودوں سے انی ہوئی تھی۔ پھانک سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر کوٹھی تھی۔ ایک عرصہ سے بند رہنے کی وجہ سے عمارت خستہ حال تو نہ تھی لیکن بوسیدہ بوسیدہ ہی لگتی تھی۔

سب سے پہلے چند میزھیاں چڑھ کر برآمدہ آتا جس کے فرش پر کالی اور پیلے موزیک کی شطرنجی پچھی تھی۔ اس برآمدے کے دونوں جانب کمرے تھے۔ بائیں ہاتھ عین شروع میں جو کمرہ تھا اُسے میں نے اپنا پڑھائی کا کمرہ بنا لیا۔

دوسری طرف باورچی خانہ تھا، جوزینب اور لالو کی راجدھانی تھی۔ میرے آفس سے پیچھے ایک کمرہ اور غسل خانہ۔ غسل خانے کا دروازہ کھولیں تو تھوڑی سی خالی جگہ تھی، جس میں ایک لیٹرین بنی تھی، جسے زینب اور لالو استعمال کرتے تھے۔

میرے بیڈروم سے ملحق اور برآمدے کے پیچھے دو بڑے کمرے اور ان سے پیچھے تین چھوٹے کمرے تھے۔ کمرے کا دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا اور اس سے پیچھے گودام صورت کمرے میں ریزی نے چار پائی ڈال لی تھی۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں کاشہ کھاڑ اور کھانے کے کمرے کے پیچھے کمرے میں زینب اور لالو رہتے تھے۔

میرے سامنے ایک حوض تھا، جس میں دستی نلکہ لگا ہوا تھا۔ میں نے گھر کی تفصیل اس لیے بیان کی کہ آپ کو بتا سکوں کہ گھر کے ماحول میں رہائش گاہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اُس کے مینوں پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ میں نے گھر میں قدم پڑتے ہی آفس پر قبضہ کیا۔ پھر اس سے ملحق اپنا بیڈروم چھوڑا۔ خانہ چمن لیا۔ زینب اور لالو ایک طرح سے میرے ملازم تھے۔ میں نے کبھی انہیں ریزی بھائی کے لیے کوئی خصوصی کام نہیں دیکھا۔ ہر جگہ میں ہی اہم تھی۔

میں نے دیکھا ہے جن گھروں میں مجھ جیسی خود اعتماد عورتیں یا لڑکیاں ہوا کرتی ہیں، وہاں ایسی شیرنیوں سے بھر جاتا ہے کہ آپ کو چھپا لیتے ہیں۔ جب وہ اپنی منوا نہیں سکتے تو اپنے اندر ہی کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ عموماً مردوں کا گھر اور ان کے ڈپریشن کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ مردوں کی طرح ایسی عورتوں کو بھی اتھارتی کا بہت شوق ہوتا ہے۔ میں نے بھی لائق بن کر اپنا عرب والدہ صاحبہ پر ڈال دیا تھا۔ وہ گھر بلوخرج کے پیسے مجھے دیتیں۔ جب بھی وہ گھر پر آتیں، میرے ساتھ سوتیں۔ جب ان کی تبدیلی ملتان ہو گئی تو وہ مجھے متان سے خط لکھتیں۔ ریزی کے لیے یہ نہیں میں کوئی چھوٹا سا پیغام بھی نہ ہوتا۔ جب بھی ذکر ہوتا تھی یا سرسری ہوتا۔

ریزی بھائی طبعاً شریف آدمی تھے۔ مجھ سے زیادہ ذہین۔ ہر طرح سے زیادہ Deserving تھے۔ اسی وقت اور محبت کے باعث تقاضا کرنا ان کی فطرت میں شامل نہ تھا۔ نہ وہ مسابقت میں یقین رکھتے تھے نہ کبھی کسی چیلنج کو قبول کرتے تھے۔ جو کچھ زینب پکاوتی کھا لیتے۔ جو کچھ میں کہہ دیتی فوراً مان لیتے۔

موسیٰ لیڈی میکلگن میں ہی رہ گیا تھا۔ میں صبح لالو کے ساتھ یعنی کچے راستے سے ہو کر جیل روڈ پر پہنچی جہاں نہر کے کنارے سے کچھ پہلے بس سٹاپ تھا۔ یہاں سے بس سیدھی مال روڈ پر پہنچتی اور بھنگیوں کی توپ کے پاس والے بس سٹاپ پر اتار دیتے اور لالو کالج پہنچتے۔

پنجاب یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ہمارا فائل کا امتحان ہوا۔ برآمدہ گزرتے ہی اندر بڑے ہال میں ہر طالب علم کے لیے ڈسک اور کرسی تھی۔ غالباً یہ چوتھے پرچے والے دن کا واقعہ ہے۔

اشفاق احمد کو کاسہ بردار کارول پسند تھا۔ وہ مجھ سے دونی مانگ کر کچھ اُدھار لے کر مجھے غالباً یہ یقین دلانا چاہتے تھے۔ مجھ سے کتر ہیں۔ ان کی یہ عادت میں نے دوسروں کے معاملے میں بھی راسخ دیکھی۔ وہ اپنے سے کتر کو فرمائش کرتے۔ کچھ نہ کچھ مانگتے۔ لڑکیوں سے بڑی عاجزی سے کچھ نہ کچھ پکا کر لانے کو کہتے اور پھر اس پکوان کو ایسی نیاز مندی سے



کھاتے گویا اس سے پہلے کبھی اس جنت کے میوے کا مزہ نہ چکھا ہو۔ تحفے لینے کا فن جیسا خاں صاحب کو آتا تھا۔ میں نے اس عاجزی کے ساتھ پھر کبھی کسی کو اس طرح تحفے قبول کرتے نہیں دیکھا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ غالباً چوتھے پرچے کا ذکر ہے.....

خاں صاحب کے دل میں وہی عاجزی در آئی۔ اپنا پن اٹھا کر میری سیٹ تک آئے اور بولے ”آپ کے پاس

بلو بلیک انک ہوگی؟“

قطاروں میں چکر لگانے والے Invigilator نے انہیں دیکھا۔ یکدم مڑا اور دور سے آواز لگائی۔

”کیوں بھئی کیا ہے؟“

میری دوات اٹھا کر اشفاق صاحب نے اُسے دکھائی۔ وہ بات سمجھ نہ پایا۔ قریب آ کر بولا۔

”کیوں بھئی آپ کو کیا چاہیے؟“

”سرا میرے پن میں سیاہی ختم ہو گئی ہے۔ میں ان محترمہ سے سیاہی مانگنے آیا تھا۔“

”کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کمرہ امتحان میں آپ کسی سے بات نہیں کر سکتے؟“

بڑی مصحوبیت سے بھولے سے بن ر اشفاق احمد بولے۔ ”جی میں بات تو نہیں کر رہا۔ میں تو سیاہی مانگ رہا

ہوں۔“

”آپ مجھ سے اپنی ضرورت کا ذکر کرتے۔ ممتحن اعلیٰ سے بات کرتے۔“

”سوری سرا نہ میرے پاس کوئی بوٹی ہے نہ ان کے پاس۔ آپ میری تلاشی لے سکتے ہیں۔“

Invigilator نے غصے سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر یکدم اُس کے چہرے پر ملانمت آ گئی۔ ”آپ

اشفاق احمد ہیں؟“

”جی..... جی!“

”آپ ادیب ہیں؟ آپ نے ”ایک محبت سوا فسانے“ لکھی ہے؟“

”جی..... حسن اتفاق سے۔“

”بڑی خوبصورت کہانیاں ہیں۔ اتنے چھوٹے چھوٹے واقعات سے آپ اتنی بڑی بڑی کہانیاں کیسے بنا لیتے

ہیں؟“

جواب دینے کی نوبت نہ آئی۔ اس وقت ممتحن اعلیٰ ڈائس سے اتر کر ہمارے پاس آ گئے۔

”کیا ہوا؟“ انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں سوال کیا۔

”یہ پن میں سیاہی بھرنا چاہتے ہیں۔ میں پاس کھڑے ہو کر سیاہی بھر دیا ہوں کہ کہیں کوئی چیٹنگ نہ ہو

جائے۔“

”Oh I see.“

سپرینٹنڈنٹ واپس چلا گیا۔ خاں صاحب نے سیاہی بھری اور میرا شکر یہ ادا کیے بغیر یوں مڑ گئے گویا دوات اُن

میں نے آج تک کبھی پن میں سیاہی نہیں بھری۔ میرے لیے یہ بڑا  
 ایک نیا تجربہ ہے۔ میں نے نہ جانے کیوں بڑی دیر تک اس دوا کو سنبھالے رکھا۔

ان ہی امتحانوں کے دنوں میں میرا پہلا تعارف خاں صاحب کے خاندان سے ہوا۔ پرچہ ختم ہونے پر ہم لوگ  
 اس سے ملے۔ ہال کے باہر برآمدے میں اشتیاق احمد خاں سے ملاقات ہوئی۔

”یہ میرا چھوٹا بھائی اشتیاق ہے۔ ہم سب اسے تقو کہتے ہیں۔ فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا ہے.....“  
 تقو نے بڑی اچھلی سی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

خاں صاحب نے عجب اپنائیت سے میرے ہاتھ سے قلم کاغذوں کے نیچے رکھنے والا گتہ پکڑا اور اسے تقو کے  
 ہاتھ میں دیا۔

”یہ قد سید میری ہم جماعت ہیں۔ تم انہیں کاکی کہہ کر پکار سکتے ہو۔“  
 نہ جانے کس طرح اشتیاق صاحب میرا گھر ٹیوٹا، مہم جانتے تھے۔

مجھے کچھ پوچھنے کا وقت نہ ملا کیونکہ تقو نے بڑی محبت سے پوچھا ”شوق پرچہ کیسا ہوا؟“  
 اب مجھے پہلی بار علم ہوا کہ اشتیاق صاحب کا نیک نام شوق ہے۔

”بس ہو گیا۔ چپ چاپ چلے آؤ۔ ان کا ملازم غالباً گورنمنٹ کالج میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔ وہاں تک جانا  
 ہے۔ تقو ہمیں ہوتا ہے لیکن خیر کوئی بات نہیں۔“

تقو بڑی خاموشی کے ساتھ ہم دونوں سے دو قدم پیچھے پیچھے چتا رہا۔ اُس نے شوق اور کاکی سے کوئی بات نہ کی۔  
 صاحب اور قد سید ہی نے آپس میں کوئی رابطہ قائم کیا۔ حتیٰ کہ یہ بھی نہ پوچھا کہ کون کون سے سوال کیے گئے اور پرچہ  
 کیسے لکھا گیا۔ قریب ہی لالو منتظر نظر آیا۔ خاں صاحب نے تقو سے میری چیزیں پکڑ کر لالو کو پکڑا دیں اور دونوں بھائی  
 ہمیں گئے گویا سرے سے واقف ہی نہ ہوں۔

اشتیاق ابھی فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ وہ کا کول میں کیڈٹ تھا اور انڈر ریٹنگ تھا۔ وہ اپنے خاندان سے نیا نیا  
 تجربہ کر رہا تھا۔ زندگی کی چھاپ ابھی اُس کے چہرے پر نہ تھی۔ چھوٹے دو اونچے لمبا۔ گورا چٹا سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں  
 والا تھا۔ خاموش رہتا تو امر لیکن لگتا۔

اس پہلی ملاقات میں تقو اور میری دوستی کی بنیاد رکھی گئی۔ ہولے ہولے یہ دوستی گہری ہوتی گئی۔ وہ جہاں بھی  
 جاتا تھا ضرور لکھتا اور میں بھی اُس کے خط کا جواب اہتماماً دیتی۔ ڈیڈی جی سے محبت کا رشتہ ضرور تھا لیکن اس میں احترام  
 کا عنصر تھا۔ تقو اور ناہید سے بڑی بے تکلفی تھی۔ وہ ساری زندگی میرا راز داں، دوست، بھائی، مددگار رہا۔ ایک عاشقی کا  
 رشتہ نہ ہو سکا باقی سارے رشتے مضبوطی سے قائم رہے۔ غالباً یہ سکھوں کے ساتھ رہنے کا اثر تھا کہ ہم دونوں ایسے  
 رشتے جو سکھ خاندانی نظام کرشن چوڑا کی بازگشت تھے۔

یہ امتحانوں کے بعد کی بات ہے۔ میں بڑے درخت کے جھولے پر تھی جس وقت کالا پھانک ہولے سے کھلا۔  
 اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ہمارے گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت نہ تھی۔ میری والدہ ان دنوں ملتان میں انسپکٹرز آف

سکولز تھیں۔ انہوں نے نادر شاہی حکم دے رکھا تھا کہ شہر میں بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ جب تک میں موجود نہ ہوں۔ کتا سے دوستی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ریزی کو بھی آرڈر دے رکھا تھا کہ کسی دوست کو گھر بلانے کی تکلیف نہ کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔

پھانک کھلا۔ سائیکل کا ایک پیہہ اندر گھسا۔ پھر ہینڈل پر ایک سفید ہاتھ نظر آیا جس پر سنہری بال تھے۔ پھر سائیکل اندر آئی۔ خاں صاحب نے احتیاط کے ساتھ اپنے پیچھے کالا پھانک بند کر دیا۔ میرا جھولارک گیا۔ میں حیرانی سے سر اٹھا، استقبال بن گئی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ 1- مزنگ روڈ کی تیسری منزل پر رہنے والے کو میرا پتہ معلوم ہو سکتا ہے۔ پھانک کے ساتھ وائیں طرف اینٹوں کا زائل روزی ملا ملہ پڑا تھا۔ خاں صاحب نے سائیکل وہاں کھڑی کر دی اور درخت سے گھر بیٹھنے کے چھوٹے کی طرف آئے۔

”السلام علیکم...“ چھوٹی سی بے ترتیب ہانڈا لنگ کروہ قریب آتے ہوئے بولے۔

”جی السلام علیکم...“

”آپ جی کا بہت استعمال کرتی ہیں۔ میں نے کالج میں بھی یہ محسوس کیا تھا...“

”جی... جی...“

میں انہیں بتانا نہ سکی کہ خوفزدہ لوگوں کے پاس جی جی کی ٹکرا ایک نوعیت کی ڈھال ہوا کرتی ہے۔ مرانہ مزارعہ، یتیم، مسکین، ملازم کے پاس یہ ایک قسم کا Defense mechanism ہے جسے استعمال کر کے وہ جاگیر و کھنڈہ نمبردار، آمر، ڈکٹیٹر، مانک غرضیکہ ہر قسم کے اپنے سے برتر کے دل میں جذبہ ترجمہ ابھارتا ہے اور کسی کے رحم و کرم پر بھروسہ کر کے اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچاتا ہے۔

میں نے شوق کو چھوٹے کے پاس بٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ یہاں دو تین بوسیدہ سے ڈگڈگی نما موڑھے پڑے تھے۔ میں برآمدے کی طرف چلی۔ وہ موڈب انداز میں پیچھے پیچھے بولے۔ تین سیڑھیاں چڑھ کر ہم برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہاں فرش تو موڑیک کا تھا لیکن اس کا ڈیزائن کالے اور پینے رنگ کی شطرنجی کا تھا۔ یہاں خوبصورت آرامیہ قیب کھڑی کی بنی ہوئی گول گول پشت کی کرسیاں تھیں۔ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور جی کہنے سے گریز کیا۔

”مجھے ریزی کی تلاش ہے... آپ اُسے بلا دیں گی؟“

آج تک پردیز کو کسی نے ریزی نہ کہا تھا۔ اب ایک لمحہ میں اُس کا نام ہمیشہ کے لیے ریزی پڑ گیا۔

”وہ تو جی گھر پر نہیں ہیں۔“

”کب تک آئے گا؟ مجھے اُس سے ایک سرورق بنانا تھا۔“

”بس جی آتا ہی ہوگا جی...“ میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ حالانکہ مجھے ریزی کی آنیاں جانیاں کبھی ٹھیک سمجھ

پر معلوم نہ ہو سکیں۔

”میں جی پوچھ کر بتاتی ہوں۔“ میں اٹھ کر باورچی خانے تک گئی۔

زیب دروازے میں کھڑی تھی۔

میں اندر چلی گئی..... ”ذرا لاکو بازار بھیج کر نمک پارے اور برنی منگوا لو۔ ساتھ چائے بھی بھیج دینا۔“  
 ”یوں ہے صوفی صاب؟“

”میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ پرویز بھائی کا پوچھنے آئے ہیں۔“

”اتنے سو بنے صوفی صاب، اتنے سو بنے..... ہائے رباتے سو بنے۔“ زینب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔  
 وہ چیپ ہو گئی۔ غالباً اس وقت زینب نے کوئی دعانا کی ہوگی جو بعد میں میرے کام آئی۔

”ویرنہ کرنا..... یہ رکتے والے نہیں..... جلدی لاکو بازار بھیجو۔“

کیٹال پارک کا بازار بالکل پینڈ و صورت تھا۔ اس میں چھوٹی موٹی دکانیں اور سستے سودے تھے۔ ایک حوائی کی  
 حوص کا بنیادی کام وہی دودھ بیچنا تھا۔ لیکن وہ اپنی دکان کی عزت بڑھانے کے لیے نمک پارے اور برنی بھی  
 خاں صاحب نے یہ برنی اور نمک پارے اس طرح کھائے جیسے من و سلوی کھا رہے ہوں اور یہ نعمتیں انہوں  
 سے پراگتھی ہوں۔

”آپ کو علم ہے کہ میں مزنگ روڈ پر رہتا ہوں؟“

”جی..... پتہ ہے۔“

”کیا آپ جانتی ہیں کہ جب ہم پاکستان آئے تو پہلے ہم اپنی خاندان رشیدہ کے پاس ٹھہرے تھے لیکن جلد ہی ہمیں  
 روڈ کا پتہ چلا۔ آپ کو پتہ ہے ہم..... بے سرو ساماں تھے۔ تقو اور میں چھوٹے تھے۔ جو بھائی کراچی میں تھے۔  
 ہماہی وال میں..... ذبا جی میرے والد ساری پونجی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اقبال بھائی نے بڑی ہمت کی۔ وہ چوری  
 کر کے ایک آدھ بکر خرید کر اپنے کندھوں پر سوار کرتے اور پھر اسے گھوم پھر بیٹے اور گھر آ کر ساری  
 بیت مال کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔“

میں بلائنگ پیپر کی طرح ساری انفرمیشن چوس رہی تھی۔

”آپ نہیں سمجھ سکتیں کتنی مشکلات تھیں۔ میری بڑی آپا فرخندہ حاند تھیں۔ اُن کے شوہر ڈاکٹر ایوب احمد خاں  
 جس ہمارے پاس چھوڑ کر لندن جا چکے تھے۔ بالو بھائی کے بیسوں سے گزارا نہ ہوتا تھا۔ پھر میں نے سوچا.....“  
 ”مجھے سمجھ آئی کہ یقیناً اقبال احمد ہی بالو بھائی ہیں۔“

”میں نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ میں کوئی نوکری تلاش کر لوں۔ مجھے پتہ چلا کہ والٹن کیمپ میں ایک کلرک کی  
 تہہ خالی ہے۔ میں بڑے رعب سے اپنی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچا۔ لیکن کلرک نے ڈگری دیکھ کر کہا، بھائی یہاں  
 بی اے۔ پاس آدھی چاہیے۔ دوسرے دن میں اپنی دسویں کی ڈگری لے کر گیا اور مجھے نوکر رکھ لیا گیا۔“  
 میرا دل ترس سے بھر گیا لیکن میں نے منہ سے کوئی اظہار نہ کیا۔

وہ کہتے گئے..... ”والٹن میں ان دنوں ایک بہت بڑا مہاجر کیمپ تھا۔ ٹولے، فرد، قافلے، اجڑے اجڑے لوگ  
 تھے۔ حیران پریشان پڑاؤ ڈال کر سارے کیمپ میں گھومتے پھرتے جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ انہیں اپنے  
 پچھلے رشتہ داروں کی تلاش تھی۔ چھت سے محروم یہ لوگ گھر ڈھونڈ رہے تھے۔ روزگار نہ تھا اور انہیں معلوم نہ تھا کہ

روزی کا وسیلہ کیسے بنے گا؟

”میں کیمپ میں معمولی کلرک تھا۔ میری ڈیوٹی تھی کہ میں مہاجروں کے نام، پتے، کوائف اور ان کی شکایتیں اپنی نوٹ بک میں لکھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے ایک مائیکروفون مل گیا۔ میں اس پر اہم اناؤنسمنٹ کرنے لگا۔ پھر سلسلہ چلا اور مجھے ملتان کیمپ بھی جانے کا حکم ملا۔

”ہوائی جہاز پر دورے ہونے لگے۔ یہ میرے پہلے ہوائی سفر تھے اور میں ان سے بہت مسحور ہوتا تھا۔ صرف ایک مشکل تھی میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ 1- مزنگ روڈ سے والٹن پیدل جانا پڑتا۔ واپسی پر بہت تھک جاتا۔“

وہ لمحہ بھر کوزے تو میں نے سوچا بھلا یہ فاصلہ کتنا ہوگا؟ میں لاہور کی سڑکوں، یہاں کے محلوں سے قطعی ناواقف تھی۔ اس لیے اس فاصلے کا اندازہ لگانا بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔

”والٹن میں ہی ممتاز مفتی مجھ سے ملے۔ بڑا بھلا آدمی ہے۔ وہ بظاہر اڑب لگتا ہے لیکن دل رکھنے کی ریت اس سے زیادہ کسی کو نہیں آتی۔“

بات کرنے والا داستان گوبلا کا سحر الہیان تھا۔ میں سنی سنائی سے گزر کر والٹن کیمپ میں پہنچ گئی اور قریب سے ممتاز مفتی کو دیکھنے لگی۔

وہ مجھے Entertain کر رہے تھے۔ بار بار وہ پھانک کی طرف اس طرح دیکھتے کہ مجھے یقین ہو جائے وہ واقعی ریزی کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھی کسی طرح ان کی گفتگو سے آد بھگت کرنی چاہیے۔ میں انداز لگائی اور اپنی ایک پسندیدہ الیم اٹھالائی۔

”یہ الیم میں نے بڑی مشکل سے تصویریں اکٹھی کر کے بنائی ہے۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند کریں گے؟“

”آپ کی فیملی الیم ہے؟“

”جی نہیں یہ ان فلمی ایکٹرز اور ایکٹریوں کی تصویریں ہیں جو مجھے جی جان سے پسند ہیں۔ جب ہم دھرم سالہ میں ہوتے تھے تو وہاں ایک سینما گھر ہمالہ ٹاکنز ہوا کرتا تھا۔ ان کا ٹیل بورڈ کو تو والی بازار کے چوراہے میں لگتا تھا۔ اس پر لکھا ہوتا تھا ”آجشبکو.....“ مجھے کبھی سمجھ نہ آئی کہ یہ آجشبکو کیا چیز ہے۔“

وہ ہلکا سا مسکرائے.....

”ہمالہ ٹاکنز کے مالک ہمارے پڑوسی تھے۔ یہاں سے مجھے اور ریزی کو فلمیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔“

”مزے تھے تمہارے۔ مفت فلمیں دیکھنے کو ملتی تھیں.....“ شتو جی نے کہا۔

”ناں ناں جی میری امی نے بھائیہ صاحب کو بڑی شدت سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کو بغیر ٹکٹ خریدے ہال میں نہ جانے دیں۔“ میں نے جلدی سے ٹوکا۔

”ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ سینما کے مالک آپ کے ہمسائے تھے۔“

”ہمسائیگی اور چیز ہے ٹکٹ اور معاملہ تھا۔“

الیم کے پہلے صفحے پر کندن لعل سہگل کی تصویریں تھیں۔ کندن لعل سہگل نے پہلی مرتبہ فلم ”دیوداس“ میں رول

”یہ کیا کہہ رہا ہے اس کماری سے لے کر پشاور تک سینما کے شائقین عیش عیش کر اٹھے۔ اس فلم میں پارو کا رول ڈبلی تیلی  
تھی۔ یہ تو میرا وائے اُس کے شوہر کا رول ادا کیا تھا۔“

”اس کے عجیب کام ہیں۔ وہ عروج کے مقامات بدلتا رہتا ہے اور زوال کو کبھی کسی ایک مقام یا شخص پر مستقل نہیں  
رہتا۔ عمارت میں بھی فلمی عروج کی داستان کچھ اسی طرح تھی کہ سب سے پہلے بمبئی ٹاکنیز نے تہلکہ مچایا۔ ”اچھوت  
نہیں“ بمبئی فلمیں بنائی گئیں، جس میں دیوکارانی نے شو درلڑکی کا رول ادا کیا۔ ان کے ساتھ ایک کھیپ بڑے ایکٹروں اور  
نئی فلموں کی پیدا ہو گئی۔“

”پھر گویا اوپر سے اشارہ ہوا اور ساری شہرت سارا عروج نیو تھیٹر کی شکل میں بمبئی سے کلکتہ منتقل ہو گیا۔ کندن  
کا سٹیج ملکہ کی آواز نے ڈھانپ لیا۔ مدھو بالا، سنو چنا کو بھول کر لوگ کانن بالا کے گن گانے لگے۔ میں خود کانن  
کا سٹیج ہیڈ فیئین تھی اور اُس کی ”جواب“ فلم نے مجھ پر جاوہ کر رکھا تھا۔“

”سہگل جب دیو داس کے روپ میں گاتا..... ”دُکھ کے اب دن چیت نہ ہیں“ تو دل میں شام ہی پڑ جاتی۔  
کانن بالا جب منت بھرے لہجے میں گاتی.....“

”جانے نہ دیں گے نہ جانے دیں  
لیٹ رہیں گے راہوں میں“

تو گویا ہیر دُن کے ساتھ ساتھ ٹکٹ خریدنے والے بھی ہیر و زکورو کو دیکھنا چاہتے۔

کندن لال سہگل ایک مرتبہ دھرمسالہ آئے تھے۔ ریٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ وہاں ہم اُن سے اُسی عقیدت  
تھی جس طرح سارے فیئین (عقیدت مند) جاتے ہیں۔ سہگل اپنا ایک ٹی سیٹ بیچ رہے تھے۔ امی نے وہ ٹی  
سیٹ بیوروپے میں خرید لیا۔ عجیب بات ہے کہ وہ سیٹ میرے پاس C-121 تک رہا اور بالآخر میں نے اسے ایک ایسے  
بھٹے پر رکھا جو سہگل کی یاد میں جمع کر رہا تھا۔

میں یہ الیم خاں صاحب کو پوری جانکاری، دلچسپی اور توجہ سے دکھا رہی تھی لیکن وہ بظاہر متوجہ لیکن بہ باطن وہ کسی  
جسٹس میں تھے۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولے..... ”یہ تو بڑی اچھی ہابی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور سنجیدہ قسم کی  
قسمت آپ کے بھائی تو بہت اچھے آرٹسٹ ہیں۔ آپ کا کوئی ایسا مشغلہ؟“

”اشفاق صاحب میں..... کچھ کہانیاں لکھ لیتی ہوں۔ ایسے ہی..... ٹاک ٹوئیاں..... کچھ مہاجر کہیوں سے  
تھی..... کہانیاں..... کچھ ارد گرد کا تجربہ۔“

”واہ یہ بات ہوئی ناں..... یہ شوق تو بہت ہی مثبت ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی کہانیاں دکھا سکتی ہیں؟“

میں اپنے آفس میں چلی گئی..... میز کی دراز سے میں نے وہ پیلے کاغذ نکالے جن پر میری کہانیاں رقم تھیں۔  
”سے پور“ ”قاطرہ“ کہانی تھی۔ بہت بعد میں اس کہانی کا ڈرامہ ”صبح کا تارا“ بنایا گیا۔ جسے پہلی مرتبہ آغا ناصر نے  
پیدا کیا۔ پھر انور سجاد نے اس میں ہیر و کارول کیا۔

جب میں کاغذوں کا پلندہ لے کر آئی تو خاں صاحب بڑی بے تکلفی سے لالو سے مشغول گفتگو تھے۔ اُن کا انداز

ایسا تھا گویا وہ برسوں سے لالو کو جانتے ہوں۔ مجھ سے انہوں نے افسانے پکڑ لیے اور بڑی دلچسپی سے ورق گردانی کرنے لگے۔ ایک مبتدی کی طرح میرے ہاتھ پاؤں کاٹنے لگے۔

”کاش کی! آپ صفحہ نمبر نہیں لکھتیں.....“

میں نے کبھی پوری توجہ اور اہتمام سے یہ کام نہ کیا تھا۔ یہ تو وقت کئی کا ایک شغل تھا۔ اچانک یہ افسانے ایک نئے رابطے کا سنگ بنیاد بن گئے۔

”جی بات یہ ہے کہ میں نے جلدی میں کچھ ترتیب سے کاغذ اکٹھے نہیں کیے۔“

”دیکھیے کوئی جلدی نہیں، آرام اطمینان سے الگ الگ کر کے افسانے مرتب کر لیجیے۔ میں پھر آ جاؤں گا۔“

ریزی تو ابھی آیا نہیں، اچھا پھر سہی۔

کالے پھانک کے پاس کھڑی سائیکل باہر نکالی۔ اس کے سوار نے نہ مڑ کر ناٹا بائی بائی کرنے کی کوشش کی نہ کوئی الوداعی جملے ہی کہے۔ بس ایک دردناک ہی خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ پھر مری سے اُن کا خط آیا کہ وہ جلد آئے۔ آئیں گے اور افسانے ضرور دیکھیں گے۔

ایسے ہی ہوا۔ جب دوبارہ وہ ہمارے گھر آئے تو چند افسانے اپنے ساتھ لے گئے۔ میری حیرانی کی انتہا نہ تھی جب میرا پہلا افسانہ ”واماندگی شوق“ ادب لطیف میں چھپ گیا۔ وہ یہ رسالہ دستی لے کر میرے پاس آئے۔

”بیجیے مبارک ہو۔ ادبی سفر شروع ہو گیا۔“

رسالے کے اوپر لکھا تھا ”کاش میں بھی ایسا ایک افسانہ لکھ سکتا!“

کہانی پر میرا نام بانو قدسیہ لکھا تھا۔ یہ نام خاں صاحب نے اپنی طرف سے عنایت کیا تھا۔ اس کے بعد رفت رفت میرا یہی نام شہرت پکڑتا گیا اور میں اپنا آبائی نام قدسیہ چھوڑ کر خود بھی بھول گئی۔

یہ ”نام“ کی بھی عجیب کہانی ہے۔

میری والدہ نے کبھی مجھے قدسیہ کہہ کر نہ پکارا۔ وہ مجھے کاش کی اور ریزی بھائی کو کاش کہتی تھیں۔ لہذا میری میکینک میں میری سہیلیاں جمیلہ ظفر، امینہ ملک، انور ملک اور آبی اقبال ملک مجھے ”کو“ کہہ کر پکارتیں۔ میں بھی اس نام پر خوش رہتی۔ مفتی جی مجھے قدسی پکارتے رہے لیکن شہاب صاحب نے جب مجھے بانو کہہ کر بنا بنا شروع کیا تو ہر نام ماند پڑ گیا۔ اب تک یہی نام مستعمل ہے۔ چھوٹے بڑے مجھے ”بانو آ پا“ کہہ کر پکارتے ہیں اور میں اس نام کے ساتھ اندر باہر بڑی مناسبت محسوس کرتی ہوں۔

ایک دفعہ بانو قدسیہ بن جانے کے بعد مجھ میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی، لیکن شوق میرے لیے پریشان تھے۔ جانتے تھے کہ میری اردو کمزور، مشاہدہ کمزور تر اور تخیل بھی واجبی سا ہے۔ لیکن اب اُن کے پاس کینال پارک آنے کا بہتر اچھا جواز پیدا ہو گیا۔ وہ مجھے کبھی کبھار کچھ لکھنے کے لیے دے جاتے اور پھر اس ورق کو بڑے احترام سے لے جاتے۔ کرنے کا یہ انوکھا ڈھنگ خاص اُن کی اختراع تھی۔

اسی جذبے کے تحت انہوں نے بعد میں مجھے ”داستان گو“ کا ایڈیٹر بنا دیا۔ کبھی کبھار وہ ”من چلے کا سودا“ کہتے

تھت مجھے ایک آدھ سین کی ون لائن پکڑا دیتے اور لکھنے کی فرمائش کرتے۔ یہ سب کچھ میرا ماں بڑھانے کے لیے تھا۔ اس سے ان کا اپنا کوئی فائدہ ملحوظ خاطر نہ تھا۔ بس میری خود اعتمادی اور انا کے لیے بڑھاوا تھا۔

یہاں اشفاق احمد کی ایک مشکل سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ ہمارے گھر کا قریباً فرد بن گئے تھے۔ ہمارے ساتھ بھئی روزیادہ اپنا سیت محسوس کرتے۔ نمک پارے اور برنی کھاتے ہوئے انہیں محسوس ہوتا کہ وہ اب دور نہیں جاسکتے۔ پھر آخری شہرت سے وہ فرار کا راستہ اختیار کرتے۔

1950ء سے 1955ء تک بڑے طوفانی سال ہیں۔ میں کبھی ملتان چلی جاتی تو ان کے خطوط میرا تعاقب کرتے۔ میں ملتان سے آتی تو چند بے ربطی ملاقاتیں ہوتیں۔ پھر وہ کبھی جہلم، کبھی مری، کبھی تراز کھیل میں ریڈیو کی کوشش کرنے چلے گئے لیکن دور بھاگنے کے باوجود وہ اس تعلق سے کئی طور پر شفا یاب نہ ہوئے۔ گریز کا پہیہ انہیں کینال پلک سے دُور بھگا تار با لیکن لوٹ آنے کے لیے راستہ چھوڑتا رہا۔

ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ وہ جہاں بھی گئے ہمیشہ خط لکھتے۔ یہ خط جذبے سے عاری اور بیانہ موٹنگائیوں سے بھرا ہوتے لیکن اندر ہی اندر وہ سوچ رہے تھے کہ یہ دوری یہ فاصلہ کافی نہیں۔ انہیں ضرور کسی لمبی اُزان پر جانا ہوگا تاکہ گھر کی روایات اور وفاداری کو ٹھیس نہ پہنچے۔ گویا انہیں ایک ایک قطرے کا مجھے اور اپنے گھر والوں کو حساب دینا تھا۔

دراصل اشفاق احمد نے بڑی کرب کی زندگی گزاری اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ کسی کی دلا زاری کو سب سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ان پر یہ حقیقت نہ کھلی کہ دل شکنی زندگی کا ایک وصف ہے۔ اللہ میاں کبھی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر عافیت بنا کر نازل کر دیتا ہے، کبھی رحمت بنا دیتا ہے۔ یہ سب اُس کے کھیل ہیں۔

اس حقیقت کو طائف کے واقعے یا رحمتِ دو عالم پر کوڑا پھینکنے والی مائی کے حوالے سے سمجھنا چاہیے کہ ہمارے نبی نے کبھی ان لوگوں کو موردِ الزام نہیں سمجھا بلکہ یہی جانا کہ بیچارے لوگ معیشت کے ہاتھ میں اس آشوب کا ہتھیار بنے ہوئے ہیں۔

اس کو کیا کیا جائے کہ قدم قدم پر ہر لمحہ ہر موسم اور مقام پر دل ٹوٹتے ہیں۔ کبھی کسی غلط فہمی کے تحت کبھی خوش فہمی کے باعث دل شکنی ہو ہی جاتی ہے۔ کبھی حسدِ حق تلفی کا باعث بنتا ہے کبھی طیش۔ انسانی جذبوں نے قلب اور نفس میں جو ہجو جو تڑی مچا رکھی ہے دماغ کی شریانیں بیرون کی جن تبدیلیوں سے متاثر ہوا کرتی ہیں، وہ سب حالات کی تبدیلی سے مل کر شہت و ریخت کا باعث بنتے ہیں۔

شاید اسی لیے تمام مسلک خواہش سے دُور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے ضرورت بھر کھانا، حدودِ معاش و تنہید جنس، انکساری کے ہمراہ ضرورت بھر عزتِ نفس کا حصول، رزقِ حلال کی یافتِ اسلامی تعلیم ضرور ہے لیکن یہ عام حقیقت کے بس کی نہیں۔ خواہش ہمیشہ ان ضروریات کو بڑھا دیتی ہے اور انسان اس خواہش کے حصول میں دلا زاری کا ہتھیار بوجاتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی دل شکنی ہو ہی جاتی ہے۔

خال صاحب نے ایک بار اپنے مسائل سے ستانے کا وقفہ لیا اور جہلم چلے گئے۔ یہاں پر ائم گلاس فیکٹری تھی



جس کے مالک سعید احمد خاں تھے جو اماں سردار بیگم کے کزن تھے۔ یہ پاکستان کی پہلی گلاس فیکٹری تھی۔ Amroc سے قریب وجود میں آئی تھی۔ گیس سارے شہروں میں پہنچی لیکن جہلم محروم رہا اور بالآخر گیس نہ ہونے کی وجہ سے فیکٹری بند ہو گئی۔ ان دنوں پرائم گلاس فیکٹری کو گیس نہ ملی تھی اور وہ تیل کی بھینوں سے کام کر رہے تھے۔ یہاں جتنی مرتبہ خاں صاحب گئے انہوں نے مجھے خط لکھے جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہیں اپنے خاندان کے لوگوں سے کس قدر محبت تھی اور ان سے بانہہ چھڑانے کے بعد وہ کس کرب سے گزر رہے ہوں گے۔

دراصل پٹھانوں میں جو کچھڑاں ایک جہتی ہے وہ انوکھی چیز ہے۔ وہ کبھی بھی اپنوں کے قرب سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ اگر بوجہ کچھڑاں بھی جائیں تو چھپکلی کی کٹی دم کی طرح پھڑکتے رہتے ہیں۔ وہ عم زاویہ کی محبت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ انہیں حفاظت کا احساس اپنے رشتہ داروں سے گھلے ملے رہنے سے ملتا ہے۔

غیر پٹھانوں کے ساتھ کھانے پینے، اعتقادات، رسم رواج، Osmosis جاری رہتا ہے۔ لیکن وہ غیر پٹھانوں میں ضم نہیں ہو سکتے۔ ہر پٹھان غیر پٹھان کے ساتھ دوستی تو کر سکتا ہے، محبت کا مرتکب ہو سکتا ہے، قلب میں سیرجی لگا کر ہو سکتا ہے لیکن غیر پٹھان کے ساتھ عمل طور پر کمزیر نہیں ہو سکتا۔

اگر مجھے درست یاد ہو تو تراڑ کھیل میں یوسف ظفر، ممتاز مفتی، عمر صاحب (جنہیں خاں صاحب عمر بکری کہتے تھے کیونکہ عمر ہر پہاڑی پر بکری کی طرح چڑھ جاتے تھے) یہ بھی سنی سنائی سمجھے کہ یہ چاروں مری سے ایسے پروگرام نشر کرنے میں مشغول تھے جو پاکستانی نقطہ نظر کی وضاحت اور نظر یہ پاکستان کی حفاظت کر سکیں۔

”ہم آگے“ پروگرام نشر ہونے لگا۔ اس پروگرام کی خوبی یہ تھی کہ پندرہ منٹ پہلے جو پروگرام بھارت سے ہوا اس کا جواب خاں صاحب ڈنکے کی چوٹ لکھتے اور جوابی حملہ اس قدر منہ زور اور سخت ہوتا کہ غالباً ہندوستان والے ساواں اس کا جواب ہی سوچتے رہتے۔

تراڑ کھیل میں ایک ٹرک میں ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا تھا۔ یہاں کا سماں عجیب تھا کہ ٹرک میں باہر کے شور سے چھٹکارا پانے کے لیے مائیکروفون اور ایکسٹرا پنے اوپر رضائی اوڑھ لیتے تھے۔ یہ اختراع اس لیے کی گئی تھی کہ ہندوستان سے ہونے والے پردیگنڈہ پروگراموں کا فوراً جواب دیا جائے۔ خاں صاحب کے ذمے ”ہم آگے“ کا سکرپٹ لکھنا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کا پروگرام سنتے۔ ساتھ ساتھ حاضر جوابی سے سارے اعتراضات کا جواب رقم کرتے۔ جونہی بھارتی پروگرام بند ہوتا تو تراڑ کھیل سے ان ڈنکے ہوتی..... ”ہم آگے!“

اس پروگرام میں مشہور آرٹسٹ محمد حسین اور تاج صاحب پیش پیش تھے۔ کبھی خاں صاحب بھی صدا کاٹتے کرتے لیکن زیادہ تر وہ سکرپٹ ہی لکھتے تھے۔ ممتاز مفتی بھی وہیں تھے اور وہ بھی سکرپٹ لکھا کرتے تھے۔ خواجہ صدکاروں میں جمیل اختر سے خاں صاحب کی یہیں ملاقات ہوئی تھی۔ خاں صاحب ازل سے محنتی تھے۔ ان کے لیے عمر سے دوری، کانے پھانک والی سے فاصلہ، اپنی تنہائی کا غم اس پروگرام کے سامنے دھندلا جاتا۔

یہیں رہ کر غالباً سب سے پہلے ان پر یہ بات واضح ہوئی کہ ان کے دل میں پاکستان کی محبت دائمی ہے۔ کبھی محبت پھر جوان ہو کر ”تلقین شاہ“ پروگرام میں ابھری جو پورے 39 سال نشر ہوتا رہا۔ اس پروگرام سے ان کی وفاداری

تھے۔ اُن کی محنت طلبی کا ایک عجیب واقعہ بھی ہے کہ جب باباجی محمد خاں اس جہاں سے چلے گئے تو ابھی اُن کا جنازہ گھر پر نہ تھا اور خاں صاحب ماتم داروں سے چھپ کر ”تلقین شاہ“ لکھ رہے تھے۔

پاکستان سے والہانہ محبت نے 1971ء کی جنگ میں ”داؤد لوہار“ کا روپ دھارا۔ اس پروگرام کو وہ لاہور سے چھپ کر لے کر لے گئے اور اس میں صدا کار بھی شتو ہی تھے۔

خاں صاحب شاید تراڑ کھیل سے جلد واپس نہ آتے لیکن ایم اے کا رزلٹ نکل آیا۔ ہم دونوں پاس ہو گئے تھے۔ تمہوں نے مجھے مبارک باد کا تار بھیجا تو مجھے لگا جیسے میری محنت ٹھکانے لگی۔ امتحان میں خاں صاحب فٹ آئے۔

میں نے نمبر پر آئی لیکن مجھے ایک بار بھی اس بات کا رنج نہ ہوا۔  
ووترنت ہی لاہور واپس آئے۔

کالا پھانک کھلا..... اشفاق صاحب نے اپنا ہو پر سائیکل لال بگری کے ساتھ دائیں کونے میں رکھا۔ سیڑھیاں چڑھے اور آدھے کی آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر یوں بیٹھے جیسے کوئی تھکا ہوا مسافر سفر سے گھر لوٹتا ہے۔

ایک سبب وقتہ خاموشی کا گزرا۔ پھر نہ تو کوئی بات تراڑ کھیل کی ہوئی نہ امتحانوں کے متعلق دہرائی گئی۔ اشفاق صاحب نے بڑی لجاجت سے کہا ”دیکھیے میری اماں کو شوق چڑھا ہے کہ وہ میری کامیابی کی خوشی میں دعوت کریں۔ آپ کو شوق نہ ہو تو آئیں۔ کل رات قربانیاں آٹھ کے درمیان۔“

میری والدہ ملتان میں تھیں اور اُن کی اجازت کے بغیر میں کہیں جا نہ سکتی تھی۔ ویسے بھی خوف میری شخصیت کا تھوڑا سا حصہ ہے۔ خود بخود پھلتا پھوٹتا ہے۔ خود بخود دیوانہ وار مجھ پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی میں ابھی لڑکیاں اتنی ماڈرن نہ تھیں کہ یوں آزادانہ گھوم پھر سکیں۔ ابھی تو سہیلیوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ پتہ نہیں چلے گا مجھے خیال آیا کہ میں 1۔ مزنگ روڈ جا کر اپنے آپ کو بے وقت اور Cheap ثابت کروں گی۔

”مشکل یہ ہے کہ میں تو آپ کے گھر نہیں آسکوں گی۔ آئی ایم سوری، یہ ممکن نہیں۔“

شوقنور اٹھ کھڑے ہوئے... ”میں تو اماں کو مرغیاں خرید کر دے آیا تھا۔“

میرا انکار سن کر غیرت مند پشیمان بچے نے اصرار نہ کیا۔ سیڑھیاں اترے ہو پر سائیکل سنبھالا، کالا پھانک کھولا

چند دنوں بعد مجھے ایک خط ملا، جس میں تحریر تھا کہ خاں صاحب نے وہ تمام مرغیاں اماں سے لے کر کوٹھے پر لے گئیں اور چیلیں اُن کی خوشی کو مرغیوں سمیت نوج نوج کر کھا گئیں۔

خاں صاحب نے اس کے بعد فرار کے کئی راستے اختیار کیے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائے۔

لیکن دعوت کی یہ خطگی تا دیر قائم نہ رہ سکی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شوق اپنے چھوٹے بھائی تقو کو لے کر ہمارے گھر آئے۔ اشتیاق کو کچھ دنوں کی چھٹی تھی اور کیڈٹ صاحب اپنے خاندان سے کچھ ہمت، حوصلہ افزائی اور محبت کی گرمی کا صلہ بخورنے آئے۔ باباجی محمد خاں سے تو سب بچوں کا دوری اور سرد مہری کا رابطہ تھا لیکن اماں جی ان ساری کوتاہیوں کو بھول کر ہم سے برابر کر دیتیں۔

تقو کے سنہری بالوں میں سرسوں کے تیل کا مساج کیا جاتا۔ اُس کی پسند کے کھانے پکائے جاتے۔ تقو امان کے کمرے میں سوتا۔ وہ پھل شوق سے کھاتا جو اماں، جی امیری بیگم سے خرید کر الماری میں رکھتی تھیں۔

ہمارے گھر میں گھتے ہی تقو نے مجھے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”کاکی! تمہارے پاس کرکٹ کا بلا ہے؟“  
”تم آرام سے برنی کھاؤ۔ تمہیں کرکٹ سے کیا“ میں نے جواب دیا۔

”بھائی میں Sportsman ہوں۔ روز جو گنگ کرتا ہوں۔ سوئمنگ میری عادت ہے۔ میں یوں بیٹھ کر صرف

باتوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہاں مزگ روڈ میں بھی کوئی نہیں کھیلتا۔ نہ ان ڈور نہ آؤٹ ڈور.....“

اتنے میں ریزی کہیں سے ایک بیس بال کا ڈنڈا تلاش کر کے لے آیا۔ یہ ڈنڈا اس کوٹھی میں پرانا پڑا ہوا تھا۔  
”کیا اس ڈنڈے سے کام بن جائے گا؟“ ریزی نے سوال کیا۔

”ڈراہٹ لگانا مشکل ہوگا لیکن گزارہ ہو جائے گا..... اور کوٹھی؟“ تقو نے پوچھا۔

”یہ کیا مصیبت ڈال رہے ہو۔“ چائے پیٹے ہوئے خاں صاحب بولے۔

”دیکھیں تو سہی کیا مزا آتا ہے۔“ تقو نے کہا۔

اس کے بعد تقو اور ریزی نے جنگلی سرکنڈوں میں سے خشک ڈنڈے تلاش کر کے برابر کی وکٹیں بنا کیں۔

بازار بھیج کر گیند منگوا دی۔ یہاں بازار میں کھیلوں کی دوکان تھی۔ پتہ نہیں لالو کس دکاندار سے ٹینس کا ایک بال لے آیا۔

کھیل کا بنیادی سامان تیار ہو گیا۔ ہم سب بیڈمنٹن، سوئمنگ، کیرم بورڈ، لوڈو کے شوقین تھے۔ فنانٹ تیار

گئے۔ طے یہ پایا کہ چونکہ زیادہ کھلاڑی موجود نہیں اس لیے ہر کھلاڑی اپنی اپنی رز بنائے گا اور جو سب سے زیادہ رز بنائے  
وہی جیت گیا۔

دکٹیں سیرھیوں کی طرف فٹ کی گئیں اور باؤلر پھانک کی طرف سے حمدا اور ہونے لگا۔ ہر کھلاڑی دو دو اوور

گیند دینے کا مجاز تھا۔ ان بارو گیندوں میں اُس کی پوری کوشش ہوتی کہ بیٹس میں آؤٹ ہو جائے۔ نکلے والے حوض سے

آگے چھکا شمار ہوتا۔ اس کھیل میں ہر کھلاڑی کافی روندی مارتا۔ اپیلیں ہوتیں اور ہر کھلاڑی چونکہ بزم خود ریفری بھی

کھیل میں بلا لگا رہتا۔

میرے کزن معظم سب سے کمزور کھلاڑی تھے۔ وہ دو چار گیندوں میں آؤٹ ہونا شروع ہو جاتے لیکن اُن

آرٹ یہ تھا کہ پورے دو اور کھیل کر نکلتے۔ کبھی کبھی میری کیلی محمودہ منظور آ جاتی۔ اس کا نام چھوٹے ہی تقو نے ”بنو“ رکھ

دیا تھا اور کبھی کبھی وہ نام رکھنے کی وجہ اس مصرع سے دیتا ’بنو دالک چیتے ورگا۔‘

بنو متحمل مزاج تھی، جلدی آؤٹ ہونے پر اُس نے کبھی برا متایا نہ کسی کے بنو پکارنے ہی کا..... ہم سب کھیتے

کے شوقین تھے۔ ہمیں جیتنے یا ہارنے سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اس کھیل کے علاوہ اشتیاق نے ایک اور کھیل بھی ہمیں سکھایا۔ یہ ایک طرح سے چور سپاہی کا کھیل تھا۔ رات

کے اندھیرے میں سب چھپ جاتے اور ایک کھلاڑی سپاہی بن کر تلاش میں نکلتا۔ جب اُسے کوئی دوسرا کھلاڑی نظر آ جاتا۔

وہ کہتا ”Smy کسی۔“ یعنی (It is me) اور کھونے والا کھلاڑی پھر سپاہی بن جاتا۔ کھیل کھلاڑی میں مشغول

صحت سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

ہم سے پچھڑ کر جب تقو واپس ”کاکول“ جاتا تو اُس کے خط مجھے، ریزی اور معظم کو آتے رہتے۔ یہاں بھی  
 بے میں کبھی کسرنہ اٹھارکھی گئی۔ خاں صاحب البتہ محتاط رہتے۔ وہ اگر دو قدم آگے بڑھتے تو تین قدم پیچھے بھی اسی  
 سے لوٹ جاتے۔ گھر میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا جو جھڑکتا، ٹوکتا لیکن ابھی اقدار زندہ تھیں۔ ان دیکھے والدین کی ناراضگی  
 سے جی اور معاشرے سے ڈر بھی نئی پود کو بے راہ روی سے روکے رکھتا۔

اشتیاق کے بعد ”نیلو“ ہمارے گھر کا فرد بن گئی۔ نیلی آنکھوں والی ڈیڑھ دو برس کی بچی ریزی اور مجھے پسند  
 تھی۔ بھائی اور باجی ضیاء کی بیٹی نیلو کو سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر سائیکل سٹینڈ پر اُس کے دو تین چالے رکھ کر خاں  
 صاحب کے محل پارک آتے۔ ان دنوں ناہور کی سڑکوں پر رش نہ تھا۔ اتنا نسا ستر خاں صاحب بڑی سہولت سے طے کر لیتے  
 تھے۔ یہاں حادثے کا خوف دامن گیر نہ ہوتا۔ نریٹک مہربان تھی۔ سڑکیں کشادہ اور ویران۔

نیلو سائیکل کی سیر پر خوش ہوتی اور خاں صاحب اُسے خوش دیکھ کر نہال ہوتے۔ ابھی خاندان مسٹی بند ایک  
 برس کی محبت میں سرشار لوگوں کا مجموعہ تھا۔ مزگ روڈ والے شقو پر تو اعتماد کرتے ہی تھے، رفتہ رفتہ انہیں ہم پر بھی اعتبار  
 سے بڑھ گیا۔

اس چھوٹی سی بچی میں خاں صاحب کی جان تھی۔ ریزی میں محبت کرنے والی روح تھی۔ وہ نیلو کو دودھ پلا کر  
 دیتی تھی۔ نیلو کے آتے ہی اس اُجاز، ڈھنڈار پرانی بوسیدہ کٹھی میں جان پڑ جاتی۔ جس چھوٹے سے چوبچہ نما حوض کا ذکر  
 کرتے تھے۔ یہ نیلو اور میری بہشت تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ میں نیلو کو نلکے کے نیچے کھڑا کر دیتی اور ہتھی اور پینچے کرنے لگتی۔ نیلو پانی کی دھار تلے  
 کھڑی ہو جاتی۔ جونہی ٹھنڈا پانی پڑتا وہ ہلکی سی سبکی بھر کر تھوڑا سا رزتی۔ لیکن اگر پانی بند کر دیتے تو وہ رونے لگتی۔ وہ اتنی دیر  
 تک جاتی رہتی جب تک اُس کا جسم ٹھنڈا برف نہ ہو جاتا۔ اُس کی آنکھوں میں دھند سی چھا جاتی اور اُس کے ہونٹ کا پینے  
 تھے۔ گھر میں اُسے تو لیے میں پلیٹ کر اندر لے جاتی۔

نیلو کے آنے سے ہم لوگ جیسے ”گھر گھر“ تھینے لگتے۔ نیلو کو میزے سپرد کر کے خاں صاحب نے کبھی کوئی  
 بات نہ دی۔ میں نے کبھی اُن سے نہ پوچھا کہ وہ کیا کھائے گی؟ کیا پئے گی؟ کب جاگے گی؟ بس اس نعلی گھرداری کی  
 سب سے بے یون خاموشی تھی۔

ایک روز گہری شام کے وقت کالا پھانک کھلا۔ اقبال بھائی اندر آئے۔ یہ میری اُن سے پہلی ملاقات تھی۔ دُبلا  
 پتلا جسم، خاں صاحب جیسا چہرہ، لب و لہجے میں شائستگی۔ بڑی لجاجت سے آگے بڑھے۔

”نیلو..... کیا نیلو یہاں ہے؟“

”جی آئی تھی لیکن شقو کے ساتھ چلی گئی۔“

”کتنی دیر ہوئی؟“ بھالو بھائی نے سوال کیا۔

”یہی کوئی آدھا گھنٹہ۔“

تشویش اُن کے چہرے پر تھی لیکن اُن کا لب و لہجہ اس تشویش کو ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔  
 ”شکریہ۔“

وہ لوٹنے لگے۔

”جی آپ بیٹھیں گے نہیں۔“

”میں ضرور بیٹھ جاتا لیکن باجی ذرا پریشان تھیں۔“

میں تھوڑی سی احساسِ جرم میں چلی گئی اور اصرار نہ کر سکی۔ کالی سائیکل پر گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے یوں احساس ہوا گویا خاں صاحب واپس جا رہے ہوں۔

میں اس سال کے دوران کبھی کبھی ملتان چلی جاتی۔ کبھی امی ہمارے ہاں دورے پر آ جاتیں۔ ریزی بھائی کی چھوڑ چکے تھے۔ وہ اور معظم کبھی مکتبہ جدید چلے جاتے۔ کبھی شفق سے ملنے مزنگ روڈ کا پھیرا لگاتے۔ کبھی انارکلی اور ماں کی سیر کرتے۔ ریزی بھائی اپنی پینٹنگ سے غافل نہیں تھے۔ کوئی ایک آدھ سردق بنانے کو مل جاتا تو بروقت اسے ڈالتے۔

آسان سے وقت تھے۔ ابھی بیرونِ زمانے نے تیزی اختیار نہیں کی تھی لیکن خاں صاحب نے اپنے اندر تضاد کے باعث بڑی مشکلات ایجاد کر رکھی تھیں۔ نہ انہیں بھاگنے اور گریا کرنے پر اختیار تھا۔ نہ وہ بار بار خطوں کے ذریعے ملاقاتوں کا سہارا لے کر مجھ سے ہر بار از سر نو رابطہ قائم کرنے سے اپنے آپ کو روک سکتے تھے۔

آپ کو جو صوفی ”رنگ رلیاں“ افسانے میں نظر آتا ہے اس صوفی کی ابتداء یہاں ہی سے ہوئی تھی۔ منگ بھٹے رہنے والے بھگت، کسی ڈیرے پر چپ تپ کرنے والا راہب ایسی ہی منہ بند کیفیت سے گزرتا ہے۔ صوفی بھی عشق کو ہے۔ اُس کی ضروریات بھی اُسے ستاتی ہیں۔ انسان ہونے کے ناطے اُس کے اندر بھی دنیاوی آسائش کے خواب اگڑا یاں لیتے ہیں۔

اگر صوفی ساتھ ساتھ شریعت کا بھی پابند ہو تو وہ اگلس و کھواب کے فرشوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنے کے خواب بھی دیکھتا ہے۔ میوے اُس پر جھکے چلے آتے ہیں۔ وہ ایسی حوروں کے خواب دیکھتا ہے جن کو نہ انسان نے ہاتھ لگایا ہو نہ کسی جنم نے..... صوفی، راہب، بھگت اپنی جسمانی اور روحانی خواہشات سے بڑے سلیقے سے ان خواہشات کو پورا کرنے کے بجائے جہادِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان ہی دنوں میں خاں صاحب نے بھی جہادِ نفس کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ مگر غالباً فرار کا تھا۔ جس مقام پر اپنی ذمہ داری حفاظت کے قابل نہ رہتی، وہ اس مقام پر بھونڈی جنگ کرنے کے بجائے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی مصلحت سمجھتے۔

ایک صوفی کا واقعہ بہت بعد میں خاں صاحب اپنے چاہنے والوں کو بتایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صوفی بادشاہ اپنے مرید کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں ایک ندی آ گئی۔ پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں ایک صاحبِ جمال جو اس سال، طرحدار خاتون ندی کنارے کھڑی ہے۔ صوفی کو دیکھ کر بولی..... ”اے اللہ کے بندے! رات آیا چاہتی ہے مجھے پار پہنچانا ہے لیکن پانی کا بہاؤ تیز ہے۔ کیا تو مجھے پار اترنے میں مدد دے سکتا ہے؟“

میرید اس وقت اپنے پانچنے اٹھانے میں مشغول تھا۔ صوفی نے عورت سے یہ سوال نہ کیا کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے۔ اس وقت پار جانا ضروری ہے۔ چپ چاپ اُسے کندھوں پر اٹھایا اور پار لے گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر عورت نے کمال بے اعتنائی سے اپنا راستہ لیا۔

کچھ دیر تو میرید نے اپنے اندر کندھ بد کو برداشت کیا۔ پھر قدرے حیرانی اور خفگی سے بولا۔

”یوں عورت کو کندھے پر اٹھا کر دریا پار کرانا باباجی..... کیا یہ گناہ نہیں؟“

باباجی ہنسے اور محبت سے بولے ”واہ بھائی! میں نے عورت کو دریا پار کرتے ہی اُسے اپنے وجود سے اُتار دیا۔ تم

بھی کسی میں مشغول ہو۔“

یہی جہاد نفس کی پختگی ہے۔ اس مقام تک کوئی کوئی پہنچ پاتا ہے۔ خاں صاحب سلیقے سے زندگی گزارنے کا گرو تھے۔ لیکن کچے مرید کی طرح اس پر کار بند ہونے کی صلاحیت اُن میں نہ تھی۔ وہ تو ابھی زندگی کے چھوٹے چھوٹے بچے بھاگنے والے تھے۔ انہیں ریزی اور معظّم نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ زویٰ صاحب کے چکر تھے۔ اثر صاحب اور شفقت باباجی کو اُن کی محبت پر تکیہ تھا۔ اتنی ساری کھینچا تانی میں وہ سکون قلب کا نسخہ کیسے لکھ سکتے تھے۔

معظّم میرے ماموں زاد بھائی پتہ نہیں کیسے ہمارے گھر منتقل ہو گئے تھے؟ ماموں فضل نے انہیں بی اے کرنے کے لیے میرے پاس بھیجا تھا لیکن معظّم دنیا جہاں کی کتابیں پڑھتے، کافی ہاؤس میں ادیبوں کی سنگت میں بحث مباحثہ کرتے لیکن کورس کی کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ریزی اور مجھ سے زیادہ معظّم خاں صاحب کی زندگی میں دخیل ہو گئے۔

دیال سنگھ کالج میں نوکری کر کے جب خاں صاحب گھر لوٹے تو معظّم کو 1۔ مزنگ روڈ پر منتظر پاتے اور پھر گھر کی سیر میں منزل پر شتو جی اور معظّم باتوں کے غبارے اُڑایا کرتے۔ جس قدر معظّم اردو ادب کا رسا تھا اسی قدر ریزی کی صحبت سے دُور تھا۔ وہ کیونرس رگ اور پراسپیکٹو (Prospective) کے چکروں سے کبھی آزاد نہ ہوا۔

ابھی ہم کالج میں تھے۔ جب خاں صاحب کی دوستی غلام محی الدین اثر صاحب کے ساتھ طے ہو گئی تھی لیکن ایم اے کے دوران ہی ایک اور چکر چلا۔ سال کے بعد نئی کلاس نے داخلہ لیا۔ ان میں باباجی شفقت تھیں۔ اُن کا لب و لہجہ شستہ تھا۔ انسانی قابلیت قابلِ محذو ش تھی۔

پروفیسروں کی عادت ہے وہ ہر نئی کلاس میں اپنے منظور نظر چن لیا کرتے ہیں۔ ہماری کلاس میں سے اثر صاحب نے میرا انتخاب کیا اور نئی فلتھ ایئر کی کلاس میں انہیں شفقت ایسی نظر آئیں جو قابلِ توجہ تھیں۔

جب چھوٹی اڑانوں سے خاں صاحب کی سیر نہ ہوئی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لاہور سے کہیں اتنی دور نکل جائے جس تک اُن کے اندرونی تضاد کی رسائی نہ ہو۔ ان دنوں خاں صاحب روم جانے کے لیے پرتول رہے تھے۔ ایم اے

کالج میں ان دنوں سید عابد علی عابد پرنسپل تھے۔ جب روم یونیورسٹی سے ملحقہ ادارے (ISMEO) میں خاں صاحب کو پڑھانے کا جاب مل گیا تو وہ چھٹی کے سلسلے میں سید عابد علی عابد کے پاس پہنچے۔ ہتیر سائٹریالی کا

Appoint لیٹر ہاتھ میں لیا اور اسے سید صاحب کی میز پر رکھ کر بولے ”روم سے یہ خط ملا لیکن اب چھٹی کا مسئلہ۔“ ہمیشہ کی طرح وہ تضاد کا شکار تھے۔ روم میں نوکری بھی کرنا چاہتے تھے اور دیال سنگھ کالج کو چھوڑنا انہیں قابل

قبول نہ تھا۔

سید عابد علی عابد نے خط دیکھا۔

”بھائی یہ تو اطالوی میں ہے۔“

”اس کے معنی یہی ہیں کہ اگر میں بروقت پہنچ گیا تو نوکری مل جائے گی۔“

”سوچ لو یہ کوئی سرکاری خط معلوم نہیں ہوتا۔“

”بس آپ مہربانی فرمادیں، باقی اللہ پر چھوڑ دیں۔“

عابد صاحب نے اجازت مرحمت فرمائی اور خاں صاحب نے روم کا رحب سفر باندھ لیا لیکن 1956ء میں

اکیاون اُن کے لیے بڑے طوفانی سال تھے۔ اب اُن کی ڈائریاں اور نوٹس دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کس کس کے ساتھ رہے تھے۔ ذرا دیکھیے۔

اُس نے آگے بڑھ کر ہسپتال کے پتروں سے منڈھے دو روزے پر دستک دی۔

”کون ہے؟“

اور اندر سے آنے والی آواز اس کے سینے میں ٹھڈے کی طرح گئی۔ وہ چہوترے سے گلی میں کودا اور شمال کی

جانب بھاگ گیا۔ گلی کا ایک کتا عادتاً اس کے پیچھے بھاگا اور پھر کھبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چاند ایک کالی بدلی سے نکل

کر دوسری میں چھپ گیا۔ سرس کے چنوں سے بارش کی کچھ بوندیں جھنک کر اس کی مانگ میں ٹھنڈی سلائی کی طرح پھر گئیں۔

اس نے اپنی رفتار مدہم کر لی لیکن پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

کسی نے ضرور دروازہ کھول کر ایک بار پھر پوچھا تھا..... ”کون ہے؟“ اس کی چھاتی نے دھوں کر کے ٹھکے

کھانسی کی آواز نکالی اور وہ پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

ٹین کی چھت پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹپا ٹپ برس رہی تھیں اور پلیٹ فارم کی روشنی میں ریل کی سیاہ پٹری

دھل رہی تھی۔ لوہے کے نیچے پر سا گوان کا مونا تختہ لگا تھا اور نضا میں نمی کی وجہ سے اس پر جما ہوا میل سلسا ہو گیا تھا۔ نیا سال

طلوع ہونے میں پورے دو دن باقی تھے اور سا گوان کے تختے میں لگے ہوئے آہنی کا پلے بڑے ٹھنڈے تھے۔ اس نے

اپنے کوٹ کے کالر اٹھا کر دونوں کان ڈھانپ لیے۔ کالروں کے نیچے کپڑے کا اصل رنگ نکل آیا۔ ایک بارہ ماشیا ہتھوڑی

کے دستے میں ربڑ کی واشریں فٹ کرتا اندر آیا۔ اس نے کوٹ کا اصل رنگ دیکھے بغیر کہا۔ ”رات یہاں کاٹو گے؟“

”ہاں۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”لاہور۔“

”لیکن یہاں تو بہت سردی ہے۔ تمہارے پاس اوڑھنے کو کچھ نہیں؟“

”نہیں۔“

”اچھا“

پھر ”اچھا“ اس کے سر پر دست شفقت بن کر پھر گیا۔ بارہ ماشیا مسافر خانے سے باہر نکل گیا اور پلیٹ فارم کی روشنیوں کی چمکیں پھڑھلنے لگی۔

سورج کی پہلی روشنی میں پیتل کے پترے چمک رہے تھے۔ دروازہ کھلا تھا۔

اور چوکھٹ کے ایک طرف ”میلا رام داروغہ صفائی“ کا بورڈ لٹک رہا تھا۔

اب ڈی کوثر افضل کے دفتر میں موجود ہے اور اس سے قطعاً زمین کی تعریفوں کے پل باندھ رہا ہے۔ افضل کچھ کھڑکھڑاسا اس کی باتوں پر توجہ دے رہا ہے۔ اتنے میں پرویز دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی ایک نظر ڈی کوثر پر پڑتی ہے۔ وہ بھائی سے کہتا ہے کہ وہ میں سکوتر کی چابی تو نیچے ہی بھول آیا۔ وہ چابی لینے جاتا ہے اور افضل کوثر سے پھر معذرت مانگتا ہے۔ کوثر بادل نخواستہ اس کے دفتر سے نکلتا ہے۔ میزھیوں پر اس کی مٹھ بھینر پرویز سے ہوتی ہے جو چابی لے کر واپس آتا ہے۔ پرویز کوثر کو روک کر پوچھتا ہے ”آپ کا نام الہ داد تو نہیں؟“ کوثر کہتا ہے ”الہ داد۔“

پرویز کہتا ہے ”اوشاید۔“

الہ داد کہتا ہے ”لیکن اب میں اے ڈی کوثر کہلاتا ہوں۔“

پرویز کہتا ہے ”ہم آپ کو آٹھویں میں پڑھتے رہے ہیں۔“ مکار کوثر کہتا ہے۔ ”ادھ ٹھیک، خوب یاد آیا۔“  
پرویز زمین کی کہتا ہے وہ آسمان کی بتاتا ہے لیکن دونوں ایک دوسرے سے تفصیلی حال پوچھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ڈی کوثر پر اپنی ڈیلر ہے۔ پرویز اپنے بارے میں بھی بتاتا ہے اور کچھ کرنے اور تجارت میں بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے کا ذکر کرتا ہے۔

پرویز اسے اپنا پتہ دیتا ہے اور کوثر اس خوبی سے ملاتا ہے کہ مزاج کے ساتھ ساتھ پرویز کے دل پر یہ بات بھی رقم کی ہے کہ یہ اس کا پرانا کلاس فیلو ہے۔

پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چل دیتا ہے۔

Describe دے کر بتاتے ہیں کہ کوثر ایک کنڈی میں ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچ کر نجیا کو بتاتا ہے کہ وہ سے بھائی کو گیا تھا لیکن چھوٹا بھائی شیشے میں خود اترتا چلا آیا۔

تمناؤں کے تیز گام شہدیز کو دوڑاتے ہوئے میں ایک صحرا میں گر کر بے ہوش ہو گیا تو ایک ٹولے نے مجھے ہوش

”تو نے پیدل چلنے میں کیوں احتراز کیا؟“ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

”اب تجھ سے پیدل بھی نہ چلا جائے گا۔“

ایک مرتبہ میری محبوبہ جنہم میں مجھ سے ملنے آئی تو میں نے کہا۔ ”جانِ تننا! اس سیاہ خانے میں تم کیوں چلی



اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ ”مجھے کسی نے بتایا تھا کہ دوزخ کے شعلوں نے تمہاری بینائی چھین لی ہے۔ تمہاری بیمار پرسی کو آئی ہوں۔“

آنکھ پھولی کھیلتے ہوئے برآمدے کے بیچ میں نے اُسے بازوؤں میں لے لیا اور کہا ”اب تمہاری ہے“ لیکن غلام گردش ٹس سے مس نہ ہوا اور میری باری یونہی چلتی رہی۔

## راولپنڈی

(1951ء)

مہینے کا آخری دن ہے۔ ابھی ابھی راولپنڈی پہنچا ہوں اور اسی ہوٹل میں قیام کر رہا ہوں جہاں دو مہینے گزر چکے تھے۔ جہاں رات رات جاگ کر سکر پٹ لکھے تھے۔ اخباریں نشان کی تحصیل اور دفتر کی فائلوں میں سرکاری قسم کے کام کیے تھے۔ شہر وہی ہے، بازار وہی ہے، عمارت وہی لیکن کمرہ اور موسم بدل گیا ہے۔ پنڈی مجھے کبھی بھی اجنبی نہیں لگتی تھی۔ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں اس شہر میں پیدا ہوا۔ اسی شہر کے کسی سکول میں پڑھتا رہا۔ یہیں سے بی۔ اے اور پھر چند سال سی۔ ایم۔ اے میں ملازمت کرنے کے بعد فوت ہو گیا۔ اسی شہر کے راستوں پر تھوڑی دیر کو میرا جنازہ اور پھر مجھے بڑے قبرستان کے ایک گوشے میں دفن کر دیا گیا۔ مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے سارے ایام میں وہیں میں گزارے اور اسی شہر میں بسر کیے۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ میں اپنے ہوٹل سے ریڈیو سٹیشن کو جانے والی سڑک کے علاوہ اور کسی راستے واقف نہیں ہوں۔ میرا سارا سامان یہیں تھا۔ پنجاب کے سیلاب کی وجہ سے میں اپنا سب کچھ اٹھا کر لاہور نہ لے جا سکا۔ ٹرنک اور بستر مفتی کے پاس چھوڑ کر ایک اچھی کیس لے کر لاہور چلا گیا۔ آج مفتی نے میرا ٹرنک لا کر دیا۔ میں نے کچھ مجھے ایسے لگا جیسے یہ میرا ٹرنک نہیں۔ اس میں کچھ کپڑے تھے، استعمال شدہ اور میلے۔ ایک کسرہ تھا۔ کافی کا ایک سا لٹرا تھا۔ دو پنسلیں۔ نشر شدہ ”ڈھول کے پول“ کی چند کاپیاں اور کچھ خطوط۔ میں دیر تک ان خطوں کو پڑھتا رہا اور ابھی نے خطوط خوانی ختم کر کے قلم اٹھایا ہے۔“

(چند خطوط خاں صاحب کے نام)

(سب سے بڑے آفتاب بھائی خاں صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں جو انہوں نے تراڑ کھیل سے لکھا۔)

عزیزم اشفاق سلما!

آپ کا پہلا خط بنام اماں جان اور دوسرا میرے نام تشریف لایا۔ دلی مسرت ہوئی۔ حیرت ہے کہ جو خط نے آتے ہی آپ کو پشاور روڈ کے پتے پر لکھا تھا، آپ کو کیوں نہیں ملا! اگر یہ آپ تک پہنچتا تو آپ اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔

مہم بفضلِ تعالیٰ سیلاب کی زد میں نہیں آئے۔ کرشن نگر اور راجگڑھ روڈ وغیرہ میں پانی اب تک ہے لیکن اُسے  
 نہ پینا چاہیے۔ خطرناک نقصان ان دیہات کو پہنچا جو تحصیل شاہدہ میں دریا کے کنارے آباد تھے۔ افتخار میاں اور  
 میرے بچے نہیں آئے۔ مری میں آپ کے ساتھ جو راحت میں نے کنگز ہوٹل میں پائی، وہ آپ کے موجودہ ہوٹل میں  
 ہے۔ جنت کا جھونپڑا جہنم کے محل سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ یہ آپ کو گمان محض ہے کہ مری میں مجھے تکلیف ہوئی۔  
 مجھے آرام نہ ملتا تو میں اتنا تو مند کیونکر ہو جاتا۔ میں تو ہمیشہ یہی کہوں گا کہ مری کی پُر بہار سیر صرف آپ کی  
 ساتھی۔

(ایک خط جو انہیں بابا محمد خاں نے مری لکھا)

عزیز محترم سلامت رہو! السلام علیکم، مزاج شریف۔

آپ کا خط آیا، حالات سے آگاہی ہوئی۔ یاد آوری کا شکریہ۔ تاحال مشینری کے متعلق کوئی انفرمیشن نہیں  
 ہے۔ پیر محمد خاں صاحب نے جب اُن کو سعید احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کا منشا مشینری لگانے کا ہے تو چچا صاحب  
 نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سعید احمد خاں کو لنڈسٹورٹ لگا رہے ہیں۔ اُن کو کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ کیا آپ ہم کو کچھ  
 پیسے بھجوا دے سکیں گے۔ یہ بات انہوں نے بطور پیش بندی کے کی تھی۔ مہا د محمد خاں اُن سے کچھ روپیہ مانگ لے۔  
 فیسرین سنوا اور کریم کے لیے شیشی کی ضرورت ہے۔ سینٹ کی ضرورت ہے۔

اشتیاق میاں بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ افتخار بھائی مع بال بچوں کے لاہور آنے والے ہیں۔ آپ نے  
 گھر سے گرمی کی بابت دریافت فرمایا ہے۔ جو اب عرض ہے کہ ہم کہاں سوختے ہیں ہمیں سردی گرمی سے کیا کام؟

نقطہ محمد خاں

(کاکی کا خط)

محترم اشفاق صاحب، السلام علیکم!

آج عید ہے۔ روایتی نہیں بلکہ اصلی۔ میرے ہاتھوں میں آج سی۔ ایم۔ جی (سول اینڈ ملٹری گزٹ) ہے اور  
 آج کے غور سے اردو ایم۔ اے کا رزلٹ پڑھ رہی ہوں۔ کاش آپ کی طرح مجھے بھی Subtle Thanks ادا کرنے  
 سے جنگ آتے تو میں بھی کوئی دس پندرہ برس پرانا واقعہ یاد کر کے اس کی روشنی میں آپ کو مبارک باد دیتی لیکن بہت  
 سچے کے باوجود بھی نہایت معمولی واقعات یاد آ رہے ہیں اس لیے معذور ہوں۔

مجھے یہ بتائیے کہ آپ نے شکریہ ادا کرنے کے ڈھنگ کس سے سیکھے؟

شیخ سعدی سے؟

یہ آپ کی محنتوں کا ثمر ہے کہ کسی کی دعاؤں کا اعجاز؟ یا پھر کہیں در پردہ آپ نے بھی تو اپنی نئی سائیکل سے امداد  
 سیر کیف نتیجہ واقعی قابل رشک ہے۔ ولی مبارک باد قبول کیجیے۔

من و سلوی کھلانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا ہے کہ پھر..... چلیے صاحب! میں تو اس کا تقاضا کرنے کی نہیں۔  
 یہ تمام جماعتوں سے آپ خود نپٹ لیجیے۔ میں تو تھوڑی سی مٹھائی پراکتفا کر لوں گی۔ وہ بھی اگر آپ کھلانا چاہیں تو۔

ماچھا، امی، پرویز اور معظم کی طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔

(عمر کا خط)

اشفاق جی!

مہاجرین پروگرام میں گروپیش (آج کل) لکھنے کے لیے آپ نے دو دن کا وعدہ کیا تھا لیکن مری آپ کو نیت خراب ہو گئی ہے اور میں ایک دن اور یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری خاطر اسے ایک دن یعنی 4 تاریخ (وار) اور سکرپٹ لکھ دیں گے۔ بے حد مشکور ہوں گا۔ باقی مری آ کر محسوس ہو رہا ہے کہ پھر سے زندہ ہو گیا ہوں۔

(پاس ہونے پر شفقت کا خط مری پہنچا)

شفقتی بھیانکستے! خوشیوں اور سرتوں میں ڈوبی ہوئی، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اور شکستگی اور اطمینان سے ہوئی ننھی سی مبارک کیا قبول ہو۔

گو میں اس قابل تو نہیں کہ آپ کو یہ چند حروف لکھ سکوں کیونکہ میں بھی اسی لاہور کی باسی ہوں جس سے یہ شدید نفرت ہے اور یوں بھی یہ مبارک باسی ہو چکی ہے۔ لیکن بقول غالب کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ قبول نہیں ہوتی اور سب خیریت ہے۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں اور خوش!

اس خط کے نیچے باجی کے انگریزی میں دستخط ہیں "S.Ara"

(منشی نعمت اللہ خاں کا خط)

گر انقدر۔ عالی مرتبہ اشفاق احمد خاں صاحب۔ ہمیشہ ہمیشہ سلامت باشد!

السلام علیکم با مصافحہ کے بعد واضح رائے عالی ہو کہ اس جگہ خیریت ہے اور آپ کی خیریت مدام نیک نظر ہے۔ آپ نے راولپنڈی آ کر اپنی خیریت سے آگاہ نہیں فرمایا۔ اس لیے مقام شکوہ ہے۔ امید ہے آپ اللہ کریم کے سے خوب ہشاش بشاش ہوں گے۔ آپ جس محبت اور خلوص سے خادم کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں، بندہ اس کا احسن پستوں تک نہ بھلا سکے گا۔ عرض یہ ہے کہ میرا لڑکا عرصہ پانچ سال سے گھر میں بے کار بیٹھا ہے۔ Type کا کام جانتا ہے۔ اگر آپ کے خیال شریف میں اس کے واسطے کوئی آدمی دکھائی دیوے تو تحریر فرمائیں۔ اس کی بے کاری نہایت ہی بڑی ہے۔ قبیل داری میں تو ایک دن بھی بغیر آمدن کے گزارنا مشکل ہے۔ خیر آپ کے خیال مبارک میں کوئی تجویز ہو تو فرمائیں۔ خداوند کریم آپ کو خوش و خرم سلامت رکھے۔ آمین ثم آمین۔

باقی مجھے اپنی صحت کے بارے میں ضرور اطلاع دیں کہ اب کیا حال ہے۔ خدا آپ جیسے لائق فرزند گھر گھر فرمائے۔ خدا کرے آپ دن دو گنی اور رات چو گنی ترقی کریں۔ خوب عیش و عشرت وافر و جلال باقبال زندگی بسر ہو۔ آمین۔

فقط والسلام

تابعدار منشی نعمت اللہ خاں

(اس خط میں خلوص کا لفظ قابل غور ہے)

ایک خط انصار کا ہے۔ اس کے آخر میں لکھا ہے۔

شکو بھیا! یہ خط کسی کو دکھائیے نہیں۔

ایک کو نے میں لکھا ہے۔

شکو بھیا! جواب میں ذرا ان باتوں کا ذکر نہ ہو کہیں۔

افتخار بھائی کے خط کے چند جملے (اپنے بیٹے رو میو کا ذکر)

شکو میاں سلامت رہو! عزیز بیٹی تمہاری بظاہر بہت شہزادی ہو گئی ہے۔ ان دنوں رضیہ کے سکھلانے پر مجھے

کہتا ہے۔ بالکل اپنے چچا ابا یعنی تمہاری تصویر ہے۔ ضد کا یہ عالم ہے کہ مجھے اس کی بات پر تم یاد آ جاتے ہو۔

مرح زین پر لیٹ کر اور منی میں لوٹ کر اپنی ہر بات منواتا ہے لیکن پھر بھی جب میں اُسے غور سے دیکھتا ہوں تو

حس ہوتا ہے کہ ابھی تمہارے جیسی ضد کا بچہ ہمارے خاندان میں پیدا نہیں ہوا۔

اس کی اور تمہاری ضد میں یہی فرض ہے کہ یہ رنگ برنگے غبار سے لے کر مان جاتا ہے اور تم دونوں جہان کی

لے کر بھی نہ مانا کرتے تھے۔ اب تو لاہور آ جائے گا۔ تمہیں بھی آنا چاہیے کیونکہ جو جو ظلم بچپن میں تمہارے جیسے

ذہن پر ہوتے رہے ہیں کہیں اس پر بھی نہ ہوں۔

منیر معذرت کرتی ہے کہ بچوں کی عادت کی وجہ سے تمہارے خطوں کا جواب نہ دے سکی۔ شکو میاں! اب چھوڑو

تو کمری۔ ریڈیو کی نوکری مری کی وجہ سے تھی نہ کہ نوکری کے سبب سے۔ عزیز بی خدا مالک ہے فکر نہ کیا کرو۔ پتہ نہیں

تھکر کرنے کی طبیعت کب صحت یاب ہوگی۔

اثر کا خط (روسی سگریٹ۔ ریڈیو لیبیل کی چائے کا تحفہ ملنے پر)

عزیز من اشفاق!

کل شب کو تمہارا گراں بہا تحفہ ملا۔

اور آج طوفان اور آندھیوں میں لکھی ہوئی چھٹی۔ پرسوں زوہبی نے کہیں سے ہاتھ مارا تھا اور حسب دستور

تینڈ کے مع بچوں کا نذرانہ عقیدت نکالا تھا۔ سٹوڈیو سے جھوٹے جھامتے گھر پہنچے تو جاوید نے پارسل دیا۔ اول شب

تہمت ریڈیو لیبیل کا منہ میں تازہ تازہ لطیف ذائقہ اور انتہائے افلاس کے عالم میں روسی سگریٹ کا ڈبہ۔ ماشاء اللہ، خدا

کے جیوسی کے نہیں اس کی عظمت کے بھی قائل ہو گئے اور اللہ جانے تمہیں کیسی کیسی دعاہائے دارین دیں۔ تمہاری خوش

حقیقی سے عقیدہ تھی اب جزو ایمان بن گئی ہے۔

آج تمہارا خط ملا۔ برق و باراں میں لکھا ہوا لیکن میری جان تمہیں یہ کیوں مشتبه لگتا ہے کہ وہ مجھے ملے گا نہیں۔

ایک جہت کو تھامنے کے لیے دو دیواریں بہت ہوتی ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ زندگیاں اس سے بھی مہین سہارے پر مدتوں

تھکتی رہتی ہیں۔ چھت تو پھر بھی چھت ہوئی اور بالخصوص جب اس کے نیچے ایک ندی دہکی ہوئی ہو۔ موت کو زندگی سے کوئی

پتھر۔ زندگی موت کی مجبوبہ ہے۔ جس سے موت اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ موت زندگی کی گھات میں نہیں رہتی، زندگی موت

تھکر کرنے کے لیے دام بچھاتی ہے اور اپنی رنگینیاں دکھا دکھا کر اسے پھانستی ہے۔ پھر بھلا تمہاری چٹھی نہ ملتی تو کیونکر۔

کا کی کو حسب ہدایت تمہارا سلام پہنچا دیا۔ وہ تم سے سخت ناراض ہے۔ کہہ رہی تھی کہ تم بڑے ناخلف بیٹے ہوئے اور یہ کہ اب وہ تمہاری مٹی نہیں رہی۔  
آختم آکب رہے ہو؟

تمہارا  
اثر

اور میں نے ان سارے خطوں کو جمع کر کے اور ان پر ایک آخری نظر ڈال کر Cent Brand Safety Matches کی ایک تیلی سے جلا دیا۔

نہ جانے مجھے کیوں ہمیشہ کولمبس کی طرح اُن دیکھے براعظموں کی طرف سفر کرنے کا شوق ہے۔ جوانی میں بڑی آرزو تھی کہ میں ماسکو سے ولاڈی واسٹنگ تک پورا ایک ہفتہ ٹرین میں گزاروں۔ اُس کے کھیت، شہر، قصبہ، نہریں، سینما سکرین کی طرح کھڑکی سے گزر جائیں اور مجھے بغیر کسی واقعے سے دوچار ہوئے ان کا منظر نامہ مضمناً مفت آجائے۔

میرا یہ خواب تو پورا نہ ہو سکا لیکن 1975ء میں جب چند ایسوں کو روس مدعو کیا گیا تو اس گروپ میں میرا شہر تھا۔ میرے علاوہ شیخ ایاز صاحب سندھ سے، خاطر غزنوی پشاور سے تھے۔ اس سفر میں مجھے ماسکو سے لینن گراڈ جانے کا اتفاق ہوا اور ہولی ریشیا کی یہ زیارت کسی عجوبہ سے کم نہ تھی۔

ایم اے اردو کے تجربے سے میں نے جو کچھ مال غنیمت اور بوٹی جمع کی اُس کا زیادہ تر تعلق اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حالات کو سمجھنے کا تھا۔ اب میرے پاس کچھ ایسی یادیں ہیں جن کا تعلق موسموں، ذومعنی باتوں، ابہام بھرے مسائل سے زیادہ نہیں۔ یہ ساری جھوٹی بچی ادھوری باتیں اس لیے بامعنی سمجھتی ہوں کہ شاید اشفاق صاحب کو سمجھنے میں کچھ مدد مل سکے۔

گو کسی شخص کو سمجھنے کے لیے تمام تر تجربے، مشاہدے، تخیل، احساس کے ہمراہ بھی قریب قریب ناممکن ہے۔ ان کے سارے وجود پر اگر سرچ لائٹ بھی پڑتی ہو تو ایسے اندھیرے کو نئے کھد رے میں ضرور رہ جاتے ہیں جن میں اس شخص کی کئی خوبیاں، خرابیاں دہکی رہتی ہیں۔

انسان کا پتھر ودھات کے زمانے سے اب تک یوں ارتقائی سفر میں چلتے چلتے آنا غالباً اسی گپت چھپے ہوئے رازوں کی بدولت ہے۔ انسان کا علم اسی لیے ہر مقام پر قلیل رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے تمام اعمال کو جانچنے کے لیے نیت بڑا کوئی Catalyst نہیں۔ کبھی کبھی نیکی بھی بد نیتی پر محمول ہوتی ہے اور بار بار رابن ہڈ (Robin Hood) جیسے ڈاکو جہاں کے سر پر کا میابی کا سہرا لگا دیتے ہیں۔

میں نے ایک لمبا وقفہ خاں صاحب کے ساتھ گزارا۔ اُن کو قریب سے دیکھا۔ فاصلے سے مشاہدہ کیا۔ پتھر یوں بھی ہوا کہ مجھے ان کے رویئے، عمل اور سوچ سے اتفاق رائے نہ تھا لیکن ایک بات گورنمنٹ کالج کے اولین دنوں میں

جو کچھ بھی تھی۔ شتو جی جو کچھ کرتے اُن کے نتائج جو کچھ نکلتے، اُن کی نیت صاف آسینے کی طرح آبدار رہتی۔ اسی نیت سے وہ کسی شخص سے تادیر ناراض رہنے والے شخص نہ تھے۔

رشتے ٹوٹ جانے پر، حیثیتیں بدل جانے پر اپنا اپنا راستہ اور اپنا اپنا منہ لے کر رخصت ہو جانے پر بھی اُن کی عین قبول نہ ہوتی۔ اسی لیے اُن سے منافقت کبھی سرزد نہ ہوئی۔ غلطی سرزد ہو جاتی تو بڑی شرمساری سے اعتراف کر لیتے۔ چھائی کر بیٹھے تو سر جھکا کر بھینی سی مسکراہٹ کے ساتھ خوش ہو جاتے۔ اسی لیے اُن کی تحریروں میں مبالغہ آمیزی محسوس نہیں کی۔ کبھی انہوں نے زندگی آراستہ نہ کی۔

نیت کی صفائی کے باوجود جس تضاد کا وہ شکار تھے وہ بدستور قائم تھا۔ چھوٹے چھوٹے سفر، نوکریاں جب تشریف لے جاتے تو انہوں نے روم جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے غالباً سکھ کا سانس لیا لیکن آزادی کی قیمت ادا کر کے ملتی ہے۔ کوئی قوم یا کوئی فرد کبھی بھی یہ قیمت ادا کیے بغیر آزاد نہیں ہو سکا۔

انہیں غالباً اس سفر میں مجھے خط نہیں لکھنا چاہیے تھے لیکن روم سے ان کے خط آتے رہے اور پاکستان میں جو Defense mechanism ہمیشہ کی طرح ساتھ تھا۔ وہ بیماری اور بے پرواہی کا بارڈر کر کرتے۔ مجھے علم تھا کہ وہ دلا زاری کو گناہ سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا مسلک غالباً محبت تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خدا سے بڑا روپ ہے۔

اشفاق صاحب نے جب اردو بورڈ میں سرزس کی تو یہاں کئی ماتحتوں کو ڈانٹا، برا بھلا کہا، لیکن یقین چاہیے یہ نیت کے تحت اپنی روزی حلال کرنے کے تحت کیا ہوگا۔ انہوں نے کبھی کسی کی اسی آرزو نہ کی۔ ان کے جانے کے بعد بورڈ کے کچھ کارندوں کی وہ باقاعدگی سے مالی مدد بھی کرتے تھے لیکن اس کا ذکر کبھی کبھی انہوں نے نہیں کیا۔

گھر پر ان کا رویہ ملازموں کے ساتھ ایسا تھا کہ جو ایک بار آ گیا وہ پھر ان کی زندگی میں انہیں چھوڑ کر نہیں گیا۔ لیکن سوال جواب کی نوبت کبھی نہ آتی۔ حجام، قصائی، دودھ والا، ہنری فروش ابھی تک چلے آتے ہیں اور جیسے ان کا کوئی اپنا انہیں چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

ان کے برعکس مجھے دوسروں کی دنیا سدھارنے کا اتنا شوق ہے۔ دوسروں کو ٹھیک کرنے کا ایسا چکا ہے کہ اپنے لیے کبھی بے پروا نہیں ہوں۔ میری نیت ہوتی ہے کہ لوگ مجھے سراہیں، میری تعریف کریں اور میری دانش کے قائل ہوں۔ مجھے خاں صاحب سے ایک گلہ ہے جو وقت کے ساتھ اب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انہوں نے پڑھنے لکھنے میں میری مدد کی۔ میری تربیت میں اتنی تنگ دودھ کی وہاں مجھ سے ایک راز چھپا گئے کہ ہر شخص میں نیت کے قطب نما کو کیسے سیدھا رکھا جاتا ہے۔

سچی بات مجھ پر عیاں ہو گئی ہے کہ نیت کی صفائی سے ہی ان میں محبت کا چشمہ اندر ہی اندر بننے لگا تھا۔ وہ اس نیت سے ناس کا پرچار ہی کرتے۔ ان کا رابطہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بڑی خاموشی سے پروان چڑھتا ہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا کہ ان کے قارئین، ناظرین، مداحین کی چاہت بھی کسی طور ان

سے وقت کے ساتھ کم نہیں ہوئی۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی برائی، کمی بیشی، اونچ نیچ محبت کے سامنے یہ بیکار باتیں ہیں۔ محبت کرنے والا محبوب کی خوبیاں خرابیاں دیکھ نہیں پاتا بلکہ محبوب کی خرابیوں کو اپنی کج ادائیگیوں کی طرف سے کر لیتا ہے۔ ڈیروں پر اسی محبت کا مظہر نظر آتا ہے اور غالباً اسی محبت کی تلاش خلق کو بابوں کے قریب لے جاتی رہی۔

مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت کے اہل نہیں ہوتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر اس قدر مان ہوتا ہے کہ وہ دوسروں میں کیڑے نکال کر، کسی اور کا قد چھوٹا کر کے، کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی عظمت کی کلا جگاتے ہیں۔ ان میں یہ نہیں کہہ رہی کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ ان میں انسان ہونے کے ناطے خوبی اور خرابی کے دریا ساتھ ساتھ بہتے رہے۔ ان میں بھی حسب و جاہ کی طلب ہوگی لیکن ان کے چاہنے والوں کی توجہ کبھی ادھر نہیں گئی۔ وہ کبھی ان کی بشریت دھیان نہ دے پائے اور انہیں ایک بہت بڑا آدمی، برگزیدہ صوفی اور اصول ادیب سمجھتے رہے۔

لیکن سوسائٹی میں کچھ نکتہ چینی قسم کے لوگ رہتے ہیں جو عجمی طریقہ نہیں اپنا سکتے اور پکڑ پکڑ کر، سینت سینت خاں صاحب کی غلطیاں نکالنے کے درپے رہتے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگوں میں صرف رویے کا فرق ہے۔ مہربان لوگوں کا رویہ ماں کی طرح ستر پوشی کا ہے اور عیب ڈھونڈنے والے اپنے سچ پر اپنی ذہانت پر اعتماد کرتے ہیں لیکن یہ بہت بھاری باتیں ہیں۔ 24۔ ایس کیٹال پارک میں نہ مجھ میں یہ جاننے کی صلاحیت تھی۔ نہ اشفاق صاحب کسی ایسے مقام پر پہنچے کہ ان کے متعلق اندازے لگائیں۔ ابھی زندگی کو سمجھنے کے لیے نہ فلسفے کی ضرورت تھی نہ روحانیت کی، سب کچھ دن کے چکر میں محبوس چل رہا تھا۔

اتنی بات ضرور تھی کہ خاں صاحب جس فرار کی راہ پر جاتے جس شہر میں پناہ لیتے وہاں سے خطوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ افسوس جو خط میں نے انہیں تحریر کیے، وہ اس لیے میں نے نذر آتش کیے کہ میں خوف کا پرندہ ہوں۔ مجھے تالی ہو جاسکتا ہے۔



## 14- ایس کینال پارک

اولاد اپنے ماں باپ کی محبت پر اس درجہ تکیہ کرتی ہے کہ اسے کبھی علم نہیں ہو سکتا کہ وہ ماں باپ کی آزادی میں کسی قدر خستہ اور اُن کے لیے کیسی سرد روی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ پرویز بھائی اور میرا بھی یہی حال تھا۔ ہم کینال پارک میں ہی آنند کی کمفر ٹیبل زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہمارے پاس زینب جیسی جاٹا اور لاالو جیسا سعادت مند ملازم تھا لیکن جو شہ والدہ اندر ہی اندر ہمارے لیے پریشان رہا کرتی تھیں۔ میری شادی نہ ہو چکی تھی۔ ریزی بھائی کا روزگار ڈھب کا نہ تھا۔ مجھے ساتھ ملتان لے جاتیں تو وہاں اور مشکل پیش آتی۔ اُن دنوں افسران بالا ابھی فرعون صفت نہ ہوئے تھے۔ امی

بھائی کی سرکاری میٹنگوں میں ہائی اتھارٹی افسران سے رہتا۔ وہ بھی امی سے بطریق احسن مہربانی سے پیش آتے۔ ڈاکٹر احمد خاں جو ملتان کی سرکاری زمینوں کے کرتا دھرتا تھے اور ڈاکٹر طوسی جو سرکاری ہسپتال کے انچارج تھے، ان کی بیوی بھئی بہن ممتاز طوسی میری والدہ کی ماتحت تھیں۔ جب کبھی میں ملتان جاتی ان دنوں ڈاکٹر صاحبان سے ملاقات ہو جاتی لیکن مشکل یہ تھی کہ امی کو سکولوں کے معائنے کے لیے سارے ضلع میں دورے کرنے پڑتے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہی ادارے اپنے طور پر سنبھلے نہ تھے۔ مجھے وہ ساتھ لے کر ریٹ ہاؤس میں جانا نہ چاہتی تھیں۔ اس لیے ملتان سے مجھے بلا ہو لو نا دیا جاتا جہاں کم از کم میرا بھائی تو ہمہ وقت میرے پاس رہتا تھا۔

لیکن پھر نہ جانے کیوں ہمیں 24- ایس کینال پارک بھی چھوڑنا پڑا۔ یہ نہیں کراے کا مسئلہ تھا یا اس کوٹھی کے رنگ و خوش اس رہائش گاہ کی ضرورت تھی۔ بہر کیف ہم نے بوریا بستر باندھا اور اس گھر کو خیر باد کہہ کر 14- ایس کینال پارک سے بے کراہہ فرام کیا۔

یہ نسبتاً نئی کوٹھی تھی۔ اگر ٹیل سے اتر کر سیدھے نہر کنارے چلتے جائیں تو پہلے موڑ پر بائیں جانب ایک چکی سڑک کی طرف پارک کی طرف مڑتی ہے۔ یہ گھومتی ہوئی سڑک اندر کی طرف چلی جاتی ہے۔ یہیں 14 ایس واقع تھی۔ کوٹھی کا بایاں حصہ رتی تھویل میں دے دیا گیا۔ یہ نہیں مالک مکان اوپر کی منزل پر رہتے تھے یا دائیں حصے میں۔ ان سے میل ملاقات نہ ہو۔ ریزی کرایہ ادا کر دیتا، وہ لے لیتے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ریزی ان دنوں بیکار تھا۔ کراے کا بوجھ بھی امی کو برداشت



کرنا پڑتا۔ 14- ایس کینال پارک میں ایک ہمارا گھر، ایک ملتان میں اُن کی دفتر سے پیچھے رہائش گاہ۔ تیسرا ماہر باؤسوں میں بخشیش کا سلسلہ۔ امی نہ جانے کس طرح گزارہ چلا رہی تھیں۔

ڈاکٹر محمد خاں کی مہربانی تھی۔ کچھ امی کے اندر ان کا آبائی خون جوش مارتا ہوگا۔ انہیں زمینوں کا خیال ہو گیا۔ اب وہ اس بات کے درپے تھیں کہ ایسی چودھرائی بن جائیں جس کو پچھری میں گرسی ملا کرتی ہے۔ اسی الاٹمنٹ کے پیمانے میں وہ دن رات مگن رہتیں۔ بالآخر انہوں نے 23 مربع الاٹ کروالیے جن میں سے چھ مربع تو اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ یہ اُن کی زندگی میں اُن کے نام نہ ہو سکے اور انہیں بار بار لانا ہور میں بورڈ آف ریونیو کے دفتر جانا پڑتا۔ نوکری بھی چھوڑ دیتیں اگر مس اقبال ملک ان کو سختی سے منع نہ کرتیں اور ان کا استعفیٰ اپنے ہاتھوں نہ پھاڑ دیتیں۔ امی لیزی میٹیکلین سے میری والدہ کے ساتھ رہی تھیں۔ ان دنوں وہ ملتان کے ڈگری کالج کی پرنسپل تھیں اور امی ان ہی پاس ٹھہرا کرتی تھیں۔

امی کے جو حالات ملتان میں تھے، ہم ان میں کم ہی دلچسپی لیتے تھے۔ کینال پارک کی کوچھی ہم دونوں کے کافی تھی لیکن 24- ایس کینال پارک کی طرح کشادہ نہ تھی۔ نان میں سے گزر کر برآمدہ آتا پھر ایک بڑا کمرہ تھا جسے دونوں نے بیڈروم، یونگ روم بلکہ سب کچھ بنا رکھا تھا۔ باقی دو کمرے استعمال میں نہ تھے۔ ہماری خالہ فیروزہ جو کچھ توڑ پھوس میں ہیڈ مسٹریس تھیں، چھٹیوں میں اور ویسے بھی وقتاً فوقتاً ہمارے پاس آ جاتی تھیں۔ اسی طرح میری سہیلی محمودہ منظور کی کھارا آ جاتی۔

اس گھر سے وابستہ دو واقعے مجھے ابھی تک اچھنبے میں ڈال دیتے تھے۔ مزنگ روڈ والوں میں پینہ نہیں کیسی کھلی مچی ہوئی تھی۔ جب سے تقو اور نیلو ہمارے گھر آنے جانے لگے تھے، کچھ دو مین شایدا اس شادی کے حق میں ہو گئی ہوں بہر کیف وہاں کیا ہوتا تھا اور کیونکر ہوتا تھا اس کی مجھے واضح اطلاع نہ تھی۔

گرمی کے دن تھے۔ ہماری چار پائیاں باہر سڑک پر پھینچی تھیں۔ کچھ دیر پہلے سب اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ چار پائیاں اٹھا کر بائیں ہاتھ کی گلی میں رکھ رہی تھی کہ باباجی محمد خاں آ گئے۔ میں حیران رہ گئی۔ چار پائی ہاتھ سے رکھ کر اُن سواگت کیا۔ اچھوت کنیا کو آکنٹے بھانپنے تولی سٹکڑی پر پورا تولنے کے لیے باباجی نے کل دس منٹ کا قیام کیا اور چلتے بنے۔ بہت بعد میں جب میری شادی ہو گئی اور مزنگ روڈ آنا جانا کھل گیا تو باباجی نے مجھے ایک دن بتایا کہ انہوں نے اسی روز فیصلہ کر لیا تھا جب مجھے چار پائیاں اٹھاتی دیکھا تھا کیونکہ انہیں دنیا میں سب سے زیادہ محنت عزیز تھی۔ دو محنت کے آگے نہ تقدیر کو کچھ سمجھتے تھے نہ توفیق الہی کو۔ اس اکلوتے واقعے نے غالباً اُن پر یہ ثابت کیا کہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے دماغ میں کچھ ایسا خناس بھرا ہوا نہیں ہوتا اور شاید گھریلو کام کاج اور روٹین اپناتے ہوئے انہیں شرم نہیں آتی۔ وہ بھی عام گھریلو زندگی گزار سکتی ہیں۔

ان دنوں میری والدہ جب وہ ایک مرتبہ ملتان سے آئیں تو انہوں نے ایک فکر کا اظہار مجھ سے کیا..... ”کامی میں تو ملتان میں رہتی ہوں۔ تم ہی ریزی کے لیے کوئی رشتہ تلاش کرو۔“

”رشتہ، امی پہلے یہ پڑھائی تو مکمل کر لے۔ کسی ڈھب کی نوکری پر تو لگ جائے۔“

”کری اس نے جس قدر پڑھائی کرنی تھی۔ اب اس کی شادی ہونی چاہیے ورنہ ایک اور بکھیرا پڑ جائے گا۔ کسی

”کیسا بکھیرا؟“

”ویلا آدمی ہے، کچھ نہ کچھ گل تو کھلائے گا۔ بس تم کسی نائن سے مل کر یا پھر محمودہ منظور سے کہہ کر کوئی رشتہ تلاش

ریزی ان دنوں شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھیں لیکن حکم عدولی بھی اس کی طبیعت میں نہ تھی۔ ایک رشتہ  
کریا گیا۔ لڑکی کا بھائی انارکلی بازار میں سونے کے زیورات بیچتا تھا۔ اس کی دکان پر ہر قسم کے قیمتی پتھر، کنگن،  
ہارے، کانوں کے بندے مگر بنائے جانے کیا کیا بھرا پڑا تھا۔ میں نے ریزی کو حکم دیا کہ وہ گیارہ بجے کے قریب اس  
پر جا کر لڑکی کے بھائی سے ملاقات کر لے۔ ریزی نے ایڈریس سنبھال لیا اور چپ چاپ چلا گیا۔

شام کو جب ریزی واپس آیا تو اس نے پورے سر کی حجامت کروا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر جو روپ سروپ  
کے نیم گھنگھر یا لے بالوں کی وجہ سے ہی تھا۔ ان دنوں چوڑے سینے کا فیشن نہ تھا۔ جب سے Yul  
ایکسٹرنل بن کر آئی ہے، اس کی دیکھا دیکھی یہ سینڈ مردانہ وجاہت کا ایک فیشن بن گیا ہے لیکن ابھی سینے پن کو کسی  
مطلوب کرنا سوسائٹی کے لیے ممکن نہ تھا۔ سنا صاحب ریزی بھائی سے ملے۔ بوتل پلائی، کچھ زیورات بھی دکھائے اور  
تعمیر سے گاہک کی طرح رخصت کر دیا۔ سنا صاحب کی دکان کے اوپر رہائش گاہ تھی اور شاید کسی طور عورتوں نے بھی  
دیکھا دیکھا لیا ہو۔ لڑکی نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور انکار کر دیا۔

”یہ آپ اس طرح گئے تھے؟“

”ہاں تو اور کس طرح؟“

”یوں سر پر استرا پھرا کر؟“

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں بھی ان کا عندیہ سمجھ گئی کہ وہ شادی پر رضامند نہیں ہیں۔ امی کو خط میں رپورٹ بھیجی تو وہ کچھ دنوں بعد  
میں۔ امی نے ہمارے ساتھ کبھی دل کی بات نہیں کی تھی۔ غالباً وہ اپنی اولاد سے مایوس تھیں۔ میں ایم اے کرنے کے  
بعد امرتسر چلی تھی۔ ریزی تھن ہو کر لاہور کی سرڈکیں ناپتا، سرورق مل جاتا تو بنا لیتا لیکن اس کا مستقبل بھی مندوش تھا۔ غالباً اولاد  
نہ صرف سے مایوس ہو کر انہیں زمینوں کا خیال آیا۔ بہادر عورت کی زندگی کا یہ دوہرا عذاب تھا۔ مانتا کو چھپا کر باپ کی پتا  
پے اوپر اوڑھے وہ دانت بھیج کر اندر تجویزیں اور فیصلے کرتیں اور پھر اکیلی ہی ان کو پورا کرنے کے لیے کمر بستہ  
ہوتی تھیں۔

ان کے لیے اب دو گھروں کا خرچ اٹھانا بھی آسان نہ تھا۔ پھر اللہ ہی نے ان کی مدد کی۔ میری خالہ جو شیخوپورہ  
میں گورنمنٹ ہائی سکول کی ہیڈ ماسٹر تھیں، تبدیل ہو کر 60- فیروز پور روڈ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھیں تعینات  
ہوئیں۔ جو نبی ماچھاجی لاہور میں سیٹل ہو گئیں تو امی نے ان سے استدعا کی کہ وہ ہم دونوں کو اپنے پاس رکھ لیں۔

سامان پہلے ہی 24- ایس کینال پارک سے رخصت ہوتے ہوئے گوجرانوالہ میری کزن طلعت (کنو) کے گھر تھی، اب تھوڑا سا سامان لے کر ہم دونوں خالہ کے سکول پہنچے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے نہ سوچا کہ مجھے اتنی تعلیم کے ساتھ کچھ ملازمت تلاش کرنی چاہیے۔ ریزی نے کسی مستقل نوکری کے متعلق لمحہ بھر کو توجہ نہ دی۔ ہم خالص بیوہ کی اولاد تھے جس پر ایک محاورہ صادق آتا ہے۔

بیوہ کا پوتہ..... کنالی میں موت



## ملتان (نانا کے پاس)

(ملتان)

(معرفت ڈویژنل انسپکٹرز آف سکولز بیگم ذاکر چٹھہ)

طوفانی سال

اشفاق صاحب کی زندگی میں 1950ء سے لے کر 1956ء تک بڑے طوفانی سال گزرے۔ جب وہ ہر لمحے میری والدہ اور بھائی کے نام ملتان میں لکھے۔

وہ ناقلتی پیدا کرنے کے لیے فرار کی راہ اختیار کرتے۔ کبھی تراز کھیل، کبھی جہلم، کبھی کراچی جا دھکتے لیکن ان چھوٹے سفر سے ایک شدید قسم کی محرومی اور تنگی ان کے اندر در آتی تھی کہ 1952ء میں انہوں نے ملک چھوڑنے کا سہارا ملا اور پینٹر سائنٹریائی کو اردو پڑھاتے رہے۔ یہیں انہیں اسکندر باؤسانی (Alessandro Bausani) سے خوب گہرا رابطہ بنانے کا موقع ملا اور پینٹر سائنٹریائی کو اردو پڑھانے کی خوشی حاصل ہوئی۔

میرا بھی ان طوفانی سالوں میں کچھ عجیب سا حال تھا۔ ان دنوں اردو کی پروفیسراں قریب قریب ناپید تھیں۔ مجھے لاہور کالج فار ویمن میں جا ب آفر ہوئی تھی لیکن میری والدہ کا خیال تھا کہ عورت جب مالی طور پر خود مختار ہو جاتی ہے تو بھروسہ کی قابل نہیں رہتی۔ میرے لیے بھی بس ایک شادی کا خواب باقی رہ گیا تھا۔

کبھی میں ملتان چلی جاتی، جہاں میری والدہ ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز تھیں۔ کبھی لاہور آ جاتی کیونکہ میری والدہ کا کام کچھ ایسا تھا کہ انہیں دوروں پر جانا پڑتا۔ شک و گمان کا یہ عالم تھا کہ وہ مجھے کسی ریٹ ہاؤس میں اکیلا چھوڑ کر

سختی نہ ہو پاتیں اور جلد ہی مجھے واپس لاہور بھیج دیتیں۔ جہاں انہیں یقین تھا کہ میرا بھائی کم از کم موجود رہتا ہے۔

ملتان میں میری والدہ کی رہائش دفتر کے ساتھ ہی ملحق تین کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک مرتبہ اشفاق صاحب ریڑی سے ملنے کے بہانے وہاں بھی تین دن کے لیے آئے تھے۔ یہ خطوط اور ملائنا گویا جمود کے پانیوں میں پتھر ماہ کرنا کو پھر بھنور صورت متلاطم کرنا تھا۔ مجھے ان کی توجہ سے غلط قسم کی امیدیں بندھ جاتیں۔ وہ امید نہ دلاتے ہوئے بھی دلا جاتے اور پھر گھر والوں کی ناراضگی کے بھوت سے خوفزدہ اور سراسیمہ ہو کر بھاگ اٹھتے۔

آپ کو میری گواہی درست تو نہ لگے گی لیکن میں بار بار آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ دوست دشمن اپنے پرانے کسی کی دلا زاری کرنے کے اہل نہیں تھے اور اسی در ماندہ کوشش کی بددست وہ کئی دل توڑنے کے مرتکب جاتے تھے۔ یوں تجھے ایک کمزور دل انسان کی اس کمزوری نے کتنے لوگوں کو اداس کر دیا؟

ملتان میں امی کی وساطت سے مجھے ڈاکٹر احمد خاں ملے۔ وہ ملتان ڈویژن کی سرکاری زمینوں کے ڈائریکٹر تھے۔ ان ہی کی وجہ سے میری والدہ کو زمینوں کا خط ہوا اور انہوں نے زمینیں خرید لیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے عزت کا ایسا مقام پیدا کر رہی ہیں، جہاں کچھری میں زمیندار کو کرسی ملتی ہے۔

ڈاکٹر احمد خاں شوقیہ ہومیو پیتھک علاج بھی کرتے تھے اور بہت عرصہ بعد جب ہم داستان سرائے میں رہتے تھے تو ایک روز وہ ہارے گھر آئے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور موہٹی روڈ پر ان کا کلینک ہے۔ اطلاع ہوئی کہ کوئی ڈاکٹر احمد خاں تشریف لائے ہیں۔ میں انہیں وقتی طور پر بھول چکی تھی۔

”آپ؟..... آئیے اندر بیٹھیے۔“

”نہیں مجھے بیٹھنا نہیں ہے۔ قد سیدہ! میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ گھر پر کون بیمار ہے؟“

میں حیران رہ گئی۔

میوہ ہسپتال میں ڈاکٹر طارق بن افتخار کی نگرانی میں اشرمیاں کا Liver Absces کا آپریشن ہوا تھا لیکن آپریشن کے باوجود بخار نہ اترا۔ وہ مضمحل پھرتا تھا۔

”جی اشرم..... میرا چھوٹا بیٹا۔“

پھر میں نے ساری تفصیل بتائی۔

”ٹھیک ہے۔ تم اسے لے کر میرے کلینک پہنچو۔ میرے پاس ایک ایسی مشین ہے جس پر لہو کی ایک بوتل رکھ کر

دوائی خود بخود تجویز ہو جاتی ہے۔“

اول تو ڈاکٹر صاحب کا آنا کم معجزہ نہ تھا پھر لہو کی بوتل سے دوائی کا تجویز ہو جانا اور بھی محیر العقول تھا۔ اب آپ کو

کیا بتاؤں کہ ان کی ہومیو پیتھک دوا سے ہی اشرم صحت یاب ہوا۔

کچھ لوگ آپ کو جب ملتے ہیں تو ان کی افادیت کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا فیض بہت بعد میں کھلتا ہے۔ کچھ لوگ

آپ کو فل شاپ کے طور پر ملتے ہیں جیسے تہذیبی، دور اور واقعات کے ختم ہو جانے کی نوید ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے مجھے ملتان میں ملے اور ان کی افادیت داستان سرائے میں جا کر کھلی۔

ایسے ہی خاں صاحب کی بابرکت ذات تھی۔ وہ مجھے کالج میں ملے اور افادیت ان کی داستان سرائے میں آ کر

تجربہ میں نے ان کی مہربانیوں کا پورا بادل برستے دیکھا۔ یہ خطوط اس مہربانی کی اولین پھوار ہیں۔ آپ کی تفریح طبع کے لیے پیش کیے دیتی ہوں۔

شکوہی (اشفاق صاحب) کے خطوط  
والدہ بانو قدسیہ کے نام

دیال سنگھ کالج

لاہور

19 اکتوبر 1951ء

حضور امی جان!

اس خط کو بہت پہلے آپ کی خدمت میں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ چند ناگزیر حالات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ جس نے آپ ملتان کے لیے روانہ ہو رہی تھیں میں سٹیشن پر گیا تھا اور گاڑی کے روانہ ہو جانے کے ایک عرصہ بعد تک آپ کا خط نہ آیا تھا۔ اگلے دن اثر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ دوسرے دن صبح کی بس سے عازم ملتان ہوئی تھیں۔

قدسیہ کی وہ کہانیاں جو ایک عرصے سے میرے پاس تھیں، اچانک طلب کر لی گئیں۔ ایک رات اثر صاحب نے لائے اور کہا کہ کاکی نے لکھا ہے کہ وہ افسانے اشفاق سے لے کر اُسے پہنچا دیئے جائیں۔ میں نے بلاچوں و چراغوں اثر صاحب کے سپرد کر دی اور انہوں نے اسے مقام مقصود تک پہنچا دیا۔

ان کے استفسار پر کاکی نے بتایا کہ اشفاق کو ہر گھڑی میری اور میرے گھر والوں کی تذلیل مقصود ہوتی ہے۔ جو ان کی بے عزتی کرتا ہے۔ میں آپ کو اس وقت سے امی کہتا رہا ہوں جب میں نے آپ کو دیکھا تھا اور میں آپ کو اس وقت تک امی ہی سمجھتا رہوں گا جب آپ مجھے دیکھنا کریں گی۔ اگر میں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ارادی یا غیر ارادی طور پر آپ کی ہتک کی ہو یا آپ لوگوں کو بیٹھا سمجھا ہو تو میری دعا ہے کہ میری ایک آنکھوں سے دیکھوں۔ میری موجودگی میں بھرے مجمع میں اس کا نیلام ہو۔ آسمانوں سے لعنتوں کا نزول ہو اور زمین سے گھبر پڑھتا رہو اور خدا کرے کہ آپ بھی یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ اس کے سوا میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میرا فیصلہ آپ کے یا اس کے ہاتھوں میں ہے جسے عرف عام میں خدا کہتے ہیں۔

والسلام

نیاز مند

اشفاق

دیال سنگھ کالج، لاہور

7 دسمبر 1951ء

امی جان!

آپ کا خط مجھے بڑے انتظار کے بعد ملا۔ میں ہر کلاس پڑھانے کے بعد سٹاف روم میں اپنی میز دیکھ کر اس پر گوبر مقصود نہ ہوتا۔ آخر آخر تو میں ناامید سا ہو گیا تھا لیکن آپ کا اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے جواب ملا۔ پرسوں سے اور معظم سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔

آپ میرے لیے سویٹر بنانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔ اس مرتبہ مجھے کافی سویٹر مل گئے ہیں۔ ایک خرید لیا ہے اور مواد ضرورت سے زیادہ فراہم ہو گیا ہے۔ اگلی سردیوں پر اگر زندہ رہا تو پھر آپ ہی سے درخواست کر دوں گا اور کیا لکھوں۔ نہ کوئی خاص بات رونما ہوتی ہے اور نہ میں ہونے ہی دیتا ہوں۔ آج طبیعت خراب ہے سے چھٹی لے لی ہے۔ سٹاف روم میں بیٹھ کر یہ خط لکھنے لگا ہوں۔

تیس تاریخ کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔ دیکھیے کب آتی ہے اور کیا لاتی ہے۔

میراجی اس نوکری میں نہیں لگتا لیکن لاہور رہنے کے لیے اور سگریٹوں کا خرچ چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی

ٹکانا ہی پڑتا ہے۔ میں نے جب سے سردیاں شروع ہوئی ہیں، ایک مرتبہ بھی کٹ کیٹ نہیں کھائی۔ آپ آئیں گے لائیں گی تو کھاؤں گا اور کسی کو نہیں دوں گا۔

آپ کا اپنا  
شکو

ڈی۔ ایس۔ کالج

لاہور

18 فروری 1952ء

امی جان!

میں کل آپ سے ملنے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ آپ جا چکی ہیں۔ یوں تو میں دو تین گھنٹے وہاں بیٹھا لیکن وہاں رہتی تھی۔ آج طبیعت خراب تھی۔ اس پر باجی نے ذرا سختی کی اور میری حالت غیر ہو گئی۔ گھر سے کالج آیا ہوں لیکن لے رکھی ہے اور لاہور میں بیٹھ کر لاہور میں کے قلم دوات سے یہ خط لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں میں اور کالج میں ایک فرق تو ضرور ہے کہ..... لیکن میں آپ کو پریشان کیوں کروں۔ پھر کبھی لکھوں گا جس دن میرا ذہن میرے قلم کا ساتھ دے گا۔

آپ کا  
شکو

لاہور

7 اگست 1952ء

امی جان!

آپ کے تار کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے پتہ تھا اس دن آپ مجھے ضرور یاد کریں گی۔ اس لیے میں پکچر

تھوڑے وقتوں کے بعد گھر آتا رہا۔

فیسوں زندگی کے کتنے ہی سال رائیگاں گئے اور میں کسی کے کام نہ آسکا۔ نہ اپنے نہ اوروں کے! جب کبھی کا کا

آپ لوگوں سے جو کچھ ملا ہے، اس کا تذکرہ نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے لیکن میری تنگ دامانی کو ہمیشہ شکوہ رہا کہ

آپ کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں لیکن مجھ پر ایک ہی خوف سوار رہتا ہے کہ کہیں مستقبل کی نحوستیں

آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے شاید یہ آرزو جلد ہی پوری ہو۔ حال میں یا مستقبل قریب میں۔

والسلام

شکو

D.S.College

Lahore

12 اپریل 1952ء

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے  
ڈھونڈا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کر

امی جان سلام محبت!

ایک شام جب میں پرویز کو ایک ضروری چٹھی دینے کے لیے گیا تو وہ روح فرسا خبر ملی جس کی توقع نہ تھی اور جس سے حقیقت میں تو کیا شاید آپ لوگ بھی تیار نہ تھے۔ ماچھا کو میں نے تین مرتبہ دیکھا تھا اور تینوں بار سینما میں۔ ایک بار حفیظ نے وہ گئی اور پوتر ماچھا کی دعوت کی تھی اور مجھے بھی بلایا تھا۔ دوسری مرتبہ جب میں اتفاق سے ریگل سینما میں موجود تھا اور تیسری بار آخری مرتبہ جب قمر صاحب کو کا کی سے کچھ کام تھا اور اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم پلازہ پہنچے تھے۔ پہلی اور دوسری ملاقات میں ان سے شاید ہی کوئی بات ہوئی ہو۔ اسی قدر یاد ہے کہ انہوں نے مجھے محبت اور شفقت کی نگاہوں سے دیکھا تھا اور میری بات کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

تیسری دفعہ ان سے البتہ کچھ باتیں ہوئیں۔ وہ زیادہ تر فلم سے اور میرے حوصلے سے متعلق تھیں۔ میں Under Capric دیکھ کر از بسکہ متوحش ہوا تھا اور انہوں نے اسے کھیل جانا تھا اور مجھے بھی تلقین کی تھی کہ فلم کو فلم ہی سمجھیں۔ اگر جانتا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے تو اور بھی باتیں کرتا اور بھی یادیں جمع کرتا۔ ان کا چہرہ ذہن میں لاتا رہتا ہے مگر وہند لاسا اور ایسا نا پائیدار بن کر کہ زیادہ دیر تک کیفیات کے چکر میں نہیں رہتا۔

میں اس مختصری زندگی میں بہت سے تجربات کر چکا ہوں اور ان گنت چیزیں میرے مشاہدے میں آتی رہی ہیں

تجربے ہی واقعے یا سانچے نے مجھے طرب پسند (Optimist) نہیں بنایا۔ ہم مشرق کے رہنے والے اکثر و بیشتر تقدیر یئے



ہیں اور قسمت کے پجاری ہیں۔ میں بھی لکھے کا قائل ہوں اور ریکھا کا ماننے والا ہوں۔

ماچھاکا وفات پر عمر خیام کی ایک بھولی ہسری رباعی یاد آگئی۔ اب یہ کئی دنوں سے میرے دماغ پر چھو رہا ہے اور خدا جانے کب تک چھائی رہے گی۔ آپ کی نگاہوں سے یقیناً گزری ہوگی لیکن اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آپ کو تسکین دینے کے لیے لکھتا ہوں۔

He moving finger writes: and having wit

Move on: nor all thy Piety nor wit

Shall lure it back to Cancal half a live,

Nor all thy Tears wash one word of it.

نہا ہوں کی دھند سے لکھا ہوا مٹا ہے نہ آنسوؤں کے ریسے سے ہونی کے اٹھ کر دھنسنے میں پر کیا کیا جانے

جو تجھ سے چھٹ گئے ہیں ان سے آنسو آ ہی جاتے ہیں

کیجہ دکھ ہی جاتا ہے تری یاد ہی جاتی ہے

میں تو اس جہان کے معمولی سے معمولی کام کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ یہ تو موت ہے۔ موت بیگانے کی

بیگانے کی میرے لیے بڑی تکلیف کا باعث ہے۔ صبر کی تلقین کرنا میرے مشرب میں نہیں۔ میں تو کہتا ہوں افسوس آتا

جی بھر کے کر دیکھیں ہمت شرط ہے!

نیلو آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ امید ہے آپ عنقریب آئیں گی۔ تقویاں آیا ہوا تھا۔ آج چلا گیا ہے۔

خط لکھنے کو کہہ رہا تھا۔ دیکھوں لکھتا ہے کہ پھر بھول جاتا ہے۔

کوشش مسلسل بہت دیر شاں چو زلف یار

عیم مکن کہ در شب ہجر نوشتہ ام

خادم

شکو

امی جان!

آپ کا محبت نامہ مل، میں کل بھی آپ کی خدمت میں ایک عریضہ تحریر کر چکا ہوں۔ امید ہے نظر سے گزرا ہوگا

آپ نے جس محبت اور خلوص سے میری روانگی کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس نے بلکہ مجھ پر الٹا اثر کیا اور میرا جی یہیں کا ہونے

کرنے لگا۔

روپوں کے بارے میں میں اس قدر پریشان نہیں ہوں۔ صرف ایک ہزار روپے کی ضرورت تھی، سو پونے

ہوگئی۔ آپ ہرگز ہرگز تردد نہ کیجیے گا اور کا کا کو زمین فروخت کرنے کا مشورہ نہ دیجیے گا۔ کپڑے میرے پاس بہت کافی

گئے ہیں۔ صرف ایک جو تا اور ایک سوٹ کیس خریدنا باقی ہے۔ ان دونوں کے لیے آپ کو یا کا کا کو ضرور زحمت دوں گا۔

سب ٹھیک ہے۔

میں پہنچ کر تو عزت سے بسر ہوگی۔ ماہ بہ ماہ تنخواہ ملا کرے گی اور اس کے علاوہ یقیناً کسی فلم کمپنی سے مکان کے ستر کھنڈے ہو جائے گا۔ کار لینے کا ارادہ میرا بھی ہے لیکن اپنے اندوختہ سے لوں گا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ”یہ۔۔۔ میں مجھے بڑا آدمی بنا دیں گی، بہت بڑا آدمی لیکن ساتھ ہی ساتھ ڈر بھی لگتا ہے کہ بڑا آدمی بن کر میں ان لوگوں سے۔۔۔ برائی جو دل و جان سے مجھے چاہتے رہے ہیں۔“

یہ صاحب نے یونیورسٹی روم کو خط لکھ کر میری خدمات انہیں سپرد کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ ابھی تک مجھے وہاں سے کوئی موصول نہیں ہوا۔ بس اس کا شدت سے انتظار ہے۔ کچھ اکتوبر میں انشاء اللہ لاہور چھوڑ دوں گا اور پھر اس کے لیے۔۔۔ بعد آپ کا اور اپنا آبائی وطن بھی۔

ایک مرتبہ پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ کسی معاملے میں بھی پریشان نہ ہوں۔ افتخار بھائی نے نیشنل خاں سے ڈیڑھ گھنٹے تک گفتگو کیا ہے۔

کا کا اور کا کی کو پیار۔

والسلام

خادم

شکو

میری پیاری امی کو میرا سلام پہنچے۔

پرسوں آپ کا خط ملا۔ باوجود اس کے کہ یہ کاکی والے خط کی پشت پر رقم تھا، میں نے سب سے پہلے اسی کو پڑھا۔ یہ سب کچھ کاؤنٹر پر بیٹھ کر مزے مزے سے چائے پیتا رہا۔ جتنی مرتبہ میں نے آپ کے خط کو دیکھا گا لوں سے نکال دیا۔ صحت مند رہیں کمیشن میں بہت سے گاہک آئے اور چلے گئے لیکن میں بدستور اپنی جگہ پر جم رہا۔

جائی دفعہ میں نے پیرے کو ڈبل ٹپ دی یعنی بیس لیرے (پورے دو پاکستانی آنے) اس پر وہ اس قدر خوش ہوا کہ کہہ کر سکتا۔ اس نے دو مرتبہ جھک کر سلام کیا اور تین دفعہ گراتے (شکریہ) کہا۔ جب میں اپنا تھیلہ اٹھا کر جانے لگا تو چونکہ وہ کوئی خبر ہوگئی تھی کہ پاکستان پر دو گرام والے نے بیس لیرے ٹپ کیا ہے، اس لیے ہر ایک نے یک زبان ہو کر ”یون۔۔۔“ کہا۔

اس رقم سے آپ کو یہاں کی ٹپ کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ روم کے ہوٹلوں کی سب سے اچھی بات یہی ہے کہ یہاں سے۔۔۔ یاد ہو لیرے (آٹھ آنے) ٹپ دی جاتی ہے اور جو سو لیرے دیتا ہے۔ یہ لوگ اس کا اور کوٹ اترتے ہیں، یہ پتھر کی لا کر دیتے ہیں، آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہیں اور ٹیکسی بلوا کر دیتے ہیں۔

یہ ٹپ کی کافی تکلیف دہ بات یہاں کی سردی اور بارش ہے۔ پتہ نہیں کب بارش ہونے لگے۔ ہر ایک کے ہاتھ۔۔۔ ہر ایک کے جسم پر برساتی ہے۔ اچانک ٹپاٹپ بوندیں برسنے لگیں۔ جل تھل ہو گیا اور گھڑی بھر میں۔۔۔ بالکل خشک ہو گئیں، گویا صدیوں سے بارش نہ ہوئی ہو۔

گھڑی یہاں بہت سستی ہے۔ ایک دن میں نے دریافت کیا تھا۔ بارہ آدمیوں کے کھانے کے نہایت نفیس

چھری کا نئے اور تچھ ایک خوبصورت مخملی بکس سمیت 33 روپے میں مل جاتے ہیں۔ اس سے گراں قیمت چیزیں بھی خریدی جاسکتی ہیں اور ان سے کم قیمت بھی۔ سبزی اور پھلوں کے معاملے میں یہ خطہ بہت خوش قسمت ہے۔ پاکستان کے مختلف شہروں کی قیمتیں زیادہ شاداب اور بہت سستی ہیں۔

پھل اتنے ہیں کہ جگہ جگہ ریزھیاں نظر آتی ہیں۔ موگ پھلی (چونکہ میں صرف یہی خرید سکا ہوں) کی قیمت زیادہ مزیدار مجھے اب تک کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ انگوروں کا تو اصلی گھر یہی ملک ہے۔ سفید انگور سے سیاہ زیادہ سستا ہے۔ بگوٹھے یہاں کی خاص سوغات ہیں۔ نارنگیں اور مانگے بے شمار بے حساب ہیں۔ سیب مرغ آٹھ آنے کا ہے اور زرد تین آنے کا۔

ڈیری کا خالص مکھن والا دودھ چھ آنے کا ایک سیر ہے۔ دہی بارہ آنے سیر ہے۔ مکھن کی قیمت مہنگی ہے لیکن آپ منوں کے حساب سے خرید سکتے ہیں۔ قیمت دودھ دہی سے اندازہ کر لیجیے۔ اٹھ چھ پیسے کا ایک سیر روپے کی۔ گوشت گائے کا اہتہ مہنگا ہے۔ کوئی ساڑھے تین روپے سیر، سور کا گوشت اس سے بھی گراں ہے لیکن گوشت سستا ہے اور میں ان دنوں غالباً گھوڑے کا گوشت ہی کھا رہا ہوں۔ نہایت بد مزہ اور بے کیف ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کا اپنا گھر ہو تو زندگی بن جاتی ہے۔ باورچی خانوں میں گیس استعمال ہوتی ہے۔ اس سے روپے سے زیادہ نہیں اٹھتا (ماہوار) بجلی اس سے بھی سستی ہے اور ٹیلی فون کا بل ڈھائی روپے مہینہ بنتا ہے۔ جس سے چار کمرے ہوں یعنی ایک کھانے کا کمرہ، ایک ڈرائنگ روم، ایک سلپنگ روم (مع دو پلنگ بستر) ایک متفرق کمرہ باورچی خانہ، ایک غسل خانہ، اس کا کرایہ سو اتنی روپے تک ہوتا ہے۔

مالک مکان ہر چیز کو بستر کی چادریں تبدیل کرتے ہیں اور ہر تیسرے دن دو تولیے بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر چیز بہت سستی ہے۔ فی ٹرپ سٹیشن، لیکن چار ہزار میں ملتی ہے۔ خواہ نقد لے لیجیے خواہ پچاس روپے ماہوار قسطوں پر لے آنے میں ایک کپ اور خالص انگور کی شراب آٹھ آنے سیر۔ مچھلی عام ہے اور بہت سستی۔ زیتون کا تازہ تیل بھی سستا ہے۔ مزیدار اور مکھن سے زیادہ صحت بخش ہوتا ہے۔ وہ بھی کوئی بارہ آنے میر کے حساب سے ملتا ہے۔

یہاں اگر کوئی چیز مہنگی ہے تو وہ مکان ہے یعنی ڈیزھ سویا ایک سو اتنی روپے کے قریب لیکن بڑا ہوادار ہوتا ہے۔ اب لیجیے نہانے کا خرچ۔ ایک مرتبہ گرم پانی اور صابن تولیے کے ساتھ نہانے پر ایک روپے خرچ اٹھتا ہے اس میں پابندی یہ ہے کہ آپ تین گھنٹے لگا تار سے زیادہ نہیں نہا سکتے۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں ایک مرتبہ نہا کر چینی کے اتنے لمبے ٹب میں لیٹ کر پھر اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ نیند سی آنے لگتی ہے اور ہاتھ پاؤں کھل جاتے ہیں۔ صابن اپنا ہو تو کوئی بارہ آنے دینے پڑتے ہیں اور بعد میں دس لیرے (ایک آنہ) اُس عورت کو دیئے جاتے ہیں۔ ان کے دروازے پر خدمتگار بن کر کھڑی رہتی ہے۔

مکانوں سے زیادہ مہنگی چیز ڈاک کے ٹکٹ ہیں۔ پاکستان میں بسنے والے عزیزوں کو لکھنے کے لیے ایک لیرے چاہئیں اور مجھ ایسا آدمی جسے یہاں روم میں بھی افسانے مانگنے والے نہیں چھوڑتے، قریباً ہر روز ایک خط لکھتے ہیں۔ باقی روم ہر طرح سستا اور اچھا شہر ہے۔ لوگ بڑے غریب اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔ گاہے سڑکوں پر مانگنے والے

تعمیر سے ہیں۔ انگریزوں والی اکڑان میں ہرگز نہیں۔ لڑتے بالکل نہیں، تلخ کلامی تک ہی معاملہ رہتا ہے۔ کسی کو تھپڑ مارنے کے برابر ہے۔

یہاں کی سب سے بڑی گندی اور فحش گالی ”جادفج ہو جا“ ہے۔ اگر کوئی کسی سے یہ کہہ دے تو پھر مرنے مارنے سے بچتا ہے۔ جزیرہ سسلی کے رہنے والوں کے لیے سب سے بڑی گالی یہ ”جا جا کے صابن کھا“ یہ سن کر تو کوئی سسلی بھرتے ہوئے ہے میں نہیں رہتا۔ اگر آپ چوراہے پر کسی سپاہی کو مخاطب کر کے راستہ پوچھیں گے تو وہ دونوں ایڑیاں جوڑ کر سسلی بھرتے آپ کو فوجی سلام کرے گا۔ پھر کہے گا فرمائیے حضور! چالان کے لیے پکھری نہیں جانا پڑتا۔ سپاہی چوراہے پر ہی پکھری کھے سیدھے دیتا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ یعنی تین سو لیرے بہت بڑا چالان ہے۔

تین ہزار لیرے پانے والا اچھا افسر ہوتا ہے۔ پچاس ہزار لیرے گرنڈ آفیسر کی تنخواہ ہے۔ اور ستر ہزار لیرے ہائی آفیسر کی تصور کیا جاتا ہے۔ اور کوٹ ڈیڑھ سو روپے میں بنتا ہے اور ہمارا گرم سوٹ ایک سو دس روپے میں اور اگر کسی کو ایک مشت ادا ہوگی کر دے تو اسے رکھیں آدمی خیال کرتے ہیں۔

پاکستان کو یہ لوگ محض اس لیے امیر ملک تصور کرتے ہیں کہ سر آغا خاں کراچی کا رہنے والا ہے اور ہماری اس طرف سے کہتے ہیں کہ ریٹائر ہو کر پاکستان کی بہو ہے۔ موقع ملتا ہے تو اجنبیوں خاص طور پر امریکیوں اور پاکستانیوں سے بات چیت کرتے ہیں۔ دکانیں مال روڈ والی بھی ہیں، انارکلی والی بھی اور ڈبئی بازار والی بھی۔ اگر ”دینا ہے تو دوور نہ دینا“ کا نعرہ ادا کر دیتے ہیں اور جلد ہی کر دیتے ہیں۔

یہاں کی شادیاں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ بیویاں دوسرے مردوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں اور خاوند اور عورتوں کے درمیان شام کے وقت دریائے ناہر کے کنارے اپنے دوست کے ساتھ بوس و کنار کرتی ہے۔ بارہ بجے رات کو سوئی جاتا ہے۔ گو کافی لوگ شراب پیتے ہیں لیکن شراب نہ پینے والے کی عزت کرتے ہیں اور اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ علاوہ اور کیا لکھوں میں تو اب تک یہی کچھ دیکھ سکا ہوں اور اسی حد تک محسوس کر سکا ہوں۔

امی! کا کی بھلا میرے خط پڑھ کر کیوں روتی ہے اور اس نے گھلنے والا رو یہ کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ اگر وہ یہ سمجھتی ہے تو چکا ہوں تو اسے تلاوت کرنی چاہیے اور ہر روز فاتحہ پڑھنے کے لیے ہاتھ اٹھانے چاہئیں اور اگر زندہ سمجھتی ہے تو شہر کے شور و غوغا پر اسے کبھی ایذا نہیں پہنچائی اور لاشعوری طور پر کبھی سکھ نہیں دیا لیکن میں کیا کروں امی یہ تماشا کبھی نہ کھسکتی ہیں) آپ سے آپ بن گیا ہے۔

میں یہاں اکیلا بالکل اکیلا بے یار و مددگار زندگی کے دنوں کو دھکے مار مار کر آگے لڑھکا رہا ہوں۔ پتہ نہیں ابھی کبھی میری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ امی! آپ دل پر ہاتھ رکھ کر میری قسم کھا کر سوچیں کیا میں برا ہوں؟ اور اگر نہیں ہے تو بس مجھے ایک خط میں یہ ایک لفظ لکھ کر بھیج دیجئے۔ خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس کے بعد آپ اس سے کبھی نہ دیکھیں گی۔

کبھی کبھی میں اپنے آپ کو بے ایمان اور بددیانت بھی تصور کرنے لگتا ہوں لیکن آپ کی محبت اور شفقت اس سے بچتی رہتی۔ آپ کے اس خط نے مجھے اپنی نگاہوں میں چور سا بنا دیا ہے اور میں اس وقت سے لے کر اب

تک سوچ رہا ہوں کہ شاید امی کی بات ٹھیک ہی ہو۔ پہلے مجھے اپنے دل میں اپنے آپ سے شدید نفرت تھی، اب میں بھی مجھے اپنے وجود سے گھن آنے لگی ہے اور جرم کا احساس قوی تر ہو گیا ہے لیکن امی! میری امی! کیا تم بھی مجھے جاؤ گی؟

اگر ایسا ہوا تو مجھ پر موت بھی حرام ہو جائے گی اور میں..... لیکن امی یوں نہ ہونے دینا۔ بس میرا جی کے لیے جھوٹ موٹ کہہ دینا کہ میں برا نہیں ہوں اور امی اُسے سمجھانا اتنا سمجھانا کہ وہ سمجھ جائے اور اگر اس کا رویہ نہ بدلتا تو میں اس سے براحتی انتقام لوں گا۔ جس مٹی سے وہ بنی ہے تقریباً اسی مواد سے میرا خمیر اُٹھا ہے۔ اگر اس نے کسی کی تو وہ وقت بہت قریب ہو جائے گا جب چلتے پھرتے اجسام آنسوؤں کے وجود بن جایا کرتے ہیں۔

آپ کا  
شہ  
میری صحت پہلے سے دو چند بندہ وہ چند ہو گئی ہے۔ شہوت کے طور پر اپنی تازہ تصویریں بھیج رہا ہوں۔ آنکھوں کے نیچے وہ جھتتے رہے ہیں اور نہ چہرے پر سلوٹیں ہی! کیا آپ بھی مجھے اپنی تازہ تصاویر بھیجیں گی؟  
رومتہ اللہ برنی

(تاریخ پتہ درج نہیں کیا ہے)

امی جان!

آپ کا ایک خط ملتا ہے، ایک خط پتہ نہیں کہاں سے کل ایک لفافہ ناہور سے موصول ہوا۔ اب میں اصول بنا لیا ہے کہ مختصر لکھوں گا مگر لکھوں گا ضرور۔ باقاعدگی سے اور ہنرمندی سے۔ لوگ پہلے ہی مجھ سے ناواقف مزنگ والوں کے ساتھ تو میں نے خاصی زیادتی کر رکھی ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سامان کا درپیش ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا پیک کیسے کروں اور کس کی مدد کروں۔ آپ دور ہیں، ریزی دور ہے اور کاکی صاحبہ کو اپنے ڈرامے کی فکر ہے۔ پتہ نہیں اس نے یہ مصیبت اپنے گلے کیوں لی ہے۔ میں اپنی ایک پریشانی میں مبتلا ہوں، دوسرے اس کی کامیابی کا تردد ہے۔ خواہ مخواہ بڑی بڑی باتوں میں دخل لگ جاتی ہے اور مجھے پریشان ہونے کے لیے کھونٹے سے باندھ دیتی ہے۔ اللہ اس کو ہدایت دے۔

ان دنوں ہر لمحہ ریزی یاد آتا ہے۔ میری کتابیں، جنہوں نے میری ساری کمائی ہڑپ کر لی ہے اس وقت پھاڑے میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ اُن کو کیسے پیک کروں اور کس طرح بک کراؤں؟ اگر ریزی یہاں ہوتا تو مجھے مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اگر آپ مجھے خط لکھنا چاہیں تو 20 دسمبر تک یہیں رونا لکھیں۔ اس کے بعد آپ کا خط نہیں آئے گا۔ میں آپ کے خط کو نبل سکوں گا۔

کل اپنی فرنج کی اُستانی کو سلام کرنے گیا تو اس نے زبردستی کرسی پر بٹھا کر کاغذ سامنے رکھ دیا اور یوں میری مرتبہ recitation لکھتے جاؤ۔ دیکھوں کتنی غلطیاں کرتے ہو۔ میں نے کہا اُدھر قدسیہ ڈرامہ کر رہی ہے، میرا وہ شہ نہیں ہے۔ پروہ نہ مانی اور مجھے لکھتے ہی بن پڑی اور تو اور "باوجودیکہ" Malgre کے سپینگ بھول گیا۔ اس پر جو

سب کو معاف کرے۔ ایک قیامت برپا ہوگئی۔ اس کے خاوند نے مداخلت کر کے معافی دلوائی۔ خدا کی قسم  
 سے پڑھنا بہت مشکل ہے۔ اطالوی زبان اور ادب کا جو امتحان دیا تھا اس میں تیس میں سے 28½ نمبر آئے۔  
 کیا حق بچے ہوں کہ نہیں؟

خود امی! آپ کا کی سے نہ بولا کریں۔ بہت بری لڑکی ہے۔ اس نے مجھے ایسے ایسے خراب خط لکھے  
 تھے۔ سبھی نہیں آتا کہ یہ سب باتیں اس کے دماغ سے اُتری ہیں۔ آپ کی زمین کا کیا حال ہے؟ ہم وہاں شکار  
 جیتے تپ جائیں گے؟ ریزی کو پیار (اگر اس نے حجامت بنائی ہو اور اس کی ڈاڑھی نہ بڑھی ہو تو بے شک میری  
 سے مزہ بھی چوم لیجے گا۔)

آپ کا  
 شوق

پوسٹ بکس 509

لاہور

4 ستمبر 1952ء

امی جان! آپ کے دونوں خط بہ یک وقت ملے۔ اُن کا مفصل جواب اگلے دن پراٹھا رکھتا ہوں۔ اس وقت  
 میں پریوز میٹھا ہے اور اس پر "ملک ٹیک" پینے کا موڈ سوار ہے۔ مجھے بھی ساتھ لے جا رہا ہے۔ اس لیے تفصیلاً لکھنے  
 سے محروم ہوں۔

"آپ پیسوں کی فکر ہرگز نہ کریں۔ اکیس تاریخ کو جب آپ آئیں گی تو مجھے پانچ سو روپیہ دے دیجئے گا۔ اس  
 سے مجھے ایک دھیلے کی بھی ضرورت نہیں۔ ابھی ابھی روما سے خط آیا ہے۔ ان لوگوں نے BOAC کی وساطت سے  
 بھرتی خرید لیا ہے جو مجھے عنقریب پہنچ جائے گا۔

انسوس کے ساتھ ہنا پڑتا ہے کہ مجھے ہوائی سفر ہی اختیار کرنا پڑے گا کیونکہ یہی اُن لوگوں کی خواہش ہے۔ آپ  
 سے کبھی مجھ ایسے سخت جان کو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

فی الحال آپ میری عیدی بھی اپنے ہی پاس رکھیے۔ میں آپ سے دستی وصولی کر دوں گا۔ منی آرڈر نہ کیجئے گا۔  
 کبھی بھی چیز ہے لیکن مزنگ روڈ والے اچھے لوگ نہیں۔ بہر کیف جو جی میں آئے کیجئے۔

والسلام

آپ کا  
 شوق

لاہور

18 اکتوبر 1952ء

میری پیاری بقلم خود امی!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ میں اور آپ کے پاس آنے کی کوشش نہ کروں!  
 خدا گواہ ہے آپ سے ملنے کو تو بہت جی چاہتا ہے لیکن.....  
 اب میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ خواہ ایک دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو  
 آپ کے پاس پہنچوں۔ امید ہے اسی ہفتہ کے اندر یہ تمنا پوری ہوگی۔  
 گمان غالب ہے آپ اپنے ہیڈ کوارٹر ہی میں ہوں گی۔  
 اور کیا لکھوں؟ بہت کچھ باتیں ہیں جو میں اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔  
 اُن کا علم میرے سوانح نگاروں کو بھی نہ ہوگا۔

آپ کا ایک ہی

ناخلف بیٹا

شکو

روما

2 دسمبر 1952ء

محترم امی جان!

ابھی میں ایک خط قدسیہ کے نام لکھ کر پوسٹ کر چکا ہوں۔ اُسے سپر ڈاک کرنے کے بعد خیال آیا کہ مجھے  
 آپ کے نام لکھنا چاہیے تھا۔ وہ بھلا کیونکر میرے خط کا جواب لکھے گی۔ خدا کرے میرا خط پہنچنے تک اسے بالکل آرام  
 ہو اور وہ اس قابل ہو چکی ہو کہ مجھے اپنی تحریر میں جواب لکھے۔

لیکن خدا نخواستہ اگر یوں نہ ہو تو آپ مجھے واپسی ڈاک اس کی صحت اور تندرستی کے بارے میں لکھیے گا۔  
 یہاں آپ کا خط پا کر کافی پریشان ہو گیا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کا اگلا خط آنے پر یہ پریشانی دور ہو جائے گی۔  
 (انشاء اللہ)

میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ یہاں اتنی ٹھنڈ نہیں ہے جتنی لندن میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ایک  
 مولاسا اور کوٹ سلوا لیا تھا۔ بس میں یا ٹرام میں سردی ہرگز نہیں لگتی۔ ریڈیو کے سٹوڈیو اور کلاس کے کمرے بجلی کے  
 دانوں سے گرم کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے وہاں بھی کوٹ اتار کر کام کرنا پڑتا ہے۔

لینڈ لینڈی نے بڑی موٹی سی رضائی اوڑھنے کو دے رکھی ہے۔ اس لیے کسی مقام پر بھی سردی لگنے کا احتمال  
 صحت پہلے پہل ماحول کی ناموافقت کی وجہ سے گرنے لگی تھی، اب سنبھل گئی ہے۔ پھل بھی کھاتا ہوں اور دودھ بھی پیتا ہوں۔  
 لیکن ریڈیو پر راول پنڈی ریڈیو جیسا کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ذہنی ورزش ہو جاتی ہے۔

آپ کو مفصل خط پھر کسی وقت تحریر کروں گا۔ اب شام چھارہ بج رہی ہے اور لوگ گھروں سے نکل کر تفریح مچا رہے  
 کلبوں کو جا رہے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں یہ چند سطور جلدی جلدی گھسیٹ رہا ہوں۔  
 پرویز ان دنوں کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اس کے متعلق بھی کچھ لکھتے رہا کیجیے گا۔ وہ میری بات نہیں سنتا۔

ت ہے لیکن وہ مجھے سب سے عزیز ہے۔

میرے نام سے پہلے پروفیسر ضرور لکھا کریں (معاف کیجیے گا) اس لیے کہ جس مینشن میں میں رہتا ہوں، وہاں سب مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں اور اس لیے بھی کہ وہ میرا نام ادا نہیں کر سکتے۔ پروفیسر میرے نام کا ایک حصہ سمجھنے کا تجربہ نہیں لکھا ہو تو ڈاکیومنٹ پریشان ہوتا ہے اور ہر ایک سے پوچھتا ہے اسحاق کون ہے؟

والسلام

خادم

شکو

روما

14 اپریل 1953ء

میری پیاری امی!

مجھے آپ کے دونوں خط ملے۔ ان دنوں چونکہ نظامی یہاں آئے ہوئے ہیں اس لیے انہیں سیر کے لیے ادھر لے جانے کا پڑتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جواب میں تاخیر ہو رہی ہے۔ آپ کے ڈیڑھ سو روپے مجھے بہت دن ہوئے مل گئے۔ اس کے لیے آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

کاکا کے ساتھ میرا حساب چلتا ہے۔ آپ خدا کے لیے عید وغیرہ کے تحفہ کا سوال پیدا نہ کیجیے۔ میں نے اس سے بچنے کی کوشش کی تھی۔ آپ سے تو میں پہلے ہی اس قدر شرمندہ ہوں کہ خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ خیر یہ تفصیلی بات ہے پھر عرض کروں گا۔

آپ کو زمین اور پرویز فارم کی خوشیاں مبارک ہوں۔ میرے آنے تک تو اس میں فصل لہلہا رہی ہوگی۔ آپ نے مجھے کھا کہ پانی کب نکلا ہے۔ مجھے فکر ہے کہ اس علاقے کا پانی فصلوں کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ خدا کرے ہمارے فارم کے پانی میں کھلا ہو۔ سانپ کے منہ کی بابت ابھی میں نے دریافت نہیں کیا۔ پرسوں پوری تفصیلات روانہ کروں گا۔

مستان کے ہشپ صاحب نے جو خط یہاں لکھا تھا وہ میں نے بھی پڑھا ہے۔ لگھتے ہیں کہ اس طرح روپیہ بچھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ وہ واقعی ٹھیک کہتے ہیں۔ آئندہ ہرگز مت۔

مجھے ریڈیو روم نے Foreign Service کے Best اناؤنسر کے طور پر دو سو روپیہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے آپ مجھے اور پرویز کو نکما کہا کرتی ہیں۔ میں نے اکتالیس اناؤنسر میں نام پیدا کیا ہے۔ مجھے شاباش کیے۔ گویہ نام اور میرا کام میری صحت برباد کر گیا لیکن اکیلا کام ہی اس کی وجہ نہ تھی اور بھی دکھ ہیں..... اب مجھے شاباش کیے۔ خوش ہو جائیے کہ میں محض سفید معظّم نہیں ہوں۔ کیوں امی؟

میں نے ناچ سیکھنا شروع کیا تھا لیکن وہ لڑکی جو میری پارٹنر بنتی تھی، اس کی ٹانگیں اور سننے چھل گئے۔ بیچاری تھ رہی اور میرا ناچ ادھورا رہ گیا۔ استانی نے کہا تو میرے ساتھ ناچا کر۔ ایک دن اس کے ساتھ ناچا تو نیچے استانی اور اوپر



میں۔ وہ پتہ نہیں فرینچ میں مجھے گالیاں دینے لگی یا شاباش کہنے لگی۔ اس کے بعد میں وہاں نہیں گیا۔

روم میں اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ سردی چند دن کے لیے دور ہوئی تھی اب پھر بڑھ گئی ہے۔ میں تو ہوں کہ یورپ مجھ کو قلفی بنا دے گا۔

آپ کب تک ملتان میں ہیں اور اس کے بعد کس جگہ پر لگنے کا ارادہ ہے؟ یہاں کا محکمہ تعلیم تو بہت اچھا مثلاً مجھ ایسے غریب پروفیسر کو سینما، تھیٹر، کلب اور نمائشوں میں کہیں آدھے داموں پر اور کہیں مفت جانے کی اجازت دفتروں میں ہیرا پھیری بھی نہیں ہوتی۔

میری صحت بہت اچھی ہے۔ تازہ فوٹو کھینچواؤں گا تو سمجھوں گا۔ جانی ماموں کو بہت بہت سلام۔ وہ آتے ہیں اور ان کی باتیں ہمیشہ یاد آتی ہیں۔

آپ کا باورچی جو جیب میں دھنیا اور نمک چرا کر لے جاتا تھا اُس کا کیا حال ہے؟ میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔

پرویز کی صحت کا کیا حال ہے۔ آپ اس کو زیادہ کام نہ کرنے دیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ بہت ہی لڑکا ہے۔ ذرا ذرا سی بات کا اُس پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور یہ اثر اس کی صحت پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس کی صحت نہیں ہے اور مجھے ہر دم اُس کی فکر رہتی ہے۔

آپ کے پاس وقت ہو تو جواب ضرور دیجئے گا۔

والسلام

آپ کا  
شکو

روم

8 جون 1953ء

میری پیاری امی!

خدا آپ کو لمبی عمر عطا کرے کہ آپ ہی ہم ایسے بے نوا لوگوں کا سہارا ہیں۔ ابھی آپ کے دو خط ایک ملے۔ ایک تو میرے دبیس کا چھ پیسے والا نفاذ تھا جسے دیکھے ایک جگ بیت گیا تھا اور ایک ایئر لیٹر جو میرے لیے ذرا زیادہ درجہ رکھتا ہے۔ اس سے پہلے بھی آپ کا ایک محبت نامہ مجھے ملا تھا لیکن میں حسب دستور جواب نہ دے سکا۔ کبھی کبھی آپ کے ساتھ اپنی بے وفائیوں کو محسوس کر کے شرم آنے لگتی ہے لیکن کوئی میرے دل میں کہتا ہے کوئی بات نہیں اپنی امی ہی تو ہے اور ہاں اگر ہم نے آپ کے ساتھ لاڈ نہ کیا تو اور کس کے ساتھ کریں گے؟

آپ نے مجھ کو اس مختصر سی زندگی میں اس قدر پیار بخشا ہے کہ یہ میرے لیے ساری زندگی کافی ہوگا۔ آپ کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ یاد آتا ہے اور امی مجھے اس وقت تو آپ بہت ہی یاد آتی ہیں جب ہوٹل کے شور بے کی پلیٹ ایک اور گرم پانی کی پلیٹ میں رکھ کر لاتا ہے۔ میں ہنس دیتا ہوں تو وہ پوچھتا ہے "Recorda Mama"

اور میں دل ہی دل میں کہتا ہوں ہاں تھوڑا تھوڑا کیونکہ جب کسی کو زیادہ یاد کرتا ہوں تو پھر سگریٹ کا دھواں بھرتی۔

آپ کی دو تصویریں میرے پاس ہیں۔ ایک میں آپ لکڑی کے پرانے (24- ایس کینال پارک والے) تخت پر لیٹے ہوئے ہیں۔ یہ فونو میں نے اتارا تھا اور دوسری میں آپ کا کی کے ساتھ کھڑی ہیں۔ یہ تصویر مجھے یہاں لگائی تھی۔ دونوں تصویریں میری لکھنے والی میز کے سامنے دیوار پر لگی ہیں۔ میں نے ان کو فریم نہیں کروایا۔ بس یونہی لگائیں۔ تھوڑی دیر سے آویزاں کر دیا ہے۔

اور امی! آپ نے یہ کیا کیا کہ فادر کو سو روپے اور دے دیئے۔ میرے پاس تو بہت سی رقم جمع ہو گئی ہے۔ اب تو مجھے پتہ ہے کہ آپ کو عید پر کچھ بھیجا کروں۔ الٹا آپ مجھے دینے جا رہی ہیں۔ سچ مجھے اس وقت روپے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب پڑی تھی میں نے آپ سے آپ مانگ لیا تھا۔ خدا کے لیے مجھے شرمسار نہ کیجیے۔ واقعی میں کسی جوگا میں ملائی کی سماجی کی کوئی خدمت کر گا۔

اور نہ ہی..... اور امی بھلا! کا کی اداس کیوں ہے۔ ایسا تو نہیں چاہیے۔ میں یہاں بالکل اکیلا ہوں۔ نہ کسی سے میل جول ہے۔ سفارت خانہ کا رخ میں نہیں کرتا۔ یہاں کے لوگوں سے باری میں نے نہیں لگائی۔ اس پر بھی میں اداس نہیں تو ہوں۔ میں براتی ہے۔ یوں کیوں ہے۔ اس کو آپ ایسا ہی محبت بھرا خط لکھیں جیسا کہ مجھے لکھا ہے کہ وہ خوش ہو جائے گی۔ آپ مجھے کا کی اور کا کا سے بڑا ہی پیار ہے۔ شاید آپ دل میں کہیں اور جیسا کہ شرارت سے آپ کی آنکھیں چمکا کرتی ہیں۔ میں چمکا کر کہیں کہ شاید کا کی سے زیادہ۔ لیکن نہیں امی (اور اب مجھے پھر تھوڑی سی ہنسی آرہی ہے) دونوں سے ایک مجھے کب کو پتہ ہے کا کا جس نے کبھی کسی بڑے سے بڑے سے بھی تو نہیں کہلوا یا میری ایسی ایسی جھڑکیاں برداشت کرتا رہا ہے۔ میں نے باباجی کی بھی نہیں کہیں۔

وہ اتنا اچھا بھائی ہے کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ آپ سے ناراض نہیں۔ اپنی خالہؤں سے ناخوش نہیں ہوا۔ میں کو تو بس ماضی میں کھوئے ہوئے وقت کا احساس ستا تا رہتا ہے اور اس کا علاج نہ میرے پاس ہے نہ آپ کے پاس۔ خود اس کے پاس۔ آپ کی زمین میں کاشت کرنے سے لے کر ہوائی جہاز کی اڑان تک اگر اس کو ایک مقام پر لگائیں۔ ہو گئی تو وہ دنیا کا Normal ترین انسان بن جائے گا۔ آپ بس دعا کیا کیجیے۔

آفتاب بھائی کا خط مجھے نہیں ملا حالانکہ وہ ہر ہفتہ لکھ دیا کرتے تھے۔ شاید اب کے میرے خط میں کچھ بات ہی لکھی جس نے ان کو سراسیمہ کر دیا ہوگا۔ پتہ نہیں انہوں نے جواب کیوں نہیں دیا۔

آپ ریڈیو روما کو ریکارڈ ہرگز نہ بھیجیں اور اگر آپ واقعی کلچرل تعلقات اچھے کرنا چاہتی ہیں اور میری اور اپنے لیے کچھ سہولت چاہتی ہیں تو Legation of Italia کو کراچی خط لکھ کر پوچھیے کہ آیا وہ آپ کے ریکارڈوں کا تحفہ Diplomatic تحیلے میں ڈال کر ریڈیو روما بھجوادیں گے۔ ان کو بس اسی قدر لکھیے کہ میں ریڈیو روما کے پاکستانی پریگرام کو سننا پسند کرتی ہوں۔ اس لیے یہ تحفہ بھجوا رہی ہوں۔

اور امی میری پیاری امی! جب مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی میں خود مانگ لوں گا۔ آپ تو بس حد کر رہی ہیں!

اب ختم کرتا ہوں۔ میری کمر اور سر میں بلا کا درد ہو رہا ہے کیونکہ دفتر سے ریڈیو اور ریڈیو سے یونیورسٹی بارش میں اور گھومتا رہا۔ ایک تو موٹر سائیکل بھسکنے کا خطرہ اس پر آنکھیں بند کرنے والی بوچھاڑ اور بستر میں لیٹوں گا۔ لگتی تھی۔ گا۔ اس وقت آپ کا بھیجا ہوا سوئیٹر پہن رکھا ہے لیکن تھوڑی تھوڑی سردی لگ رہی ہے۔ ہاں سچ امی! کیا یہ بات گلہ ملتان میں لوچنے لگی ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔

ایک بات اور سنئے۔ یورپ میں اپنی امی اپنے امی اور بھائی بہنوں (یعنی سب رشتہ داروں) کو "ٹو" کہتا جاتا ہے۔ مجھے یورپ کی بس ایک یہی بات پسند آئی ہے۔ اگر میں آپ کو اسی طرح مخاطب کیا کروں تو آپ کو کونسا لگے گا؟

اچھا امی! جب تیرا جواب آئے گا تو اور بھی باتیں لکھوں گا۔

تمہارا چھوٹا  
شو

Via Catome 16

Roma

25 اپریل 1954ء

میری پیاری امی!

ایک مدت کے بعد آپ کا خط ملا اور وہ بھی اس وقت جب میں روما میں نہیں تھا اور اباجی کے کام سے باہر ہوا تھا۔ مجھے آپ کا خط پا کر اس قدر خوشی ہوئی کہ ملتان آنے کو جی لپکانے لگا۔ آپ کے خط میں ایک فقرہ پڑھ کر میں رہ گیا کہ آپ کے کھیت میں سبزیاں اُگ آئی ہیں اور خربوزے پک گئے ہیں۔ خربوزے تو گرمیوں میں پکا کرتے کونسی زیت خربوزوں کی پاکستان میں چل نکلی ہے۔

میں اس وقت کسبل میں لیٹا ہوا یہ خط تحریر کر رہا ہوں۔ یہاں سخت سردی پڑ رہی ہے اور میرے ہاتھ جھونکے ہوئے جارہے ہیں۔ جب میں میلان گیا تھا تو اپنا اور کوٹ اس لیے ساتھ نہ لے گیا کہ اب تو گرمیاں آگئی ہیں۔ چھوٹا وہاں پہنچا سرد ہوا میں چل رہی تھیں۔ میں اپنے ہوٹل میں انگلیٹھی کے سامنے بیٹھا ایک ناول پڑھتا رہا۔

اگلے دن کام سے باہر نکلا تو پہلے بارش شروع ہوگئی۔ اس کے بعد بر فباری نے گھیر لیا۔ میرے سینے میں سخت شروع ہو گیا۔ جس فرم سے مجھے کام تھا، انہوں نے مجھے ٹیکسی میں ڈال کر ہوٹل پہنچا دیا۔ اس ایک دن میں کوئی بڑا ٹھنڈا آدمی بوتل حلق سے نیچے اتری۔ گلاسوج گیا مگر سردی دور نہ ہوئی۔

میں نے آپ کو بہت یاد کیا اور سب لوگوں سے جی ہی جی میں اپنی خطاؤں کی معافی مانگی لیکن اگلے دن آنکھ تو میں بدستور زندہ تھا۔

کاکا نے اتنا اچھا موٹا سوئیٹر بھیجا تھا، میں وہ بھی ساتھ نہ لے گیا۔ مجھ سے بے وقوف صاحبزادے پیدا ہوئے اب بند ہو گئے ہیں۔ آپ ذرا میری قدر کیجیے۔ لوگ کہتے ہیں ایسا موسم نہ یورپ میں پہلے دیکھا تھا اور نہ اس کی اُمید تھی۔

میں چلا تھا مگر بیچ گیا۔ کام پورا کر کے واپس روم آیا ہوں۔ اب تو مجھے آپ کی اور ابا جان کی طرف سے

میرے بیڈ روم کے محکمہ موسم نے بتایا ہے کہ کل سورج نکلے گا۔ سو اس امید میں خوش بیٹھا ہوں اور گیت گارہا ہوں۔  
میرے خرد بتایا ہے اور اس میں دس مرتبہ سورج کا پانچ مرتبہ دھوپ کا ذکر آتا ہے۔ اب یہ خط ختم کر لوں گا تو اس  
مرتبہ خربوزوں کا اضافہ بھی کروں گا۔ مجھے خربوزے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ کے کھیت میں اتنا کام  
کرتا ہوں کہ نمدیدے بچوں اور میری لالچی بیوی کے بہت سے خربوزے ہڑپ کر جانے کے بعد بھی آپ کو کوئی

آپ خدا کے لیے عیدی و عیدی کی فکر نہ کریں۔ میں سچی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ رقم آپ کا کی کو دے دیں۔ مجھے  
اور وہ بار بار اس کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے نو آنے لے کر سٹریٹ کی ڈبیا خریدی  
مرتبہ کہہ چکی ہے "اشفاق صاحب ہے تو شرم کی بات اور مجھے بار بار تقاضا نہ کرنا چاہیے مگر آپ کو میرے نو آنے  
میرا ایک مرتبہ امی اجب میں نے چڑ کر کہہ دیا تھا کہ جائیں نہیں دیتا۔ اس لیے کہ میرے پاس نہیں ہیں تو اس  
میرے سر پر پٹکھی ماری تھی۔ اس لیے ناکہ میں شریف آدمی ہوں اور آگے سے بولتا نہیں ہوں۔ اگر  
میں وقت ملے تو ذرا سختی سے اس سے پوچھیں کہ اس نے ایسی حرکت کیوں کی تھی۔

تو سائتریلی سے میری لڑائی ہو گئی ہے اور میں اس سے بولتا نہیں ہوں۔ اس لیے آپ ہرگز ہرگز اس کے  
سب سے نہ ملیں اور نہ عیدی و عیدی ہی کی درخواست کریں۔ یہ میری التجا ہے۔ سائتریلی ایسے برے عیسائی ہیں کہ  
میں کو پسند نہیں کریں گے۔ مجھ سے چکار چکار کر کام لیتے رہے اور جب ایک دن میں نے ان سے کام کرنے کو  
میں نے انہیں خوب خوب برا بھلا کہا۔ (جس کا مجھے بعد میں افسوس بھی ہوا) اب میں ان سے  
وہ دفتر کے سب لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ اشفاق کی مجھ سے صلح کرادو لیکن میں کسی سے دیتا نہیں ہوں  
مجھ سے دبتے بھی ہیں۔ امید ہے اب آپ پر بات کھل گئی ہوگی۔

ٹوٹو یہاں آئی تھی اور ڈھائی دن رہ کر چلی گئی۔ لندن سے ان کا ایک گروپ اطالیہ کی سیر کرنے آیا تھا۔ اس میں  
میں نے چھٹی لڑکیاں اور احمق سے لڑکے تھے۔ ٹوٹو کی میں کچھ بھی خاطر مدارات نہ کر سکا۔ دو دن کے بعد میری موٹر  
میں نے کیا ہوا کہ سٹارٹ نہ ہوتی تھی۔ ہارش زوروں پر تھی اور مجھے اس کے ساتھ بس یا ٹرام میں جانا پڑا۔ ٹوٹو تو چلی گئی  
میں نے لوگوں نے میری زندگی آفت میں ڈال رکھی ہے۔

کبھی پوچھتے ہیں وہ حسین لڑکی پھر کب آئے گی؟ اس مشرقی حسن کی دیوی کا پتہ کیا ہے؟ میرے بہت سے  
کے لیے مسلمان تک ہونے کو تیار ہیں۔ ٹوٹو کو اس کے حسن کے Compliments جس قدر روم میں ملے ہیں  
تھے۔ وہ خود حیران ہو کر روم کے حسن کو دیکھتی تھی اور لوگ اس پر دیوانہ ہوئے جاتے تھے۔ اس ڈھائی  
میں ایک مرتبہ جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی میری اور ٹوٹو کی لڑائی بھی ہو گئی۔

وہ کہہ رہی تھی آپنی ملک نے تم کو خط لکھا ہے اور تم نے جواب نہیں دیا اور میں عرض کر رہا تھا کہ ملک نے

مجھے نہیں لکھا۔ پتہ نہیں ہم میں سے کون سچا تھا لیکن بات یہاں ختم ہوئی کہ مجھے ٹوٹو کے منہ سے ”سبھی مردوے ہیں“ سننا پڑا۔ میری وجہ سے بچاری ساری مردوے کی بے عزتی ہوئی۔ اس کے لیے میں مردوں کے سامنے شرمندہ رہوں گا۔

آپ حلوہ وغیرہ بھیجنے کی فکر نہ کریں۔ ہاں اگر آم مروانہ کر سکیں تو کمال ہو جائے بلکہ یہ تو ضرور ہی بھیجنے کا۔ جن لوگوں نے اُن کا مزا چکھا ہے۔ انہوں نے دوسروں کی (جنہوں نے نہیں چکھا) زندگی حرام کر رکھی ہے۔ میں آپ کو بھیجنے ہوئے آموں سے ایک پھانک بھی نہ کھاؤں گا۔ یہ اٹالوی لوگ کھائیں گے تو خوش ہوں گے۔

یہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ڈاکٹر ولونیکا صاحب (ہمارے مسلمان بھائی) کو ان کا حصہ ضرور دیا جائے گا۔ اُن کا حصہ پہلے۔ اگر یہاں ہوائی اڈے پر پہنچ گئے تو میں نیٹ لوں گا۔

پرسوں آپ کے خط کے ساتھ حکومت اطالیہ کا خط بھی ملا کہ اکتوبر میں آپ کا معاہدہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر معاہدہ کرنے کی مہربانی فرمائیے گا۔ اب کی بار حکومت کچھ اس قدر خوش ہوئی ہے کہ ایک سال کے بجائے پانچ سال کا معاہدے کی بات کر رہی ہے۔ میں چپ ہوں اور اس خط کو گول کر رہا ہوں۔

اگر کا کی کو یہ خبر سنائی جائے تو وہ قتل کر دے۔ واقعی اس کے ساتھ نو مہینے کا وعدہ تھا اور میں دو سال یہاں گیا۔ یہاں نہ کچھ کھو یا نہ پایا۔ بس اپنے ڈھرے پر زندگی چلتی رہی۔ پہلے ہاتھ سے روٹی کھاتا تھا اب کانٹے سے ہوں۔ پہلے لوٹا لے کر غسل خانے جاتا تھا، اب خالی ہاتھ سیٹی بجاتا جاتا ہوں اور خالی ہاتھ ہی واپس آتا ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ آتی مرتبہ سیٹی نہیں بجتی کیونکہ طبیعت ذرا پریشان ہی ہوتی ہے۔

سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہوتی ہے کہ ان دو سالوں میں ایک بھی یورپی ٹرکی سے عشق نہیں کر سکا۔ اول بڑی محبت سے ملیں لیکن جب میرے دلچسپ دیکھے تو واپس لوٹ گئیں۔ پاکستان واپس آنے سے پہلے کم از کم ایک اور حسینہ سے خطرناک طور پر محبت کرنی چاہتا ہوں لیکن ڈر ہے کہ ہونہ سکنے گی۔

اگر میں یورپ سے ایسا ہی آلو کا آلوٹ گیا تو میرے کالج میں شاف روم میں سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ آج سے چار مہینے پہلے تک میرے ساتھی پروفیسروں پر میرا اچھا اثر تھا کیونکہ میں نے انہیں لکھا تھا کہ زیادتی کا قائل نہیں ہوں۔ بس دن میں دو بوتل شراب پیتا ہوں اور ایک لڑکی بغل میں رکھتا ہوں۔ وہ خوش تھے کہ چلو بہت نہ سہی اتنا ہی کافی ہے لیکن چار مہینے پہلے پنجاب یونیورسٹی کا ایک کجخت یہاں آدھکا۔ اس نے جو مجھے دیکھا تو ایک تفصیلی خط دوستوں کو لکھ کر پاکستان سے بھی گیا گزرا ہو گیا ہے۔ اب سب لوگ مجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ چنانچہ میں ایک عدد محبت کرنے پر مجبور گیا ہوں۔ اس لڑکی کے خط اور فونو ساتھ لاؤں گا۔

اثر صاحب کے بارے میں کوئی خبر موصول نہیں ہوئی۔ آپ پھر اپنے دفتر آ گئی ہیں کیا؟ ملک کا کیا حال ہے انہیں میرا سلام کہنا۔

میرا افسانہ ”گڈ ریا“ پتہ نہیں لوگوں کو اتنا آئیوں پسند آیا ہے کہ اب تک ہندوستان اور پاکستان سے خط آ رہے ہیں۔ مجھے افسانے سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ میرے پبلشر نے بڑی محنت سے مجھے اس کا معاوضہ دیا۔

کیا آپ مجھے جواب دیں گی؟

صرف آپ کا  
شکو

C/o Zubey Artist

Post Box 509

Lahore

24 نومبر 1951ء

ایمی اسلام مسنون۔

ابھی چند لمحوں کی بات ہے۔ میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ صادق آیا اور یہ خط مجھے دے گیا۔ اس نے کہا کہ  
جس جاسکا اور نہ بی بی جی کا یہ خط ہی مکتوب الیہ کو پہنچا سکا۔ آپ وہاں تو جائیں گے ہی۔ یہ خط لے لیجئے! میں نے  
وقت تو خط لے لیا لیکن بعد میں خیال آیا کہ میں تو کینٹن پارک نہیں جا رہا ہوں..... بہر کیف خط ارسال خدمت ہے  
میں کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔

ایک کارڈ بھی روانہ کر رہا ہوں۔ یہ آپ خود پڑھ کر کاکی کو سنا دیجیے۔ اس نے تو مرزا والے خط کا برا مان کر سب  
خراب کر دی تھی۔ اب اگر میں اس کارڈ پر رنجیدگی کا اظہار کروں تو کس مان پر؟  
رات بلیک آؤٹ ہوا۔ بڑا مزا آیا۔ میں اپنے چوہارے کی تکی چنگ سے جلاتا۔ بیٹیاں بچے لگتیں۔ ابا جی  
بیٹے اور مجھے بڑا لطف آتا۔ لڑائی کا انتظار کر رہا ہوں اور بڑی شدت سے کر رہا ہوں۔ پھر بہت مزا آئے گا۔  
بچوں کو پیار۔

والسلام

احقر

شکو

1- مزنگ روڈ

لاہور

23 مئی 1951ء (11 بجے صبح)

کاکی! سلام مسنون۔ میں نے آج سیالکوٹ ایک اور تار دے دیا ہے کہ 24 ماہ حال سے پہلے نہیں  
تار سکتے۔ جوشاید میں نے اچھا ہی کیا۔ اس طرح میں کل صبح سنٹر پر شفقت کے لیے دعائے خیر کہنے جا سکوں گا۔ نوکری  
تھی جی رہتی ہے لیکن ایسا موقع کم ہی ہاتھ آتا ہے۔ خدا کرے وہ پاس ہو جائے اور دنیوی اور اخروی نعمتوں  
سے نابل ہو۔

امی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ ان کا مفصل حال مجھے کل بتانا۔ مجھے بڑا ہی افسوس ہے کہ مجھے بیمار پر کسی کے نہیں آتے۔ خدا گواہ ہے کہ کسی صاحبِ فراش کو دیکھ کر مجھے اس سے بڑی محبت ہو جاتی ہے لیکن ایک عجیب قسم کی محبت باتیں نہیں کرنے دیتی۔ مجھے پتہ نہیں لگتا کہ میں کیا کروں اور اس سے کیا پوچھوں! لیکن میرا جی چاہتا رہتا ہے کہ وہ بیمار ہو جائے اور پھر کبھی بیمار نہ ہو۔ امی کو میری اس فطرت سے مطلع نہ کرنا درنہ ان پر میری سپاٹ فرودیت کی ایک اور گتہ اُجاگر ہو جائے گی۔

کل میرا چکور بھائی جان کی مسہری کی لالچی کرنے سے لنگڑا ہو گیا۔ ٹھیک طرح سے چل پھر نہیں سکتا میرے پاس کوئی دوائی نہیں ہوتی۔ میں نے اس کی ٹانگ پر بالوں کو لگانے والا تیل لگا دیا ہے۔ دعا کرنا کہ پھر فٹ پھرتے ہنستے بولتے دیکھوں۔ میرے لیے تو یہ صاف شکن ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے علاقے میں اس قدر گرمی پڑتی ہے کہ اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ آج اخبار میں پڑھا کہ سکھر میں آدنی گرمی سے ہلاک ہو گئے۔ پتہ نہیں بیچارے قیدیوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی جنہیں شام کے سات بجے ہی بارگاہ بند کر دیا جاتا ہے۔

اسحاق بھائی آج صبح کراچی روانہ ہو گئے ہیں اور وہ ایک ہفتہ تک لندن پہنچ جائیں گے۔ میں ریکھا پر تھوڑا بہت یقین رکھتا تھا۔ اب ہتھیلی کے ان سپنولیوں پر ایمان لے آیا ہوں۔ واقعی ہر کام اُس کی سے ہوتا ہے۔  
سب کو سلام۔

والسلام  
دعا گو  
شکو

17 اگست 1952ء

ابھی تمہارا تار ملا۔ مبارکباد کا شکر یہ لیکن دیکھ لو پیارے زندگی کا ایک اور سال گھٹ گیا۔ ہے نا افسوس کی بات کتاب کے حقوق ابھی تک فروخت نہیں کیے تھے کہ تمہارا تار ملا اور میں رُک گیا۔ تار میں لکھا ہے کہ پانچ روپے کا بندوبست ہو گیا۔ اس کا مطلب کیا؟

کیا سچ سچ کے پانچ ہزار روپے یا لائری، معصے کی رقم؟

کل کا دن مجھا اور صاحب کی حضوری میں گزرا۔ صاحب کی صحت دن بدن ٹھیک ہو رہی ہے۔ میں ان سے بہت زیادہ سونے لگا ہوں یعنی شام آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک۔ تم آؤ گے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر پھر ویسی محنت شروع کر دیں گے۔

لاہور میں بارشیں بدستور ہو رہی ہیں لیکن تمہارے بغیر لطف نہیں۔

یونیورسٹی سے ابھی تک رقم نہیں ملی۔

جب بھی ملے گی ویسی کی ویسی رہے گی۔  
 آؤ کی ٹکیوں اور آکس کریم کی بالٹیوں پر خرچ نہ ہوگی۔  
 سب کو سلام۔

تمہارا  
 شوق

(ریزی کے نام)

بیارے پرویز!

اور سناؤ تم نے کراچی یونیورسٹی کا Crescent بنا یا تھا اُس کی رقم ملی یا نہیں۔ تم بھی بس سو گئے ہو گے۔ یا اس  
 کے منظور ہو جانے سے مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ پاگل ہو گیا۔

میں زندگی سے پہلے ہی تنگ تھا۔ یہ کار لے کر اور بھی دکھی ہو گیا ہوں۔ سالے سالے روم میں گھومتے رہو۔  
 (Parking) کی جگہ نہیں ملتی۔ کسی بھی جگہ کھڑی کرو، حرام زادے سپاہی سیٹیاں بجانے لگ جاتے ہیں۔ کبھی تو میرا  
 ہے سالی کو آگ لگا کر بھاگ جاؤں۔ بھلا میرے جیسے شریف آدمی کو پارکنگ کی ہر جگہ اجازت کیوں نہیں دیتے؟  
 یہاں کے سپاہی ایسے آلو کے پٹھے ہیں کہ چائے کافی کی رشوت بھی نہیں مانتے۔ بس کاپی نکال کر مر پر کھڑے  
 ہیں۔ اگر سیدھے شریف آدمیوں کی طرح سڑکوں پر گھومتے رہو تو بھی روک لیتے ہیں اور بربک دبو کر دیکھتے ہیں  
 کہ کیا ملتی ہے یا نہیں۔ یہ بھی اٹلا ملک ہے کہ اگلی بتی جلے نہ جلے پچھلی ضرور جلے۔

میں سڑکوں پر اتنی ہوتی ہے کہ میں تو رام نام لے کر چلتا ہوں۔ اگر کسی گزرنے والے کے کوٹ سے موٹر لگ  
 جائے تو سچا س روپے ہر جانہ لیتا ہے کہ مجھے خوفزدہ کیا۔ اس سالے سے کوئی پوچھے کہ ہمارے یہاں تو کوئی موٹر کے نیچے  
 لگتی ہے تو بھی اس سے کچھ نہیں لیتے۔ یہاں خوف کھانے کی رقم بھی لے لیتے ہیں۔

کیا تم زوبی صاحب سے کبھی ملے ہو؟ ان کا کیا حال ہے اور وہ کیا کرتے ہیں؟ روما کی لڑکیاں ان کو پسند کرتی  
 تھیں۔ سردی بے عزتی کرتی ہیں کہ تم تو بدھو ہو۔ بس کتاب کا علم جانتے ہو اصلی علم نہیں جانتے۔ ہاں سچ ریزی... نے  
 "لینے کا انعام لیا تھا۔ بس دھکا ہی کیا۔ خدا نے عزت رکھنی ورنہ میرا تو برا.....

بہت تنگ آ گیا ہوں۔ جرمنی کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسری ملتی ہے لیکن وہاں سردی بہت ہے۔ سردی کم  
 کے لیے پیٹ پر چادر ڈال کر سوتا ہوں۔ تم نے بہت بری بری عادتیں سکھادی ہیں۔

چھاب ختم کرتا ہوں۔ دعا کرو کہ کیمبرہ خرید سکوں۔ جب تم کراچی آنا تو اپنے ساتھ سو دو سو روپیہ لے کر آنا۔  
 یہ زوبی دے سکوں۔ نہیں تو میں Tape Recorder سمندر میں پھینک دوں گا۔ یہ Recorder میں نے  
 لیے لیا کہ وہ اچھا نہیں گاتی ہیں۔ ان کی آواز بھر کر ان کو سنائیں گے تو جنابہ قدسیہ چٹھہ کو پتہ چلے گا۔ ہاں سچ  
 تھی۔ ریڈیو پر میں نے اُس کے ساتھ انٹرویو کیا۔ مگر بھائی! وہ تو ایسی تیزی سے بولی کہ پندرہ منٹ کا سکرپٹ  
 ختم کرنے لگی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے مصیبت ٹالی۔ اب بتاؤ ہم ان لڑکیوں کو کیسے سمجھائیں۔



یہاں ایک ہندو لڑکی ایک دن کے لیے آئی تھی۔ اس سے مجھے عشق ہو گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ ایک امریکہ چلی گئی۔ وہاں سے اُس نے خط لکھا تو میں موٹرسائیکل سے گر کر بستر پر لیٹا تھا جو اب نہ دے سکا۔ اب پتہ نہیں ہے۔ اس بات کو ایک سال گزر گیا۔ بس یہ آخری عشق تھا۔ روم میں سب حرامزادی لڑکیوں نے میرا نام پادری صاحب دیا ہے۔ جب میرا بیٹا ہوگا تو میں اُس کو کھلی چھٹی دے کر روم بھیجوں گا۔

اچھا بھئی اب میں ذرا سا پیشا کھانے لگا ہوں۔ تمہارا ڈبہ اس کا سارا شیرہ چوس رہا ہے۔ بیدی آپا کا کمر ہے۔ سالے کینے کتے تُو نے بھی کئی گھر برباد کیے ہیں۔ میں آ کر تیرے جوتے لگاؤں گا۔

صرف تمہارا ہمیشہ تمہارا

شکو

ہنٹریزی نے 1952ء میں کراچی یونیورسٹی کا کریسنٹ بنایا تھا۔ آج تک وہی کریسنٹ چل رہا ہے۔

ریزی کے نام (والد کہہ کر مخاطب کرتے تھے)

18 اگست 1952ء

ابھی تمہارا خط ملا اور ابھی میں کچھری جا رہا ہوں۔ 5 ہزار روپیہ بھلا میرے کس کام آئے گا۔ مائی ڈیر وائٹس صرف ایک ہزار کی ضرورت تھی، سول گیا۔ تم اگر مجھے شاپنگ کروا دو اور اگر ہو سکے تو ایک عدد Slight Weight کیس لے دو۔

کھلونوں کا کام شروع کرو اور جب تمہارے پاس بارہ ہزار روپے ہو جائیں تو مجھے اطلاع دو۔

Senes کو تو میں روم سے بھجوا دوں گا۔ اس کے علاوہ گراموفون مشین کے پارے میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔

روم میں میں ریکارڈنگ کرا کر بھیجتا ہوں گا۔

شاید ہمارے اچھے دن قریب آ رہے ہیں۔ (صرف مالی لحاظ سے ذہنی لحاظ سے نہیں۔)

اچھا کچھری جاتا ہوں۔ اس کے بعد اثر صاحب سے ملنا ہے۔

تمہارا

بڑا والد

سارخ سارخ

Dear Maka,

If the 3rd of next month I have Lahore for Multan (By mail) would it

you? Which station you suggest? Cantt. or City?

Your Shukko

27-5-1952

Lahore

26-5-1952

Dear Idiot,

Some three days before I wrote you a detailed letter having every detail of my doings in your absence. It was placed in the dictionary for so intactness. But instead of steadiness it gave much to elopement and was kidnapped. Who removed it I do not know. When wish removed? I can say at the dead of night when as he came to my house borrowed the book, took it to home and did what even he likes.

Anyway, dear idiot, I am well and happy and me serious very about Yousaf sahib date 7. I can easily smell a rat in every happening. here I smell about two dozen of rates. He is a genuine man and can help.

To-day I will start brewing at home (24-Canal Park), don't worry. When are you coming back, I am trying to know "her" responsibilities and duties? If so, I may come to you. Let me know you are progressive. Should I come on 3-6-52?

I am keeping fast and rumbling wet cloth on my legs. All the nerves (which are concerned with writing) have refused to work. Kindly excuse me for this small letter and its telegraphic language.

Your's B. Wala

Shukko

Lahore

15-5-1952

Dear Bho Wala,

Drawing is too hard.

Thank you.

Do not write any letter to.....

For God's sake don't

Don't!

Don't!!

Don't!!!

Detailed letter with your portrait, Tomorrow!

Shukko

Lahore

17-5-1952

Dear Razeer,

You must have received my last day's letter. Here I send you your portrait. Is this the thing you required? How I managed to get it, is a long story which you may hear from Qudsia.

You have taken great pains in delineating the drawing. I have shown it to the publisher and it has been forwarded to block maker who was much pleased to see it and was compelled to praise the craft of the artist who has done it with great skill for good results of 1/2 fore block.

Dear one! Don't write any letter to bitter things are tasted once and left to others to taste it for experience. You are experienced enough and need not repeat the path you had been traveling for some time off the trash you went. Nobody saw you going astray and could not help. Do you still dare to write a letter at the cost of your regulation? Every goal seeks certain pack of dramatic movements in the man in whose favor it is going to be jelled. We do most of the required movements. Let us credit them first in the ledger of courage and then proceed. If once you go bankrupt no money can drain your disintegrated and ruptured honour. Think! And DO NOT write.

On the seventh of this month I reached there before time. Waited for him about two hours. Puffed half of the Capstain's packets contents. Backed up and down the canal for about 135 times. He did not turn up. Never sent a message. I think he must have been occupied. Must have gone some where. He is dead. If he still lives, I am sure he would come again. He would see us, help us and help us. We the sons of humble parents!

Go on working. Anything may come out of labour. Any moment  
red iron may appear. We may wake. Hit it and sleep again. And this  
will never be disturbed. She who hit iron will protect our sleep. But the  
condition is to work and work. Bundle of kisses sweet, sour, bitter,  
and pungent assorted kisses in large packing.

Your

Shukla

Idiot

29-5-1952

Dear Idiot

1. Should I come on 3-6-52?
2. Where should I get down?
3. Where is your home situated?
4. And, if I am not granted to the required LEAVE will

excuse me.

Rigge Idiot

Shukla

To reduce material desires doesn't always  
Brings peace to mind. In order to live in peace.  
Spiritual desires must also be reduced

(Kappa, Akutagawa)

ALONE

Thy young son

Eating his lunch, heard a plane go overhead, and put down his  
Remarking, the pilot does not know I am eating a egg. He smell shocked  
as if he had never known nor suspected he was locked in, from the beginning  
alone.

Buried alive in a body not my own the work apish, the feet a

nds a woman's out of work.

The eyes as enemy's the teeth a dog's

The lips politic, the tongue a traitor's

The legs ill at ease, the ears not matched

the venal severed, the groin itchy.

The slain sun learned by day, goose fleshed at night.

The lungs drawing with air, the brain groggy

Buried alive in a body not my own.

(T.S.Mathews)

No one gives you a black eye,

You have to fight for it

The height of laziness

Is getting somebody else

To do you ours sting

Is a man

With a transplanted ticker

Living on borrowed time?

Modern technology

Owes ecology

An apology

Some have greatness thrust upon them

Others get is otherwise

Why the hell was mine all scattered

Round my waist and hips and thighs?

Over and above everything else

Jeremy was in love with himself

But he did not get on then

Why am I here

(When half me's asleep  
 And the other's sill in bed)  
 Making the coffee  
 With tea bags.  
 I don't need you for testing  
 I have enough trouble with my own thoughts  
 The solution  
 To pollution  
 Is hold you breathe?  
 until your death  
 Is I  
 See on my back and cry  
 Tears collect in my ears  
 I am  
 Completely, hopelessly, madly  
 Passionately, deeply, confusingly,  
 Totally, absolutely, felly,  
 Wholly, knowingly, desperately  
 In love  
 With you  
 I think.  
 Nostalgia's all right  
 But it's not it was

خاں صاحب کی رنگارنگ زندگی، اُن کی تخلیقی قوتوں کی نیرنگی، اُن کے سفر و سفر، مختلف طبقات میں تعلقات کی  
 سوج بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہ سارا تنوع ایک طرح سے تلاش کا سفر تھا۔ یوں تو ہر انسان  
 کو تلاش کرنے کے درپے ہے لیکن اُن کی کہانیاں، ڈرامے، زندگی سب اس بات کے مظہر ہیں کہ ساری عمر وہ کسی  
 شے کو تلاش کرتے رہے۔

پتہ نہیں یہ اشرف المخلوقات کا نصیب ہے کہ وہ کھوئی ہوئی جنت اس دنیا میں ڈھونڈتا ہے یا چھپے کی یاد اُسے جینے

نہیں دیتی۔ شاید یہی بے نام بے قراری خاں صاحب کا مقدر تھی اور وہ ساری عمر گم گشتہ جنت کی تلاش میں رہے۔  
 کا اصل مقصد جاننا چاہتے تھے۔ انسان کس لیے تخلیق کیا گیا ہے؟ اُس کی زندگی کیا کسی خاص مصرف کے لیے ہے؟  
 اُن کے لیے شاید یہ سمجھنا کاردار تھا کہ مادی زندگی کا حصول اور روحانی سفر میں مطابقت کیسے کی جائے۔  
 ایسے فارمولے کی تلاش میں تھے جس کی مدد سے وہ زندگی کی ٹرین کو ان دونوں پٹریوں پر توازن کے ساتھ چلا سکیں۔  
 جو لوگ ان کی کہانیوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کی پہلی کہانیوں میں ”رنگ رلیاں“ ”حوش“

مظہر ہیں اور جو آخر آخریں ”من چلے کا سودا“ ”زاویہ“ ”صبحانے افسانے“ میں بدل گئی۔

بہر کیف ذاتی زندگی میں جب جہلم، پنڈی، اسلام آباد، تراز، کھیل کے چھوٹے چھوٹے سفرنا کانی ثابت  
 اور اُن کے اندر کی کیفیت یا تضاد کسی طور پر چل نہ ہوا تو انہوں نے ایک لمبی اُڑان کی ٹھانی۔ زوبی ریڈیو روم سے  
 چکے تھے۔ سید عابد علی عابد نے خاں صاحب کو چھٹی دے دی۔

ISMEO سے پیئر سانٹریلی کا Appointment Letter آ گیا۔ سب کوائف پورے ہوئے۔  
 شفقت کا مجھ سے بڑا دوستانہ تھا۔ وہ میرے پاس 24- ایس کینال پارک آتی رہتی تھی۔ کالج کی مشور  
 ہمارا کافی وقت لے لیتیں۔ شفقت میں عجیب خود اعتمادی تھی۔ انارکلی کے باہر وہ کسی چوبارے میں رہتی تھی۔ میرے  
 یہ عالم تھا کہ کبھی اُس کے گھرا کیلی نہ جا سکی اور وہ تھی کہ اگر چاند کے سفر پر بھی اُسے جانا ہوتا اور پیراشوٹ سے چھوٹنا  
 ہوتی تو وہ لمحے بھر کونہ سوچتی۔

زوبی جب اٹلی جانے والے تھے تو خاں صاحب زوبی کو میرے پاس ایک بار لے آئے۔ پھر خاں صاحب  
 بھاگنے کے لیے اشارہ ہی کافی تھا۔ وہ زوبی صاحب کو روم کے لیے الوداع کہنے کراچی تک گئے۔ حسن اتفاق  
 زندگی میں جو سب سے لمبا خط ملا وہ کراچی سے ہی لکھا گیا تھا۔

آپ اندازہ لگا لیجیے کیسے اشفاق صاحب وقت کو ساکت کرنے کا فن جانتے تھے۔ سمندر کی متلاطم  
 دیکھتے ہوئے ساحلی ریت کو کاغذ پر سے جھاڑتے ہوئے اس خط کو پوسٹ کرتے وقت پتہ نہیں انہوں نے کتنی  
 ہوگا..... پوسٹ کروں..... یا پھاڑ دوں؟

پھر وقت گزر گیا۔ زوبی اپنا وقت پورا کر کے لوٹ آیا تو اشفاق صاحب بھی ایک اور نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔  
 علم ہو گیا تھا کہ چھوٹے چھوٹے رابطے اور چھوٹے سفر سب پر کار ہیں۔ 1- مزنگ روڈ سے 24- ایس کینال  
 کی گردش بے ثمر۔

دیال سنگھ کالج کی پروفیسری نے انہیں دو ایک منظور نظر قسم کی لڑکیوں سے ضرور متعارف کر دیا تھا لیکن یہ  
 بھی بے سود اُن کا وقت ضائع کر رہی تھیں۔ وہ کسی ایک سڑک پر، کسی ایک مسلک کے ساتھ، کسی ایک مصرف کا ہو کر  
 گزارنا چاہتے تھے۔

اسی لیے انہوں نے ایک لمبی اُڑان کا سوچا۔ 1952ء میں انہوں نے روم ہجرت کرنے کی ٹھانی۔  
 دوست زوبی روم ریڈیو پروگرام کر رہے تھے۔ اُن کی واپسی پر یہ جگہ خالی تھی اور خاں صاحب کو قومی امید تھی کہ انہیں

دوسروں کی نوکری مل جائے گی۔ اس وقت وہ دیال سنگھ کالج میں پروفیسر تھے۔ سید عابد علی عابد ان دنوں پینٹنگ تھے۔ سید عابد علی عابد کے پاس پہنچے۔

”کیوں بھائی چھٹی کیوں چاہتے ہو؟“

”مجھے روم جانا ہے سر۔“

”بھائی احمق نہ بنو۔ کیا وہاں سے نوکری کنفرم ہو جاتی ہے؟“

”جی یہ دیکھیے یہ پیئر سائنٹرلی کا خط ہے۔“

اکتوبر کا مہینہ تھا نہ سردی تھی نہ گرمی۔ میں اگر اپنے لیے افسردہ اور اس تھی تو مجھے اتنی خوشی ضرور حاصل تھی کہ مجھے یہ خبر ملے کہ سید عابد علی عابد نے اپنا آخری چھوڑنے پر پوری طرح کار بند ہو چکے تھے۔ باقی خیر کسی سے مشورہ کیے بغیر کسی اظہار میں جائے بنا نہیں تھے ایک مثبت فیصلہ تو کر لیا۔

ریزی نے فیصلہ کیا کہ وہ شوقو کو ملتان تک خدا حافظ کہنے جائے گا اور ملتان کے سٹیشن پر اتر کر امی کے پاس چلا جائے گا۔ ریزی، لاہور میں رات کے وقت میاں میر کے سٹیشن پر پہنچے۔ یہ ان دنوں ایک بہت معمولی سا پلیٹ فارم تھا۔ مسافروں کے لیے دو تین بچیں پڑی تھیں۔ ہم اندر پہنچے، گاڑی بروقت آئی۔

چونکہ یہاں گاڑی کا قیام کم ہوتا تھا، اس لیے جھپاک سے ریزی سوار ہو گیا۔ اماں جی اپنے بیٹے شوقو کو کراچی تک نہ جانے جا رہی تھیں۔ شاید اماں نے سوچا ہو کہ کہیں قد سید بھی ساتھ ہمسفر تو نہیں۔ پھر سر جھٹک کر اس خیال سے پیچھا کیا۔

میں صاحب نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ الوداعی کلمات یا خدا حافظ کا والہانہ انداز بھی نہ اپنایا۔ لہجائی قیام کے بعد ایک کھڑکی میں ایک چہرہ نظر آیا۔ سفید ہاتھ اور بازو خدا حافظ کے انداز میں ہلے اور گاڑی چھٹک کر تکی پلیٹ فارم سے نکلی۔ رات کافی جا چکی تھی۔

میاں میر سٹیشن سے کینال پارک اچھا خاصا قافلہ ہے لیکن تب خوف نامی چیز دلوں پر حکمران نہیں تھی۔ سڑکوں پر نہ ٹریفک جھگڑا ہوتا تھا۔ لڑکیاں بخوبی ٹھنڈی روشنیوں میں آ جا سکتی تھیں۔ میں اور لالو آہستہ آہستہ کینال پارک کی طرف چلے گئے۔

ڈراپ سین ہو گیا۔

میرے اندر نہ امید تھی نہ ناامیدی ہی..... بس ایک کھوکھلا پن تھا جس میں بار بار گاڑی کی وصل بھتی تھی اور بجے جاتی تھی۔ ایک بہت بڑا باب ختم ہوا۔





## 450- این، سمن آباد

ہم بچوں کے ارادوں کی عموماً بڑوں کو خبر نہ ہوتی اور جو نہیں وہ کچھ ارادہ کر لیتے ہمارے منصوبے ریت کے جھوڑے جاتے۔

عجیب اتفاق ہے یا اب تک میری سمجھ سے بالاتر بات ہے کہ خالہ نے فیروز پور روڈ کی اقامت چھوڑ کر اپنے بستر اٹھا یا اور 450- این، سمن آباد میں ہمیں ساتھ لے کر چلی گئیں۔ ان کی دو بیٹن و جوہات یہ سمجھ میں آ سکتی ہیں کہ خالہ خوفزدہ تھیں کہ ہمارے ملنے والے خاص کر تقو، ڈیڈی جی اور ریزی بڑی باقاعدگی سے سکول کو اپنا ڈیرہ بنائے ہوئے تھے۔ اس سے رنگ رنگ کی gossip چل نکلنے کا اندیشہ تھا۔ پھر ریزی کالز کیوں کے سکول میں کھپنا مشکل تھا۔ وہ غریب جانے کس طرح سارا دن گزارتا تھا۔

یہ مشکل بھی لائیگی تھی۔ خالہ جب 450- این میں شفٹ کر گئیں تو ان کی مروت سے بعید تھا کہ وہ اپنے بچے کو جھوڑے جاتیں۔ اب ہم دونوں بھی گویا ان کے جہیز میں گئے۔

450- این، سمن آباد کی اس گلی میں آخری مکان تھا۔ اس طرح اسے دو رو یہ پکی سڑک کا فائدہ تھا۔ ایک۔ عین اس کے سامنے تھی اور دوسری سڑک سمن آباد کے چھوٹے بازار کے سامنے سے گزرتی اور آگے مین بازار میں جاتی تھی۔ اس گھر میں ایک بار پھر رنٹیں ہو گئیں۔ مجھے ملنے 1۔ مزنگ روڈ والے کھلم کھلا وقت کی پابندی کو پس پشت ڈال کر آنے لگے۔ گورنمنٹ کالج سے ریزی کا دوست ریاض نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ وہ بھی اب بلاوجہ آنے لگا۔

لیکن تبدیلی ہمارے تعاقب میں تھی۔ یکدم ہمارے ماموں فضل کے دونوں بچے سرفراز اور طلعت جیسے ہم سے گنو بلاتے تھے، لاہور خالہ کے پاس آ گئے۔ سرفراز ان دنوں I.C.S. کی تیاری کے آخری مرحلے میں تھا اور اُس کا سہارا میں رہنا ناگزیر تھا۔ طلعت اپنے ایم۔ ایس۔ سی بائیولوجی کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ان دونوں کے لیے تنہائی کی ضرورت تھی۔ سرفراز اس امتحان میں پاس ہو کر لاہور میں آئی جی پولیس لگ گیا اور طلعت ایم۔ ایس۔ سی کر کے

تین برسوں میں پروفیشن اور کوالٹی کنٹرول میں چلی گئی۔ سال بھر بعد جب سرفراز نے امیر محمد کلاباغ پریکس بنا دیا تو ہر لینڈ  
 سرفراز نے امیر محمد صاحب نے بہت بے عزتی کے بعد سرفراز کو پولیس سے ہی نکلا دیا۔ اب سرفراز پر برے دنوں نے  
 ڈھکی چھپی تھی۔ اتنی جدوجہد کے بعد ناکامی کے باعث وہ شدید Depression میں مبتلا ہو کر عین جوانی میں فوت ہو گیا لیکن یہ  
 تھیں۔

جب 450۔ این میں میرے اور ریزی کی وجہ سے گہما گہمی تھی۔ اشتیاق کی پوسٹنگ باہر ہو چکی تھی۔ وہ جب بھی  
 آتا تو ایک آدھ دن ہمارے پاس گزارتا۔ ایسے میں کبھی کبھی اُسے رات پڑ جاتی اور وہ بھی ہمارے پاس تک جاتا۔ ان  
 کے پاس پلو کے گھروں کی دیواریں اونچی نہ تھیں۔ مین بازار کی طرف جانے والی سڑک کی جانب ایک تین فٹ اونچی  
 دیوار تھی۔ رات کو تقو ریزی کا زرد پاجامہ پہن لیتا جو اُس کے گھٹنوں سے تھوڑا سا نیچے تک پہنچتا۔ ہم دونوں  
 کے ساتھ اس دیوار پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ تقو اپنے شتو بھائی کا دیوانہ تھا۔ اُن کی غیر موجودگی میں گویا وہ مجھ پر اپنی  
 باتیں کرتا رہتا۔ میں تقو پر اس لیے مہربان تھی کہ وہ مجھے 1۔ مزنگ روڈ کی طرف ایک گپت راستہ لگاتا تھا۔

تین پھر جب گو اور سرفراز آ گئے تو تقو بہت جلد گو کا دوست بن گیا لیکن رات کی بھٹیلیں برخاست ہو گئیں۔  
 پتہ نہیں امی کی خودداری تھی یا انہیں گو اور سرفراز کا خیال تھا۔ اب وہ دو ایک پارلمان سے آئیں تو کچھ سوچ  
 ہی لائن میں آگے چل کر ڈاکٹر سعید رہتے تھے۔ جب بھی ہمیں ضرورت پڑتی ہم اُن کے گھر جا کر بلا تکلف فون  
 کر لیتے۔ ایک معمولی سا تھینک یو اور بس! بہت بعد میں جب سعید صاحب کی دونوں بیٹیاں ٹیلی ویژن سے وابستہ  
 ہو گئیں۔ آپ کی ایکٹریس بننے میں خاں صاحب سے بہت مدد ملی۔ پتہ نہیں کونسا نمبر کس وقت استعمال میں آتا ہے  
 کس وقت کس کے ہاتھوں پٹ جاتا ہے۔ یہی دعا رکھنی چاہیے کہ اسے باری تعالیٰ! تو اپنی مخلوق میں مجھے کسی پر آفت  
 نہ فرما اور ہمیں کسی انسان کی بے عزتی کا باعث نہ بنا۔ اُسر آپ اس دعا کو طیرہ حیات بنا لیں تو آپ کو بہت جلد  
 آپ کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہنے لگیں گے جو معاملات میں اسلام کا بنیادی حکم ہے۔

60۔ فیروز پور روڈ سے میں اور ریزی کچھ دیر کے لیے اپنی خالہ فیروزہ کے پاس 450۔ این میں منتقل ہو گئے۔  
 پائی بھر بھی وصول نہ کرتی تھیں اور ان کی آزادی بھی سلب ہوتی تھی۔ شاید میری والدہ کی خودداری نے  
 خالہ سے چند گھر چھوڑ کر قریب ہی 455۔ این خالی تھا۔ اس میں رہائش اختیار کی گئی اور ہم دونوں نے  
 پھر پور یا بستر اٹھایا۔ تین کمروں کا یہ گھر اور باورچی خانہ ہمارے لیے بہت بڑا تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ، اس سے ملحق  
 تھے۔ سامنے صحن اور لیزرین بہت کافی تھے۔ اب اس گھر میں ایک نامور ادیب اے حمید رہتا ہے جس نے اپنے گھر  
 کو سب گھر میں بدل دیا ہے۔ کشمیری چائے، کچے، نان اس گھر کا منہ ماتھا ہیں۔ اے حمید اور ان کی بیگم ریحانہ قمر بانو  
 نے میں مشغول رہتے ہیں یا پھر تواضع ان کا شعار ہے۔

خاں صاحب اطالیہ جا چکے تھے۔ ہم دونوں نہ کام پر لگے تھے نہ قرینہ سے ہمیں زندگی بسر کرنے کا سلیقہ، طریقہ  
 تھی۔ ہمیں زندگی کو بنانے کا ویسے بھی ہماری پود کو خیال تک نہ آتا۔ ہم میں ڈسپلن اور استقامت کی کمی تھی۔ میں نے اپنے  
 راستے کا ایک راستہ نکالا۔ ایک موسیقی کا استاد رکھ لیا۔ مجھے اُن دنوں گانے بجانے، ناچنے کا شوق تھا۔ ماسٹر صاحب

باقاعدگی کے ساتھ آنے لگے۔ میرا سارا وقت اُن کی شاگردی کی نذر ہونے لگا۔

اسی مصروفیت کے باعث ملازمت کی تلاش ہوئی۔ اتفاقاً زینب اور لالو کہیں سے آگئے اور باورچی بننے لگے۔ میں نے لکھنے کا شوق اور ناپنے کی مصروفیت جاری رکھی۔ سارے گاوالا پتے اور تھیا تھیا ناپنے کا مشغول تھا۔ ادھر ریزی بھائی بھی ہمیشہ کی طرح بیکار سر کیس ناپنے کو بڑی مصروفیت سمجھتے تھے۔

دن گزرتے گئے۔ استاد جی آتے رہے۔ میں اپنے ناول پر کام کرتی رہی۔ ایک دن اچانک استاد صاحب سے کہنے لگے۔ ”بی بی ایک بات تم سے کہنی تھی۔“

”جی فرمائیے۔“

”بات یہ ہے کہ میں ادھر شاہی محلے میں بیبیوں کو تعلیم دینے جاتا ہوں۔ وہ میری کبھی اتنی عزت نہیں کرتی تھی۔ آپ نے کی۔“

میں حیرانی سے اُن کا منہ ٹککنے لگی۔ میرے نزدیک تو استاد کا مقام ہی ایسا تھا کہ اُس کی عزت کیے بغیر نہ تھا۔

”آپ کو شاید پتہ نہیں نور جہاں بیگم کو بھی اُس کے استاد کی دعا ہے کہ ترقی کر رہی ہے۔ میں بھی آپ کے ہوں اللہ آپ کو اقبال مند کرے، عروج حاصل ہو۔“

میں نے منہ جھکا کر کچھ شکر یہ کہنے کی کوشش کی۔

”میری ایک فرمائش ہے۔“

میں نے دل میں سوچا، اس تمہیدی اصل وجہ فرمائش تھی..... اب رنگ لائی گلہری!

”بات یہ ہے کہ مجھے یہ سارا علم میرے استاد کدر پیا نے سکھایا ہے۔ جب آپ کسی مقام پر پہنچ جائیں تو فرما کر اُن کا کلام ضرور چھاپ دیں۔ اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔“ ساتھ ہی انہوں نے مجھے کدر پیا کے کلام کے کاغذات پکڑا دیئے بطور نمونہ میں آپ کی خدمت میں ایک صفحہ پیش کرتی ہوں۔

کدر پیا

شھری کھاج

آئی بدریا جھوم کارے کارے

انترہ کہہ پیا پارس رُت آئی

آنگن اندھیاری چھائی

لوچھپ گئے سب ہیں تارے

شھری کھاج

ادچٹ گئی موری نیندریاں سن لی مرلی کی تان

- انتروہ  
 کہہ رکو تہری ٹھمری بجاوت  
 یا نیچی بہت مورے پران  
 ٹھمری تلنگ
- انتروہ  
 اے جی رسیارے دیکھی توری پیت  
 ہم سے بہانا سوتن گھر جانا  
 پانی کدری توری ریت ..... اے جی رسیارے  
 ٹھمری تلنگ
- انتروہ  
 اے میں پیاسوں مان چلی۔ باٹ تکت تھی کب کی کھڑی  
 اپن دن بن کدر کل زہرت ہے  
 دیکھو گسیان نی نی پرت بُری  
 ٹھمری پیلو  
 ارے ری گیاں گئے کدر بدیسا  
 رین دن مورے رہے اندیسا
- انتروہ  
 گھڑی پل چمن موہے کل نہ پرت ہے  
 بنائے سکھی اُن کا سندیسوا  
 ٹھمری تلنگ کا مسود  
 ایسی سندرنار کہیں دیکھی ناہیں
- انتروہ  
 گوری گات پرتک نیں سوتلاہٹ  
 کدر دیکھے پڑت ہے نین کی پرچھا نیں  
 ٹھمری ایمین (سانجھ)
- انتروہ  
 اپنی پتا میں کا سے کہوں اے ترے کارن جو جو کچھ پایا  
 کج دیوتن من دھن اور چھوڑا اپنا پرایا  
 کون کرے تھی ایسی برائی  
 کدر پیا نہیں تہری خطا کچھ  
 مور کہو مورے آگے آیا  
 ٹھمری تلنگ
- انتروہ  
 اری سنولیا کا ہے پیت لگائی!  
 نت رہیں ہیں کدر سوتن سنگ

موسوں کرت چترائی!

ٹھمری بھیرویں

ایک بچہ کھڑا دکھلا جا رہے

بن دیکھے کدر تو رے کلنا پرت ہے

انترہ

بھول جیوں سارا دکھڑا اے..... ایک بچہ

ٹھمری ملتان خیال نما

آج کھوموری لاج گئی سب سیکھن میں! مہاراج

بہس بہس نہ کھڑکھ کدر

انترہ

گروالگا نیو اپنے پرانے میں مہاراج.....

ٹھمری جھنھوٹی

اب تو پوچھتے تھری بات؟

تڑپے اوڑچا ہے دن رات!

کدر بیا اولکا ڈھونڈت ہیں

انترہ

چین تھا جن کے دم کے سات

ٹھمری کافی

برہن زادا بکن لگا ہے

استائی

ہر روز اگر نئی توانی ایماہ زلف

انترہ

گا ہے گا ہے

پوشیدہ اگر کئی زاغیار

در سیر یو من یا ہر ہے

جان کرد فدا یقین نہ داری

تن بیجان شد گوا ہے

راست است کدر ہمیں کہ دائم

ظالم مفر بادشا ہے

ٹھمری شہانہ

بس ہٹو گیوں کی چترائی

کا ہے کدر اب بنتی کرت اے

انترہ

اتنی کر کے ڈھٹائی

کوؤ جتن کے کچھ نہ مانوں

ایہہ تو کہو کہاں رین گنوائی

ٹھمری سند ہڑا

بھٹکت نین رہے سوسورے آلی رے

کدر پیا کو سپنے میں دیکھا

چونک پڑی میں بھور بھئے

ٹھمری بھیرویں

چانگھٹو اپہ ڈھونڈن آئی میں سکھی

موری بندیا گئی رے

بھور بھئی مورے پنیاں بھرت

کدر پیا گرو لگائی

ٹھمری پیلو

پیت لگائی ہم سے چھپا کر..... ہار گئی سمجھا سمجھا کر

آ کھو (آخر) کدر پیا کیو چھل کیو

گیاں اپنے بس میں لا کر

سوتن کے ڈو دکھنا ہیں سنوں گی

سوئے رہوں گی میں کچھ کھا کر

ٹھمری پیلو بروا

پیت ناہیں رے گھر وندے کا کھیل

کدر جب جانوں جو دو دکھ جائے جمیل

بیوگ بہت پرت

تن من جلت

رکت گھٹت جیسے دلے کا پیت

ٹھمری سوہنی

پیت لگائی کا ہوسنگ؟

دیکھت ہوں میں سانج سکارے

کدر پیا لورے نت نئے ڈھنگ

ٹھمری کھماج

تمہاری بھولی بھولی صورت کے میں واری جاؤں  
 آنٹوں پیر موہے دھیان رہت ہے  
 کہت کدر کیسے پاؤں؟

ٹھمری دیس

تم بن موراجیانہ پہلے

برا بھلا جو چاہے کہہ رہے

لاج سدم سب پت کھوئی  
 ایسوں نوچ نیہہ لگائی کوئی  
 کدر میں کا جاتی تھی پہلے

ٹھمری پیلو

جو گجرے ترے من پر کدروہ کا جانیں؟

اپنے جیا کی اُن سے کہو تو

چاہیں ما میں نہ ما میں

ٹھمری کافی

جانے دو موہے چھوڑو پیردا

کدر پیا تو ہے لاج نہ ڈر ہے

اتنے لوگن میں لگانے بہت گردا

ٹھمری کھماج

جو کر موں میں ہو سو ہے سویا

ترپت روت رب کا ہوت

آنکھ لگاوت ہے کدر من موہ لیو

نا کچھ جادو ٹونا

ٹھمری جھنٹھوئی

چھلا دیو موراری کا ہے کرت بدنام

کدر پیا جن سے ہنس بولت ہو

ان ہی سے را کھو کام

ٹھمری پیلو

دیکھو کدر مورے گاری دینی رے

میں تو کہنویں پر پنیاں بھرت تھی  
اور ناہک گاگر جھینے رے

سترہ

ٹھمری بیاگ

دیکھو کدر لگر لگر مور۔ بھاری

چھلکت بھیجت ساری

بار بار پنیاں بھرن بھیجت

سترہ

سائے دے دے گاری

ٹھمری کھماج وتلنگ

سکھی ری موراجی گھر میں لگت ناہیں بن پنی

رک تو گئے کدر بدلیوا

سترہ

دو ج برت نندی

ٹھمری سند ہڑا

سن اے ری بجنی مورے دھن دھن بھاگ

رک رے کدر ہمری سبجریاں

سترہ

موبے پت پت گلے لاگ لاگ

ٹھمری کھماج

کدر پیا کیوں گئی

بولوں گی تم سے کاہی نہیں

چلو ہٹو کاہے بنتی کرت ہو

سترہ

اٹھو اٹھو بس جاؤ دیر

ٹھمری بھیرویں

کہو کدر لاگی پار نیا دیا

دیکھو نیا مورے بن کھویا

سترہ

دو جے ہے منجد ہار

ٹھمری کافی

کیو آج چھیل چھیل کنورے

چٹ پٹ پٹ جھپٹ

مورا انچرا انچ



اچانک کدر پیا مکھ چوم لیورے  
ٹھہری دیس

کاہی کہوں گنیاں تمس میں رات کی بات  
سگری ریں موہ پے جیسی گزری  
اور جو کچھ کدر کہنی مورے سات

انترہ

ٹھہری جہنگلہ

کدر پیا کیسی آؤں توری پاس  
اک تو پانکیا چھن چھن باجے  
دو بجے جاگے موری ساس

انترہ

ٹھہری جہنگلہ

کدر پیا کیسے آؤں توری میر  
جات ہوں میں بھرتی نیر  
سا ٹھہر کو سکھیاں پنیاں بھرت ہیں  
پنگھٹ پر ہوئی بھینز

انترہ

ٹھہری تلنگ

کابے کو پیت لگانئی کدر چارون کی ری  
اورن سے پیاہنت بولت ہیں  
ہم سے کرت چڑائی

انترہ

ٹھہری پیلا

کون بھینز نے میں آن پھنسی گنیاں  
درسن ان کے  
سُنیاں اسے جئے  
دیکھے بانکے سنولیا  
رنگیلے بن کے

گائیں بجائیں رجا میں سکھی ری  
وہ تو گئی ہیں سب ہیں گن کے  
تب تو کدر کی ناہیں کدر تھی

انترہ

انترہ

اب ترپت ہوں خبر سن سن کے

ٹھہری پرچ

کب آئیں سیان موری گنیاں

میں توری میوں بلیاں

ساس نند موری پیرن بھجوری

یا ہلکن یک بکا لو گیاں لو یہاں

اپنی پپتا میں کائے کہوں کدر بن

جو جو پڑیاں سہیاں

ٹھہری بہاگ

کدر بیانیہاں لگا کر چھپائے

ہم ترپت تم سوتن سنگ سوت ہو

ناہک ترے کہے میں آئے

ٹھہری کھماچ

کدر میں تو نا ہیں ہوں توری ناری

کیوں بھجوں کی چوز موری ساری

نہ موہے جانور نہ موہے چینیو

کاہے ماری پچکاری

ٹھہری بھوپالی

کہور سیا چھل بل کیٹھانی

کر چترائی ساری رین گنوائی

کدر سوتن گھر آج گئے

اُن کی ڈھٹائی ایسی

مہکانہ سہائی

ٹھہری جھنجوئی

بنی توری نہ مانوں نا پوچھوں توری بات

رات کدر کاہے سوتن سنگ سوتے

اور ہم سے کنی گھات

ٹھمری کھماج

میں پنیاں بھرن کیسے جاؤں کدر پیا؟

ایک گگر بھاری

دو بے دھک دھک کرت ناری

ڈگر چلت

پگ دھرت

ٹھمر ٹھمر کا پنے جیا

ٹھمری پیلو

میں تو کدر کے کارن بھی جو گن

تج کرتن میں بھی برد گن

کانن کنڈل گلے مرگ چھالا

بن کے جو گن

میں پھری بن بن

ٹھمری جھنگہ پیلو

موری سکھیاں ڈھونڈ رہی

اونکا پاوت ناہیں کہیں

کدر پیا تم جنکا چاہت ہو

کا جانے کون دلیں گئیں

کیسے اکھاں پھیر لیں کدر ہی ملن کی نہ آس

مورے آسو ڈھلنے لاگے گھلنے لاگاس

ٹھمری پرچ

موری گھر گئی اون بن برسوں

ڈھونڈن نکسی ہوں گھر سوں

رین وفا ہمیں ترپ بتی

اس پے درس کے ہیں جیتی

آئی بسنت اور انہو ابورے

بہار آئی پھولی برسوں

راہ تکت مورے نین تھکے

انترہ

انترہ

انترہ

اب جائے کوئی یہ اُن سے کہے  
جھوٹ کد رقم کیوں کرت ہو  
دسویں کبت آج کل پرسوں

شھری بارہ ماہ

جب سے سیاں پر دیسوا گیوری  
من میں رہت واکا دھیان ری  
برسن گجری سیاں بن ہم کا  
ورسن کارمان ری

سترہ

اپنے پیا کو میں ڈھونڈن نکسی - کا ہو کی ندر ا کھی آن ری  
نییاں کی گھائل برہا کی مائی - ہم ری یہی پچان ری  
پاتی میں لکھیو یہی موری گنیاں - تم بن نکسی پران ری  
نییاں لگا کر من موہ لینو - تن من دھن اور جان ری  
پیت نہ کرنا کدر سنگ کوڈ - ہم کا بھی اب کان ری

سترہ

واورا کافی

چلی گئی ہم سے سیاں کھ مور  
اوگلو تھا جانا کرت بہا نہ کوڈ  
سوتن کی اور  
دیکھے کدر کی یہ چترائی بہیاں چھڑا کر جور

سترہ

سترہ

واورا کیلو

کہہ پیا نا ہیں کہوں ڈکھ اپنا  
ساس تند کا ڈر مو ہے کیسے؟  
بولوں جیسے گوگی کا پننا

سترہ

ہولی پیلو

آگ لگی ایسی ہولی کو گنیاں  
کیسی کدر نے مرو ری ہیں بہیاں  
چھین پچکاری مو سے  
سوتن پر رنگ ڈالا  
دیکھونا ہک ہم کا جلاوت ہیں سیاں

سترہ

تال ہولی کافی

اپنی پیتا کہوں کا سکھی من کی

تک سدھنا ہیں ہم کاتن کی

اب مورلی جیا پیا، ناہیں آوت

انترہ

ہوسن گی ایسی کن بیرن کی

ہولی کافی

اچا تک انجرا پکڑ مور اچھینچا

چولیا مسک گئی چوریاں کرک گئیں

گرواگت ایسے جورے سے پھینچا

کدر پیا ادروں میں تو ہنستی تھی

یہ سچ ہے بڑے مول کا سر پہنچا

ہولی کافی

پیا ہولی نہ کھینوگی اب کی بار

تم تو بھاگت ہو رنگ ڈار ڈار

جاؤ کدر کھیلو سب سکھیں سنگ

انترہ

بٹی رہی ہیں بار بار

ہولی کافی

رنگ نہ ڈار و پکڑ کر سیان

مانو کہا ذرا چھانڈو تو بتیاں

کدر ہم سے تم کیوں ٹھٹھولی کرت ہو

انترہ

اور بھی تو ہیں ساتھ کی گئیاں

ہولی کھماچ

کدر میں تو ناہیں ہوں توری ناری

کیوں بھجھوئی چوز موری ساری

نامو ہے جانو نامو ہے چنہو (چنی ہو)

انترہ

کا ہے ماری پککاری

دو ہڑہ جوگن

برسوں سے وہ آئے نہیں رہی اکیلی سوئے

ترپت روت بیٹھ رہے ہیں اسون سے منہ دھوئے  
 کدر پیا سے نبیہ لگائے کچھ جنم کاسات  
 کد پیا بن ہمکا گنیاں دن سوچھے نہ رات  
 کدر کی مورت آنکھ میں ہے پتلی وین بجھائے  
 قل دھرنے کی جگہ نہیں ہے تو اور کہاں سے آئے  
 سرمہ دوں تو گر گر جائے کا جل دیا نہ جائے  
 جن نینن میں پی بسیں دو جا کون سمائے؟  
 آؤ بیاتم نینن میں پلک ڈھانپ تو ہے لوں  
 نا میں دیکھوں اور کونا تو ہے دیکھن دوں  
 ارے پیسے بانورے تو آدھی رات نہ کوک  
 ہوئی ہوئی سلگن دے اک بار سنت بھوک  
 آہ کروں تو جگ جلے اور جنگل بھی جال جائے  
 پاپی جیا رانہ چھے کہ جائیں آوسلائے  
 ججن سکاری جائیں اور نینن بریں گے لائے  
 بدھنا ایسی رین کو کہ بھور کبھی نہ ہوئے

دوہڑہ

جب دانتوں کی چٹک پڑی تو رنگ بھیا سفید  
 بجلی گرتی روکے کون اور کیا کر کے بید؟



## روم سے.....60 فیروز پور روڈ کا تعلق

ہمیں 14۔ ایس کینال پارک کے مالک مکان نے پیغام بھجوایا کہ وہ سارا گھر استعمال میں لانا چاہتے ہیں گھر کو خالی کر دیا جائے۔ وہ ایک ایسا عہد تھا جب مالک مکان بھی دسویں سے گھر خالی نہ کرواتے تھے نہ کسی نے دیتے تھے۔ ہم نے شرمندہ شرمندہ اپنا سامان ریڑھیوں پر لادا اور 60۔ فیروز پور روڈ روانہ ہو گئے۔ ان دنوں سڑک طرح سامان سے لدے ریڑھے عام نظر آتے تھے۔

یہ لڑکیوں کا سکول تھا جس میں دسویں تک تعلیم دی جاتی تھی۔ میری خالہ کے لیے ہمیں سٹاف اور کچھ چھپا کر رکھنا بڑی بدنامی کا باعث ہو سکتا تھا۔ محکمہ اُن کی انکوائری کر سکتا تھا، لیکن ابھی لہو سفید نہ ہوا تھا۔ ہماری خالہ تھیں اس لیے اُنہوں نے اپنی ساری شفقت ماوری ہم پر مرکوز کر رکھی تھی۔

خالہ نے ہمیں سکول کے بائیں ہاتھ یہی دو چھوٹے چھوٹے کمرے رہنے کے لیے دیئے جن کے باہر غسل خانہ بھی تھا۔ سکول کے پچھواڑے ایک گراؤ بند تھی جس کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ درخت اُگے ہوئے تھے ہاتھ ہی ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور سرونٹ کوارٹر تھا جس میں ہماری نئی ملازمہ اور اس کی بیٹی خورشید نے قبیلہ ہیڈ مسٹریس کی رہائش گاہ تھی۔ ہیڈ مسٹریس کے رہنے کے لیے دو کمرے مختص تھے۔

یہ پاکستان کے ابتدائی جھجانی سائل تھے۔ اوپر سے ریزی بھائی کا مسئلہ گھمبیر تھا، بلکہ سارا مسئلہ ہی میں میں تو خالہ کے ساتھ کسی طرح کھپ سکتی تھی لیکن ریزی کا رکھنا دشوار تھا۔ وہ پہلی گھنٹی بجنے اور ”لب پد آتی ہے دعا“ سے بہت پہلے سکول سے باہر نکل جاتے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سڑکیں ناپتے، نوکری تلاش کرتے یا کام کی کھوج کرتے۔ سکول اُس وقت لوٹتے جب ساری بلڈنگ ویران ہو جاتی۔ کبھی باورچی خانے میں جا کر کھانا کھا لیتے، کبھی خورشید کا کھانا لگا کر کمروں میں لے آتی۔

اس سکول میں شام کے وقت دسویں کی خالی جماعت میں ہمارے ملنے والے آ جاتے۔ اب 1۔ حرم والوں کا خوف اور دھڑکا بہت کم ہو چکا تھا۔ خاں صاحب روم سدھار چکے تھے۔ شادی کا ساڑن بند تھا۔ افتخار بھائی

میں سے باہر سے پاس باقاعدگی سے آنے لگے۔ یہ بھی ایک دوہری Situation تھی۔ جس قدر 1- مزنگ روڈ کے پاس سے گزرتے تھے، اسی قدر تو اتر کے ساتھ روم سے خاں صاحب کے خطوں نے میرے اندر دھوم مچا رکھی تھی۔

میں نے اس وقت سے ہماری دوستی 24- کینال پارک میں ہو چکی تھی۔ وہ ایک Sportsman ہے۔ بیٹھ کر غیبت کرنا اور کھیلوں کا شوق ہے۔ اُس کا محبوب مشغلہ کبھی بھی نہیں رہا۔ کینال پارک میں اُس نے ہمیں خوب کرکٹ کھلائی اور کبھی کبھی "Smy" سے بھی متعارف کرایا۔ اس کی پوسٹنگ لاہور سے باہر ہوئی تھی لیکن جب بھی وہ سکول میں ملنے شام کے وقت ضرور آتا۔

میں نے اس کی محبت میں عجب اپنائیت تھی۔ اُسے دیکھ کر گتہ گویا ہم اکٹھے بڑھے پلے ہوں۔ اُس پر سکھوں سے میل جول تھا۔ وہ بھابھی کے رشتے کو ماں، دوست، بہن اور آدھی گھر والی کے طور پر دیکھتا اور جانچتا اور پرکھتا تھا۔ کبھی کبھی ریزی کی طرح شام یا گہری شام کے وقت آتا۔ وہ کبھی چھپلے کمروں میں نہ بیٹھتا بلکہ دوسری جماعت کے کلاس روم میں کرسی نکال کر ڈسک پر کھینیاں جما کر بیٹھ جاتا۔ کبھی کبھی چاک اٹھا کر ڈسک پر ہی اتنی سیدھی تصویر کھینچنے کے وقت چھپلے باورچی خانے میں یا اسی ڈسک پر بیٹھ کر کھانا کھا لیتا۔

اسی سکول میں تقویٰ ملاقات محمود منظور سے ہوئی۔ محمود منظور بے وی پاس تھی اور ملتان میں میری والدہ کی رہائش تھی۔ وہ اول تو میری والدہ کو خوش کرنے کے لیے اُن کا تعاقب کرتی رہی، لیکن پھر رفتہ رفتہ میری دوست بن گئی۔ یہ وہ دور ہے کہ محمود منظور نے اس میں محمود کی طرف سے بہت زیادہ جذبہ اور اظہار کیا تھا۔ اُس کے والد تو حیات نہ تھے اور والدہ باغبان پورہ میں رہتی تھیں اور ایک سکول چلاتی تھیں۔ مجھے اور ریزی کو کبھی اُن کے گھر جانے کا اتفاق نہ ہوا۔

میں نے یہ شتر وقت وہ ہمارے ساتھ رہتی، یہیں اُس کی ملاقات تقو سے رہتی۔

محمود کا جسم بے حد متناسب تھا لیکن شکل سادہ تھی۔ کبھی کبھی تقو اُس کا مورال بلند کرنے کے لیے کہتا: "بھئی، تم نے کبھی پتے اور گٹا" اسی سلوگن نے محمود کا نام "پتو" ڈال دیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کرکٹ اور "Smy" کھیلنے لگی۔ یہ سب Smy چل نہ سکی کیونکہ کمروں میں ڈسک اور کرسیاں زیادہ تھیں۔ اس لیے کچھ دیر بعد یہ کھیل چھوڑ دی گئی اور کرکٹ پر اکتفا کیا گیا۔

باقی مزنگ روڈ والے تو ابھی سکول کی طرف رخ نہ کرتے تھے لیکن تقو سے بھی زیادہ افتخار بھائی ہماری دلجوئی اور دوستی کے لیے سکول کا رخ کرتے۔ وہ مجھ سے بہت کم بولتے تھے لیکن میری خالہ (ماسی جی) ماچھی جی اور ریزی سے اُن کے بارے میں پتہ چلتی تھی۔ وہ ماچھا کو اپنی "کالی ماں" کہہ کر بلاتے تھے۔ ابھی افتخار بھائی میرے لیے ڈیڈی جی نہ بنے تھے۔ مجھے جانچنے آنکے اور پرکھنے کے لیے آتے تھے۔ مجھے وہم پالنے کی عادت ہے۔ میں ان دونوں بھائیوں کے آنے سے بچنے لگی کہ شاید میری جملہ کمتری کو دل سے مزنگ روڈ والوں نے معاف کر دیا ہے اور واقعی انہوں نے مجھے پسند کر لیا ہے۔ یہی شرید وہ لوگ صرف اتنا سمجھتے تھے کہ خطرہ نل گیا۔ روم میں کوئی اطالوی لڑکی (میم) پسند آ جائے اور وہ خواہ مخواہ کی



بدمزگی مول نہ لیں۔

ڈیڈی جی دل کے نرم انسان دوست اور کامریڈ قسم کے شخص تھے۔ جب باباجی کی وفات کے بعد کچھ عرصہ لیے انہوں نے فیسرین کا کام بھی سنبھالا۔ یہاں اُن کا دفتر اُن میٹریوں کے ساتھ تھا جو ادھر شتو جی کے چوبارے پر تھیں۔ یہاں اس دفتر میں اُن کی آدرشی گفتگو سے متاثر ہو کر لوگ اُن کے پاس آنے لگے اور اُن میں لیڈرشپ کی ترقی اُبھرنے لگیں۔ شاید لیڈرشپ کی خوبی جس کی وجہ سے وہ بعد میں میری اور خاں صاحب کی شادی میں کود پڑے۔ شادی کی پاداش میں انہیں 1- مزنگ روڈ سے باباجی نے نکال دیا تھا، لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی 60-61

تھے۔

ابھی تو میں آپ کو اُن لوگوں سے متعارف کرانے کی کوشش کر رہی ہوں جو سکول میں ہماری بے سرو سامان باوجود ہم سے جڑے رہے۔ کھکھو ڈیڈی اور تقو کے بعد ناہید میرے پاس سکول آنے لگی۔ ناہید خاں صاحب آپ فرخندہ اور ڈاکٹر ایوب احمد خاں کی بیٹی ہے (اور ڈاکٹر ایوب خاں ماڈل ٹاؤن میں 36- جی میں رہتے تھے)۔ فرخندہ کو تم اور اماں جی سردار بیگم کو اپنی والدہ زیادہ سمجھتی تھی۔

جن دنوں شتو جی مزنگ روڈ میں رہا کرتے تھے اور ناہید اپنے گھر ماڈل ٹاؤن میں رہنے کے بجائے ہمیں میں مقیم تھی تو خاں صاحب نے ناہید کو پڑھانے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ ناہید پیدائشی آرٹس تھی۔ وہ اپنے تصویروں میں رنگ بھرنے میں مشغول رہتی تھی۔ ابھی اُس کا یہ جوہر آشکار نہ ہوا تھا لیکن ایک ست الوجود آرٹس اُسے کبھی اس فکر نے نہ ستایا کہ اُس کا مستقبل کیا ہوگا۔ اُسے محنت، کوشش، جدوجہد کے ساتھ کسی منزل کے لیے کوشش ہوگا۔

جب 1950ء میں ابھی خاں صاحب روم نہ سدھارے تھے، ناہید بڑی سعادت مندی کے ساتھ کراچی سے دوپٹے سے ڈھانپ کتاہیں ہاتھ میں لے کر اندر والی میٹریوں سے چڑھ کر خاں صاحب کے پاس اوپر چوبارے پہنچتی۔ خاں صاحب اُسے پڑھاتے۔ وہ نہ کبھی کوئی چیز نوٹ کرتی نہ دودھ ہراتی۔ دوسرے دن خاں صاحب پوچھتے تھے جو سوالات میں نے تمہیں حل کرنے کے لیے دیئے تھے، وہ ہوم ورک کر لیا؟

ناہید کی خوبصورت براؤن آنکھیں تھیر سے بھر جاتیں۔ ”کون سے سوالات شتو بھائی؟“

”اچھا وہ مضمون پڑھ لیے جن پر میں نے نشان لگا کر دیا تھا؟“

وہ مظلوم بن کر نظریں جھکا لیتی اور مری سی آواز میں کہتی۔ ”کون سے نشان شتو بھائی؟“

خاں صاحب اپنی تمام تر قوت برداشت کے باوجود چڑ جاتے۔ ”سارا دن کیا کرتی رہتی ہے بریتی؟“

ہے اپنے وقت کا؟ کس طرح اپنا سونا پیتل کرتی ہے؟“

ان جھڑکیوں کا اُس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ معصومیت سے سوال کرتی۔ ”شتو بھائی! برتی کیا ہوتی ہے؟“

پنسل سے اپنے بالوں کو کریدتے ہوئے شتو جی کہتے ”خشکی کا وہ ریتلا ٹکڑا جو دریا کے بیچ بھگینے سے

ہے۔ پانی اُس کے دائیں بائیں سے گزرتا ہے لیکن وہ برتی خشک رہتی ہے۔ تیرے ارد گرد علم کا دریا بہ رہا ہے غافل

یہ وقت واپس نہیں آئے گا اور کچھ نہیں تو پیٹنگ میں ہی نام پیدا کر۔ کوئی سمت کوئی شوق کوئی جہت تو ایسی  
پہنچا کر تو اپنی زندگی کو با مقصد بنائے۔ تیری کوئی اپنی شناخت ہو۔“

یہ کلمہ شتو جی نے کئی بار دہرایا لیکن اس اُکسانے سے ناہید نے نہ کبھی کچھ سیکھا نہ براہی منایا۔ روم جانے سے  
بے زحمت صاحب نے مجھ سے کہا۔

”تو یہ میرا ایک کام کر دو گی؟“

”جی۔“

”تاہید کو تم جانتی ہو۔ اُسے ذرا بلی اے کرا دو۔ وہ شہد سے میٹھی اور سمندر سے گہری ہے لیکن میرے قابو میں برتی  
تھی۔“

”جی میں کچھ باقاعدہ استاد نہیں ہوں۔ میری کوئی ٹریننگ نہیں ہے۔“

”استاد ہونا ضروری نہیں، تم میں صبر زیادہ ہے۔“

بغیر سوچے سمجھے ہمیشہ کی طرح میں نے فوراً وعدہ کر لیا۔

لیکن اس وعدے کو ایفا کرنے کا وقت 60- فیروز پور روڈ میں ایفا ہوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس پڑھانے میں  
کبھی بھی ہوگی۔ پڑھانے سے پہلے میں رتی بھر خوفزدہ نہیں تھی کیونکہ میرے آئی کیو میں ایک یہ بھی کمی ہے کہ میں کوئی  
Impulsive فیصلے کو توڑنے کے لیے صدق دل سے ایڑی چوٹی کا زور بھی  
عام طور پر اللہ میاں میری لاج رکھ لیتا ہے اور میرے عیوب کی پروہ پوشی بھی کرتا ہے۔ اسی ستر پوشی کے طفیل  
میں کھلنے نہیں دیتا اور میری محنت، لگن کو ترقی، کامیابی اور عزت میں بدل کر میری محنت  
کا دیتا ہے۔

اس سکول میں میرے پاس ناہید کے آنے کی وجہ اس کا بلی اے کا درپیش مرحلہ تھا۔

تقویٰ کی طرح ناہید بھی عموماً شام کو ہی سکول پہنچتی۔ ہم دونوں یا ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں یا پھر سوسائٹی جماعت کی  
میں بیٹھ کر پڑھتے۔ اگر اُسے کھانے کی طلب ہوتی تو وہ ہمیں بیٹھ کر والیہ کھا لیتی۔ ناہید کبھی بھی خوش خوراک  
میں زمانے میں ابھی ریستورانوں کی بھرمار نہ ہونے کی وجہ سے ہماری ساری پود گھر کے سادہ کھانے خوشی سے کھایا  
گھرے میں چاک کی خوشبو کسی ڈسک پر پرنٹس پڑی نظر آ جاتی۔ ڈائننگ روم تو کیا مناسب میز بھی نہ ملتا۔

ناہید تو ازلی برتی تھی لیکن مجھے اسے پڑھانے، اُکسانے اور محنت پر راغب کرنے کا طریقہ نہ آیا۔ وہ نہ تو کبھی  
کبھی نہ نوٹس بناتی نہ کبھی کسی جواب کو دہرانے کی کوشش کرتی لیکن لڑکی بنیادی طور پر ذہین تھی۔ میں کورس کی کتابوں  
سے پڑھے جاتی تو وہ بے توجہی سے سنے جاتی۔ جیسے کیسے امتحان کا وقت آ گیا۔

کنیر ڈکالچ اس کا سینئر بنا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ وقت پر امتحان دینے آ جاتی۔ اکیڈمک کمروں میں امتحان گاہ  
میں پہنچی جاتی۔ مجھے ہر لحظہ خوف رہتا کہ کہیں وہ پرچہ نہ چھوڑ دے یا ماڈل ٹاؤن سے آنا ہی نہ بھول جائے۔ ریزی مجھے  
بہت سے پہلے ڈکالچ کی لان میں چھوڑ جاتا۔ جب ناہید امتحانی گتا، جیو مٹری بکس، پن، قنالے کر مجھ تک پہنچتی تو میں

شکر کا سانس لیتی۔

”پرچہ کیسا ہوا؟“

”اچھا ہوا ہے قد سیرا پا۔“

میں امتحانی پرچہ غور سے دیکھتی۔

”اور اس سوال پر نشان نہیں لگایا، یہ چھوڑ دیا؟“

”بس نام نہیں ملا قد سیرا پا۔“

میں اس خیال سے کہ کہیں اگلے پرچے نہ چھوڑ دے، چپ رہتی لیکن میری حیرانی کی حد نہ بڑھی جب صاحب کی لاڈلی چھوٹی بہن (یا بھانجی) نے رزلٹ آنے پر سینکڑوں ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔

ان ہی دنوں میں جب ہم سکول میں منتقل ہوئے تو آپا فرحت نے سمن آباد میں گھر خرید لیا اور وہ بھی صاحب کے لیے میرے پاس پڑھنے کے لیے آنے لگیں لیکن ان کی کتابیں دیکھ کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے ان کی کتابیں بھی پڑھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ پھر بھی میں نے ان کی مدد کرنے کی کوشش ضرور کی۔ وہ بھی بغیر حوصلے کیے آتی جاتی رہیں لیکن ذہین آپا فرحت نے سمجھ لیا کہ یہ پڑھائی نہ استاد کے بس کی ہے نہ شاگرد اس سے کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ نام نہ پڑنے لگے۔ وہ نوٹس بنا نا چاہتی تھیں۔ سوال کرنے کی خواہش مند تھیں۔ یہ سب کچھ میرے لیے تھا اور بالآخر آپا جی نے سکول آنا چھوڑ دیا۔

خاں صاحب کو جب یہ اطلاع ملی انہوں نے کسی خط میں مجھ سے بر ملا نہ پوچھا کہ ایسی کوتاہی کی وجہ کیا ہے۔ آپا جی کیوں پڑھنا چھوڑ گئیں۔ خاں صاحب مجھے بغیر کسی سوال جواب کے خط لکھتے رہے۔ حالات کچھ امید افزا نہیں لیکن میرے اندر امید کا چھوٹا سا دیا جتنا رہا۔ غالباً اس ویسے کا تیل وہ خط اور کارڈ تھے جو مجھے روم سے ملتے تھے۔ ان خطوں میں کسی قسم کا وعدہ شادی کے لیے کوئی التجا وغیرہ کبھی رقم نہیں ہوئی لیکن اپنا سبیت سے لکھے گئے ان خطوں میں اپنے سبب سے پیش آئے تجربات، مغربی لوگوں سے ملنے کے بعد تاثرات اور ثقافتی تقابلی کی خوبصورت تصاویر ملتی تھیں۔

میرے سکول میں رہنے کے باعث ایسی لہجہ زد سے دوستی ہو گئی جو نہ جانے کیوں میری طرف مائل تھیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی بھانجی تھی اور میرے کندھے پر بھی ایک اضافی بلا لگا تھا۔ ان دوستوں میں سے قابل ذکر محمودہ اصغر تھی۔ وہ 30-جیل روڈ پر رہتی تھی اور مورس کار میں سول آیا کرتی۔ مجھے اس کا یہ بد بواہ اور شہسپا“ دل سے بھاتا۔ اس کا دنیاوی Status سکول والی ٹڈل کلاس استانیوں اور شاگردوں سمیت زیادہ تھا۔

محمودہ کے والد انجینئرنگ کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ان سے کچھ تو میری دوستی کی وجہ سے اور کچھ میرے خالہ کی مرعوبیت کے باعث تعلقات بڑھ گئے۔ اصغر صاحب بھی ہر بڑے آدمی کی طرح اندر سے تنہائی کا شکار تھے۔ ان کے بیگم ایک سیدھی سادی خاتون خاندان تھیں لیکن ان میں ایک خوبی اچھی خانہ داری کے علاوہ بھی تھی۔ وہ ڈھولک بہت عمدہ جانتی تھیں۔

ہم ان کے گھر جاتے تو میری خالہ اصغر صاحب کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول ہو جاتیں۔ تاش اور کھیل

بہ نوائی ان ڈور کھیل تھے۔ محمودہ کی والدہ ہر بڑے آدمی کی بیوی کی طرح Left out محسوس کرتیں تو وہ میرے ساتھ ساتھ بجانے میں مشغول ہو جاتیں۔ میں روڑ لیا چھوٹی چیخ بجاتی۔ پھر ہم دونوں مل کر شادی بیاہ کے گیت اور ادھر سے لے کر کیے فوک گیت گاتے۔ محمودہ تو تاش کھیلتی نہ کبھی ہمارے ساتھ سنگت ہی کرتی۔ اس کا وقت کبھی میز بجانے یا شہنشاہی میں لگتا۔ محمودہ اصغر کے گھر لڈیڈ کھانے ہمیشہ ہمارا سواگت کرتے۔

محمودہ اصغر کی دو اور شناختیں بھی تھیں۔ اس کی شادی اظہر صاحب سے ہوئی جو پاکستانی حکومت کے پہلے نائب ایڈوائزر رہے۔ کسی سفارش کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اس زمانے میں Economic Wizard تھے اور وہ تشریح کی معیشت پر ان کی گہری نظر تھی۔ دوسری پہچان محمودہ کی اس کی چھوٹی بہن مشہور و معروف ادیبہ خالدہ حسین تھیں۔ سکول کے دور میں خالدہ بہت چھوٹی تھی۔ وہ ہم دونوں کی دوستی کومنڈ میں انگلی ڈال کر دیکھنے کی عمر میں تھی۔

مجھے دو پہر کو سونے کی عادت ہمیشہ سے ہے۔ جب کبھی میں محمودہ کے گھر دو پہر کو ہوتی تو خالدہ بھی میرے اور عیب کے ساتھ تکیہ جوڑ کر لیتی۔ خالدہ اُس زمانے میں پڑھنے کی رسیا تھی۔ یہی شوق آگے چل کر خود اُسے لکھنے کی شکل میں لکھنے میں شوق کے علاوہ اسے لڈی، بھنگلے اور کچھ کچھ کا بسکٹ ناچ کی طرف بھی رغبت تھی۔

محمودہ اظہر کے علاوہ میری پرانی دوست نسرین رشید اور شمیم رشید بھی آجاتیں۔ ان دونوں لڑکیوں سے میری دوستی ایک آدھ بار متان میں بھی ہوئی تھی۔ وہاں اُن کے والد رشید صاحب ملتان میں اُن دنوں ڈپٹی کمشنر تھے اور اُن کی دوستی سے نانا کے مراسم کافی جاندار تھے۔ ابھی نسرین بی اے کرنے کے مرحلے میں تھی۔

ناہید کی پڑھائی کا مرحلہ ختم ہوا تو ناہید آ پافرحت کے پاس سمن آباد میں منتقل ہو گئی۔ پھر انورا قائم رہا۔ میری سہیلی ناہید کو چھوٹے (ہانگی) میں مل گئیں۔ ایک روز ہم سہیلیوں نے ناہید کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ پیدل نالے کے ساتھ یہ تھوڑا سا روانہ ہوا۔ اتفاقاً پیچھے سے ایک ریڑھے والا نظر آیا۔ ہم نے اُس کا راستہ روک کر ٹھہرایا۔ شریف آدمی نے بلا چون کر ریڑھ روک لیا۔ سب اس میں سوار ہو گئیں اور سمن آباد کا رخ کیا۔ چندہ کر کے پیسے اکٹھے کیے جو غالباً اجرت سے کم تھے سمن شریف آدمی نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ ہمیں بغیر کوئی مذاق یا بھنگلے کیے سمن آباد آ پاجی فرحت کے گھر آتا دیا۔

ہم آج کی نوجوان نس پر آزاد روی کا لیبل لگاتے ہیں لیکن ہم اس بات پر تو ج نہیں دیتے کہ ہر بیس پچیس سال کے بعد آزادی کا معیار بدل جاتا ہے۔ یہی ارتقاء کا راستہ ہے۔ ہمیں پسند آئے نہ آئے اللہ اسی طرح تبدیلی لاتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے عہد میں بھی فاسٹ فوڈ تھا۔ گول، گپے، دی بیجھے، چکڑ چھولے، پھٹورے ہماری پود کے پسندیدہ تھے اور ماں سب ان چسکوں سے منع کرتے تھے جیسے آج برگر، چپس اور سوفا ڈرنک سے منع کرتے ہیں۔ تب فون نہ تھے غالباً نہ گفتگو نہ ٹیکسٹ پر ہو سکتی تھی نہ فون پر لیکن خطوں کے کبوتر اور چوری چھپے کی ملاقاتیں عام تھیں۔ ایک موت ایسی اہل حقیقت ہے جسے سنان آنکھوں سے دیکھتا اور جھٹلا نہیں سکتا۔ باقی سب کچھ اُس کی بصیرت اور آئی کیو اور جینز پر منحصر ہے۔ وہ کیا کچھ سمجھتا ہے اسے کس چیز سے کیا سیکھتا ہے؟

میں نے اسی سکول میں اپنا ایک ناول قریب قریب مکمل کیا لیکن قیام پاکستان کے بعد کے واقعات اور نشیب و فراز نے اسے نہ ہو سکے اور نیت کی تھیم پر یہ ناول تا حال نامکمل ہے۔ اپنے پڑھنے پڑھانے کے شغل میں مجھے پانچویں جماعت

میں انارکلی ڈرامے نے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں چھوٹی عمر سے انارکلی کے کردار میں ڈھل جانے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس خواب نے ابھر کر مجھے ستانا شروع کیا۔

میں نے سید امتیاز علی تاج کے اس ڈرامے کو سٹیج کرنے کی ٹھان لی۔ پیچھے میری نیت یہ تھی کہ میں اہم کردار ادا کروں گی۔ محمودہ اظہر شہزادہ سلیم کا کردار تیار کرنے لگی۔ میں نے ناہید کو بلایا اور استدعا کی کہ وہ دلآرام کاروں میں سے ایک ہو۔ لیکن وہ بیچاری روایت پسند بدگئی کیونکہ میں یہ ڈرامہ آرٹس کونسل میں کرنا چاہتی تھی۔ خیر سکول کی ایک ٹیچر بلتیہ نے دے دیا گیا۔ اکبر کے رول کے لیے تھوڑی سی مشکل درپیش تھی لیکن پھر نسرین نے یہ ذمہ داری اٹھائی۔

نسرین نے بادشاہ اکبر کا رول اچٹایا۔ چونکہ قد ذرا چھوٹا تھا اس لیے ہیل والی جوتیاں پہن کر اوپر سے زیب تن کر کے سٹیج پر براجمان ہوتی۔ اس زمانے میں نسبت روڈ پر ایک ”ہالی وڈ ٹیلرز“ ہوا کرتے تھے۔ فلموں کے لباسوں کا شاک رکھتے تھے۔ پیسے جمع کر کے ان سے ساری کا سٹ کے ملبوسات جمع کیے۔ ناہید گوڈرامے میں تھی لیکن وہ سکول میں ہونے والی ریہرسوں پر آ جاتی اور بڑے مزے کا وقت گزرتا۔

ہال کے لیے آرٹس کونسل کی طرف رجوع کیا۔ نئی بلڈنگ میں ایک لمبوٹراسٹوڈیو دائیں طرف تھا جس پر سٹیج شو اور ڈرامے کبھی کبھی منعقد کیے جاتے۔ میں وہاں پہنچی، یہیں میری پہلی ملاقات انور سجاد سے ہوئی۔ اس کی طرح اُس میں قدرتی تجسس تھا۔

”آپ؟“

”میرا نام قدسیہ چھٹہ ہے اور میں یہاں انارکلی ڈرامہ سٹیج کرنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن یہ تو بہت Elaborate مغلہ ماحول کا ڈرامہ ہے۔ آپ کیسے.....؟“

”ہم کر لیں گے۔ آپ تاریخیں دے دیجئے۔“

”وہ تو میں دے ہی دوں گا لیکن کیا آپ کو ایسا کوئی تجربہ پہلے بھی ہے؟“

”جی نہیں تجربہ تو نہیں ہے لیکن کر لیں گے..... تجربہ۔“

”سینم کاروں کون کرے گا؟“ انہوں نے چند فلمی ایکٹروں کے نام مدد کے لیے پیش کیے۔

”جی نہیں اس میں مرد کا سٹ شامل نہیں ہے۔ ہم لڑکیاں ہی سارا کام کریں گی۔“

انور سجاد نے ابرو اٹھا کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ چاپ تاریخیں دے دیں۔

اس ڈرامے کے دوران دو عجیب واقعات ہوئے۔ ناہید اپنے ساتھ اماں جی سردار بیگم کو لے کر ڈرامہ سٹیج آگئیں۔ سٹیج کی لائٹیں اور مغلہ سیٹ میرے بھائی ریزی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ واقعی سٹیج دیکھ کر لگتا تھا کہ مغلہ دربار کا حصہ روشن ہو گیا۔ جب وہ سین آیا جب شہزادہ سلیم سے لپٹ کر انارکلی اپنے کینز ہونے پر روتی ہے اور شہزادے کو اپنی خود سے باز رکھنا چاہتی ہے تو میں نے سٹیج پر وارنٹی کے عالم میں اتنے آنسو بہائے اور یوں محمودہ سے لپٹی کہ اس عشق و عاشقی اماں جی جو پرانی وضع کی خاتون تھیں، برداشت نہ کر سکیں اور غصے سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ ناہید کو بھی بادل نخواستہ ساتھ لے کر جانا پڑا۔

اس واقعے کا میں نے کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ اس وقت ڈرامہ بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔ دوسرا واقعہ اس سے بڑی حیرت کا موجب ہوا۔ اس ڈرامے کی سکول میں خوب تکٹیں بکی تھیں۔ لڑکیوں نے اپنے ہنسنے سے پیسے وصول کیے تھے اور ہماری خزانچی محمودہ نے بڑی رقم جمع کر لی تھی۔ جس وقت ہم سب اپنا سامان گھر لے کر آئے تو اس وقت ایک بار پھر انور سجاد وارد ہو گئے۔

”آپ کا ڈرامہ تو بہت کامیاب گیا۔“

”ہاں جی۔“

”ایک بات ہے قدسیہ۔ میرے پاس ایک فلم کے ڈائریکٹر آئے بیٹھے ہیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے

”فلم ڈائریکٹر؟“

”وہ آپ کو اپنی فلم میں لینا چاہتے ہیں۔“

”مجھے؟..... پر انہیں کیسے پتہ چلا؟“

”یہ فلمی لوگ ٹیلنٹ ہنٹ کرتے رہتے ہیں بانو صاحبہ۔ کسی سراغ رساں نے انہیں خبر دی ہوگی۔ آپ کرنا

چاہتے ہیں تو آفس میں چل کر ان سے مل لیں۔“

”نہیں سجاد صاحب! مجھے ایسی اجازت گھر سے نہیں ملے گی۔ اُن سے ملنے کا فائدہ۔“

میں انور سجاد کو انکار کر کے والپس لوٹی تو میرے دل میں عجیب قسم کا ملال تھا۔ شاید اس روز میرے Career کا

بیسٹ آپ کی آپ ہو گیا۔ اگر اس روز میں فلموں میں چلی جاتی تو شاید ادیب بننا میرے مقدر سے غائب کر دیا جاتا۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ زندگی کے ہر دورا ہے پر انسان کو اپنا فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ اللہ میاں بھی انسان کی اس حیثیت ہی میں حائل نہیں ہوتا۔ اُس نے تضاد سے انسانی لبہ کی تشکیل کی ہے۔ یہاں صاف اور گندے لہو آپس میں گڈمڈ ہونے کا حکم اللہ کبھی نہیں دیتا۔ یہ ہر انسان کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے کہ وہ کسی دورا ہے پر پہنچ کر کونسی تضاد کی راہ اختیار کرے گا۔ یہ فیصلے میں اُس کے سفر کی چال، کامیابی اور ناکامی کا لیول مضمحل ہے۔

ناہید نے جب اماں جی کے ساتھ چلے جانے کا فیصلہ کیا تو اُس نے مائے والوں سعادت مند لوگوں میں اپنا نام کھب لیا۔ وہ دل سے ہم جیسی ماڈرن لڑکیوں کے ساتھ تھی لیکن اس اندرونی سوچ کے باوجود اس کا عمل مثبت اور راسخ تھا۔ یہاں کوئی کام نہ کرنا چاہتی تھی جس سے ان کے بزرگوں کے دل دکھیں۔ میں بھی آہستہ آہستہ اس فیصلے پر پہنچی کہ شاید مجھے اپنے خود ساختہ اور خود ساختہ آزادی کو خد حافظ کہہ کر ہی اشفاق صاحب کے گھر میں داخلے کی ٹکٹ مل سکتی ہے۔ میں اس سارے گروہ کی خود معین کردہ لیڈر تھی۔ ریزی غریب سارا دن غائب رہنے کے باعث اور بیکار ہونے کے ہاتھوں غریب گھر کی طرح کچھ منوانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ والدہ ملتان میں تھیں۔ خالہ ویسے ہی احسان جتا کر اب اپنا کیا دھرا ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے کبھی روک ٹوک کا سہارا نہیں لیا۔ ادھر اس ساری خود سری کو ناہید کی طرح توجہ کر کے مجھے کچھ حاصل ہونے کا امکان تھا۔ ادھر اُن خطوں نے امید کا دیار روشن کر رکھا تھا۔

جب خاں صاحب روم سے لوٹے تو میں 455-این میں مقیم تھی۔ میری شیخیاں سنیں تو منہ سے نہیں نہ کہا۔ صرف آہستہ سے بولے۔ ”اچھا وہ فارسی غزل جو تم نے گائی تھی ذرا وہ تو سناؤ۔“ میں نے گائے بغیر فارسی غزل پڑھ دیا۔ انہوں نے اپنا سرائنگی سے کھجلا تے ہوئے کہا ”قد سیر! کسی سے تلفظ ٹھیک کرو لینا تھا۔ تمہیں معلوم ہے سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔“ روکو مت جانے دو“ کے اور معنی ہیں اور ”روکو! مت جانے دو.....“ کے کچھ اور معنی ہیں وقتے سے سارا مفہوم بدل جاتا ہے۔“ کچھ انور سجاد کا واقعہ مجھے سرد کر گیا تھا لیکن اس کے بعد میرا Career! ہمیشہ رک گیا۔ میں ایک عرصے سے ایکٹریس بننے کے خواب دیکھتی آ رہی تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق واجبی سا تھا۔ راستے پر بورڈ لگ گیا۔ ”روکو! مت جانے دو۔“

آہستہ آہستہ خاں صاحب نے ہی میرے اس ثانوی شوق کی پرورش کی اور اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے ہی میرے دل میں یہ فیصلہ صادر کر دیا ورنہ اس دوسرے راستے پر چل کر مجھے کچھ زیادہ ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب میں برسوں کے لکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میرے لکھنے اور خاں صاحب کے لکھنے کا آسان کا فرق تھا۔ دو Conviction کے آدمی تھے۔ انہوں نے جب بھی قلم اٹھایا اُن کی تحریر میں یہ Conviction صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔

میں لکھتی ضرور ہوں لیکن میرے لیے یہ شغل ہمیشہ دوئم درج کی Activity رہا۔ میں نے کبھی اسے اولیٰں جگہ نہیں دی۔ جس طرح خاں صاحب اور کچھ اور میرے واقف کار ادیب اور پرتوج دے کر سردھڑکی بازی لگا دیتے ہیں۔ جو کچھ مجھے ایم اے کی تعلیم میں نصیب ہو گیا میرے لیے کافی تھا۔ کچھ پڑھتی تھی کسی افادیت کے پیش نظر مطالعہ نہ تھا۔

60-فیروز پور روڈ سے میری خالہ فیروزہ 450-این میں منتقل ہو گئیں۔

میں اور ریزی اُن کے دم چھنے بھی ساتھ گئے۔ یہاں خاں صاحب کے خطوں نے ڈھارس بندھانے کی پوسٹنگ اُن دنوں کھاریاں میں تھی۔ وہ جب بھی آتا ہمارے پاس ضرور آتا۔ رات کو ریزی کا پاجامہ پہنانے کے گھنٹوں سے کچھ ہی نیچے تک آتا تھا۔

سمن آباد کے اس کوارٹر کی ساخت ایسی تھی کہ اس کا فرنٹ سامنے والی سڑک پر اور ایک چھوٹی سی سڑک مارکیٹ کی طرف جانے والی سڑک پر بنی تھی۔ میں اور تقو دیر تک اسی چھوٹی دیوار پر بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔ اس کے الفاظ میں اپنی محبت یا وفاداری کا اظہار نہ کیا لیکن کوئی ایسی Frequency ضرور تھی جو اس کا جذبہ مجھ تک پہنچتا رہا۔ علاوہ کالی ماں سے ملنے افتخار بھائی آیا کرتے تھے۔ اب ناہید بھی قریب تھی۔ وہ بھی مجھ سے ملنے آتی رہتی۔

لیکن پھر ایک بار تہذیبی کا حکم ہوا اور میری والدہ نے ہمیں 455-این کا کوارٹر کرائے پر لے دیا۔ اب ایک پھر ریزی اور میں مختار گل تھے۔ ہم دونوں آزادی سے اپنے فیصلے سے راستے کا چناؤ کرتے۔ ہم کو اپنا وقت کیسے گزارتے کیونکر گزارنا ہے، اس کے لیے ہم کسی کے جوابدہ نہ تھے۔



## 455- این سمن آباد

اچانک استاد صاحب نے آنا چھوڑ دیا۔ یا تو وہ جس قدر جانتے تھے اُسے Deliver کر چکے تھے یا انہیں علم تو یہ تھا کہ میں اس سے زیادہ علم موسیقی حاصل کرنے کی اہل نہیں ہوں۔ ہمیشہ کی طرح اس مشغلے سے فراغت پا کر میں نے اپنے دھونے میں وقت ضائع نہ کیا۔ اب کچھ کچھ زیادہ وقت میں خالد کے پاس جاتی یا اپنے ناول کو سیدھا کرنے میں لگتی۔ ابھی صاحب کو روم سے آئے چند دن ہوئے تھے کہ میں نے ایک دن اُن کو مرعوب کرنے کی غرض سے شیخیاں مارنا شروع کر دیں کہ کس طرح ہم نے ڈرامہ کیا اور میں نے اس کا سکرپٹ لکھا۔ پھر کیسے سٹیج پر میں نے ”اک ترک غمزہ زن کہ سناؤ“ گانا گایا۔

چند لمحے خاں صاحب خاموش رہے پھر بولے ”ڈرامہ مجھے گا کے تو سناؤ۔“  
میں نے بڑے تکبر سے پہلا مصرعہ لگایا۔

وہ کچھ لمحے سوچ کر پھر بولے ”سنو کا کی! اس مصرعہ میں تو غلطیاں ہیں۔ پھر ویسے بھی تمہاری آواز کا نتیجہ ہے۔  
یہ گوانا تمہیں نہیں آ سکتا۔ ہو سکے تو کوئی اور شبت کام کر دو۔“

پھر خاں صاحب روم سے لوٹ آئے۔ ایک دو دن غالب گھر والوں سے میل ملاقات میں گزرا۔ تیسرے دن صبح کے وقت خاں صاحب ہمارے گھر آئے۔ یہاں برآمدہ گزر کر ایک لمبا کمرہ تھا جس میں ہم نے اپنی طرز کا ڈرائنگ روم لکھانے کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ اسی گول میز کے گرد چار پانچ کرسیاں تھیں جن پر بیٹھ کر میں ناول لکھتی۔ ریزی صاحب اپنی تصویریں تخلیق کرتے اور ہم مل کر ناشتہ اور کھانا بھی کھاتے۔

خاں صاحب کو آئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا۔ ہم اسی گول میز کے گرد بیٹھے تھے کہ اچانک حاجی ضیا حسین۔ چند لمحے علیک سلیک کے بعد انہوں نے خاں صاحب سے کہا۔ ”چلو اٹھو شوق! جہلم سے سعید بھائی آئے ہیں۔  
ہائیں فیکٹری کے مالک۔“

سعادت مند بھائی کی طرح خاں صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے نہ الوداعی سلام کیا نہ پھر آنے کا وعدہ کیا اور



خاموشی سے باجی ضیا کے ساتھ چلے گئے۔

منزہ اور میں اُن دنوں اکٹھے ہوتے تو ہم سڑکیں ناپنے کے لیے چل نکلتے۔ ابھی منزہ اشتیاق کی بیوی تھی ہم دونوں میں ایک سی خواہش کہیں ہر وقت شور مچایا کرتی۔ اُس شام ہم دونوں نے 30۔ جیل روڈ محمودہ اصغر کے گھر پر ارادہ کیا۔ بس ارادہ کرنے کی دیر تھی، ہم چل نکلیں۔ اُن دنوں سڑکوں پر گاڑیوں کا رش نہ تھا۔ لڑکیوں کو اغوا کرنے کی نہ پڑی تھی۔ جیل روڈ پر پہنچے ہی تھے کہ پیچھے سے آواز آئی ”مٹو..... کا کی۔“ میں بے پرواہی سے چلتی رہی۔

ہوئی..... ”کا کی..... کا کی رُکن.....“

منزہ نے مجھے روکا۔

پیچھے کھکھو ڈیڑی چھ آ رہے تھے۔

ہم دونوں نے سلام کیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”جی یہاں 30۔ جیل روڈ پر میری کینٹی محمودہ رہتی ہے۔ اس سے ملنے جا رہی ہیں۔“

”کیا امی ملتان سے آگئی ہیں؟“

”جی کل رات ہی پہنچی ہیں۔“

مجھے ہلکا سا شک بھی نہ گزرا کہ کھکھو بھائی اتنا بڑا سندیسہ لے کر آئیں گے۔ دوسرے دن میں خالد

ہوئی تھی تو ڈیڑی جی آئے۔ انہوں نے امی سے کہا..... ”امی جی اچھ سے اب شتو کا یہ سنتا پ دیکھا نہیں جاتا۔ بچہ نہیں ہے۔ پھر اسلام میں ایسی پابندی کہاں ہے؟ آپ کل تیار رہیں۔ کل میں شام کو عصر اور مغرب کے آؤں گا۔ میں نے خاں صاحب کی طرف سے دو گواہ مقرر کر لیے ہیں۔ محمد حسین آرسٹ اور قدیر ملک۔ مولوی

ساتھ ہوں گے۔“

امی کا چہرہ فق ہو گیا۔

امی نے ذرا جرأت سے کہا..... ”کھکھو بیٹا! ایسی کیا مجبوری ہے؟ تم یہ فیصلہ کیوں کر رہے ہو؟“

”آپ کی مجبوری نہیں، میرے بھائی کی مجبوری ہے۔“

”اچھا پھر تمہاری مرضی۔“

ڈیڑی نے ذرا ہچکچا کر کہا..... ”ایک بات ہے امی۔“

”ہاں، وہ کیا؟“

”میری کالی ماں اور گٹو کو پتہ نہ چلے۔ ابھی 1۔ مزنگ روڈ کی فضا ٹھیک نہیں۔ اماں جی کو پتہ نہیں لگنا چاہیے۔“

”لیکن وہ تو ساتھ ہی رہتی ہیں۔“

”یہ آپ جانیں اور آپ کا کام..... منزہ کو بھی پتہ نہ لگے۔“

میں اپنے آپ کو ایک جاسوسی ناول کی ہیروئن سمجھ رہی تھی۔ اس سارے Adventure میں مجھے لطف

پاس پہننے کے لیے نہ کوئی خوبصورت جوڑا تھا نہ کوئی زیور ہی۔ ہاں میں نے اتنی تیاری ضرور کی کہ ایک چوڑیاں سے نکاح کی سرخ چوڑیاں خرید کر پہن لیں۔

16 دسمبر 1956ء کی یہ شام بڑی خاموشی لے کر آئی۔ محمودہ اصغر واقعے سے کچھ پہلے آ گئی۔ میرے پاس ایک لمحے کے لیے بیٹھ کر، سفید و پینڈا اور شلوار تھی۔ صرف قمیض تھوڑی سی پھٹی ہوئی تھی لیکن اسے سینے کا وقت بھی نہ تھا۔

”تم مجھے بتا دیتیں۔ میں تمہارے لیے کوئی اچھا سا جوڑا لے آتی۔“

”یہی ٹھیک ہے محمودہ، تم فہم نہ کرو۔“

میں اور محمودہ ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں تھیں۔ خاں صاحب، ڈیڈی جی، دونوں گواہان، ریزی جی اور جی اے کے ہمراہ تھے۔ جب نکاح کی اویس لکھت پڑھت ہو گئی تو میری اجازت لینے ڈیڈی جی اندر آئے۔

تین مرتبہ انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا واقعی میں اس نکاح پر رضامند تھی؟ پھر میرے سائن کرائے۔ محمودہ نے کھوجاں کر خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا اور شوق کو اندر بھج دیا۔ خاں صاحب نے اپنی پاس بگ مجھے دے کر

”میں کوئی انگوٹھی وغیرہ نہیں ڈیا..... بینک میں میرے نو سو روپے جمع ہیں، یہ تمہارے ہیں۔“

مبارک سلامت کا کوئی شور بلند نہ ہوا۔ میز پر ایک ڈبے میں مٹھائی اور ایک میں پانچ چھ میٹریاں پڑی تھیں۔ محمودہ اور لہیا پارٹی رخصت ہو گئی۔ محمودہ نے مزید باتیں کرنے کے بجائے چپ چاپ رخصت ہونے کو ترجیح دی اور کھیت غائب ہو گئی۔ ہم تینوں نے بھی کوئی تبصرہ نہ کیا اور خاموشی سے کھانا کھا کر سو رہے۔

اب ہم دونوں میاں بیوی تھے۔

دو دن کے بعد مجھے خاں صاحب نے کہا۔

”قد سید! یہ چوڑیاں اتار دو۔ تم عموماً ایسی شوخ چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ کہیں اماں جی کو شک نہ ہو جائے۔“

میں نے کوئی جھٹ نہ کی۔ بس چپ چپ چوڑیاں اتار کر زینب کو دے دیں۔

امی نے کسی قسم کا تبصرہ نہ کیا۔ سامان باندھ کر متان جانے کی تیاری کر لی۔ جاتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا۔

”قد سید! اب خوش ہو؟“

”جی بہت خوش۔“

”یاد رکھو اپنی مرضی کا فیصلہ عموماً مہنگا پڑتا ہے۔ اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ قیمت ادا کرتے وقت نہ حوصلہ ہارنا

بے شک محض سے شکایت کرنا۔“

اس سے زیادہ تبصرہ اُن کی ڈکشنری میں نہ تھا۔

امی کے جانے کے بعد خاں صاحب رات دیر گئے میرے پاس آتے، بڑی رازداری سے رات رہتے اور صبح

کھانا کھاتے۔ میں نے اُن سے کبھی نہ پوچھا کہ ابھی کتنی دیر اور اس خبر کو صیغہ راز میں رکھنے کا ارادہ ہے۔ بہر کیف وہ

مطمئن تھے اور میں اپنے طور پر بہت خوش تھی۔

ایک روز علی الصبح ڈیڑی جی آئے اور میری کھڑکی پر دستک دی۔

”شتو..... شتو..... گھر چلو..... اماں اوپر تمہیں ملنے آرہی ہیں۔ چلو فوراً۔“

خاں صاحب بستر سے چھلانگ لگا کر اترے۔ تھو تھمبو کر کے کپڑے پہنے۔

اور یہ جاوہ جا۔

چند دن نہ خاں صاحب آئے نہ ڈیڑی جی۔ 1- مزنگ روڈ میں بم کا گولا پھنسا۔

بابا جی نے شتو کو تو کچھ نہ کہا، ڈیڑی جی سے بولے۔ ”مجھے پتہ ہے یہ ساری تیری کارستانی ہے۔ وہ کونسا

کام میں تھے مزہ ملتا ہے۔ شتو کی کیا مجال تھی کہ شادی کر لیتا۔ تو نے بد بخت اسے آکسایا۔“

اس جرم کی پاداش میں ڈیڑی جی کو ”مزنگ نکالا“ برداشت کرنا پڑا۔ وہ دور یڑھیوں پر سامان لادنے

کے گھر پہنچے۔ آپی منیر اور بیچے بے قصور تھے لیکن کیا کرتے۔ ساتھ ہی آتے بن پڑی۔ ماچھا جی نے ماتھے پر ہاتھ

اور ڈیڑی جی کی زبانی اُنہیں پہلی بار پت چلا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔

آپی منیر خاں صاحب کی خالہ زاد بہن اور بابا جی ضیاء کی چھوٹی بہن تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی سے ڈیڑی

تکھنوپن کی شکایت نہ کی۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں مشغول رہتیں۔ ایک شام الہتہ انہوں نے مجھے حیران کر دیا۔

بچوں کو لے کر ہمارے گھر آئیں۔ ایک مٹھائی کا ڈبہ ان کے ہمراہ تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے طارق کو میری گود میں

اُس کا منہ بیٹھا کرنے کے بعد بولیں..... ”گود بھرائی کی رسم ہوگئی۔ آج سے یہ تمہارا مٹھنی ہے۔“

اس رسم کی لاج ہمیشہ ڈاکٹر طارق بن افتخار نے رکھی۔ وہ نہ صرف شکا گو میں ایک عالمی شہرت کا حامل

سرجن ہے بلکہ اس کی بڑی ذاتی شناخت خاں صاحب کے حوالے سے ہے۔ اسے فونو گرافی اور ٹکٹیں جمع کرنے

بہت شوق ہے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں خاص کر خاں صاحب کی کالے گرتے والی تصویر ان کی تمام کتابوں کی

سب۔ ابھی جب باغ میں زلزلہ آیا تو وہ چند امریکی سینئروں کے ہمراہ پہنچا۔ ہم چونکہ ہر وقت امریکیوں کی مہر

محتاج ہیں ان لیے یہ بھی ایک ایسی شناخت ہے جو اہم ہے اور غالباً گو (طارق) سے زیادہ ان سینئروں پر مینڈیا

دی۔ وہ تو ہڈیاں جوڑتا رہا اور سینئر امریکہ کی شناخت میں اضافہ کرتے رہے۔

اماں جی اور بابا جی نے خاں صاحب کو کچھ نہ کہا لیکن جب ڈیڑی جی مزنگ روڈ سے نکل آئے تو یہ خاں

کی مروت سے بعید تھا کہ وہ وہیں چوہارے پر گئے رہتے۔ انہوں نے اپنا سامان دور یڑھیوں پر لادا۔ ٹوٹنی والی

نشانی وہیں چھت پر رہا اور وہ سمن آباد آگئے۔ ویسے بھی اُن کا زیادہ وقت ہمارے گھر میں ہی گزرتا تھا۔

ایک روز دور یڑھے ہمارے گھر کے آگے رُکے۔ اُن میں زیادہ تر خاں صاحب کی کتابیں اور

الماریاں تھیں۔ اب وہ لمبا کمرہ جو ہمارا ڈرائنگ روم کم ڈائنگ روم تھا، اس کی لمبی دیوار کے ساتھ کتابوں کی

گنٹیں اور گول میز پر بیٹھ کر خاں صاحب مطالعے میں غرق رہنے لگے۔

نکاح کے بعد باقاعدگی سے گھر آنے والے جناب محمد حسین شاف آرٹس ریڈیو پاکستان اور

ریکارڈسٹ ریڈیو پاکستان تھے۔ خاں صاحب ان سے باتیں کم ہی کرتے۔ نانانے اُن سے دوستی کر لی اور یہ

میں بیٹھ کر تاش پر رمی یا بینک بینک کھیلتے۔ کبھی کبھی جب ڈیڑی جی آجاتے تو اُن کو چوتھا پارٹنر مل جاتا۔ عموماً مجھے بھی کھیلتے پر اُکتائے لیکن پتہ نہیں کیوں میں زیادہ وقت نہ نکال سکتی۔

دونوں ایک اور تبدیلی نے سر نکالا۔

پانچ فرحت من آباد میں آچکی تھیں۔ جاوید اپنی پڑھائی سے بہت غافل تھا۔ اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ تو لیا تھا مگر اُس نے اپنے کلاس کے چند ناکارہ لڑکوں سے دوستی گانٹھ لی تھی اور ان کو اپنی جادو بیانی سے مطیع کر رکھا تھا۔

جب میں سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے۔ جب میں 450-450 این میں خالہ کے پاس رہتی تھی۔

ایک روز آ پاجی فرحت میرے پاس آئیں اور کہا..... ”قدسیہ! تم نے ناہید جیسی بے پروا کھلنڈری کو لی۔ اسے سب جیدی مجھے بی۔ اسے کرنا نظر نہیں آتا۔ کچھ اس کی مدد کرو۔“ ہمیشہ کی طرح میں نے کام کی نوعیت سمجھ بغیر حامی

جاوید پڑھنے کے لیے آنے لگا۔ پڑھائی تو مشکل نہ تھی لیکن جاوید اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا پٹا لے آتا۔ سارا دن اس میں پڑھائی وہ اس کتے کو گود میں رکھ کر کبھی سہلاتا، کبھی گندگیاں کرتا، کبھی فرماتا..... اس مشغلے کے ساتھ پڑھنا

ہو گیا۔ ایک روز میں نے جاوید سے کہا۔ ”جیدی! تم کل سے کتا نہیں لاؤ گے۔ اگر کتا لانا ہے تو گھر بیٹھو۔“

نتیجہ یہ نکلا کہ جیدی نے گھر آنا چھوڑ دیا۔

ایک روز آ پاجی آئیں۔ مجھے کہنے لگیں۔ ”قدسیہ! امتحان میں کم وقت رو گیا ہے۔ جیدی آنے پر رضامند نہیں ہو سکتی۔ تم ہے کہ تم ہمارے گھر آ کر پڑھا جایا کرو؟“

اب میں باقاعدگی کے ساتھ آ پاجی کے گھر جانے لگی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے ایک صاف ستھری خانہ دار گھر کو قریب سے دیکھا۔ آ پاجی کے شوہر نامہار بھائی عبدالقادر سہی واں میں ہی تھے اور آ پاجی جاوید کی خاطر یہاں منتقلی تھیں۔ ساتھ والے گھر میں آفتاب بھائی رہتے تھے۔ اُن کے گھر چونکہ بیوی نہ تھی۔ خالد آفتاب اور وہ آ پاجی کے ساتھ کھانا کھاتے اور خالد سکول کے بعد اپنے کتے Tassi کے ساتھ سڑکیں ناپتا تھا۔

آ پاجی کے گھر کے قریب چوہدری برکت علی کی کونٹھی تھی۔ اُس زمانے میں ان کا رسالہ ”ادب لطیف“ اپنا مقام چیتے میں بنا چکا تھا اور اُن کے اعزہ رشید احمد چوہدری وغیرہ کے مکتبہ جدید سے خاں صاحب کی کتاب ”ایک محبت کے لیے“ چھپ چکی تھی۔ ریزی اُن کے سرورق بنانے کے لیے مکتبہ جدید جایا کرتا۔ چوہدری برکت علی فوت ہو گئے تو ان کے بیٹوں سے اتنا بڑا کاروبار سنبھل نہ سکا لیکن چوہدری صاحب کی بیٹی گواس وقت محض سولہ برس کی تھی، اس نے ہوش و شعور بہت زیادہ پڑھنے والی صدیقہ ذہانت کے ساتھ ساتھ بڑے اچھے دل کی مالک تھی۔ جاوید پھرنے کے وقت تین، زندگی سے حظ اٹھانے کی عمر میں تھا۔ بسوں پر آتے جاتے، بس سٹاپ پر انتظار کے دوران دونوں کی گفتگو ہوتی۔ جاوید کی عمر اس وقت بمشکل تمام انیس برس کی تھی۔

پھر اچانک پتہ چلا کہ جاوید نے بھی پٹھان برادری کی روایت چکنا چور کر دی۔ اُس نے ایک غیر پٹھان سے نکاح کر لیا اور آ پاجی نے خاندان کی پاسداری میں جیدی کو گھر سے نکال دیا۔ وہ بوریا بستر لے کر

ہمارے گھر آ بسا۔

بظاہر یہ سارے کوائف اس بات کی دلیل تھے کہ جاوید ناکارہ، ناکام اور زندگی میں کسی مقام پر پہنچنے والے تھے لیکن زندگی کا کچھ علم نہیں۔ آج وہ ہائی نون لیبارٹریز کا مالک ہے جو ایشیا کی ایک بہت بڑی ادویات بنانے والی کمپنی ہے۔ کوئی شخص کن وجوہات سے کہاں پہنچتا ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

یہاں کچھ لمحے توقف کیجیے۔ میں آپ کے ساتھ اپنے تجربات سے اخذ کیا ہوا کچھ مشاہدہ Share ہوں۔ باری تعالیٰ ہمیشہ نیکی سے نیکی کے نتائج اخذ نہیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ نیک اعمال کے نتیجے میں برے حالات لاتا ہے اور کبھی کبھی برائی بھی بڑی کارآمد شاندار مستقبل کی ضامن بن جاتی ہے۔

آج 2007ء ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ”مختار امانی“ نے کس عروج کو چھو لیا ہے۔ وہ Rape کا پتہ نہیں کیوں اور کیسے پہلے پاکستانی میڈیا نے اور پھر یورپی اور امریکی الیکٹرونک اور پریس میڈیا نے اُسے آماجگاہ دیا حتیٰ کہ وہ یو این او کی مہمان بن گئی اور شہرت کا وہ مقام پایا جو محنت اور شہرت کاموں سے نکل نہ سکتا تھا۔

ہزاروں نہیں لاکھوں ایسی لڑکیاں ہیں جن سے اغوا اور جنسی تشدد کا واقعہ پیش آیا۔ تمام عمر ذلت کا احساس کمتری کا شکار رہتی ہیں لیکن وہ بے نیاز، قادر مطلق کسی کے مشورے کا محتاج نہیں نہ روادار ہی۔ وہ یہ دیکھتی ہے کہ برائی سے بھی نیکی کے نتائج نکال سکتا ہے اور کئی بار ساری عمر کے نیک اعمال، عبادتیں بھی منفی نتائج نکال سکتی ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ انسان نیک اعمال سے منہ موڑ لے اور یہ سمجھنے لگے کہ اگر میں نتیجے پر قابض نہیں ہوں تو مشقت سے حاصل ابات وہیں آ کر رکھتی ہے کہ مانی کا کام پانی دینا ہے۔ پھل پھول لگانے والا کہیں اُپر پر نہیں چاہے نہ چاہے اُس بے نیاز کی مرضی۔ کسی کی محنت کو قبول نہیں کرتا اور کسی کی نااہلی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

455- این سمن آباد کا گھر ہمارے لیے عجیب بابرکت ثابت ہوا۔ خاں صاحب اور میں دونوں ماں کا کھانے کے مرتکب ہوئے لیکن عجیب بات اس کا نتیجہ ہمارے لیے مثبت ملا۔ ہم دونوں ایک ہی دھکے میں تھے اور تقویت سے پُر اپنی صلاحیت، قابلیت اور اہلیت کے متلاشی ہو گئے۔ یہاں ہی سے ”داستان گو“ رسالہ نکالا گیا۔ غالباً برصغیر میں پہلا اور اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ تھا۔ ریزی کی بیکاری بھی خوب کام آئی۔ اُس نے کچھ دیر صرف کی اور پھر ایک روز خاں صاحب رسالے کی ڈمی بنانے میں مشغول تھے کہ ریزی اُن کے پاس آیا۔

”یار شقو! میں ”داستان گو“ کا ایسا سردرق بناؤں گا کہ دنیا دیکھے گی۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے سلک سکرین پرنٹنگ (Silk screen printing) کا طریقہ سیکھ لیا ہے۔ میں وہ چاہتی ہوں لوں گا جس پر جو بھی تصویر بنانا ہوگی بنا لوں گا۔ پھر ہم رنگ اوپر ڈال کر سکوجی پھیریں گے نقش نیچے کاغذ پر آ جائے گا۔“

”یار یہ سکوجی کیا بلا ہے؟“

”جس طرح شیشوں کو صاف کرنے کے لیے ایک وائیپر نہیں ہوتا، فرشوں پر پھیرنے والا وائیپر؟“

”یار احق نہ بنو ریزی۔ ابھی مغرب میں اس کی تحقیق تصدیق کو نہیں پہنچی۔ تم کہاں سے اتنے تیس ماہ علم

”ہاں ہاں۔ جو مرضی مجھے کہہ لو۔ میں کر کے دکھاؤں گا۔ ایک مشکل ہے۔ جتنے رنگوں کا نائٹل ہوگا۔ اتنی مرتبہ ہر

رنگ کا نائٹل ہوگا جیسے لباس سفید، دوپٹہ گرین، قالین سرخ ہو تو تین بار سرورق چھاپنا ہوگا۔“

”بھائی اتنے سارے کاغذ سکھائیں گے کیسے۔ باہر تو سکھانے کے لیے مشین ہوتی ہے۔“ خاں صاحب بولے۔

”میں نے اُس کا علاج بھی تلاش کر لیا ہے۔“

”کیا؟ مسٹر واس کوڈی گا۔“

”ہمارے برآمدے میں جو چھتیں لگی ہیں، ان کے کونوں میں جو خالی جگہ ہے وہاں سوکھنے کے لیے آرام سے

بیٹھیں گے۔“

”دیکھیں کہیں مرواندہ نہیں۔ پہلے ہی خرچہ نہیں چلتا۔“

میں جو یونہی بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھی۔ میرا کام بھی متعین ہو گیا۔ میں ایک ایک کاغذ اٹھاتی اور اسے جتن میں

سکھنے کے لیے لگا دیتی۔ خاں صاحب نے رسالے سے پہلے مال روڈ پر دفتر ”داستان گو“ بنا لیا تھا۔ سلیم چوہدری یہاں

تھے۔ ان کے علاوہ کاتب یوسف رسالے کے میٹرل کی کتابت کرتے تھے۔ اُن دنوں ابھی کمپیوٹر ایجاد نہ ہوئے تھے

تو ان کا اور خطاطی کافن ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ کاتب یوسف نے نہ کبھی اجرت مانگی نہ کبھی کسی قسم کا تقاضا ہی کیا۔

میں نے یہ سنا تو کتابت کرنی نہ ملا تو دفتر میں بیٹھ کر گھر چلے گئے۔ سلیم چوہدری حکمہ نوڈ میں ملازم تھے۔ وہ بھی کسی قسم کی تنخواہ یا

کچھ نہ لیتے۔ جب رسالہ چل نکلا اور دفتر میں لوگ آنے لگے تو اُن کا خیال کرتے، چائے پانی پیش کرتے۔

خاں صاحب آجاتے تو پچھل سیٹ اختیار کر لیتے۔

مجھے کبھی اس دفتر میں جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ میں گھر پر ہی بیٹھ کر کام کرتی تھی۔ محمد علی رقعہ نے کر میرے پاس

کبھی نہیں صاحب عموماً ”داستان گو“ کی چھپی ہوئی پرچی پر لکھتے۔ ”قدسیہ! یوسف خالی بیٹھا ہے، میٹرل نہیں ہے۔ کوئی

کچھ نہ سمجھو؟ فوراً لکھ کر بھیجو۔“

تمام کام پس پشت ڈال کر میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتی۔ رسالے میں اپنے پُر اعتماد لوگوں کے نام سے کہانیاں،

کھیل لکھ کر بھیج دیتی۔ جیدی، صدیقہ، ڈیڈی جی کے نام سے کئی کہانیاں لکھیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک روز ڈیڈی

میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ ”کاکا! یہ تیرے کی آنکھ کیا چیز ہے؟“

”ڈیڈی جی! یہ مصر کے نعون تہ آخ مون کے نام سے مخفف بنایا۔“

”مثنیٰ! مجھے تو بتا دیا ہوتا۔ آج دفتر میں ایک آدمی نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ کچھ معلومات بڑھانا چاہتا تھا۔“

میں کچھ پریشان ہو گئی تو ڈیڈی جی بولے۔ ”چل میں نے سنبھال لیا تھا تو ایس فکر نہ کر۔“

عموماً ڈیڈی جی میری اور صدیقہ کی غلطیوں کو اسی طرح سنبھالنے کے عادی تھے۔ یہ جھوٹ کی وہ قسم ہے جو کسی

کسی زاری کو بچانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ ایک دفعہ ڈیڈی جی سری پائے اٹھا کر لے آئے۔ میں نے کبھی نہاری، سری

پتھر کباب وغیرہ نہ بنائے۔ مجھے ڈیڈی جی بولے۔ ”یہ مثنیٰ! تیرے سپرد لیکن زینب سے نہ پکوانا خود پکانا۔“

وہ تو سودا پکڑا کر چلے گئے۔ میں ایک امتحان میں پڑ گئی۔ رات جب وہ اور ڈیڈی جی کھانے بیٹھے تو ڈیڈی جی

نے بڑے چسکے لے کر کھائے۔ میں سمجھی یہ پھر ڈیڈی جی میرا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں۔ اُن کے چہرے بعد میں نے تعریف طلب نظروں سے خاں صاحب کو دیکھا۔ وہ میری حالت دیکھ کر بولے۔ ”واقعی قدسیہ! تم نے اس کی طرح پائے پکا دیئے۔“

پھر انہوں نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور اس پر سائن کر کے مجھے دے دیا۔ اُن کی داد دے انوکھا طریقہ تھا۔ وہ ایک روپے کے نوٹ پر آٹو گراف کر کے تعریف کیا کرتے تھے۔

کچھ دیر تو ڈیڈی جی اپنی کالی ماں کے پاس رہے لیکن پھر غیرت مند آپی جی نے گھر تلاش کر لیا اور وہاں کالونی بوریا بستر سمیٹ کر چلے گئے۔ میرا اور خاں صاحب کا معمول تھا کہ ہم شام کے وقت ڈیڈی جی کے گھر چلے یہ ہمارے لیے بہت خوشی اور آئندگی تقریب ہوتی۔ خاں صاحب اپنے گھر سے زیادہ ڈیڈی جی اور آپی منیر کے گھر Home محسوس کرتے۔ فرش پر چھوٹا سا میز پوش بچھا کر آپی جی، ڈیڈی جی اُن کے بچے لٹھی، ککو، حارث دسٹر خوان کے مزے لومتے۔ میں آپی جی سے پکانے کے راور ترکیبیں سیکھتی۔ ڈیڈی اور خاں صاحب 1- مزے با تہیں کیا کرتے۔

جب کبھی خاں صاحب شہر سے باہر جاتے، میں آپی جی کے پاس رات گزارتی اور لٹھی میرے پاس سوتی۔ خاں صاحب کے گھر میں رواج تھا کہ عام طور پر چھوٹے ہی بڑوں کے گھروں سلام کرنے جاتے اور شاذ ہی چھوٹوں کے گھر پھرے اڑاتے۔ جس طرح ہمیں ڈیڈی جی کے گھر جانے کی عادت تھی ویسے ہی صدیقہ کے گھر تقریباً دوسرے تیسرے روز ہماری طرف آ جاتے۔ دن گزرتے گئے اور ہم بغیر شور مچائے ترقی کرتے چلے گئے۔

پھر وہ دن آ پہنچا۔ جب اللہ کو ہمارے گھر ایک نئی روح بھیجا تھا۔ مجھے دیکھنے اور اور میرے حالات جاننے کے لیے ایک معمولی سی دائی حسین بی بی آیا کرتی تھی۔ دہلی پتلی دراز قد بڑی خاموش طبع۔ وہ چرب زبانی سے کم اور کھلی آنکھوں سے کام لینے والی تھی۔ وہ دوسرے تیسرے روز میرے پاس آتی اور مجھے دبانے کی خواہش ظاہر کرتی۔ تبھی اس آسائش کو اپنے لیے جائز نہ سمجھا۔

جس روز انیق بیٹے کو دنیا میں آنا تھا۔ میری تکلیف کے تیور دیکھ کر امی نے مجھے خالہ کے گھر 450- ایم بی بی بونے کے لیے کہا۔ انہوں نے چھوٹے بچے کے لیے اپنے ہاتھ سے آٹھ جوڑے سی رکھے تھے۔ ان کی پوٹلی بیٹی چلچلی اٹھائی اور ہم دونوں نے ماچھا جی کے جا کر دستک دی۔ گویا دونوں بہنوں میں اس تقریب کے لیے پہلے سے ہوجی تھی۔

فورا حسین بی بی کو بلوایا گیا۔ پتہ نہیں ڈیڈی جی کو کیسے خبر ہوئی۔ وہ واقعی میرے باپ کا رول ادا کرتے آ گئے۔ انہوں نے اور تو کچھ نہ کیا۔ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر پورا وقت نہیں پڑھتے رہے۔

جس وقت نوکی نے پہلی اضطرابی چیخ ماری، جمعے کی اذان ہو رہی تھی۔ ڈیڈی جی نے شکرانے کے دو نفل پڑھے۔

سبقتی بنی نے نہایت خاموشی سے بچے کو نہلایا ڈھلایا، صاف چادر میں کس کے ہاندھا اور ڈیڈی جی کے بازوؤں میں  
 بیڈی جی نے اینٹ بیٹے کے کان میں اذان دی اور بڑی خاموشی سے اُسے خاں صاحب کی گود میں دے دیا۔  
 18 اکتوبر 1957ء میں اینٹ اس دنیا میں آئے۔

یورپورے سال بعد 16 ستمبر 1958ء کو انیس بیٹے نے ہمارے گھر کو روشنی بخشی۔ نانا تو گھر پر موجود تھے لیکن  
 خاں صاحب نے باہر والے برآمدے میں اپنی چارپائی بچائی۔ اندر نانا اور حسین بی بی اپنی کارروائی اور میں اپنی  
 قریب دو سو پکے کے قریب انیس بیٹے نے چیخ مار کر اپنی آمد کا ڈکا بجا دیا۔ حسین بی بی نے اسے نہلا ڈھلا کر  
 کہا: ”ہاں ہاں کراہی جی کو دیا تو وہ بولیں۔“ ”ہائے بچارے کو اتنی تھقی سے کیوں ہاندھ دیا ہے؟“  
 ”بی بی جی! اس طرح بچہ ڈرتا نہیں اور روتا بھی کم ہے۔“

اس سے زیادہ حسین بی بی نے کوئی توجیہ نہ دی۔ امی نے خاں صاحب کو بچہ دیتے وقت بہت ہولے سے  
 بچا کر چھین مار کر خوشی کا اظہار کرنے والی غائب پریشان تھیں کہ اوپر تلے کے بچے کیسے پالے جائیں  
 اتنی سادہ لوح اور غیر Practical ہے کہ یہ اتنی ذمہ داری کیسے اٹھائے گی۔ وہ خود تو ملتان جاتی رہتی تھیں  
 اس کام میں ہاتھ بٹانا ممکن نہ تھا۔

لیکن ہم دونوں کو علم نہ تھا کہ بچے تو آفرینش کا مستند ہے۔ پرورش تو اوپر والے کی تعفت ہے۔ وہ فقط ماں کے سر  
 کے لیے اس کا رخیر میں اسے شامل کر لیتا ہے اور اس کی جزا بھی مقرر کر دی ہے۔

اس معاملے میں خاں صاحب نے میری بہت مدد کی۔ چھوٹا سا اینٹ جب گھر دم ہاتھتا اور دودھ کے لیے ضد کرتا  
 صاحب اسے گود میں اٹھا کر باہر لے جاتے اور سرک پر نہلاتے۔ اتنی دیر میں دودھ کی بوتل تیار ہو جاتی اور یوں بچے  
 سے بچا لیا جاتا۔ میری خوراک اور صحت ایسی نہ رہی تھی کہ میں اینٹ کو اپنا دودھ پلائی۔ تین چار مہینے کے بعد  
 سے بوتل پر لگانا پڑا۔

انیس کی پرورش میں اس قدر مشکل بھی پیش نہ آئی۔ ایک تو وہ اپنی Genetics کے اعتبار سے رونے دھونے  
 والا نہ تھا۔ پھر مجھے بھی بچہ پالنے کی انکل آچکی تھی۔ بڑے آرام سے وقت گزرتا گیا۔ حسین بی بی اینٹ  
 کے پوتے دھونے آتی تھی۔ پھر انیس کی جوگان دھو جاتی۔ اس سے زیادہ وہ ہمکلامی کی عادی نہ تھی۔

میرے تیسرے بیٹے اشیر احمد کی پیدائش 15 جون 1962ء میں ہوئی۔ اب تک ہماری زندگی میں مالی سہولت  
 جی۔ جاوید کے پاس ایک ہری مورس گاڑی تھی اور وہ بینک میں اچھی خاصی تنخواہ لے رہا تھا۔ اس سے پہلے ٹیلیڈ کی  
 کے وقت ہمیں ایف سی کالج کے ہسپتال کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ ہم ڈاکٹر مارٹن جسے ہم لیڈی مارٹن کہتے تھے، واقفیت  
 رکھتے تھے۔

اشیر کی پیدائش کے وقت ہم نے حسین بی بی سے رابطہ نہ کیا۔ انسانی فطرت کے مطابق ہم اس کی خدمات کو  
 مجھے صرف یہ ڈرتھا کہ اینٹ کی باری تو میرا فلیپوٹ کی بہن جیوانندن بروقت آگئی تھیں اور انہوں نے اس



ٹانگے بغیر بے ہوش کیے لگا دیئے تھے لیکن اب صرف خوف ہی تھا، انتظام نہ تھا۔

جاوید ایک دن گاڑی لے کر آ گیا اور مجھے اور خاں صاحب کو لے کر ایف سی کالج کے کراچی ہسپتال میں لے گیا۔ ”معاذ گرانے میں کوئی حرج نہیں ماموں۔ اگر معاملہ ٹھیک ہو تو مامی کو واپس لے آئیں گے۔“

جب میں ہسپتال پہنچی تو ڈاکٹر مارٹن ان دونوں کو باہر چھوڑ کر مجھے ڈیوری روم میں لے گئی۔ مجھے لیٹنے کا حکم دیا۔ کچھ دیر معائنہ کرنے کے بعد اس نے مجھے تعجب سے پوچھا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ بیمار بواں مہینہ ہے اور اُسرا بھی بچہ کی ڈیوری نہ لے گئی تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔ اس کے بعد اس نے مجھے جلدی سے اوپر تلے ٹیکے لگائے۔ بے ہوش رکھنے کا جتن کیا اور اشرمیاں بڑی مشکل سے کے پہلے پہر اس دنیا میں آ گئے۔ اس طرح ہماری دنیا کو منور کرنے تین چاند باری خوش قسمتی کا مظہر بن گئے۔“

یہاں کچھ اور بچوں کی آمد کا حوالہ دینے پر طبیعت آمادہ ہو رہی ہے۔ آج سے دس بیس سال پہلے پیدائش کا باب ممنوع تھا لیکن اب 2007ء یہ پک منہ میں انگلی ڈانٹنے کا نہیں اور صحت کے ضمن میں اس کی انگریزی جینی تعلیم بچوں کی تعلیم کا حصہ بن چکی ہے۔

ڈیڈی، جی ان دنوں چوبدزی کا نوٹی میں رہتے تھے۔ انٹق کی پیدائش سے ٹھیک دس دن بعد ڈیڈی جی کو اس دنیا میں تشریف لائی۔ ابھی حسین بی بی کا سکہ چستا تھا۔ میں نے اور خاں صاحب بھانگم بھاگ ڈیڈی جی کے گھر گئے خاں صاحب نے اس کے کانوں میں اذن دی۔ اس طرح بابا محمد خاں کے گھنے درخت میں ایک اور بیٹھا پھل لگا۔ صدیقہ بیگم دے کی مریضہ تھی۔ کبھی کبھی جب اُسے ایک ہوتا تو اُس کا دم اکھڑ جاتا اور لگتا آخروں ہے۔ میں نے ایک دن صدیقہ کو مشورہ دیا کہ ایف سی کالج ہسپتال چلتے ہیں۔ تم اپنا معائنہ کراؤ۔ یہ کام حسین بی بی بس کا نہیں لگتا۔

”لیکن مامی جائیں گے کیسے۔ گاڑی وغیرہ تو ہے نہیں۔ آپ کے بچے چھوٹے ہیں۔“

”احقوں کی طرح میں نے کہا۔“ بس میں چلیں گے۔ نہر کتا رے تک بس لے جائے گی۔“

”اور اُس سے آگے۔“

”تھوڑا راستہ ہے نوٹی چل لے گا۔ لالے کو میں اٹھالوں گی۔“

”کو کھ لیں، آپ کو تکلیف ہوگی۔“

”کوئی تکلیف و تکلیف نہیں ہوتی۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔“

تب من آباد سے نہر کے آخری سٹاپ تک ایک آدمی کی ٹکٹ دو روپے تھی۔

ہم دونوں مع بچگان ہسپتال پہنچے۔ یہاں اس وقت معائنے کی عرضی سے عورتیں جمع تھیں اور باری باری مارٹن سے مشورہ کرنے کے لیے اندر جا رہی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح میں ڈاکٹر مارٹن کا نام سن کر بڑی مرعوب ہوئی۔ سفید قوم کے گورے پن کی بیبت کے سائے نے تمام ہتھیار ڈال دیئے۔ اندر ڈاکٹر مارٹن کے پاس پہنچ کر میں نے قدرے دلیرانہ انداز اختیار کیا اور اسے صورت

اس نے کچھ پڑتا لگا کر مجھے ایک چٹ دی جس پر وقت، تاریخ درج تھی اور لکھا تھا کہ پیدائش کے وقت میں  
 گورنمنٹ ہسپتال پہنچ جاؤں۔ حسن اتفاق سے نانا آگئیں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جانا پڑا۔ جس وقت ہم ہسپتال  
 پہنچے تو ڈاکٹر نے پڑتے ہی صدیقہ بیگم کو اندر ڈیوری روم میں بھیجنے کا حکم دیا۔

جاوید اور خاں صاحب مع میرے باہر انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد لیڈی مارٹن باہر آئی اور مجھے ایک گاؤن پکڑا کر بولی ”یہ پکڑے کا ماسک اور گاؤن پہن کر  
 میرے ساتھ آؤ۔ مریض کی حالت ٹھیک نہیں۔“

خاں صاحب نے جاوید کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ اور کر بھی نہ سکتے تھے۔ میں گاؤن اور ماسک چڑھا  
 اور ماسک اندر پہنی۔ صدیقہ قریب قریب بے سدھ تھی۔ پھر لیڈی مارٹن کی تنگ دوسے گھنٹے کے بعد ٹویڈ اس دنیا میں  
 آئی۔ یہ بھی Under-weight تھی۔ مشکل سے چہرہ پاؤنڈ کی ہوگی۔ بچی کو ہنسا دھلا کر باہر لائے تو لیڈی مارٹن نے مجھے  
 اس کی کلائی دکھائی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سفید پلاسٹک کے متنوں کا ایک بارسا اس کی کلائی میں پڑا تھا اور اس پر ٹویڈ کا  
 پستان لگا جاوید لکھا تھا۔

مجھے بچی سوچتے ہوئے ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔ ”دیکھو، ماں کے زندہ رہنے کی امید کم ہے۔ تم قسم کھاؤ کہ تم بچی پال لوگی؟“

”میں..... لیکن میرے اپنے دو بچے ہیں۔ میں کیسے؟“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ بچی تنہائی محسوس نہیں کرے۔ قسم کھاؤ اپنی ہولی بک کی کہ تم بچی کو دعا نہیں دوگی۔“

ہمیشہ کی طرح میں نے حامی بھری۔

گنجیب بات ہے اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ وزن نہیں ڈالتا۔ میں تو اپنی کمزوری سے آگاہ نہیں تھی لیکن ٹویڈ کی  
 مدد نے صدیقہ کو صحت دے دی۔ پھر جاوید نے صدیقہ کا بڑا ساتھ دیا اور دونوں نے دو ہاتھ بن کر ٹویڈ کو پال نکالا۔

جب اشیر کچھ سال بعد اس دنیا میں آیا تو ٹویڈ کے تجربے سے مجھے فائدہ ہوا اور ہم بروقت ہسپتال جا پہنچے۔ جب  
 لیڈی مارٹن کے بعد مجھے کچھ دن ہسپتال میں رہنا پڑا تو میرے پاس آپلی منیر آ کر رہتی تھیں۔ دو نو دس بجے صبح آباد سے بس  
 لکھتیں۔ اپنا کھانا ساتھ لاتیں اور شام کو میری سیوا، دیکھ کر کچھ کرنے کے بعد گھر لوٹ جاتیں۔ اس غیرت مند خاتون نے  
 مجھ پر وہی بوجھ نہیں ڈالا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ایسے لوگوں سے سیکھنے کا موقع ملا۔

## ماموں کی باتیں (ریزی کی باتیں)

اس تحریر کو لکھتے ہوئے آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ میرے ماموں اصل میں ایسے ہی انسان تھے۔ اس کتاب میں  
 پیش کیے ہوئے افراد من گھڑت اور مصنوعی ہیں اور میرا کسی پر کچھڑا چھاننا اور کسی کے دامن پر داغ دھبہ لگانے کی منشا نہیں۔  
 میں اس کہانی میں آپ کی تفریح کا سامان مہیا کروں گا لیکن آپ کی بد مزاجی کے پیش نظر بچوں اور بیویوں کی سینڈلوں سے  
 خوف نہ آپ کو میری یہ تحریر فرسودہ اور فضول لگے گی۔

میری التماس ہے کہ اس کا پہلا باب پڑھ لیجیے اور اگر ممکن ہو تو پورا پڑھ لیجیے۔ اس کتاب کو خریدنے کی ضرورت

نہیں کیونکہ اس وقت جو کاپی آپ کے ہاتھ میں ہے، وہ ہم نے ایڈیٹنگ کے لیے بنائی تھی لیکن ایک کٹرک کی بنا پر باعث دوسری کتابوں میں اسے ملا دیا، جس کی وجہ سے یہ کتاب بگ سٹال پر پہنچ گئی۔ دوسرے آپ کی ذہانت کو دیکھتے تھے تعجب ہو رہا ہے کہ آپ نے اپنے قیمتی سرمائے میں سے اسے خرید لیا ہے جو درحقیقت Pre-editing کی کاپی ہے۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ بھلا دوپہر کا ذکر تو نہیں ہو رہا۔ میری گال پر کسی نے ہلکی سی چپت لگائی جس کی وجہ سے میں ڈرنے کے بجائے مایوسی کے عالم میں چلا گیا کیونکہ جب آنکھیں کھولیں، سامنے ماموں کا چہرہ نظر آیا۔ دل ہی دل میں خیال آیا کہ آج کا دن بھی مایوسی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

وہی تو ماموں کے ساتھ ہماری بے تکلفی اور دوستی بہت گہری تھی لیکن خواب میں امریکی صدر کے الیکشن جیتنے مرحلہ درپیش تھا، جہاں ذاتی سیکنڈل اور Perjury جیسے واقعات شروع ہو جاتے ہیں۔ یقیناً آپ میری تحریر سے واقف چکے ہوں گے کہ چوبیس سالہ دو شیزہ مایزکا کیونکی کے تعلق سے صرف دو تین سالوں کے فاصلے پر تھا اور یکدم اٹھنے باعث ایک کاراکھیر نما بڑا جس کے چند داڑھی کے بالوں سے مشابہت ہو، مجھے نظر آیا۔ آنکھیں ملنے پر تصویر اور صاف ہوئی تو یہ ہمارے ماموں تھے۔

یہ بات ابھی تک میرے لیے معیوب اور معنی خیز ہے کہ ہمارے نانا سرخ و سفید چھ فٹے باہمت آدمی تھے۔ شادی پنجاب کی ایسی دو شیزاؤں میں سے ایک سے ہوئی جن کا تعلق بٹ خاندان سے تھا مگر چاند گربن کے باعث ہمارے ماموں کی رنگت کچھ ایسی تھی کہ رات کو ہنسنے وقت ان کو شاناز جنو با پہچاننا صرف دانٹوں کے باعث ہوا کرتا۔

شاید ایسی صورت میں گھر والوں کی توجہ اپنے بیٹے پر کم تھی، جس کی بنا پر ماموں کی تعمیر و تربیت کچھ زیادہ کم ہو پائی۔ آپ آٹھ کے پہنارے سے زیادہ نہ جانتے تھے اور اٹا کو غاملا لکھا کرتے تھے۔ اس نفسیاتی کیفیت میں ماموں ذہن چست اور جملے کی ادائیگی میں تیز و طرار تھا۔ میرے مشاہدے میں ایسا کوئی وقت نہ آیا جب ماموں نے حاضر و محض سے کام نہ لیا ہو۔ آپ کی شہرت اور مشہوری بام عروج پر تھی۔ آپ کو معززین میں سے سمجھا جاتا تھا۔ خلیفہ داڑھی منڈوانے والے کو زبردستی اٹھا کر ماموں کی کرسی پیش کرتا۔ اس اٹھک بیٹھک میں نہ صرف دوکان ہی میں ہنگامہ پیدا بلکہ کئی دفعہ متعدد آستروں کے دار خالی جانے کی بنا پر اور ماموں کی جان مشکل سے بچتی۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ بازار میں سائیکل مسٹری، کلچر فوٹس، پرچون والا اور دیگر دوکانداروں سے ماموں کا باضابطہ رویہ کیسا تھا۔

سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ چند مشکل اوقات بازار کا ادھار ماموں پر لگ بھگ پندرہ ہزار تھا لیکن ان کے کرڈٹ کی لائن کسی IMF کی محتاج نہ تھی۔ رہا Debt Servicing کا معاملہ تو صرف شخصی Collateral کی بنا پر آپ Multiple Revolving Finance کا چکر تھا۔ کبھی تو گوشت والے سے پیسے لے کر سائیکل والے کو پکڑا دیئے۔ سائیکل والے سے لے کر تانہائی کو دے دیئے جاتے لیکن اس سے اپنی کمیشن جھاڑنا نہ بھولتے۔ اس کرڈٹ کے چلتے پیسے سے سارا بازار خوش اور مطمئن تھا لیکن اس محاورے سے بازار ناواقف تھا کہ احمد کی پگڑی محمود کے سر اس خوش اسلوبی سے پہنائی جاتی ہے کہ احمد بھی دلفریب رہتا ہے اور محمود تو دلکش ہی ہوتا ہے کیونکہ پگڑی بار بار اس کے سر پر آ جاتی ہے۔



## 479- این، سمن آباد

455- این سے 479- این، سمن آباد میں نقل مکانی کسی بڑی شہد کھڑی ہوئی، کیونکہ اس مکان میں منتقل ہوتے ہیں۔ قادری اور غریبی سے کافی حد تک نجات مل گئی۔ زندگی میں خصوصی مشکلات جو درپیش رہتی ہیں ان میں غریبی، بے چارگی، ہسپتالی جھگڑے، سانس نندوں سے اڑ پھس، بے روزگاری، اولاد کی آزمائش، بیماری، موت جیسی تکلیفیں کس وقت کیسے آتی ہیں ان کا قیام کس قدر لمبا ہوتا ہے یہ انسانوں کی اپنی Genetics ان کے فیصلے اور ان کے ماحول سے نبرد آزما ہونے کی قوت پر منحصر ہے۔ جو کچھ مجھے سمجھ آئی وہ یوں ہے۔

جب بھی کسی شخص کو غریبی سے پالا پڑتا ہے اس کے چھوٹے چھوٹے راستے کسی نہ کسی طور پر بندگلی میں جا پہنچتے ہیں۔ بالکل معمولی ضرورتیں، دھوری خواہشیں، نا آسودہ احساس کتیری کی فضا، خود اعتمادی اور بے مائیگی کی فضا ہر لحظہ قائم رہتی ہے۔ کچھ لوگ غریبی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے رشتہ داروں سے جڑے رہتے ہیں اور اپنے حالات کی توجہ سونپی کو مانگنے کی شفقتوں سے سینچتے رہتے ہیں۔ لیکن جو نئی حالات بہتر ہو جاتے ہیں، وہ رشتے ناطے جو ذاتی ضرورت کے تحت اہم تھے، غیر اہم ہونے لگتے ہیں جیسے کوئی ستارہ اپنے مدار سے نکل جائے اور واپس نہ لوٹ سکے۔

غریبی میں بنائے گئے رواج ساری عمر فرٹ نہیں آتے۔ یہ یا تو کھلے ہوتے ہیں یا بہت تنگ..... دراصل غریبی میں صرف کام ہی ہتھیار بن سکتا ہے۔ غریبی میں صبر عموماً مجبوری کا نام ہے۔ حسرتوں کے چوکھٹے میں اس عہد کی تصویر نگاہی ہو سکتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ غریبی میں انسان اپنی اس کمزوری کے ہاتھوں مجبور، رنجور اور منہ اٹھائے آسمان کو تکتا رہتا ہے کہ کب حالات بدلیں۔ کب وہ ڈیپ فریزر میں جھے گوشت کی صورت باہر نکلے..... نہ بوباس نہ ذائقہ..... بس گوشت ہی گوشت۔ وہ بھی مجبوری میں صبر کی طرح ٹھنڈا اور جما ہوا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس امیری کچھ کم امتحان نہیں۔ امیری عجب تیزاب کا منکا ہے۔ اس میں آسائشیں، زیبائشیں، اسراف، عہد، سنی، کام چوری بہت کچھ آدمی کو اپنے میں گھولنے لگتی ہے۔ وہ اس تیزاب کے منکے میں یوں حل ہونے لگتا ہے جیسے کب پڑھیلا ہو لے ہو لے پانی میں حل ہوتا رہے.....

یہ مجھے بہت بعد میں ان دونوں امتحانوں سے گزر کر پختگی کی عمر کو پہنچ کر سمجھ میں آیا کہ انسان کو دراصل یہ مسئلہ ہر وقت درپیش رہتا ہے اور وہ ہے روح کی آزادی۔ جو مسئلہ بھی روح کو جکڑے وہ انسان کے لیے ناقابل حل ہو جاتا ہے۔ یہاں آ کر آج کی پود اور پچھلی پود کے نظریہ حیات میں تضاد شروع ہو جاتا ہے۔ بوڑھائی پود کے ہر وقت بولتا رہتا ہے یا پھر اپنے عہد کی عافیت کا نقشہ کھینچتا رہتا ہے۔ یہ بولنا نصیحت کرنا بالکل بے کار رہتا ہے کہ کس جسم کے آزاد ہونے کے خواب دیکھتی ہے اور بوڑھے کو روح کی آزادی درکار ہوتی ہے۔ بوڑھے بھی غلط اور فوٹو سرچر ہے۔

اب نوجوان اپنی سوچ کو اس قدر سیکولر بنا چکے ہیں کہ وہ اب سمجھنے لگے ہیں کہ مذہب کا انسان کی زندگی رکاوٹ کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ جو مذہب سے پیار کرتا ہے وہ ساری عمر کسی بدھے کی طرح دروازے ہی بند ہے۔ کھڑکیوں میں چٹھنیاں اور گیٹ پرتا لے ہی لگا تاربت ہے۔ وہ تازہ ہوا سے واقف نہیں ہوتا! نوجوان پود کو یہ معلوم نہیں کیا اگر واقعی روح کی آزادی مظلوم ہو تو مذہب کی کشتی درکار ہوتی ہے۔ یہ نوبلی ہو چکی ہو اس میں شک و گمان کے سوراخ نہیں ہونا چاہئیں۔ اگر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر کھلے آسمان سے رابطہ ہے تو کسی ایک راستے کا انتخاب ضروری ہوگا۔ جو لوگ بار بار پلڈنڈی کشتی یا مسلک بدلتے رہتے ہیں ان کو آزادی ممکن نہیں رہتی..... اگر آپ کو روح کی آزادی چاہیے اور دنیاوی منفعت کے لیے جان کھپادیں تو بھی مذہب مایوس کرتا رہے گا۔ اگر آپ ساری عمر دوسروں کی کشتیوں پر نمبر لگا کر رہیں گا تماشہ دیکھتے رہے تو آپ کو علم ہونا چاہیے کی ساری جدوجہد اس کا شٹ قربانیاں اوپر والا دیکھتا ہے اور بالآخر وہی آزادی کی نعمت بطور سخاوتی عطا کرنے والا ہے۔

آزادی انعام ہے..... حق نہیں.....

آزادی منزل ہے..... راستہ نہیں.....

آزادی سکون، طمانیت اور شکر کا مقام ہے..... مظلوم کیفیت کا نہیں.....

479- این میں ہمارے پاس ریڈیو آرٹسٹ محمد حسین باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ آپ محمد حسین کے بخوبی واقف ہوں گے۔ یہی وہ آرٹسٹ ہیں جنہوں نے بڑی شہرت پائی۔ ترازیخیل میں جب ایک ترک میں رضائی کراندر نہانیکر فون لگا کر خاں صاحب پروگرام ”ہم آگئے“ کیا کرتے تھے اس وقت بھائی محمد حسین ایک معاون صاحب تھے۔ ان کے ساتھ دوسری آواز ایک آرٹسٹ تاج صاحب کی ہوا کرتی تھی جو بڑی بھاری کھرج میں بولا کرتے تھے پروگرام کشمیر کی آزادی کے حوالے سے غالباً پہلا پروگرام تھا۔ ادھر بھارت سے پروگرام نشر ہوتا۔ ادھر ساتھ ساتھ اشفاق صاحب اُس کا جواب لکھتے جاتے اور پھر دھڑلے کی آواز میں اشفاق صاحب لکارتے۔

”ہم آگئے.....!“

اس پروگرام کے ختم ہونے پر خاں صاحب لاہور آگئے۔ ریڈیو پر ان کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ سچ پوچھو تو ڈیلاگ لکھنا بھائی محمد حسین نے خاں صاحب کو سکھایا جن سے بعد میں یہ علم میں نے ایسے جذب کیا جیسے سیاتھی

جواب کرتا ہے۔

بھائی قدیر ریڈیو پر Recordist تھے۔ وہ اپنے کام کے ماہر تھے اور بڑی خاموشی و دیانت داری سے پروگرام ریکارڈ کرتے تھے۔ بعد ازاں جب تلقین شاہ جاری ہوا تو اس کی ریکارڈنگ بھی ان ہی کی ذمہ داری ٹھہری۔

بھائی محمد حسین، قدیر ملک اور میری والدہ جب کبھی وہ ملتان سے آتیں مل کر تاش کھیلا کرتے اور اس سے گھر میں عجیب قسم کی رونق آ جاتی۔ گھر کا باسیوں سے عجب رشتہ ہوتا ہے۔ کھلے کھیتوں میں رہنے والا، کشادہ گھروں میں پانے والے بازاروں سے نئے نئے گھروں میں ہر لحظہ شور کے عادی، گلیوں کے باسی، سکولوں کی ہمسائیگی میں رہنے والے، بچوں کے شہزادے، شہزادیاں، غرضیکہ تمام لوگوں پر ان کے ضمنی اور زمینی ماحول کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر اسے بھول کر طرح خود سمجھ سکتے ہیں نہ کسی کو سمجھا ہی سکتے ہیں۔ لیکن رگوں میں دوڑنے پھرنے کی طرح یہ ماحول ہم میں رواں رہتا ہے۔

479۔ این ہمارے پہلے گھر یعنی 455۔ این سے کشادہ اور مقابلاً بڑا خوبصورت تھا۔ اس کی دائیں سڑک اس وقت کے سے ٹوب ویل کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہی سڑک دوسری جانب یعنی مین بازار سے ہو کر گولائی اختیار کرتی۔ یہ سڑک بھی بائیں جانب کو مڑ جاتی۔ مین ان دونوں سڑکوں کے سنگم پر 479۔ این واقع تھا۔ اس گھر کے عین سامنے ٹیپ میں ایک بہت بڑی گراؤنڈ تھی جسے سب ڈونگی گراؤنڈ کہتے تھے جس میں بارش میں سستانے اور دھوپ سے بچنے کے لیے ایک بارہ دری تھی جسے میرے بیٹے ہاندرادری کہا کرتے تھے۔

ہمارا کوٹھی نما گھر مین سڑک پر واقع تھا۔ ہمارے گھر سے آگے دائیں ہاتھ چیل صاحب رہتے تھے جو گاڑیوں کی دیکھ بھال چلاتے تھے۔ پھر یہ سڑک سیدھی چودھری کالونی کی طرف جا نکلتی تھی جہاں میرے بھائی نے شادی کے بعد گھر پر گھر لیا تھا۔

گھر کے آگے ایک معمولی سا گیٹ تھا جس کی گلی سیدھی صحن کی طرف جاتی۔ اندر کشادہ صحن میں بائیں ہاتھ چیل صاحب کا ساغسان خانہ اور متصل ٹائلٹ تھا۔ جب نظامی صاحب ریڈیو سٹیشن سے ریٹائر ہو گئے تو انہوں نے ہمیں بہت سے پتے لکھے تھے بیچے جن سے پچھنا صحن اور سامنے والا برآمدہ آراستہ کر لیا گیا۔

پھانک کے سامنے قریباً پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ آسانی سے اندر جھانکنا ممکن نہ تھا۔ ہمیں پر برآمدہ تھا۔ جب سترن گولڈ رسالہ بند ہو گیا تو ہماری پرنٹنگ مشین جسے محمد علی چلایا کرتا تھا اسی برآمدے میں لاکر دھری گئی۔ برآمدے میں دروازے کھلتے تھے۔ ایک تو ناور نما گولائی لیے کمرہ تھا جسے ہم نے ڈرائنگ روم بنالیا اور جس میں نانا کی تاش پارٹی بھی ہوتی تھی۔

جالی کا دوسرا دروازہ ہمارے نانا کے بیدروم میں کھلتا تھا۔ اس کے آتش دان کے اوپر فون دھراتھ جو ہماری نئی نئی ٹیٹ تھا۔ جب کبھی مہمان آتے تو اس کمرے میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا میرے دونوں بچے بڑے آرام سے اس آتش دان کے نیچے بیٹھ کر باتیں سنتے رہتے۔ نعیم طاہر ان دنوں سائیکل پر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ ابھی تک انہیں ان بچوں کا آتش دان میں بیٹھنا نہیں بھولا۔

اس کمرے سے ایک ہی دروازہ ایک اور کمرے میں کھلتا تھا جسے ہم نے کھانے کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ خوبصورت میز اور کرسیاں تھیں۔ یہ میز کرسیاں اس لیے خوبصورت تھیں کہ انہیں ٹیک وڈ سے بنوایا تھا، آسٹریلیا سے پہلے وہ یہ میز اور سائیڈ بورڈ ہمیں دے گئے۔ ایک خوبصورت سائیڈ بورڈ کے علاوہ یہاں اور کسی فرنیچر کی گنجائش نہ تھی۔ اس کمرے میں بائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک بڑی بڑا سرار الماری تھی جس کے دونوں تختوں پر کوئی بیٹا۔ یہ الماری خاص الخاص خاں صاحب کی کھل جا سم تھی۔ اس میں سب سے اوپر والے تختے میں خاں صاحب کی ریزگاری چھپا کر رکھتے تھے۔ ضروری خط اور رسیدیں پیک بک اور یادداشتیں بھی یہاں ہی ہوتیں۔ میں نے الماری کو کھول کر نہیں دیکھا لیکن جب واصف اور سارہ (اسحاق بھائی کے بچے) ہمارے پاس آئے تو پھر یہ آئس کریجنگول گئے پنے ہاتھ والے خواجہ فرڈشون سے خریدنے کے لیے یہاں ہاتھ صاف کر لیا کرتے تھے۔ نہیں تھی میرے سامنے یہ کام ہوتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ ضرورت بھر ریزگاری میں گے اور امیر ہوجانے کے بعد ان کی ان خواہشوں کا احترام کچھ ایسا برا بھی نہ لگتا تھا۔

اس کمرے سے پھر ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جو صحن سے ملحق تھا۔ اس برآمدے کے آخر میں ایک غسل خانہ ہماری ضرورت کے لیے بہت بڑا تھا۔ کھانے والے کمرے سے ایک دروازہ عین الماری کے سامنے بیڈروم میں کھلتا تھا۔ اس بیڈروم کی ایک لمبی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی اور پھیلی جانب ایک دروازہ کھل کر ایک گپت قسم کے غسل خانے میں کھلتا تھا۔ یہاں سے اوپر گولائی میں میڑھیاں اوپر چھت کی طرف چڑھتی تھیں؛ جب ہم یہاں شفٹ ہوئے تو رضائیوں والے ٹریک کے لیے ان ہی میڑھیوں پر چھت پر پہنچنے سے پہلے جگہ بنائی گئی۔ مردیوں میں نانایا سلطان ملازم اوپر چھت پر چھت سے پہنچنے کے لیے چلے جاتے۔ دو گئی گراؤنڈ کا ایک ماں میرے لیے پھولوں کے گلدستے کبھی کبھار لایا کرتا تھا اور اسی بیڈروم کی مال نے تقریباً کیلے ہی یہ پٹی اوپر چڑھانی تھی۔

پچھلے صحن والے غسل خانے میں ایک گولائی میں میڑھیاں اوپر نیم چھتی کو چڑھتی تھیں۔ اوپر دو کمرے تھے۔ ایک میں خاں صاحب کی لائبریری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اشفاق صاحب کی کتابیں ان کی زندگی میں بڑا اہم رول کھاتی رہیں۔ جب وہ 1941ء میں روڈ میں تھے تو کتابیں ان کے اوپر والے کمرے میں رہتی تھیں۔ وہ پوریا بستر تھا جب وہ 1945ء میں ہوتا تھا۔ ان میں مقیم ہوئے تو ان کتابوں کو الماریاں ملیں اور یہ کچھ ڈرائنگ روم کی زینت بن گئیں اور کچھ بیڈروم کی الماریوں میں سجادی گئیں۔

جب ہم 1949ء میں آگے تو ایک بار پھر ان کتابوں کو اچھا بیسران مل سکا۔ دو تین الماریاں تو پہلے کمرے میں لگ گئیں لیکن باقی نیم چھتی کے دوسرے کمرے میں تہہ در تہہ لگا کر رکھ دی گئیں۔

اس نیم چھتی میں ہمارا پہلا رہائشی مہمان عکسی مفتی آیا! عکسی مفتی لاہور میں ایم اے سائیکالوجی کرنے آیا تھا۔ وہ کسی قسم کے آراستہ کمرے کا خواہش مند نہ تھا۔ مفتی اور عکسی مفتی میں خوشبو سونگھنے کی قوت ہے۔ وہ انسان کی نیت تک اسی خوبی کی وجہ سے پہنچ جاتے ہیں۔

صحن سے عین سامنے برآمدے سے ملحق ہمارا باورچی خانہ تھا۔ چھوٹا سا اور اس کے ساتھ ایک الماری تھی۔

کھانے والی ایک جالی دار کھڑکی جس میں دودھ وغیرہ ابال کر بڑے اہتمام سے رکھا جاتا۔ بعد میں جب ہم کھانے کے وقت ہمارے پاس تیل کا چولہا بھی آ گیا۔ لیکن ابھی لکڑیوں کی آگ جلا کر میں روٹیاں پکاتی سیکتی تھی اور جب روٹی کھانے پر پہنچتی تو مجھے ایسی خوشی ہوتی جیسے اب افسانہ ختم کر کے ہوتی ہے۔

اس چولہے سے کوئی ایک فٹ دور ایک چھوٹی سی میز بھی تھی جس کے آگے تین چار ڈگڈگی نما چھوٹے چھوٹے کرسیاں تھیں۔ ان موڈھوں پر عکسی مفتی ہمارے ساتھ بیٹھ کر سادہ سادہ کھانے کھاتا اور بے تحاشا تعریف کرتا۔

عکسی مفتی نے آتے ہی اشیر بیٹے کو اپنی جاگیر بنا لیا۔ وہ اسے نڈھیر پکارتا نہ شیری۔ اس نے اپنا ہی نام اختراع کر کے کھانے کے کمرے کے آخری دروازے پر کھڑا ہو کر وہ پکارتا۔ ”شیری..... شیری..... شیری.....“

اشیر خاں نے ابھی مشکل سے چلنا سیکھا تھا لیکن اپنے گوڈا قدر کی آواز سن کر جہاں بھی ہوتا بھاگ نکلتا اور اپنا ہی ”شیری..... شیری.....“ پکارتا رہتا۔ عکسی اسے ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اٹھا لیتا اور اپنی نیم چھتھی میں لے جاتا۔ مجھے کھانے کے بعد وہ آواز بھی اوپر والے کمروں سے نہ آتی۔ جب کبھی عکسی گھر نہ بھی ہوتا تو کبھی کبھی شیری اسے تلاش کرنے کے لیے شیری اوپر جا نکلتا اور پھر اسے سلطان اٹھا کر نیچے لاتا۔

سلطان اور رحمت دو بہن بھائی تھے جو کہیں سے ہمارے گھر آ گئے تھے۔ رحمت جو بمشکل تمام بارہ سال کی ہوئی تھی وہ غیر بدھوتی تھی اور باورچی خانے میں میرا ہاتھ بٹاتی تھی۔ بچپن میں اسے شاید پولیو ہوا ہوگا کیونکہ اس کی ایک ٹانگہ تھوڑی سی تھی۔ رحمت تو دو ایک سال بعد کام چھوڑ گئی لیکن سلطان نے اشیر خاں کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا۔ وہ اسے جس جگہ بٹھا کر بھائیوں کے ساتھ ڈوگی گراؤنڈ میں لے جاتا۔

عکسی مفتی شروع سے زندگی کے اصل معنی تلاش کرنے میں لگن تھا۔ ابھی اس کی یہ خواہش ناپختہ تھی اور وہ کھانے پانیوں میں ناک نونیاں مار رہا تھا۔ اس تلاش کی ایک مہم بھی شکل اس کے دوست تھے جن میں صادق ایک اہم شخصیت تھی۔ وہ اپنے تین دوستوں کو لے کر کالج سے آتا۔ برآمدے سے ملحق ڈرائنگ روم میں ایک گول میز رکھی تھی جس پر شیشے کا گلاس رکھا جاتا۔ چاروں دوست پوری توجہ حیرت اور مجسم سوال بن کر گلاس پر انگلیاں رکھتے۔

عکسی کہتا:

Any soul passing by kindly enter the glass move it.

حیرانی کی بات ہے۔ دو تین مرتبہ جب عکسی یہ التجا کر چکے تو گلاس لرزنے لگتا اور چلنے لگتا۔ اب سوالات کیے جاتے تو عکسی ہر سوال کے بعد پوچھتا: ”اگر اس سوال کا جواب ہاں میں ہے تو گلاس میں آئی روح آپ ہاں تک چلی جائے۔ ورنہ اگر آپ کا جواب انکار میں ہے تو نوپر چلی جائیں.....“

گلاس کھٹا کھٹ پھٹا چھٹ جواب دینے لگتا۔ روح سے دنیاوی و دینی روحانی کئی قسم کے سوال پے در پے پوچھے جاتے۔ خاں صاحب اور مجھے کبھی اس مشغلے میں شامل ہونے کا موقع نہ ملا۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ عکسی دوستوں کی سنگت میں ہمیں بلاتا ہے اور اس کے اس مشغلے سے ہماری زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اس لیے ہم خارج نہ ہوئے۔

بہت بعد کی بات ہے کہ ان دوستوں میں سے صادق اسلام آباد میں کمیونسٹ تحریک میں مورڈ الزام ٹھہرا۔



مارشل لا کا زمانہ تھا۔ تحقیق کم اور گرفت زیادہ تھی۔ صادق کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر بہت بعد میں صادق کو لاہور کی جیل میں دیا گیا۔ یہاں سے اس کے خط میرے نام آیا کرتے تھے۔ پھر یکدم ایک دن خبر ملی کہ صادق کو کسی قیدی کے کر دیا..... کچھ لوگوں کو قید میں بھی راستہ مل جایا کرتا تھا۔ غالباً راستے کی تلاش کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ایک اور شخصیت کا ذکر بھی کر دوں اور وہ کیپٹن یوسف ہیں۔ ان کا ذکر صاحب صاحب کیا کرتے تھے۔ کیپٹن یوسف سے ایک دو مرتبہ میں اسلام آباد میں ملی تھی۔ انہوں نے ایک مرتبہ شہاب سے کہا..... "آج سے آپ میرے ابو ہیں۔"

شہاب صاحب نے بڑی شائستگی سے انکار میں سر بلایا اور بولے: "سوری یوسف! میں صرف تاقیہ ہوں۔ آپ کا یہ اعزاز قبول نہیں کر سکتا....."

کیپٹن یوسف کو اس کے بعد مذہب کا جنون ہو گیا۔ وہ منبر پر چڑھ کر نما سیکرہ لون کا سہارا لے کر تقریریں کرنے لگے۔ کچھ لوگوں کے اعتقادات مجرد ہو گئے۔ یہ لوگ بھی بولے تھے لیکن یہی اعتبار سے طاقت ور بھی تھے۔ انہوں نے یوسف سے بدلہ لیا اور اسے ہتھکڑی لٹوا کر جیل میں ڈال دیا۔ جب تک خاں صاحب سلامت رہے ان کا یوسف سے تعلق تھا یا نہیں تھا مجھے اس کی خبر نہیں..... لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے یوسف کے خط آنے لگے۔ ان خطوں میں پچھتائیاں بھی تھیں یا اس کی جھنجھکیاں بھی تھیں اور اندھیرے سے روشنی کی طرف آنے کی خواہش بھی تھی..... پتہ نہیں یہ یوسف کی کونسی نتیجہ میں ہوا کہ قدرت کو اس کی رہائی مقصود تھی..... ایک روز یوسف کو ساتھی قیدی نے قتل کر دیا! یوں صادق اور یوسف نے جیل سے رہائی پائی۔

میں نے بھی ممتاز مفتی کی طرح سچ بولنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مفتی جی اور میں عموماً گھنٹوں اس بات پر بحث کرتے۔ وہ سچ کے داعی تھے۔ مجھے دل رکھنے کی بیماری تھی۔ عام قری کے لیے سچ بڑی پر لطف چیز ہے۔ وہ ایسی کہانیوں کو پسند کرتے ہیں جس میں لکھاری اپنے گندے کپڑے آپ کے سامنے دھوئے۔ جب "علی پور کا اینٹی" مسودے کی شکل ہمارے پاس آیا اور "داستان گو" کو اسے چھاپنے کا اعزاز ملا تو مفتی جی سے میرا ایک ہی جھگڑا تھا۔

میں کہتی..... مفتی جی! اگر آپ شہزاد کے کردار کو سچ کی صورت بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں تو کیا یہ پورا سچ آپ کی بہادری بچوں کی بزدلی کا باعث نہیں بن جائے گی۔ آپ ٹکسی کے لیے اپنی بیٹیوں کے لیے کئی Complexes اور دماغ میں چھوڑ جائیں گے۔ میرا خیال ہے کوئی شخص بھی پورا سچ بولنے پر قادر نہیں کیونکہ ہر انسان کا ضمیر (Conscience) ہے۔ کوئی شخص دوسرے کے متعلق تو کیا خود اپنے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔

میں سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ چونکہ ہمارے اندر گند اور صاف لہوا کٹھارواں دو ہیں۔ ان کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ یہ دونوں ہوا قلب میں مل نہیں پاتے۔ سنا ہے ایسے ہی جنت میں دو دریا جاری ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ پران میں ایک قدرتی آڑ ہے۔ گویا اس دوئی یا تضاد نے انسان کی ساری زندگی کو بے الجھاؤ کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ مکمل طور پر فرشتہ بن جائے یہ ممکن نہیں، مجسم ایلیس بن کر اترائے اور تکبر کی صورت زندگی میں کرے یہ بھی یقینی نہیں۔ اللہ نے اسے آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ اگر ہدایت کا رخواستگار ہوا تو ہدی کا سفر نیکی میں منتقل ہو جائے۔

کے سحر سے چھٹکارا حاصل نہ کرنا چاہے تو بھی فیصلہ اس کا صرف اپنا ہے۔ یہی طاقت اسے تبدیلی پر آمادہ تو کرے گی۔ تمنا ندری نہیں کر سکتی۔

اس ایک بار پھر عرض کرنا چاہوں گی کہ میری کتاب سچ کی دعوے دار نہیں۔ میں نے سائنسی طریقہ کار کی طرح PPT طریقہ استعمال نہیں کیا۔ تخلیقی عمل کا تعلق ذہن سے کم اور قلب سے زیادہ ہے۔ یہاں تخیل، احساسات، 'Pretas' پیش گوئیاں، تحت الواقعہ معنی، ذومعنی، ابہام پسند Interpretations اہم ہیں۔ یہاں معجزاتی صرف یقین محکم کا حصہ ہوا کرتے ہیں بلکہ ان کا انتظار لازمی اور زیادہ ترین قیاس ہوتا ہے۔

اسی لیے جو کچھ میں خاں صاحب کے بارے میں بیان کروں گی کسی سلسلہ وار یا تاریخ وار ہسٹری کی ضامن نہیں ہو سکتی مجبوری ہے۔ میرے پاس جو مانگرو سکوپ ہے اس میں سے ذرات اسی طرح دیکھے جاسکتے ہیں۔

جب میں نے بہت بعد میں 121-سی میں 'مرزا بریشم' لکھی تو متذممتی اور میرے درمیان ایک محاذ قائم ہو گیا۔ آپ کا پہلا نسخہ مفتی جی کو بھیجا جس کے جواب میں فون پر بات ہوئی۔ مفتی جی بولے: "کاکی! تو نے بڑی سچ کتاب کے بارے میں لکھی؟"

"کیوں مفتی جی کیا کیا میں نے؟"

"میں لاہور آ رہا ہوں۔ آ کر بتاؤں گا؟ یاد رکھا ایسی من من کن کن سے نہ لکھنے والے کا کچھ فائدہ ہوتا ہے نہ اس شخص کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔"

مفتی جی کے آنے تک میں نے بڑے تذبذب میں دن گزارے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کہاں غلطی کی تھی آئے بڑی محبت سے بسرام کیا۔ جب خاں صاحب روانہ ہو گئے تو ہم دونوں محذراتی میں مشغول ہو گئے۔

"اوئے کاکی! تو بڑی لکھاری ہے لیکن اتنی جھوٹی ہے مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"میں نے کیا جھوٹ لکھ مفتی جی؟"

"تو ہم سب سے زیادہ شہاب کو جانتی ہے..... وہ تیرے گھر میں آتا جاتا رہا، تو نے اسے بہت قریب سے دیکھا؟"

"پھر؟"

"تو جانتی ہے کہ اس کا روحانی دنیا میں کیا درجہ تھا۔ وہ قطب تھا، ابدال تھا، ولی تھا۔ تجھے اچھی طرح سے معلوم ہے۔ تو نے ساری کتاب میں کہیں ایک جگہ اپنے آپ کو Commit نہیں کیا۔ کیا یہ بددیانتی نہیں ہے، قلمی بددیانتی؟"

"مفتی جی! میں شہاب صاحب کی اس جہت کو نہیں جانتی جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔"

"نہیں نہیں بیٹے۔ تو نہیں جانتی تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ صرف تجھے بھی ایک بیماری ہو گئی۔ اپنے شوہر پر وقار High and mighty کی طرح تجھے بھی وہم ہو گیا ہے کہ تجھ سے بڑا کوئی نہیں۔"

میں ہکا بکا رہ گئی۔ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن مجھے معلوم تھا کہ جس وقت مفتی جی کی باز چڑھی ہو وہ کبھی نہیں سنتے۔

”بول بول..... بول..... جانتی ہے نا کہ جھوٹی کتاب لکھی ہے اس لیے چپ ہے۔ سچا آدمی اپنے آپ کے حوالے نہیں کرتا..... سچا آدمی بولتا ہے اور گج وچ کے بولتا ہے۔“

”مفتی جی! آپ مائیں گے نہیں۔ لیکن میں نے شہاب بھائی کو قرآن سے سمجھا۔ وہ جب جب بھی میرے ٹھہرے ہمیشہ خاں صاحب کے ساتھ دفتر چلے گئے اور واپسی پر اپنے کمرے میں مقید ہو گئے۔ اگر کبھی گھر پر ہوں تو بچوں کی سنگت میں ملے۔ سب سے زیادہ انہوں نے اشیر کے ساتھ وقت گزارا۔ وہ حالات میں نے قلم بند کر دیا۔ سارے۔“

”بالکل ٹھیک..... اب سچی بات منہ پر آئی۔ تو نے شہاب کا نام لے کر اپنی فیملی کو Build کرنے کا حکم اپنے ناخن کاٹنے والے شوہر کو ان کا ضیغہ بنا دیا۔ اشیر ذرا یور کو نہ جانے کیوں یوں ظاہر کیا، گویا وہی ایک لاہور میں پوسان حال تھا..... شہاب بیچارے کا کچھ ذکر نہیں..... ساری شاعرانہ تھکنی بے شیخی ہے شیخی۔ یہ کتاب تو نے اپنے Build کرنے اور اپنے گھر والوں کی ہوا باندھنے کے لیے لکھی ہے۔“

سچی بات ہے مفتی جی جیسے خاکے کسی نے اردو ادب میں نہیں لکھے۔ شہاب صاحب کہا کرتے تھے کہ جنت کے مجذوب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا یہی وصف انہیں دنیائے ادب میں بھی معرکے کا مقام دیا گیا لیکن انہیں کروں آری کی طرح چلنے والا تیر کی مانند کھب جانے والا تین اور تیرہ کے درمیان کو تو ال کی طرح الف کھراچ مجھ سے نہیں جاتا۔ مجھے موم بتی کی روشنی میں کھڑکی میں سے در آنے والی چاندنی، تارچ سے چابیاں تلاش کر کے تالا کھولنے کمرے کا منظر دیکھنا پسند ہے۔

جب عکسی ہمارے پاس تھا تو مفتی جی اسلام آباد سے ہمیں ملنے آیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی کسی خصوصی محبت کرتے نہیں دیکھا۔ وہ خاں صاحب اور مجھ میں مشغول رہتے۔ ہر مرتبہ جب وہ آتے تو ان کے ساتھ ہمیشہ تازہ جھوٹی ہوئی مونگ پھلیاں ہوتیں۔ ان میں کبھی ایک دانہ بھی کبھی ممتاز مفتی نے منہ لگایا نہ عکسی نے کھایا۔ میں نے پوری اپنے بیدروم میں محفوظ کر لیتی اور پھر ان صاحب ان کے دوست اور میں اس سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔

مفتی جی کا سیرا بھی اوپر نیم چھتھی میں ہوا کرتا تھا اور مفتی جی چونکہ مفتی جی تھے اور محبت کرنے والی روت تھے روز اول سے ملی تھی اس لیے انہوں نے بہت جلد اس اصول کو اپنا لیا کہ ہر رے دل میں جگہ بنانے کے لیے اینٹ اور پتھر سے محبت کرنا ناگزیر ہے۔ یہ دونوں بچے مفتی جی کے پاس اوپر نیم چھتھی میں گھس رہے جہاں ممتاز مفتی اپنے کاغذوں کے کھلاڑ ”علی پور کا ابلی“ لکھتے رہے۔ وقت پر نیچے آ جاتے باورچی خانے میں اپنا مونڈھا لیتے، بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ گویا یہ کی بھوک ہو۔ ہر نوالے پر داد دیئے چلے جاتے۔

مفتی جی اپنی جلو میں ہمارے لیے ایک تھک مرزا جی لے کر آئے۔ یہ وہی مرزا جی ہیں جن کا ذکر ”سفر در سفر“ سے آپ پڑھ چکے ہیں۔ چھوٹے قد کے مرزا جی بڑے مزیدار آدمی تھے۔ ان کو سمجھنے کے لیے مزاح کی حس قوت جاننا ضروری کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے پرانے قصے بڑا لطف لے لے کے سناتے خاص کر وہ واقعہ جب وہ بنگال میں تھے۔ ان کی فوج میں ٹھیکیدار تھے۔ باقی چھوٹی موٹی بے ایمانیاں تو ایک طرف ایک مرتبہ انہوں نے بار بردار ہاتھیوں کی پوری سی

تھریز کر نیل کو قائل کر لیا کہ ہاتھی کہیں جنگل میں غائب ہو گئے ہیں اور اب ان کی تلاش بے کار ہے۔  
 لیکن مرزا کو کھانا پکانے کا بھی بہت شوق تھا۔ مفتی جی اور نکسی تو صرف کھانا کھانے آتے تھے لیکن مرزا جی کبھی کبھی  
 بیٹے۔ نئے نسخے بھی بتاتے۔ رنگ برنگے مصالحات کا اضافہ بھی کرنے کو کہتے۔

باتو اس میں تھوڑا سا زیرہ اور اورک بھی پیس کر ڈال دینا۔ پنے کی دال کا ڈانگہ اچھا ہو جائے گا۔ ثابت مرچ  
 کے ساتھ۔“

”تیرے پاس کلوچی ہے کلوچی..... اور اجوائن؟“

”ہاں جی..... دیکھتی ہوں مرزا جی.....“

”دیکھ کیا بنتی ہے تجھے پتہ نہیں.....؟“ وہ قدرے ناخوش ہو کر کہتے۔

”جی کبھی ضرورت نہیں پڑی.....“

”اُوئے اشفاق سارا دن بیٹھا رہتا ہے۔ میں اس کے لیے بڑی اعلیٰ قمون بنا دوں گا۔ کچی بھرنا شتے کے بعد کھلا  
 ہو اور غیرہ سب خارج.....“

”اچھا جی.....“

”لا..... مجھے پیسے دے۔ میں فاروقی کی دکان سے سودا کچھ کر لاتا ہوں.....“

جب میں انہیں پیسے پکڑاتی تو وہ کسمسا کر کہتے..... ”اُوئے کڑیے! یہ تو تھوڑے سے ہیں۔ چل اچھا میں گزارہ کر

”ہو“ ان کا تکیہ کلام تھا۔ جو کچھ نہ ہو سکتا اس پر وہ ”ہو“ کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ جو کچھ سمجھ میں نہ آتا اس پر  
 کہہ کر پردہ پوشی کر لیتے۔ جہاں سے محبت کی آرزو ہوتی اور محبت نہ مل پاتی تو وہ ”ہو“ کہہ کر صبر کر لیتے۔  
 کا مجموعی فلسفہ حیات ”ہو“ تھا۔ لیکن کبھی کبھی ہووے سے نکل کر وہ یکدم اکڑ بھی جاتے اور اپنی بات منوا کر رہتے۔  
 جب حجام آجاتا تو مرزا جی چودھری بن جاتے۔

”اُوئے چلو میں حجامتیں بناؤں گا تمہاری..... نوکی۔ کیسی چلو.....“

خاں صاحب کچھ ڈرتے ڈرتے کہتے ”ناں یا تو کھینچ لے کر..... میں کروا لیتا ہوں۔“

”تو پڑھ بیٹھ کر پڑھا کو..... حجامت میں کراؤں گا۔ مجھے معصوم ہے خلیفے کتنے ظالم بنے جس ہوتے ہیں۔ کھڑا ہو کر  
 سے ترسوں گا.....“

بچے جو حجامت کے نام پر بدکتے تھے پتہ نہیں کیوں مرزا جی کی معیت میں بال کنوا نے کو کھیل تماشا بکھتے۔

”کوئی نیا تولیہ لاکا کی..... یہ تو گندا ہے۔“

”دھل جائے گا مرزا جی..... بال ہی تو کنوا نے ہیں۔“

”اور گندا تولیہ ڈال دوں..... ان کے کندھوں پر؟“

”اب مجھے ایک مگ اور ڈیول لاکر دے۔“

میں سمجھتی تھی کہ ڈیول صرف وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں کسی زخم میں پیپ پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔  
 ”ڈیول کیا کرنی ہے مرزاجی؟“

”کیا کرنی ہے.....؟ ہے نا جھلی۔ میں خلیفے کا استرا، قینچی، سارے اوزار ڈیول میں بھگو کر خود صاف کر کے پتہ نہیں کن کم بخنوں کی جگہ میں جاتا آیا ہے۔ ایویں بچے بیمار کرنے ہیں۔“  
 اس کے بعد وہ بڑے اہتمام سے تولیہ ڈیول گ مع چگان لے کر باہر والے برآمدے کے سامنے دو دنوں بچوں کو باری بار کرسی پر کھڑا کر کے کسی پولیس آپریشن کی طرح حجامت کرواتے۔ اس کے بعد سارے بال سے جمع کرواتے اور میرے پاس لے کر آتے۔ ”مفتی! ان بالوں کو ایک تھیلی میں ڈال دے۔ میں خود جا کر نہر میں پھینک گا۔ تھیلی نہ ہو تو کوئی خاکی لٹا دے۔“

”آپ فکر نہ کریں میں احتیاط سے کوزے میں پھینک دوں گی۔“

”ہے نا پاگل اوکے بالوں پر تو ٹونے ہوتے ہیں۔ لوگ تو نوہ میں رہتے ہیں۔“

غرضیکہ ایک جو مت یوں سروائی جاتی ہے جیسے کوئی بڑا پراجیکٹ ہو.....

مرزاجی کو ہم دونوں سے بڑی محبت تھی لیکن اس کا اظہار انہوں نے کبھی بر ملا نہ کیا۔

کبھی کبھی جب ہم سب صحن میں بیٹھے مفتی جی والی موگ پھلیاں کھا رہے ہوتے تو مرزاجی کہتے..... ”یہ بیوی کھری ہے کھری..... تو اس کی قدر کیا کر اشفاق۔“

”کھری سے آپ کی کیا مراد ہے مرزاجی؟“

”یار میں نے بڑی عورتیں بندائی ہیں۔ میں عورت کو اس کی آنکھ سے پہچانتا ہوں۔ تیری بیوی کی آنکھ میں مرد کے لیے لاجھ نہیں۔ یہ کھری عورت کی نشانی ہے۔ اس کی آنکھ میلی نہیں ہوتی۔ بڑا خوش نصیب ہے تو اشفاق! تجھے ہا سے بہانے میں یہ مرد کو کیسے وغلا لیتی ہیں۔ ایک آنکھ کے اشارے سے بیچارا مرد الٹ بازی کھا جاتا ہے.....“  
 مفتی جی چلے گئے۔

مرزاجی اگلے جہان سدھارے۔

مفتی جی اپنا نعم البدل عکسی کی صورت میں چھوڑ گئے۔

لیکن مرزاجی بھی اپنی نشانی چھوڑنے میں پیچھے نہیں رہے۔

مرزاجی اپنا بھانجا ڈاکٹر عاطف مرزا ہماری خدمت کے لیے دے گئے۔

جب خاں صاحب 2002ء میں بیمار رہنے لگے اور انہیں باقاعدہ ڈاکٹروں کی حاجت رہنے لگی تو ڈاکٹر نے نے سر نکالا۔ ہائی نون لیبارٹریز میں ڈاکٹر صاحب غالباً کوائنٹری کنٹرول کے چیف تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف مرزاجی سے حوالے سے کروایا۔ پھر باقاعدگی سے خاں صاحب کو دیکھنے آتے رہتے۔ انہیں اصرار ہوتا کہ اپنا بریف کسے دیکھ سکتے ہو وہ خود اٹھائیں گے۔

خاں صاحب کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اپنی ذمہ داری کو اور شدت سے محسوس کیا اور مجھے بھی

بگے۔ بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد عموماً ان کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری اور تشویش ابھر آتی.... کبھی خال خالاتے، کبھی نسخے لکھ کر دے جاتے۔ ان کی شکل پر تشویش دیکھ کر بات ٹالنے کی غرض سے میں نے کہا: ”عاطف! آپ کی وائف بھی تو ڈاکٹر ہیں۔ وہ آج کل کیا کرتی ہیں؟“

”وہ جی آج کل قرآن پڑھاتی ہیں۔ الدعوتہ سے انہوں نے فرحت ہاشمی صاحب کا کورس کر لیا ہے۔“

یعنی ڈاکٹری چھوڑ دی۔“

”اندرون شہر نوکری ملی تھی.... جتنی تھیں لیکن بہت دور جانا پڑتا تھا۔ بس چھوڑ دیا۔“

عاطف مرزا کا گھرانہ مذہب کی طرف مائل ہے اور میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ وہ داستان سرائے میں ایک نیا پر کھینچے چلے آتے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کے متعلق جو رائے قائم کرتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی۔ ہمارا علم ہر مقام پر اتنا قلیلا کا شکار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عاطف بھی خاں صاحب کی سے یہ قیافہ لگا چکے تھے کہ شاید ہمارے گھرانے کو مذہب کی شیفتگی اور عمل ویسے ہی نصیب ہو گیا ہے جیسے عاطف کی کو میسر ہے۔ ڈاکٹر غریب کو معلوم نہیں کہ ہم تو سراسر اس شیخی خورے ہیں جنہیں تلاش تو رہتی ہے لیکن بہت کم نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

لیکن اس گھر میں ہم تک جیلہ ہاشمی کیسے پہنچیں یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔

جیلہ ہاشمی تب اتنی بڑی ادیبہ نہ تھی۔ اس کی تخلیقی روح بڑی جاندار تھی لیکن ابھی ادب کا راستہ متعین نہ ہوا تھا۔ مجھے کیسے خبر ہوئی یا جیلہ نے مجھے فون کیا یا پھر کسی طور پر مجھے پتہ چلا کہ جیلہ بہت بیمار ہے اور وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

ان دنوں ساڑھ ہاشمی سمن آباد میں رہتی تھی۔ مین بازار کی سڑک جہاں گول دائرے پر منج ہوئی ہے اس سے کچھ نیچے کے ساڑھ کا گھر تھا۔ جو شہی مجھے جیلہ کا پیہ ملا، میں بھاگ بھاگ ساڑھ کے گھر پہنچی۔ جیلہ بڑی دلبرداشتہ پریشان ایک نئے نما چار پائی پر عجب کسمپری سے عالم میں لیٹی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”میں بہت بیمار ہوں قدیر۔“

”پھر چلو میں ڈاکٹر کو دکھا لاؤں....“ میں نے فوراً مشورہ دیا۔

”نہیں.... میں ڈاکٹر کو دکھا چکی ہوں۔ وہ میری بیماری کا علاج آپریشن بتاتے ہیں۔“

”تو کرا لوناں آپریشن۔ کیا ہرج ہے؟“

ہر احمق آدمی کی طرح میں نے بن مانگے مشورہ دیا۔

”اوئے نہیں بابا.... اگر آپریشن ہو گیا تو پھر میرے گھر بچے کیسے ہوگا.... میرے میاں گدی نشین ہیں۔ ان گنت سبب ہیں۔ وہ کیا ہوں گی؟“

مجھے معلوم نہ تھا کہ جمیلہ سردار محمد صاحب گدی نشین کی اہلیہ ہے اور اتنی لمبی چوڑی زمینوں کی مالک ہے۔  
 ”اچھا تو پھر کیا کریں..... علاج کے بغیر تو جمیلہ کام مشکل ہے۔“

جمیلہ گھنٹی کے بل ہو گئی اور پُر امید لہجے میں بولی..... ”میں نے سنا ہے کہ اشفاق کا کوئی ہو میو پیٹھک واقعہ ہے۔ تم میرا علاج اس سے کروادو۔“  
 واقعی مین بازار میں فاروقی کی دکان کے پاس ایک ہو میو پیٹھک ڈاکٹر تھے۔ ہم بھی وقت بے وقت اس کے علاج کرواتے رہتے تھے۔

”چلوڑائی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ شام کو خاں صاحب آئیں تو تمہیں لے چلوں گی۔“  
 ”نہیں بھی تم مجھے ابھی لے چلو..... اتنی وقت۔ پھر موقع ملے نہ ملے۔“  
 میں کچھ حیران ہی ہو گئی۔

”بھائی میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ کیسے لے چلوں؟“

”دیکھو تم مجھے اپنے گھر لے چلو قد سید..... اس وقت سائڑہ گھر پر نہیں ہے۔ وہ آگئی تو پھر موقع نہیں ملے گا۔ اسی وقت۔“

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میری طبیعت میں عجلت بھی ہے اور ناسمجھی بھی۔ میں بغیر سوچے سمجھے فیصلہ کرتی ہوں اور پھر فوراً اس پر عمل پیرا ہو جاتی ہوں۔ اس وقت کا فیصلہ بھی کسی دانشمندی پر مبنی نہ تھا۔ خاں صاحب عموماً مجھے کئی چیزوں سے پکارا کرتے تھے۔ ان میں ”ناؤنی..... لے بیج..... ہیکلی“ ان کے پسندیدہ تھے۔ سائڑہ کے شوہر دکیل اقبال گھر میں تھے لیکن میں نے ان سے بھی مشورہ نہ کیا۔

میں نے فوراً چار مزدور بلائے۔ جمیلہ ہاشمی کے دو تین کپڑے سادہ سی استعمال کی چند اور چیزیں چار ہاتھ والیں، جمیلہ کو کھاٹ پر لٹا کر مزدوروں کو آرڈر دیا کہ مریضہ کو 479- این لے چلیں۔ میں چار پائی کے ساتھ ساتھ چار مارچ کرتی چلی۔

گھر میں برآمدے کے سامنے وانا کمرہ جو نانا کے لیے مختص تھا اس میں جمیلہ کو پٹنگ پر ڈال دیا گیا۔ یہ کمرہ کشادہ، ہوادار اور ٹھنڈا تھا۔ قباحت صرف اتنی تھی کہ سڑک پر سے آنے والے ٹریک کی آوازیں یہاں ڈرازا یاہوتی ہوتی تھیں۔

شام کو جب خاں صاحب یو ایس آئی ایس سے لوٹے تو میں نے انہیں نانا کے کمرے میں جانے سے روک دیا۔ وہ صورت حال سے ناواقف تھے۔

”لیکن کیوں مجھے وہاں کچھ چیزیں رکھنا ہیں ذاتی۔“

”وہاں جمیلہ ہاشمی آئی ہوئی ہیں..... بیمار ہیں ان کا علاج کرانا ہے ہو میو پیٹھک.....“

پھر میں نے کچھ خوف کے ساتھ کچھ شیخی کے طور پر رام کہانی سنائی۔ خاں صاحب نے لمبی سی سانس لی۔ اس کے بعد کسی قسم کی لعن طعن..... بس چپ ہو گئے۔

ہاں ایک اور بات ضرور ہوئی۔ بچوں کا لمبی ٹرین کا کھیل بھی بند ہو گیا کیونکہ اب انہیں بیمار کے کمرے میں رکھنا ہوتا تھا۔

دوڑے گھر میں نہایت سادہ کھانا پکتا تھا۔ پھل وغیرہ آتے ضرور تھے لیکن وہ بھی کبھی کبھار۔ اگر خاں صاحب کو کھانے کا موقع مل جاتا تو پھر پھل میں افراط نظر آتی۔ ان دنوں دو مور یہ پل کے قریب سبزی اور پھل کی منڈی لگا تھی۔ میں اتنی دور جانے میں بھی کوئی مشکل درپیش نہ آتی کیونکہ ہم غریبی کے دور سے نکل کر اپنے آپ کو امیر سمجھنے لگے تھے۔

جمیلہ کے کپڑے دھونے کے لیے اسے دہانے کے لیے وہی مائی آیا کرتی تھی جس کے ہاتھوں میں اینٹیں اور پتھر تھے۔ بچے چھوٹے تھے۔ گھر کا کام بہت تھا۔ مجھے جمیلہ کے پاس بیٹھ کر گپ بازی کرنے کا وقت کم کم ملتا تھا۔ روز میں اس کے لیے گلو کوڑا کا گلاس بنا کر لے گئی تو جمیلہ بولی۔

”تھوڑی دیر تو تک کر بیٹھ جایا کر قد سید۔“

میں حکم کی تعمیل میں بیٹھ گئی۔

”یہ کھانا کون پکاتا ہے بڑا معمولی ورے کا کھانا پکاتا ہے۔“

میں کچھ شرمندہ ہو کر بولی..... ”کھانا تو خیر میں ہی پکاتی ہوں جمیلہ.....“

”میرا یہ مطلب نہیں کہ کھانا خراب پکا ہوتا ہے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں انہیں طاقت و خوراک دینا.....“

”مثلاً.....“

”گوشت مرغی، قیسمہ..... کھن دی.....“

”وہ بھی پکتا ہے لیکن اینٹیں اور انہیں سبز یاں ہی پسند کرتے ہیں۔ خاں صاحب کو وال پسند ہے اور خاص کر کاپلی۔“

”ہاں یہ..... شیر خاں ابھی دودھ پیتا ہے۔“

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔“

”تم کسی کی فہم نہ کرو جمیلہ میرے ساتھ فورس کرچین ہسپتال چلو..... وہاں ایک بڑی قابل لیڈی ڈاکٹر آئی ہے۔“

”علاج کرواؤ.....“

”پھر وہی بات..... جس طرح میں تیری منطق نہیں سمجھتی تو میری بات نہیں جانتی۔ وہ پکڑ کر آپریشن کر دے۔“

”یہ بومبو پیتھک علاج مجھے راس آ رہا ہے۔ خدا کی قسم اب تو لگتا ہے مجھے کچھ ہوا ہی نہیں۔“

واقعی لگتا تھا جیسے جمیلہ پوری تندرست ہو گئی تھی۔

جب چودھری سردار محمد جمیلہ کو لے کر گاؤں گئے تو میں حیران تھی کہ اتنے غلط فیصلے کا اس قدر مثبت نتیجہ کیسے نکل سکا۔

خاں صاحب کو جانوروں سے بڑی محبت تھی۔ یہ جملہ بڑا بے معنی سا لگتا ہے جیسے کوئی آنٹھوں جماعت کی لڑکی



فون پر آپ سے کہے کہ مجھے اپنی امی سے بڑا پیار ہے لیکن کبھی کبھی کلیشے کے جملے بڑے سچے بھی ہوا کرتے ہیں۔ جب عبد گزر جاتا ہے تو اس سے مستعار لی ہوئی اقدار بھی ماضی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ آج ساری دنیا میں صنعتی ترقی کے اثرات بول بالا ہے۔ دیہات دیہاتی رسم و رواج، دیہات سے وابستہ اقدار سب رول بیک کر رہے ہیں۔ وہ جو ساری دنیا کو پینامیا کرتے ہیں پینڈو کہلائے جانے پر احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ شہری مہذب آدمی جب جانور سے محبت ہے تو کتے کے گلے میں پیکا اور چین ڈالتا ہے۔ بلی کو بچھرے میں بند رکھتا ہے۔ سیزن آنے پر بلی کو نیکا لگوا کر باغچہ کرنا پڑتا ہے۔ طوطا ہے تو بچھرے میں۔ مجبوری سرخا ہے۔ بلبلیں ہیں تو بچھرے میں۔ شہر میں ہر چیز کو قید کر کے رکھا جاتا ہے۔

لیکن دیہاتی لوگوں کی زندگی کھیٹا ہارے آگن میں گزرتی ہے جہاں ریوز گھوڑے کتے، بلیاں، مرغیاں، گائے بھینسیں سب ماحول کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک راستوں پر گھومنا جو ہر میں بطنیں، چھتوں پر کبوتر، گھونسلوں سے چڑیا کے بوت نہ گریں۔ بچپن سے بچے جانوروں سے مانوس ہوتے ہیں۔ نہ انہیں کسی جانور سے خوف آتا ہے نہ وہ کسی Pet ہی سے زبردستی پیار کرتے نظر آتے ہیں۔ دیہاتی گائے، موٹے گنے پیر کھاتے کئی کئی میل کا پنڈا طے کر لیتے ہیں۔ انہیں کے ڈاکٹر سے کچی سلاد کا نسخہ لکھوانا نہیں پڑتا۔ وہ طبعاً بڑے انداز میں جہاں جو چیز کچی نظر آئے منہ مارنے لگتے ہیں۔ چنے ابھی مشکل سے جھاز یوں پر لگتے ہیں تو کچا چھولیا ”ہولیں“ بنالی جاتی ہیں۔ اسی ہری ہو تو اچار بن جاتا، چٹنی تیار ہو جاتی ہے۔ رس نکل سکے تو آم رس بننے لگتا ہے۔ صنعتی انقلاب نے جہاں زرعی طرز یودو باش گنوا کر (اب اس کی تلاش بے معنی اور بے منزل ہے) صنعتی انقلاب نے (از سر نو اس کی تلاش شروع کر دی ہے۔ وہ ہیں وہ اس دین سے بھی کچھڑ گیا ہے جس کی پالنا دیہات میں آسان ہے) خاں صاحب کو جانوروں سے فیشی سی محبت نہ تھی۔ وہ گھوڑے، بھینسیں، کتے، مرغی، بلی، کچھڑے کے ساتھ چلے تھے اور اس محبت میں مصنوعی پن نام کو نہ تھا۔

ان دنوں اشیر خاں بیمار تھا۔ اسے دودھ کی الرجی ہو گئی تھی۔ بھینس کا دودھ اسے ہضم نہ ہوتا۔ زبان پر سوسی جم جاتی۔ کبھی کبھی تے کا عارضہ بھی ہو جاتا۔ سمن آباد کے بازار میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر فاروقی سے ہم بچوں کے دوا کیں لایا کرتے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ہم اشیر خاں کو بکری کا دودھ پلایا کریں۔

ان دنوں جمیلہ ہاشمی ہمارے گھر میں مقیم تھیں۔ جب وہ اپنے گاؤں واپس جانے لگیں تو خاں صاحب نے صاحب سے فرمائش کی کہ اگر وہ کوئی گا بھن بکری بھجوا سکیں تو ہم یہ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ کچھ وقت کے بعد بکری آ گئی۔ مکمل طور پر شہری تھی۔ مجھے کتوں کا تو پھر بھی کچھ تجربہ تھا لیکن بکری سے میں نامانوس تھی۔ مجھے اس کے چارے سے بے رحمی سے گھن اور شکل سے بیزاری ہوتی تھی۔ لیکن میں نے اشیر خاں کی خاطر اس کی نبل سیوا برداشت کی۔

سمن آباد کے اندرونی غسل خانے میں کالے پیروں والی سفید گا بھن بکری کو باندھا جاتا۔ خاں صاحب آ جاتے تو بکری کو آنگن میں اگے ہوئے دھریک کے نیچے لے آتے۔ محمد علی بکری کے لیے چارہ پٹھے لاتا۔ خاں صاحب خود اسے بڑے پریم سے دانہ پٹھے کھلاتے۔ میں ایک فاصلے سے ان کا شغل دیکھتی اور سوچتی کہ کیا انہیں بکری سے کچھ

کے چھینے ہوئے کھلے منہ سے خوف نہیں آتا۔ جس روز بکری نے بچے دیئے یہ بھی عجیب سادان تھا۔ ہمارے  
 سے کسی ایک غسلاخانہ تھا، جس کے ساتھ اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ خاں صاحب صبح بکری بیگم کو اس غسلاخانے  
 سے پٹھے ڈال کر چلے گئے۔ مجھے سمجھا گئے کہ بکری بچہ دینے والی ہے کبھی کبھی دیکھ لینا۔ اب گھر پر بچوں کے علاوہ  
 یہ نہ تھا۔ میرے پاس ان دنوں کوئی ملازم بھی نہ تھا جس سے میں مشورہ کر سکتی۔ ماما بھی زمینوں پر گئی ہوئی تھیں محمد  
 بھی "داستان گو" کے دفتر جا چکا تھا۔  
 میں بہت زور سہتی۔

جب میں نے سمجھا کہ اب وقت کم ہے اور کچھ کرنا چاہیے تو میں گھر کی گلی میں سے باہر نکلی۔ سنا ہے جاہلوں کی  
 سے یہ اللہ فرشتے بھیجتا ہے۔ اس وقت اشیر خاں میری گود میں تھا۔ گھر کے آگے سے ڈوگلی گراؤنڈ کا ایک مانی گزرا۔ یہ  
 کبھی کبھی پھولوں کا گلہ ستہ بنا سجا کر خاں صاحب کی خدمت میں دے جایا کرتا۔ میں نے اسے بلایا تو اس نے اپنی  
 میں رکھ دی اور پوچھا۔

”بی بی جی..... کیا حکم ہے؟“

مجھے اسے سمجھانا تو نہ آیا لیکن میں اسے اپنے ساتھ ساتھ گلی میں لائی۔ دروازہ کھولا تو بکری بلبلا رہی تھی۔ اس کی  
 کہ سن کر شاید وہ خود ہی سمجھ گیا۔ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ مجھے تو نہ اسے کچھ بتانے کی ضرورت پیش آئی نہ اس نے کوئی  
 جواب ہی کیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا اور بولا: ”مبارک ہو بی بی جی! ایک بچہ تو مرا ہوا تھا دوسرا لیلادودھ پی رہا ہے۔“  
 اس وقت محمد علی سکول سے انیق اور انیس کو لے کر آیا۔ گھر میں رونقیں ہو گئیں۔ خاں صاحب کو ”لیل و نہار“ کے  
 ستر میں فون کیا کہ گھر میں اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنے ہو پر سائیکل پر کچھ دیر بعد پہنچ گئے۔ اب بکری کا ٹھکانہ یہی غسلاخانہ  
 تھا اس کی دیکھ رکھیے خاں صاحب اور محمد علی کرتے تھے لیکن اشیر خاں نے اپنی شہری والدہ کی طرح بکری کا دودھ بھی قبول نہ  
 کیا اور اس طرح اسے Cow & Gate کا خشک دودھ ہی پلانا پڑا۔ شہری بچے عموماً سوکھے دودھ اور بوتلوں پر ہی پلا  
 کرتے ہیں۔ گھر سے بکری اور لیلادودھ بھی رخصت ہو گئے۔ خاں صاحب کچھ دن کبھی درخت تلے، کبھی غسلاخانے کے آگے  
 کبھی اندروالی سیڑھیوں کی طرف جا کر کھڑے رہتے جیسے کچھ یاد کرتے ہوں۔ اپنی بے وفائی کا احساس اور بکری کا اس گھر  
 میں نہ رہنے کا جواز ہونے والے روز مرہ کے حوالے ہو گیا اور مسائل جنم لینے لگے۔ مختلف راحتیں شکل دکھانے لگیں اور خاں  
 صاحب نے اس بکری کا پھر کبھی ذکر نہ کیا جسے وہ بڑے پیار سے تھپتھپایا کرتے تھے اور ہاتھ سے پٹھے کھلایا کرتے تھے۔ وہ  
 جانتے تھے کہ شہری زندگی ایسی محبتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہاں جانور کو پنجرے میں بند پڑنے میں قید ڈسپلن کے کھونٹے  
 سے باندھ کر ہی رکھا جاسکتا ہے۔

اشیر خاں سوکھا دودھ شوق سے پینے لگے۔ ان کی بوتل Sterilize کرنا پڑتی۔ دودھ ابلے پانی میں بنانا ہوتا۔  
 اس دودھ کے کئی منٹے اور شرائط تھیں۔ بکری کے لیے کچھ بھی کرنا نہ پڑتا تھا۔ نہ میں نے اسے باندھنا کبھی دانہ چارہ دیا لیکن  
 جب بکری محمد علی کو عنایت کر دی گئی تو میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ مجھے اب گھر سے بونہیں آتی تھی۔ غسلاخانے صاف  
 سترے ہو گئے تھے۔ مجھے یوں لگتا جیسے کوئی نحوست ختم ہو گئی۔ بکری غریب رشتہ دار تھی۔ رخصت ہوئی تو اطمینان ملا۔ نادار

رشتہ دار روئیاں بھی پکاتا ہے۔ جھاڑ پونچھ صفائی ستھرائی بھی دیکھتا ہے۔ کپڑے دھونے میں بھی کوئی عار نہیں۔ نائنگیں پہنکھا جھلنے میں بھی اپنی عزت محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس امیر صاحب حیثیت رشتہ دار پانی کا گلاس بھی خود لاکر نہ سکتا۔ وہ آپ کی آراء پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ آپ چاہے پی ایچ۔ ڈی ہوں چاہے امریکہ پلٹ پیٹنٹ سیشنلسٹ وہ آپ سے علم کم جانکار اور سوسائٹی کا ناکارہ پرزہ سمجھتا ہے جو اپنی جہالت کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے۔ میں بھی اس سے چھٹکارا حاصل کر کے بڑی پرسن تھی۔ اب میرے پاس خشک دودھ اور اس کی کہانی تھی۔ اس کے استعمال نے مجھے کئی طرح سے سر بلند بھی کرنے میں مدد دی تھی۔

لیکن خاں صاحب دیر تک کمری کے بغیر خوش نہ رہ سکے۔ ایک دن ان کے ہاتھ میں ایک پنجرہ تھا جس پر سائیکل کے اوپر ایک لمبا سا ڈبہ دھرا تھا جس پر ہوائی جہاز کی تصویر بنی تھی۔ یہ ”نیل ونبار“ کی ایڈیٹری کا زمانہ تھا۔ خاں صاحب کے پاس ہو پر سائیکل تھی جسے ان کا آفس بوائے عبداللہ جان یوں صاف کرتا جیسے وہ کوئی بی ایم ڈ بلیو یا امریکن ہو۔ پنجرہ گھر کے آگن میں کھٹنے والے برآمدے میں رکھا گیا۔ دوسرا ڈبہ خاں صاحب کی لائبریری میں رکھ دیا گیا۔ پنجرے میں سرے تھے۔ اینٹ اینٹ اور اٹیر کھستے کھسکتے پاس آگئے۔ پنجرے کے اندر چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں پانی ڈالا گیا۔

میرے تینوں بچوں میں سے انیس احمد خاں میں جانوروں سے موروثی محبت زیادہ ہے۔ وہ بڑی بڑی جانور تک پرندے اور جانوروں کی صحبت میں رہ سکتا ہے۔ انیس شغف اور دلچسپی سے دیکھ سکتا ہے۔ ان کی خدمت میں راحت پاتی ہے۔ وہ جانوروں کے ساتھ رہ کر اپنی ازلی معصومیت کے ساتھ ساتھ خوش رہتا ہے۔ سرے بھی ان کی ملکیت بن گئے۔

وہ پنجرے کے پاس بیٹھ کر ان کی چھوٹی چھوٹی آرائیں دیکھتا۔ ٹرکیوں جیسے نرم و نازک ہاتھوں سے انہیں ڈالتا۔ کبھی کبھی پھر پھر کہہ کر اڑاتا۔ اینٹ خاں ایسے میں اسے منع کرتا کہ مداخلت ہے۔ طبیعتوں کے جوہر بچپن ہی سے واضح ہونے لگتے ہیں۔ اینٹ خاں شائستہ رڈ شائستہ مزاج، کسی کو زبردستی اڑانے یا ہٹانے کا قائل نہ تھا۔

اشیر نے ان دنوں تھوڑا سا دوڑنا سیکھ لیا تھا۔ جب بھی دونوں بڑے بھائی پچھلے برآمدے میں سرخا پارٹی کرتے وہ بھاگ کر آتو جاتا لیکن اس کے یوں پر ایک ہی تکرار ہوتی ”نیپ کارڈر لینا....“ وہ ہمیشہ سے مشینوں کا شوقین تھا۔ اسے موم بتی بھی مشین لگتی تھی۔ اگر کبھی بجلی چلی جاتی اور موم بتی جلانا پڑتی تو وہ بھاگا آتا ”باقی لینا.... موم باقی لینا“ اس کے سر پر گیت کے لکھڑے کی طرح جاری رہتا۔

ہمارے گھر کے آگے دونوں جانب گراؤنڈس تھیں۔ ایک ڈونگی گراؤنڈ تھی جس کے قریب صوفی صاحب گھر تھا اور جہاں خاں صاحب صوفی صاحب سے ملنے جایا کرتے تھے۔ دوسری گراؤنڈ سے گزر کر بازار آ جاتا تھا۔ اس میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ ایک روز جب ہم وہاں پہنچے تو خاں صاحب نے کہا..... ”ڈاکٹر صاحب! مجھے کئی طبیعت پھر ٹھیک نہیں لگتی۔ دودھ تو وہ اب ڈبے کا پیتا ہے لیکن اس کی زبان صاف نہیں جیسے کچھ سفید چمٹا ہوا ہے۔ آ نکھیں بھی دھندلی ہیں۔“

میں نے ان دونوں باتوں کا نوٹس نہ لیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب تھوڑے تھوڑے مافوق الفطرت اشاروں کے آدمی بھی تھے۔

کہنے لگے..... ”کوئی پرندہ ورنہ تو نہیں پال رکھا؟“

”چھ مہینے سرنے ہیں۔ بڑی رونق لگا رکھی ہے۔ بچے انہیں باجرہ ڈال کر خوش ہوتے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب خاموشی سے پڑیاں بناتے رہے۔ ساتھ ساتھ کچھ ہوں ہاں کا شغل بھی جاری رہا۔

”یہ پڑیاں ہر چار گھنٹے بعد..... اور اگر آپ برآمد نہیں خاں صاحب! پرندے آزاد کرویں۔ آپ کے بیٹے کو

سزا کا آدمی مل جائے گی.....“

جس روز خاں صاحب نے سرنے آزاد کیے وہ ڈبہ جس پر ہوائی جہاز کی تصویر تھی، لاہریری منگوایا گیا۔ یہ ایک

تھوڑے لمبی سی تار اور بیڑی سے اڑتا تھا۔ اس کا ڈیزائن سامنے رکھ کر جوڑا گیا۔ خاں صاحب میں جو بچہ تھا، اس نے

اس سے اپنے بچوں کی چھیڑ چھاڑ سے اسے بچا کر کھانے کے کمرے کی میز پر یا سٹر پلان بچھا کر جوڑا۔ بیڑی لگائی۔

کھانے کے کمرے کی میز پر لگائی۔ جب ہوائی جہاز کی اڑان تسلی بخش ہوئی تو وہ بچوں کو اپنے ساتھ اوپر لے گئے۔

ہوایں اڑ جانے والے سرنے گویا اپنا غم تبدیل چھوڑ گئے۔

اب ساری تو جاس ہوائی جہاز پر تھی جو غائب ہوا اور میں اپنی نوعیت کا پہلا کھلونا تھا۔

مجھ سے بات ہے سرنے اڑ جانے کے بعد اشر خاں کی زبان بھی صاف ہو گئی اور باقاعدگی سے اپنے بھائیوں

کو سزا دینے کا دودھ پینے لگا لیکن اس کی ایک خواہش سرد نہ پڑتی۔ اب بھی جب وہ کمرے میں بھاگتا..... ایک ہی

”تسلی کا رڈ لینا..... موم بتی لینا.....“

موم بتی تو آسان کام تھا۔ ریکارڈ دینا ابھی میرے بس کی بات نہ تھی۔ کیونکہ نیوریلکو میپ ابھی گھر میں نو وارد تھا

تھا۔ صاحب بیست بیست کر رکھتے اور بڑی کنجوسی سے استعمال کرتے۔ انہیں خاں نے اسے البتہ چلانا سیکھ لیا تھا

تھا۔ ابھی ابھی ابھی ابھی ابھی میں جب وہ اسے چلا لیتا تو اسبق کا وہی لہجہ ہوتا..... ”اسے مت چلاؤ کیسی..... ابو ناراض ہوں

اس بیماری سے نجات تو مل گئی، لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ بیماریاں عموماً اپنے چنگے پونے انسانی جسم میں بطور

مخفیہ چھپ جاتی تھیں۔ لیکن ابھی کچھ دیر کے لیے عافیت رہی۔ پھر انہیں بیمار پڑ گیا اور اسی سلسلے میں نہ جانے کہاں سے

ڈاکٹر ظہیر کو پکڑ کر لے آئے۔

کشمیرا روپی ڈاکٹر ظہیر ہمارے گھر میں بڑی راحتیں لے کر آئے۔ وہ نہ صرف معالج تھے بلکہ نفسیات داں بھی

تھے۔ معالج کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے خوف بھی دور کرتے اور ہمیں تسلی بھی دیا کرتے۔ ایک رات انہیں کو بہت تیز بخار تھا۔

میں نے اپنے گھر نہ گئے بلکہ ہم دونوں کے ساتھ انہیں کے پانگ کے ساتھ جڑ کر بیٹھ رہے۔ رات گئے انہیں میری گود

میں سے ہٹا کر اشر آدھی رات کی فیڈ کے لیے جاگ گیا۔ ظہیر بولے..... ”خاں صاحب! اشر کے لیے فیڈ بنالائیں۔ انہیں

کیوب مشرب کرنا ٹھیک نہیں۔“

”بھائی میں نے تو کبھی دودھ نہیں بنایا۔“

پہلے ڈاکٹر صاحب نے سمجھانا چاہا کہ ڈبے کے دودھ کا فارمولا اس کے اوپر لکھا ہوتا ہے۔ اسے پڑھ کر لیکن پھر ڈاکٹر اٹھ کر باہر چلے گئے..... کچھ دیر بعد واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی.....

”آپ مجھے ساتھ لے چلتے ظہیر۔“

”ناں جی اصل کام تو کیا پڑا تھا۔ بوتل sterilize کرنا پڑتی تو وقت لگتا..... وہ تو تیار لائن میں پڑی ہیں۔ انیس کا بخار صبح سویرے ٹوٹ گیا۔ ہم دونوں سراپا تشکر تھے۔“

”اسے دوائی کونسی پلائی تھی ڈاکٹر صاحب۔ اتنے دنوں سے مسلسل بخار..... ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔“

”کچھ نہیں سر! ایک گولی اسپرو..... یہ بڑی زوداثر ہے۔ جب کبھی بڑی دوائیاں کام نہ دیں اسے آنت

چاہیے۔“

یہاں سے ڈاکٹر اور خاں صاحب کی دوستی شروع ہوئی۔ ان کا کھینک موہنی روڈ پر تھا اور وہ زیادہ تر مریمین مفت علاج کرتے تھے۔ ہمارے بھی وہ فیملی ڈاکٹر بن گئے۔

ابھی ہمارے پاس گاڑی نہیں تھی۔ بوپر کی جڈاب Lambretta سکوٹر آگئی تھی جسے خاں صاحب خوش چلاتے تھے گویا مرسیڈیز ہو۔ بڑا اچھا موسم تھا نہ سردی نہ گرمی بچے نکلے تھے ہم دونوں یو ایس آئی ایس سے وابستہ اس لیے راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ ایک شام خاں صاحب آئے کچھ شکر تھے۔

”کیا بات ہے شوق جی؟“

”وہ..... یا منی کرشنا مورتی آرہی ہیں۔“

”کون؟“

”کیرالہ کی بہت بڑی فنکار ہیں۔ وہ لارنس باغ کے اوپر تھیٹر میں بھارت ناٹیم اور کٹھک کلاسیکی ناچ کریں گی۔ میری آرزو تھی کہ تمہیں اس کا شو دکھلا دیا..... تم شادی سے پہلے ناچ سیکھا کرتی تھیں ناں.....“

”ہاں جی ایک استاد صاحب آیا کرتے ناہمی دھنا نہ دھی دھنا سکھایا کرتے۔ کچھ کلاسیکی بول تو مجھے یاد ہیں۔ لیکن میرا سیکھنا سکھانا کچھ دیر کے بعد آپ ہی بندگلی میں جاگھستا ہے۔ آپ کو پتہ ہے ناں کچھ دیر میں سیکھا تھا۔“

”اچھا کچھلی باتیں چھوڑ۔ جانا چاہو گی؟“

”اس سے بہتر خوش اوقاتی اور کیا ہو سکتی ہے۔“

”لیکن بچوں کا کیا کریں..... کس کے پاس چھوڑیں؟“

”نانا آج ہی آئی ہیں۔ اندر بچوں کے ساتھ لوڈ وکیل رہی ہیں۔“

”لوجی مسئلہ حل ہو گیا۔ دو تکیے تیار کر لو۔“

یا منی کرشنا مورتی نے اپنے ناچ سے سب کو مبہوت کر دیا۔ ایک ناچ تو خاص طور پر یادگار تھا۔ اس نے ایک

میں نے کہا کہ آپ کو بپ دکھایا جو مہاراج کرشن کی عبادت کرنے جاتی ہے اور کیسے اپنے آپ کو اپنے ہار سنگھار کو لکھ بھر کے لیے  
 پہنچا۔ ایک ایک ایکشن تکبیر شیخی اور خود نمائی تھی۔ سارا اوپن ایئر تالیوں سے گونج اٹھا۔

مجھے اور خاں صاحب کو کسی مہربان نے بالکل سامنے والی قطار میں بٹھا دیا تھا۔ جونہی پروگرام ختم ہوا ہم بڑی  
 سہولت سے سرخوشی میں پھنسے بغیر باہر نکل آئے..... باہر ہمیں ظہیر اپنی کار میں منتظر ملا۔

”وہ آپ کو بھی شوق ہے کا ایسی ڈانس کا.....“

”نہیں خاں صاحب! میں گھر گیا تھا۔ امی نے بتایا آپ دونوں یہاں آئے ہیں۔ میں تو آپ کو لفٹ دینے آیا

”ہم سکوٹر پر چلے جائیں گے ڈاکٹر صاحب.....“

”خاں صاحب! سکوٹر پر آ جائیں آپ میرے ساتھ چلیں۔“ انہوں نے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھنے کی  
 دعوت کی۔ راستے ایک ٹرینڈرائیور کی طرح خاموش رہے۔

”میں ٹرینڈرائیور کے ساتھ ساتھ خاں صاحب ریڈیو پاکستان سے 1963ء سے وابستہ ہو گئے جہاں دو تلقین شاہ

تھے لیکن تلقین شاہ پروگرام کرنے کی ایک وجہ ہو گئی۔ خاں صاحب یو آئی ایس پر V.O.A. (وائس آف

امریکہ) کے لیے پروگرام کرتے تھے۔ یہاں انہیں مارلاک ملا جو V.O.A. پروگرام کا کرتا دھرتا تھا۔ ایک مرتبہ خاں

صاحب نے ایک پروگرام لکھا جس میں تلقین شاہ کا کیریئر ڈیٹا ملا۔ اس کے پانچ رول تھے اور پانچ مختلف لب ولہجہ کے ساتھ

تھے۔ یہ رول ادا کیے۔ مارلاک اردو پنجابی یا سمانہ کی یوٹی تو نہیں جانتا تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ

یہ رول کرنے والے خواجہ سلیم اور چند دوسرے لوگ جو سٹوڈیو میں موجود تھے اس پروگرام سے بہت منظور ہوئے۔

پھر امریکہ سے بھی آنے لگی اور اسے کئی بار لگایا گیا۔ ایک روز مارلاک نے خاں صاحب سے امریکن انگریزی

”اشفاق! تم ایک کام کیوں نہیں کرتے؟“

”تو پہلے کیا میں کم کام کرتا ہوں..... جو ایک اور بھی کر لوں؟“

”ایک پروگرام کرو ریڈیو پاکستان سے..... کئی پروگرام کرنے کے بجائے ایک پروگرام۔ خدا جانتا ہے یہ اتنا

مہنگا ہوگا کہ لوگ تمہیں اسی پروگرام کے حوالے سے یاد کریں گے۔ ایسا کردار پیش کرو جو بڑا Lovable ہو لیکن

”خبروں کو نصیحت کرے اور اپنے پر کسی قسم کی پابندی نہ لگائے۔“

مارلاک تو ماچس جلا کر خاموش ہو گیا لیکن خاں صاحب کی تخلیقی لکڑی میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے ترنت تلقین

کرو کر دیکھ لیا۔ پھر اس کی کمینگی کو ابھارنے کے لیے ہدایت اللہ کو جنم دیا۔ ریڈیو سٹیشن سے انہیں بھائی نذیر حسینی مل گئے

”نصیحت اللہ کے روپ میں امر ہو گئے۔“

میں آپ سے عرض کر چکی ہوں کہ جب اللہ اچھے دنوں کی دستک دیتا ہے تو پھر وہ آپ کو وہ تقویت اور توانائی

دیتا ہے جس کی مہربانی سے آپ ہمت طاقت سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بڑی استقامت سے

سارے کام بڑی کامیابی اور خود اعتمادی سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ شرط صرف ایک ہے کہ اوپر والے کو آپ کی کامیابی مطلوب ہو۔ سب سے بڑی امدادِ غیبی ہے کہ آپ کی تجویز، عمل اور فیصلہ مثبت نتائج مرتب کرنے لگتا ہے۔

تلقین شاہ آنا فانا مشہور ہو گیا اور لوگ پروگرام کو شیدول بنا کر دیکھنے لگے۔ جس قدر شہرت تلقین شاہ کو ملتی تھی ایسی ہر دعویٰ بڑی ہدایت اللہ کے نصیب میں بھی تھی۔ وہ جب بھی گھر آتے ان کے ساتھ خاں صاحب کے ساتھ ساچی پان ضرور لاتے۔ تلقین شاہ 39 سال چلانا سوائے دو سال کے جب بے نظیر بھنٹو آئی تو اسے دو سال کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ دو سال کے لیے انہیں اردو سائنس بورڈ سے بھی بند دیا گیا لیکن نذیر حسینی کے کردار میں نہ پروگرام کوئی تبدیلی آئی نہ ان کے رویے میں ہی۔ وہ پہلے دن سے لے کر آخری پروگرام تک شاہ جی کے مؤدب جاں شہزادہ رہے۔ شروع میں اس پروگرام میں رقیہ کا کردار ابوالاثر حفیظ چاندھری کی دوسری بیوی خورشید بیگم کیا کرتی تھیں۔ دوسرے کئی کردار آئے اور چلے گئے۔ عائشہ تسلیم ایک مدت اور مرتضیٰ برلاس کی بیگم فریدونے کافی دیر اس میں رویہ کیا ریاض محمود صاحبزادہ صاحب کے روپ میں اس پروگرام میں شمولیت کرتے رہے لیکن ہدایت اللہ اور تلقین شاہ ہمیشہ ساتھ رہے۔ اب تو اس پروگرام کو "گینفر بک" میں بھی تیسرے مقام پر جگہ مل گئی ہے کہ پاکستان میں اتنی دیر تک اور ان کی کرداروں کو مرکز بنا کر کوئی پروگرام نہیں چلا۔

خاں صاحب کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کوئی کام کرتے مجھے اس میں شرکت کی دعوت ضرور دیتے۔ میں نے بھی کچھ عرصہ تلقین شاہ میں کام کیا لیکن میں یہ کام بھانہ سکی۔ ریڈیو سے قدر تک اس پروگرام کی ریکارڈنگ برسوں کرتے رہے۔ پھر جب ہمارا گھر داستان سرائے میں بن گیا تو خاں صاحب نے اوپر والی منزل پر ریکارڈنگ روم اور مشین لیا۔ انیس ایم بی اے کی تیاری کر رہے تھے لیکن ساتھ ساتھ انہوں نے ریکارڈنگ کی ساری ذمہ داری اٹھالی۔ انیس ایک ایک عجیب بات ہے کہ وہ جس شخص سے محبت کرتا ہے اس کے کام آنے کی کوشش کرتا ہے۔ انیس بیسے کو باپ سے محبت تھی۔ اس نے ریکارڈنگ ہی نہیں کی بلکہ تلقین شاہ کے تمام اکاؤنٹ اکاؤنٹ کی پے منٹ کی رسیدیں اور ایک maintain کیا۔ وہ ہر تلقین شاہ کی تاریخ، سال، وقت تو نوٹ کرتا ہی تھا لیکن اس رجسٹر میں ہر پروگرام کی پہلی اور آخری مطر بھی لکھتا۔ اب میں حیران ہوتی ہوں کہ نہ جانے کیسے وہ سارا حساب کتاب لے کر اور صد اکاروں کی رسیدیں ترتیب وار لے کر ٹیکس والوں کے دفتر بھی جاتا رہا اور ٹیکس کے ضمن میں خاں صاحب کو کبھی کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ جب پی آئی اے میں ملازم ہو کر انیس کراچی چلا گیا تو پھر ائیر نے ریکارڈنگ شروع کر دی۔ ائیر طبعاً مشین کے قریب ہے۔ اسے مشین دکھادیں تو وہ اس کی کارکردگی کو بآسانی سمجھ جاتا ہے۔ اکاؤنٹ اور رجسٹر تو اس کے بس کی بات نہ تھی، گو وہ مارے باندھے یہ بھی پنپاتا تھا۔ لیکن پہلی ریکارڈنگ سے لے کر آخری ریکارڈنگ تک خاں صاحب کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملا۔

ائیر خاں کی شادی کے بعد رفیق میاں ہمارے ساؤنڈ انجینئر بنے۔ وہ باقاعدہ اور باضابطہ طور پر اردو سائنس بورڈ میں ملازم تھے لیکن شام کو ہمارے پاس آ کر کام کرتے تھے۔ ساری مشینوں کی دیکھ دیکھ بڑی ریلوں پر ان کی مشینوں کی ٹیپوں کی گنتی شمار، سکرپٹوں کو اہتمام سے رکھنا رفیق احمد کا معمول تھا۔ البتہ انیس کی طرح اکاؤنٹ نہ رکھے جاسکے جس کے

س نے اپنی خدمات حاضر کر دیں۔ اب کاسٹ کے چیک اور رسیدیں میں بناتی تھی۔ ٹیکس کے لیے ایک وکیل مقرر کیے جو سال بہ سال ٹیکس لگوانے کے لیے پیش ہوا کرتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک خاں صاحب تھے۔ وہ بے وفائی نہیں کر گئے۔

اب یہ سارے اکاؤنٹ رجز غرضیکہ تلقین شاہ کی ہسٹری ”دبستان شہابیہ“ لوک ورثہ اسلام آباد میں محفوظ ہے۔ تحقیق اور تجسس کے زرخے میں رہتے ہیں وہاں جا کر تحقیق کر سکتے ہیں۔

ہر پروگرام کے دو حصے ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ حصہ جو Product کی شکل میں قارئین سامعین اور ناظرین تک پہنچتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ تیاری کے مرحلے ہوا کرتے ہیں جس میں سکرپٹ، کاسٹ، سٹوڈیو، کیمرے، تکنیکی سٹاف، سٹے لے جانے کی گاڑیاں، مقررہ اوقات کی پابندی عجیب مصیبت ڈالتی ہے لیکن اصلی قباحت انسان اپنی طبعی خصوصیات کے تحت اپنے ذاتی حالات کے پیش نظر اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ یہاں عموماً کئی مجبوریاں باہم ٹکراتی ہیں۔ بڑے بڑے عموماً خوشامد پسند اور وقت کو اپنے آپ پر لاگو نہیں سمجھتے۔ اگر وہ لیٹ ہیں تو لازماً سب کو خوشی سے انتظار کرنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا والدہ کے جنازے سے کچھ تاخیر سے پہنچے تو بڑا آرٹھ کسی کو بتائے بغیر گھڑی دیکھ کر رخصت ہو جائے تو سب صدمہ لگتے ہیں۔ یہ نہ سمجھتے کہ بڑا آرٹھ جان بوجھ کر بددماغی یا بد مزاجی اختیار کرتا ہے۔ ہر بڑے آدمی کی زندگی میں ہی built خرابی ہوتی ہے جیسے کسی کسی نئی مشین میں کبھی کبھی کوئی manufacturing نقص ہوتا ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ تلقین شاہ کی ریکارڈنگ میں خاں صاحب کو نہ کاسٹ کی مزاج داریاں اٹھانی پڑیں نہ ٹیکنیکل سبب کی غٹیں کرنا پڑیں۔ خاں صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو محبت کے پالنے میں پروان چڑھے۔ کچھ عرصے بعد شاہان کی خوش نصیبی سے حسد کرتے ہوں لیکن کیا کیا جائے اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسروں پر ہر معاملے میں فضیلت بخشتا ہے۔ کیا کیا جائے اگر اس نے مرد کو عورت پر فوقیت عطا کی۔ اب عورتیں اس بات کو غلط ثابت کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ لیکن انہیں شاید علم نہیں کہ جہاں فضیلت ہوتی ہے وہاں ذمہ داری بھی تو اسی تناسب سے زیادہ ہوتی ہے۔

ہر مرد اسی فضیلت کے ہاتھوں عورت، گھر بار، اولاد، والدین کا بار بردار غلام بن جاتا ہے۔ ہر بڑا آدمی جسے بیت، عزت، شہرت، سوسائٹی میں اونچا مقام مل جاتا ہے اس پر معاشرے کو اسی تناسب سے احسن طریق پر بہتر چھوڑ کر جتنے کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے۔ وہ اپنی لائف بوٹ گھاٹ پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے ساتھ کئی بجزے کشتیاں، نئے پھوٹے پھٹوں پر سوار لوگ ساتھ ہو جاتے ہیں۔ خاں صاحب بھی ساری زندگی نعمتوں کی وصولی کے بعد بڑے تنگ روپ میں قرض حسنہ کے طور پر اس بڑائی کی قیمت ادا کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی ذمہ داری ایک باپ کی طرح محسوس کیا کرتے تھے اور اس ذمے داری کا کوئی بوجھ محسوس نہ ہوتا۔

یوں کہہ لیجیے کہ 479- این میں کیریئر کے اعتبار سے خاں صاحب نے کئی معر کے مارے۔ 479- این ایک عرصے سے بہت ہی اہم اور Eventful جگہ تھی۔ یہاں خاں کی اہمیت ان کے کام کے اعتبار سے بہت بڑھ گئی۔ 16 اگست 1968ء کو انہیں گلڈ کاسکریٹری بنا دیا گیا۔ یہ گلڈ ایسوسی ایشن کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ گلڈ میں کام کرنے



کے ساتھ ساتھ خاں صاحب کو ایڈیٹر "لیل ونہار" کی نوکری مل گئی۔ Progressive Papers کا دفتر میوہستان سامنے تھا۔ اسی دفتر میں سیکرٹری سرفراز صاحب نے خاں صاحب کو 21 اپریل 1959ء کو نوکری دلائی۔ قریباً دو سال بعد 15 مارچ 1961ء تک خاں صاحب "لیل ونہار" کا رسالہ باقاعدگی سے نکالتے رہے اور اپنی ہوپر سائیکل پر سمن آجہاں دفتر آتے جاتے رہے۔ اس کے بعد تو یو ایس آئی ایس نے خاں صاحب کو مکمل طور پر جذب کر لیا۔ حتیٰ کہ 1963ء میں برکے Exchange پروگرام میں امریکہ چلے گئے۔

لیکن یو ایس آئی ایس ایک بالکل نیا تجربہ اس اعتبار سے تھا کہ پہلی بار خاں صاحب کے انق پر امریکہ ابھرا۔ مارلاک یو ایس آئی ایس میں وی او اے کا کرتا دھرتا تھا۔ دبلا پتلا خوش شکل امریکیوں کی طرح خوش مزاج اور آپ کو درست سمجھنے والا ہر وقت اپنا نکتہ نظر سمجھانے پر مصہر شاکستہ زو شاکستہ زبان آدمی تھا۔ بہت بعد میں کسی نے یہ پتہ لگایا کہ مارلاک دراصل سی آئی اے کا آدمی تھا اور اس کی ڈیوٹی میں خاں صاحب کو monitor کرنے کی ذمہ داری تھی۔ تب ہماری جنرل نوٹج اتنی نہ تھی کہ میں امریکہ بہادر یا پھر سی آئی اے کی اچھی طرح سے سمجھ آ سکتی۔ ہمارے بہت بہت تھا کہ خاں صاحب کو ایک پروگرام لکھنے اور پھر اسے ریکارڈ کرنے کے لیے 180 روپے ملتے ہیں۔ رفتہ رفتہ میں کچھ پروگرام لکھنے لگی اور اس طرح ہمارے پاس پیسوں کی ریل بنیل ہو گئی۔

مارلاک کی وساطت سے یو ایس آئی ایس کے دفتر میں خاں صاحب کی ملاقات خواجہ سلیم سے ہوئی۔ وہ اے کے لیے خاں صاحب کے پروگرام ریکارڈ کرتے تھے۔ خواجہ سلیم ایک انتہائی شریف النفس کم گو اور محبت میں پت انسان تھے۔ مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی اس بات کا برملا ذکر نہیں کیا۔ خواجہ سلیم خورے نہ تھے اس لیے انہیں کسی قسم کے سرٹیفکیٹ دکھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ گھر آتے تو باورچی خانے میں صحن پر بیٹھ کر چپ چاپ جو کچھ ملتا سمبر و شکر سے کھاتے۔ ان کی محبت کا اظہار لڑکیوں جیسا تھا۔ خاں صاحب کا ہاتھ کھڑے رہتے اور انہیں تنکے جاتے۔ انیس ان کی طرف کھنچا جاتا۔ مجھے دیکھ کر بھائی بھائی جی کا ورد کیے جاتے۔ ان کی ایسی تھی جیسے اجوہ کھجوریں خالص شہد میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

جب خاں صاحب نے "دھوپ سائے" بنائی تو خواجہ جی ہی اس فلم کے Recordist تھے۔ انہیں دس روز کے retake کے لیے کہا جاتا۔ ان کے ماتھے پر کبھی بل نہ پڑتا۔ ٹھنڈے ٹیٹھے مزاج کے خاں صاحب کے چلے جانے کے خواجہ جی میرے پاس آتے رہے۔ ان کی طبیعت پر گہرے Depression کے اثرات تھے جیسے وہ اپنی ہی مٹھاس کے ہاتھوں عاجز آ چکے ہوں۔ افسوس جس طرح خاں صاحب ان کا ہاتھ پکڑتے تھے مجھ سے خواجہ جی کی محبت لوٹائی نہ گئی۔ میں جو بناوٹ ہے غالباً اس کا بھیدان پر اور ان کی ڈاکٹرناہید پر کھل گیا ہوگا۔ ہولے ہولے ان کے پھیرے کم ہوتے گئے اور خواجہ جی بھی بغیر کسی طور پر ملے ہم سے رخصت ہو گئے۔

خواجہ جی کے ساتھ بھائی احمد علی کی بھی اسی یو ایس آئی ایس میں ملاقات ہوئی۔ جس قدر خواجہ جی دھیرج پسر تھے اسی قدر بھائی احمد علی بلند بانگ رولار پتا اور اپنی منوانے والے تھے۔ رام پور سے ہجرت کر کے یہ غیرت مند پنڈت لاہور پہنچا تھا۔ غالباً سب سے زیادہ وہ خاں صاحب سے وابستہ تھے۔ وہ گھر آتے تو سب کو follow on کا حکم دیتے۔

میں چلا جاتا۔ وہ قیمرہ ساتھ لاتے۔ اس میں کچھ بالائی ملا تے۔ تھوڑا قیمرہ ابال کر ڈالتے۔ کسی کو کبابوں کی انگیٹھی کہتے تھے۔ بہارت نہ ہوتی۔ بڑے لذیذ کباب بناتے اور سب سے پہلے خاں صاحب کو چکھاتے اور صرف انہیں ہی کھاتے تھے کہ وہ پنکھالے کر کبھی کبھی انگیٹھی سے شعلے اٹھادیں۔ وہ دور نہ جانے کب ختم ہو گیا۔

یہ سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ بھائی احمد علی نے لاہور کالج میں ایک دکان کھولی جسے پی آئی اے نے Sponsor کیا۔ اس پر سامان رعایتی قیمتوں پر مقرر کرتا تھا۔ خاں صاحب کے چلے جانے کے بعد بھائی احمد علی سے رابطہ قائم ہے لیکن اس میں سوسائٹیز اور محبت نہ تھی جس سے رشتے نامٹے سیراب ہوتے ہیں۔

یو ایس آئی ایس کی بدولت ہی 1963ء میں پہلی بار خاں صاحب امریکہ گئے۔ یہ Berkeley Education پروگرام تھا۔ اس میں چند نکھاری پاکستان کی طرف سے بریڈ فورڈ گئے انہیں وہاں جا کر کچھ لکھنے لکھانے کی سہولتیں دیاں گئیں۔ انہیں امریکہ کے وہ دانشور جو اس پروگرام کے کرتا دھرتا تھے ان سے ہمیشہ کی طرح یہ پروگرام بہت ابتدائی رکھا۔ امریکی یہ سمجھتا ہے کہ کالا آدمی سرے سے کچھ نہیں جانتا اور اسے کھانا دیکھا کر یہ بھی بتانا چاہیے کہ ”غائب علمو ایہ مانیکر فون ہے۔ اس سے آواز ریکارڈ کی جاتی ہے۔“ یہ Creative کی کلاس کی تھی۔ خاں صاحب کے لیے جو کئی پروگرام ریڈیو پر کر چکے تھے جو صاحب کتاب بھی تھے اور جو ان کے لیے ”داستان گو“ نکالتے رہے تھے اور ”لیگل ونہار“ کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ان کے لیے یہ ساری پرنٹنگ سہولتیں دوسرے ممالک اور ایڈیٹوں سے دوستی کے لیے یہ عہدہ بار آور ثابت ہوا۔

جن دنوں خاں صاحب برکلے پروگرام پر گئے، وہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے ظفر کو تار کید کر گئے۔ ظفر خاں کے رشتہ دار دوست اور راز دار بھی تھے۔ درمیانہ قدر گوری رنگت ذرا بھاری جسم والے ظفر کو بچے انکل ظفر کہتے تھے۔ ان کی رعایت سے میں اور خاں صاحب بھی انہیں انکل ظفر ہی کہا کرتے تھے۔ بھاری چہرے پر موٹے شیشوں والی عینے پہارتی جس سے ان کا چہرہ بہت سنجیدہ لگتا۔ ظفر جوانی میں نہ بوڑھے تھے نہ جوان۔ انہیں اپنی کسی رشتہ دار لڑکی سے شادی ہوئی جو کسی اور شخص کے عشق میں بہتا تھی۔

ظفر جب بھی میرا اور بچوں کا حال چال پوچھنے آتے کبھی برآمدے سے آگے نہ بڑھتے۔ بچوں سے رسی گفتگو کے لیے اپنی توجہ اشر پر مرکوز کر کے پوچھتے: ”کلیجی کھائی؟“

وہ نفی میں سر ہلاتا۔

”خدا کے لیے قد سیدہ آپا سے کلیجی کھلائیں۔ یہ ضد کر کے تو کلیجی نہیں مانگ سکتا۔“

میں ان سے کہنا چاہتی کہ ظفر اپنی ذہنی عیاشی ترک کر کے شادی کر لیں کیونکہ کوئی لڑکی ضد کر کے آپ سے شادی نہیں کرے گی لیکن میری خواہش اس وقت پوری ہوئی جب ہم 121-سی میں گئے اور انہیں انعام کے طور پر خاندان کے خرمی صورت ترین لڑکی ارجمند عطا کر دی گئی۔ زندگی نے وفانہ کی اور ظفر رخصت ہو گئے لیکن ارجمند کے تین بڑے بچے بچے موسیٰ، منیرہ اور انکل ظفر کی نشانی بن کر ارجمند کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ سینت کر اپنی ذات پر خرچ نہ کر کے

انکل ظفر کافی اٹاشا اور ایک کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں چھوڑ گئے ہیں اور انکل ظفر کی بدولت یہ لوگ موج میلا مناتے ہیں۔

479۔ این کی بات ہے ایک روز جب ہم ڈوگنی گراؤنڈ کے سامنے کھڑے تھے انکل نے پوچھا:

”اشفاق کا خط پتر قدسیہ آ یا؟“

”باقاعدہ خط آتے ہیں بلکہ بچوں کی تصویریں منگوائی ہیں؟“

”اچھا تو بھیجی آپ نے؟“

حسن اتفاق سے اس وقت ریزی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا۔

بچوں نے اصرار کیا کہ تصویریں ڈوگنی گراؤنڈ میں کھینچوانی جائیں۔ محمد علی نے بچوں کو سنبھالا۔ میں نے سید گودا اٹھا لیا۔ پھر یہ قافلہ سڑک پار کر کے اس ڈھنواں پر پہنچا جس سے اتر کر ڈوگنی گراؤنڈ اور باندرا درمی آتی تھی۔ اینق میاں نے انکل ظفر کو اپنی ٹوپی عطا کی اور کئی تصویریں بنائیں۔ جب یہ تصویریں امریکہ پہنچیں تو ایک فرانسیسی لڑکی خاں صاحب سے پوچھا: ”کیا یہ آپ کے کزن Confirmed bachelor ہیں؟“

”ہاں ابھی شادی نہیں ہوئی۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟“

”ان کے چہرے پر لکھا ہے۔“

خاں صاحب نے اپنے خط میں لکھا: ”اسی لڑکی جو تصویر دیکھ کر اتنے گہرے نتائج نکال لیتی ہے۔ کل اسے کلاس میں ایک ایسی کتاب کا مضمون پڑھنا پڑا جو امریکہ میں پانچویں کے طالب علم پڑھتے ہیں۔ اس سے اس پر وہ جہالت کا اندازہ لگائے۔“

اسی برس کے آٹھ ستمبر پر وگرام ٹی وی میں خاں صاحب کو جیکو لین کینیڈی سے ہم مکتب کی شکل میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ وگرام میں بھانت بھانت کے اویب جمع تھے اور اپنے اپنے ملک میں وہ بہت معرکے مار کر آئے تھے۔ لیکن امریکہ کی شاپنی۔ امریکن انگریزی کے علاوہ کسی زبان کو اب ہم سمجھتا ہے۔ ناپنے نو ساختہ کچر کے علاوہ اور کسی کچر کے حسن کو مانتا ہے۔ وہ کسی گروہ سے تال میل کرتا ہے اسی احساس برتری کے باعث دوسروں پر چھا جانے کی قوت رکھتا ہے۔

جب خاں صاحب برکلے سے واپس آئے تو انہیں جیکو لین کینیڈی کی کتاب کا ترجمہ کرنے کی آفر ہوئی جو انہوں نے بطریق احسن پوری کی۔ اس کے علاوہ انہیں ایک اور کتاب ترجمہ کرنے کے لیے ملی۔

The Golden Hawks of Genghis Khan جو انہوں نے ”چنگیز خاں کے سنہری بازو“ کے

سے قارئین کے لیے چھوڑی ہے۔

ڈوگنی گراؤنڈ اور باندرا درمی نے ہمیں ایک بڑے آدمی سے ملایا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم اے میں استاد ہے تھے اس لیے ان سے تعارف کی حاجت نہ تھی۔ صوفی صاحب ان دنوں ”نوٹ نوٹ“ کی نظمیں مرتب کرتے تھے۔ وہ ان نظموں کا رد عمل دیکھنے کے لیے ڈوگنی گراؤنڈ میں آتے، بچوں کو جمع کرتے اور نوٹ نوٹ کی نظمیں سناتے ہمیں ملتے تو خاں صاحب سے لاڈ کے انداز میں کہتے: ”اوائے تیری روزی میں میرا کوئی حصہ نہیں؟“

”صوفی صاحب! ابھی قدسیہ ایسا کھانا نہیں پکا سکتی جو کسی کشمیری کو کھلایا جاسکے۔“

”بائے گدھے! تو میرا مطلب نہیں سمجھا۔ استاد کے گھر جا کر کھانا کھانا بھی اپنے ہی رزق سے کھانا ہے۔“  
 گھر آئے۔ میں بڑے اچھے کچے خود لگاتا ہوں۔ کشمیری چائے کے ساتھ..... گولاش کھایا ہے کبھی؟ اوئے تم تو کبھی  
 کبھی نہیں آئے۔ یہاں کیا آؤ گے۔“

اس طرح ہم سرکتے سرکتے صوفی صاحب کے دسترخوان پر پائے جانے لگے۔ میں نے صوفی صاحب سے  
 جاننے جانے کا طریقہ سیکھا لیکن خدا گواہ ہے وہ ذائقہ کبھی پیدا نہ ہوا۔ نہ کبھی شعروں سے مناسبت پیدا ہو سکی نہ  
 کبھی لہجے میں لذت پیدا ہوئی۔ اب جا کر پتہ چلا کہ یہاں پھر ہماری جہلت کا بہت گہرا اثر ہے۔ ہمیں جو موروثی  
 ہے اسے ہم اس Genetic Coding کے حساب سے خاص معنی جیتوں کے مالک ہو جاتے ہیں۔ استاد کبھی  
 پڑھتے کرتا ہے لیکن وہ مثلاً گردن کی مناسبت استاد کے علم کے ساتھ ہوتی ہے وہ بہت جلد ترقی کر جاتے ہیں اور  
 ترقی اور خواہش کے باوجود کہیں نہیں پہنچ پاتے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ نذیر بیگم موسیقی میں بے حد ریاضت کیا  
 لیکن نور جہاں بہت کم وقت میں اپنی خدا داد صلاحیتوں سے باعث وہاں پہنچ جاتی جہاں پہنچنا نذیر بیگم کے لیے  
 اس گھر میں ہمارے پاس کا چھا بھی آنے لگی۔

اس کا چھا آج کے مشہور نفسیات داں ڈاکٹر ترین کی بیوی تھی۔ اس وقت ڈاکٹر ترین کچھ خاص مشہور نہ تھے۔ کاچھا  
 نے Pramod میں ڈال کر ہمارے گھر بلا دھڑک چلی آئی۔ اس کی ملاقات خاں صاحب سے ڈوگلی گراؤنڈ میں ہوا  
 یہاں سے وہ گھر آنے لگی اور رفتہ رفتہ مجھے یوں لگنے لگا جیسے وہ ہمیشہ سے 479۔ این کا حصہ ہی ہے۔

کاچھا کے ساتھ اس کی ایک سہیلی عارنی بھی ہمارے گھر کا حصہ بن گئی۔ عارنی بیگم دراصل اشفاق صاحب کی  
 سہیلی تھی۔ وہ ”ٹیل و نبار“ میں بلا دھڑک چلی جاتی۔ خاں صاحب کام کرتے رہتے۔ وہ سامنے بیٹھ کر کبھی کی طرح  
 کی باتیں کرتی رہتی۔

یہ تو اب مجھے یاد نہیں کہ عارنی پہلے گھر آئی اور اس کے ساتھ کاچھا آئی یا کاچھا عارنی کو متعارف کروانے والی  
 تھی۔ مجھے ایک دو باتیں عارنی کے متعلق یاد رہ گئی ہیں۔ عارنی کو میرے منجھلے بیٹے انیس سے بڑی محبت تھی۔ اس نے  
 جو صورت سویرا انیس کے لیے بنایا تھا جس پر ایک سفید بلی اُڑنی دھاگوں سے Knit کی تھی۔

عارنی برآمدے کے ساتھ والے نانا کے کمرے میں بین آتش دان کے پاس والے صوفے پر بیٹھ کر سویرا  
 کے ساتھ والے ڈانگ روم میں خاں صاحب بیٹھ کر لکھا کرتے۔ عارنی باتیں کیے جاتی اور خاں صاحب چھوٹے  
 نے جواب دیتے رہتے۔ یہ ٹیلی گرافک سلسلہ ان دونوں کی دوستی کا باعث بنا۔ بعد ازاں عارنی نے احمد رضا قصوری  
 کی شادی کر لی، لیکن عارنی کا لمبا چوڑا ذکر اس جگہ درست نہیں۔

مفتی جی ہمیں مرزا جی کا تحفہ تو دے کر گئے ہی تھے ایک عدد رہائشی مہمان قیصر مفتی کی شکل میں اور دے گئے۔  
 مفتی مرزا جی میں امریکینوں کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ جب بھی لاہور آتا ہمارے ہی گھر ٹھہرتا۔ مجھ سے اس کی خط و کتابت  
 جی کے اصرار پر شروع ہوئی۔ ایک روز مفتی جی مجھے کہنے لگے: ”اوئے قدسیہ! تو ساری دنیا پر پٹو ڈال لیتی ہے ایک

میرا کام کر دے تو مانوں؟“

”فرمائیے۔“

”بھائی وہ قیصر تیرا بہت گرویدہ ہے۔ اگر تو اسے کسی طرح شادی پر رضامند کر لے تو میں مانوں۔ آج تک

شادی سے بدکنتار ہا ہے۔ اگر اس کا خوف ختم ہو جائے تو اس کی تنہائی کا علاج ہو جائے۔“

لیجیے کا تا اور لے دوڑی قسم کی قد سید کے لیے یہ بہت بڑی Activity تھی۔

اس گھر میں میری تجویزوں کے باعث شادیاں ہوئیں۔

## قیصر مفتی کی شادی

### میرے بھائی پرویز (ریزی) کا بیاہ

آپ کو شاید علم ہوگا کہ نصیر انوران دنوں ریڈیو پاکستان میں سکرپٹ رائٹر تھے اور نصیر انور کے ساتھ

صاحب کا گہرا دوستانہ تھا۔ نصیر انوران دنوں فلمنگ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ ان کی گھر والی کشور بہت جلد ہمارے ساتھ

مل گئی۔ کشور بھی ریڈیو پاکستان کے لیے لکھتی تھی اور کافی مشہور ہو چکی تھی۔

فلمنگ روڈ سے خاں صاحب کا رشتہ پرانا تھا۔ ریاض محمود اسی سڑک پر رہ چکے تھے۔

اس جہاں سے رخصت ہونے سے کچھ دیر پہلے بھی ایک مرتبہ خاں صاحب اور میں لالی جان (کشوری)

گئے تھے۔

یہ خالہتا کشمیری گھر اندہ تھا۔ ان کے دسترخوان پر ہر قسم کی لذتیں تھیں۔ گھروالوں کی آپس میں بڑی

تھی۔ لالی جان سے چھوٹی بہن نصرت کبھی بچپن میں پولیو کی شکار ہو گئی تھی اور اب ذہیل چیز کی محتاج تھی۔ آج بھی

آباد میں شہنم ثقلیل اور نصرت وہاں کی روح رواں ہیں۔ اس Handicap کے باوجود ”منجھی“ بڑی جان دار اور

ملنسار لڑکی تھی۔ اس سے چھوٹی بہن جیداں تھی جس سے بعد ازاں قیصر کا رشتہ طے ہوا۔

لالی جان ہمارے گھر عموماً کھانے پکا کر لاتی تھی۔ ہم ان کے گھر بھی بڑے جذبے کے ساتھ جایا کرتے

لالی جان کی والدہ بھی بڑی شفیق خاتون تھیں۔ جب بھی ملتیں عموماً باورچی خانے میں بیڑھی پر سائی ہوئی نظر آتیں۔

دعاؤں سے نوازا کرتی تھیں۔

جب لالی جان مان گئیں تو مفتی جی پردھان بن گئے اور اس طرح قیصر کی شادی جیداں سے ہو گئی۔

کراچی چلا گیا۔ قیصر سے رابطہ قائم رہا۔ 1984ء میں جب میں کینسر میں مبتلا ہو کر میوہ ہسپتال میں داخل ہوئی تو آخر

قیصر مجھے ملنے آیا۔ وہ پریشان تھا، لیکن کھلنڈ را بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اوئے یہ کیا پا کھنڈ مچا رکھا ہے۔ سیدھی طرح گھر جا کر اپنے کا کے اشفاق احمد کی خبر لے..... کینسر دیکر تیرے

نہیں بگاڑ سکتا۔ تو مضبوط قوت ارادی کی مالک ہے باز آ جا..... پلنگ چھوڑ دے..... نہیں تو.....“

مجھے تو یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد قیصر کینسر سے بیمار ہو کر آنا فانا اس جہاں سے چلا گیا۔ ایک کہانی ختم ہوئی۔ ایک صدیق نہ ہو گیا.... ایک دروازہ مقفل کر دیا گیا۔

میری زندگی ہے.....

اس گھر کی برکت سے ایک اور بڑے انسان سے کچھ توقعات وابستہ ہیں۔ ان میں صدیقہ بیگم کا ذکر کرتی

صدیقہ بیگم چودھری برکت علی (مکتبہ اردو) کی ہونہار بیٹی تھیں۔ ہائی بہن بھائی تو باپ سے ادب کا شغف اٹھانے والے تھے لیکن صدیقہ نے چھوٹی عمر میں لٹریچر سے بڑی شناسائی پیدا کر لی۔ وہ نصابی کتابوں کی طرف مائل نہ تھی لیکن ادب سے بڑی محبت رکھتی تھی۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپا فرحت اپنے بیٹے جاوید طارق خاں کے ساتھ کمن آباد میں مقیم تھے۔ جاوید ہر لاڈلے بیٹے کی طرح اس وہم میں مبتلا تھا کہ جو کچھ بھی وہ کر ڈالے آپا فرحت اُس سے ناخوش نہیں ہوتے۔

چودھری برکت علی کی چھ کینال کی کوچھی میں صدیقہ اپنے بہن بھائیوں اور سادہ لوح والدہ سمیت رہتی تھی۔ ان کی زندگی آسان اور سادہ تھی۔ جاوید اور صدیقہ کی مٹھ بھینٹ بس میں یا سڑکوں پر ہو جاتی۔ جاوید کو اپنے گھرانے سے ادب پڑھانی تھی۔ وہ بے شمار شعرزبانی سنا سکتا تھا۔ شاعروں ادیبوں تحریک پاکستان سے وابستہ لوگوں کے نام جانتا تھا۔ اس کا حریف لیکن Presentation سوچتی۔ اسے اپنا لوہا منوانے میں کبھی وقت پیش نہیں آئی۔ صدیقہ چودھری برکت علی کی جین کے تھوڑے دار اور ادب پرست لڑکی تھی۔ مکتبہ اردو کی وجہ سے احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی جیسے بڑے نام والے اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔

یہ ملاپ آنا فانا شادی کے وعدوں میں بدل گیا۔

جاوید بمشکل تمام انیس برس کا ہوگا۔ صدیقہ بھی صرف سولہ کی تھی۔ ان دونوں نے زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ خواب اور حقیقت ایک ہو گئے۔ روایت شکنی کی یہ شادی خاں کی شادی کے بعد دوسری بغاوت تھی۔ نتیجہ وہی نکلا جس کی امید تھی۔ آپا جی جاوید طارق خاں سے ناراض ہو گئیں۔

صدیقہ ایک طرح سے میری بہن بن گئی اور دوسرا رشتہ جو اس سے بڑا وہ میری سہمن بھی بن گئیں۔ اس کی بیٹی شمیم بیگم میرے بیٹے انیس احمد خاں سے بیانی گئی لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ جب ہم 121- سی میں آ گئے تھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب صدیقہ کے ٹولید آنے والی تھی۔ اسے دس کے دورے پڑتے تھے اور خدشہ تھا کہ بچہ ضائع نہ ہو جائے۔ میں نے معتبری سے ایک راستہ یہ نکالا کہ صدیقہ کو ایف سی کالج کے زیر نگرانی چلنے والے ہسپتال میں رکھی۔

یہاں ان دنوں زچہ بچہ کی ڈاکٹر مارٹن تھیں۔ جب ٹولید اس دنیا میں آ گئی تو لیڈی مارٹن نے بچی کی کلائی میں اس کا نام "بی بی جاوید" پلاسٹک کے ٹکڑوں میں پرویا ہوا ڈال دیا۔ بچوں کی شناخت کے لیے ایسا با ضروری تھا۔

”ہوش کر صدیقہ.... خدانے بی بی دی ہے۔ اللہ کی رحمت گھرائی ہے۔“

صدیقہ نے آنکھ کی جھری سے مجھے دیکھا۔ ”مامی..... اسے اٹھالیں..... یہ آپ کی ہے۔ آپ نے اس کو دیا ہے..... آج سے یہ آپ کی ہوئی۔“

پھر برس ہا برس بعد جاوید طارق خاں دوتی میں تھے تو میاں بیوی نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ٹولہ ہمیں فرمائی۔ اس طرح صدیقہ پہلے میری بہو بنی پھر میں اس کی بیٹی کی ساس بن گئی۔ کچھ لوگ وعدے نبھانے میں خوب محنت ہیں۔ صدیقہ اس اعتبار سے بالکل منفرد ہے۔

یہاں پر ریزی کی شادی کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔

کبھی سوچتی ہوں کہ شاید اپنے گندے کپڑے یوں سرخ م دھونا آپ کی بد مزگی کا باعث نہ بنے لیکن یہ مقصود ہے کہ زندگی کی کروٹیں عجیب و غریب ہوا کرتی ہیں اور بڑے انسان کی زندگی بھی معمولی واقعات سے متاثر ہوتی ہے۔ اور وہ بھی ہدی اور نیکی کی زد میں اسی طرح رہتا ہے جس طرح نام لوگ۔ اس کے تھپڑے کھاتے ہیں لیکن واقعات میں نہیں بڑے آدمی کے رد عمل میں مضمر ہوتی ہے۔

میرے بھائی ریزی کا رشتہ ملنا ذرا مشکل تھا۔ جب تک ”داستان گو“ چلتا رہا وہ ”داستان گو“ کا حصہ پاکستان میں سب سے پہلے Silk printing کی ایجاد ریزی نے کی تھی۔ وہ باہر کے مضامین پڑھ پڑھا کر بالآخر چھوٹی سکرینیں بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان پر وہ پتہ نہیں کیسے تصویر اتارتا بناتا اور پھر سکرین کو کنزٹی کے فریم میں اوپر پینٹ لگاتا۔ پھر ایک کنزٹی کی سکوچی پھیرتا۔ نیچے پرنٹ آنے لگتا۔ یہ پروسس اسی کو سمجھ میں آ سکتا ہے جسے ”داستان گو“ کے رسالے دیکھے ہیں۔ ہر ایک صفحہ علیحدہ ہاتھوں سے تیار ہوتا۔ 455۔ این میں یہ ریزی کر چکا تھا۔ گھر کے سامنے بڑے برآمدے میں چھتیں آویزاں تھیں۔ میرا کام تھا کہ ہر ایک سرورق کو لے جا کر چھتوں کا نوں (سرکنڈوں) کے درمیان سوکھنے کے لیے فٹ کر دیتی۔ سمن آباد کے چھپلے برآمدے میں خاں صاحب ریزی کرتے۔ ریزی بہت دھیان سے سکوچی پھیرتا۔ میں کاغذ اٹھا کر باہر والے برآمدے میں لاتی۔ ریزی اور خاں صاحب چونکہ تخلیقی لوگ تھے انہیں کبھی اس کام سے بوریت نہ ہوتی۔ وہ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے رہتے۔ انہیں اپنے کام کی کامیابی کا سروہ تھا۔ جیسے کرکٹ کے کھلاڑی کو سپر ہی کر کے ملتا ہے۔ یہ مشغلہ 479۔ این میں بھی جاری رہا۔ باورچی خانے سے ملحق گودام اور غسانخانے کے درمیان جو برآمدہ تھا یہاں سکرین پرنٹنگ کا اڈہ لگایا۔ بار چھتیں نہیں تھیں۔ باہر چار پائیوں پر سرورق سکھانے کے لیے رکھے جاتے، لیکن پھر رسالہ بند ہو گیا۔ کچھ دیر ”لیل و نہار“ ”داستان گو“ اور یو ایس آئی ایس ساتھ ساتھ چلتے رہے لیکن پھر ”لیل و نہار“ میں خاں صاحب نے استعفیٰ دے دی۔ ”داستان گو“ کا دفتر گو پاس رہا۔ وہاں چودھری سلیم محمد علی اور ریزی پردھان رہے۔ لیکن خاں صاحب کی ساری عمر یو ایس آئی ایس اور امریکہ میں برکٹے ایچ بی پی پروگرام میں شمولیت کے بعد ریڈیو پاکستان کی طرف مبذول ہو گئی۔ جہاں شاف آرسٹ تھے۔ ان کا کوئی دفتر نہ تھا۔ وہ ریڈیو سٹیشن کی لان میں بیٹھ کر کام کرتے اور کینیڈین پرنٹنگ آرٹسٹوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنی داستان گوئی جاری کیے رکھتے لیکن خاں صاحب نے کبھی اس بات کو اہمیت نہ دی کہ وہ معمولی شاف آرسٹ ہے۔

سکھنے پر عجب ڈالنے کے لیے ان کے پاس نہ کوئی دفتر ہے نہ گھومنے والی کرسی۔ کمپیوٹر تو خیر تب تک ایجاد ہی نہ ہوا تھا۔  
جان صاحب اور ریزی دونوں پیدائشی تخلیق کار تھے۔

یک مدت ہوئی ریزی گورنمنٹ کالج چھوڑ چکا تھا۔ ہر آرٹسٹ کی طرح اس کا کام افادیت سے نہ تھا۔ وہ دنیا  
میں کھڑے کے لیے عام راستے چن نہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں بھی نوکری کے لیے ڈگری اہم تھی۔ Establishment  
میں کھڑے ہونے کے لیے ہمیشہ ڈگری اہم رہی ہے۔ یہ بات میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ریزی ایف ایس سی نہ  
کے پاس کی وجہ ایک احمقانہ حرکت تھی۔ گورنمنٹ کالج میں جہاں گھڑی نصب ہے بہت سے جنگلی کبوتر آیا کرتے تھے۔  
ان کے امداد ایک شکاری ہمیشہ تھا۔ ایک روز وہ صبح کے وقت اپنی ڈیزی گن لے کر کالج پہنچا۔ دو تین کبوتر پھڑکا دیئے۔

دوسرے دن یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ میں تب ایم اے اردو میں پڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر محمد صادق نے کلاس  
میں محنت مجھ سے کہا..... ”قدسیہ! ہم لوگ آئیٹ لڑکے پر ریزی کی تلاش میں تھے۔ پتہ چلا ہے کہ اس نے کالج کے مقدس کبوتر  
میں سے مارے ہیں۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو ریزی خود کالج چھوڑ دے یا مجھے آ کر explain کرے کہ اس نے ایسا  
کیوں کیا؟“

جناب میرے بھائی صاحب نے بھی کچھ کسی کو explain نہیں کیا تھا۔ جب ہم دھرم سالہ میں تھے اور ریزی  
دو دھرم سالہ کے بوائز کالج میں پڑھتا تھا۔ تب بھی اس نے کالج چھوڑ کر گھر پر ایک گورکھا ٹیچر رکھا تھا۔ اس استاد کے ساتھ  
پڑھنے کے بجائے وہ پہاڑوں پر بندوق لے کر شکار کرنے چنا جاتا۔ میری والدہ آیت الکرسی پڑھ کر ہلکان ہوتیں اور  
دو دھرم سالہ کے گھنے جنگلوں میں تلاش کرتی پھرتیں۔ یہ سب کچھ بتانے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ریزی ایک عرصہ  
پڑھ کر یوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

لیکن لڑکی والے تو روزِ نازل سے مرد کی ساکھ مالی حیثیت، معاشرے میں عزت سے وابستہ رہے ہیں۔ ریزی  
کے پاس معاشرے میں بھنوانے کے لیے کوئی کریڈٹ کارڈ نہ تھا۔ دو چار جگہ کوشش کی لیکن کورا جواب مل گیا۔

اب ایک پریشانی کا دور شروع ہوا۔ لڑکی تلاش کرنا میرے لیے مشکل تھا، لیکن پھر اس مشکل کو آسان بنانے  
کے لیے عزیز بیگم کہیں سے آ گئی۔ مجھے اس کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ وہ کہاں رہتی ہے کون ہے لیکن وہ دن ایک دوسرے پر اعتبار  
کونے کے تھے۔ 479۔ این میں ریزی کی شادی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ جلد ہی اس نے ہمیں شہزادی ماما کا رشتہ تلاش  
کرنے کا پتہ دیا۔ مجھے وہ اندرون شہر میں میاں تقی صاحب کے گھر لے گئی۔ میاں صاحب کی اس سارے محلے میں بڑی عزت تھی۔  
پھر کئی مہینوں کے ساتھ اوپر چوبارے میں ماما شہزادی کے ساتھ رہتی تھی۔

پہلے دن میں میاں تقی صاحب کے گھر پہنچی۔ اینوں والے آنگن سے گزر کر اندر ڈرائنگ روم میں ایک خوش  
حالی عورت بیٹھی تھی۔ یہ آپا مختار تھیں۔ شہزادی بیگم کی بڑی بہن اور میاں صاحب کی بیگم..... تھوڑی دیر کے  
بعد پھر آئیں۔

شہزاد نکھیں..... گورا چٹانگ..... بہت خوبصورت نقش.....

آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔



جو چیز اپنے میں نہ ہو ہمیشہ اس کی تلاش رہتی ہے۔ میرا بھائی اور میں ہمیشہ سے جمال پرست تھے۔ میں کبھی کبھی اس خاندان کی گرویدہ ہو گئی۔ شادی کی تاریخ جس دن طے ہوئی تھی، خاں صاحب اور میں اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اچانک ریزی کی بے مائیگی کا پورا نقشہ ایک بار پھر ٹاپک بن گیا۔ شہزادی کے بھائی، بھائی نواز اور سرفراز اس شادی کے حق میں نہ تھے۔ میاں تقی اور مختار بیگم میرے ووٹ تھے۔ آخر میں معاملہ یہ طے پایا کہ میری والدہ اپنے مریدانہ عقائد کے نام وقف کر دیں تاکہ لڑکی کے لیے کچھ سکورٹی کا بندوبست ہو جائے۔

بہر کیف جب اللہ کو منظور ہو تو کچھ معاملات خود بخود طے ہو جاتے ہیں۔ شادی طے ہو گئی۔ اس شادی کے کرنا دھرتا ہمارے ڈیڈی جی تھے۔ انہوں نے سکول جانے والی گراؤنڈ میں شامیانے لگوائے۔ بڑے اہتمام کیے۔ بچے جی نے اصرار کیا کہ ویسے پر تلے ہوئے بادام ضرور ہوں۔ یقین کیجیے میں نے سیروں، بادام پھیلے اور انہیں تل کر ڈیڈی جی کے سپرد کیا۔ بڑی رونق اور مزے دار یوں میں شادی ہوئی اور ہم ریزی کی طرف سے سبکدوش ہو گئے۔

ریزی نے دو چار دن بھی ہمارے ساتھ نہ گزارے اور شہزادی کے ساتھ چودھری کالونی میں کرائے کا مکان لے لیا۔ وہ قریباً روز شہزادی کو میرے پاس چھوڑ جاتا۔ میں نے ایسی گائے عورت کبھی نہیں دیکھی۔ نہ اس کے منہ میں تھوڑی سی تھنی نہ دماغ میں طیش نہ حرکات میں تیزی۔ وہ کسی کام میں دخل اندازی نہ کرتی۔ کچھ تبصرے کیے بغیر ساتھ رہتی تھی۔ شہزادی اور ریزی کو تین بیٹیاں عطا کیں۔ سب سے بڑی بیٹی ارم میرے بیٹے اشیر خاں سے سال بھر بڑی ہے۔ آہاد کے پرائیویٹ ہسپتال میں پیدا ہوئی۔

وہ ریزی جس کی شادی کے امکانات بھی ناممکن تھے، شہر کی خوبصورت ترین لڑکی کا بلا شرکت غیرے شہر تھا۔۔۔ اور بیوی شہزادی اس کے گن گاتی تھی۔

یہ زندگی میں عطا کے رنگ ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے چھینر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اسے کسی سے کاغذ پر منظوری کی حاجت نہیں۔ جب چاہے جسے چاہے وہ دے دیا۔

اسی 479۔ این میں خاں صاحب سے ان کے رشتہ داروں میں سے سب سے پہلے معافی نامہ بن کر آ گیا۔ جنگی جس کا اصلی نام نعیم احمد خاں تھا۔ ہوائی فوج میں کیڈٹ تھا۔ ابھی تک خاں صاحب اپنے خاندان سے بچھڑنے اندر ہی اندر سلگ رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ سووا بہت مزہنگا ہے اور اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے وہ اہل نہیں۔ جس وقت ہمارے گھر آیا، خاں صاحب گھر پر نہیں تھے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ خاں صاحب سے مشابہت تھی۔ میں نے اس سے کہا: ”اندر آ جائیے۔“

”آپ نے مجھے پہچان لیا؟“

”جی نہیں.... لیکن اندر آ جائیے۔“

اس نے ذرا سا مسکرا کر کہا..... ”واقعی شقو بھائی نے ایک سادہ لڑکی سے شادی کی ہے۔ آپ پر اعتماد کیا ہے؟“

”ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں اماں جی سردار بیگم کی چھوٹی بہن ماسی رشیدہ کا بیٹا نعیم احمد خاں ہوں۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن میں رہتے

اس پہلی ملاقات ہی میں جنگلی اور میں Ideas کو ہر وقت discuss کرنے والے دوست بن گئے۔ جنگلی  
 بہت ہی تھیوریوں، سوچیں اور خیالات کی آماجگاہ تھا۔ وہ ہر بار ایک نیا خیال شطرنج کی چال بنا کر پیش کرتا۔ میں شہہ لے  
 کرتی۔ ہم دونوں کبھی سچ کے متعلق اکٹھے سوچتے، کبھی الگ الگ سوچ پراڑ جاتے۔ کبھی روایات اور بغاوت کی بیخ  
 بکنی جاتی۔ کبھی محبت زیرِ عتاب آ جاتی۔ جنگلی کے آنے جانے سے خاں صاحب نے گویا سکھ کا سانس لیا۔ جس طرح کوئی  
 سرسبز میں اپنے میکے والوں کی ہلکی سی خبر پانہ کر نہال ہو جاتی ہے۔ خاں صاحب کو بھی ٹھنڈی ہوا کا احساس ہونے لگا۔  
 بہت وقفہ نہیں گزرا۔ جب ایک روز ماما جی فیاض کو بھی نعیم اپنے ساتھ لے آئے۔ ماما جی پولیس میں ایک بڑے  
 پورے تھے اور اماں سردار بیگم کی سب سے چھوٹی بہن رشیدہ بیگم کے شو ہر تھے۔ ماما جی کا بڑا اوبد بہ تھا۔ وہ مکمل طور پر اس  
 شو کے شو ہر تھے جن سے ماسی رشیدہ تھر تھر کانپتی تھی۔ رفتہ رفتہ نعیم کی مہربانی سے ماسی رشیدہ اور ماما جی فیاض ہمارے گھر  
 آئے۔ ان کے آنے سے خاں صاحب کی تسلی ہوئی اور وہ اماں جی سے ملنے شاہی مسجد جانے لگے۔ جنگلی عموماً مجھے  
 اپنے پیارے خط بھی لکھا کرتا تھا۔ ہم دونوں میں خط و کتابت اچھی خاصی تھی۔ افسوس زیادہ خط وقت کے ساتھ تلف ہو  
 گئے ایک خط کی نقل پیش خدمت ہے۔

اچھی آپا قدسیہ!

ارے ارے ارے! یہ تو شروع ہی غلط ہو گیا۔ سوچا تو تھا کہ لکھوں گا ”بہت ہی خراب آپا قدسیہ“ لیکن جب  
 لکھ شروع کرتا ہوں تو اچھی ہی لکھا جاتا ہے۔ جانے آپ کے ہاتھ کیا معجزہ ہے کہ آپ کی طرف سے دل میں ذرہ بھر بھی  
 شش پیدا نہیں ہوتی۔ آپ کے خیال سے ہی ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ مچلنے لگتی ہے۔ مجھے تو ہر دفعہ وہ پہلا دن یاد آ جاتا ہے  
 جب میں آیا تھا تو شتو جی نے کہا تھا تو بھی قدسیہ یہ نعیم ہے ”نعیم؟“ آپ نے کہا ”آپ کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا  
 کہ یہ نام کچھ غیر مانوس سا تھا۔ شتو جی نے بھی یہ محسوس کیا۔“ ارے بھی اتنی دفعہ تو اس کا ذکر کیا ہے۔ جنگلی یوں اور جنگلی  
 میں ”اوه یہ ہے جنگلی؟“ آپ نے کہا ”کس قدر شیرینی تھی آپ کے لہجہ میں۔ کس قدر یگانگت۔ مجھے یوں محسوس ہوا  
 گویا یہ میری آپ سے پہلی ملاقات تھی بلکہ ہمیشہ سے واقفیت تھی اور اب ایک لمبے عرصے کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ آپ  
 کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ آپ کی آنکھوں کی چمک کہہ رہی تھی۔ جنگلی میں تو ہمیشہ سے تمہیں جانتی ہوں۔ میں نے  
 تمہارے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا ہے اور اسی لمحہ آپ نے کہا: ”شتو جی سے تمہارا اتنی بار ذکر ہوا ہے کہ معلوم  
 ہوتا ہے تمہیں ہمیشہ سے جانتی ہوں۔“ مجھے انتہائی طمانیت کا احساس ہوا اور میں ہمیشہ کے لیے آپ سے مانوس ہو گیا۔ نہ  
 بننے کہاں تک اپنے خیالات کا صحیح اظہار کر سکا ہوں اور خط بھی قاعدہ سے شروع نہیں ہوا۔ نہ القاب نہ آداب اور لگے بے  
 تکی ہائیکے۔ لیکن مجھے کچھ بھی فکر نہیں۔ اگر آپ کو یہی بے نکا خط نہ لکھ سکوں تو شاید کسی کو بھی نہ لکھوں۔ آپ کو تو جو میرے من  
 میں آ گیا لکھتا چلا جاتا ہوں۔ کچھ معنی ہوں یا نہ۔

اچھی آپا! آپ کا خط آنے سے کس قدر خوشی ہوئی۔ اس کا ذکر کرنا حاصل ہے کیونکہ میں اول تو بیان ہی نہ کر

سکوں گا اور اگر بیان کر بھی سکا تو آپ مبالغہ آمیزی کی تہمت لگائیں گی۔ بس یہ سوچ لیں کہ سکول سے واپس آیا تو سب سے میل روم پہنچا۔ آپ کے خط سے تو قطعاً ناامید ہو ہی چکا تھا۔ اب جو خط ملا تو وہیں کھول کر پڑھنے لگا لیکن وہاں کچھ آفیسر کھڑے تھے جو مجھے گھورنے لگے۔ میں نے خط پڑھتے پڑھتے ہی چلنا شروع کر دیا۔ رستہ میں دو ایک آدمیوں سے ٹکراتے ہوئے ہوئے پکی۔ بہر حال کمرہ میں صبح سلامت پہنچ گیا۔ ارادہ تو اسی وقت جواب دینے کا تھا مگر کچھ لوگ آپہنچے۔ ”تم نے ابھی تک کچھ کھایا یا تو نہیں؟“ میم صاحبہ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی چیخیں ”نہیں بھئی۔ ابھی ابھی تو سکول سے واپس آئے ہوں۔“ میں نے کہا: ”تو بس پھر چلو۔“ صاحبہ بولے: ”آج ہم نے باربی کیو کا انتظام کیا ہے۔ تم کو لینے آئے ہیں بس کرو۔“ میں نے لاکھ کہا کہ ابھی مجھے منہ ہاتھ دھونا ہے۔ دو خط اور آئے تھے جنہیں ابھی کھولا بھی نہیں۔ کپڑے بدلنے سے گئے۔ امتحان میں تین دن باقی رہ گئے مگر وہ لوگ گویا جھگڑے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ بس کپڑے بدلنے کی مہلت دہی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ رات کو جب واپس ہوا تو ڈھائی بج رہے تھے اور پھر اسی طرح دن گزرنے لگے۔ یہاں پر زندگی اس قدر سبک رفتار ہے کہ وقت پھسلتا چلا جاتا ہے اور اگر ہر لمحہ پر نظر نہ رکھی جائے تو انسان بھٹک جاتا ہے۔ بہر حال اب جا کر کہیں فرصت ملی ہے۔ یہ خط زریں کو لکھنا شروع کیا تھا مگر لکھ نہ سکا تھا۔ اب ادھار لے کر آپ کو لکھ رہا ہوں۔ اس پر پھر لکھ دوں گا۔

آپ کا خط پڑھ کر تو خاصہ فخر ناحق ہو گیا ہے۔ مجھے تو کچھ خبر بھی نہیں تھی۔ گھر سے مجھے کبھی بھی خبر نہیں ملی۔ کوئی بیمار ہے یا کسی کی طبیعت خراب ہے۔ ہاں ٹھیک ہو جانے پر ضرور خبر ملتی ہے۔ ”تنو کو اپینڈیسائٹس کا حملہ ہوا تھا۔ آپریشن کروا دیا تھا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہسپتال سے واپس آ گئی ہے۔“ اس قسم کی خبریں ملتی ہیں۔ اللہ کرے کہ سب لوگ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں۔ شتو جی کا بہت فکر ہے۔

رسالہ صحیحیہ کی نیت کا لانا ہنہا شکر یہ مگر اب تو میں اپنے واپسی کے سفر پر روانہ ہوں۔ واپس آ کر ہی پڑھوں گا۔ ہاں اچھی آپا۔ کیا سچ سچ میرا افسانہ چھپے گا؟ میں نے افسانہ آپ کو بھیج تو دیا تھا مگر رول میں پچھتا تا رہا کہ یونہی بھیجا تو جب کافی عرصہ جواب نہ ملا تو میں سمجھا کہ آپ بھول گئیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے افسانہ شائع کر کے واقعی میرا دماغ خراب کر دینا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آپ نہ جانے شادی سے پہلے کیسی تھیں۔ جو میں لاہور آیا تو ٹھنگو کے لیے یہی موضوع رہے گا۔ میرف طرف سے عارفی کو دلی مبارکباد پیش کریں۔

ارے میں بھی کتنا عجیب ہوں کہ کس ٹریٹمنٹ پر بیٹھا خط لکھ رہا ہوں اور یہ لکھا ہی نہیں کہ یہ میں یہاں کیوں لکھ گیا؟ یہاں کیا کر رہا ہوں؟ اور آئندہ کیا ارادہ ہے؟ تو آپ اپنی بات یوں ہوئی کہ میرا کورس پندرہ روز ہوئے ختم ہو گیا۔ کون ختم ہونے پر میں نے ڈھائی ہفتے کی چھٹی لے لی۔ جیکسن، مسپی، ہمفس، ٹینیسی ہوتا ہوا میں کل صبح یہاں یعنی سینٹ میں پہنچ گیا اور آج یہاں یعنی اب سوادس بجے رات کو سپرنگ فیلڈ لیا نوائے کے لیے روانہ ہو رہا ہوں جہاں چند گھنٹے کے قریب کے بعد ہکا گو پلا جاؤں گا۔ وہاں سے انڈیا نوٹس انڈیا نا۔ ٹولیز دو باہو ہوتا ہوا ڈیڑھ بجے جاؤں گا۔ وہاں چار پانچ روز قریب کا ارادہ ہے اور ارد گرد کا چکر لگاؤں گا۔ خیال ہے کہ گرانڈ ریپڈز، بیئر برڈ این آر بر اور کینیڈا کا چکر لگا لوں گا۔ پھر کیوبیک پش برگ ہوتا ہوا واشنگٹن جاؤں گا۔ وہاں سے نارفوک رائج ہوتا ہوا چارلسٹن ساؤتھ کیرولینا جاؤں گا جہاں سے مجھے ج

ہے۔ اگر اس سفر کے بعد کچھ ڈالر بیچ گئے تو شاید میا می فلوریڈا کا چکر بھی لگا آؤں۔ گو اس کی امید بہت کم ہے۔  
 میری رپا ہوں یہاں پر سوائے بس کے کرائے کے ہر چیز بجٹ سے زیادہ پڑی ہے۔ ڈالر یہاں پر چونوں کی  
 سستی ہے۔

میری بس تیار ہے۔ اب بند کرتا ہوں۔ شقو جی، نوکی کو پیار۔ پرویز اور بھائی کو سلام۔ عارفی، جاوید، صادقہ سب

فقط آپ کا  
 جتنی

خدا کے لیے آپ اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کریں۔ میرا خیال ہے شقو جی سے ہی بات کرنا پڑے گی۔ آپ  
 بخیر رہیں گی۔

28.07.61 شکاگو

آپا خط پوسٹ نہ کر سکا تھا یہاں پوسٹ کر رہا ہوں۔

خدا حافظ

جتنی

ادھر ماما جی اور جتنی گھر آنے لگے۔ ادھر خاں صاحب کے بڑے بھائی اسحاق احمد خاں جن کے متعلق میں نے  
 کبھی نہ سنا تھا وہ بدوق لے کر میرے گھر کے چکر لگاتے رہے ہیں کہ میری وجہ سے ماں جی اور بابا جی کو اس قدر تکلیف

ایک روز اسحاق بھائی اور ذکیہ اچانک ہمارے گھر آ گئے۔

ذکیہ جی تو بہت پہلے سنگرم سائی کورس میں میرے ساتھ تھی اور میں نے ان کے ساتھ مشین پر کشیدہ کاری کا کورس  
 کیا تھا۔ ابھی میرے پاس ذکیہ کی خوبصورت Embroidery کے کئی میز پوش ہیں۔ لیکن اسحاق بھائی کو میں نے اس  
 سے پہلے بھی نہ دیکھا تھا۔

میں تو ان دونوں سے قطعاً ناواقف تھی۔ مجھے تو صرف اس قدر معلوم تھا کہ ججو بھائی خاں صاحب کی خفیہ شادی  
 سے نہ تو دلبرداشتہ ہوئے تھے کہ پستول لے کر ہمارے گھر کے ارد گرد گھوما کرتے۔ انہیں اُس ولین کی تلاش تھی جس  
 نے ان کے والدین کا دل توڑا اور خاندانی روایات کو پھینا چور کرنے کی جرأت کی۔

ججو بھائی سامنے بیٹھے تھے۔ عجب ملائمت اور خاں صاحب سے مشابہت نے مجھے فوراً ان کے قریب کر دیا۔  
 میں نے بھی نہ جانے کیوں مجھے چھوٹی بہن سمجھ کر فوراً قبول کر لیا۔

”قدسیہ..... ایک کام ہے تم سے کر لوگی۔“

”جی حکم دیں ججو بھائی۔“

”مجھے ایک بڑا اچھا سا کالر شپ مل گیا ہے۔ یہ تو تمہیں اشفاق نے بتایا ہی ہوگا کہ میں ایئر فورس چھوڑ چکا ہوں۔ فیسرین کا کام بہت مشکل ہے۔ میں اسے ماڈرن basis پر چلانا چاہتا تھا۔ باباجی اس کی بوتل ڈبیا اور اندر رہ پیر تک نہیں چاہتے..... میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے لیکن اگر فرانس کا سرٹیفکیٹ مل جائے تو Authentic ہو جاتا ہے۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ اسحاق بھائی حسین روڈ پر منتقل ہو چکے تھے اور ”نیوسما“ کریم بناتے تھے۔ میرے بھائی ریزی نے کہا کہ اس کریم کی ڈبیا کالیبل ڈیزائن کیا تھا لیکن میں کبھی حسین روڈ نہیں گئی تھی۔“

”جی میں کچھ سمجھ نہیں پائی؟“

”ذکیہ میرے ساتھ جائے گی لیکن بچوں کا جانا مشکل ہے سارا Jesus & Mary کو نیونٹ میں پڑھتی ہے۔ واصف کی پڑھائی کا بھی حرج ہوگا۔ سینٹ انتھونی میں اسے مشکل سے داخل کرایا ہے۔“

مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھ سے کیا توقع کی جا رہی ہے۔ اس وقت ذکیہ نے میری مشکل حل کی۔

”قد سیدہ جی..... بات یہ ہے کہ میری والدہ بیگم روڈ پر رہتی ہے۔ وہ ان بچوں کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہیں لیکن بچوں کی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے بچوں کو اپنے پاس رکھ لیں۔ مجھے پتہ ہے کہ یہاں خوش رہیں گے۔ آپ کے بچے ماشاء اللہ انہیں جلد ہی ہماری جدائی بھلا دیں گے۔“

میں ”تفکروں“ کی عادی نہیں۔ سوچے سمجھے بغیر فیصلے کرنا میری جہلت میں ہے۔ میں نے فوراً وٹوک سے کہا..... ”لیس یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ خاں صاحب آپ کے بھائی پہلے ہیں اور میرے شوہر بعد میں۔ یہ آپ کا پہلے ہے اور میرا بعد میں..... فوراً بچوں کو چھوڑ جائیے.....“

شکر ہے ان دنوں سامان سے اتنی محبت کرنے کا روانہ نہیں تھا۔ بچے اپنے مختصر سامان کے ساتھ میرے پاس آ گئے۔ واصف ان سب سے بڑا بھائی تھا۔ انیق اور سارا قریب قریب ہم عمر تھے اور پہلے دن سے ہی ان دونوں کی بھائی چھننے لگی۔ واصف نے آتے ہی اشیر پر قبضہ بھالیا۔ وہ ہر وقت اسے اٹھائے پھرتا۔ ڈوگنی گراؤنڈ میں جاتا تو چیری ساتھ سکول والی گراؤنڈ میں جاتا تو بچہ ڈھاک پر۔ کچھ رشتہ داروں نے سمجھا غالباً میں نے واصف کو کھلاوی بنانے کے لیے پتہ رکھ لیا ہے لیکن خدا جانتا ہے میری ایسی نیت نہ تھی۔ مجھ میں نیت کو چھان پھٹک کر سچا کھونا جاننے کی بھی صلاحیت پیدا ہو سکتی۔

سارہ واصف کافی بڑے تھے۔

لیکن میں ان پانچوں کو برآمدے والے غسلخانے میں اکٹھا کر لیتی اور کل جماعتی غسل شروع ہو جاتا۔ پانچوں کو نہلا دھلا کر ”پے رانے“ بنا کر مجھے بڑا لطف ملتا۔ کھانا ہمیشہ کی طرح باورچی خانے میں چھوٹی چوکی کے آگے چھوٹے چھوٹے ڈگڈگی نما موڑھے لگا کر کھایا جاتا۔ جب سارہ اور واصف ہمارے پاس پہنچے گرمیوں کا موسم تھا، ہم آٹھن میں چار پائیاں ڈال کر سویا کرتے تھے۔ ایک ہی پیڈٹل فین تھا جو خاں صاحب کی چار پائی کے ساتھ لگایا جاتا۔ پھر سارہ اور میری چار پائی ہوتی۔ اس کے بعد نوکی اور انیس اکٹھے سوتے۔

بے مزے کے دن اور عیش کی راتیں تھیں۔ سارہ اور واصف کے آنے سے گھر بھرا بھرا اور خوشیوں سے نبض  
 بے شمار ہو گیا۔ ان ہی دنوں واصف کو خاں صاحب کی اس الماری کا پتہ چل گیا جہاں وہ ریز گاری اور گھریلو  
 کپڑوں کے لیے پیسے رکھا کرتے تھے۔ یہ الماری کے کمرے میں برتنوں کی الماری کے ساتھ تھی۔ اس میں خاں صاحب  
 سے لے کر اپنے پن کا پیاں کتا میں رکھا کرتے۔ اوپر والے خانے میں ایک ڈبے میں ریز گاری اور دوسرے میں نوٹ  
 کے پیسے ہوتے۔ یہ بات میں اندازے سے کہہ رہی ہوں کیونکہ میں نے اوپر والے خانے میں کنسوٹی لے کر اصل  
 کچھ بھی حاصل نہ کی..... جب بچوں کو آکس کریم گول گپے، مکئی کے دانے وغیرہ لینے ہوتے تو ادھر ہاتھ صاف کیا  
 جس نے انہیں منع کیا نہ اس کی رپورٹ ہی خاں صاحب سے کی۔

سارہ ہمارے گھر میں بیٹی کا پہلا تجربہ تھا۔ ہمیشہ سے سارہ کو بھائیوں پر ترجیح اس لیے دی جاتی کہ ایک تو وہ اکیلی  
 گھر سے اس کے انداز بڑے دل لہانے والے تھے۔ ہنستی تو جھرنوں کی طرح۔ مذاق کرتی تو بغیر دلاویزی کے۔  
 ممتی تو جو کچھ اچھا لگتا بافتی چلی جاتی۔ خاص کر اپنے بیلی اینٹ کی پلیٹ پر تو خاص عنایت تھی۔

پتہ نہیں آ پافر خندہ بھائی کی کشش میں ہمارے ہاں کبھی نہیں کہ انہیں پتہ چلا سارہ اور واصف ہمارے پاس ہیں اور  
 کھینے کی خواہش ہم تک لے آئی۔ بہر کیف آپاجی فرخندہ اور بھائی ایوب اب خود بخود ہماری طرف کھینے آتے۔

یہ دور واصف کے سٹیج پروڈیوسر کے کمالات کا دور تھا۔ اسے شوق تھا کہ وہ سٹیج سجائے۔ سامنے گھر کے لوگ  
 بیٹھ کر بیٹھے ہوں۔ وہ اپنے احکامات تلے سب کو دوڑائے، نچائے، بٹھائے۔ ایک روز جب آپافر خندہ اور بھائی  
 کے تو واصف نے بڑی پُر لطف رچنا رچی۔ بھائی ایوب کے پیچھے سبز شیل کا لمبا سا بادشاہوں کی طرح کپڑا لٹایا۔  
 اور بھائی آپافر خندہ کے پیچھے بھی ایسا ہی سبز شیل کا کپڑا مغربی بادشاہوں اور دہنوں جیسا لٹکا یا۔ اسے سارہ ایشق اور  
 بھائی بچھے بچھے چلے آئے۔ سامنے ناظرین میں خاں صاحب، انکل، ضفر شہاب صاحب، مفتی جی، عکسی اور  
 بھائی میاں بیٹھے تھے۔ آپاجی تو ہنستی رہیں اور کچھ نہ بولیں۔ بھائی ایوب نے یہ موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اور  
 بھائی تقریر امرائیل کے خلاف کی اور سب کو بتایا کہ بھین میں یہودی نے کیسی تباہی مچائی۔

Demon-crazy is Democracy ان کا فیورٹ موضوع تھا۔

اس کے ساتھ بچوں کا ایک ٹرائی سائیکل تھا۔ اس نے نوکی کو سائیکل بکڑایا، جو اس پر انیس کو بٹھا کر گلی کی طرف  
 لے گیا۔ اشیر خاں میری گود میں سو رہا تھا اس لیے وہ سائیکل کی Excitement میں شامل نہ ہو سکا۔

”قدسیہ آ پا۔“

”جی۔“

”قدسیہ آ پا۔“

”ہاں کہو۔“

”قدسیہ آ پا۔“

”بتاؤ ناں ناہید کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”آپاجی جواد..... سجاد؟ کوئی؟“

اس نے دائیں بائیں کچھ ذومعنی ساسر بلایا۔

”اچھا میں پرے دکھتی ہوں۔ تم ہمت کر کے کہہ ڈالو۔“

”وہ جی آپ کو پتہ ہے ابولیبیا گئے ہوئے ہیں۔ اب آپا کا بھی ارادہ ہے کہ وہ ابوجی کے پاس چلی جائیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ اس میں بسورنے کی کیا بات ہے؟ ہر بیوی کو شوہر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔“

”اتنا آسان نہیں قد سید آپا..... میں جہلم چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔“

جہلم کا نام سن کر مجھے یاد آیا کہ اب ناہید میری شاگرد نہیں تھی۔ ناہید آپا فرخندہ کی بڑی بیٹی تو جہلم پر تھی۔

فیکٹری والوں کی بہوتھی۔ اس کے سسر سعید احمد خاں بڑے اصولوں کے آدمی تھے اور ان کے چھوٹے بھائی رشید احمد تھے جن کی ناہید بیوی تھی، جہلم سے گہری محبت رکھتے تھے وہ بھلا ناہید کو کیونکر جہلم چھوڑنے کی اجازت دیتے۔

”لیکن جہلم چھوڑنے کی ضرورت کیا پیش آئی ناہید؟“

”وہ جی..... بات یہ ہے کہ جواد کے دسویں کے امتحان ہیں۔ بال بھی ایک سال بعد دسویں کا امتحان ہے۔“

گا..... نبیلہ آپ جانتی ہیں، تھوڑی سی ایب نارٹل ہے۔ اس کی ساس، دیور اور نبیلہ کا شوہر افضل خاں ابھی سب لوگ۔

36۔ جی میں ہیں۔ نہ نبیلہ گھر واری کر سکتی ہے نہ سب بے جی..... پھر بتائیے آپاجی کس کے پاس 36۔ جی کا نظام چھوڑ کر

جائیں..... سجاد اور عمر تو خیر..... اپنے فیصلے کر سکتے ہیں لیکن جیونی رمضان اور یہ باقی سب ان سب کی ذمہ داری کھتے

اٹھائے؟“

ڈاکٹر ایوب احمد خاں اور ان کے فیصلوں کو دیکھنے کے لیے چند لمحوں کے لیے یہیں توقف کیجیے۔ بڑے لوگوں کی

طرح وہ فیصلہ پہلے کرتے تھے اور عمل کی دقتوں پر فکر کیے بغیر نتائج بعد میں بھگتتے تھے۔

ڈاکٹر ایوب بڑے سرجن تھے۔ جب قیام پاکستان سے بہت پہلے انہوں نے ڈاکٹر محمد خاں کی سب سے بہت

بیٹی فرخندہ سے شادی کی تو اس دن وہ دھام کی شادی کا چرچا دیر تک خاندان میں رہا کیونکہ اس شادی پر لاہور سے

Stiffls ہوٹل سے پوسٹری منگوائی گئی تھی۔ یہ گویا سکھوں کے اکثریتی علاقے میں کلچر ڈ اور پڑھے لکھے ہونے کا آئینہ

ثبوت تھا۔

لیکن اس فیصلے کے کچھ ہی عرصہ بعد ڈاکٹر ایوب احمد خاں میوہسپتال کے ہو کر رہ گئے۔ وہ اپنی ڈاکٹری چمکا رہے

تھے۔ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے تھے۔ بیوی کی دلجوئی کے لیے وہ اپنی والدہ کو ذمہ داری سونپ کر بے فکر تھے۔ نہیں

علم نہ تھا کہ ڈاکٹر محمد خاں کی سب سے بڑی لاڈلی بیٹی فرخندہ جس کی خاطر باباجی نے چار خادمائیں رکھی تھیں، جس کے

چہرے پر ہلکا ساداغ پڑ گیا تو باباجی نے فیئرین ایجاد کر ڈالی۔ یہ بیٹی جب روایتی ساس کے پلے پڑی تو سارا لاڈ لاپن

پر دھرا رہ گیا۔ لکڑیوں کا چولہا جھونکنا، گوبر کی پاتھیاں لگانا، سسرالی رشتوں کو بہ عزت نبھانا اس لاڈلی کے لیے ماڈرن

ایورسٹ پر چڑھنے کے مترادف تھا۔ اس ساری بدسلوکی کے بعد جب ڈاکٹر ایوب تھکے ہارے گھر پہنچتے تو چندری ساس کی

طرح ان کی والدہ کہتیں۔

”سہمی لاڈلی نے مجھے صبح کا دودھ تک نہیں دیا..... ناشتہ تو یہ کیا دیتی؟“

یہ بھائی دن بھر کی تھکاوٹ کو Aggression میں بدل دیتے۔ پھر آپا فرخندہ کو تھپڑ تو ایک طرف، لاتوں سے بھی نواز دیا جاتا۔

یہ دوسری جنگ عظیم کا واقعہ ہے۔ ایک روز قبائلی بھائی مکتسر سے اپنی بہن کا حال چال پوچھنے 36۔ جی کے ساتھ تو انہوں نے ڈاکٹر ایوب کی مار پیٹ کا ڈراپ سین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا لاڈلی بہن کا یہ کہہ کر وہ گھر لوٹے اور بھائیوں کو اس بات پر اکسایا کہ ہر بھائی کے ہاتھ میں ہاکی ہو اور وہ اسی بے دردی سے مارے۔ گویا جس طرح کا منظر وہ دیکھ کر آئے ہیں۔ سارے بھائیوں کو یہ گیم اچھی لگی کیونکہ اس سے پہلے وہ سب گولف سے نائنٹ گولف کی کھیل میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔

مکتسر جیسے گاؤں میں جہاں سکھ سرداروں کا راج تھا باباجی محمد خاں کے بیٹوں نے باباجی سے بغاوت کے سلسلے میں ”پنگا“ ایجاد کیا تھا۔ باباجی خوفزدہ آدمی تھے۔ وہ بچوں کو سمیٹ ساٹ کر رکھنا چاہتے تھے۔ ذرا سی شرارت پر بھائیوں کی تھپڑی سے مارتے اور اماں جی کے سامنے ادھ موا کر دیتے۔ وہ تو آف تک نہ کر سکتیں لیکن نانی اماں سچ پچاؤ کے ہتھیار میں مدافعت کرتیں۔

”چھوڑو دے محمد خاں اللہ کا واسطہ تھم جا..... بہت ہو گئی۔“

”اوائے چندر یا اقبال تو ہی ہار مان لے..... معافی مانگ لو کھکھو..... پیر پکڑ لے باپ کے۔ ججو..... سن تو سہی محمد خاں کا بھینڑ یا۔“

نانی کی منتوں کا جامین پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ نہ باباجی کا غصہ اترتا نہ نواسے معافی مانگتے بلکہ ہر مار کے بعد شرارت بڑھتی اور انوکھے پن میں اضافہ ہو جاتا۔ بانی IQ کے بچے تھے۔ تخلیقی کارکردگی ہر وقت راہ بھاتی رہتی۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ سب سے ناک پر کھئی نہ بیٹھنے دیتے۔ باقی بھائی تو اپنے طور پر نئی شرارتیں سوچتے ہی تھے لیکن اسحاق بھائی ماسٹر ماسٹرنڈ تھے۔ قلمی شورے اور پوٹاشیم کا آمیزہ بنا کر اس کا گھریلو بم بنانے میں ماہر تھے۔ بجلی کے مین سپلائی کی تاروں پر اپنی تار لٹکا کر بجلی چرانے کی ریت بھی ان ہی کی ایجاد تھی۔

لیکن سب سے بڑا کام انہوں نے نائنٹ گالف organize کر کے کیا۔ رات کے وقت سارے بچے اپنی گالف کے سٹک لے کر بستروں سے چوری چوری کھسکتے۔ باباجی دن بھر کے تھکے ہارے بے سدھ خرائے لیتے رہ جاتے۔ ججو بھائی اور گالف ٹیم کے کھلے میدان میں گھر سے دوڑ گھوڑوں پر جاتے۔ سارا دن گیند کو مٹی کے تیل میں بھگو کر رات کو اسے آگ لگا دی جاتی۔ اب ہاکی سٹک سے گھوڑوں پر سوار کھلاڑی گالف کھیلتے۔

یہ پیرا محض اعادے کے لیے رقم کیا کیونکہ مکتسر کی زندگی کے واقعات خود اشفاق صاحب اپنے افسانے ”باباجی“ میں لکھ چکے ہیں۔ میں تو فقط اس قدر بیان کرنا چاہتی ہوں کہ سب بھائی اپنی اپنی ہاکی لے کر 36۔ جی پہنچے حتیٰ کہ جمو آفتاب بھائی بھی پیچھے پیچھے رنجیدہ خاطر دل برداشتہ چلے آئے لیکن آپا فرخندہ کو اپنے شوہر سے بے پناہ محبت تھی۔

”بھائی! خدا کے لیے ایک بار اپنے بھائی ایوب کو معاف کر دو۔“



”کردیں گے لیکن ایک شرط پر۔“

”کیا شرط.... کیسی شرط؟“

”پہلے آپ کو شرط ماننی ہوگی ہماری۔“

بہت لمبے دے کے بعد آپ نے وعدہ کر لیا اور بھائیوں نے یہ شرط پیش کی کہ وہ اور بھائی ایوب مکتبہ آجائیں۔ آپ اب وعدہ کر چکنے پر مجبور تھیں۔

جو لوگ خاندانی نظام کے پروردہ ہوں جیسا کہ خاں صاحب تھے انہیں بچوں کے ساتھ رہنے کا ایک خاص یا ڈھنگ آتا ہے۔ وہ بچوں کو کبھی خصوصی توجہ نہیں دیتے۔ کبھی ان کی سالگرہ نہیں مناتے۔ ان کی تفریح کا کوئی بندھن نہیں جاتا۔ امتحانوں پر توجہ دینا تو درکنار اگر بچے فرسٹ بھی آجائیں تو کسی کے منہ سے مبارکباد کا لفظ نہیں نکلتا۔ بچے کی طرح Matter of fact ہوتے ہیں۔ جس قدر توجہ فرد اپنے آپ کو دیتا ہے اتنی ہی توجہ بچے کو ملتی ہے اور اپنی خاندانی نظام سرے چڑھتا ہے۔

جب اسحاق بھائی ایسز فورس چھوڑ کر مرنگ روڈ منتقل ہوئے تو وہ صحیحیہ سے متصل بڑے کمرے میں رہتے تھے۔ فیسرین کریم کو سنبھالنے بہتر بنانے اور مارکیٹ کرنے کے خواب ساتھ لائے تھے۔ جو باباجی محمد خاں اور ان کی دوستی باعث پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

ایک عدد بنیادی نطلپی ذکیہ جی سے بھی ہوئی۔ گویہ نطلپی نہ تھی صرف نظریے کا اختلاف تھا۔ ذکیہ جی نے جوش و خروش سے سارہ کی سالگرہ کو جشن صورت منا ڈالا۔ ہم دونوں بھی خراماں خراماں پہنچے۔ گو خاں صاحب خود انہیں علم تھا کہ سالگرہ منانا باباجی اور اماں جی کی روایات سے کھلم کھلا انحراف ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح شامل بھی نہیں شمولیت سے باہر بھی تھے کیونکہ انہیں دونوں پارٹیوں کے دل کا خیال تھا۔ خاں صاحب کے دل کی یہی پھانسی ان کے فیصلے پر حاوی رہی.... وہ عموماً دو ایسی پارٹیوں کی طرف داور رہے جن کا آپس میں نظریاتی اختلاف تھا۔

اماں جی اس دعوت میں چند لمحوں کے لیے آئیں۔ پھر وادھ کے سر پر ہاتھ پھیر کر غائب ہو گئیں۔ باباجی پارٹی کے وقت دفتر میں چلے گئے اور پھر اندر نہ آئے۔ ہم دونوں نے کچھ کھایا پیا، کچھ ہراساں ہوئے کچھ پی پی کچھ کیک کٹنے پر تالیاں بجائیں۔ اماں جی سے رخصت چاہی اور طول سے جو بھائی کو چھوڑ کر آ گئے۔ اس وقت جزیشن خصوصی طور پر آمریت پسند تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی معصوم خوشیوں کے لیے بھی راستہ دینے کو تیار نہ تھی۔ درجہ مضبوط تھی کہ بغاوت کے بغیر آزادی کی راہ ملنا ناممکن تھی۔

ابھی تک جہاں خاندان اکٹھے رہنے کے چکر میں ہیں اور جہاں خاندانی نظام چل رہا ہے یہی کیفیت ہے۔ آزادی بغیر بغاوت کے نہیں ملتی اور ہر بغاوت سے روایات کی کچھ برجیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ کھسک درمیانے درجے کے لوگوں کا ہوتا ہے جن قوموں میں درمیانہ طبقہ خوشحال، مطمئن اور پروقار ہوتا ہے وہ بڑی ترقی کرتے ہیں اور خوشحالی سے ہم کنار رہتی ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے درمیانے طبقے کو اوپر والے طبقے نے شیر آیا شیر بن کر خوفزدہ کر رکھا ہے۔ اس لیے

ماتحتی نام نہیں ہوتیں جس قدر امیر لوگوں سے مستعار لیے ہوئے خواب انہیں پڑمردہ کرتے ہیں۔ وہ بڑی کاروں کے لیے سب سے سجائے بنگلوں، انگریزی سکولوں میں بچوں کو تعلیم دلانے، بیرون ملک تفریح کی خاطر سیر پائے بازاروں کے لیے سب سے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ قرضوں کے باوجود اوپر چڑھنا تو ممکن نہیں ہوتا۔ ہاں اپرٹنڈل کلاس کے ہاتھوں جلد ہی لوڈنڈل کلاس میں شامل ہو جاتی ہے۔ Process ہر خاندان میں بقدر آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

مجھے اور خاں صاحب کو اس تنزلی سے نجات کچھ تو اوپر والے کی مہربانی سے ملنی دوسرے ہم دونوں اس خواب کے لیے نہیں ملتی تھی۔ فی الحال کچھ اور درکار نہیں اور ہم شہنی خورے بڑے لوگ ہیں۔ شہنی بھی کبھی کبھی بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ کاموں سے بچانے میں ڈھنڈل کی طرح کام آتی ہے۔ ہم سمن آباد میں رہتے تھے۔ ٹڈل کلاسیے تھے لیکن شہنی کے لیے بچے رکھا۔

وہ صاف اور سارہ کے اضافے کے ساتھ ان دنوں ایک اور خوبصورت واقعہ طارق بن افتخار تھا۔ ڈیڈی جی کا سب سے پہلا بچہ جن دنوں سنٹرل ماڈرن سکول میں پڑھتا تھا۔ یہ سکول گورنمنٹ کالج کے نزدیک ایک اچھا تعلیمی ادارہ تھا۔ ان دنوں مجھے تیس کو بچوں کی تعلیم کا اس قدر خوف نہ تھا، آپی جی ہر وقت اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے پریشان رہتی تھیں۔ پتہ نہیں چلے ڈیڈی جی کی وجہ سے تھا جنہوں نے بی اے کا امتحان نہ دیا۔ یا پھر وہ سمجھتی تھیں کہ تعلیم ہی وہ ہتھیار ہے جس سے نیک معاشرے میں مقام پیدا نہیں کر سکتا۔

وہ بڑے زور و شور سے طارق، حارث، لبنی کو پڑھاتیں۔ مارنے، جھڑکنے اور گھونسنے رسید کرنے سے بھی باز نہ آتیں۔ میری خود بھی بچوں کو سختی اور تنظیم سے پڑھاتیں اور طارق اور حارث کو باقاعدگی سے میری خالہ کے پاس بھیج دیتیں۔ گویا میری خالہ فیروزہ کا مزاج بڑا ہی نرم تھا اور وہ بڑی سے بڑی غلطی کا جواز خود ہی نکالنے کی

طارق کو جب کبھی آپی جی سودا لینے کے لیے بھیجا کرتیں تو عزیز بی طارق تھیلا اور پیسے لے کر میرے پاس آتے۔ ہم دونوں مل کر ”ناٹم“ رسالے کو بنیاد بنا کر بہت سی باتیں کرتے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ مضامین کو خوب سمجھتا تھا۔ میری والدہ تھرے کی استعداد رکھتا تھا۔

”میں یہ رسالہ گھر لے جاؤں۔“

”ضرور لے جاؤ سکو۔“

”کل پڑھ کر آؤں گا۔“

”لیکن پہلے ہوم ورک کر لینا۔“ میں بزرگوں والی نصیحت کرتی۔

”ضرور..... اُس کی آپ فکر نہ کریں..... میں خوب پڑھوں گا قدسیہ آ پ..... لائق بنوں گا.....“

طارق بن افتخار سے تھوڑا سا تعارف اس مقام پر ضروری لگتا ہے۔

جب میری شادی ہوئی تھی تو ٹوٹے پھوٹے رواج جو اس وقت ممکن تھے ان میں سے ایک رواج دلہن کی گود میں

بچہ بٹھانے کا بھی ہوا کرتا تھا۔ اس سے مراد یہ ہوتی کہ اللہ جند دلہن کو اولاد مزینہ عطا فرمائے۔ میری گود میں ایک بڑا سادہ طارق بٹھایا گیا..... اور تب ہی سے ہم نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور ابھی تک وہ کسی نئے شخص سے ہمارا تعارف کراتا ہے۔ حیثیت سے کراتا ہے۔

واقعی طارق بن افتخار نے اپنا ارادہ سچ کر دکھایا۔ خوب محنت کی۔ ہڈیوں کا ڈاکٹر بنا۔ ان دنوں وہ شکاگو میں بہت بڑا سرجن ہے۔ ملک اور خاندان کا نام روشن کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ڈاکٹری کے علاوہ اس کے دو مشغلے ہیں۔ ٹکٹیں جمع کرنا اور تصویریں کھینچنا۔ اس کے پاس بھاننت بھاننت کے مختلف ممالک کے نئے اور پرانے ٹکٹ کٹتے ہیں۔ وہ اپنے پیاروں کو یہ ٹکٹیں پریت سے دکھاتا ہے۔ یہ لگ بات ہے کہ دیکھنے والے پر عموماً ان ٹکٹوں کو بڑی خوشی وارد ہوتی ہے نہ استعجاب۔ یہی اس جہان رنگ و بو کی بوالغی اور تیرگی ہے۔ ہم جس مشغلے میں خود دلچسپی نہیں لے سکتے ہمارے لیے بے کار اور تفضیح اوقات ہے۔ جس شخص کو ٹینس کا شوق نہیں وہ نہ ٹینس کے کھلاڑیوں کو جانتا ہے نہ اس کے رموز ہی سمجھتا ہے۔ جو ہسٹری کا دلدادہ نہیں اس کے لیے پرانے کھنڈر ماضی کی داستان بن کر نہیں اُبھرتے..... اللہ نے ساری مخلوق کے لیے ان گنت شوق مشغلے اور مصروفیت کی رنگ بچکاری بروقت جاری کر رکھی ہے۔ جو جس رنگ میں جاتا ہے اس کے لیے بس وہی حقیقت زندہ رہ جاتی ہے باقی ساری مخلوق اور شوق بے کار ہو جاتے ہیں۔

ٹکٹوں کے علاوہ تصویریں کھینچنا اس کا دوسرا محبوب مشغلہ ہے۔

اس میں البتہ احباب دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ اپنی تصویر دیکھ کر ہر انسان کی انا پھن اٹھا کر دل ہی دل میں اس کہتی ہے: ”کیوں دیکھا پھر۔ ہے کوئی ہم سا تو سامنے آئے۔“

جو جادو آئینے میں ہے وہی سحر تصویر میں بھی ہے۔ انسان اپنی شبیہ سے متاثر ہو کر ایک عجیب قسم کے سرور میں جاتا ہے۔ آپ نے خال صاحب کی کتابوں کے پچھلے سرورق پر ایک تصویر دیکھی ہوگی جس میں خال صاحب نے اپنے اور میں نے سفید لباس پہن رکھا ہے۔ یہ تصویر شکاگو میں طارق نے بڑی محبت سے کھینچی تھی۔ اس کے علاوہ دو اور تصاویر بھی سکو نے کھینچی ہیں جو مختلف کتابوں کے پشتوں پر نظر آتی ہیں اور جنہیں قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔

میڈیکل کالج کی تعلیم کے دوران کنگو شاہ اس کی ہم جماعت لڑکیوں نے پسند کیا ہو لیکن طارق نے روایت پسند پٹھان بچہ تھا۔ اس نے اپنی چچا زاد ورواء سے محبت کی اور اسی سے شادی کی۔ ورواء اقبال بھائی کی بیٹی منفر وڑکی تھی۔ اس نے ہمیشہ ایسے انفرادی فیصلے کیے جو حیران کن بھی تھے اور فرحت انگیز بھی۔ جب اس کی شادی ہوئی تو ڈیڈی جی اور آپی جی اس شادی کے حق میں نہ تھے لیکن ورواء کے ارادے کے آگے کسی کی نہ چلی۔ شادی ہوئی اور خیر نہ بھی۔

اب ورواء شکاگو کے اس علاقے میں رہائش پذیر ہے جو ڈاکٹروں کی ایک امیر بستی ہے۔ یہاں ورواء صاحبہ پینتی ہے۔ اس کی جواں سال بیٹی کو بھی حجاب پہنتے ہوئے کئی سال گزر گئے ہیں۔ اس کے گھر کا ماحول سادہ اور سادہ اقدار کا حامل ہے۔ میاں بیوی سچ کر آئے ہیں۔ ایک مسجد بنوادی ہے اور باقاعدگی سے دینی کاموں میں مصروف ہیں۔ ان کا بیٹا ارسلان وکیل ہے اور ٹی وی پر ایک ایسا پروگرام کرتا ہے جو امریکی لوگوں کو اسلام کی اقدار لبرل تعلیمات

تجربے کے مسائل سمجھاتا ہے۔

جس کبریٰ تبدیلی میں جو طارق کی زندگی میں رونما ہوئی اور جو ارسلان، سویرا اور سلطان میں روح بن کر رواں رہی ہے۔ تبدیلی کا طارق کے فیصلوں سے کوئی تعلق نہیں۔ خوبصورت سی واڑھی رکھ لینے والا سر جن اپنے کام اور ذاتی زندگی میں دو عالمیں بانٹیں جھانکنے کا عادی نہیں۔

جب ورداء نکو کے ساتھ امریکہ پہنچی تو غریبی کا سفر تھا۔ اس نے گھر پر رہ کر سلائی کی۔ روپیہ بنایا، بچایا اور عقل کو تیار کیا۔ غریبی میں عموماً عقل مثبت مارچ بن جایا کرتی ہے۔ ورداء کے سلیقے نے نکو کو ایف آر سی ایس کرنے کی بات کی۔ وہ پھر دھیرے دھیرے اپنی منزل تک پہنچنے کا ڈھب سکھایا۔ جب نکو سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، تو ورداء اس کی کمر باندھی اور آزاد تھی۔ جب طارق کو اس کے آپریشنوں کی داد ملنے لگی۔ نرسوں کے فون، نوجوان بیمار اور بیماردار کے پاجبت بھرے شکر یہے میں بھیگے ہوئے ہڈی توڑ ہڈی جوڑ ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ آرزو سے ٹیری فون آنے لگا۔ وہ سونے کچھ اور ہو گیا۔ ایسے فون سن کر نکو کی انا، اس کے نفس کو خاص قسم Boost ملتا۔ وہ اوپر والی منزل سے شعر کہنے سے گاتانیچے اترتا..... ورداء، چونکی ہو جاتی..... عورت کو عموماً اس وقت شوہر کی طرف سے بے اطمینانی زیادہ ملتی ہے۔ شہر میں دولت کی ریل چل ہونے لگے۔ کہیں اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ اندرا پلیس کان میں شک کی آواز آنے لگتا ہے۔ اُسے لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے اب تو میرا شوہر دوسری بیوی بھی afford کر سکتا ہے رکھیل کھیل میں سے ہے۔ گرل فرینڈز تو روزمرہ ہیں ہی۔

حالانکہ نہ شک کی کوئی وجہ تھی نہ امکانات..... نکو پٹھان پچر روایت پسند تھا۔ میں آپ کو پہلے بتا چکی ہوں خاں کے خاندان میں قیام کے بعد ہوشیار پور تک کے نوجوان ابھرے تھے۔ ایک وہ تھے جنہوں نے روایت کی ویسی ہی بات کی تھی۔ ان کے آباؤ اجداد ہوشیار پور تک کرتے آئے تھے۔ اشفاق احمد صاحب بریگیڈیئر اشتیاق جاوید طارق تھے۔ وہ خالق وہ بغاوتی سپاہی تھے جن کی آنکھیں کسی طرح کھل گئی تھیں اور انہیں اپنے خاندان کے علاوہ بھی بہت کچھ دیکھنے کا تھا۔ نکو مغرب میں رہنے کے باوجود ابھی تک مشرق سے وابستہ تھا۔ اس کے دل میں ماں کی محبت تازہ جیسے کی جیسے رہی تھی۔ اس کا دھیان اپنے مرکز سے پرے نہیں نہ جاتا۔

لیکن ورداء کے کان میں شک کی بانسری جب ایک بار بجنے لگی تو اس کی پیدا کردہ کھلیلی سے فرار نہیں نہ تھا۔ جیسے کی عورت ہے۔ اس نے جلد اس کا حل تلاش کر لیا۔ اسے سوائے مذہب کے اور کہیں پناہ نظر نہ آئی۔ جینز اور بنیان سے سوئی۔ حجاب پردہ پوشی اور دور باش کے سلسلے میں پہنا گیا۔ نمازوں کی پابندی، مسجد سے رابطہ درس کی کلاسوں میں شرکت، اللہ کی حضوری میں عاجزی و رداء کے شکوک نے عجب مثبت رنگ اختیار کر لیا۔

عجیب سی بات ہے۔

انسان عام طور پر جسمانی ساخت کے علاوہ بیرونی طور پر بہت کم بدلا کرتا ہے۔

اصلی تبدیلی اس کے اندر کہیں آتی ہے۔ وہ نئے راستوں، فیصلوں، ارادوں کی وجہ سے پہلے اندر بدلتا ہے پھر اس بدلتے ہوئے اندر میں تبدیلی در آتی ہے۔

کریسٹ سکول میں پڑھنے والے طارق کے علاوہ اُن دنوں ہمارے رحمت خانے میں ایک اور طالب علم قسم کا نوجوان بھی آیا کرتا تھا۔ ابھی اس کے پاس ایک سائیکل تھی۔ وہ پڑھائی سے فارغ نہ ہوا تھا اور ریڈیو سٹیشن پر بیٹھ کر طاہر اور خاں صاحب کے ساتھ جب موقع مل جاتا 'صد' کاری کرتا۔

اس نوجوان کا نام نعیم طاہر تھا۔

ابھی آئرس کونسل میں کرتا دھرتا ہونے کا اعزاز اسے حاصل نہ تھا۔ ابھی IP.N.C.A. اسلام آباد کی کوئی سگ نہ تھی..... یہ ساری شناختیں تو مستقبل کے پردوں میں چھپی ہوئی اس کی منتظر تھیں لیکن ایک بات ضرور تھی، نعیم طاہر آنکھوں میں اس کے رویے میں کچھ کرنے کی آرزو جھلکتی تھی۔ وہ بڑی انکساری سے ہمارے گھر آتا اور کبھی اپنے خاندان ذکر ہم سے نہ کرتا۔

اس کمرے میں جہاں نانا آ کر قیام کرتی تھیں اور جہاں جمیلہ ہاشمی رہ چکی تھیں وہ آ کر بیٹھ جاتا۔ عجیبہ سہانہ ہے کہ اس کے آنے پر میرے دونوں بڑے بچے انیق اور انیس آتش وان میں آ کر بیٹھ جاتے اور ہماری باتیں خاص کر سنتے رہتے۔ نہ وہ تو جہاں کے طالب تھے نہ کسی کو انہیں توجہ دینے کا خیال آتا۔ کھانے کا وقت ہوتا تو نعیم کو لے کر خاں صاحب باورچی خانے میں آ جاتے۔ بے حد سادہ کھانے محبت سے کھائے اور کھلائے جاتے اور اسی لیے ان میں وہ لذت مند جاتی جو مدتوں اطراف کو یاد رہتی۔

نعیم طاہر کے ساتھ ہی ایک اور یاد بھی رنگتی چلی آتی ہے۔

اور وہ ہے ایلسا باؤسانی۔

جب خاں صاحب فرار ہو کر روم پینچے اور ISMEO میں اردو پڑھانے لگے تو ان دنوں اسکندر باؤسانی نے اطالوی میں Alessandro Bausani کہتے تھے ان کے ساتھ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے۔ باؤسانی کا طور پرزبانیں سمجھنے کا لپکا تھا۔ وہ اقبال پر کافی بڑی اتھارٹی تھا۔ مشرقی علوم میں اس کی دور رس نگاہ تنقیدی مقالوں کی شکل میں رونما ہونے لگی تھی۔

لیکن بظاہر باؤسانی نہایت سادہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ اطالوی لوگوں کی طرح دونوں بازو کھولی کر ہاتھوں سے کہتا: "ماما میا mama mia" تو یقین آ جاتا کہ واقعی وہ کچھ نہیں جانتا۔ بھاری جسم پر بچھے بچھے رنگوں کے کپڑے، ملبوس باؤسانی کو ہر وقت ایلسا کی ضرورت رہتی۔ یوں لگتا جیسے وہ ایلسا کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اگر ایلسا پاس ہوتی اور باؤسانی آ کر مجبور صورت اسے دیکھتا تو ایلسا سب کچھ چھوڑ کر بھاگتی۔

ایلسا اطالوی عورتوں کی طرح خوبصورت اور دلکش تھی۔ پتی دھرم اس پر ختم تھا۔ باؤسانی کی ضروریات آگے اس کی اپنی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے رب نے باؤسانی کی بیساکھی بنا کر بھیجا تھا۔ ایلسا میں محبت والی روح تھی۔ وہ جس سے ملتی بڑی جلدی گھل مل جاتی۔ بچوں سے بھی اس کا یہی رویہ تھا۔

"نوکی صاحب کھانا کھا لیا؟"

"کیسی صاحب آپ کیا لکھ رہا ہے؟"

ہونوٹی پھوٹی اردو میں بچوں سے رابطہ قائم کر لیتی۔ جب خاں صاحب گھر ہوتے تو یہ تینوں فر فر اطالوی بولتے۔  
 میں نے وہ سب سنا ہے اُچک کر ہاتھوں کو فعال کر کے، آنکھوں کے اشاروں سے گفتگو میں جان ڈالتے رہتے۔ ان کی اس  
 سبب میں ہم خاموش ناظرین کی طرح شامل رہتے۔

”تمہارا شوہر بہت اچھی اطالوی بولتا ہے قد سیدہ..... مشکل یہ ہے کہ اس کی اطالوی خالص روم کی ہے اور میں  
 اس کی ذرا بھی سمجھتی ہوں۔ مجھے احساس کمتری ہوتا ہے! Bravo۔“

ایک روز نعیم طاہر نے ایلسا اور باؤسانی کے ساتھ ہماری دعوت کی۔ مجھے نعیم اور یاسمین کے گھر اس سے پہلے  
 گیا تھا۔ نعیم اور یاسمین کا گھر عجیب گھر سے مختلف نہ تھا۔ یہاں جگہ جگہ پرانے شمال، طرف، ٹوکریاں،  
 کتب خانے، مین سجے تھے۔ جلد ہی خاں صاحب اور باؤسانی نے کسی کی دال گلنے ندی اور روم کی باتوں سے شام کو سجا دیا۔  
 ہم تانگے پر نعیم طاہر کے گھر گئے تھے۔ میں اور ایلسا تانگے کے سامنے اور باؤسانی اور خاں صاحب کچھلی سیٹ  
 پر بیٹھے۔ جس وقت من آمد کے مین بازار میں تانگہ پہنچا، ایلسا پر ہنسنے کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے کان کے ٹوکس سرخ ہو گئیں۔  
 اس سے آنسو جاری ہو گئے۔

”کیا بات ہوئی ایلسا۔“ میں نے سوال کیا۔

”یہ یوانی ہے..... کبھی کبھی اسی طرح ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔“

بڑی دیر بعد جب تانگہ بازار سے گزر چکا اور کوچوان صاحب اسے کئی بار حیرانی سے دیکھ چکے تو ایلسا نے بتایا کہ  
 یہ کسی جگہ پر ہنسی آرہی تھی۔

”جگہ صاحب نے پھر کہا.....“

میں آج تک سمجھ نہیں پائی کہ وہ کسی انسان کو جگہ کہہ کر پکار رہی تھی کہ کسی طرف کے پرانے پن پر یوں خندہ  
 لگتی تھی۔ بس اتنی بات واضح تھی کہ واقعی ایلسا میں بچوں جیسی مصومیت تھی اور وہ اسی مصومیت کے طفیل ہر مقام پر کسی بھی  
 حالت میں اندوز ہونے کی قوت رکھتی تھی۔

باؤسانی اور ایلسا میں ایک اور بڑی خوبی ان کی Sharing تھی۔ وہ جو کچھ ہو رہا ہوتا اس میں بڑی بے ساختگی  
 سے ہونے کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ میرا خیال ہے کہ Ideas are not for ever لیکن جو لوگ خیال کو لباس کی طرح  
 پہن نہیں کرتے وہ زندگی کے کھیل کو انجوائے نہیں کر سکتے۔ لباس پہن کر بڑے قد آور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر  
 دیکھنا تو لانا چاہیے کہ لباس کارنگ فیشن تراش خراش کیا مجھ پر چچی کہ نہیں۔ کیا رنگ میری طبیعت کے مطابق ہے؟ ہر ماحول،  
 ماحول اور حالات اپنے ساتھ کچھ خیالات لے کر آتے ہیں۔ اگر خیال مثبت ہو اور اس کا ٹکراؤ آپ کے مسلک یا اقدار سے  
 ہو تو ایسے Idea کو ضرور آزما کر دیکھنا چاہیے۔ اس سے آپ کے علم میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہے..... ”سیروانی الارض“ ایسا  
 ایک مثبت خیال ہے۔ سفر میں آپ کو کوئی انسان، جگہیں، کچھ اور انداز زیست کی بولمونیات ملتی ہیں۔ آپ کسی بھی سفر پر  
 جانے کے شوق میں جائیں گے تو آپ کو پورا مکتب ملے گا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کلاس بدلتی رہتی ہے۔ آدمی ہمیشہ تختی ہی  
 پر کھتا رہتا۔ تختی سے پن پن سے بال پوائنٹ پھر مہنگی سیاہیوں سے لکھنے والے مہنگے پن..... کبھی فقط پنسل کا سہارا۔

ڈرامے سے ہمارا تعلق پرانا ہے۔

ایک روز بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ کچھ ہیرا نمٹھا قسم کا کھیل ہونا چاہیے۔ صدیقہ اور جاوید بھی آئے تھے۔ ایسا کوہیر جیسا لباس پہنایا۔ ہاتھ میں شیشے کی جڑی پنکھی پکڑائی۔ باؤسانی کو راٹھا بنایا..... صدیقہ نے کئی ٹھٹھے دھارا۔ جاوید کچھ مانا کچھ نہ مانا۔ لڈی ڈالنے والوں کی طرح گلے میں کیسری دوپٹہ ڈال کر مہینوال بن گیا۔ آنگن کے پچھلے کونے میں تخت پوش بچھایا گیا۔ اس پر ایسا راٹھے کو پنکھا جھلنے لگی۔ راٹھا صاحب نے اور بانسری پر غلط سلط سر بجانے لگے۔ اس دن کی یاد بڑی خوبصورت تصویروں میں محفوظ کر لی گئی۔

یہ تصویر بھی عجیب چیز ہے؟ دراصل جس شخص نے کمرہ ایجاد کیا، اسے ”یاد“ کو محفوظ کرنے کا خطہ تصور سے ہرگز ربا ئی نہیں پاسکتا۔ بڑھاپے میں جوانی کی تصویریں دیکھنا، جوانی میں بچپن کی تصویریں دیکھ کر کھڑکی بچھڑی محبوبہ کی تصویر دیکھ کر پرانے عشق کی سولی پر لٹکتا پرانے دشمن کی تصویر دیکھ کر واقعے کی اہمیت پر سوچنا، پوٹو باپ بہن بھائی دوست سب کی تصویروں سے تعلق خاطر کی ہلکی ہلکی پھوار دل پر پڑتی رہتی ہے۔ تصویروں کا اثر اتنا جیسا ہوتا ہے اور شاید اسی وجہ سے فلم میڈیا میں اتنی کشش ہے۔

تصویروں سے خیال آیا کہ ہماری زندگی میں عبدالرحمن میاں کیمرے کی وجہ سے داخل ہوا۔ اسے بنانے کا جنون تھا اور ہم چوری چوری اس پبلسٹی سے خوش ہوتے تھے جو ہمیں ان تصویروں سے ملتی تھی۔

عبدالرحمن میاں منگلا میں انجینئر تھا۔ ان دنوں منگلا ڈیم زیر تعمیر تھا اور رحمن میاں زمین کھودنا اور ڈالنے والے جیسے ڈیروں ناکر لوگوں کو پانیوں سے سیراب کرنے کا فن جانتا تھا۔ پتہ نہیں خاں صاحب کی رحمن سے کیسے ملاقات ہوئی۔ رحمن عام طور پر ہمارے گھر شام کے وقت آتا۔ ایک تخت پوش باہر والے برآمدے میں کبھی یہ بوسیدہ تخت پوش پچھلے آنگن میں چلا جاتا۔ کبھی اس کو اوپر چھت پر لے جاتے۔ کبھی یہ باہر گیٹ کے پاس ڈال دیا جاتا۔ اچھے دنوں میں جب یہ اصلی مالکوں کے پاس ہوگا تو اس پر موٹی سی پلاسٹک سیٹ لگی ہوگی، لیکن اس حال میں ایک نکلی کہیں آدھی رکھا رہتا تھا۔

رحمن جب بھی منگلا سے آتا اسی تخت پوش پر سو یا رہتا۔ رحمن کا پروفیشن تو انجینئرنگ تھا، لیکن اسے فوٹو گرافی اور ادب تھی۔ تصویروں تو وہ بہت اعلیٰ درجے کی کھینچتا ہی تھا، لیکن کہانی کہنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ پہلی کہانی ”دیرانے کا چول“ پہلی مرتبہ ”داستان گو“ میں چھپی اور اس نے قارئین سے بہت داد پائی۔ رحمن کبھی شاید..... شاید بڑا نام حاصل کرتا لیکن ہر تخلیق کار کی طرح اس کے اندر تنہائی نے جو فور چار کھا تھا، اس کے نتیجے میں لے کر پہلے تریا کے در پر پہنچا۔ تریا اس سے اس درجہ متاثر تھی کہ اگر کوئی سواری نہ ملتی تو دودھ والے کے ریڑھے پر چڑھ کر رحمن سے ملنے چلی آتی، لیکن یہ حالات تب واقع ہوئے جب ہم 121- سی میں تھے۔

تریا کی شادی رحمن سے نہ ہو سکی۔

رحمن کے اندر کا فنکار پتہ نہیں کیوں دم سادھ کے چپ ہو گیا اور سوسائٹی میں اس کی پہچان اس کی..... رحمن بشری رحمن بن گئی۔ جوں جوں بشری پھیلتی گئی رحمن سکڑتا گیا۔ 2007ء میں یا تو رحمن تاشقند میں اپنے جیٹ





”میں سمجھی نہیں شوق..... بھلا مجھ میں کون سا پوٹیشنل ہے۔ میں ناچنا گانا چاہتی تھی لیکن آپ کی روایات نے

اُدھر بڑھنے نہیں دیا۔“

”چلے ہم قصور وار سہی..... یا یوں سمجھئے ہم لوگ دقیانوسی مسلمان ہیں لیکن تم میں ایک خوبی اور بھی ہے۔

طرف سے تم لا پرواہی برتی ہو۔ تم بہت اچھا لکھتی ہو۔ اگر پوری توجہ دو تو دور تک اور دیر تک لکھ سکو گی۔“

”لکھتی تو ہوں خاں جی..... میرا شکاری کے قلمی نام سے کتنے مضمون لکھے ہیں۔ ادارت کرتی ہوں ”واستے

کی۔ جب کوئی افسانہ کم پڑ جاتا ہے تو جدیدی کے نام سے نکھو ڈیڈی کی طرف سے حتیٰ کہ صدیقہ کے لیے بھی ایک آؤٹ

لکھ ڈالی ہے۔“

”لکھی ہیں لکھی ہیں کہا نیاں قلمی ناموں سے..... لیکن..... لیکن.....“ وہ ناک کھجانے لگی۔

”لیکن کیا.....؟ آپ گھبرائیں ناں..... لیکن کیا؟“

”ہر عورت کی طرح تم بھی عورت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو۔ عورت کی بد نصیبی کہہ لو وہ اپنی ذات کے سہا

زندہ رہنا چاہتی ہے۔ کم بخت اتنی ناقص العقول ہے کہ نہیں جانتی بڑھا پاس کے اندر بی رہا ہے۔ جسم بھدا ہو چکا

دانت جواب دے جاتے ہیں..... بال جھڑوس بنا کر رہ جاتے ہیں اور کوئی تعریف نہیں کرتا۔ پھر فیصلہ بدلنے کا وقت

نہیں ہوتا۔ لے دے کے بچوں کے سہارے جینا چاہتی ہے۔ وہ بھی اس کی توجہ جھٹک کر اپنی راہ نیستے ہیں۔

آیا.....؟ فیصلہ کر لو..... جوں جوں وقت گزرے گا..... تمہاری شناخت بڑھے گی..... جوں جوں کام میں پختگی آئے گی

دور دور پھیلے گی..... لیکن فیصلہ تم کو خود کرنا ہوگا۔“

”جی فیصلہ تو میں کر چکی ہوں ناں خاں صاحب..... میں دونوں کام کروں گی..... عورت پن بھی ہرگز

گی..... اور..... ادنیٰ شناخت بھی پیدا کروں گی۔“

”دیکھنے عورتوں کے لیے مرزا ہادی رسوا نے اپنے ناولی ”امراؤ جان ادا“ میں مشعل ہدایت

ہے..... امراؤ جان ناچنے گانے والی بھی بنی رہی اور مشاعروں میں بھی آداب عرض کر کے شعروں پر تعریف

رہی..... پھر اس کا انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔ انجام کار جو بھی قسمت میں لکھا ہو تمہیں مل جائے گا لیکن فیصلہ

چاہیے۔“

میں نے فیصلہ کیا لیکن خاں صاحب کو زبانی نہیں بتایا۔ میں جانتی تھی کہ عورت تو ویسے ہی مرد کی طرح

میں بٹی ہوئی ہے۔ بچے گھر رشتہ داریاں سوشل لائف بازار ان گنت بکھیڑوں میں سے جس قدر کم ہو جائے اتنی

آسان ہوگا۔

میں نے اپنا زیور لا کر میں بند کرادیا۔ شادی کے لباس پیک کر کے دھردیئے اور سادہ لباس سلوا کر سفید

تھیس دوپٹا اختیار کر لیا..... ایک بار اس کے بعد بھی مجھے ایک فیصلہ کرنا پڑا۔

صدیقہ کے بھائی کی شادی تھی۔

صدیقہ چودھری برکت علی کی کوٹھی میں بڑے اہتمام سے شادی کے انتظامات میں مصروف تھی۔ میں

صاحب بھی تیار ہو کر بروقت روانہ ہوئے۔ میں نے بنارسى ساڑھی، نیل والی جوتی اور خوب میک اپ کر رکھا تھا۔ یہ لباس نہیں تھا اور غالباً خاں صاحب ایسی خاتون کے شانہ بشانہ چلنا نہیں چاہتے تھے۔

میں اپنے بھانویں خوبصورتی کا ماڈل بنی چلی جا رہی تھی۔

لیکن جب ہم گراؤنڈ کے دائیں راستے پر نیوب ویل کے پاس پہنچے تو خاں صاحب چلتے چلتے اچانک رُک گئے۔ حیران ہو کر پوچھا..... ”خیر ہے شوقی طبیعت ٹھیک ہے؟“

وہ چند لمحے چپ رہے۔ غالباً سوچ رہے تھے کہ دنا زاری کیے بغیر ایسے سچ بولا جائے۔

”ہوا کیا ہے؟“

”بات یہ ہے قد سیدہ کہ..... دیکھو تم اپنا لباس تبدیل کر سکتی ہو؟“

”لباس..... کیوں اس میں کیا خرابی ہے۔ ہم شادی پر جا رہے ہیں۔ اسکی قیمتی ساڑھیاں ایسے موقعوں پر ہی پہننا ہوتی ہیں۔“

”آپ حکم دیں آپ چاہتے کیا ہیں۔“

”حکم نہیں قد سیدہ..... تم فیصلہ کرو..... ہمارے گھر میں ساڑھی کا رواج نہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا ہے..... ویسے ہی معتوب ہوں اور.....“

میں نے جرح کی، کیونکہ میں ساڑھی اتارنا نہ چاہتی تھی۔ ”خاں صاحب..... مشرقی پاکستان کا یہی لباس ہے۔“

”ہاں کرنا تو چاہیے لیکن ہمارے گھر والوں میں ابھی وسعت نظر نہیں ہے..... وہ کنویں کے مینڈک ہیں۔ جب کسی پاکستانی بن جائیں گے تو شاید.....“

وہ چپ ہو گئے۔ ان کے لیے مجھے یہ کہنا بھی کافی بوجھل ثابت ہو رہا تھا۔

میں نے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا اور سادہ شلوار قمیض پہن کر جب پھر باہر نکلی تو خاں صاحب مسکرا رہے

مجھے میری والدہ نے بہت خوبصورت بنارسى کشمیری کڑھائی وانی تیلے کے کام سے آراستہ تقریباً پچاس ساڑھیاں سجھائیں۔ میں نے ان ساڑھیوں کا احتیاط سے پیک کر کے رکھ چھوڑا۔ اب میرا ارادہ پھر کبھی ساڑھی پہننے کا نہ تھا یا یوں سمجھئے کہ میں نے یہ ہندوانہ لباس ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔

اشفاق احمد چاہتے تھے کہ میرے تمام عیوب، کمزوریاں، غفلتیں، Shortcomings لوگوں کی نظروں سے چھپی رہیں اور میری خوبیوں کو ہیرے کی طرح تراش کر مجھے معاشرے میں پیش کیا جائے۔ اس معاملے میں وہ اللہ کی طرح سچ بولنے والے اور بہترین صورت تصور کرتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں اپنی کسی غلطی کا تسخیراڑا تے نہیں دیکھا۔

لوگوں کے سامنے میری غلطیوں کو اس طرح پیش کرنا کہ سب کے لیے ہنسی مذاق نکل آئے یہ حرکت ان کے لیے بڑی مذموم تھی۔ بار بار کسی نقص کا اعادہ کرتے رہنا ان کے مسلک میں ممنوع تھا۔ وہ تنہائی میں بھی انگلی اٹھا اٹھا کر

مسکان دکھا دکھا کر آواز اونچی کر کے اپنے آپ کو نمبر پر چڑھا کر مجھ سے بات نہ کرتے تھے۔ جب بھی عیحدگی میں بات کی آواز مدھم، لہجہ شیریں اور مفہوم مثبت نکالنے کی کوشش کی۔ ہم میں جو ساری عمر لڑائی جھگڑا نہ ہوا تو اس کی بنیادی وجہ صاحب صاحب تھے۔ میں تو شاید کسی وقت بھڑک اٹھتی۔ تقریری مقابلہ جاری کر دیتی لیکن وہ شاید اچھی طرح جانتے تھے کہ تو سب کا زخم تو مندمل ہو جاتا ہے لیکن زبان کا عطا کردہ زخم ایسا بیہودہ ہوتا ہے کہ اسے کوئی نانا کا نہیں لگ سکتا نہ یہ کبھی پورے صدمہ مندمل ہوتا ہے۔

آپ سے پہلے عرض کر چکی ہوں کہ جو نبی امیری فارغ البالی بھینے دن گھر کا رستہ دیکھ لیتے ہیں کئی تبدیلیاں اچانک گھر کے دروازے پر دستک دینے لگتی ہیں۔ غریبی میں عموماً وقت تھم جاتا ہے۔ مصیبتوں کی شکل تو نہیں بدلتی۔ صبح بھر وہی ”رٹڈی رونے“ گلے پڑے رہتے ہیں جس کے باعث غریب آدمی ڈیپرییشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ امیری میں اس وقت بدل جاتے ہیں۔ تبدیلی بہت حد تک Opportunity کی شکل میں آتی رہتی ہے۔ آدمی کو جلد جلد فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی دو گز بڑا کرفٹ راہوں کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس طرح شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی کئی باتیں ڈیپرییشن کی صورت میں نکلتا ہے۔

ہم بھی 479۔ این میں کئی تبدیلیوں کا شکار ہوئے۔ اچانک ایک دن بیٹھے بٹھائے ہی مجھے لاہور کالج فور ویکس سے نوکری کی آفر ملی۔ میں نے کسی جگہ نوکری کی درخواست نہیں دی تھی لیکن ان دنوں چنگ سٹاف کی قلت ہر کالج میں تھی۔ لاہور کالج میں بھی اردو ڈیپارٹمنٹ نیا نیا کھلا تھا۔ ظاہر ہے اس آفر نے میری اتراہٹ میں بڑا اضافہ کیا۔ رات جب سو گئے اور گھر میں فراغت کا احساس ہوا تو میں نے وہ کاغذ نکالا اور خاں صاحب کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

”یہ دیکھ لیجیے۔“

”کیا ہے؟“

”بس آپ دیکھ لیں۔“

شوقی نے کاغذ اٹھایا۔ عینک درشتی سے لگائی۔ چند لمحے پڑھنے کے بعد بولے: ”مبارک ہو..... یہ تو اتراہٹ اعزاز ہے۔ ہمیں تو نوکریوں کے لیے خاک چھانی پڑتی ہے۔ تمہیں گھر بیٹھے بٹھائے آفر مل گئی۔ شاباش.....“ پھر وہ کھنگھنگا کر بڑی نرمی سے تہہ کرنے لگے۔

”تو پھر جوائن کر لوں..... کیا خیال ہے آپ کا؟“

وہ چند لمحے چپ رہے۔ پھر بولے..... ”دیکھ لو سوچ لو۔ فیصلہ تمہارا ہونا چاہیے۔ میرے خیال کی ضرورت نہیں ہے۔“

بچوں پر ملازموں پر رعب ڈالتے مجھ میں ایک خاص قسم کا استانی پن پیدا ہو گیا تھا۔ نانا نے ایک دن مجھے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ”قدسیہ! بچپن میں تو تیری طبیعت بڑی نرم تھی۔ اب تجھ میں مشنری میموں جیسی ڈسپلن پیدا ہو رہی ہے۔ نہ وہ خود آرام کرتی ہیں نہ کسی اور کو زندہ رہنے کا حق بخوشی دیا کرتی ہیں۔“ مجھے پتہ نہیں کیوں اس روز جسد نانا کا یہ جملہ یاد آ رہا تھا۔

لیکن آپ مجھے کچھ تو فیصلہ کرنے میں مدد کیجیے ناں..... چلئے رائے ہی دیجئے۔“  
 ہاں..... مولانا اشرف علی تھانوی سے اگر کوئی رائے مانگتا تو وہ کہتے..... بھائی کرووہ جو تمہارا دل چاہے۔ ہاں  
 تمہیں تمہاری جگہ ہوتا تو یوں کرتا۔“

ہاں تو بتائیے ناں کہ آپ کیا کرتے؟“

میں نے سر کھجایا اور سوال کیا۔ ”تخنواہ قریبا کتنی ہوگی؟“

میں نے حاجت سے جواب دیا۔ ”غائباً ڈھائی سو روپیہ یا پونے تین سو۔“

”اچھا تو پھر حساب لگاتے ہیں۔ تمہیں روز تانگے پر کالج جانا پڑے گا۔ سام تانگہ 75 روپے ماہوار سے کیا کم  
 ہے؟ پھر خاں ابھی چھوٹا ہے اس کی دیکھ کر کچھ کے لیے کوئی مائی رکھنا پڑے گی۔ وہ بھی پچاس ساتھ سے کم میں نہ ملے گی۔  
 پھر تو تم پرانے کپڑوں میں گزارا کر لیتی ہو لیکن کالج میں تو ایسے کپڑے نہیں چلیں گے اور باں پھر کیا پتہ شام کو فنکشن  
 ہے۔ تمہیں شام کو بھی کالج جانا پڑے۔“

”نانا کو مجبور کروں گی وہ گھر پر رہیں گی۔“

”جیلہ ہے وہ سب مستقل طور پر یہاں روئیں گی۔“

میں چپ ہوئی۔ میرے غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔

اس روز نوکی خاں بلا وجہ تارویا کہ مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

میں نے جب ن ہو کر کالج فور ویمین کو انکار کر دیا تو خاں صاحب منہ سے کچھ نہ بولے لیکن ان کے رویے سے  
 مجھے حساسی ہوا کہ وہ بڑے مطمئن ہیں۔ جیسے کسی بڑے قلعے کا محاصرہ توڑ دیا ہو۔

یہ 121۔ سی ماڈرن ٹاؤن کا واقعہ چونکہ اسی ڈھب کا ہے اس لیے یہاں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ایک بار جب  
 صاحب بھائی ہمارے پاس آئے تو انہوں نے کہا..... ”قدسیہ! یہ تمہارے پاس ہی شاکر علی میوزیم بن رہا ہے ہمیں اس کے  
 لیے ایک صد ڈائریکٹر کی ضرورت ہے۔ اگر تمہارا جاد تو یہ نوکری میں تمہیں بہ سہولت دلوا سکتا ہوں..... اچھی تخنواہ کے علاوہ  
 پھر بھی ملے گی۔ گھر کے کام کے لیے دونو کر بھی آجائیں گے اور سفر کے دوران سرکاری ٹکٹ بھی مل جائے گی..... سوچ کر  
 جہاں۔“

ایک بار پھر میرے دل میں انا کا گلاب کھلا۔ اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ میں نے خاں صاحب سے

پوچھا..... ”آپ نے سن لیا ناں شہاب بھائی جو کہہ رہے تھے۔“

”ہاں سن لیا۔“

”پھر کیا کہتے ہیں آپ؟“

”دیکھو قدسیہ! بات میرے کہنے سننے کی نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی سے جو فیصلہ کرو گی ہم سب کو منظور ہوگا۔ ظاہر  
 سے اس وقت ہمیں پیسے کی تنگی نہیں ہے جس کی وجہ سے تم کو نوکری کرنا پڑے۔ گاڑی گھر پر موجود ہے۔ پھر پرسنل گاڑی اور  
 ڈرائیور تو اسے درکار ہوتا ہے جو شخص بڑا سوشل ہو اور جسے گھر پر وحشت ہوتی ہو..... رہ گیا خانساں تو ہماری حیوانی رمضان

سلامت رہیں۔ گھر پہلے ہی خدمت گزاروں سے بھر پڑا ہے اور دو آدمی تابعدار بنا کر کیا ملے گا۔“

بہت سارے مسائل بدل چکے تھے لیکن میری نوکری سے ان مسئلوں میں سے کوئی بھی نہ سنورتا تھا۔ یہ ضرورت تھی کہ میری شناخت ایڑی کی گرگا بل مل جاتی۔ انسان کے اندر بسنے والی اس کی انا کسی طور پر مطمئن نہیں ہوتی۔ دم بھوکی پیاسی اور دکھی سی کچھ نہ کچھ مانگتی رہتی ہے۔ برسوں اس شہنی خورہ کو پانی دو..... اس کی پیاس ختم نہیں ہوتی۔ عمر کے آخری حصے میں جا کر کچھ کچھ پتہ چلا ہے کہ جس راستے پر انا نکلا ہوا تھا یا ساتھ نہ ہو وہ راستہ صرف انا کا سفر ہی ہے۔ یہاں کھانے کو تھوہرا اور پینے کو گرم پانی ملتا ہے۔ آپ کو فرعون کی طاقت ملے یا قارون کا خزانہ نہ اپنا فائدہ کھائے نہ کسی اور کا.....

ابن میں نے بڑی دقت سے اپنے لیے یہ بات سوچی کہ کسی اور کا فائدہ چونکہ نہ ہوگا اس لیے یہ کام افادہ خالی ہے..... گھر بھرنے سکھ کا سانس لیا اور ایک بار پھر شائق کی ہوا میں برآمدے میں چلنے لگیں۔

شہاب صاحب 121۔ سی ماڈل، ڈن میں ہمارے بہت قریب آئے لیکن اس بارش کے بلکے بلکے چھینکے آباد کے اسی گھر میں شروع ہو گئے تھے۔ یوں تو دو خاں صاحب کے اس دقت کے جان کار تھے جب وہ 1۔ مزنگ رہتے کرتے تھے۔ پھر جب میری شادی ہوئی تو وہ اور عفت مجھے ہیلو ہیلو کہنے والوں میں شامل ہو گئے۔ لیکن شروعات اسی گھر سے ہوئیں۔

شہاب صاحب اس دقت و وقتی حکومت کے سیکرٹری تھے۔ محکمہ غالباً تعلیم کا تھا لیکن اب میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔ وہ سرکٹ ہاؤس میں رہا کرتے تھے لیکن شام کو جب خاں صاحب گھر پر ہوتے وہ چھوٹے سے باورچی خانے میں تپائی نما میز پر بے جوڑ برتنوں میں گول ڈگڈگی موڑھے پر بیٹھ کر بڑے معمولی کھانے رغبت سے کھاتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دسترخوان پر مل بیٹھنے کی مہمان نوازی مسلمان ممالک میں چلی آ رہی ہے۔ روایت سب سے زیادہ ڈیروں پر نظر آتی ہے۔ یہاں فائیو ٹارکا کھانا نہیں ملتا نہ ذریعہ کار و راج ہے کہ اپنا اپنا ادا کیا کرتے ہیں۔ خاں صاحب کی تو وضع بھی خاص الخاص دسترخوان سے وابستہ تھی۔ وہ چٹنی روٹی اچار پر اٹھا کھانے میں محسوس نہ کرتے۔ پر تکلف کھانوں کی ان کے نزدیک کوئی شرط نہ تھی۔ میں عموماً اہتمام کے بغیر کھانا کھانے میں سکتی تھی کرتی۔ میرا جی چاہتا کہ شہاب صاحب کے شایان شان کچھ ضرور ہو۔ خاں صاحب کہا کرتے: ”قد سید اہتمام نہ کر۔“ انتظام کر لو۔“

میں ان دونوں کے فرق کو بہت بعد میں سمجھی۔ جب بھی شہاب صاحب آتے میں آلو کی پوریاں بنانے کی کوشش کرتی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس قسم کی پوریاں رغبت سے کھاتے ہیں۔ لیکن ان سے گفتگو بہت کم ہوتی تھی۔ پھر طرف کبھی ان کی توجہ نہیں گئی۔ وہ خاں صاحب سے آگے ایک قدم نہ بڑھتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے اور بچوں سے ہونے کی کوشش نہ کی..... کوشش تو غالباً وہ ایک ہی سمت میں کرتے تھے لیکن ابھی مجھ پر ان کی یہ سمت نہ کھلی تھی۔ شاید خاں صاحب اس جہت کو جانتے ہوں لیکن انہوں نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا.....

ذکر تو خاں صاحب ویسے بھی بہت کم باتوں کا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہر معاملے میں اپنی راہ

تو زبانی دی تھی۔ جس وقت وہ طفیل نیازی کے ٹیپ لے کر گھر آئے۔ انہوں نے طفیل نیازی کا نام تک مجھے نہ  
 سنا تھا۔ طفیل نیازی کی گونج دارآواز سے بھر جاتا۔ ایک جادو سا فضا میں تیرنے لگتا۔

میں نہیں جانتا کھیڑیاں دے نال“ کی کوک بن کر کمروں میں تیرنے لگتی اور میں سوچتی رہتی پتہ نہیں یہ  
 کون سے گمانے والا کون ہے۔ پھر ایک دن ایک آدمی نانی اماں کے کمرے میں خاں صاحب کے پاس بیٹھا نظر آیا۔  
 میں نے دیکھا کہ جب کبھی بھی خاں صاحب کے پاس کوئی بیٹھا ہو میں از خود اس مجلس میں شرکت نہیں کرتی تھی، اگر خاں  
 صاحب بیٹھے تو اور بات تھی۔

”قدسیہ..... ذرا ادھر آنا۔“

میں اندر گئی۔ ایک بھاری بدن ملائم سانولے چہرے اور کھرج دار آواز میں ایک شخص پینٹ قمیض میں ملیوں نانی  
 صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔

”یہ طفیل نیازی ہے۔“

بھرے چہرے پر شناخت نہ ابھری تو خاں صاحب بولے..... ”بھئی جس کے گانے سن کر تم باورچی خانہ چھوڑ

”یہ میری بیوی ہے..... قدسیہ۔“

طفیل نیازی اپنی باتوں میں لگن رہا۔

طفیل سے بات کرنا مشکل نہ تھی کیونکہ اس کے پاس ان گنت باتوں کا پتلا تھا۔ کبھی وہ چراغوں کے میلے کا کوئی

کچھ مانتے والوں کی ٹولی میں مل کر گانے بجانے کی کہانی سناتا۔ کبھی گڑوی بجانے والیوں کا ذکر ورمیان میں لے

جاتا تھا۔ اس نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔

”خاں صاحب! میں اور میرا چھوٹا بھائی فقیر یا ہمارے ساتھ چلی سازندے فیصل آباد کی درگاہ سے چوکی بھر کر آ

ئے تھے۔ ہمیں بس ننلی۔ شہر سے دور ایک اچڑ گدہ میں دریاں ڈال کر لیٹ گئے۔ خاں صاحب! کوئی آدھی رات گزری

تھی کہ جنوں کی ایک ٹولی وہاں اتری۔“

”جنوں کی“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں بی بی جن ہوتے ہیں۔ ان کا ذکر اللہ کی کتاب میں آیا ہے۔ ٹھیک ہے آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ آپ

مجھے پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی آنکھ دیکھ سکے لیکن ہوا بھی تو موجود ہے نا۔ آپ مانتی ہیں نا۔“

”بی بی قدسیہ! میں نے بھی آپ کی طرح انہیں نہیں پہچانا تھا۔ لیکن فقیر یا نے میرے کان میں کہا: ”دیکھو بھائی

میں میں سے کوئی بھی آنکھ نہیں جھپکتا..... یہ دوسری مخلوق ہے ہم میں سے نہیں۔“

”اچھا تو آگے چل۔“ خاں صاحب بولے۔

”ہاں تو سرکار وہ ٹولی بھی اُس رات اُسی درگاہ پر چوکی بھرنے آئی تھی جہاں ہم چوکی بھر کر آئے تھے۔ فقیر یا کی

گفتگو سنی لیکن میں پتہ نہیں کیوں سو نہ سکا بلکہ چوری چوری انہیں دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے سلطان باہو کا

کلام ایسی لہک سے گانا شروع کیا کہ وجد طاری ہو گیا۔ جی چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی جنگل میں جا بسوں اور سوائے کوئی اور رشتہ باقی نہ رہے.... لیکن سرکار ہم لوگ.... ہم جو گانے بجانے والے، قوالی کرنے والے، ٹمر کے لوگ ہوتے ہیں، ہمیں اپنے رشتے بہت پیارے ہوتے ہیں۔ ہم لاکھ چاہیں اپنے گھر والوں کے سوائے کسی کے لیے نہیں ہوتے.... میرا ارادہ میرے سوائے ہوئے بھائی، گھر بیٹھی بیوی اور بچوں نے تو زدیا۔ کچھ اونگھتا سوتا میں اس کو غافل نہیں تھا۔ پھر وہ فجر سے پہلے اٹھے۔ اپنے ساز سنبھالے اور چلنے لگے۔ ابھی دس بارہ قدم دور ہو گئے ہوں۔ سارے غائب.... ہا جا سا رنگی ڈھولک طبلہ.... سمیت نہ کوئی نشان نہ کوئی اند پتہ نہ کوئی یادگیری نہ کوئی نشانی.... یہ واقعہ ہے سرکار.... لوگ تو میلوں پر اور بھی عجیب و غریب باتیں بتاتے ہیں....“

صفین اپنی ممتعلوئی باتوں سے خاس صاحب کو رجھار ہا تھا۔ میں اس کی باتوں سے متاثر ضرور ہوئی لیکن ایمان لانا میری تعلیم کی وجہ سے ناممکن تھا۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ انسان کا ماحول اس کی ذات کو گھرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ انسان کی تعلیم، ماحول اس کی جہت اور میں جون ایسے فیکٹرز ہیں جو ہر شخص کو ایک خاص ڈالتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے اس قدر مماثلت بھی رکھتا ہے اور یقین فرق کا شکار دیتا ہے۔

لیکن موسم ان سب سے زیادہ انسان کی بناوٹ کو بدلنے میں مدد دیتا ہے۔ جن ملکوں میں برف باری ہوتی ہے وہاں لوگ گھروں میں محبوس ہو کر Introvert ہو جاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انسان کی اصیبت کا بغور مطالعہ کرنے کا وقت بھی ملتا ہے اور کرب بھی۔ اسی تہائی نے یورپ میں سائنس کو جنم دیا۔ دھیرے دھیرے انسان کو بھی سائنس کا حصہ بنا دیا۔

اس سلسلے میں بیسویں صدی میں یونگ ایڈراور فرائیڈ نے نفسیات کی دنیا میں ایک انقلاب کی شکل دیا۔ لیکن انسانی مجبوری ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر میں محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

فرائیڈ کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی تخلیقی قوت جنس تھی۔ جب اس کی آسودگی ممکن نہیں ہوتی تو اس میں اس تشنگی کا علاج ڈھونڈ نکالتی ہے۔ فرائیڈ نے اپنی تھوری کو تقویت دینے کے لیے بہت سارے راستے ڈھونڈے۔ یہ Psycho-analytical طریقہ علاج تھا۔ خوابوں کی تعبیر اور ان میں Symbols کی تلاش ایڈپس کپلیکس کی دہی اور نیوراکس اور شیوزوفرینیا کے علاج کی سائنسی توجیہات نکالیں۔ کچھ عرصہ یونگ اپنے استاد فرائیڈ کے ماحول شامل رہا اور اس کے انداز فکر سے مطابقت میں آنا و صدقہا کہتا رہا۔ یہ تعلق تو قائم رہا لیکن انسان کے متعلق تشریحی بحث بھی خاطر خواہ اضافے ہوتے رہے۔

لیکن پھر یونگ نے انسان اور اس کی دیومالائی بیک گراؤنڈ کی طرف ایک اور نقطہ نظر سے شدید توجہ مرکوز کر دی۔ وہ سمجھنے لگا کہ فقط جنس ہی انسان کی واحد ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ماضی کا بھی حصہ ہے اور ان دیکھی طاقتوں اور اس طرح Cosmic Consciousness کی ایجاد ہوئی۔ یونگ نے Introvert-Extrovert میں انسان کو کیا اور ماورائی تجربات کو بھی زندگی کا ضروری حصہ بنا دیا۔ حضرت انسان کی تلاش نے ایڈلر کی سمت بھی متعین کر دی۔

صنیدہ: وہ سب بات کو اہمیت دیتا تھا کہ انسان میں Will to power اہم ہے۔ ہر انسان رب بننے کی کوششوں میں حصہ لیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی قوت اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی خواہش میں پنہاں ہے۔  
فرائیڈ کی جنس سے وابستگی۔

یونگ کا Archetypes سے عشق اور ماورائی قوتوں کی رغبت۔

یونگ کا Will to power کا فلسفہ۔

یونگ کی اپنی اپنی سمت کے بڑے کام تھے، لیکن یہ سارا سچ نہیں تھا۔ میرا علم اتنا نہیں کہ میں ان تینوں پر آپ کو وضاحتیں پیش کر سکوں۔ لیکن مجھ پر خاں صاحب کی صحبت میں ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ انسان چاہے کتنا ہی کمزور اور عاجز کیوں نہ ہو، اس کی تلاش کی معراج مذہب ہے۔ یہاں آپ کو منوانے سے بھی زیادہ کسی کو ماننے کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسان چاہے کسی مقام پر پہنچ جائے، تہذیب رہے گا۔ قارون کے خزانہ فرعون کی طاقت میں اللہ کا ہاتھ اور اس کی قوت بے کار ہے۔ انسان کے اطمینان قلب، صبر و شکر، ترقی و فلاح کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دراپس بھی تلاش کرے اور اللہ کا اعتقاد و ایمان اسے ماتحت لینے پر ہمیشہ رضامند رکھے۔

خاں صاحب سمجھتے تھے کہ یہ تلاش جو انسان کا مقدر ہے سب سے زیادہ فنکاروں کا نصیب ہے۔ وہ شاید خدا کو تلاش کر پاتے لیکن اپنے میں وہ جو ہر ذمہ داری لیتے ہیں جو ان کی شخصیت کا بہترین اظہار و تشکر ہوتا ہے۔

جو لوگ طفیل نیازی کی طرح رب رب کرنے والے فنکار ہوں وہ اپنی جملہ خرابیوں کے باوجود (خرابیاں تو ہم سب کے ہیں) شاکر اور صابر آدمی طفیل نیازی کی اونچ نیچ، مشکلات، اوگھٹ گھٹائیاں، زندگی میں بھی عام نارمل آدمی کی طرح ہوتی ہیں لیکن وہ کبھی اللہ کا شکوہ نہیں کرتا تھا۔

لیکن مجھ میں نہ تو خاں صاحب والی تلاش تھی۔

نہ طفیل نیازی جیسی تسلیم و رضا۔

مجھے میری تعظیم نے صرف یہ سکھایا تھا کہ اپنے زور بازو پر اعتماد کرو۔ جو لوگ اپنی توانائی اور تقویت کو بروئے کار لاتے ان کی صلاحیتیں رنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ مجھے نہ کسی مقدر پر یقین تھا نہ ایسی قوت پر اللہ کا یقین ہی تھا جو انسان کو تہمت جانے کی توفیق دیتی ہے۔ میں تو کسی خود سرنچے کی طرح اپنے سینہ پر مکام مار کر کہنے کی عادت تھی۔

”میں میں آئے آئے۔ میں خود۔“

اسی جذبے کے تحت ایک روز جب طفیل نیازی ہمارے گھر آئے تو میں نے ان سے کہا۔ ”طفیل بھائی! مجھے

گنے کا بہت شوق ہے۔ میں ایک ماسٹر صاحب سے کچھ دیر کلاسیکی موسیقی بھی سیکھ چکی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے گانا

سکھادیں..... میں اس فیلڈ میں نام پیدا کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ ازراہ ادب چند ثنائے چپ رہے۔ پھر ہولے سے بولے۔ ”ہاں بی بی! ذرا میرے ساتھ گرم اٹھائیں۔“

ایک بار طفیل بھائی نے سارے گاما کی سرگرمی سادگی سے ادا کی۔ توقف کیا پھر سرگرم دہرائی اور چپ ہو گئے۔



میں نے ان کے تعاقب میں گویا سرسُر ٹھیک ہی گایا۔

پھر انہوں نے دو تین بول ایک ٹھمری کے گائے۔ میں نے نقل بہ نقل اصل اتاری۔ جہاں تک نقل کا تعلق ہے درست تھی لیکن ان کے بھانویں کچھ کسر تھی۔ وہ چپ ہو گئے۔ میرے گانے کی کوئی تعریف و توصیف نہ کی۔ میں بھتکتی ہوئی لیکن خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد بولے۔ ”میں بی بی ہر ایک سے جھوٹا بولتا ہوں لیکن شاگرد سے ایسی دل لگی کو سنتے ہوں۔ تمہارے علم میں کوئی کمی نہیں..... لیکن تمہیں میرے رب نے وہ آواز نہیں دی جو اصلی گائیک کو ملتی ہے۔ وہ رہیں تو درمیانے درجے کا اثر تو پیدا کر لیں گی لیکن وہ بلندی بس میں نہیں آ سکتی جو اچھی آواز کو ملتی ہے..... آپ جب آواز دیتی ہیں تو آواز کا پتہ لگتی ہے..... یہ بڑا نقص ہے۔“

میری شکل دیکھ کر طفیل بھائی کو ترس آ گیا..... ”آپ کسی اور فیلڈ میں کام کریں۔ کیا پتہ وہ شہرت مل جائے گی آپ کو شوق ہے۔“

اس سے پہلے میں شوقیہ کمروں میں غسل خانے میں پورچی خانے میں گایا کرتی تھی لیکن اس کے بعد یہ مجھے بند ہو گیا۔ خاں صاحب نے بھی ایک دو مرتبہ مجھ سے کہا: ”ہاں یار آواز تمہاری تو کانپتی ہے.....“ میری والدہ بھائی سے اور میں پہاڑوں سے گاتے چلے آئے تھے۔ لیکن طفیل نیازی کی بات نے مجھے محتاط کر دیا۔

انسان کے ہر اہتھے سے اچھے نکل کا راستہ برے نکل کی طرف نکل سکتا ہے اور اس کی بدی کا دروازہ ایک تھپتھپائی کی راہ پر کھل سکتا ہے۔ میری اس دلآزاری سے میرے لیے ایک بہت ہی اچھا تجربہ میری زندگی میں شامل ہونے لگا۔ قلم اور کاغذ تھا مایا اور اپنی دلچسپی کی سست بدل ڈالی۔

اگر میں کانپتی آواز میں تانیں اٹھانے والی ٹھمریاں گانے والی ہوتی تو شاید ہوشیار پور کے پشمان اندر تھی بھاگ جاتے اور میں منیر نیازی کو کبھی نہ جان سکتی۔ لیکن پتہ نہیں میری تقدیر کتنی یاد اور میری عقل کتنی کوتاہ ہے کہ مجھے قابل ذکر لوگوں کی توجہ ملی۔

منیر نیازی ہمارے گھر آیا کرتے تھے لیکن مجھ سے کبھی لمبی چوڑی بات نہ کی تھی۔ ایک روز آئے تو خاں صاحب نے گھر نہ تھے۔

”تمہاری..... جاننٹی ہو میں کون ہوں؟“

”جی جاننٹی ہوں۔ میں نے آپ کی دو تین غزلیں اور نظمیں ”داستان گو“ میں چھاپی ہیں۔“

ہرایڈیٹر کی طرح ”داستان گو“ کا ذکر کر کے میں نے اپنی قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔

”او میری بڑی مشکل آسان ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ اشفاق رسالہ نکالتا ہے۔ اب پتہ چلا واقعی اس رسالے سے تیرا بھی کچھ تعلق ہے۔ ہاں بھی اشفاق گھر پر نہیں ہے۔ میں نے اپنی پنجابی نظموں کو اکٹھا کر لیا ہے۔ اگر تمہارے ادارے سے ارادہ ہو تو چھاپ لو.....“

”نام کیا رکھا ہے منیر بھائی؟“

”سفر دی رات.....“

حسین نے چپکے سے نظمیوں کو پکڑا لیا۔ مجھ سے کوئی لمبی چوڑی بات نہ کی اور جلدی رخصت ہو گئے لیکن پتہ  
 مجھ سے نہ ہوا۔ مجھ پر مکمل اعتماد ہو گیا۔ یہی اعتبار اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے اپنی نظموں کا انگریزی مجموعہ  
 'سب میرے نام کیا۔ ان کے لیے غالباً یہ ایک معمولی بات تھی لیکن میرے لیے یہ اعزاز کی تمغہ حسن  
 کے تھے۔

حسین نے زنی بھی پٹھان برادری کے جملہ مردوں کی طرح اظہار کے معاملے میں بڑے جھینپو تھے۔ خاں صاحب  
 نے ان کے لیے رشتہ دار بھی تھے کہ نہیں؛ لیکن دونوں ہوشیار پور کے عاشق تھے جہاں ان کے پرکھوں نے پڑاؤ ڈال کر  
 ان کے ساتھ سکھ کا سانس لیا۔

میر نے شوالک کی پہاڑیوں سے دونوں کو گہری محبت تھی۔ دونوں کے دلوں میں چھتری ہوئی گلیاں، بے آباد گھر،  
 مٹی اڑاتے راستے، اجڑی بجزی قبریں، گرسے پڑے کتبے اور یادوں کی سنسناقی ہوائیں چلتی  
 تھیں۔ ان کے اندر امید بن کر تو طلوع ہوئی لیکن یہ امید جیسے ہوا کی زد میں رکھا ہوا دیا تھا کہ نہ بچھتا تھا  
 نہ طرح لودیتا تھا۔

حسین نے زنی کے خوبصورت چہرے کو میں نے کبھی کھلکھلاہٹ میں نہیں دیکھا۔ وہ چہرہ ہمیشہ تھوڑا تھوڑا ہنستا ہوا  
 تھا۔ میرا اپنی مسرتوں کو بھی چھپائے رکھتا، گویا نظر بد سے بچا رہا ہو۔ سب سے بھلی چیز میری زنی کی آواز تھی..... کچھ  
 کیسی بیٹھی بیٹھی ہی آواز..... کچھ کسی محبوبہ کے آگے عرض حال کرتے وقت رک رکی سی، کچھ حاکم وقت سے مراعات  
 کی جھجکی اور اصرار سے بوجھل آواز.....

حسین نے زنی کے مالی حالات کبھی درست نہ رہے۔ وہ ان مالی حالات کے ہاتھوں بڑے زچ ہوا کرتے تھے۔  
 ان کے دل سے بری لگتی تھی اور ساتھ ہی ہانگے بغیر چارہ نہ تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ آخر تک  
 ان پر جانے کی حاجت رہی۔

وہ وہی امریکہ لندن میں ہونے والے مشاعروں میں جانے کے لیے پہلے دعوت کا اظہار کیا کرتے پھر خود ہی  
 کو قون بھی کرتے اور شرمندہ بھی ہوتے۔ ہمارے ہاں عجیب بات ہے کہ مشاعروں میں شاعروں کو اکٹھا کرنے  
 کے لیے ایسے شاعروں کا ہجوم رہتا ہے جو ہر طرح سے ان کی خوشامد کر کے اپنا راستہ بناتے ہیں۔ خوشامد چونکہ انا کو  
 کہتی ہے اس لیے نو دولتوں کی طرح ان نو شاعروں کی کھپ سے مشاعروں کا بندوبست کرنے والوں کو بڑی  
 حاجت ہے۔

ان حالات میں منیر بھائی کو بھی خوشامدی رعایا میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ان دنوں  
 ان کے چکر نہ چلا تھا۔ منیر نیازی ابھی ساہیوال میں رہتے تھے۔ جب بھی لاہور میں قیام ہوتا وہ ہمارے گھر ضرور  
 آتے۔ اس دن وہ اپنی بیوی کو لے کر ہمارے پاس آ گئے۔

’یہ میری بیوی ہے قد سیدہ..... تم سے ملنے کا اسے بہت شوق تھا.....‘  
 میرے سامنے جوان سال خوبصورت منیر نیازی کے ساتھ ایک جوانی پٹی، مرجھائی سی میلی میلی خاتون کھڑی تھی،

جس کے چہرے پر لجاجت آمیز مسکراہٹ، معافی کے انداز میں پھیلتی تھی۔ میں نے دل میں اس بے جوڑ شادی پر ہنسنا شروع کیا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ خاں صاحب نے بھی تو خاندان سے باہر شادی کی تھی اور میں کسی طور پر ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ پھر سجاد تھا..... اشتیاق تھا..... خالد آفتاب تھا..... جاوید طارق تھا۔

ان روایت توڑ پنہان بچوں نے خاندان سے باہر شادی کر کے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچادی تھی کہ خاں صاحب کے مرد گھر سے باہر جب بھی چناؤ کرتے تھے ہمیشہ برامال خرید کر اسے سرکاج تاج بنا لیتے تھے اس لیے نہیں کہنا نہیں ہے۔ مائیکل کا علم نہیں تھا بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ انہیں اپنی Commitment کا ہمیشہ پاس رہتا۔ وہ کسی غلط فیصلہ کر بیٹھنے سے اس سزا کے سزاوار بن جاتے۔

میر نیازی اپنے سے عمر میں بڑی خاتون کے ساتھ بڑی محبت سے دن گزارتے گزارتے بالآخر اس کے پیچھے جب ان کی بیگم داغ مفارقت دے گئیں اور وہ آئیڈ بار پھر تیار ہو گئے۔

میر نیازی بھی آتے رہے اور طفیل نیازی بھی۔ ایک روز جیلہ اختر اس وقت آئیں جب طفیل بھائی گھر آئے تھے۔

جیلہ دراز قد، خوبصورت اور مرذت والی روح تھی۔ شہر کے ایک معتبر ریٹس میر صاحب کی بیگم تھیں۔ میر صاحب دنیائے رخصت ہو گئے تو جیلہ کو تین بچے دے گئے۔ ایک بیٹی امریکہ میں بیابھی گئی ہے اور دو بیٹے اچھے مقامات پر جیلہ کے لیے باعث فخر ہیں۔

ان دنوں جیلہ کے پاس اس کی آواز قہقہے کا ویزا تھا۔ وہ بڑی خوبصورتی سے ڈائلاگ ادا کرنے کی فنکار تھی۔ اس کا قہقہہ باعث شہرت تھا۔ اسی قہقہے کی بدولت وہ طفیل نیازی سے متعارف ہوئی۔

جب سُر کے رسیانے جیلہ کی ہنسی سنی تو خاں صاحب سے پوچھا: ”یہ کون سُر میں ہنس رہی ہے؟“  
خاں صاحب نے جیلہ کو آواز دے کر بلایا۔ تعارف کرایا۔ ”یہ ہماری ڈرامہ ڈائمنس ہے۔ میرے ڈراموں کی عموماً یہی سٹریٹ کروارا کرتی ہے۔“

طفیل نیازی نے بڑے اشتیاق سے کہا..... ”بی بی! میرے پیچھے پیچھے ذرا سرگم گاؤ۔“  
جیلہ اختر نے بڑی سہولت سے خوفزدہ ہوئے بغیر سرگم کا تعاقب کیا۔

پھر کسی ٹھہری کا مکھڑا گا یا۔ یہ بھی جیلہ کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ لوک گیت کے اونچے سروں میں طفیل نے کمرے میں گونج پیدا کر دی۔ جیلہ اختر نے اس گونج کی بازگشت سنا دی۔ بڑے امتحان میں پاس ہونے کے بعد میر صاحب نے ایک بڑے فنکار کی طرح اسے کام کر چکنے کے بعد کبھی گھبراہٹ کا احساس نہ ہوا تھا۔

”لو بی بی اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنا شاگرد بنا سکتا ہوں۔“  
مجھ پر حسد کا بم گولا گرا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جیلہ جو میری چھوٹی سی اور خاں صاحب کی بڑی بیٹی تھی

یوں اس کی پذیرائی ہوگی۔ پرستار عموماً قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ طفیل بھائی جیلہ کے استاد ہیں اور اس کے گھر جا کر اس کی تعلیم فرماتے ہیں۔ میں نے کبھی طفیل بھائی کا ذکر اس سے نہ کیا۔

مجھے تو ایسے حسد کی یلغار کے بعد اس کے تعاقب کا وقت بھی نہ ملا۔ جیلہ ہمارے گھر چھوٹی بہنوں کی طرح آنے لگی۔ پھر وہ ایک دن اپنے ساتھ صابرہ سلطانہ اور اس کی بیوی روجی کو لے کر آ گئیں۔ یہ سب ہمیں جنہوں نے ”اُچے برج لہوردے“ میں جیل بسل کے ساتھ سیکورٹی کا معرکتہ آرا رول کیا تھا۔ صابرہ نے خوش لباس اور اپنا آپ نہ منوانے والی خاتون تھیں۔ وہ بہت کم شلو اور قمیض پہنتی تھیں۔ عموماً ہلکے پھلکے رنگوں کی کپڑے پہنتی تھیں۔ جیلہ اختر اور وہ چند بار اکٹھی آئیں۔

پھر ہمیشہ کی طرح صابرہ اور روجی خاں صاحب کی زیادہ چیتھی بن گئیں اور جیلہ دیکھتی رہ گئیں۔ یقیناً جیلہ پر بھی کچھ پڑا ہوگا لیکن اس نے کبھی منہ سے اظہار نہ کیا اور ہولے ہولے پیچھے ہٹ گئی۔

ایک خطرہ ہمیشہ دوستی میں رہتا ہے۔ جب کبھی کوئی شخص اپنا دوست اپنے کسی دوسرے دوست سے ملواتا ہے تو یہ ہے کہ جب تمہارے یہ دونوں دوست بہت قریب آ جاتے ہیں اور آپ کی نشی کر دی جاتی ہے۔ اس بات کو کیا کیا احتیاط سہل پسند ہے۔ جب کوئی بنا بنایا رشتہ شمالی میں رکھ کر پیش کیا جاتا ہے جو قائل اعتماد بھی ہو تو پھر انسان اس میں پورا نہیں اتز سکتا اور غوطہ لگا جاتا ہے۔ ایسے ہی جیلہ بھی ڈکی لگا گئی۔

479۔ این میں جب یو ایس آئی ایس ریڈیو پاکستان گویا خاں صاحب کی عادت کا حصہ بن گیا۔ ایک اور نئے سرے کا لا اور گھر پر بڑے زور کی دستک دی۔ یہ دستک ناہید کی تھی۔ آپا فرخندہ کی بیٹی ناہیدہ.....

اس شاید پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ اقلیت ہمیشہ ٹھنی بند معاشرے میں اپنا تحفظ محسوس کرتی ہے۔ وہ اپنی قوم پر رواج لباس انداز گفتگو زبان کے پیچھے مر مٹنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اکثریت کے دریا میں اپنی ناؤ بہاؤ کرتی ہے۔

ہن لوگوں کی تبدیلی جب بھی آتی ہے خاندان کے کسی فرد کی انفرادی سوچ کے ہاتھوں آ سکتی ہے۔ جب ہم باہر شادی کرنے کا ارادہ کر کے خاں صاحب نے پُر سکون پانیوں میں تلامح برپا کیا تو خود ان کے اپنے اندر کی خواہش نے احترام جرم احساس کتری اور حزن و ملال کے چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا کر دیئے۔

اس بار ناہیدہ نے اس تبدیلی کا شوشا چھوڑا۔ اسے حسن اتفاق یا شومنی قسمت کے باعث قدسیہ سے محبت ہو گئی تھی۔ یہ محبت میں ویسا ہی اعتماد تھا جیسا خاں صاحب نے مجھ پر کیا۔

خاں صاحب گھر پر نہیں تھے۔ بچے اور میں سن آباد 479۔ این کے بیرونی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد ترین سائیکالوجسٹ کی بیوی کا چھاپنے بچے کو پرام میں دھکیلتی لے گئی تھی۔ اس وقت ہمیشہ کی طرح حیا کی صورت میں کچھ کھنے والی ناہیدہ کلفا اندر آئی۔ اس کے ساتھ بچوں کا ایک ٹرائی سائیکل تھا۔ اس نے نوکی کو سائیکل پکڑا یا جو کچھ وہ بٹھا کر گلی کی طرف لے گیا۔ اشیر خاں میری گود میں سو رہا تھا۔ اس لیے وہ سائیکل Excitement میں شامل

”قدسیہ آ پ!“

”جی۔“

”قدسیہ آ پائے۔“

”ہاں کہو؟“ میں نے استادوں کی سی دھمکی کے ساتھ کہا۔

”قدسیہ آ پائے۔“

”بتاؤ ناں ناہید۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”آپا جی جواد..... سجاد؟ کوئی؟“ اس نے دائیں بائیں کچھ ذومعنی سا سر ہلایا۔

”اچھا میں پرے دیکھتی ہوں۔ تم ہمت کر کے کہہ ڈالو۔“

”وہ جی آپ کو پتہ ہے ابولسیا گئے ہوئے ہیں۔ اب آپا کا بھی ارادہ ہے کہ وہ ابوجی کے پاس چلی جائے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ اس میں بسور نے کیا بات ہے؟ ہر بیوی کو شوہر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔“

”اتقا آسان نہیں قدسیہ آ پائے..... میں جہلم چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔“

جہلم کا نام سن کر مجھے یاد آیا کہ اب ناہید میری شاگرد نہیں تھی۔ ناہید کلفا آپا فرخندہ کی بڑی

پرائم گلاس فیکٹری والوں کی بہوتھی۔ اس کے سر سعید احمد خاں بڑے اصولوں کے آدمی تھے اور ان کے

بھائی رشید احمد خاں جن کی ناہید بیوی تھی، جہلم سے گہری محبت رکھتے تھے وہ بھلا ناہید کو کیونکر جہلم

اجازت دیتے۔

”لیکن جہلم چھوڑنے کی ضرورت کیا پیش آئی ناہید؟“

”وہ جی..... بات یہ ہے کہ جواد کے دسویں کے امتحان ہیں۔ بلال بھی ایک سال بعد دسویں کو

گا..... نبیلہ آپ جانتی ہیں تھوڑی سی ایب نارٹ ہے۔ اس کی ساس دیور اور نبیلہ کا شوہر افضل خاں ہیں۔“

36۔ جی میں ہیں۔ نہ نبیلہ گھر داری کر سکتی ہے نہ بے بی بی..... پھر بتائیے آپا جی کس کے پاس 36۔ جی کو

جائیں..... سجاد اور عمر تو خیر..... اپنے فیصلے کر سکتے ہیں لیکن جیونی رمضان اور یہ باقی سب ان سب کی قیادت

انہائے؟“

بچے ٹرائی سائیکل پر خوش گلی میں آ جا رہے تھے۔

”قدسیہ آ جا جواب دیں ناں..... آپ 36۔ جی آ جائیں گی.....“

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ناہید لیکن کیا خاں صاحب مان جائیں گے؟“

”بس ٹھیک ہے آپ مان گئیں تو وہ آپا جی مان جائیں گے۔ اب میں خوشی سے جہلم جا سکتی ہوں۔“

اس نے جھینپتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

میں نے بھی گرم جوشی سے ہاتھ دبا دیا۔

”تم فکر نہ کرو ناہید..... آپا جی کو مزے سے جانے دو..... وہ برسوں بن باس سبہ چکی ہیں۔“

اس رات خاں صاحب یو ایس آئی ایس سے لوٹے تو تھکے ہوئے تھے۔ مارلاک اور انہوں نے

دی او اے کے پروگرام کا زانچہ بنایا تھا۔ خواجہ سلیم بیچوں کی طرح آنکھیں کھولے ساتھ ساتھ تھے۔

کھانے کے بعد ہم دونوں صحن سے ملحق برآمدے میں چارپائی پر سونے کے عادی تھے۔ بچے اندر والے کمرے  
 کو تھوکتے تھے۔ رات گئے میں نے خاں صاحب کا کندھا ہلا کر کہا۔

خاں صاحب آپاجی لیبیا جا رہی ہیں۔“

”کون سی آپاجی؟“

”آپا فرخندہ۔“

”اچھا تو جائیں۔ سو جاؤ اب۔“

”تین؟“

”تین کیا سو جاؤ؟“

”ووہم اگر..... یعنی اگر ہم 36۔ جی شفٹ کر جائیں تو پھر آپا تسی سے جا سکتی ہیں۔ ورنہ.....“

”بھائی سو جاؤ آخر صبح بھی تو ہوگی ناں۔ تب یہ رندی رونا کر لینا۔“

”دیکھیں ناں خاں صاحب! جو اڈے دسویں کا امتحان دینا ہے۔ بلال..... بھی پڑھ رہا ہے..... نبیلہ اس کی بے

”خاں اشرف..... اور پھر ان کے نمک خوار حیوانی رمضان..... ان کو..... یہ سب کیا کریں گے۔“

”قد سید..... ہمارے اپنے بہت مسائل ہیں۔ میں کسی اور کے پھڑے میں کیسے؟ نگ پھنسا سکتا ہوں۔ قد سید

”معرض ہے۔ تم ہمیشہ بغیر سوچے کچھ Commitment کر لیتی ہو..... کیا تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ تفکر بھی ایک

”ثابت سوچ کا آدمی جب کوئی عمل کرتا ہے تو پھر اس کے فیصلے سے نہ کسی کو نقصان پہنچتا ہے نہ اس کا اپنا حرج

میں نے لجاجت سے سر جھکا لیا۔

مجھ میں ایک کمال کی کم عقلی موجود ہے جو ثابت کرتی ہے کہ میں ’رج‘ کے ناقص العقل ہوں۔ مجھ میں ہر کام کو

”اس قدر شوق و ولولہ اور Motivation بھڑک اٹھتی ہے کہ میں کبھی نہیں سوچتی کہ کام میرے بس کا نہیں۔ اسی

”کے تحت جب میری شادی ہوئی، میں باورچی خانے میں گھس گئی۔ مجھے روٹی پکانا نہیں آتی تھی، لیکن نہ میں نے سیکھنے

”بغیر سوئمنگ سیکھے پانی میں کود جانے والی تھی۔

میں کھکھو ڈیڈی کی خصوصی طور پر شکر گزار تھی۔ انہوں نے والدین کی مرضی کے خلاف میرا اور خاں صاحب کا

”وہ کھانے پینے کے شوقین تھے۔ مجھے کہنے لگے۔

”کاکی امیرے لیے روٹی پکا..... سالن میرے ڈبے میں ہے۔“

میں باورچی خانے میں گئی۔ حسن اتفاق سے گندھا ہوا آنا موجود تھا۔ میں نے بے ڈھنگی سی روٹی نیلی۔ قریب

”نہے کا بڑا ڈبہ پڑا تھا۔ اس کو روٹی پر گھمایا اور تھوڑا سا تھپ تھپ کر کے روٹی تو بے پر ڈال دی۔ حسن اتفاق سے کسی

”نے مدد کی۔ روٹی پھول کر کھپا ہو گئی۔ میں روٹی لے کر ساتھ والے کمرے میں بھاگی۔

”ڈیڈی جی خوب خوش ہوئے.....“ دیکھا شوق تو کہتا ہے یہ کھانا پکانا نہیں جانتی۔ میری منوسب کچھ جانتی ہے۔“

خاں صاحب نے لمحہ بھر کو میری طرف دیکھا۔ حیرانی سے روٹی پر نظر ڈالی اور چپ ہو گئے۔ وہ میرے Image سے خوش ہوا کرتے تھے۔

صدیقہ بیگم کا بیاہ جب جاوید طارق خاں سے ہوا تو اس کی عمر بمشکل سولہ برس کی تھی۔ وہ بھی لاڈلی بیٹی تھی۔ کام کاج سے فارغ رہی تھی لیکن ڈالڈاروٹی پریکٹس میں وہ بھی جلد روٹی پکانا سیکھ گئی۔ (میں نے سری پائے پکانے کیسے یہ بھی کبھی کھکھوڑیڈی کے حوالے سے بتاؤں گی۔)

جب میں نے بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری اٹھائی تو مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حروف تہجی کتنے ہیں۔ ڈی میں کون سے حرف Vowels کہلاتے ہیں، لیکن کمر بستہ ہو کر بچوں کو پڑھاتی گئی اور بخدا اچھے خاصے ماردی۔ انہیں پڑھائی سے اس قدر نفرت ہوئی کہ وہ کلاس میں چھوڑ کر بیچ پر باہر بیٹھنے لگے۔ کالج جاتے لیکن باہر اوروں کو کرا جاتے۔ اپنے بیٹوں کے تعلیمی مشاغل کی داستان میں پھر کبھی آپ کو سناؤں گی..... اب صرف یہ بتانا مقصود ہے نے بغیر سوچے سمجھے 36۔ جی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ خاں صاحب نے ہمیشہ کی طرح میرے وعدے کا پاس کیا۔ مکانی کے نیچے کمر بستہ ہو گئے۔

خاں صاحب اس تہذیبی کے لیے ہرگز ہرگز نہ ذہنی طور پر نہ جسمانی اعتبار ہی سے تیار تھے۔ اس وقت آئی ایس میں چودھری تھے۔ انہیں سمن آباد ڈوگنی گراؤنڈ اور 479۔ این سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔

جس روز ہم سب سمن آباد چھوڑ کر ماڈل ٹاؤن گئے۔ مجھے نئی ذمہ داریوں کے متعلق کچھ علم نہیں تھا لیکن صاحب فاروقی کی دکان درزی جمیل کا درزی خانہ جہاں سے بچوں کے یونیفارم بنواتے تھے، سبزی والے ماٹھے، سبزیوں سے لدے ٹوکرنے بچوں کا سکول مین سڑک سے ملحق جوتوں کی دکان اور وہ راستہ جس سے وہ کئی برس پہلے موٹر سائیکل سے آتے جاتے تھے اور پھر یہی راستہ جہاں انہوں نے قدرے خوشحال ہونے کے بعد موٹر سائیکل Lambretta خریدی تھی..... یہ راستے دکانیں ہم شکل گھر ساری ہستی کو دل میں بسائے 36۔ ماضی سے سہکدوش ہو کر نیا گورا صفحہ اٹھانے کے عادی نہ تھے۔ ہر نئی تحریر کے ساتھ پرانی لکھت ساتھ چمٹی چلی آتی۔ صحبتیں پیچھے نہ رہ سکیں، اذیت دینے کے لیے ساتھ آگئیں۔

آپاجی کے پاس جانے سے پہلے غیرت مند پٹھان بچے نے اپنی بڑی بہن سے یہ طے کر لیا کہ وہ انہیں نہیں دوسروں پر یہ کراہ دیتے رہیں گے۔ اسی قدر ناہانہ وہ سمن آباد کے گھر کے لیے دیتے تھے۔

سامان ریزہوں پر روانہ ہو گیا۔ خاں صاحب کی لائبریری کا سب سے زیادہ فکر تھا۔ تین ریزہ تھے اور سالوں سے لدے تھے۔ محمد علی جو ”داستان گو“ سے ہمارے ساتھ تھا، ان ریزہوں کی نگرانی کے لیے سائیکل پر نہیں کس موٹر پر اور کیسے ایک ریزہ والا جس پر رسالے لدے تھے، محمد علی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور سیدھا محمد علی کے سامنے رڈی والوں کی جانے کس دکان پر سارے رسالے بیچ باج کر چپت ہو گیا۔

سامان کی نگرانی خاں صاحب اور ریاض محمود کر رہے تھے۔ ریاض محمود تب ریڈیو سٹیشن میں سکرپٹ ڈیپو میں تھے اور خاں صاحب کے ان چند عقیدت مندوں میں سے تھے جن کا رویہ ہمیشہ ایک سارہا۔ وہ خاں صاحب کا

تھے، لیکن پھر بن باس لینے والے جوگی کا دل لگانے شام کو راج گڑھ روڈ سے روز آتے۔ ایسی وفاداری بشرط  
تعمیراتی میں دیکھنے کو ملتی ہے، لیکن خاں صاحب میں کوئی عجیب سی گیدڑ سنکھی تھی۔ جو ایک بار ان کے دام محبت  
کے نیچے پھروہ کبھی رہائی چاہتا نہ اسے رہائی ہی ملتی۔

خاں صاحب من آباد چھوڑنا نہ چاہتے تھے انہیں اس کی سڑکوں سے 'مین بازار سے' باندرا درمی 'سکول کی گراؤنڈ'  
کے سب سے ایک خاص قسم کی انسیت پیدا ہو چکی تھی۔ اسی گھر میں پہلی بار انہیں Norelco کا شپ ریکارڈ ملا تھا۔  
اس کی یاد ان کے پاس ذاتی ریڈیو آ گیا تھا۔ اس ریڈیو کی بھی ایک چھوٹی سے کہنی تھی۔ خاں صاحب کو ریڈیو کی  
تعمیرات تھی۔ اپنے پروگرام کو مینٹر کرنے کے لیے وہ کسی کے گھر جا کر اسے سننا گوارا نہ کرتے۔ کسی دکان پر باقاعدگی  
لے جانے کی فرمائش نہ کر سکتے تھے۔ اپنا ریڈیو دوہ مزنگ روڈ سے چلتے وقت خاندان آفتاب کو دے آئے تھے اور اسے  
تعمیرات کیلئے بھی کبھی انہیں آ نہیں سکتا تھا۔

پھر رب نے ان کی سن لی۔

ایک روز بھائی ابوالحسن آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ریڈیو تھا۔ جس پر میڈیم ویو بھی اس  
کا تھا گویا کوئی پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ بھائی ابوالحسن پولیس میں تھے اور خاں صاحب کے پٹھے  
کے ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔ یہاں من آباد میں مجھے اس قدر معلوم تھا کہ ایک صاحب جو کھرج  
کے ہیں اور ہر پولیس کی طرح دیر تک اپنی بات سمجھانے میں لگا دیتے ہیں، آیا کرتے ہیں۔ کئی بار خاں صاحب  
کے سے آگے نہ بڑھتے۔ کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے اور پھر اپنی جیب میں روانہ ہو جاتے۔ بعد  
کے میں ہو گئے۔ ان کی بیگم سعیدہ جی سے بعد میں میری دوستی ہو گئی.... لیکن ابھی سب کچھ پردہ غیب میں  
سوئی جی پولیس بھی نہ تھے۔

خاں صاحب ابھی تو اس ماحول کا حصہ تھے جسے بھول جانا خاں صاحب کے بس کی بات نہ تھی۔ 36۔ جی پہنچ کر  
ان کا باہر برآمدے میں چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ ان کی نگاہیں سانس والی نیم دائرہ سڑک پر ہوتیں۔ وہ یہاں سے  
تعمیراتی سڑکوں پر جا نکلتے، کبھی دم کے اس راستے پر جو دایا کٹونی سے یونیورسٹی کی طرف جاتا تھا۔ کبھی 1۔ مزنگ روڈ  
کے کھنڈ والی سڑک پر سائیکل لے کر چلے جاتے.... کبھی مری کی پہاڑیوں پر کھو جاتے۔ ان کے لیے ہر جگہ ہر  
وقت بن باس بن جاتے جس میں یادوں کے علاوہ کچھ زندہ نہیں ہوتا۔

ہاں ایک تشفی ریاض محمود کی شکل میں موجود تھی۔

وہ شام کے وقت آ جاتا۔ تب اس کی ساعت ٹھیک تھی اور وہ بآسانی خاں صاحب کے ساتھ وقت گزار سکتا تھا۔  
تعمیرات... اپنی دن بھر کی مصروفیات بیان کرتا۔ دونوں شعبہ ہاڑوں کی طرح.... بازی گروں کی مانند کبھی ماضی  
کے مستقبل میں چکا چوندا پیدا کرتے رہتے۔

کبھی کبھی خاں صاحب کی گہری چپ سے پریشان ہو کر ریاض سوال کرتا۔

خاں صاحب! کیا بات ہے آپ خوش نہیں لگتے۔“



”یہ قدسیہ کا فیصلہ ہے شاید وہ خوش ہو؟“

ریاض ویسے ہی ایک کان کا آدمی ہے۔ ایک کان سے کم سننے کی وجہ سے وہ پوری انفرمیشن کنی بار مس کر رہا ہے۔ اسی لیے اس میں بچوں جیسی معصومیت ہمیشہ غالب رہتی ہے۔

”وہ..... وہ آ پاجی تو ہمیشہ خوش رہتی ہیں جی ان کی کیا بات ہے۔“

خاں صاحب لمحہ بھر کو بولے سے کھنگارے۔ پھر بولے: ”خوش نصیب ہے نہ اس کو کوئی سوال ستاتا ہے۔ احساس جرم کی کبھی شکار ہوتی ہے..... کسی کو قتل کرنے کے بعد بھی وہ راضی خوش رہ سکتی ہے۔“



## 36- جی، ماڈل ٹاؤن

ماڈل ٹاؤن میں آمد خاں صاحب کے نیے بڑا بوجھل فیصلہ تھا۔ شامیں ان کے لیے خاص طور پر لمبی اور غم انگیز جی سکھوں کا چھوڑا ہوا چھ کیناں پر پھیلا ہوا قدرے بوسیدہ صورت بنگلہ تھا۔ اس گھر کے دو بچا تک تھے۔ ایک بگ سکول کے رُخ پر تھا اور دوسرا ماڈل ٹاؤن کی لائبریری کی جانب۔ اس گھر کے سامنے ماڈل ٹاؤن کی دوویہ

رہا۔ مگر اس گھر کے برآمدے میں کھڑے ہو کر دیکھتے تو سامنے ایک Oval شیپ کی Unkept لان تھی، جس میں کھڑے ہو کر تالا ڈالنے کا رواج نہ تھا۔ دائیں جانب سے داخل ہو کر نیم دائرے سے چل کر پورچ آتی۔ اس کے سامنے ایک عہد کی یاد دلاتے۔

پھر تین سیزھیاں چڑھ کر برآمدہ تھا، جس میں پنگ پانگ کا میز دھرا تھا۔ جواد، بلال اور میرے بچے یہاں پنگ پانگ کھیلتے۔ ایلچی کے درخت پر چڑھنا بھی ان کا ایک محبوب مشغہ تھا۔ برآمدے کے دونوں پہلوؤں پر ایک کمرہ تھا۔ ایک میں جواد رہتا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر ایوب کا کمرہ تھا، جو ابوتی کی تحویل میں چلا گیا لیکن خاں صاحب نے اسے اپنے سکول نہ کیا۔ اسی کمرے سے ملحق ایک غسل خانہ تھا، جس میں سفید نمکین لگی تھیں۔

اس کے ساتھ ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں خاں صاحب، بچے اور میں رہتے تھے۔ لانا آ جاتیں تو وہ بھی کمرہ میں آ جاتیں۔ اس کمرے سے جڑی ہوئی چھوٹی سی پینٹری اور باورچی خانہ تھا۔ ایل شیپ برآمدے سے گھر کے اندر کے لیے ایک لمبی گیلری تھی جس میں دائیں ہاتھ پر بیڈروم سے مشابہ بڑا سا ڈرائنگ روم اور اس کے ساتھ جڑا ہوا کمرہ تھا جس میں بلال رہتا تھا۔

جواد اور بلال کے کمروں میں ایک سانچا دروازہ تھا۔ گیلری ایک طرف تو بچھلے برآمدے میں کھلتی تھی۔ ایک شاخ ڈرائنگ روم کے ساتھ ساتھ ایک غسل خانے کی طرف جاتی تھی، جس میں سفید ٹائلز لگی تھیں اور ٹائٹل Squating فلش لگا تھا۔ اس گیلری سے اوپر نیم چھتی کی سیزھیاں کھلتی تھیں۔

اس نیم چھتی میں خاں صاحب کی ساری کتابیں، رسالے، کاغذیں تہہ در تہہ ڈھیر کر دی گئیں اور تعجب کی یہ بات ہے کہ ان کو کبھی الماریوں میں لگانے کا خاں صاحب کو خیال نہ آیا۔ کتابیں عجب کمپرسی کی حالت میں پڑی رہتیں۔ طرح طرح ہر انسان کا ماضی اُسے پکارتا رہتا ہے، ایسے ہی وہ خاں صاحب کی منتظر رہتیں۔

عین ڈرائنگ روم کی پشت پر گیلری کے ساتھ ساتھ دو کمرے تھے۔ ایک تو ہم نے ڈائنگ روم بنالیا اور ساتھ دوسرا کمرہ جو آفرخندہ کا تھا، یہ خاں صاحب کی تحویل میں چلا گیا۔ باورچی خانے کا دروازہ، کھانے کے کمرے کا۔ اور آج کے کمرے کا دروازہ سمیت گیلری کے دروازے کے ایک بڑے کشادہ برآمدے میں کھلتے تھے، جس میں سفید پتھروں کی شطرنج بچھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کھلا سخن تھا جس میں جو ادسا کیل پر بچوں کو "ہونے" دیا کرتا تھا۔ برآمدے کے بائیں طرف سخن کے پار ایک کھلا باورچی خانہ اور گودام تھا۔ ہم عموماً اسی باورچی خانے میں کھانے کے لیے میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ سخن میں باورچی خانے کے باہر ایک بڑا ساناہلی کا درخت تھا جہاں بیوٹی کا درخت تلے چولہا جلتا۔ سخن کے پچھوڑے چاروں طرف اونچی دیوار تھی اور سخن باورچی خانے سے دوسری سمت غسل خانہ اور بیوٹی، رمضان کی تحویل میں تھا۔

سخن میں ساناہلی کے علاوہ دو درخت بیر کی بھی تھے، جن کو نہ جانے کب پھل لگتا۔ کب بیر جھڑتے۔ کون کون کون توڑتا۔ اس غسل خانے کے علاوہ ایک پرانی وضع کا چھوٹا سا بغیر چھت کے نہانے کا غسل خانہ تھا، جس کے ساتھ باہر کی جانب ایک دروازہ کھلتا تھا۔ اس دروازے سے نکل کر کوٹھی کی دیوار سے ملتی تین سروٹ کو اڑتے تھے، جن کے سروٹے دو بیڑا موں کے تھے۔ یہ قلمی آم نہیں تھے۔ ایک اچاری آموں کے کام آتا تھا، دوسرا کھنا بیٹھا سب کھاتے۔ سستے کھاتے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ یہ سائڈ بچن گارڈن سے مشابہہ تھی۔

گھر کے عازم رمضان، مالی اور بیوٹی ماسی اس گھر کے رتنا دھرت ایک قسم کے مالک ہی تھے۔ سروٹ کوٹھی کی طرف ایک ہتھی نکا تھا، جس سے رمضان بھائی اس بچن گارڈن کو پانی دیتے۔ اشیر خاں ابھی بھائیوں کے ساتھ بیوٹی کی پبلک سکول نہیں جاتے تھے۔ وہ بیوٹی ماسی کے بیٹے ظیل کے ساتھ یہاں ہی کھیلتے رہتے اور ہماری بے خبری کا یہ حال تھا کہ ہم نے کبھی نہ اشیر کی نگرانی کی نہ اُسے کبھی نوکا ہی کہ وہ باہر کو اڑوں کی طرف نہ کھیلتے۔ کبھی یہ وہم ہی ہوا کہ وہ کھانا سیکھ رہا ہے۔

میں عجب غفلت کی ماری ہوئی ماں تھی۔ مجھ پر ہندو سوج کا گہرا اثر تھا۔ ہندو مسلمانوں کو پیچھا اور شوردر سمجھتے تھے میرا اپنا تجربہ ہے ہندوؤں کے ہمسائے میں رہ کر میں نے اُن کی برہمن جاتی سے کچھ تکبر بھی حاصل کر لیا تھا۔ میں ہندوؤں کی طرح اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتی اور اپنا کہا منوانے کے چکر میں رہتی۔ وقت Disillusionment کا تھا اور اُس وقت اسلامی راستہ تھا لیکن میں اسلامی اخوت کا سبق سیکھی ہی نہ تھی۔

میری روح ہندو استری کی تھی۔ میں پتی دھرم اور پتی بھگتی کے مسلک پر کار بند تھی۔ میری ڈاکٹری میں بھی اسلامی شادی کا کوئی تصور نہ تھا۔ تعدد ازدواج، طلاق، خلع، پسند کی شادی، برابری کا دعویٰ، منفرد حیثیت وغیرہ میرے نزدیک گالی تھی۔ میں گو آواگون کی تشریح کو بھی بخوبی نہ سمجھتی تھی لیکن میرے نزدیک ایک ہی شوہر سے جنم مرن کا ساتھ تھا۔

کے اس پہلو پر یقین رکھتے ہوئے میں کئی Monogamist تھی۔ ممتاز مفتی نے سب سے پہلے میری اس خوبی کو تسلیم کیا۔

جب تک خاں صاحب گھر رہتے، میں سائے کی طرح اُن کے پیچھے لگی رہتی۔ مجھے ہر لحظہ اُن سے بچھڑ جانے کا خوف تھا۔ جو نبی وہ مرکزی اردو بورڈ چلے جاتے میں لکھنے لکھانے میں مشغول ہو جاتی۔ بچے سکول سے لوٹتے، باورچی خانے میں بیٹھ کر ہم کھانا کھاتے۔ پھر ہم چاروں سو جاتے۔ سر پر سے بلانا لنے کے انداز میں میں اُنہیں کھانے کی میز کے سامنے لے کر پڑھاتی۔ نہ مجھے اُن کی پڑھائی کا خاطر خواہ علم تھا نہ میں سائنس کے متعلق کچھ جانتی تھی۔ مجھے ان کی تربیت کی کوئی سمجھ بوجھ نہ تھی۔

1965ء کی جنگ میں جب بھارت کے طیارے گھر کے اوپر سے گزرتے تو میں بچوں کے لیے کبھی خوفزدہ نہ ہوتی۔ خاں صاحب نے اُن دنوں بچوں کو ساتھ سلانا شروع کر دیا اور جب نانا میری والدہ خوفزدہ ملتان سے آئیں اور ملتان زمینوں پر لے جانے چاہا تو خاں صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔

میرا حال اپنے لوزرڈل کلاس کے جہلا جیسا تھا جو ہوائی جہازوں کی Staffing دیکھنے چھتوں پر چڑھ کر نظارہ دیتے تھے۔ جو آج بھی بچوں کی گردنیں کٹواتے ہیں، لیکن دھاتی تاریں پیٹنگ بازی میں استعمال کرنے سے نہیں بچتے۔ اسی جہالت کے باعث میں نے اپنے بچوں میں خود اعتمادی کا وہ بیج نہ بویا، جو مثبت محنت کا ثمر ہوتا ہے۔

میں نے انہیں مسابقت، آگے بڑھنے اور اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوئی تربیت نہ دی۔ میں خود غافل، سست اور جوڑا اپنے شوہر کے بعد اپنی ذات میں مشغول رہنے والی عورت تھی۔ اسی لیے جب میرے بچوں پر ذمہ داریاں پڑیں تو وہ کھلا گئے اور گہرے وزن کا شکار ہو گئے۔

میں جب نئے گھر 36۔ جی میں پہنچی تو یہاں کے باسی میرے لیے مکمل طور پر اجنبی تھے۔ میں نے آپ کو بورڈنگ کی غرض سے نہیں بلکہ اس نیت سے گھر کا نقشہ بیان کیا ہے کہ مکان کا مکین پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ محلوں میں رہنے والے کو یہ طرح سوچتے ہیں اور جھوپڑیوں کے باسی اپنی سوچ میں کوئی اور زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔

آپ شاید اسے طبقاتی تفریق پر محمول کریں لیکن میرے نزدیک درو دیوار، کھڑکیاں، فرش، پردے، ہر وقت سے عالی چھت، سرکنڈوں کی آساری ہوئی دیواریں کچھ اور قسم کی سوچ پر مائل کرتی ہیں اور جب انسان مختلف موسم، کسی جگہ کسی ماحول میں رہتا چلا جاتا ہے تو اس کا رویہ، سوچ اور عمل میں عادت کا عنصر غالب آ جاتا ہے۔

سمن آباد اشفاق صاحب کی عادت بن چکی تھی۔ سمن آباد سے بچھڑنے کے بعد دیر تک وہ راتوں کو جاگتے رہتے۔ وہ اپنے پرانے ماحول سے بچھڑ کر نئے گھر میں adjust نہیں ہو رہے تھے۔

مجھے خیال آ رہا ہے کہ اشفاق صاحب جب اپنے اصلی گھر رخصت ہو گئے تو سب سے زیادہ میری نیندوں پر اثر سمن کی بیماری کے دوران میں راتوں کو جاگنے اور بار بار جاگتے رہنے کی عادی ہو گئی تھی۔ بڑی برداشت والے اشفاق صاحب بھی ہتھیار ڈالتے جا رہے تھے۔ فجر کے قریب جب مریض، چوراہہ نمازی جاگنے کے عادی ہوتے ہیں میری بھی تربیت جاتی۔

بستر پر کروٹیں لیتے میں نے کچھ عرصہ بعد نوٹ کیا کہ نماز سے کچھ عرصہ پہلے مسجد کی طرف سے تہجد گزرتی ہے۔ گزاروں کے ذکر کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگتیں۔ جو نبی فجر سے کچھ پہلے نمازی مسجد کے راستے پر آتے۔ گتے جاتے اور بھونکنے شروع کر دیتے۔ سوئے ہوئے کتے عادت کے اس قدر عادی تھے کہ بھونکنے ان کے شعور کا حصہ بن جاتے۔ دن کی دوسری نمازوں کے وقت مسجد کی طرف سے کبھی کسی کتے کی آواز نہ آتی تھی۔

لیکن جب لا شعور کسی عادت میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس عادت کا چھوٹا محال ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتی تھا کہ لا شعور کیا انسانوں کی طرح کام کرتا ہے، لیکن ان کے بھونکنے کی عادت سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ گھر کے سوئے کا اچانک جاگ کر بھونکنے شعوری سطح پر تو ممکن نہیں۔

فجر کی اذان سے پہلے ایک دو ہوائی جہاز جو غالباً مغرب کی طرف عازم سفر ہوتے تھے، ہوا میں گونج چھننے لگتی۔ ان کی آواز شیڈول کے تابع تھی لیکن مجھے لگتا جیسے یہ بے جان جہاز بھی گویا کسی عادت کے تحت ہیں اسی وقت اڑتے پھرتے ہیں۔ ہوائی جہاز، کتے، نمازی، اشفاق صاحب اور میں کسی ایک شیڈول کے عادی ہو چکے تھے اور عادت ہمیں ایک ہی سمت میں گھسیٹنے پھرتی تھی۔ اشفاق صاحب من آباد کے عادی ہو چکے تھے اور اس نئی جگہ میں وہ کفر ٹیبل نہیں لگاتے۔ اشفاق صاحب کی بڑی بہن آپا فرخندہ میرے لیے ہانگل نامانوس تھیں کیونکہ کبھی ان کے ساتھ رہنے کا ارادہ نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر ایوب احمد خاں ہمارے آنے پر موجود نہ تھے۔ وہ لیہیا جا چکے تھے۔ ان کے متعلق اتنی بات و ثوق نہ ہوئی کہ وہ بڑے آدمی تھے۔ وہ نہ صرف ایک بڑے ڈاکٹر تھے بلکہ کردار اور سوچ کے اعتبار سے بھی بڑے آدمی کی صفات فائز تھے۔

مفتی جیسے ایسے معاملوں میں بڑی دور رس لگا د رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے بڑے لوگوں کو جس دور بین نظروں سے دیکھ کر خاکے لکھے تو ان خاکوں میں گہرائی بھی تھی اور گیرائی بھی۔ ایک روز داستان سرائے میں ایک اور ریکارڈنگ روم میں بیٹھے اپنی کتاب کی کتابت دیکھ رہے تھے تو اشیران کے پاس چلا گیا۔ مفتی جی اور اشیران میں کبھی کبھی وہ ان کے پاندان کو چھیڑتا۔ کبھی قلم دیکھنے لگتا۔ کبھی تو ام کی بوتل کھول کر سو گھننے لگتا۔ مفتی جی ہولے سے ہوں کہتے لیکن وہ بچوں کو جھڑکنایا سختی سے منع کرنا سناہ سمجھتے تھے۔

”کیا لکھ رہے ہیں مفتی جی؟“ چھوٹے سے لڑکے نے سوال کیا۔

”یہ کتاب لکھ رہا ہوں۔ سب کا کام ہے سب اگانا۔ میں اور کوئی کام نہیں کرتا، بس کتابیں لکھتا ہوں۔“

”یہ کام تو اب بھی کرتے ہیں۔ آپ کوئی اور کام سیکھ لیجیے۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً کرکٹ۔ ہوائی جہاز چلانا۔“

اشیر کی خواہش تھی کہ وہ کرکٹ بنے اور ہوائی جہاز اڑائے۔ وہ اپنی خواہش مفتی جی کو بھی تفویض کرنا چاہتا تھا۔

”ناں یار۔ یہ نوجوانوں کے کام ہیں۔ میں اس عمر میں کچھ سیکھ نہیں سکتا۔ بس جو آتا ہے وہی کرتا چلا جاتا۔“

”بہت ہے۔“

کبھی کتاب ہے مفتی جی؟“

یار خا کے ہیں۔ مثلاً تمہارے باپ کا۔ شہاب صاحب کا۔ تمہاری ماں کا خاکہ۔“

اچھا، یہ مشکل کام نہیں ہے مفتی جی؟ کیا نام رکھا ہے کتاب کا؟“

یار ابھی نام سوچا نہیں۔ نام رکھنا ایک اور مشکل کام ہے۔“

یہ آسان کام ہے۔ آپ اس کتاب کا نام ”اوکھے لوگ“ رکھ دیں۔“

مفتی جی اٹھ کر تالیاں بجانے لگے۔

”پالیا..... پالیا۔ اوئے یار تو نے تو میری بڑی مشکل آسان کر دی۔ کیا نام ہے ”اوکھے لوگ“...“

ڈاکٹر ایوب احمد خاں ”اوکھے آدمی“ تھے۔ اوکھے آدمی کی طرح ان کی توجہ اپنی خوبیوں، خرابیوں پر نہ تھی۔ وہ

کبھی سوچتے کر گزرتے۔ انہوں نے کبھی سماج پر غور کرنے کی زحمت نہ کی۔ انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ ان کی طبیعت

کے لیے مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔ جب انہوں نے چوباندن چنے گئے۔ وہاں ایف آر سی کرنے کے بجائے اسپین

کے لیے ضروری میں شامل ہو گئے۔ واپس آئے 36۔ جی میں منتقل ہو گئے۔ یہاں آٹھ بچوں کے مستقبل سے بے خبر لیبیا

سے پھر ایک وقت آیا کہ کچھ بچے اٹھائے اور انگلستان میں ٹیم ور تھ چلے گئے۔

ٹیم ور تھ کے ہسپتال میں کام کیا۔ بڑی خوبصورت خیال آرا کتاب لکھی۔ اسرائیل کے جنگل سے مسلمانوں کو

کے لیے بھائی ایوب اسپین کی جنگ میں شریک ہوئے۔ جا بجا خط بھیجے لیکن یہ فلسطین کے مسلمانوں اور اسرائیل کا

تعلق تک لائیکل نظر آتا ہے۔ ہر اوکھے آدمی کے اندر ایک بے قرار سیلانی روح ضرور ہوتی ہے۔ وہ اطمینان قلب اور

سکون میں کئی راستوں کی خاک چھانتا ہے۔ بھائی ایوب نے بھی زندگی کے اصل مطالب کی تلاش میں عمر بسر کی۔

یہ وہ ضرور پہنچ گئے کہ مسلمانوں کی ہستی کی ایک وجہ اسرائیل کی تنگ نظری اور اسلام دشمنی ہے۔ وہ کسی طور پر بھی

میں کا دوست نہیں بن سکتا۔

بھائی ایوب کو علم نہ تھا کہ چھوٹے شہر میں ان کی سوچ کے آدمی کی کھپت نہ تھی۔ جدیدی انہوں نے ایک اور فیصلہ

اپنی Qualifications کو بہتر کرنے کے لیے لندن سدھارے۔ ڈاکٹر ایوب واقعی ایک بڑے آدمی تھے۔

Lone Wolf کی طرح راہ حیات میں کچھ اپنے وجدان، کچھ اپنے ن فکر کے سہارے چل رہے تھے۔ منزل کا تعین

میں نے نہ کیا۔ ان کی نیت اس قدر شفاف تھی کہ غلط فیصلے کے باوجود انہیں کبھی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

انگلستان میں بیرونی حالات نے کروٹ بدلی اور انگلستان دوسری جنگ عظیم کی لپیٹ میں آ گیا۔ بھائی ایوب

سیت پھڑکی اور وہ اسپین چلے گئے، جہاں وہ Fighting Force کا حصہ بن گئے۔ اس طرح چھ سال دونوں

کے نے بن باس سہا۔ آپا فرخندہ جو جی جان سے ایوب بھائی کی عاشق تھیں، مانتی بے آب کی طرح تقریباً چھ سال

تحتی کہ جب قیام پاکستان کے وقت بابا جی محمد خاں کستور سے لاہور پہنچے تو آپا فرخندہ ساتھ تھیں۔ اسپین میں

بے تکی کی بنا پر ایوب بھائی نے ایک کتاب یہودی لابی کے خلاف لکھی جو جرمنی کے ہولوکاسٹ کی گویا پیش گوئی تھی۔

آج جو کچھ فلسطین میں اسرائیل کے ہاتھوں West Bank میں ہو رہا ہے، اس کی واضح پیش بندی کے طور پر چشمہ میں یہاں کتاب کے اقتباسات طوالت کے طور پر پیش نہیں کر سکتی۔

36۔ جی پہنچ کر مجھے یہاں کی کئی پہیلیاں سلجھانا پڑیں۔

میں نے ایک دو مرتبہ آ پافر خندہ کے سب سے بڑے بیٹے سجاد کے متعلق پوچھا تو پتہ نہ مل سکا کہ وہ کہاں اس کے اوقات کیا ہیں۔ بعد ازاں تابش سے پتہ چلا کہ سجاد تو کراچی میں رہتے ہیں اور کسی کے ساتھ مل کر کام نہیں ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں میں سجاد سب سے خوبصورت ہے۔ چھ فٹ سے کچھ تجاوز کرتا ہوا قد، چھریا بدن، قہر میں نین نقش۔ صاحب لوگوں کی طرح گورا چہنہ۔ کچھ بھائی ایوب کی رعنائی اور دلکشی، کچھ آ پافر خندہ کا کھویا کھویا سا چہرہ و جاہت اور خوبصورتی پر طرہ یہ کہ اپنی خوبصورتی پر بظاہر کوئی گھمنہ نہیں۔

وہاں رہتے ہوئے کچھ عرصہ گزر جانے پر مجھے تابش سے پتہ چلا کہ سجاد نے پڑھائی کو خیر باد کہہ کر کراچی کے متحول گھرانے کی دراز قد صوفیہ سے شادی کر لی ہے اور وہاں اپنے سسرال میں رہتا ہے۔ اوکھے ڈاکٹر ایوب کا بچہ بھی اوکھا نکلا اور روایات شکنی میں اُس نے پہل کی کیونکہ صوفیہ پٹھان بیگی نہ تھی۔

بہت سالوں بعد جب میں 36۔ جی میں نہیں تھی تو سجاد اپنی بیوی لے کر 36۔ جی میں وارد ہوا۔ آ پافر خندہ صوفیہ بظاہر بہت Cordial لیکن اندر سس بہو کا رشتہ پالے ہوئے نہیں لیکن آفرین دونوں پر کہ کبھی کسی کو اندھن نہ لگندی۔

جب آ پافر انگلستان چلی گئیں تو سجاد اور صوفیہ ان کے ساتھ گئے۔ سجاد اور صوفیہ کو اللہ نے تین بچے دیے۔ ایمان احمد خاں، الطاف احمد خاں اور بیٹی عائشہ۔ میری ان بچوں سے کم کم ملاقات رہی کیونکہ جب ڈاکٹر ایوب کراچی میں ٹیم ورتھ میں مقیم تھے تو سجاد اور صوفیہ لندن میں تھے اور ہم یہاں 36۔ جی میں۔ سجاد بیکار تھا اور لندن کی ویٹنیرینری میں وظیفہ خوار تھا۔ صوفیہ اور سجاد نے ہر چند ساتھ رہنے کی کوشش کی لیکن اوکھے سجاد میں حقیقت سے زیادہ خواب ہے۔ اسے ایوب بھائی کی محنت تو نہ مل پائی، ہاں وہ ایسے ہوائی قلعے بنانے میں ماہر ہو گیا جن کی مادی تعبیر مشکل تھی۔ شادی میں طلاق کی وجوہات کو انگلی دھر کر بیان کرنا اور اعداد و شمار سے جانچنا ذرا مندوش سا کام ہے۔ صوفیہ اور سجاد علیحدہ ہو گئے۔ جب بچے ہوں تو ملنا ملنا تو تقریبات پر ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح یہ دونوں بھی بچوں کی خاطر پراکٹھے ہوئے لیکن رجوع مستقل نہ ہو سکا۔

اب کچھ سال پرے سجاد نے ایک ہسپانوی خاتون ایما مارتینی سے بیاہ کر لیا ہے۔ بقول سجاد وہاں تین بچے خاندانی نظام کے پیروکار ہیں اور ان کی روایات مسلمانوں سے ملتی ہیں۔ سجاد کی ایک بیٹی اور لایا خاند ہے جو پاکستان میں ہی جواد کے بچوں سے گھل مل جاتی ہے اور کسی قسم کی غیریت محسوس نہیں کرتی۔ سجاد حسب عادت ابھی تک ہوائی تھیں ہے اور ان کے ٹوٹے پر آرام سے آگے نکل جاتا ہے۔

ناہید کا آخری بیٹا میمون اور اس کی بہو آکا میرے پیارے ملنے والے بچے ہیں۔ ناہید نے میمون کی بیٹی کے کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے لیکن بالآخر اب میمون صحت مند، خوبصورت اور خوب کام کا انسان ہے، لیکن ناہید ابھی

تو یہ ہے۔ ان لوگوں کا 36۔ جی سے اس وقت تعلق نہ تھا جب خاں صاحب اور میں نقل مکانی کر کے یہاں

در اصل ہمیں تو نیلہ کی خاطر ناہید گھسیٹ لائی تھی۔ نیلہ کا اصل نام تابندہ مجاہدہ تھا لیکن کوئی اس اصلی نام سے  
 نہیں ہے۔ وہ بنیادی طور پر تھوڑی تھوڑی ماؤف دماغ کا شکار تھی لیکن بڑی ہنس مکھ، محبت کرنے والی روح ہے۔ اُسے  
 سنی سے بڑا شفیق شوہر محمد افضل خاں ملا، جو بھائی ایوب کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور جو وقت بچ جاتا وہ وقت  
 مانے رائے کہہ کر اس کی دیکھ رکھ میں مصروف رہتا۔

جب ہم 36۔ جی میں شفٹ ہوئے یہاں ناہید اور سجاد نہ تھے۔ 36۔ جی میں اس وقت نیلہ کی ساس، اس کا  
 بھائی اور افضل خاں بھی رہتے تھے جن کی دیکھ رکھ میری ذمہ داری تھی۔ میرے ہوتے ہوئے تو یہی کنبہ تھا۔ بعد  
 کے گھر اللہ نے پانچ بچے دیئے۔ وجیہہ، عثمان، فریحہ، عمران، سلمان اور رضوان۔ اس کے علاوہ غازیہ، جو اد، بلال  
 سے 36۔ جی بھرا ہوا تھا۔

آپا فرخندہ کی چوتھی بیٹی غازیہ بڑی جی دار ہے۔ اس کی پہلی شادی گھر والوں نے زبردستی خاں صاحب کی خالہ  
 کے بیٹے انصار سے کر دی لیکن اس دھن کی پکی نے اس بندھن کو قبول نہ کیا اور اسے چھوڑ کر نثار سے شادی کر لی۔ یہ  
 نے پر اُس نے ماریں بھی سمیں، مظالم کا شکار بھی ہوئی لیکن اپنے سچ کو کسی سے چھپایا نہیں اور اس کی بھاری قیمت

نثار کے ساتھ شوگ کے بعد غازیہ لندن شفٹ کر گئی جہاں اس کے تین بچے ہوئے۔ بڑی بیٹی سمیٹ ہے جس  
 نے پہلے شوہر سے خلع لے کر نام بدل لیا ہے اور اب سحر ارمان کہلاتی ہے۔ جنید خاں جس کی رام کہانی یوں ہے کہ  
 نے رائل فیملی کی ایک پرنس سے لندن میں شادی کر لی لیکن تباہ نہ ہو سکا اور اب لندن میں ایک بڑے لارڈ کی سی  
 کرتے ہیں۔ جنید خاں جسے ہم سب جو جی کہتے ہیں۔ ان سے چھوٹے فیضی ہیں جن کا اصلی نام فیصل نثار ہے۔

نثار صاحب کی رام کہانی اب تک یہ ہے کہ وہ اپنی پہلی بیوی کے پاس لوٹ گئے ہیں اور اس طرح غازیہ کئی دکھ  
 چھپائے لاہور آتی جاتی ہے، لیکن منہ سے کبھی ایک لفظ شکایت کا نہیں نکالتی۔

جو اد کی چھوٹی بہن جو نمبر پانچ پر آتی ہے، آ پاجی کی وہ بیٹی ہے جو اس وقت 36۔ جی میں موجود تھی۔

تابش بڑی بھلی سی روح ہے۔ پتہ نہیں تابش، جو اد اور بلال کس وقت حیوانی بہن کے پاس بیٹھ کر کھانا کھاتے  
 ہو جاتے اور کہاں کہاں پڑ کر سو جاتے۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے پڑھنے لکھنے میں سرگرداں رہتے۔ ہمیں اپنی  
 جی ہم کسی کا کیا پتہ لیتے لیکن سردیوں میں جب پچھلے برآمدے میں دھوپ آ جاتی اور ہم وہاں بیٹھ کر کچھ غسل آفتابی  
 ہو جاتے تو تابش چائے کاڑے اٹھا آتی لیکن کئی بار یا تو اُس سے چائے گر جاتی یا دودھ اوندھا ہو جاتا۔

ایک روز حیوانی نے مجھ سے کہا۔ ”مامی جی ایک دعا کر دیں۔“

”دعا، کیسی دعا؟“

”اس تابش کی شادی کسی ایسی جگہ ہو جائے جہاں آگے اسے خدمت کرنے والا بیٹ مین مل جائے۔ اسے کچھ



کام کرنا نہیں آتا۔“

”شادی سے پہلے کس کو کام آتا ہے حیوانی؟“

”ناں جی یہ سیکھ بھی نہیں سکتی۔ اس کا دماغ سیکھنے والا نہیں ہے۔ کوئی فوجی، جس کا کوئی بیٹ مین ہوں۔“

خاں صاحب بھی کہا کرتے، کوئی عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا بیٹی کول جائے تو نصیب کھل جاتا ہے۔

36۔ جی سے چلی گئی اور تابلش سے رابطہ ٹوٹ گیا تو پتہ چلا کہ اس نے میجر جاوید اصغر سے شادی کر لی ہے۔ میجر صاحب نے اس کے ساتھ ہمیشہ ایک بیٹ مین تھی رہا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی کہ تابلش نے خوب کھانا پکانا سیکھا اور اپنے کھانے کو اپنے سلیٹے سے اپنا مداح بنالیا۔ تابلش کو اللہ نے تین بچے عطا کیے۔ ایقہ سب سے بڑی بیٹی جو اب جہانزیبا (جیری) کی بیوی ہے۔ اکرام خاں شتو جی کے خالہ زاد بھائی ہیں اور اسی انصاف کے بھائی ہیں جن سے عاقبت چھٹکارا حاصل کیا تھا۔

ایقہ سے چھوٹا عمیر انجینئر ہے۔ ان سے چھوٹا سید (گون) ہے جس نے ملک چھوڑنے، واپس آکر از سر نو پڑھائی کرنے کے بعد ایم بی اے کر لیا۔ آئن کس تابلش تیر پاول کے نیچے عسکری فلیٹس میں رہتی ہے۔ شادی کے متعلق بھی محدوش خبریں گھوم پھر رہی ہیں۔

بلاں بھی 36۔ جی کا باسی تھا، لیکن اس سے مہتمم ملاقات رہتی تھی۔ جو ادا اور بلاں برآمدے کے بھائی پڑھنے میں مشغول رہتے اور کبھی کسی مصیبت یا جھیلے کا باعث نہ ہوئے۔ بلاں نے بعد میں، بید کی دوستی سے شادی کر لی جو پٹھان نہیں تھی اور اس طرح بلاں کے ہاتھوں بھی ایک پرانی روایت ٹوٹ گئی۔ اس کی بیوی نے بچے نہ ہوا تو گھر والوں نے پکڑ دھکڑ کر کے اس کی شادی ایک پٹھان لڑکی شیخ سے کر دی لیکن بلاں اور فائزہ کی صحبت نہ تھی۔ وہ لندن چلے گئے اور شیخ واپس اپنے گھر شیخوپورہ لوٹ گئی۔ اب خالدہ اور بلاں کے گھر میں ایک بیٹا آریا ہے۔ بلاں سے چھوٹا عمر کردار خاں ہے، جس نے ایک انگریز لڑکی Jane سے شادی کر لی ہے۔ ان کے گھر نے جنم لیا جس کا نام دایان نقش بند ہے اور وہ لندن کا شہری ہے۔

عمر سے چھوٹی مریم ہے جس سے 36۔ جی میں ملاقات نہ ہو سکی اور جب ہم دونوں لندن گئے اور مریم ایوب بھائی کے پاس ٹھہرے تو پہلی مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی۔ مریم کا پورا نام مریم شیبہ ہے اور وہ صلاح الدین بزنس مین کی بیگم ہے۔ ان کے تین بچے سارہ فاطمہ خاں، مغیث الدین خاں اور زوحا خاں ابھی بننے کے عمل میں ہیں۔ اب جب میں 36۔ جی میں نہیں ہوں، مریم اور صلاح الدین قریباً روز جو ادا کے گھر آتے ہیں۔ صلاح الدین کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ وہ عمران خاں کا رشتہ دار ہے اور زمان پارک میں عمران خاں کے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔ آپ کو شاید یہ ساری تفصیل ناگوار گزری ہو لیکن اس کو بیان کرنے سے میرا ایک مقصد ہے۔ جب پاکستان اور بھارت کے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنے نئے وطن پہنچے تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ املاک کے ساتھ کچھ اپنی آبائی روایات، شناختیں اور رسم و رواج بھی چھوڑ رہے ہیں۔ اللہ اسی طرح تبدیلیاں لاتا ہے۔ کبھی سیلاب

سے ہلا کر، کبھی چنگھاڑ سے تباہ کر کے۔ جب کوئی معاشرہ بہت جاہد ہونے لگتا ہے تو اسے اللہ ہزار طریق سے بھیج کر بدل دیتا ہے۔

اس صاحب کے گھرانے میں سب سے پہلی روایت عثمانی خاں صاحب نے کی۔ پھر اشتیاق نے اعجاز بنا لوی کی۔ پھر عثمانی کر کے پٹھان در پٹھان شادویوں کی روایت ختم کی۔ اس کے بعد جاوید طارق خاں آپا فرحت کے بیٹے نے علی کی بیٹی صدیقہ بیگم (جو بعد میں مدیرہ ’’اوب لطیف‘‘ بنیں) سے شادی کی اور یہ سلسلہ چل نکلا۔

آپا فرخندہ اور بھائی اوب کے گھرانے میں سجاد، غازیہ، تابش، بلال، عمر کردار خاں نے خاندان میں شادی کی۔ روایت کو اتھل پھٹھل کر دیا۔ صرف جواد، ناہید اور مریم ہی ایسے تین بچے تھے جنہوں نے باپ دادا کی روایات کا سچا منہ رکھا اور ذاتی خواہشات کو کبھی خاندانی فیصلوں پر حاوی نہ ہونے دیا۔

ڈاکٹر جواد ساجد اپنے والد اوب احمد خاں کے قریب تر ہے۔ وہ بڑا نامور ہارٹ سرجن ہے اور P.I.C ہسپتال کے سربراہ ہے۔ اس نے ستارہ امتیاز اور انہلال بھی حاصل کیا ہے اور ساتھ ساتھ وہ بڑی آدرشی روح ہے۔ اپنی والدہ صاحبہ سے اس نے لاہور سے بیس پچیس میل دور شیخوپورہ کے پاس ایک رفاہی ہسپتال کھول رکھا ہے۔ ہر اتوار کو وہ چند عورتوں کو لے کر یہاں چلا جاتا ہے اور قریبی دیہاتوں کے غریب دیہاتی جوق در جوق آتے ہیں اور اس سے جیسے اور ہسپتال میں ان ڈور مرلیش بن کر بھی رہتے ہیں۔

جواد کے ساتھ اس کی بہت والی خوبصورت بیوی عثمانی بھی جاتی ہے اور ہر کام میں جواد کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ جواد کے بیٹے ہیں جن کا بہرہ یاروں ماڈل کیسے جواد ہے۔ مہربان جو اسٹریلیا میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ پنگو (ماہم نقش بندی) جو اسٹریٹس میں رہتا ہے۔ شذرے (نقش بندی) جو لاہور میں میڈیسن کی تیاریاں کر رہی ہے۔ سب سے چھوٹا بچہ نقش بندی جو ابھی سکول تک پہنچا ہے اور صبح اٹھنے میں حیل و حجت کرنے کا عادی ہے۔

اپنے کام میں گہری دلچسپی، آدرشوں سے لگاؤ کے علاوہ جواد اپنے نقش بندی ہونے پر بہت فخر کرتا ہے۔ اسے یہ فخر ہونے پر مان نہیں بلکہ وہ بھائی اوب خاں کے آباء پر فخر کرتا ہے جو بہت بڑے صوفی فقیر تھے۔ مشرقی پنجاب میں اس مزار کی آرائش از سر نو کی گئی۔ سکھوں نے جواد کو ہلا یا اور بڑی عزت و احترام سے اسے گدی نشینی عطا کی۔ لیکن یہ تب کی باتیں نہیں ہیں جب میں 36۔ جی میں آئی تھی۔ یہ تو 2007ء کی داستان ہے۔ تب جواد کھلنا بالغ تھا۔ ابھی اس نے دسویں جماعت پاس کرنا تھی۔

میں نے آپ کا تعارف 36۔ جی کے مکینوں سے بڑی تفصیل سے کرایا ہے۔ ممکن ہے آپ کو یہ بڑا اضافی فخر ہو لیکن میں نے دانستہ کچھ وجوہات کی بنا پر اس تفصیل کو اپنایا ہے۔ حسن اتفاق سے آپا فرخندہ کے گھرانے میں جواد پیدا ہو گئے جو قابل ذکر ہیں جن کے متعلق معلومات جمع کرنا غالباً اتنا سہل بھی نہیں۔ ڈاکٹر حسنا احمد، ڈاکٹر مراد اوب اپنی اپنی جگہ پر اور عوامی مقبولیت کے اعتبار سے قابل توجہ ہیں۔

ناہید کے بیٹے ڈاکٹر حسنا کو تو لیڈی ڈیانا کی حادثاتی موت انٹرنیشنل شہرت دے گئی۔ پرنس چارلس سے بعد ڈیانا بیگم بڑے ذہنی انتشار کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے دل کے دورے تو نہ پڑتے تھے لیکن احتمال غالب تھا کہ

ڈیانا کا دل متاثر ہو چکا تھا۔ اسی سلسلے میں ڈیانا ہیر سمٹھ ہسپتال میں داخل ہوئی جہاں ناتی ان دنوں دل کے عارضے سے تھراور ڈاکٹر مگدی کی شاگردی میں دن دوئی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

ڈیانا کے دل کا عارضہ تو جاتا رہا لیکن ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ کچھ عاشقی، ستاشی اور لکٹن میٹی کا اندازہ تھا۔ ڈیانا بیگم باقاعدگی سے حسنا ناتی کے گھر آنے جانے لگی۔ ڈاکٹر حسنا احمد جسے گھر والے ناتی پکارتے ہیں نے اپنا پارٹنر تبدیل کرنے کے چکر میں تھا۔ ڈیانا دوسری منزل کی کھڑکی کھول کر ناتی کی کتابیں، ٹیکے، چادر میں لپیٹ کر سامان اور پتے نیچے پھینکتی جاتی۔ نیچے ناتی اسے بازو پھیلائے تیج کرتا۔ حسنا کی زندگی میں محبت کیونکر آئی اور کبھی زندگی الجھا کر چلی گئی۔ اس پر کئی کتابیں رقم ہو چکی ہیں۔ ڈیانا کی سائیکلو تھریسٹ کی کتاب اس سلسلے میں بڑی اہم مغربی میڈیا کی مسلمان کو بخشا نہیں کرتا۔

کھیل کھیل میں، مدد کے چکر میں دونوں بہت قریب آ گئے، لیکن حسنا کے منہ سے اظہار کا یہ نکلا۔ آپ ان پٹھان زادوں کو کمینہ یا از حد محتاط کہہ سکتے ہیں لیکن اتنی بات طے ہے کہ حسنا اپنے گھر والوں کے خاندانی روایات کو توڑنا نہ چاہتا تھا۔ ایسے میں ڈیانا نے یہیں کی۔ اس نے آپا فرخندہ کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ صاحب سے رابطہ قائم کیا۔

خاں صاحب نے ڈیانا سے متعلق اپنے ایک انٹرویو میں ڈیانا اور حسنا کے تعلق کو بے نقاب کر کے بتا دیا تھا لیکن یہ نقاب کشائی کافی نہ تھی۔ حسنا کی وجہ سے میں نے اس کے خاندان کی تفصیلات جہاں تک مجھے معلوم آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کون جانے ڈاکٹر جواد جوان ونوں ہارٹ کے ہسپتال P.I.C کے چیف ایوب، مد خاں جو اپنی جگہ بے حراہم انسان تھے، کب ان تفصیلات میں سے کوئی مکڑی ان بڑے لوگوں کی زندگی میں حاصل کرنے اور ان لوگوں کی زندگی کی جگہ سول پزل میں عین گم شدہ مقام پر اہم Clue بن جائے۔

دوسری بڑی وجہ اس تفصیل بیان کی میرے نزدیک یہ ہے کہ میں آپ کو بتا سکوں، ہجرت کرنے والی ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ وہ اپنوں میں اس قدر گندھے ہوئے رہتے ہیں کہ ہر رشتہ چاہے وہ دور ہی کا کیوں نہ ہو انہیں کا حامل رہتا ہے اور اسے توڑنا یا گزند پہنچانا ان کو احساس جرم میں مبتلا کرتا ہے۔ حسنا نے بہت کوشش گزاری لیکن اپنے گھر والوں کا دل نہ توڑا۔ خاندانی روایات کی پاسداری کی۔ خاں صاحب برسوں تضاد کا شکار۔ پٹھانوں کی روایات ان کے ہاتھوں چکنا چور ہو گئیں۔ شاید جس کا رنج انہیں تاحیات رہا۔ شاید کبھی کسی مقام پر حسنا میں یہ تفصیلات اس لحاظ سے بھی اہم ہو جائیں اور آپ اُس بات کی تہ تک پہنچ پائیں جس تک میری رسائی نہ ہو سکتی۔ آپا فرخندہ خاندان کی ذمہ داری کے بعد جو پہلا ذہنی حادثہ ہمیں پیش آیا وہ 1965ء کی جنگ تھی۔

نہ تھا کہ بھارت کے دل میں اس قدر پاکستان دشمنی ہے۔ وہ طاقت کا ازلی ہتھکنڈہ استعمال کر کے مسائل کو پاکستان کی بانہ مروڈینا چاہتا تھا تا کہ از خود ہم اُس کے غلام بن جائیں اور خود ہاتھ جوڑے اُس کا اٹھند بھارت پورا کر دیں۔

تجربہ بھارت کو نہ تب علم تھا اور نہ آج تک اُسے سمجھ آئی کہ اعمال ہمیشہ نیتوں کے ڈانڈوں پر تو لے جاتے ہیں۔  
 ہونے والے کی نیت میں کھوٹ نہ تھا۔ اسی لیے باوجودیکہ ہم نے بطور قوم اس نعمت کی حفاظت نہیں کی، لیکن اللہ  
 سے خیراں رکھے گا۔

میں آپ کو بتا رہی تھی کہ 1965ء کی جنگ جاری تھی۔ لاہور کے کلچرل باسی ہوائی حملوں کو بھی کوئی کلچرل شو سمجھ  
 کر سب اوپر سے جہاز گولیاں برساتے اڑتے، لاہور کے پتنگ باز جیلے کوکھوں پر چڑھ کر نعرے لگاتے۔

میں نے یوشین ان دنوں بہت سررم عمل تھا۔ ساری میڈیا جنگ میں سے ہو رہی تھی۔ اشفاق صاحب کا  
 دور و شور سے چل رہا تھا۔ میں بھی کچھ شامل باجہ رہتی تھی۔ ان دنوں سنوڈ یوز میں ملکہ ترنم نور جہاں سے  
 وہ قومی ترانے باقاعدگی سے گایا کرتی تھیں۔ جس روز میری نور جہاں سے پہلی ملاقات ہوئی، وہ سنوڈ یو  
 سے گھر رہی تھیں۔

”نہی رنگ رنگیلا ہائے نی کر نیل نی جرنیل نی۔“

میں کے بعد ”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ تھی۔ خاں صاحب اور میں دروازہ کھول کر اندر گئے اور چپ چاپ  
 سامنے سفید ساڑھی میں بیوس برف پوش پہاڑ کی چوٹی کی طرح اللہ کا ایک خوبصورت منظر کھڑا تھا۔  
 کہ باوجود اُس کے حسن میں کہیں کمی نہ تھی۔ بالوں میں ایک سفید پھول، ہاتھوں میں ہیرے جڑی چوڑیاں، گلے  
 بھائی..... نور جہاں مکمل طور پر نسوانیت کی پوری طاقت سے لیس ترغیب کی ایک تصویر تھی۔

”بھائی رنگ رنگیلا..... ہائے نی جرنیل نی کر نیل۔“

مجھ پر بعد سازندوں کو چھڑکیاں عطا ہوئیں۔ سارنگی نواز تار ٹھیک کرنے لگا۔ طاقتور تھوڑی لے کر طبلے کی جوڑی  
 میں مشغول ہو گیا۔ چائے آگئی۔

نور جہاں خاں صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”آغا جی یہ صوفی صاحب تو غضب کے قومی ترانے لکھ رہے ہیں۔“ نور جہاں نے کہا۔

”بھائی ہمارے استاد ہیں۔ وہ نہیں لکھیں گے تو اور کون لکھے گا۔“

میری نگاہوں میں کالج کا وہ زمانہ گھوم گیا جب صوفی صاحب ایم اے کی کلاس میں ہم شاگردوں سے غالب کی  
 ہو کر باری باری باواز بلند پڑھوایا کرتے تھے۔

نور جہاں نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے کاٹھ کباڑ سے لدے گودام کو دیکھ رہی ہو۔

”یہ آپ کی بیگم ہیں آغا جی۔“ وہ خاں صاحب کو ہمیشہ آغا جی کہتی تھی۔

”بالکل۔ کوئی شک ہے؟“

میں نے ہمیشہ کی طرح سفید لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر کوئی میک اپ نہ تھا اور جسم پر ایک شادی کی انگوٹھی  
 سنی زبور نہ تھا۔

”ہائے ہائے نگلی بچی..... اتنا سادہ بے رونق لباس اور بھائی! تم کچھ ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔ میک اپ کرو تو

آغا جی کی جوڑی بھی ہے۔ اتنے خوبصورت آدمی کی بیوی۔“

وہ چپ ہو گئی جیسے میری دلآزاری کا خیال آ گیا ہو۔

”دیکھو بی بی، تمہارا شوہر پاکستانی تو لگتا نہیں۔ اطالوی لگے تو لگے۔ اس کے ساتھ تو.....“

وہ پھر خاموش ہو گئیں۔ میں نے دل ہی دل میں جملہ مکمل کر لیا۔ ایسے خوبصورت اطالوی مرد کے ساتھ

نظر بٹو بھی تو درکار ہے ورنہ اسے تو قدم قدم پر نظر لگنے کا خدشہ ہے۔ بہر کیف اپنی لائبریری نکل آنے پر میں خوش

واپس آئی۔

جنگ کے یہ دن ہر پاکستانی پر بھاری تھے۔ خاں صاحب رات کو سوتے وقت اینٹ اور انہیں کو دانتیں

اشیر کو سینے پر رکھ کر سوتے۔ انہیں اپنا خوف تو شاید نہ تھا لیکن سوچتے ہوں گے، ابھی 1947ء کو بھولے نہیں اور

پھر؟ نہ جانے اس جنگ میں کون کس سے بچھڑ جائے۔

پھر اچانک نانا آ گئیں۔ انہوں نے خاں صاحب سے کہا ”شقا! اب زاہور میں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ تم

میرے ساتھ ملتان کی زمین پر چلو گے۔ زمین ملتان سے بھی اتنی دور ہے کہ جنگ کے اثرات محسوس نہیں ہوں گے۔

”نانا جی! آپ قدسیہ اور بچوں کو لے جائیں۔ میرا جانا تو مشکل ہے۔ میں تو ”تلقین شاہ“ سے بندھا ہوں

میں نے خاں صاحب کو چھوڑ کر جانا منظور نہ کیا اور نانا بچوں کو لے کر ملتان چلی گئیں، جہاں بچوں نے ٹیوب ویل

ٹریکٹر پر بیٹھ کر، کھیتوں میں سے کچی سبزیاں تو ڈکرائیں، لمبی پلنگ منائی۔

اخلاق بھائی بھی جنگ کے دوران دو تین مرتبہ بڑے متوحش آئے اور مشورہ دیا کہ ہم واقعی گاؤں چھوڑ

لیکن خاں صاحب بڑے مؤدب طریقے سے خاموش ہو گئے۔ اخلاق بھائی ذکیہ اور بچوں کے ساتھ ہری پور چلے گئے۔

ان ہی دنوں جب ریڈیو کیشن سے رابطہ گہرا ہوا۔ مجھے صابرہ سلطانہ ریڈیو کیشن پر ہی ملیں۔ صابرہ

بہنا پنا ہو گیا۔ صابرہ سلطانہ میاں عابدالحق کی دوسری بیگم تھیں۔ میاں صاحب بھاری بھاری گورے چٹے سفید تھے

میں بڑی برداشت تھی۔ اُن کے بیٹوں نے صابرہ آپا کی بیٹی راجی اور انہیں برداشت نہ کیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ بیگم

زمینوں میں اپنا حصہ بخر نہ ثابت کر دیں۔ اس سلسلے میں ہمیشہ کی طرح انہوں نے میاں صاحب کو بڑے دباؤ میں

یہی شرط پیش کی کہ صابرہ آپا کبھی زنی نہیں جائیں گی۔

میاں عابدالحق کا گاؤں کا کاخیل سوات کی سڑک پر مروان سے کوئی سولہ میل دور تھا۔ راجی کے بڑے

بھائی شمس کا کاخیل کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ صابرہ سلطانہ اُن کی جائیداد ہتھیانے کے لیے دوسری بیگم

حالانکہ اس معاملے میں صابرہ بڑی درویش تھیں۔ میاں عابدالحق کے آباء میں کا کاخیل ایک بڑے صوفی بزرگ

ہیں۔ نوشہرہ کے قریب اُن کا مزار مرجع خلافت ہے۔ ہر سال عرس کے موقع پر میاں صاحب کے گھرانے کے

شمولیت کرتے ہیں۔

صابرہ سلطانہ بڑی گنومورت تھیں۔ باوجودیکہ وہ بھی پٹھان والد کی بیٹی تھیں اُن میں غصہ، طیش

بھڑک اٹھنا میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُن کی ساری کائنات راجی بیگم تھیں، جنہیں انہوں نے sus & Mary

میں تعلیم دلوا کر یونیورسٹی میں پہنچایا۔ اس ساری تگ و دو میں ان کی ذاتی خواہشات راکھ ہو گئیں۔

میں نے ان دنوں جب آرٹس لوگوں کی ریڈیو پاکستان پر گہما گہمی تھی، ایک روز خاں صاحب ”آج اور آج کا دن“ کے لئے اس پروگرام میں وہ ہر روز بتایا کرتے تھے کہ آج کس بڑے آدمی کا جنم دن تھا۔ کس ملک کو آج کے روز جسکی تحریک کی بنیاد ڈالی گئی۔ تاریخ سے نوجوان سامعین کا رشتہ جوڑنے کا یہ انوکھا طریقہ بھی خاں صاحب کے عجیب و غریب تھی۔

میں نے ان دنوں صابرہ کے ساتھ ان کی بیٹی روجی موجود تھی۔ آپا صابرہ نے خاں صاحب سے تعارف کرایا۔

خاں صاحب ایسی کئی ہے۔ سسٹس اینڈ میری سکول میں پڑھتی ہے۔ بڑی ذہین ہے۔“

پوچھا۔ پھر تو تمہیں مبارک ہو۔ میں قد سید کو لے کر تمہارے گھر آؤں گا۔“

آپ کہاں محلہ میں بہرا گھر ڈھونڈتے پھریں گے، سب جی آجائیں گے۔“

صابرہ نے اپنا اتہ پتہ بتایا تو اپنی طبعی فراست کے باعث خاں صاحب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

میں نے سچے سچ میں بولے۔ ”کسی کو مشورہ دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ روم میں میری لینڈ لیڈی کہا کرتی تھی۔ ہر انسان کو

کھانے کا اختیار ہے۔ یہی اصلی جمہوریت ہے لیکن میری رائے ہے کہ اتنی ماڈرن تعلیم کے ساتھ اس کو کسی کھلے

محلے کی ضرورت ہے۔ جب اس کی سہیلیاں وزٹ کے لیے آئیں تو ان پر کوئی ہانغ کا اچھا اثر ہو۔“

خاں صاحب کو علم نہ تھا کہ وہ وقت سے بہت پہلے معیار زندگی کے حق میں ووٹ دے رہے تھے۔ مفری ترقی

کی خاطر یہ مثبت تھا۔ تو نیچے کسی کسی گھڑی کی بات دل پر اثر کر جاتی ہے۔ صابرہ آپا پر بھی خاں صاحب کی بات کا

اچھا اثر ہوا۔ میں گھر لے کر آ بیٹھیں۔ روجی اور ان کے پاس زیتونی رنگ کی نوکسی تھی جسے میاں صاحب کا ایک

بھائی خرید کر لایا کرتا تھا۔ مجھے اور خاں صاحب کو ہانگل علم نہ ہوا کہ کب اور کس دن صابرہ آپا نے مکان بدلا۔ بس

میں نے کسی میں صابرہ اور کوئی آئیں۔ ہم دونوں کھانے کے کمرے میں 36۔ جی کی گیلری میں دائیں ہاتھ بیٹھے کھانا

کھاتے والے تھے۔ آپا صاحبہ رے میں بڑے اعلیٰ مرغی کے تگے، کباب، شوربہ مع سرہیٹ کانٹے چھری کے لے کر

میں سرور اور صفائی قابل داد تھی۔

”بڑا اچھا ہوا۔ اشفاق بھائی! آپ نے کھانا شروع نہیں کیا۔ میں آپ کے لیے مرغی کے یہ تگے بنا کر لائی

میں صاحب ہمیشہ کھاتے ہیں۔“

”اتنی دور سے کھانا لے کر آئی ہیں آپ۔ غضب کر دیا صابرہ۔“

”دور کہاں۔ میں تو کبھی کی ایچ بلاک میں شفٹ کر گئی ہوں۔“

”کیا؟..... کیا کہا؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”لو قد سید جی۔ اب تو ہم ایک طرح سے آپ کے پڑوسی ہو گئے۔“

”لیکن آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

”کئی کبھی کسی دن surprise دیں گے۔ انکل کو surprise اچھا لگتا ہے۔“

پتہ نہیں صابرہ اس تبدیلی سے خوش تھی کہ نہیں لیکن کئی کھلے درختوں والے ماڈل ناؤن میں ایک آزاد پرنسپل  
طرح لمبی ازانوں کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

جنگ اور آپا صابرہ کے بعد جوئی تبدیلی ہمارے نظام زندگی میں آئی، وہ خاں صاحب کی مرکزی اردو بورڈ  
تقرری تھی۔ عین 17 جون 1967ء کو خاں صاحب کو قدرت اللہ شہاب نے بیسویں گریڈ کا ڈائریکٹر بنا دیا۔ شہاب نے  
ان دنوں سیکرٹری ایجوکیشن تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے لندن میں انڈیا آفس کی میموریل لائبریری کا ڈائریکٹر  
کو بنا دیا۔ پتہ نہیں یہ اعزاز ان اداروں کا تھا کہ انشائی اور خاں صاحب کا لیکن ان دونوں جن حضرات نے خوب کام  
اتنی کتابیں خاں صاحب نے چھاپ دیں کہ آج تک اردو بورڈ ان کتابوں کی رائلٹی کھا رہا ہے۔ خاں صاحب کی  
پوسٹنگ 1967ء سے 2 جولائی 1989ء تک بیسویں گریڈ میں رہی۔ پھر بینظیر صاحبہ تشریف لائیں۔ تلقین صاحبہ  
پر وگرام سے ناخوش ہو کر انہوں نے خاں صاحب کو اردو بورڈ سے معطل کر دیا۔ ساتھ ہی تقین شاہ بھی ریڈیو سے  
گیا۔ پھر 26 مارچ 1991ء کو دوبارہ اشفاق صاحب کو اردو بورڈ کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا گیا اور بائیسواں گریڈ بھی  
مہربانی جناب نواز شریف نے کی تھی اور بڑی معذرت کے ساتھ کہا تھا۔ ”مجھے افسوس ہے اشفاق صاحب! سیاسی  
کے محسنوں کو نہیں جانتے۔ انہیں معلوم نہیں کہ آپ ایک Living Legend ہیں۔ آپ جیسے لوگ بار بار  
ہوتے۔ ہمیں ان لوگوں کی قدر کرنی چاہیے جو قوم کا رول ماڈل ہیں۔ چاہے ہمارا آپ کا مسلک ایک مذہب  
نواز شریف کی مہربانی سے خاں صاحب 26 مارچ 1991ء سے 12 جون 1993ء تک اردو بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل  
اور بائیسویں گریڈ تک جا پہنچے۔ ہماری انا کے لیے یہ ترقی بڑی ہی تسلی بخش تھی اور گو ہم ایک دوسرے سے بھی  
کرتے تھے لیکن اندر ہی اندر اس جیت پر چھوٹے نہ مارتے تھے۔

آپا صابرہ، اردو بورڈ کے علاوہ ایک اور بھی تازہ پانی ہماری زندگی میں شامل ہوا۔ یہ ریاض محمود تھے  
تعارف ان ہی کی زبانی سنئے۔ ان کا ذاتی مضمون ملاحظہ کیجئے۔

جب میں نے ہوش سنبھالی تو ہم لوگ احاطہ فیروز دین فلمی رنگ روڈ میں رہتے تھے۔ ہمارے اور موصوفی  
اختر شیرانی صاحب کے گھر کی دیوار مشترک تھی۔ میری والدہ ایک میز پر کھڑی ہو جاتیں اور دوسری جانب سے  
شیرانی بھی میز پر کھڑی ہوتیں۔ دونوں خواتین گھنٹوں باتیں کرتی رہتیں۔ اکثر میں دیکھتا کہ بیگم اختر شیرانی رور  
میری والدہ انہیں تسلی دے رہی ہیں۔ میں والدہ سے بعد میں پوچھتا کہ بیگم اختر شیرانی کیوں رور  
اُدھر کر جاتیں۔ اختر شیرانی صاحب کا ایک بیٹا میرا ہم عمر تھا۔ ہم اکثر ان کے گھر جاتے۔ وہاں جانے میں  
تھے۔ ایک تو دوست سے ملاقات۔ دوسرے دوست کی ٹرائی سائیکل چلانے کا مزہ اور تیسرے گرمی کے دنوں میں خوش  
بھرا صندل کا شربت جس کا ذائقہ مجھے آج بھی یاد ہے۔

احاطہ فیروز دین میں ایک کنواں تھا جس کا پانی بہت ٹھنڈا ہوا کرتا تھا۔ کنوئیں کے ساتھ ہی مسجد تھی  
نمازی اسی کنوئیں کے پانی سے وضو کیا کرتے تھے۔ بچپن سے لے کر جوانی کے آخری دنوں تک میں خواب دیکھتا

تس کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے ڈول ڈالا۔ ڈول بھر گیا، میں پانی نکال رہا ہوں کہ ڈول بھاری ہونے کی وجہ سے کنوئیں میں گر گیا ہوں۔ یہ خواب عرصے تک مجھے پریشان کرتا رہا لیکن اب کئی سالوں سے نہیں۔

میری پیدائش 2 جولائی 1936ء کی ہے۔ 1941-42ء میں جبکہ میں پانچ چھ سال کا تھا، دوسری جنگ عظیم کے دوران میں۔ احاطہ فیروز دین میں صرف فیروز دین صاحب کے گھر میں ہی ریڈیو تھا۔ شام کو احاطے کے سب لوگ حاجی صاحب کی بیٹھک میں جمع ہو جاتے اور ریڈیو پر خبریں سناتے۔ میں بھی اپنے والد کے ساتھ حاجی صاحب کی بیٹھک میں جاتا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے خبروں میں کوئی دلچسپی تھی، بلکہ اس لیے کہ حاجی صاحب گھر آئے مہمانوں کی تواضع فرماتے تھے۔

ان دنوں چائے سے تو کچھ ایسی دلچسپی تھی البتہ فروٹ ٹیک میں بڑے شوق سے کھاتا۔ دوسرے وہاں جانے والے شخص یہ تھی کہ میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا تھا جو ریڈیو کے اندر بیٹھ کے خبریں پڑھا کرتا تھا۔ میری وہ خواہش تو پوری ہوئی۔

میری والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مجھے کسی انگریزی سکول سے تعلیم دوائیں۔ اسی خواہش کے پیش نظر انہوں نے مجھے سنسن روڈ کے ایک سکول میں داخل کروا دیا جس کی پرنسپل، مالک اور ٹیچر ایک بوڑھی سی یورپین بیڈی تھی۔ یہ سکول ان دنوں اخبار کے ساتھ والی گلی کے آخر میں واقع تھا۔

سکول میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جاتی تھی جبکہ وہاں پرنسپل صاحبہ کے خرگوش اور ان کا بیٹا اونٹن بھی تھے اور ہم بچے کلاس روم میں سے انہیں دیکھ سکتے تھے۔ اچانک پرنسپل صاحبہ نے لندن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سکول بند ہو گیا اور مجھے مہاں شاہ ابوالمعالی کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیا گیا، جو لاہور ہونل کے عقب میں تھا۔ اسی سکول میں ہمیں ایک دن کھانے کے لیے لڈو دیئے گئے اور بتایا گیا کہ اتحادیوں کو دوسری جنگ عظیم میں ہار ہوئی ہے۔

شاہ ابوالمعالی پرائمری سکول سے چار جماعتیں پاس کرنے کے بعد میں نے وطن اسلامیہ ہائی سکول میں جو کہ پانچ سول لائسنس سے ملتی تھی، پانچویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں تحریک پاکستان زور و شور سے جاری تھی۔ لیکن ہم پانچویں جماعت کے طلباء کو ہم ہوا کہ آج ایک جلوس اسمبلی ہاں کے سامنے مظاہرہ کرے گا۔ میں اور میرا دوست بھی اس جلوس میں شرکت کے لیے جا پہنچے۔

ہمارے سامنے ایک شخص نے اسمبلی کی عمارت پر چڑھ کر یونین جیک کو نذر آتش کر دیا۔ پھر ایک بھگدڑی منج سے لگی آنکھوں میں جلن ہونے لگی اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ ایک بھلے مانس نے ہم بچوں کو بھگدڑ میں دیکھا تو دو دو دیتے ہوئے کہا کہ بچو! بس اب فوراً گھر کو بھاگ جاؤ۔

1947ء کے فسادات بڑے ہولناک تھے۔ اکثر سڑکوں پر لوگوں کی لاشیں پڑی نظر آتیں۔ عمارتوں کو آگ لگا دی۔ ہم چھتوں پر چڑھ کر جلتی ہوئی عمارتوں سے نکلنے والا دھواں دیکھا کرتے تھے۔

میرے بڑے بھائی کی شادی فیروز پور کے ایک پٹھان خاندان میں ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لوگ



فیروز پور سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ میری بھابھی کے نام سے رحمان پورہ میں ایک کونٹری لائٹ کروالی گئی اور ستمبر 1947ء کے آخر میں رحمان پورہ منتقل ہو گئے۔

میرے والد ریلوے میں ملازم تھے لیکن بعد میں نوکری چھوڑ کر کاروبار کرنے لگے۔ ہم تین بھائی تھے۔ سب سے چھوٹی تھی۔ 1948ء میں میری بھابھی جن کا نام نسیم تھا، انتقال کر گئیں۔ انہیں تپ دق تھی اور اس زمانے میں اس مرض کا سوائے موت کے کوئی علاج نہ تھا۔ بھابھی کے ساتھ میری بڑی دوستی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں اکثر غم سے دیکھتا کہ وہ مری نہیں ہیں بلکہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ قبر میں دبانے کے بعد وہ ہوش میں آ گئیں اور اپنے اوپر پڑی کپڑے کھینچ کر کفن میں بنیوں ہمارے گھر کے دروازے پر پہنچ کر دستک دے رہی ہیں۔ خوف سے میری آنکھ کھل جاتی۔ دل فطرت سے دھڑکتا اور رات کا بقی کا حصہ میں جاگ کر گزارتا۔

پڑھائی میں میں کچھ ایسا اچھا نہیں تھا لیکن جیسے تیسے کر کے میں نے 1953ء میں میٹرک کر لیا۔ انہی دنوں صاحب کو کاروبار میں پے در پے گھانٹوں اور کچھ کاروباری ساتھیوں کی بددیانتی کی وجہ سے کٹھن مالی مشکلات میں مبتلا رہا تھا۔ میرا داخلہ ایف سی کالج میں ہو گیا لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ داخلہ فیس دینے کے لیے والد صاحب کے پاس سے رقم نہیں تھی۔ چنانچہ میں پڑھائی چھوڑ کر والد صاحب کے ساتھ کام کرنے لگا۔ ایم اے تک تعلیم میں نے بعد میں حاصل کی۔ میرے نھتیاں والے انارکلی میں رہتے تھے جہاں ان کی بہت جائیداد تھی، لیکن نسل در نسل بٹنے اور پھر بیعت فروخت کر کے کھلے علاقوں میں رہائش اختیار کر لینے کے باعث اب وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ انارکلی میں اپنی پڑنائی سے ملنے اپنی والدہ کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ ہم سب انہیں ماسی وڈی کہا کرتے تھے۔ وفات کے بعد حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار سے ملحق قبرستان میں دفن ہو گئیں۔

میرے سگے ماموں اور دوسرے کئی رشتے دار قیام پاکستان سے قبل ہی رحمان پورہ، اچھرو، مہران، بلنگرہ، فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ کے سامنے آن بسے تھے۔ ہم لوگ فلمینگ روڈ سے انہیں ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ زمانے میں بسیں، رکشے یا وہنیں تو ہوا نہیں کرتی تھیں۔ تاکے ہی لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا کام کرتے تھے۔ جب ہم فلمینگ روڈ سے فیروز پور روڈ یا رحمان پورہ آتے تو سالم تاکہ بارہ آنے کا مانتا تھا۔

1960ء میں میں نے ریڈیو جوائن کیا اور یہیں میری ملاقات اشفاق احمد صاحب سے ہوئی۔ ”گڈ ریڈیو“ چکا تھا اور مصنف کے انداز بیان کا معترف تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر اشفاق احمد صاحب کا آنا جانا اکثر رہتا۔ وہ ان دنوں روزہ ”لیل ونہار“ کے ایڈیٹر تھے، لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ”لیل ونہار“ چھوڑ کر ریڈیو لاہور کے ساتھ بطور سکرپٹ رائٹر بہت ہو گئے۔ ان دنوں ان کے پاس بھی سکوٹر تھا اور میرے پاس بھی۔ ہم لوگ دفتر سے نکلتے۔ سڑکوں پر رش بالکل نہیں ہوتی۔ آہستہ آہستہ سکوٹر چلاتے مزنگ چوگی بیچتے۔ عثمان کی دکان سے ساچی پان خرید کر کھاتے۔ گیس لگاتے اور شام کے سہانے گہرے ہونے کے بعد وہ من آباد اور میں رحمان پورہ کی راہ لیتا۔

1965ء میں اشفاق صاحب من آباد سے ماڈل ٹاؤن منتقل ہو گئے اور بعد میں انہوں نے ماڈل ٹاؤن سے چھ اپنا گھر بنالیا۔ 1966ء میں میری شادی ہوئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ شادی کے بعد میں علیحدہ رہوں گا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ

سفر میں بہت خرابیاں اور لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی شادی کے بعد ماڈل ٹاؤن میں ہی رہنے لگا جو اشفاق صاحب کے پڑوس میں تھا۔

ایک دن اشفاق صاحب بتانے لگے کہ میں کسی زمانے میں فلمینگ روڈ میں رہتا تھا۔ بعد میں کچھ عرصہ اچھرہ سراج بلڈنگ میں رہا۔ بعد میں مزنگ روڈ، بمن آباد اور پھر ماڈل ٹاؤن۔ میں نے عرض کیا کہ فلمینگ روڈ تو بہت تھیں۔ اچھرہ اڈہ کے پاس معراج بلڈنگ میں میرے ایک رشتے دار رہتے تھے۔ ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ان کے پاس بھی اکثر جانا ہوتا تھا اور اب ماڈل ٹاؤن میں تو آپ کا پڑوسی ہوں ہی..... اشفاق صاحب مسکراتے تھے کہ تم نے بھی میرا "کھیڑا" کبھی چھوڑا نہ۔

میں نے کہا کہ میں نے کبھی نہیں اور شفقتیں ہی اب زندگی کا سرمایہ ہیں۔ یادوں کے علاوہ اور کون سا اثاثہ انسان کے پاس رہتا ہے۔ ان کے متعلق ریاض محمود صاحب لکھتے ہیں۔

”داستان گو“ (داستان سرائے)

اشفاق احمد مرحوم..... آج بھی انہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپ جاتا ہے۔ یہ بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ جو بھی شادی سے ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے لیکن اشفاق احمد ایسا تندرست، زندگی سے بھرپور، ذہین اور دوسروں کے لئے نیک انسان اس قدر جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اشفاق صاحب سے میری پہلی ملاقات پرانے ریڈیو سٹیشن میں ہوئی۔ سردیوں کے دن تھے۔ چند روز پہلے میں بھی اور تیز ہوانے سردی میں اضافہ کر دیا تھا۔ تاج الدین صاحب، اکرم بٹ صاحب، سعید مرزا صاحب اور دیگر دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھے کہ اتنے میں ایک صاحب ہاتھ میں موگ پھلی کا لفافہ لیے ہمارے درمیان سے گئے۔ لفافہ کھل گیا۔ چائے آگئی اور ہم سب موگ پھلی کھانے، چائے پینے اور ان صاحب کی باتیں سننے میں مصروف ہو گئے۔ میرے سوا سب ان سے واقف تھے اور خاں صاحب کہہ کے مخاطب کرتے تھے۔

خاں صاحب ایک خوبصورت انسان تھے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خوش گفتاری تھی۔ بات کہنے کا فن ان کے پاس تھا۔ جس میں مزاح کی چاشنی، علم، مشاہدے اور تجربے کا ایسا اظہار کہ ہر سننے والے کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ یہ سنیں اور وہ سنتا جائے۔

جب خاں صاحب اس وعدے کے ساتھ رخصت ہوئے کہ جلد ہی پھر ملیں گے تو میں نے اکرم بٹ صاحب سے کہا کہ یہ خاں صاحب کون ہیں۔ بٹ صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا تم نہیں جانتے خاں صاحب کو؟ میں نے کہا نہیں۔ میں نے تو آج پہلی بار انہیں دیکھا ہے۔ بٹ صاحب کہنے لگے، یار اشفاق احمد خاں صاحب کا نام لگاؤ۔

”گڈ ریا والے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل وہی۔“ بٹ صاحب نے جواب دیا۔

یہ غالباً 1960ء کی بات ہے۔ اشفاق صاحب ان دنوں ہفت روزہ ”لیل و نہار“ کے ایڈیٹر تھے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ”لیل و نہار“ کی ایڈیٹری چھوڑ کر ریڈیو پاکستان لاہور سے بہ حیثیت سکرپٹ رائٹر منسلک ہو گئے۔ میں شعبہ ری کنسٹرکشن میں کام کرتا تھا۔ اشفاق صاحب بھی اس شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ میری نیاز مندی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کی محبت اور شفقت بھی بڑھتی گئی اور یہ سلسلہ ان کے اس جہان فانی سے رخصت ہونے تک جاری رہا۔

اشفاق صاحب ہمیشہ نئی بات سوچتے، ریڈیو پروگراموں میں مختلف قسم کے تجربے کرتے اور لکیر کے ختمے روینے کو ناپسند فرماتے۔ یوں تو انہوں نے ریڈیو کے لیے ہر نوعیت کے پروگرام پیش کیے جن میں فیچر، دستاویزی فلم، تقاریر اور انٹرویوز شامل ہیں لیکن ان کا اصل میدان ڈرامہ تھا۔ ریڈیو ڈرامہ نسبتاً ایک نئی چیز تھی اور اس کے لیے نئی نئی باتوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ریڈیو صرف اور صرف آواز کا میڈیم ہے، جس میں مصنف اور پروڈیوسر صرف صوتی لہروں ذریعے ہی ہر چیز اپنے سننے والے تک پہنچاتا ہے جبکہ نئی ویرژن اور فلم میں آواز کے ساتھ اداکاروں کی حرکات، میک اپ، لباس اور سیٹ مصنف کی بات کو موثر ترین انداز سے دیکھنے والے تک پہنچاتے ہیں۔ اس لیے ریڈیو کے لکھنا اور اسے پروڈیوس کرنا زیادہ مشکل ہے۔

لیکن جہاں ریڈیو صرف آواز تک ہی محدود ہے، وہیں اس کا ایک مضبوط پہلو بھی ہے کہ سننے والوں کا دل آواز کی لہروں سے موصوف ہونے والے اسگنلز سے اس منظر کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بنا لیتا ہے، جیسے وہ سنی ہو ہے۔ ظاہر ہے اپنے تصور کے زور پر بنائی تصویر ہر شخص کو پسند ہوتی ہے اور یہ ریڈیو کا وہ مضبوط پہلو ہے جو اسے مشکل فلم پر سبقت دلاتا ہے۔

اشفاق صاحب کو تجربات کرنے کا بہت شوق تھا۔ گھر میں وہ مختلف قسم کے سر کے اور کریمیں بناتے تھے۔ باکمال بن جاتیں اور کبھی ناکام ہو جاتیں۔ اسی طرح وہ اپنے افسانوں، ریڈیو ڈراموں اور ٹیلی وژن پروگراموں میں مختلف تجربات کرتے رہتے۔ ریڈیو ڈرامہ عام طور پر سٹوڈیو میں صوتی اثرات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے لیکن اشفاق صاحب نے ”دس دسمبر“ کے نام سے ایک ایسا ڈرامہ لکھا جو تمام کام تمام سٹوڈیو سے باہر ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اس میں ریڈیو ڈرامے میں ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ اس ڈرامے کے فنکاروں میں جمیلہ اختر، آفتاب احمد، ڈاکٹر انور جمیل اور اشفاق احمد شامل تھے۔

اسی طرح جب پروگرام تفتیقین شاہ شروع ہوا تو اس میں بھی اشفاق صاحب نے بولنے کا وہ لہجہ اختیار کیا جو پنجابی اور اردو بولنے والے یکساں طور پر سمجھ سکتے تھے۔ یہ لہجہ پٹیالے کی بولی تھا۔ اشفاق صاحب نہ پٹیالے کے والے تھے اور نہ پٹیالے کی بولی ہی کے آشنا لیکن جس روانی سے وہ اس بولی میں بات کرتے اس کو سن کے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ پٹیالے ہی کے رہنے والے تھے۔

پٹیالے سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے اکثر حضرات ان سے پوچھا کرتے تھے کہ وہ پٹیالے میں کب رہتے تھے۔ اشفاق صاحب کہتے ”سنام میں گھر تھا اپنا۔“

وہ صاحب کہتے ”ہم بھی سنام کے رہنے والے ہیں۔ کبھی ملاقات نہ ہوئی آپ سے وہاں۔“

اشفاق صاحب کہتے ”بس اتفاق اے جو ملاقات نہ ہوئی، آپ تاں شاید چھوٹے ہوں گے اس وقت۔“  
 اشفاق صاحب کا مشاہدہ عمیق اور کان بہت تیز تھے۔ پیالوی لب و لہجے میں بات کرنے کا فن انہوں نے کرشن  
 سے سیکھا۔ ایک ڈاکٹر صاحب سے سیکھا۔ تلقین شاہ 1962ء میں شروع ہوا۔ اُس وقت اس پروگرام کا نام  
 ”تلقین شاہ“ تھا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران اس کا نام بدل کر ”تلقین شاہ“ رکھ دیا گیا۔ ریڈیو پاکستان کو  
 سونپا گیا ہے کہ تلقین شاہ اس کا بیالیس سال تک چلنے والا پروگرام ہے۔ غالباً دنیا کے کسی نشریاتی ادارے سے اتنے  
 سونپے کے لیے کوئی پروگرام نہیں چلا۔ اسی بنا پر اسے گینٹربک آف انفرمیشن میں دوسری جگہ ملی ہے۔

پھر چند کہ اشفاق صاحب پرنٹ میڈیا کے لیے بھی لکھتے تھے لیکن پھر ان کی زیادہ توجہ الیکٹرونک میڈیا کی طرف  
 تھی جس کی وجہ سے ان کے بہت سے قریبی دوست جن میں ممتاز مفتی اور اے حمید بھی شامل تھے، ان سے ہا خوش  
 تھے جن دوستوں کا استدلال یہ تھا کہ اشفاق احمد بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہے جو اپنی صلاحیتوں کو الیکٹرونک  
 میڈیا پر متعلق کر رہا ہے۔ جو چیز ہوا کی لہروں سے سننے والے تک پہنچی، وہ ایک بار نشر ہونے کے بعد ختم ہوگئی جبکہ چھپی  
 ہوئی چیزیں ہمیشہ کے لیے رہ جاتی ہے۔ اشفاق صاحب کے تقریباً سبھی ڈرامے اور فیچر تلقین شاہ آج کتابی صورت میں بھی  
 موجود ہیں اور ان کے ٹی وی ڈرامے سی ڈی پر اور ریڈیو فیچر کے کیسٹ بھی بازار سے مل جاتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق احمد شاید وقت سے کوئی پچیس تیس سال پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ ان کا ذہن آنے والے  
 ہی دور تک دیکھ سکتا تھا، عام ذہن وہاں تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر اور ابلاغ کے  
 دور شروع آنے کے بعد کتابوں کی اہمیت ویسی نہ رہے گی جیسی پہلے ہوا کرتی تھی۔ شاید اسی لیے انہوں نے خود کو ٹیلی  
 ویژن اور ریڈیو کے ساتھ عام لکھنے والوں سے بہت پہلے وابستہ کر لیا۔ ان پر تنقید کرنے والے بعد میں خود بھی الیکٹرونک  
 میڈیا کے لیے لکھنے والوں میں شامل ہو گئے۔

نومبر 1964ء میں جب پاکستان ٹیلی ویژن نے ناہور سے اپنی تجرباتی نشریات کا آغاز کیا تو اس وقت اس  
 ٹیلی ویژن کے مدیران، ذکا درانی مرحوم (جن کا چھانگہ مانگے میں ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا) فضل کمال مرحوم اور محمد  
 عیسیٰ عیسیٰ ذہن اور محنتی پروڈیوسر تو موجود تھے لیکن پروگراموں کے میزبان، ڈرامہ لکھنے والوں اور اداکاروں کی سخت  
 کمی تھی۔ ویرن کی تجرباتی نشریات کا آغاز ہو گیا لیکن کسی ایسی اکیڈمی یا ادارے کے فقدان کے باعث جو ٹیلی ویژن  
 کے لیے لکھنے والوں، فنکاروں یا میزبانوں کی تربیت کر سکے، یہ کام بھی ٹیلی ویژن پروڈیوسروں اور اشفاق احمد کے حصے  
 میں آ گیا۔

انہوں نے جہاں ٹیلی ویژن کے لیے بڑے جاندار ڈرامے لکھے، وہیں انہوں نے ریڈیو، سٹیج اور باہر سے لیے  
 گئے نغموں کی ایک ایسی ٹیم بنا دی جس نے اپنی محنت اور لگن سے ٹیلی ویژن ڈراموں کو عوامی مقبولیت بخشنے میں بھرپور  
 حصہ لیا۔ ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور میں جہاں اشفاق صاحب نے ”نااہلی تھلے“ ”اچھے برج لاہور دے“ اور  
 ”میرا بے“ جیسے مقبول سلسلے وار کھیل تحریر کیے وہیں فرید احمد، ایوب خاں، قمر چوہدری، راقم الحروف، نذیر حسین، انور  
 شاہ، سلطانہ، ڈاکٹر جہانگیر، جمیل بھل اور عطیہ شرف کے ساتھ بے شمار دوسرے فنکاروں کو بھی ٹیلی ویژن ڈراموں

میں متعارف کروایا۔

ڈرامہ لکھنے کے بارے میں اشفاق صاحب بتایا کرتے تھے کہ میں جب مکالمے لکھتا ہوں تو پہلے میں خود بولتا ہوں تاکہ اندازہ کر سکوں کہ کہیں بولنے والے کو وہ مکالمے ادا کرنے میں کوئی دشواری تو محسوس نہیں ہوتی۔ جب وہ کسی فنکار کو کوئی کردار ادا کرنے کے لیے کہتے تو فنکار کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے کردار لکھتے تاکہ اسے ادا کرنے والے کو مشکل نہ پڑے۔

اشفاق صاحب کے ڈراموں میں مضبوط پلاٹ کے ساتھ ساتھ کردار بھی بڑے جاندار ہوتے تھے۔ ان میں انسانی نفسیات سے آگاہی، گہرا مشاہدہ اور مختلف طبقات سے میل جول ان کا مددگار ثابت ہوتا تھا۔ ٹیلی ویژن تقریباً چالیس سال تک اشفاق صاحب کے زیر اثر رہا۔ نئے لکھنے والوں نے بھی اشفاق صاحب کے دیئے ہوئے کوئی اپنایا۔ لوگ آج بھی پوچھتے ہیں کہ اب ویسے ڈرامے کیوں نہیں ہوتے کیونکہ آج کے ٹی وی ڈرامے مسہل اعتبار سے گراڈت کا شکار ہیں۔

ٹی وی کے ابتدائی دور میں اشفاق صاحب ڈرامہ لکھتے تو کرداروں کے سامنے ان فنکاروں کے نام بھی لکھتے جن فنکاروں کو وہ ان کرداروں کے لیے منتخب کرتے۔ پروڈیوسر بھی اشفاق صاحب کی خواہش کے مطابق انہیں منتخب کرتا۔ جب فنکاروں کو یہ علم ہوا کہ کاسٹنگ تو اشفاق صاحب ہی کرتے ہیں تو انہوں نے مرکزی اردو ہونٹ لگانے شروع کر دیئے جہاں اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل تھے۔

ہمارے ملک میں فنکار تو ہوتا ہی غریب ہے اور پھر اس دور میں تو فنکار تھے بھی بہت زبوں حالی کا شکار اپنی ضرورتیں اور مجبوریاں۔ ہر ایک چاہتا کہ اسے آنے والے Episode میں ضرور کام دیا جائے۔ خاص کر فنکاروں کو صرف ایک ڈرامے میں تو نہیں سویا جاسکتا تھا۔ جب کوئی ایسا فنکار جسے کام نہ ملا ہوتا اشفاق صاحب اشفاق صاحب کہتے کہ یا اس بار تو تم رہ گئے، اگلی بار تمہاری باری ضرور آئے گی۔ جب وہ فنکار وعدہ لے کر رخصت ہوتا تو اشفاق صاحب فون پر اپنے پی اے شریف صاحب سے کہتے۔ ”شریف الدین! یہ صاحب کس پاس سے گزر رہے ہیں انہیں روکو اور ایک نفاذ دے دو۔“

ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور میں فنکار کو پینتالیس روپے کا چیک ملا کرتا تھا۔ شریف الدین صاحب کے پاس اس قدر رقم ہوتی کیونکہ اشفاق احمد فنکاروں کی مجبوریوں اور ضرورتوں سے آگاہ تھے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے۔ داستان سرائے جا چکے تھے۔ اس دور میں اشفاق صاحب نے بہت سے باکمال سلسلہ وار کھیل لکھے جن میں ”حیرت کدہ“ ”ایک محبت سوانح“ ”تو تا کہانی“ ”اور ڈرامے“ ”ننگے پاؤں“ ”من چلے کا سودا“ کے ساتھ ساتھ شمار اور ڈرامے بھی لکھے۔ ہمارے معاشرے میں پارٹی بازی کی بہت اہمیت ہے۔ سیاست دانوں اور تاجروں سے ادیبوں تک سب گروہ بندی اور پارٹی بازی پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اشفاق احمد خاں نے کبھی کوئی گروپ بنانے یا کسی میں شامل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا سب سے بڑا گروپ یا پارٹی ان کی محنت تھی۔

اشفاق صاحب سکرپٹ لکھ کر گھر کے اخراجات پورے کرتے۔

یہ دن میں نے دیکھا اشفاق صاحب کے بیڈروم کے ایک کونے میں ایک روسٹرم پڑا ہے۔ میں نے پوچھا صاحب یہ روسٹرم کیسے آ گیا بیڈروم میں۔ کہنے لگے کہ آج لکھنے کا کام بہت زیادہ ہے۔ دن بھر تو مہمانوں کا تانتا ہے۔ رات کو جب کرسی پر بیٹھ کر لکھنا شروع کرتا ہوں تو نیند آ جاتی ہے۔ اس لیے یہ ہی فیصلہ کیا کہ کھڑے ہو کر لکھ جائے۔ آخر گھر کے اخراجات بھی تو پورے کرنے ہیں۔

اشفاق صاحب کے کچھ مہربان یہ بھی کہتے ہیں کہ اشفاق احمد ایک بہت چالاک انسان تھا جس نے پاکستان کی سے قائمہ اٹھایا یا یہ کہ حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ان کے نظریات میں بھی تبدیلی آ جاتی تھی۔ میرا خیال ہے یہ ہوگا کرتے ہیں جنہوں نے اشفاق صاحب کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ جن لوگوں نے اشفاق احمد کو قریب سے دیکھا ہے وہ یقیناً ان باتوں سے متفق نہیں ہوں گے۔ حکومتوں کے ساتھ بدلنے والے تو کروڑوں میں کھیلتے ہیں، لگے لگے گھر کے اخراجات پورے نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ ایک بات کہا کرتے تھے کہ ”ٹھنڈا تپا پانی ملد ار ہو سے تے دور و تپاں ایس توں ودھ انسان وی ہو رکی لوڑاے۔“

دو دفعہ وقت کے حاکموں نے انہیں وزیر بننے کی پیشکش کی لیکن انہوں نے دونوں مرتبہ انکار کر دیا۔ پہلی بار ۱۹۷۱ء کے دور میں اور دوسری بار نواز شریف صاحب کے دور حکومت میں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں تو اخبارات میں بھی شائع ہو گئیں کہ اشفاق صاحب بہت جلد اپنے عہدے کا حلف اٹھانے والے ہیں۔ میں نے بھی خبر پڑھی تو صاحب کو ٹیلی فون کر کے مبارکباد دی۔ ”خال صاحب کسی تے وزیر بن رہے ہے۔“

کہنے لگے ”توں تے دوست ایں تو سیوں بد دعائیں دے رہا ہے۔“

میں نے عرض کی ”لوگ تو وزیر بننے کی تمنا کرتے ہیں۔ آپ الٹ بات کر رہے ہیں۔“

کہنے لگے ”ریاض میاں! نہ تو میں نے مال بنانا ہے اور نہ شہرت کی کوئی تمنا ہے۔ شہرت اللہ نے پہلے ہی بہت

کے لیے اور گزارے کے لیے ہم میاں بیوی کما ہی لیتے ہیں۔ پھر میں کیوں اپنی آزادی گنواؤں۔“

میں نے کہا ”بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن وزارت، وزارت ہی ہوتی ہے۔ اُس کا اپنا چمکا ہے۔“

کہنے لگے ”میں اور تیری آپا کبھی کبھی شاد عالمی جاتے ہیں۔ وہاں ایک بڑھیا سردیوں میں سروسوں کا ساگ پکا کر

کے ہم وہ ساگ اس بڑھیا کے پاس پیڑھیوں پر بیٹھ کر کئی کی روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ جو چمکا اس بڑھیا کے

کے سروسوں کے ساگ کا ہے، وہ وزارتوں یا اداروں میں نہیں ہے۔“

میں نے پوچھا ”آپ صدر صاحب کو کیسے انکار کریں گے؟“

کہنے لگے ”تیرے بچے جنیں۔ یہی سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ حاکم وقت کا اصرار ہے کہ اسلام آباد چلے آؤ۔“

میں نے عرض کیا ”میں نے انکار ہے۔ دعا کرو کہ اس امتحان سے بخیر و خوبی نکل آؤں۔“

انقلاب سے کچھ عرصہ پہلے حکومت پنجاب نے انہیں علاج کے لیے پانچ لاکھ روپے دینے کی پیشکش کی لیکن

صاحب نے شکریے کے ساتھ اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شعیب بن عزیز سے کہنے لگے۔ ”بھائی اگر

میں نے چوہدری پرویز الہی کی رقم وصول کر لی تو میرے بیٹوں کو رنج ہوگا۔ ابھی علاج کی وہی کفالت کر رہے ہیں۔“

اشفاق صاحب کے افسانے، ڈرامے اور مضامین تو بہت شائع ہوئے لیکن کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ”کھٹیا وٹیا“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک دن میں اشفاق صاحب کو ملنے ان کے گھر آکر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے ”لے بھی ریاض محمود! تینوں ایک نظم سنائیے۔“ وہ ہمیشہ مجھے پورے نام سے ہی مخاطب کرتے تھے۔ میں نے پوچھا ”کس کی نظم ہے؟“ کہنے لگے ”میری۔“

میں نے عرض کیا کہ ”یہ شاعری کب سے شروع کر دی؟“ کہنے لگے ”تینوں تے پتہ ای اسے کہ میں کدی شاعری نہیں بنتی۔ پتہ نہیں کہاں پچھلے دنوں مینوں شاعری بھوت چڑھ گیا تے میں کوئی تی بہنتی نظماں لکھ چھڑیاں۔ اچھا گاں بعد وچ کریں، پہلا ایرہ نظم سن لے۔“

چھاؤنی آ لے ہل توں

پہلاں لنگیاں مندا

فیرنگی کڑی

فیرنگی چنی کار

پنھوں لنگی تیز گام

بندیاں نال بھری

ایڈھاسو بندن سی

میں چھٹی لے لئی۔

میں نے عرض کیا ”نحال صاحب! یہ تو کمال کی شاعری ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔“

کہنے لگے ”ریاض محمود! ایہہ ساریاں نظماں داورو لے داگواک پاسیوں آئیاں تے مینوں بھوانیاں دے ڈوبے پاسیوں نکل گئیاں۔ مُرد میں بڑا چارالا یا بڑی کوشش کیتی پراک مصرعہ وی میرے نیزے نہ ڈھکیا۔“

اشفاق صاحب کے ٹیلی ویژن ڈرامے اور ریڈیو پروگرام تلقین شاہ بھارت میں بھی اتنے شوق سے دیکھے سنے جاتے تھے جتنے پاکستان میں۔ ایک بار بھارت کے معروف گلوکار ہنس راج ہنس پاکستان تشریف لائے۔ ایک تقریب میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور کہا ”میں آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔“

ہنس راج کہنے لگے ”میں آپ کو جانتا ہوں۔“

مجھے حیرت ہوئی، پوچھا ”کیسے؟“

کہنے لگا ”میں نے تو گانا سیکھا ہی لاہور ریڈیو سٹیشن کو سن کر ہے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ لاہور ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرام ”پنجابی دربار“ میں تمہارے گانے نشر ہوتے ہیں۔ مجھے یقین نہ آیا لیکن جب میں نے لاہور ریڈیو سے شروع کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صاحب سچ کہتے تھے۔“

میں نے کہا ”ہلے یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا کہ آپ مجھ سے واقف ہیں۔ اب یہ فرمائیے کہ انٹرویو کے لیے کب

تھے۔“

سراج کہنے لگے ”اس بار تو مشکل ہے لیکن اگلی بار آؤں گا تو ضرور انٹرویو ریکارڈ کراؤں گا۔ ابھی پروگرام شروع ہوا ہے۔ پھر گلوکار شوکت علی کے ہاں کھانا ہے اور صبح پانچ بجے میری واپسی ہے۔“

سراج نے کہا ”اگلی دفعہ جب آپ آئیں تو انٹرویو ضرور ہوگا۔“

سراج کہنے لگے ”ایک اور خواہش تھی جو میں ساتھ لے کر آیا تھا لیکن وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔“

”وہ کیا خواہش تھی؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگے۔ ”لاہور میں ایک بہت بڑا دہی جیور ہوتا ہے۔ اُن کے ورژن کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”آپ انہیں کیسے جانتے ہیں۔“

کہتے لگے ”اُن کی ساری ویڈیو، آڈیو پیسٹیں میرے پاس محفوظ ہیں۔“

میں نے کہا ”میں انہیں آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔“

میں راج کہنے لگے ”اُن سے کہیے گا کہ ایک پاگل بھارت سے آیا تھا اور آپ کے چرن چھونے کا خواہش مند تھا۔“

”بے گناہ ہونے کے باعث حاضر نہ ہو سکا لیکن آؤں گا ضرور۔“

میں راج اپنے وعدے کے مطابق اشفاق صاحب کو ملنے تو نہ آ۔ کا لیکن اس نے بمبئی سے اصغر ندیم سید کے ہاتھ ایک شال اور ایک ہزار روپیہ نذرانے کے طور پر ارسال کیا۔ اشفاق صاحب کے انتقال کے بعد ایک روز میں راج سے گفتگو ہوئی تو اس نے اشفاق صاحب کی رحلت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”بڑا قیمتی بندہ تھا۔“

”مزاولیہ“ پروگرام جسے اشفاق صاحب ہر ہفتے پنی ٹی وی سے پیش کرتے تھے، ساری دنیا میں بننے والے اردو کے سب سے انتہائی مقبول تھا۔ جب اشفاق صاحب نے یہ پروگرام ابھی شروع نہیں کیا تھا تو ایک دن اس خاکسار کو

”میں ٹیلی ویژن سے ایک پروگرام شروع کر رہا ہوں جس میں میں چند لوگوں کے سامنے پچیس منٹ گفتگو کروں گا۔“

میں نے عرض کی ”حضور یہ پروگرام کامیاب نہیں ہوگا کیونکہ کون پچیس منٹ تک صرف ایک ہی آدمی کو سن سکتا

کہنے لگے ”تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ میرا قریلی داستان گو بھی تو ساری ساری رات ہزاروں کے مجمع سے بات کرتا اور کوئی ایک آدمی بھی پنڈال چھوڑ کے نہ جاتا تھا۔“

جب پروگرام شروع ہوا تو میرا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا اور ”مزاولیہ“ نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اشفاق احمد بنیادی طور پر ایک داستان گو تھا۔ انہوں نے جب رسالہ شروع کیا تو اس کا نام ”داستان گو“ رکھا۔ اردو میں یہ پہلا رسالہ تھا جو ریڈرز ڈائجسٹ کے ماگزین پر چھپتا تھا۔ اس کا مواد، سرورق اور چھپائی نہایت



اعلیٰ درجے کی تھی۔ ادبی حلقوں میں اس رسالے نے دھوم مچا دی۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے محنت کر کے ایک تبصرہ تو نکال دیا لیکن دونوں میاں بیوی اس کے تجارتی پہلو سے ناواقف تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ”داستان گو“ بند ہو گیا۔ اشفاق احمد نے ماڈل ٹاؤن میں گھر بنایا تو اس کا نام ”داستان سرانے“ رکھا۔

پروگرام ”زاویہ“ میں ان کی گفتگو کا انداز جس کے سب لوگ دیوانے تھے، داستان گو جیسا کہ صاحب پروگرام ”زاویہ“ کا اختتام اس جملے پر کیا کرتے تھے۔ ”اللہ تعالیٰ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے۔“ تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔“ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ بات صرف کہتے ہی نہیں تھے بلکہ اس پر عمل بھی کرتے۔ ہمیشہ دوسروں کے کام آتے۔ ان کی پریشانیوں میں ان کی مدد کرتے لیکن انداز ایسا اپنائے رکھتے جیسے ان کا کچھ تعلق ہی نہ ہو یا انہوں نے کسی کے لیے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ جب کوئی خاں صاحب کے پاس اپنی کوئی پریشانی یا مشکل آتا تو وہ اسے اس انداز سے سنتے گویا ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔

اپنی پریشانی لے کر آنے والا ناپوس ہو جاتا کہ لوجی میں سخت مشکل میں گرفتار ہوں لیکن اشفاق صاحب توجہ سے میری بات تک نہیں سنی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ جب کوئی پریشانی یا مشکل بیان کر چکے تو ہمیں اس کی ندر ہتی۔ خاں صاحب کی ہو جاتی اور وہ اس پریشان شخص کی امداد کے لیے کمر بستہ ہو جاتے۔ جب اس کا کام تھب بھی ایسے ظاہر کرتے کہ سب اتفاق سے ہو گیا۔ اس کام کے ہونے میں میری کسی کوشش کا دخل نہ تھا۔ کسی کی بوجھ ڈالنا انہیں ناپسند تھا۔

ریڈیو کے ایک بڑے بہت فنکار کا انتقال ہو گیا۔ ہمارے معاشرے میں فنکار خواہ وہ کتنا ہی نامور ہو مشکل سے ہی گزر رہا کرتا ہے۔ اس فنکار کی موت کے بعد اس کی بیوی بچوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ خاں صاحب اس فنکار سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ مرحوم فنکار ریڈیو سے بحیثیت سٹاف آرٹسٹ منسلک تھے۔ آج کل تو ان کے ملازمین کی یہ کیلگری ہی ختم کر دی ہے لیکن ان دنوں میں سٹاف آرٹسٹ کو ایک مقررہ تنخواہ ہوتی تھی۔ کوئی میڈیکل گریجویٹ یا پشٹن اوانڈ کی جاتی تھی۔

اشفاق صاحب نے کوشش کر کے اس فنکار کے گھر والوں کے لیے وظیفہ منظور کروایا۔ ہر ماہ خود بھی امداد کرتے۔ اس فنکار کی بچیوں کی شادیوں میں بھی اشفاق صاحب اور اس خاندان کی بھرپور اعانت کی۔

ایک اور نامور ڈرامہ نگار اور صدا کار جن کا بہت شہرہ تھا، انتہائی دل پریشانیوں کا شکار تھے۔ خاں صاحب نے ماہ ان کی مالی امداد فرماتے، لیکن امداد کا انداز یہ تھا کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتے۔ اتفاق سے میری نظر اس خط پر پڑ گئی جو ان ڈرامہ نگار صاحب نے شکریے کے طور پر اشفاق صاحب کو لکھا تھا، جس سے صاحب کا حال معلوم ہوئی۔

بہت سے بچے اشفاق صاحب کے ہاں گھریلو ملازم کی حیثیت سے آئے تھے لیکن داستان سرانے میں سے سلوک ایسا ہوتا گویا وہ اسی گھر کے بچے ہیں۔ وہ گھر کے باقی افراد کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ آپا نہ یہ پڑھاتیں۔ پڑھائی کے سارے اخراجات ادا کرتیں۔ جب وہ پڑھ گئے تو ان کو مختلف جگہوں پر ملازمتیں دلوائیں۔

ت زندگی بسر کر رہے ہیں۔

خاں صاحب مہمان نواز بہت تھے۔ خود بھی خوش خوراک تھے اور دوسروں کو بھی کھلا کے خوش ہوتے تھے۔ سیخ  
بہت پسند فرماتے تھے۔ کھانے کے معاملے میں میرا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ غالباً ہمارے تعلقات کی  
بھی خوش خوراک ہی تھی۔ کسی زمانے میں چونا منڈی میں خلیفہ کباب فروش کے ہاں پہنچے ہوتے اور کبھی موچی  
کے سامنے کھاپینے کے ہاں اور کبھی چھاؤنی میں ماچھے کے کبابوں سے لطف اندوز ہوتے۔ بیماری کے دنوں میں  
کے بیرونی کوششوں کے باوجود اشفاق صاحب کچھ کھانے پر آمادہ نہ ہوتے۔

میں نے ایک دن عرض کی ”خاں صاحب! ایسے تو بہت کمزوری ہو جائے گی۔“

کہنے لگے ”میرے سامنے گوشت اور شور بار کھ دیا جاتا ہے۔ میں اسے کیا کھاؤں۔ کوئی کباب ہوں یا نکلے تو  
کھانے پر آمادہ ہو جائے۔“

میں نے ان کی خواہش پر کئی جگہوں سے کباب لاکے انہیں کھلائے لیکن خاں صاحب کو پسند نہ آئے۔

ایک دن کہنے لگے ”ریاض محمود! بروے دکھ کی بات ہے کہ لاہور ایب شہر ہو لیکن یہاں کوئی بھی اچھا کباب نہیں

جو پرانے تھے وہ یا تو کام چھوڑ گئے یا ان کا معیار گر گیا اور جو نئے ہیں ان کا تو سرے سے کوئی معیار ہی نہیں۔

کے دنوں میں کبھی کبھی اشفاق صاحب اپنے نسخے کے مطابق سیخ کباب لگایا کرتے تھے۔ آپا قدسیہ سیخ پر قیمہ لگاتیں  
خاں صاحب ان کو کونوں پر پکاتے۔ ایسے لذیذ کباب تیار ہوتے کہ جس نے بھی کھائے پھر کھانے کی تمنا کی۔

پھر میں آٹھ مہمان آجائیں پاؤں۔ اگر کھانے کا وقت ہو گیا تو وہ کھانا کھائے بغیر نہیں جاسکتے تھے۔ آپا قدسیہ  
موتیرا ہندی روٹی سنبھال لیتیں۔ ایسے ایسے لذیذ کھانے تیار ہوتے کہ مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔

کبھی کبھی اشفاق صاحب کے ہاں مہمانوں کے درمیان کھانا پکانے کے مقابلے بھی ہوتے۔ جو سب سے لذیذ  
کے اشفاق صاحب اپنے دستخطوں والا سورہ پے کا نوٹ دیتے۔ قلفے کا ساگ گوشت پکا کے ایک بار میں نے بھی

تھا۔

خاں صاحب ایک انتہائی ذہین، پڑھے لکھے، جدید نظریات پر یقین رکھنے والے اور مشرقی طرز زندگی سے متاثر  
تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی علوم، تہذیب اور ثقافت سے بھی بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی لگاؤ انہیں

کو حشر پیا کسا تار بتا۔ نور والوں کے ڈیرے میں جب ان کی ملاقات ایک باباجی سے ہوئی تو ان کے خیالات میں  
میں نے آگئی اور بقول اشفاق صاحب ”نور والے ڈیرے کے باباجی سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ اصل گیان، علم اور

سیر ہمارا ستہ دکھانے کا نسخہ تو ان بابوں کے پاس ہے۔“

یہ بابے مادی ترقی کے مخالف نہیں لیکن انسانی شخصیت کو سنوارنے اور روحانی ترقی کا جو درس ان کی باتوں میں  
ہے وہ کہیں اور سے نہیں ملتا۔ باباجی کی باتوں اور اتوال کی جھلک اشفاق صاحب کی تحریروں میں بھی نظر آنے لگی اور

میں ملاقاتوں اور باتوں نے انہیں ”من چلے کا سودا“ ایسا سیریل لکھنے پر راغب کیا۔

دوسروں کی تکلیف، پریشانی یا دکھ کا حال ضرور سنتے اور موقع محل کی نسبت سے اُسے مشورہ بھی دیتے تھے۔ دکھ یا پریشانی کا کسی سے ذکر نہ کرتے۔ اُن کے پتے کا آپریشن ہوا تو معلوم ہوا کہ پیکر پارگر تھ ہے۔ سرجن نے احمد کے ہتھلے صاحبزادے کو بتایا کہ یہ ملینکٹ ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان صرف چند ماہ کا فاصلہ ہی رہ گیا ہے۔ انیس خاں نے پوچھا۔ ”ابو کو علم ہے۔“

سرجن نے کہا ”ہم نے تو نہیں بتایا لیکن اشفاق احمد جیسے ذہین انسان سے کوئی بات چھپ نہیں سکتی۔“

بات سے آگاہ ہیں۔“

اور اشفاق صاحب یقیناً سب کچھ جانتے تھے لیکن کبھی کسی سے ذکر تک نہ کیا کہ میں کینسر ایسے موذی شکار ہوں۔ ہمیشہ یہ ہی کہتے کہ پار لوگ تو پتے کا آپریشن کروا کے آٹھ دس دن میں بھسے چنگے ہو جاتے ہیں لیکن میرے کچھ طویل ہی ہو گیا ہے۔ جب بھی کوئی پوچھتا ”اب طبیعت کیسی ہے؟“

تو یہی کہتے ”اب پہلے سے بہتر ہوں۔ بس کمزوری ہے، اللہ سنے جا یا تو یہ بھی جاتی رہے گی۔“

بات صرف اتنی تھی کہ اپنے بیماروں، عزیزوں یا دوستوں کو اس موذی مرض کا بتا کے پریشان نہیں کرتے تھے۔ کبھی بلکہ آخری دن تک اپنے قریبی سے قریبی دوست سے بھی اپنے مرض کے متعلق کچھ نہ کہا۔

سات ستمبر کی صبح کو جب وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوئے تو رخصتی سے ذرا پہلے آپا قدمیہ کے پریشانی کے آثار دیکھ کر کہنے لگے۔ ”قدیر! گھبراٹھا یا پریشان مت ہونا۔ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہو رہا ہے۔“ میں اور اشفاق صاحب صبح کے وقت ڈی بلاک فٹ بال گراؤنڈ ماڈرن ٹاؤن میں سیر کیا کرتے تھے۔ دونوں طرف پختہ سڑکیں تھیں اور لوگ پختہ سڑکوں پر ہی سیر کیا کرتے کیونکہ گراؤنڈ ایک دو چٹھوں سے قدرے بڑا تھا۔ اشفاق احمد اس گراؤنڈ کو اپنی محبوب گراؤنڈ کہا کرتے تھے۔

میں نے کئی دفعہ عرض کی ”خاں صاحب! یہ گراؤنڈ ناہموار ہے۔ کیوں نہ ہم بھی سڑک پر چہل قدمی کیا کرتے لیکن خاں صاحب نہ مانے۔ اب یہ اتفاق ہی ہے کہ خاں صاحب کی اسی محبوب گراؤنڈ میں ان کا جنازہ ہونا ہوئے اور وہیں چالیسواں۔ اشفاق صاحب بنیادی طور پر ایک پُر امید انسان تھے اور ہر معاملے کا روشن پہلو دیکھتے لوگ جب ملکی حالات سے پریشان ہو جاتے تو ان سے پوچھتے ”خاں صاحب! اب کیا ہوگا؟“

اکثر اُن کا جواب یہ ہی ہوتا ”اس میں کوئی شک نہیں حالات بہت خراب ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ میں سے بہتری کی کونسل پھولے گی۔ انشاء اللہ پاکستان کا شمار دنیا کے امیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں ہوگا۔ دولت تو مجھ میں بہت آجائے گی لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم مادیت کی دوڑ میں پڑ کے اپنی روحانی اقدار سے منہ نہ موڑ لیں۔“

ایک دن بتانے لگے ”پرویز مشرف نے مجھے ایوان صدر میں بلوایا۔“

جب گفتگو شروع ہوئی تو مشرف نے کہا ”اشفاق صاحب! ملکی حالات کی بہتری کے لیے کوئی مشورہ دے۔“ اشفاق صاحب کہنے لگے ”خلق خدا دکھی ہے لیکن کوئی اُس کا دکھ سننے والا نہیں ہے۔ لوگ نہ روئی، نہ سمجھے

کپڑا نہ مکان۔ وہ صرف ایک کندھا چاہتے ہیں جس پر سر رکھ کے وہ دو آنسو بہا سکیں۔“

کئی فرمانے میں ہمارے بابے دکھوں کی بات سنتے تھے۔ انہیں حوصلہ اور مشورہ دیتے تھے لیکن اب وہ بابے بھی...

رات ستمبر 2004ء کی سوگوار شام کو جب ہم ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں خاں صاحب کو سپرد خاک کر کے... تھے تو رہ کر میرے دل میں خیال آ رہا تھا کہ آج آخری بابا بھی ہم سے رخصت ہو گیا۔ وہ کندھا بھی ہمارا... جس پر سر رکھ کے لوگ دو آنسو بہا لیا کرتے تھے۔

معلم کولسری گو 36۔ جی کا حصہ نہ تھے لیکن وہ اردو بورڈ سے منسلک تھے۔ میں ان سے کبھی 36۔ جی میں نہ... مرانے بن گیا تو کولسری صاحب، خاں صاحب سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی داستان بعد میں رقم کروں گی۔... صاحب کا مضمون دیکھیے۔

اشفاق صاحب... ڈائریکٹر جنرل اردو سائنس بورڈ

اشفاق صاحب کی رحلت کے بعد تین چار مواقع پر مجھے اپنے تاثرات بیان کرنے کو کہا گیا مگر ہمت نہ پڑی کہ... ہی ہونٹ ساکت ہو جاتے اور قلم گم۔ نین ویران کے منفرد کمپیئر نور الحسن نے اسلام آباد میں اشفاق... لیے ہونے والے ریفرنس میں شرکت کی نہ صرف دعوت دی بلکہ ہوائی جہاز کی سیٹ بھی بک کروالی۔ نور الحسن کو... صاحب کے جنازے میں آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے دیکھا تھا۔ سوان کا کہنا میرے لیے بے حد اہمیت کا... کے بعد ناہور ٹیلی ویران پر منعقدہ پروگرام میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ میں اپنے گوشہ تنہائی میں چپ... اشفاق صاحب کی یاد میں شائع ہونے والی مختلف کتب اور میگزینز میں کچھ لکھنے کو کہا گیا۔ قلم اور زبان مجھ... بھی تک قلم چھوڑے تو زے ہوئے ہوں، آخر کیا لکھوں اور کیسے لکھوں۔

پہنچی سن کالج کے پروفیسر عرفان علی شاد کے افسانوں کی کتاب ”دھوپ کی لکیر“ شائع ہوئی تو انہوں نے ازراہ... مجھے بھی عطا کیا۔ پہلا افسانہ ”دھوپ کی لکیر“ بے پناہ ڈرامائی کیفیات لیے ہوئے تھا، میں نے تجویز کیا کہ... کہنے لگے کہ جناب اشفاق احمد بھی یہی فرما رہے تھے، ممکن ہو تو آپ اپنی کوشش کریں۔ میں نے... اور پھر ہم وہ ڈرامائی تشکیل لے کر اشفاق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ اشفاق صاحب سے... تھی جو عرفان بھائی کے توسط سے اردو سائنس بورڈ میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ انہوں نے میز کے نیچے... ہمارا طرف بڑھایا جس میں بھنے ہوئے پننے تھے اور خود میرے لکھے ہوئے ”ڈرامے“ کو الٹ پلٹ کر... تھے۔

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“ انہوں نے پہلا سوال کیا۔ میں نے بتایا کہ ”ساہیوال کا“۔ فرمانے لگے۔... میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ منیر نیازی نے آ کر دھوم مچا دی۔ انہوں نے دو تین صفحے دیکھے اور پلندہ میز پر رکھ دیا۔ کچھ... چنے چباتے رہے۔ پھر بولے ”بھائی تم نے تو بالی وڈ کے لیے لکھ دیا۔ یار لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ یہ سین... پر فلما یا جائے تو وہ سٹوڈیو میں بانس گاڑ لیتے ہیں۔ یہ ڈرامہ نہیں ہو سکے گا۔ بہر حال تمہاری کوشش اچھی... تھی۔“

ہے۔“ پھر انہوں نے بیل بجائی یعنی ہمارا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری کوشش مضحکہ خیز ہونے لگی ہے۔ ناکام تھی مگر انہوں نے مجھے دل شکستہ نہیں ہونے دیا۔

کچھ مہینوں کے بعد مجھے اردو سائنس بورڈ میں ریسرچ آفیسر لسانیات کی نوکری مل گئی۔ وہ مسکرائے۔ تو مجھے تمہارے ڈرامے کا معاوضہ مل ہی گیا۔“ میں اندر ہی اندر بہت خوش تھا کہ ان کے قریب رہ کر ڈرامہ نویس کی کافرنگی سے تیسرے ہی روز وہ میری میز پر آئے اور یہ کہتے ہوئے کہ ”ڈرامے اور اس کا خط نکال ڈھن سے اور دفتر کے دوسرے طرف پوری توجہ دو۔“ آگے بڑھ گئے۔ مجھے دھچکا سا لگا مگر کھلا کہ دفتری امور میں کسی قسم کی کاہلی یا عدم دلچسپی کوئی نہیں کر پاتے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ایک دن کے لیے شہر سے باہر گئے تھے۔ اگلے روز شاید کسی نے کہہ دیا کہ وہ دفتر نے سستی کو سونپ دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے طلب کیا۔ ”کل تم نے کیا کام کیا؟“ میں اس سوال پر حیران ہوا۔ میرے چہرے پر چھپ گئی، ساتھ ہی ناخوشی کی ہلکی سی لالی بھی تیر گئی۔ میں آئیں یا نہیں شائیں کر کے باہر اپنی جگہ اڑا کاڑھ سے آئے ہوئے کچھ دوست براجمان تھے اور اس کے ساتھ ہی دفتر میں چھٹی کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ ہو گیا۔ رہ گئے میں اور میرے مہمان۔ میں نے چوکیدار سے چائے لانے کو کہا۔ چائے آئی تو اشفاق صاحب آگے کے ایک ہاتھ میں بسکٹ کی پیٹ اور دوسرے ہاتھ والی پیٹ میں نمک پارے اور اکبرز میں میں شدت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے ”یار کیا کروں میں ماں بھی بہت اچھی ہوں۔“ وہ پینٹیں دھر کے چلے گئے۔ میں مہمان کافی دیر تک کوئی بات نہ کر سکے۔

ان دنوں دفتر اڑھائی بجے بند ہو جاتا تھا، اڑھائی بجتے ہی لوگ باگ گھروں کی راہ لیتے۔ چوکیدار پاس آ جاتا اور میں دفتر کے پچھواڑے چوکیدار کے کمرے میں گھس کر سو رہتا، البتہ اشفاق صاحب اپنے کمرے کام کرتے رہتے، کام نمنا کر مطالعے میں مستغرق ہو جاتے، مطالعے سے قدرے تھک جاتے تو نیپ ریکارڈ آگے بیڈفون کانوں سے لگا کر آنکھیں موند لیتے اور کوئی لیکچر سننے لگتے۔ پھر نیل بجاتے، چوکیدار بھاگا بھاگا آتا۔ پوچھتا جاگ گیا ہے۔ پشمان چوکیدار طوطی مرجان تیزی دکھاتا۔ ”صاحب اٹھاؤں؟“ ”نہیں، جب جاگ جائے انہوں نے کبھی مجھے جگا یا نہیں۔ میں اپنی مرضی سے پانچ بجے کے قریب بیدار ہوتا تو مرجان بتاتا کہ صاحب پر تھے۔ میں ان کے کمرے میں جاتا۔ تب وہ چوکیدار سے چائے لانے کو کہتے اور کمرے میں پھیلی روشنی میں شفقت شامل ہو جاتا۔ وہ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے۔ تب وہ میرے پاس نہیں بزرگ ہوتے اور میں بروخوردار، نیاز مند، عزیز مگر اگلی صبح جب دفتر لگتا تو اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل ہوتے اور خاکسار محض ریسرچ آفیسر جیسا کہ میں نے عرض کیا اشفاق صاحب دفتری معاملات میں کسی قسم کی رورعایت نہ کرتے۔ اذیت دہانی ہوتی ادھر ایک پیلے رنگ کا کاغذ میز پر آ جاتا جس پر ”ڈائریکٹر جنرل کی طرف سے سلام پہنچے“ تو چھپا ہوتا، ہاتھ کے قلم سے لکھی ہوتیں اور خاصی ”حوصلہ افزا“ ہوتیں۔ سو دفتری اوقات میں دفتر میں مکمل طور پر خاموشی ہوتی۔ میز پر اپنے کام میں مستغرق ہوتا۔ کبھی کوئی مہمان آ نکلتا تو ہال میں داخل ہوتے ہی گھبرا سا جاتا۔ پھر سرگوشی میں احوال پوچھتا اور بھاگ نکلنے ہی میں عافیت سمجھتا۔ تاہم ایک انتظام پسند ڈائریکٹر جنرل ہونے کے باوجود نہیں

میں کو ایک خاندان بھی بنا رکھا تھا جس کی بزرگ ترین ہستی وہ خود تھے۔ انہوں نے یہ کیسے manage کر رکھا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

صبح دفتر آتے تو سارے دفتر کا راؤنڈ لیتے، یہ موٹر سائیکلیں سیدھی قطار میں کیوں نہیں، میز ذرا آگے کھسک کر آواز کیوں دیتا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی باتوں پر نظر رکھتے تھے حتیٰ کہ اگر ڈاک کلرک کسی لفافے پر ٹکٹ چسپاں کرے تو میز ہا کر بیٹھتا تو بھی پکڑا جاتا "اسے اتارو اور ٹھیک سے چسپاں کرو۔"

ایک روز وہ علی الصبح دفتر آ گئے۔ سیدھے چوکیدار کے کمرے میں گئے جو چائے بنا رہا تھا۔ "ارے خان، آج تو پوڈیو نہیں؟" مرجان کھیانا سا مسکرایا۔ وہ اگلے روز بھی علی الصبح دفتر آئے، ان کے ہاتھ میں ایک ایک کھلم کھلا۔ چوکیدار نہیں دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ چیزیں تھا کر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

یہ سلسلہ دفتر کے ملازمین تک محدود نہ تھا۔ میں ایک ایسی تنگ و تنار ایک گلی سے بھی واقف ہوں جس کے ایک کمرے کے مکان میں ایک نابینا بزرگ رہتے تھے جن کی اپنی اولاد نہ تھی، ضعیف بیوی ان کی خدمت کرتی تھی، کمرے سے محروم ہو گئیں۔ آمدنی کا واحد ذریعہ اشفاق صاحب تھے۔ وہ ہر مہینے انہیں اتنی رقم پہنچا دیتے کہ مکان کے کرایہ کو دیکھنے پر تھکے اور ادویات وغیرہ کا بندوبست ہو جاتا۔ وہ خود بھی ان کی خبر گیری کے لیے کبھی کبھی اس تنگ و تنار میں پہنچتے اور کانی دیر ان کے پاس بیٹھے رہتے۔ چونکہ یہ بستی میری رہائش گاہ کے قریب تھی، اس لیے میں ان سے واقف تھا۔ اور بھی کئی تاریک گوشے ہوں گے جہاں ان کی مروت کا چراغ روشنی پھیلاتا تھا، مگر میں ان سے کبھی کبھی اپنے ایسے دکھانے کا ذکر تک نہیں کرتے تھے۔

نظام کی محفل میں، ہمیں اکثر خاموش رہنا، مگر ان کے مہربان رویے کی بنا پر آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ ایک شام یونہی بیٹھ کر دیا کہ "یہ جو آپ کا جملہ ہے کہ پاکستان کو کسی ان پرہ نے نقصان نہیں پہنچایا اور جس کا یار لوگ یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ آپ تعلیم کے خلاف ہیں تو....." میں ذرا سا جھجکا۔ انہوں نے چائے کی بھر پور چسکی لی تو میں نے کہا "تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے یہاں کے نظام تعلیم پر طنز ہے کہ وہ کیا مال پروڈیوس کر رہا ہے نہ کہ علم کی تلاش کے چہرے پر بھر پور مسکراہٹ پھیل گئی۔ فرمانے لگے "لو سا ہیوال کا پینڈو بات کو سمجھ گیا ہے اور ہمارے یہاں ہی برساتے چلے جاتے ہیں۔" ایک بار میں نے شہاب صاحب کی مخالفت میں شائع ہونے والی کسی کتاب کے بارے میں اشفاق صاحب خود مان گئے ہیں شہاب نامے کے کچھ اوراق انہوں نے سپرد قلم کیے، کچھ ممتاز مفتی نے اور کچھ ادیبوں نے۔ "حیرت ہے۔" وہ کہنے لگے "یار اچھے بھلے پروڈیوسر لوگ بھی طنز کو نہیں سمجھتے۔"

یہ ہم ایسے موقعوں پر ایک آدھ جملے ہی پر اکتفا کرتے تھے، بات بڑھاتے نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی کسی ہم عصر کے بارے میں کسی مخالفانہ تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ کبھی کوئی ایسا ذکر چھیڑا بھی تو انہوں نے ٹوک دیا۔ البتہ اپنے بابا فضل کی باتیں خوب لطف لے لے کر بیان کرتے۔ فیصل آباد میں مقیم ایک بابا جی کا ذکر بھی کیا کرتے کہ میں ان دنوں بہت پہنتا اور اکثر ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے حجرے میں میرے لیے ایک تہ بند اور گرتر رکھا ہوا تھا، جسے تبدیل کر کے ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ ایک دن میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ ایک زمیندار قسم کا شخص داخل ہوا۔ لمبا گرت

شرل شرل کرتا تہہ بند اور سر پر بڑا سا پگڑ، موچھیں تلوار مار کہ۔ آتے ہی باباجی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا یا اور بڑی خوش گویا ہوا۔ ”حضرت جی بس توبہ کر لی۔ قصہ ختم۔“ باباجی نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”رہا؟“ اس شخص نے بات کاٹ دی۔ ”قبلہ آپ نے غور نہیں فرمایا۔ مکمل توبہ قبلہ مکمل۔“ باباجی نے پھر توجہ نہ دی مخاطب ہونے لگے۔ وہ شخص پھر چرکا ”حضور واقعی، آپ کو غالباً یقین نہیں آتا، یقین مانیں۔ چھوڑ دیا۔ سب دیا۔“

باباجی بے زاری سے بولے ”یہ بھی چھوڑ دو۔“ اور وہ شخص ایک لچلے کے لیے پریشان ہوا، پھر کچھ کے میں نے اپنی بات بڑھادی۔ ”حضور کیسے گری کیا ہے، کیا مٹی واقعی سونا بن جاتی ہے؟“ ”بن سکتی ہے، کیوں نہیں سکتی۔“ باباجی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ایک منٹ۔“ وہ شخص اچھلا۔ لپک کر دروازے کو اندر سے چٹختی لگائی کے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔ ”باؤ جی کوئی کاغذ قلم نکالو، نسخہ لکھ لو۔ میں اور آپ بھائی وال۔ نہ آپ نسخہ کسی کو بتائے میں۔ شاباش، شاباش کاغذ قلم.....“ پھر اونچی آواز میں..... ”جی باباجی حضور وہ کیسے؟“ اس کا منہ بے کواڑ وہ طرح کھلاتا اور پلکیں جھپکنے تو جیسے اس کی فطرت میں ہی نہ تھا، سانپ کی طرح کہ اسی لیے تو وہ خزانے پہ بیٹھتا ہے نے فرمایا ”ایسے کہ..... سونے کو مٹی سمجھا جائے۔“ اور اس کے ساتھ ہی زمیندار صاحب گویا پتھر کے ہو گئے۔

اشفاق صاحب اکثر بڑی پر معنی باتیں کرتے مگر قدرت نے انہیں یہ ملکہ عطا کر رکھا تھا کہ وہ عام سی بات اپنے سحرانہ انداز سے انتہائی پر لطف اور فکر انگیز بنا دیتے مگر یہ سحری دفتری اوقات میں نہ ہوتی۔ وہاں صرف پوائنٹ بات کرتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اردو سائنس بورڈ کی مطبوعات کی فروخت سے دفتر کے لیے بلڈنگ تعمیر کی جو بلاشبہ ایک مثال ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی وہ کافی ذہانت اور محنت سے کام لیتے ایسی کتب شائع کرتے جو فروخت کے ریکارڈ قائم کر سکیں اور ان کی آمدنی سے کوئی ایسی کتاب شائع کرتے جو اپنے اور مواد کے اعتبار سے نام آور ہو جیسے ”ریگستانی نڈی کا ہضمی نظام“۔

بظاہر لگتا تھا کہ انہیں کسی کا دست طلب دراز کرنا پسند نہیں۔ میں نے ایک بار دبا دبا سا احتجاج کیا اور ہوا کہ آپ کا انداز کچھ میں نہیں آتا، کبھی آپ بن مانگے چیز دیتے ہیں، کبھی مانگے پر نہیں دیتے اور کبھی مانگے پر نہیں دیتے ہیں، آدمی کیا کرے؟ انہوں نے مسکرا کر بات بدلی اور کافی دنوں کے بعد اس بات کی وضاحت کی جس کی وضاحت نے اشارہ کیا تھا۔ تب کھلا کہ ایک چیز کے دبانے اور دوسری سوپنے میں حکمت تھی۔ یا رلوگ اس تقسیم پر ناخوش تھے کہ کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ جو صحیح سمجھتے وہی کرتے۔ دوستوں کو بہر حال بہت بعد میں احساس ہوتا کہ فیصلے ہی میں بھلائی تھی۔

مجھے کبھی کبھی ان کے دولت کدے مگر نہیں دولت کدے نہیں، گھر میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا۔ گھر میں لیے کہا کہ وہاں جو گھر بنا دیکھا، وہ اپنے گھر میں کبھی محسوس نہ کیا۔ مہمان جو بھی ہوں، جتنے بھی ہوں ان کی یوں کی جاتی کہ وہ مہمان نہ رہتے، گھر والے ہی بن کے رہ جاتے۔ پھر ان کا دسترخوان بھی عجیب ہوتا، پرانے دیہات کے لیے ہوئے۔ کبھی چڑی روٹی پہ چٹنی، کبھی باجرے کی روٹی دہی کے ساتھ، کبھی مکئی کی روٹی پر ساگ اور لسی۔ جدید

تو جوتے ہیں۔ یقیناً اس جمال میں بانو آ پا کے مزاج اور سنگھڑ پنے کا کمال بھی شامل ہوتا۔ تاہم یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ جس جاؤ کیونکہ وہ کام، کام اور کام کو بہر حال اہمیت دیتے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو انہوں نے جس قدر تخلیقی کام کیے تھے عمل نہ ہو پاتا۔ کئی الماریاں تو تلقین شاہ کے مسودات سے بھری پڑی تھیں۔ ناول، افسانے، نئی ویرن کے مسودے اور تقریریں جدا۔ ان مسودات سے جو جگہ بچتی اور وہ بھی کافی تھی، اس میں فرش سے چھت تک الماریاں ہی بھری تھیں۔ الماریاں نہایت اہم کتب سے بھری پڑی اور یہ کتب سجانے دکھانے کے لیے نہیں ہضم کرنے کے لیے تھیں بلکہ ان پر قدرت حاصل تھی۔

جب وہ اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل کے منصب سے سبکدوش ہو گئے تو زیادہ وقت گھر پر گزارتے تھے۔ ان کے معمولات میں فرق نہ آیا، صبح آٹھ بجے گھر کے کچھواڑے قائم ریکارڈنگ مشینوں میں جا بیٹھتے اور لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ان کے شہرہ آفاق ریڈیائی فیچر ”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ یہیں پر ہوتی۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ان کی بھی آرزو ہوتی کہ میں گاہے بگاہے آ جایا کروں، مگر اس کا انہوں نے کیا بندھن کیا کہ ”تلقین شاہ“ میں میرے لیے ایک کردار تخلیق کیا۔ ماسٹر خوشی محمد کا۔ ظاہر ہے کہ مجھے صداکاری سے یہ تو تھا نہیں مگر وہ ریکارڈنگ کے دوران میرا کندھا تھپتھپاتے جاتے۔ سو آہستہ آہستہ میں رواں ہو گیا۔ ”تلقین شاہ“ پر وگرا موں میں مختلف لوگ حصہ لیتے، میں نے محسوس کیا کہ تلقین شاہ کے حوالے سے مختلف لوگوں کی پروقار سے مدد کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ وہ اپنے صداکاروں کے نجی مسائل پہ گفتگو کرتے اور حتی الامکان ان کی کوشش کرتے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں جو بچے کام کرتے تھے، وہ اشفاق صاحب کو ابوجی کہہ کر مخاطب کرتے اور گھر میں بھاگے پھرتے جیسے وہ ان کا اپنا ہی گھر ہو۔

اشفاق صاحب اپنے غموں اور بیماریوں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اکثر کسی ملازم ہی سے پتہ چلتا کہ ان کا آپریشن ہو گیا۔ وہ ہسپتال میں داخل رہے ہیں۔ آخری بار وہ آپریشن کے بعد گھر آئے تو چار پائی سے لگ کے رہ گئے۔ اس کے بعد میں بھی مطالعہ ان کا معمول رہا۔ میں گاہے بگاہے ان کی عیادت کو جاتا رہا۔ بس چند منٹ کے لیے ہی بیٹھتا کہ انہیں کچھ سنبھائی راس تھی۔ ایک شام مجھے شادی کی تقریب میں شرکت کا ایک کارڈ ملا۔ دولہا دلہن کے ناموں سے میں آشنا ہوا۔ شادی بارات داستان سرائے سے روانہ ہونا تھی۔ میں نے ان کے خادم خاص محمد رفیق جو یہ کارڈ لائے تھے، سے پوچھا کہ کیا سلسلہ ہے؟ انہوں نے لاکھمی کا اظہار کیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اچانک ایک خیال نے ذہن میں چھید کر دیا۔ یہ شادی بارات کا اہتمام تو نہیں!!

شادی کی شام میں ان کے یہاں پہنچا تو ہر طرف قہقہے روشن تھے، بارات تیار تھی۔ بڑی رونق تھی، دو آدمی صاحب کو سہارا دے کر باہر لائے۔ وہ دولہا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ مٹھائی اور کوک سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد کھانے کو ڈھونڈنے لگا مگر کوئی شاعر، ادیب یا صحافی بارات میں شریک نہ تھا۔ ان کے رشتہ داروں اور عزیزوں کا ہونا تھا۔ بارات ایک شادی گھر کے لیے روانہ ہوئی۔ میں گیٹ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کوئی واقف ہے نہیں، کس گاڑی میں جاؤں گا۔ ساتھ ہی بانو آ پا کی آواز آئی۔ ”اسلم تم میرے ساتھ چلو گے۔“ اور پھر گاڑی میں بانو آ پانے بتایا کہ دولہا کی



والدہ خاں صاحب کی نیاز مند ہے، انہیں مالی پریشانی نہیں ہے مگر عزیز کوئی نہیں۔ انہوں نے اس پریشانی کا اظہار صاحب سے کیا تو انہوں نے یہ سارا اہتمام کرنے کا حکم دیا۔ بانو آیایوں مصروف اور خوش تھیں جیسے ان کے اپنے لیے شادی ہو۔ تقریب کے اختتام پر پھر پریشانی کہ واپس کیسے جایا جائے۔ پلٹ کے دیکھا تو اشفاق صاحب دو آدھ سہارا لے کر میری طرف آرہے تھے، ساتھ بانو آتھیں۔ بانو آپانے گاڑی منگوائی۔ اشفاق صاحب نے مجھ سے ملا یا۔ آخری بار اور رخصت کر دیا..... ہمیشہ کے لیے۔

چند ہی دنوں کے بعد داستان سرائے کے آس پاس سڑکوں پر لوگوں کا جھوم تھا اور اشفاق صاحب اپنے کمرے میں سفید چادر اوڑھے ابدی نیند سو رہے تھے۔ پھر وہ اسی نیند میں ڈوبے، آنسوؤں سے لبریز آنکھوں والے لوگوں کے کندھوں پر تیرتے ہوئے آخری آرام گاہ میں چلے گئے۔ ہزاروں لوگ تھے اور ہر طبقے کے لوگ۔ دانشور، شاعر، صحافی، فقیر، مسکین، صداکار، گلوکار اور عام آدمی، ریڑھی والے، تانگے والے، رکشے والے۔ ان میں سے کچھ اشفاق صاحب کو، کچھ اشفاق صاحب کو، کچھ ڈائریکٹر جنرل کو، کچھ ایک بڑے سوئی کو، کچھ ایک بڑے ترمز کو، کچھ تلقین شاہ کو یاد کرنے آئے تھے۔ ایک شخص کے ساتھ بہت سی شخصیات رخصت ہو گئیں۔

مجھے بطور ڈائریکٹر جنرل اشفاق صاحب کے بارے میں تاثرات بیان کرنا تھے مگر میں ادھر ادھر بھٹک گیا۔ آپ کے سامنے بے ندان کی افسری کے سائل سے انصاف ہو سکا اور نہ ہی کسی اور پہلو پر ٹھیک سے بات ہو سکی۔ یہی ہے اور یقیناً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ فی الوقت میں کچھ لکھنے کا ارادہ ترک ہی کر دوں اور اس وقت تک کروں جب میں کچھ لکھنے کے قابل ہوں۔ وہ بھی اگر ہو سکے تو.....

”بابا وہ ہوتا ہے جو لینے کے نہیں دینے کے مقام پر ہو۔ یہ اس کی موت ہی نشانی ہے۔ جب بھی آپ لکھیے ایسے مقام پر دیکھیں تو پھر سمجھیں کہ یہ بابا ہے، اور یہ داتا ہے، عطا کرنے والا آدمی ہے۔“

(اشفاق احمد، زاویہ، لاہور)

ریاض محمود کے نام

21-12-1990

عزیز مسز امت!

اس سے پہلے تم کو ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے شگیا ہوگا۔ یہ خط اس کے جواب کی یاد دہانی نہیں ہے۔ میں نے ہی لکھ رہا ہوں۔ محض اس قسم کو test کرنے کے لیے اور اس پرانے air bath کو دیکھنے کے لیے کہ اس میں کتنی جانتا او کہاں تک پہنچتا ہے اور اگر پہنچ جاتا ہے تو پھٹتا تو نہیں۔ تم اس کا جواب لکھنے کی کوشش نہ کرنا اور مزے سے پتے وغیرہ افسوس کہ اس قلم کی سیاہی دوسری جانب نکل رہی ہے۔ اس لیے اب ایک اور استعمال کرتا ہوں۔ کل اکٹھے آئے تھے، پوچھنے لگے کہ چند مہینوں سے ریاض نظر نہیں آتا۔ میں نے منہ پکا کر کے کہا کہ اس کے ساتھ کچھ ناراضی ہے۔ میں نے چند الفاظ فحشی اور کا کے کے خلاف کہہ دیئے۔ اس نے تو برداشت کر لیے لیکن بانو آگے سے بولنے لگی۔ نے کبھی آپ کے بچوں پر تنقید کی ہے جو آپ ہمارے بچوں پر کتہ چینی کر رہے ہیں۔ اس پر بات بڑھ گئی اور انہوں نے

تھیں۔ چنانچہ ترک کر دیا۔

میں نے ظفر اس وقت سے پریشان ہے اور نڈکھجا کر ہر ملاقات پر یہ کہتا ہے کہ ایسا ہونہیں سکتا لیکن جب میں اسے دیکھا تو وہ تمہاری بے وقوفی پر بہت ناراض ہوتا ہے کہ اس گدھے کو سوچنا چاہیے تھا کہ اتنے سالوں کی تو دشمنی بھی کتنی گوارا ہے۔ مجھ سے انہوں نے تمہارے مکان کا پتہ پوچھا تو میں نے انکار کر دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اب یہ سچن و غیرہ جا کر خود تمہارے گھر کا پتہ معلوم کر رہا ہے اور کافی پریشان ہے۔

بھی یہ سیاہی تو بہت تنگ کر رہی ہے، اس لیے ختم کرتا ہوں۔ ویسے تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔

دعا گو

اشفاق احمد

تہران (ایران)

2-6-1991

عزیزم سلامت باشید!

ہر گاہ کہ من ارادہ کردہ بودم کہ حضر فروش گاہ جناب عالی شدم بعد از خیال من مبدل گرد کہ من بجائے تربت ایجا کیے ز زائر من حضرت امام خمینی روح اللہ شدم۔ خیلے خوش قسمت مستم کہ دی شب زیارت روضہ حضرت امام خمینی شدم..... معافی چاہتا ہوں کہ ڈیڑھ دوون کے مسلسل استعمال سے اب زبان اور قلم فارسی ہی کی طرف مائل ہوئی اور انہی ہواؤں سے لطف لیتے ہیں۔ ابھی کوئی ہفتہ بھر ادھر ہی قیام ہوگا اور پھر انشاء اللہ جمعہ کے روز واپسی

جب ہم مشہد جائیں گے تو آپ کا علاقہ بالکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگا اور وہ جو کہتے ہیں کہ رات کے سونے کی بتیاں سیالکوٹ سے نظر آتی ہیں، ایسا ہی خانہ تہماری بیویوں کا ہوگا اور جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں گی ان میں بین شرط ایک ہی ہے کہ تربت میں روشنی کا انتظام ہو۔ بتیاں جلتی ہوں۔ لوڈ شیڈنگ کا معاملہ نہ ہو۔

اس وقت کا ایران میرے زمانے کے ایران سے بالکل مختلف ہے۔ واضح فرق بیسیوں میں نظر آیا ہے جو اب ہر وہ مال باندھ کر ٹخنوں تک کا لمبا کوٹ پہن کر باہر نکلتی ہیں، خریداری کرتی ہیں، سکولوں کالجوں میں جاتی ہیں اور کچھ کام کرتی ہیں لیکن وہ اس لباس سے خوش نہیں ہیں کہ ایک تو ساری شواری گئی۔ دوسرے وہ ٹرپ جو راہ چلتوں کو کام کرنے والوں کے دلوں میں خواہ مخواہ پیدا کر دیتی تھیں، وہ ٹرپ پیدا نہیں ہوتی۔

اور جو یہ نہ ہو تو پھر زندگی بیکار ہے۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں، رسالے اور گانے بجانے جو شاہ کے زمانے میں ہر بازار کے ہر موڑ پر بکتے تھے اور جن کی صورتیں ہم بھی پاکستان سے آ کر بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے، ان کا نام وہ بھی جانتی رہی۔ عمومی حالت یہ ہے کہ فی الحال لوگوں کو اور حکومت کو یہ معلوم نہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔ انقلاب کے بعد بھی امام خمینی سے 1/4 طاقت کی بھی ہوتی یا 1/10 بلکہ 1/100 طاقت کی بھی ہوتی تو کام آگے چل سکتا تھا مگر مجھے یہ بھی نظر نہیں آتا۔ اس سے معاملہ رکا ہوا ہے۔ پورا انجمن سٹیم سے بھرا ہوا اور کونکوں سے بھٹتا ہوا اسٹیشن پر کھڑا ہے اور

ڈرائیور کا پتہ نہیں کہ کدھر گیا۔ ایک امید یہ بھی بندھی ہے کہ ابھی آ جائے گا۔ ایک خوف یہ بھی دامن گیر ہے کہ کدھر سے آئے گا۔

اچھا تم اس کالے پانی کی ابھی کتنی قید اور کالو گے۔ اگر تم کو مستقلاً اگست میں آنا ہو تو پھر درمیان میں کوئی پتہ لگا لے کہ نہیں۔ پچھلی مرتبہ کا تمہارا آنا بالکل بے کار گیا۔ ایک بھی مفصل ملاقات نہ ہو سکی۔ اکیلا میں ہی نہیں اس شکوے سے انکل ظفر بھی بڑی شدت سے شریک ہیں۔ تمہاری آپا کا پرانا فلسفہ ہے کہ جوں جوں بچے جوان ہوتے جاتے ہیں وہ بے چارے چوبابتے جاتے ہیں۔

شیر خواری میں ان کی اتنی فکر نہیں ہوتی جس قدر ان کے جوان ہو جانے پر ہوتی ہے۔ میں ٹھیک ہوں لیکن ٹھیک نہیں ہوں کہ ایسے لمبے لمبے سفر کر سکوں اور اتنی بڑی بھیڑوں میں خود کو سہار سکوں۔ اب اندر سے ہی معاملہ ٹھیک ہونے لگا ہے اور یہ تجربہ بھی خوب ہے۔ اپنے سارے دوستوں کو میرا سلام مسنون پہنچا دینا اور ان سے کہنا کہ گرمی سے بچیں۔ باہر کی گرمی سے بھی اور اندر کی گرمی سے بھی بلکہ اندر کی گرمی سے زیادہ بچیں۔ یہاں کا ایک خوفناک روپ ہے ان کی راہ میں حائل ہوتا رہتا ہے۔

ان دنوں تمہارے تربت میں کون سا پھل چل رہا ہے؟  
دعا کیس اور مزید دعائیں۔

دعا گو

اشفاق احمد

داستان سرائے

121/C ماڈل ٹاؤن

لاہور

24-3-1991

عزیزی ریاض میاں! سلامت رہو، خوش رہو۔ کل 23 مارچ تھی مگر ہمارا یہ دن بھی روتے پینتے اور آنسوؤں کا گزرا۔ اشتیاق کے بڑے بڑے صائل کی موت کی خبر تم کو مل چکی ہوگی۔ ہمارے سارے خاندان میں اور پورے ملک میں ایک کہرام مچا ہے۔ کسی ظالم نے صائل کو اس کے گھر کے گیٹ پر چوہ گولیاں مار کر ختم کر دیا۔ اس کی بیٹی (جسے وہ سکا لایا تھا) یہ سارا منظر دیکھتی رہی۔ اب تک قاتل کا یا قاتلوں کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اشتیاق غم کی صورت بنا، کمروں میں خانہ میں گھومتا رہتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بس اس کو ہونی کہتے ہیں اور اس کے آگے کوئی تدبیر کوئی تجویز کارگر نہیں ہوتی۔

جس روز مجھے تمہارا خط ملا ہے اس سے دو دن بعد یہ سانحہ عمل میں آیا۔ ذہن ماؤف اور جسم شل ہے۔ میں نے بانو کو فون کیا تھا، وہ بھی تھیر اور غم میں ڈوبی بیٹھی ہے۔ فون پر ٹھیک سے بات بھی نہیں کر سکی۔ اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ صحت اب اچھی ہے۔

کسی میاں واپس اپنی Post پر چلے گئے ہیں اور انہوں نے اسلام آباد میں اپنی کرسی سنبھال لی ہے اور فرما رہے ہیں کہ میری غیر رسمی چلا گیا ہے اور کسی اور منصب کی تلاش میں ہے۔ میرے آرڈر بھی آگئے ہیں لیکن ان میں سقم ہے یعنی ڈائریکٹر کر دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سب غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے اور پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کو اصل حقیقت سے مطلع نہیں۔ میں نے ابھی تک چارج نہیں لیا لیکن سیانے کہتے ہیں کہ چارج لے لو، اس کے بعد اپنے دعوے کا حکم

مجھ ہی دینا ہے اور عجیب سے حالات میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ اب کوئی خاص مزاجی نہیں رہا۔ تم یہاں سے کسی ڈھارس بندھتی لیکن اب یہی حکم ہے کہ تم دور دور ہو اور یہی حکم درست ہے۔  
اپنے دوستوں کو میرا سلام دینا اور بتانا کہ ان سب کے نیچے میرے پاس ڈھیر ساری دعائیں ہیں۔  
ہندہ تم سب کو خوش رکھے اور آسانیاں عطا فرمائے۔

دعا گو  
اشفاق احمد

2-9-1967

قد سید جان سلامت رہو۔

میں کل دوپہر کراچی پہنچ گیا اور خالو سرور کے جنازے میں شرکت کی۔ قبرستان گئے اور اپنے ہاتھ سے مٹی دی جس میں گھر پہنچے۔ یہاں دو گھڑی ماسی جی سے باتیں کرنے کے بعد اجازت چاہی اور اپنے ہونٹ چلا آیا۔  
ملا ہو رابری پورٹ پر افتخار بھائی، اقبال بھائی، شیر آغا، انارخال، باجی اور گڈی موجود تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی تھے۔ میں آئے تھے اور یہ امر مجبوری سمجھوں کہ پاس فرس۔ بھاس کے ٹکٹ تھے۔ باجی میرے اس دتیرے پر بہت تھی تھی۔ کراچی والوں کو میری صورت دیکھ کر یقین نہ آیا۔ میں نے کہا ماموں کوئی ہمارے رشتہ دار نہیں تھے، میرے پاس تھے اس لیے چلا آیا۔ سب لوگ شکر گزار اور ممنون تھے۔

شام کو جب میں اپنا پیچی اور تھیلا اٹھا کر چلنے لگا تو روکا گیا۔ میں نے کہا جہاں لو اچھین پراتنا بوجھ ہو وہاں میں نہیں نکلتا، یہ میرا اصول ہے۔ ایک دو دوست کے پاس ٹھہروں گا۔ سب نے میرے اس اصول کو بہت سراہا۔  
میرے دوستوں کے۔ کہنے لگی اپنے کسی کام سے آئے ہو گے آپ۔ وہ کرنے جا رہے ہیں۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ملاحظہ فرمائیے اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے حیران سے!

آج مجھے اپنی میننگ کا تکلیف دہ کام ہے۔ سارا دن اس میں گزارے گا۔ کل اتوار کے روز صبح آٹھ بجے رسم قبل نماز شروع ہوئی۔ تم سب کو بوسے! بچوں کو ساتھ پیار بھی۔

تمہارا

اشفاق



## 75۔ جی ماڈل ٹاؤن

اصل وجہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن بظاہر خاں صاحب اس بات سے پریشان تھے کہ ہم لوگ آپاجی کے گھر کو جانے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وجہ جو بھی تھی اب گھر کی تلاش ہوئی۔ 36۔ جی کی بغلی گلی میں مطلوبہ گھر مل گیا، لیکن یہ گھر عین ضروریات کے لیے بہت بڑا تھا۔ اس کا علاقہ یہ سوچا گیا کہ آپا صابرہ گھر کی مین بندنگ میں آدھے گھر میں تختہ لگائیں۔ گھر کے پچھلے آنگن میں بائیں ہاتھ ایک تین کمروں کا گینسٹ ہاؤس تھا۔ اس میں ریاض محمود، بانو پاجی کے لیے ڈال لیا۔ بائیں ہاتھ آنگن میں کھلنے والے دروازے سے ملحقہ دو کمرے تھے۔ ایک میں جیونی کا باورچی خانہ اور دوسرا کھانا کھانے کا کھانا کمرہ گھریلو کاشھ کپڑا اور گودام کی شکل اختیار کر گیا۔

اس طرح کے بنگلے ماڈل ٹاؤن میں عام ہیں۔ گھر کے دو پھلک تھے۔ یہ نیم دائرے کی شکل میں ایک طرف سے داخلے کے لیے استعمال ہوتا اور دوسری جانب سے اخراج کی صورت نکلتی۔

آپا صابرہ کی سائینڈ پر بڑے بیٹھے آموں کے پیر تھے اور ہماری طرف اپچی کے دو تین درخت بڑے پھلکوں سے لند جاتے۔ برآمدے کے سامنے کشادہ پورچ تھی جس میں آسانی سے دو کاریں پارک کی جاسکتی تھیں۔

ہماری سائینڈ پر ایک ڈوگی گراؤنڈ تھی جسے اینٹوں سے پختہ بنا دیا گیا تھا۔ اسی ڈوگی گراؤنڈ کے عین مقابل ہمیں پہلا کمرہ ڈائننگ روم بنا لیا۔ اس کے اوپر دو لمبے سے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں لاکر خاں صاحب کی کتابیں اور کچھ بے سرو سامانی کے عالم میں ڈھیر کر دی گئیں جیسے وہ 36۔ جی میں گیلری کے اوپر ڈھیر تھیں۔

برآمدے میں سے اندر ایک بڑا کمرہ ڈرائنگ روم بنا لیا گیا، جس کا مصرف کم کم تھا۔ باہر کی سڑک کی طرف سے والا کمرہ مہمان خانہ ٹھہرا، جس کا استعمال اور بھی کم تھا۔ پھر ہمارا سونے کا کمرہ تھا۔ یہ کافی کشادہ اور ہوادار تھا۔ اس کے ساتھ ہی پھر برآمدہ شروع ہو جاتا اور برآمدے اور خوابگاہ کے درمیان ایک کافی بڑا کمرہ تھا جو خاں صاحب کی سنڈی، آرٹسٹک تنہائی طلب لمحات میں پٹھان تھی۔ جب کبھی اس کمرے میں داخل ہوتے، غسارخانے سے ہو کر جانا پڑتا۔

پچھلا برآمدہ کم و بیش استعمال میں آتا لیکن پچھلے آنگن میں خوب ریل پیل رہتی۔ یہاں ایک پرانا بڑا تختہ

تھا، جس پر دو رسیاں مضبوطی سے باندھ کر ان میں آدھے ٹائر جتنے لوہے کے Rings باندھے گئے اور خاں سے مدد کی سے ٹائٹیں اٹھا کر کبھی دائیں کبھی بائیں ورزش کرنے لگے۔ ان کی ورزش کے اوقات میں بڑی توجہ سے دیکھتا تھا۔ بچے ابھی چھوٹے تھے ورنہ وہ نقل میں زور آزمائی کرتے۔

تم لوگ بہت کم آپا صابروہ کی طرف جاتے۔ وہ عام طور پر اپنا کھانا بڑے سلیقے سے ٹرے میں سجا کر ہماری طرف دیکھتا تھا۔ سب ایک ہی میز پر اپنا اپنا کھانا کھاتے۔ اسی طرح روجی بیگم بھی کانٹے، چچ اور سرویٹ سے لیس اپنا ٹرے لاتی تھی۔ میں بیٹھ کر کھاتی۔ نہ کبھی انہیں share کرنے کا خیال آیا نہ کبھی ہم نے انہیں کچھ پاس کرنے کی جسارت ہی کی تھی۔ جیسے ہی وال چپاتی ہنری بھات کھانے والے تھے، انہیں کچھ آفر کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔

آپا صابروہ اپنی چائے کی پیالی لے کر باہر والے برآمدے میں بیٹھتیں لیکن ہماری طرف سے کبھی ادھر کوئی نہ دیکھا۔ میری والدہ بی بی جی اپنے اندر ہی رہتیں۔ ان کا ہمارے پیئرن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس گھر سے دو تین اہم واقعات وابستہ ہیں۔

فیض صاحب کا آنا جانا

قوس کی کار کا خریدنا

”جھوپ سائے“ فلم کی شوٹنگ

فیض صاحب اچھے بلاک کے میوز پر رہتے تھے۔ سلیم اور میزو روجی کی ہم عمر تھیں، لیکن یہ ایک دوسرے کی بہن بن جانے کیوں نہ بن سکیں۔

جب ہم 75۔ جی میں آئے تو سب سے پہلی واقفیت فیض صاحب سے ہوئی۔ ان کا گھر اچھے بلاک میں ایک میوز کے سامنے پر تھا۔ یہاں وہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ سلیمہ تو شاید ہماری طرف کبھی نہیں آئی لیکن میزو بڑی محنت کے ساتھ کبھی کبھی اکیلی ہی ہمارے گھر آ جاتی رہی۔

پہلی بار مجھے کپڑا بیچنے والی افغان عورتوں سے پالا بھی پڑا۔ ان دنوں پھانک کھلے رہتے تھے۔ بلا روک ٹوک سر پہنے کے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے وہ دندانائی اندر آتیں۔ ان کا معاورہ تھا کہ وہ ہماری کچی ڈوگی گراؤنڈ کے کنارے بیٹھ کر دیکھ سکتیں۔ یہ اب خواتین کی اکثریت کا گھر تھا۔ آپا صابروہ، روجی اس کی آواز سن کر بھاگی آتیں۔ بانو باجی کو بھی خبر پڑ جاتی۔ دو بیڑھیاں اتر کر آنگن والی سائیڈ سے برآمد ہو جاتی۔ میزو کو بھی عموماً خبر دی جاتی۔ وہ بھی بھگم بھانگ

اب رنگوں پر تبصرہ، میٹرل کی جانچ پڑتال، قیمت پر جھگڑا جاری ہو جاتا۔ اول تو نہ جانے انہوں نے کہاں پیسے جمع کیے ہوتے۔ بے دریغ خرچ کر لیا جاتا۔ کبھی کبھی میزو کے پیسے کم پڑ جاتے تو وہ خاں صاحب کی لاڈلی آن سے لے لیتی۔

مردوں کا اس خرید و فروخت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

فیض صاحب ان سے علیحدہ مجھے اور خاں صاحب سے ملنے آتے۔ وہ کبھی گھر کے اندر داخل نہ ہوتے۔ انہیں

ہمارے کھانے کے کمرے میں بھی کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ ڈوونگی گراؤنڈ کی کسی کرسی پر آرام سے بیٹھ جاتے۔ والوں کی فراغت کا انتظار کرتے۔

خاں صاحب عام طور پر اردو بورڈ میں ہوتے یا ریڈیو سٹیشن۔ فیض صاحب بڑے صبر سے میرا انتظار کرتے۔ جب میں اُن تک پہنچتی وہ چپ چاپ چیری کے درختوں کو اُن پر چھپانے والے پرندوں سے ملاقات کرتے۔ شہر میں جہاں جواز لی سنگیت موجود ہوتا ہے، اُس کے ساز اُن کے اندر بجتے۔ اُن کے چہرے پر کوئی بوریٹ نہ ہوتی۔

جب کبھی خاں صاحب موجود ہوتے، وہ بڑی نقیدت سے پاس بیٹھتے۔ شاید اُن بنی ملاقاتوں میں خاں صاحب نے اندازہ لگایا کہ فیض صاحب ملامتیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لیے اُنہوں نے فیض صاحب پر "صوفی" کے کتیبہ نظر سے مضمون قلمبند فرمایا۔

ایک روز فیض صاحب میرے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے مجھے بتایا "بھئی! ہم ایک وفد مغربی پاکستان مشرقی پاکستان لے کر جا رہے ہیں۔ نہ بور سے جمیلہ ہاشمی، اسد مہ آباد سے طاہر غزنوی، ہرے ساتھ ہوں گے۔ اُن کے ہم سفر ابھی نامزد نہیں ہوئے۔"

میں نے سوچا کہ بڑے بڑے ازیب جا رہے ہیں۔ کچھ ادبی محفلیں ہوں گی۔ معرکے کی تقریریں ہوں گی۔ میں 1200 میل کے فاصلے کے باوجود یک جہتی کا اعادہ کیا جائے گا۔

"اور وہاں جا کر کیا پروگرام ہے فیض صاحب؟"

"کچھ نہیں بس سندھ بن دیکھیں گے۔ پھاڑوں پر جا کر کچھ لطف اٹھائیں گے۔ سوٹر بوٹ کی سیر کریں گے۔"

میں خاموش رہ گئی۔ میرا خیال تھا سلیکشن میرٹ پر ہوئی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی "آتشِ رفتہ" نے چونکہ وہیں پہنچ گئی تھی۔ اس لیے ان کا حق فائق تھا لیکن ہمیشہ کی طرح دل میں حسد، لالچ اور کینے نے حملہ کر دیا۔ جب فیض صاحب آئے اور کچھ عرصہ ملتے رہے تو میں نے اسی حسد کے تحت کہا "فیض صاحب! اگر آپ جمیلہ کو میرٹ پر لے جاتے ہیں تو کوئی افسوس نہ ہوتا لیکن آپ نے حق بمسائلی بھی ادا نہ کیا۔"

یہ بات کہیں فیض صاحب نے پلے باندھ لی اور جب دوبارہ سونار دیس جانے کا اتفاق ہوا تو وہ مجھے بھی لے لے گئے۔ اس ٹرپ کا مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ فیض صاحب کے پاس ایک ہی ہوائی جہاز ایک ہی ٹیمبل پر بیٹھ کر کھانے کا وقت ہوا۔ سفر میں عموماً انسان اپنے ہم سفروں سے بہت کچھ سیکھتا ہے جو اس کی بنیادی خصلت ہوتی ہے۔ وہ بار بار دیکھنے والی شخصیت سے جھانکنے لگتی ہے۔

فیض صاحب کو کسی بات کی جلدی نہ تھی۔ وہ اپنی ضرورت کو اُجاگر کرنے کے عادی نہ تھے۔ غسل نہ کرتے تھے۔ گندے تولیے پڑے مل گئے، اُن ہی سے نہا لیتے۔ میز پر پسند کی ڈش دوسروں نے کھالی اور اُن کو ہاتھ روکنا پڑا تو خوشی سے کچھ اور کھا کر اٹھ گئے۔ کپڑے لاندری میں بھیجے۔ واپس آنے میں تاخیر ہوئی۔ پرانے کپڑے ہی اٹھا کر چڑھائے۔ جو توں کو پالش کرنے پر اصرار نہیں۔ فرنٹ سیٹ پر معتبر بن کر بیٹھنے کی خواہش نہ دار۔

فیض صاحب کی جھکی جھکی آنکھیں، نرم لہجے، ترنم بھری آواز سب مجھ پر اثر انداز ہوئی۔ ان جیسا بننے پر میں نے

تھی۔ میں جانتی تھی ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق سیکھتا ہے اور بسا اوقات بڑے لوگوں کی شناسائی اسے  
 گھنٹہ بے لیکن وہ اس شخصیت سے کچھ بھی سیکھ نہیں سکتا۔

چند عرصہ بعد فیض صاحب 75۔ جی نہ آتے۔ بس اردو بورڈ چلے جاتے۔ کبھی خاں صاحب نے ان ملاقاتوں  
 کی خبریں کیا۔ بس اتنا بتاتے۔ ”فیض صاحب آج آئے تھے۔“  
 میں نے کبھی ان ملاقاتوں کی تفصیل نہ پوچھی۔

جب ہم 121۔ سی میں منتقل ہو گئے تو فیض صاحب نے ہمیں بھلایا نہیں۔ وہ کبھی کبھی بلا تکلف چنے آتے۔  
 ہمیں بغیر دکھاوے اور Show off کیے ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ میری ان سے ملاقات کم کم ہوتی۔  
 جب میری کتاب ”امر تیل“ چھپی تو اس کا فنکشن درپیش تھا۔ ہمارا معیار زندگی بڑھ چکا تھا۔ ایک روز ہم فیض  
 صاحب کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے تو میں نے بڑی جرأت رندانہ سے کہا ”فیض صاحب! میری کتاب کا فنکشن ہو  
 گا آپ اس کی صدارت کر دیں گے؟“

”کرویں گے۔“ انہوں نے سادگی سے کہا۔ ”کارڈ بھجوادینا۔“  
 وہی پر خاں صاحب کہنے لگے..... ”بھی اتنے بڑے شاعر کو صدارت کے لیے کہتے ہوئے تمہیں خوف نہیں

تھی ان کی بڑائی کا مجھ پر اس وقت کوئی تہور موجود نہ تھا۔

فنکشن ہوا۔ اس میں باب ہیز نے مجھ پر مضمون پڑھا۔ خاں صاحب، احسان اکبر، سہیل عمر اور اصغر ندیم سید  
 نے مضمون پڑھے اور وہ خوبیاں بیان کیں جو نہ کتاب میں تھیں نہ صاحب کتاب میں۔

فیض صاحب وقت سے کچھ پہلے پہنچے۔ بڑی توجہ سے مضمون سنتے رہے۔ فنکشن کے اختتام پر اٹھے۔ رومزم پر  
 تقریر کی۔ افسوس اُن کی تقریر زبانی تھی اور تب ابھی ٹیپ ریکارڈ کا رواج نہ تھا، اس لیے وہ سنہری الفاظ ضائع

تھانوں سے ڈرا دور اشیاء کی فراہمی انسان کے اندر جو فرحت پیدا کرتی ہے، اس کا گہرا تعلق ہر انسان کی ذاتی  
 ہے۔ کئی بار ہمیں کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جو نہ ہماری ضرورت ہوتی ہے نہ خواہش۔ ایسی صورت میں اشیاء کا  
 خیال بن جاتا ہے۔

75۔ جی میں تھوڑی دیر کے بعد خاں صاحب نے فوکسی کا خرید لی۔ 7262 نمبر کی یہ فوکسی گویا ہم سب کے  
 بہتر اضافہ تھی۔ بچے تو کار پر لٹو تھے لیکن باپ کی طرح وہ جذبات کو ابھی سے چھپا جانے والے تھے۔ سکول  
 جاتے جاتے چوری چوری اس کے پاس رکتے، نظر بھر دیکھتے جیسے کوئی نوجوان محبوبہ کو غٹ غٹ پی جانے کے  
 لیے صبر کرتا ہے۔

فوکسی نے ہماری زندگی میں بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ دن کے وقت تو خاں صاحب کام پر اور بچے  
 سوتے لیکن شام کو اس پر عموماً باہر جانے کا اتفاق ہوتا۔ کبھی کبھی وہ چوری چوری آپس میں اس کی باتیں بھی



کرتے، لیکن ہمیں خبر نہ لگتی۔

75۔ جی میں سب سے بڑا واقعہ ”دھوپ سائے“ فلم تھی۔ پتہ نہیں انہیں فلم بنانے کی کیونکر سوچھی۔

اندر ہی اندر سوچتے رہتے کہ پاکستان میں جاگرتی کرانا اور عوام کو پاکستان سے محبت کے لیے تیار کرنا پورا عہدہ ہے۔ اس فلم کی بنیادی تھیم بھی یہی تھی کہ یہاں منافع خوروں کے خود غرض طبقے نے دولت کمانے کے لیے ہتھکنڈے اور راستے تلاش کر لیے ہیں۔ آفتاب احمد جعفری ادویات بناتا ہے اور اُس کے ہاتھوں کئی مریض مر چکے۔ آخر میں جب انجام کار وہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے تو اُس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ رد جاتے ہیں ”کوئی گولی کوئی تھم نہیں۔ یہ تو کیفرِ کردار تک پہنچنے کی پاداش میں ہے۔“

اس فلم میں قوی نے شرابی، منور تو فیق نے تائب طوائف، عطیہ نے پیار بچے کی ماں کا رول کیا تھا۔ ان ایکٹروں سے ضرور واقف ہوں گے کیونکہ انہوں نے اسپتہ عہد میں بڑی شہرت حاصل کی۔

نیٹی اور بدی کا جو گہرا تعلق ہے اور معاشرہ ان کے زلغے میں جس طرح آیا رہتا ہے ”دھوپ سائے“ بڑی اچھی مثال تھی۔ قوی شرابی اور منور تو فیق تائب طوائف ہے جو بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی ہے۔ یہ دھوپ کے راندہ درگاہ ہیں۔ دوسری جانب آفتاب احمد جو سوسائٹی میں دولت کی وجہ سے بہت عزت دار ہے۔ اپنا کس۔ یہاں خاں صاحب نے منور اور نیٹی جی کی طرح طوائف اور شرابی کی بڑی طرف داری کی ہے۔

اسی فلم میں جب زہرہ تائب ایک درخت تلے بیٹھی گارہی ہے۔

”شام شہر ہوں میں شمعیں جلا دیتا ہے تو“

تو کٹڑی کا ایک بزم خود شریف آدمی خسرو اسے پوچھتا ہے ”بول ری آپا زہرہ کون ہے تو؟“ جب آپا زہرہ کی بے عزتی عروج کو پہنچتی ہے تو شرابی کہیں سے آ نکلتا ہے اور کہتا ہے..... ”چل آئی ایک شرابی ایک طوائف، ہم دونوں اس کٹڑی میں رہنے کے قابل نہیں۔“

خاں صاحب نے فیروز پور روڈ کی مین سڑک سے بہت کرا ایک کٹڑی کرا پیہ پر لے رکھی تھی اور اسی شروع کر دی تھی، لیکن اردو بورڈ کا ٹکٹا بھی ساتھ تھا۔ وہ بیچارے بڑی مشکل میں تھے۔ ایک روز میرے اور بونے۔

”کیا کر رہی ہو قد سید؟“

”بس جی بچے آئے ہیں۔ کھانا تیار کر رہی ہوں۔“

”فضول جھنجھٹ چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔“

”اور جی بچے؟“

”انہیں بھی ساتھ لو..... شفٹ کا کرایہ پڑ رہا ہے۔ کیمرہ مین بڑے نخرے والا آدمی ہے۔“

میں اور بچے فوکسی میں سوار ہو گئے۔

کٹڑی کا عجب سماں تھا۔ ایک جانب بوسیدہ سے تین چار کمرے، پھر کھلا اجاڑ آنگن اور سامنے توراہ

مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر خاں صاحب ایک اضافی ذمہ داری ڈالنا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے جس طرح مجھے ساتھ رکھا۔ اب بھی وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں اس وقت سلیم خواجہ اپنے کمرے کے سامان سجائے بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی۔

سب کی طرح خواجہ جی نے اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

باقی سب کچھ تمہیں خواجہ جی سمجھا دیں گے۔“

کچھ ہی دریا کے چھوڑ کر خاں صاحب اردو بورڈ میں بیٹھ گئے۔ اس وقت ”شام شہر ہوں“ کی شوٹنگ ہونے والی تھی۔ وہاں پہن کر قدیر ملک درخت کے تنہے تک لے گئے۔

یہ صبری قوی سے پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت ریہرسل جاری تھی۔ قوی کا چوہا رو شاہدہ کے تور کے ساتھ ساتھ ساری طرح بھول پر جاتا تھا۔ قوی کو ان میٹرھیوں سے تھکا ہارا اترنا تھا۔ گانے کا ٹیپ جاری تھا۔ منیر نیازی کے بول ساری طرح مٹ رہے تھے۔ کسرہ بین تصویر بنا رہا تھا۔ کچھ تو بیٹھے یہ اتھارنی سر کو چڑھ گئی۔ پھر قوی کی سعادت مندی نے اسے سنبھالی کر دی۔ میں فرعون صفت آرزو دینے پر مامور ہوئی۔

کچھ اچھی طرح یاد ہے یہ ٹیک پوری بارہ مرتبہ Re-take ہونے کے بعد مکمل ہوئی۔ پندرہ مرتبہ اوپر نیچے کی سب سے مکمل شکل بندھا رہا تھا۔

اب تک قوی کے ساتھ مراسم جاری ہیں۔ قوی خاں میں جو پٹھانی لہو ہے، اس میں وہی اظہار کی کمی ہے جو شہزادہ کے کونٹے پرین اور منیر کے موسموں کی چپ میں چھپا ہوا تھا۔ قوی نے ناہید سے شادی کی تو بھی اس نے نہیں کی۔ اس شادی کا ذکر اتنے دے لفظوں میں کیا گیا کہ کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ بھاگ گیا ہو۔ قوی کی شخصیت میں اور دوسرے مردوں پر شاید فرق و رعایت کا پڑتا ہو لیکن تمام عورتوں کو قوی کی شرم و حیا نے ہمیشہ متاثر کیا۔ نگاہیں گھٹا کرنے والے قوی سے کبھی کسی ایکٹریس کو گلہ نہ ہوا۔

میرے صوب اپنے اندر ایک خاص قسم کے نظریے کو پالتا ہے۔ اشفاق صاحب نے ایسا ادب پیدا کیا جو پاکستان میں پہلا تھا، لیکن ایک اور بات پر وہ مُصر نظر آتے تھے۔ وہ جو اور جینے دو کے پرچار رک تھے۔ کہانی ”گڈ ریا“ سے لے کر یہ تک وہ اس سلوگن کا شکار ہے۔ انہوں نے مفتی جی کی طرح ادب میں کئی کروٹیں لیں۔ بس وہ اسی مسلک کے مشورے سے لکھتے رہے لیکن ہر انسان میں توازن کی کمی ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے مسلک میں بھی کبھی توازن قائم نہیں کر سکتے۔ اس قدر محنت میں گم ہو جاتا ہے کہ اسے آرام، خوشی اور خاندان کی پروا نہیں رہتی۔ اسے جو راحت اور خوشی سے محروم توازن کے باعث اسی محنت میں ملتی ہے۔ جو آدمی دولت کو بے دریغ استعمال کرنے کا عادی ہو اسے کبھی سے بچنے، کفایت کا ہاتھ پکڑنے اور ضرورت بھر خرچنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ سوشل آدمی اگر اس درجہ ملنسار ہو جائے تو یہ بہت کم صرف یا رباشی میں نظر آنے لگے تو اسے پھر نکما، کھٹوا اور دوسروں سے مانگنے والا بن کر گزارہ کرنا

خاں صاحب میں بھی کسی حد تک توازن کی کمی تھی۔ وہ جیو کی حد تک تو اپنے مسلک پر قائم تھے، جیسے سب سے پہلے پروا تھی۔ اپنے لیے اور گھر والوں کے لیے ”جینے دو“ کا مطلب انہیں سے سمجھ میں آیا کہ ان کو آزادی دینی چاہیے۔ وقت اور مداخلت ان پر ضائع نہ کریں۔ اگر جینے دو اور جیو میں توازن ہوتا تو انہیں بچوں سے حصہ دہائی اور مشکلات کا باہمی حل مل جل کر نکالنا پڑتا۔ اپنے لیے بھی انہیں جینے دو کی کبھی سمجھ نہ آئی۔ وہ زیادہ کام کر سکتے سوتے، اپنی صحت کی طرف سے بے توجہی برتتے رہے۔ زندگی کے کئی خانے ہیں لیکن ان میں پیشہ، خاندان اور تعلیم ان سب میں وقت کی بانٹ اور توازن نہ ہو تو کسی نہ کسی کے ساتھ نا انصافی کا انسان مرتکب ہو ہی جاتا ہے۔

جب ہم 75۔ جی میں تھے تو نیلی ویرٹن کی آمد نے خاں صاحب کو یقین دلا دیا تھا کہ اب ناظرین کے کتبوں سے نہیں نیلی ویرٹن سے اخذ کریں گے۔ نئے راستوں کی تلاش ”ایچ“ سوچ کی نئی منزلوں نے انہیں ہمراہ لے لیا۔

”دھوپ سائے“ ایک آرٹ فلم تھی۔ اس کی بنیادی تھیم یہی تھی۔ ”جیو اور جینے دو“۔ اس کی کہانی کئی سالوں میں رہنے والوں کی کہانی تھی۔ اس مضمون میں رکشا ڈرامیور، ایک بیمار بچے کی ماں، ان پڑھ پھیری والا۔ ایک حقوق نسکینی اور ہدی میں ہاتھ میں ہاتھ دیئے پھرتی تھی۔

خاں صاحب جن دنوں ”دھوپ سائے“ کے سکرپٹ کی ذہنی تیاری میں مبتلا تھے۔ ہوائی جہاز ٹیکہ آتے سے پہلے تیل پانی چیک ہو رہا تھا۔ انجن اور پہیوں کی ہوا کو جانچا جا رہا تھا۔ خاں صاحب گولگو کے عالم میں بیٹھ کر بڑے کمرے میں کچھ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتے۔ وہ ہر ہر قلم کو ٹیسٹ کرتے اور دیکھتا چاہتے کہ ”دھوپ سائے“ کے سکرپٹ کس پن سے لکھیں گے۔ کونسی سیاہی موزوں ہے۔ کونسا کاغذ محبوبہ کی جلد جیسا ملائم جان پڑتا ہے۔

مختلف شیفر، پارکر، ڈالر، سٹے قیمتی قلموں کی ٹرائی جن کاغذوں پر کی گئی میرے پاس ان کاغذوں اور قلموں کا انبار ہے۔۔۔۔۔ پن منتخب کرنے کے بعد کاغذوں کی باری آتی۔ کھلی لائنوں والے تنگ لائنوں والے۔ فل سکیپ۔ ہر قسم کی ڈائریاں غرضیکہ اشفاق احمد صاحب جب بھی لکھنے کا عمل جاری کرتے، ان کے لیے تیاری، ہشیا ری اور کمال کا عمل ساتھ ہی شروع ہو جاتا۔ انہیں شازت لینے میں رقت پیش آتی۔ اپنے تخلیقی گھوڑے کو سائنا مار کر رلیس کرنے میں مرحلہ وار تیاری کرنی پڑتی۔ جا بجا مختلف کاغذوں پر رنگ رنگ کے پنوں سے بے ربط، بار بار پیرا گراف کے بعد ناک کے بالوں کو دائیں ہاتھ کی انگلیت شہوت سے کھینچتے ہوئے ابروؤں کے لمبے ہانی جڑ سے اکھاڑنے کے دوران وہ اپنے ناپک، کہانی، مضمون کے متعلق سوچتے چلے جاتے۔

عام طور پر وہ قلم testing کرتے وقت ”اس کے علاوہ“ سے شروع کرتے تھے۔ کبھی کبھی قلم کے حوالے سے اظہار خیال کر دیتے۔ ان کے برعکس مجھے کاغذ، کاپی، پن میسر آ جاتا، وقت ملنے پر میں لکھنے پر آمادہ ہو جاتی۔ مجھے لوگوں نے لکھتے دیکھا ہوگا کیونکہ میں عموماً خاں صاحب کے دفتر جانے کے بعد بچوں کے سکول، کالج سے واپس سے جاتا جو کچھ بھی دماغ میں ہوتا، کاغذوں پر اتار لیتی۔

میرے ایگل کے پن میں سیاہی ہمیشہ شفو بھرتے۔ میری میز پر کامن پینس، کلپ، ڈائریاں وہی تھیں۔

میں نہیں بھی وہی ڈالتے۔ ابھی تک مجھے پن میں سیاہی بھرنا نہیں آیا۔ نہ قلم کو لکھ کر چیک کرنے کی صلاحیت ہی ہے کہ قلم وہی چیک کرنے کے عادی تھے۔

قلم اور کاغذ کی آمادگی دیکھ چکنے کے بعد وہ تخلیقی علم کی انگینٹ کے لیے تھوڑا تھوڑا کئی کتابوں سے چرچک لیتے۔ پڑا مادہ ہو جاتا، قلب اپنی بات پیش کرنے پر motivate ہو جاتا۔ ایسے میں مطالعہ رنگا رنگ ہوتا۔ فکشن وہ ہے۔ شاعری کی کتابیں بھی، اقبال، غالب، فیض، فراز، ناصر کاظمی کی زیر مطالعہ رہتیں۔ میرا اُن سے یہاں اختلاف رہتا۔ مجھے اقبال کی نسبت غالب پڑھنے کا زیادہ شوق تھا۔ خاں صاحب سوچ سے وابستہ انسان تھا۔ پڑھ کر دیر تک سوچتے رہتے۔ پچھلے بیس پچیس سال میں اُن کا مطالعہ Comparative Religions کی سیاق میں ہو گیا تھا۔ وہ رنگ رنگ کی انفرمیشن، مختلف مذاہب کا انداز فکر سمجھتے ہوئے کبھی کبھی لکھنے سے پہلے اُن کے کلمے لکتے۔

## انیس کی کلاس

اس طرح ایق کے شاگرد مفت ٹیوشن حاصل کرنے ماذل ناؤن آتے تھے۔ اسی طرح جب انیس ایم بی اے کے لئے تو داستان سرائے میں اس کے ہم جماعت، ہم درسوں کی رونق بڑھ گئی۔ انیس کے ساتھ پڑھنے والے ہر صاحبان سے پڑھ چکے اور اُن کے پلے کچھ نہ پڑتا تو سب سائیکلوں پر، کاروں پر، موٹر سائیکلوں پر سوار ہوتے آجاتے۔ لان کی طرف کھلنے والے بڑے کمرے میں اب اصلی جماعت شروع ہو جاتی۔ یہاں کوئی بلیک بورڈ تھا نہ کوئی نقشہ جات، صرف غسل خانے کے ساتھ والی دیوار تھی جس پر گہرا نارنجی پینٹ کیے شہد افضل تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چاک اور ڈسٹر ہوتا۔ وہ کئی کئی گھنٹے ہم جماعتوں کو پڑھاتا رہتا۔ اسی خیال سے کمرے کے کالی میز اُن دنوں برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے ساتھ تھی۔ دس بارہ لڑکے اس جگہ جاتے۔

مختل پیدا ہوتی مگر تھا۔ وہ نہ سوال جواب سے گھبراتا نہ مناظرے سے بھاگ جانے کی صورت پیدا کرتا۔ سچ تو یہ تھا کہ نعل کی محنتوں کا شرتھا کہ سارے لڑکے اچھے نمبروں سے ایم بی اے کر گئے۔ کلاس میں کچھ شاگرد قابل ذکر تھے۔ عظم، خمیں اور انیس خاں۔ طالبات میں عاصمہ، شگفتہ اور نغمہ پیش پیش تھیں۔ شگفتہ کے ذمے کلاس کے لیے تھوڑے گھنٹے غریب الطبع تھی۔ درمیانی شکل اور ذہانت کے ساتھ اُس نے خدمت کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ جب وہ پانی ختم ہو گیا ہے تو فوراً اندر باورچی خانے میں پہنچ جاتی۔ یہاں اُن دنوں پانی فلٹر کرنے والی مشین لگی تھی۔ پہنچ کر وہ پانی بھرتی، جیونی بہن سے دو چار باتیں کرتی۔

آج کیا پکایا ہے انیس کے مہمانوں کے لیے جیونی بہن۔“

آج تو ثابت سر ہیں اور کڑھی۔“

پھر دوسرے دن جواب ہوتا۔ ”آج شگفتہ بی بی توے والا قیمہ اور آلو گوشت۔“

یہ خاں صاحب کے ڈیرے کا ازلی Menu تھا۔ نہ جیونی بہن اس کے علاوہ کچھ پکاتی تھیں نہ کبھی کسی سے آتا۔ ان دنوں ٹیلی ویژن تو گھر پر تھا لیکن اس پر وہ کھانے پکانے کی ترکیبیں نہ دکھائی جاتی تھیں۔ ابھی ہونٹوں کے گھروں میں نہیں گھسے تھے۔

نغمہ اپنے نوٹس بخوشی ادھار دے دیتی اور عاصمہ کلاس کا حسن تھی۔ جس طرح ڈریس ڈیزائنر کے خاص ماڈل کی وجہ سے مقبول ہوتے ہیں۔ اسی طرح عاصمہ اپنی اواؤن، طرحدار یوں کے باعث مقبول تھی۔ تحسین ان دنوں کلاس کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرتا۔ شاہد افضل اپنی موٹر سائیکل کی چابی تحسین دیتا۔ پھر جب تک وہ اپنے گھر نہیں جاتا، چابی تحسین کے پاس رہتی۔ شاہد افضل میں جیہ کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس سے کچھ دور ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا لیکن اس کی ڈیگیں مارنا شاہد افضل کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ اس نے جماعت کو اپنے بچھلے Status سے مرعوب نہ کیا۔ خاں صاحب کی طرح پٹھان بچے نے کبھی اپنے نام کے ساتھ کلمہ لکھا۔ وہ ہر جگہ اپنے میرٹ کا سہارا لیتا۔

اب 2007ء ہے۔ شاہد افضل امریکہ میں پی آئی اے کے C.E.O. مقرر ہے لیکن وہاں بھی وہ میرٹ کے سر پر کھڑا ہے اور اپنی کارکردگی کا دیا کھاتا ہے۔ اُس کی پہلی بیوی سعدیہ اُس کی جھینپو طبیعت سے عاجز آ کر



## بچگان اور ان کے دوست

سچے گھر میں آکر ماحول کی تبدیلی، حالات کی تبدیلی، کام کے اوقات میں نیا پن پیدا ہو گیا۔ فراغت کے ملتے جلتے مہینوں میں سوچیں نے کرکھل گئیں۔ تعلیم و تربیت کی جہت بھی نئی تبدیلی سے آشکار ہوئی۔

کئی ہی ایک کھڑکی جب کھلی تو میں نے خاندانی نظام کے متعلق کچھ زیادہ ہی توجہ سے سوچنا شروع کر دیا۔ ہم دور مغربی نظام میں کتنی مماثلت اور کتنا بعد ہے؟ کیا مشرقی معاشرے کی تنظیم مکمل طور پر خاندان کی مرہون ہے؟ مغرب کو سیکولر سوچ اور جمہوریت نے تو خاندانی نظام کی افادیت سے منکر نہیں کر دیا؟ کیا ہمارے ملک میں ترقی کی راہ میں مذہب اور خاندانی نظام سب سے بڑی رکاوٹ ہے؟ 75۔ جی تک ایسی سوچ اور ایسے سوچنے والے بھی زیادہ سوچنے پر مجبور نہ کیا تھا۔ اب بھی میں نے کسی سے مشورہ کر کے اپنی سوچ کو مناظرے کی شکل نہ دیا۔ سوچ میں فار اینڈ Against دونوں طرف سے دلائل مجھے خود دینا ہوتے تھے۔

میں سوچنے پر مجبور تھی کہ معاشرتی نظام میں شادی سب سے بڑا نظام ہے۔ اس ادارے کی بقا میں مستقبل کا تحفظ سب سے محفوظ ہے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ مغربی تعلیم اور کلچر کی قدم قدم پذیرائی سے مشرقی Idealism مر رہا ہے۔ نظام کو بھی دھچکے لگ رہے تھے۔ بنیادی طور پر کوئی نظام یا ادارہ آدرشوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

میں ہی آدرشوں کی ایک جہتی جماعت نظام اور ادارے کو مضبوطی اور استقامت بخشتی ہے۔ ان ہی آدرشوں کی مدد سے وجود میں آتی ہے، لیکن یہاں پھر ایک خطرہ موجود رہتا ہے۔ اس قدر جڑے رہنے کے باعث مرد اور عورت دونوں عموماً آزادی بھی مجروح ہونے لگتی ہے۔ مغربی معاشرے نے فرد کی آزادی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ وہاں ہر شخص کو یہ زعم ہو گیا ہے کہ وہ قانون کی پابندی کے بعد فرد کی سطح پر مکمل طور پر آزاد ہے۔ وہ کسی کی دخل گیری کرنے کو تیار نہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ اکیلا کافی ہے۔ شخصی آزادی کی آرزو میں مبتلا مرد اور عورت اپنے فیصلے کو سنبھالنے کے لیے جنس اور محبت کی جب تک ذاتی طلب رہے شادی برقرار رہتی ہے۔ جب اندر کے جذبے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں تو دونوں ضرورتوں کی کفالت کرتی ہے اسے برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شخصی آزادی میں حقوق

اور فرائض کی مانگ برابر ہوتی ہے لیکن خاندانی نظام میں بات انسانی حقوق (Human Rights) کی نہیں سمجھتی ہے۔ اپنے حقوق چھوڑ کر بنتا ہے۔

کبھی کبھی بچوں کی معصومیت اور بے بسی کے حوالے سے ماں باپ کو مکمل طور پر اپنی آزادی خوشی اور خوشامد کو توجہ کر مستقبل کی سنہری کنجی ملتی ہے۔ اتنا ایثار قربانی اور انتظار آج کی عورت کے بس کا نہیں۔ راستہ کہیں بہت ہے جس کا علم ہر فرد کی سمجھ اور صلاحیتوں پر ہے۔

بھلا کوئی شخص شادی کیوں کرتا ہے؟

آپ شادی سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

کچھ لوگ ابھی سوچنے کے قابل بھی نہیں ہوتے جب ان کی شادی ماں باپ کی مرضی سے کر دی جاتی ہے۔ لوگ بڑی تابعداری سے ماں باپ کی خاطر مذہب کی انگلی پکڑ کر شادی کو کامیاب بنانے میں گمن رہتے ہیں۔ نزدیکی بچوں کو سرے چڑھانے کا عمل ہی شادی ہے۔ پرانے زمانے میں ایسی شادی ڈولی سے لحد تک ایسے ہی سہارے بھرنے سے بھرتی تھی۔

مغرب میں بھی پہلے یہی مسنک تھا۔ رابرٹ براؤنگ کے اشعار دیکھئے۔

Grow old along with me

The best is yet to be

The last of life for which

The first was made

Our lives are in his hand

لیکن وقت بدل چکا ہے۔

Elizabeth Barret Browning کے ساتھ تو رابرٹ کی بھگتی..... لیکن اب مغرب اس کی

چکا ہے۔

شاید آج کا مرد اس لیے شادی کرتا ہے کہ وہ عورت کی کفالت کر کے اس پر اپنی برتری ثابت کرے۔ کفالت کرنا بیسوں کی حد تک محدود نہیں اور پہلے زمانے میں مرد اس ذمہ داری کو محسوس تک نہ کرتے تھے۔ فلاح قسم کے مردوں کا رویہ کرخت ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف آج کی عورت شادی کے بعد مرد کی خدمت کے بجائے اسے تبدیل کرنے کی موٹو گائیڈوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں مفاہمت کے بجائے مسابقت کا احتمال رہتا ہے۔ انسان محبت بھی کرے اور سیانا بھی ہونا ممکن ہے۔ ایسی عورت سے محبت کرنا جو آپ کو ذمہ داری کا نٹوں سے شہد چاٹنا ہے، لیکن یہ خوف کی رنگ برنگی شکلیں ہیں۔

آج کا ماڈرن مرد اور عورت بھی بچوں پر بہت زور لگاتے ہیں لیکن اس کی وجہ خوف ہے خوف خدا نہیں۔ باپ بچے کو خدائی مہمان نہیں اپنی ذات کی پروڈیکشن سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا سارا زور بچے کی تعلیم پر ہے۔

حیثیت کو ثانوی حیثیت مل گئی ہے۔ یہ عہد دولت، دولت کے حصول اور دولت کے بل بوتے پر اپنی حیثیت کو بچانے کے لیے جو کچھ اس خواہش کی آگ میں جھونکا جاسکے اس سے آج کا ماڈرن انسان دریغ نہیں کرتا۔

سجی کا خوف جب معاشرے کا دائرہ بن کر پھیلتا ہے تو پھر ایک دوسرے کے حالات سے سرد مہری بن کر سب کو فریاد کی سطح پر اور معاشرے کے مجموعی مزاج کے اعتبار سے رزق حرام کی یا پھر خودکشی یا خودکشی حملے کی شکل میں صورت اختیار کر لیتا ہے۔

آج کل کے نوجوان کسی خاص آدرش کے تحت شادی نہیں کرتے۔ عموماً وہ اپنی تنہائی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے سب کچھ کرنا پناگس سناٹھی کے وجود میں دیکھنے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ کچھ فقط مسابقت سے خوفزدہ فقط اپنا جسم دیکھنے کا سوچ کر شادی کر بیٹھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کو سکے کی طرح ہے۔ یہ گرائیڈ منٹ ہے اور بھی ہے اور ہیرا بھی..... دباؤ سہ جائے تو ہیرا ہے ورنہ معمولی کوئٹہ..... اسے ہدی سے نیکی اور متعفن ہدی کا فرق ہے۔ اسی لیے ہر انسان اپنی سوچ، عمل، رویے کے مطابق شادی کو فرحت بخش ٹھنڈا پانی یا کھولتا ہوا پتھر سمجھتا ہے۔

شادی کی شراکت داری میں شامل ہو کر شخصی آزادی کا خواہاں نوجوان Privacy کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ جذبات، خیالات، حالات، اشیاء کی Sharing ختم ہوتی ہے، تو خاندان کا نقل بگڑتا ہے۔ جہاں کہیں خاندان کے بچے کے مقام پر فائز ہو کر لینے کا تقاضا شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں ادارے یا نظام یا جماعت کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، جگہ جگہ افراد چالاک، خود فریبی اور انا کے چکر میں خدمت کرتے ہیں۔ وہاں آہستہ آہستہ ذاتی طاقت کا سفر شروع ہوتا ہے۔ پھر مرد ہو یا عورت وہ پرورش کا فن بھول جاتا ہے اور اپنی پرورش میں لگ جاتا ہے۔ یہیں سے معاشرے کی صورت میں آمریت کا بیج بویا جاتا ہے۔

ہم انسان صرف اپنے حواس خمسہ کی روشنی میں اپنی جسمانی زندگی کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر سوچتا اور زندگی گزارتا ہے۔ اسے اپنی روحانی تلاش کا ادراک تک نہیں ہوتا۔ وہ خدا اور اُنڈب سے وابستگی اور اس سے پیدا ہونے والی خدمت سے بے خبر ہوا کرتا ہے اسی لیے اسے نہ شادی کی سمت، نہ اس کی ذمہ داری ہی کا کوئی احساس ہوتا ہے لیکن یہ مت یقین کر لیں کہ ہمیں اپنی ضروریات سے ہٹ کر بے لوث خدمت کا تصور پیدا ہوتا ہے، خطرہ وہاں بھی موجود رہتا ہے، کیونکہ ہمیں خدمت کا اجر بھی مانگتے ہیں۔ یہاں پھر جماعت کی خدمت بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان جب اندر ہی اندر سے سبکدوش ہوتا ہے تو وہ اپنے متعلق سوچتا ہے۔ وہاں پھر Power کا تصور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اپنے چکر میں پھنس جاتا ہے۔

دن و نونوں صورتوں سے بچنے کے لیے اگر انسان کو صرف اپنا کردار، اخلاق اور اندرونی بالیدگی کے سفر کا خیال ہو، تو اللہ کو قرض حد دینے کے چکر میں ہو تو شاید اس کے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کسی کو مرعوب کرنے کے لیے اسے کوٹھیک کرنے کا جنون ہو تو شادی اور زندگی دونوں کا سفر رائیگاں جاتا ہے۔

اگر اپنے آپ کو درست کرنے کے ارادے سے انسان کو ایسے تھیلے کی ضرورت ہو جس میں بیٹھ کر وہ عرفان



ذات اور اس سوچ بچار کے نتیجے میں اپنی غلطیاں ٹھیک کرنے کے لیے وقت درکار ہو تو اس عزت نشینی کے لیے جسے ذیل میں درج ہیں:

- 1- ملنے والے بار بار گھر آنے والے افسران سے اپنے لیے نوکری میں 'Extension' بیٹے کے لیے درخواست کی جاتی ہے۔ بیٹی کی ترقی کے لیے اصرار شروع کر دیں..... بھینٹ چھٹ جائے گی۔
- 2- امیر رشتہ داروں سے قرض کی درخواست کریں۔
- 3- طبقہ اناس کی نوجوان عورتوں، لڑکیوں سے پردے کی خوبیاں شوہر کی اطاعت اور ہر طرف سے سچے سچے بیان کریں۔
- 4- بوڑھی عورتوں کو اپنی اور گھر والوں کی خدمت پر اکسائیں۔ وہ بھاگ جائیں گی۔
- 5- ملازمین کو ڈسپلن سکھائیں۔ ملازم حضرات اپنی مصیبتوں کو لے کر آپ کے گرد جمع نہیں ہوں گے۔
- 6- مہمان سے تقاضا کریں کہ وہ گھر آنے سے پہلے اطلاع ضرور دے اور کتنی دیر ٹھہرے گا اس کا تعین سے پہلے کر دے۔

اس ہدایت نامے پر عمل کرنے سے آپ کو وہ تنہائی نصیب ہوگی جو عرفان ذات کے لیے وقف کی جاتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس ہدایت نامے پر عمل کر کے تنہائی کے اوقات کسی اور منفی عمل کے لیے بھی استعمال میں لاسکتے ہیں۔ انسان کو سمجھنا ویسے ہی بہت مشکل ہے کیونکہ کسی کی نیت کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے علم غیب ہی رہنمائی کر سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو انسان اپنی نیت کو بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا۔ اسی نیت کی بدولت بڑے گھپے ہوتے ہیں۔ خاص کر وہ لوگ جو لمبے سفر میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا عزم کرتے ہیں، کبھی شوہر ہیرے کا ہار بھی بری سے لے آتا ہے اور کبھی آپ ہی کا دوپٹہ اچھی نیت سے آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ کبھی راتوں کو جاگ کر اندر لہن سننے والی ماں بھی اپنے عمل کو کھونا کر دیتی ہے اور بعض اوقات اچھی نیت سے چائنا رسید کرنے والی کسی کی عاقبت سزا کا موجب بن جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں یقیناً آپ نے مجھ سے زیادہ سوچا ہوگا لیکن میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسان کے سائیکل کے ہب کی مانند ہے۔ ساری خوبیوں، خرابیوں کی سپوکیں اسی ہب یا ڈھرے سے جڑی ہیں۔ سپوک ہب سے اکھڑ جاتی ہے، اسی لمحے سائیکل کی رفتار متاثر ہو جاتی ہے۔ نیت کی خرابی کے باعث جو خوبی کسی خوبی پر نازاں ہونے لگتا ہے، وہ گھائے کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور کسی کو نقصان پہنچنے نہ پہنچے اس کی اپنی ذات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

میں چوری چوری خاں صاحب کے اعمال اور اقوال کا جائزہ لیا کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کبھی اپنے دست سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ یہاں ان کی ازلی غیرت ان کی نیت کو قبلہ رو رکھتی۔ انہیں بارہا دیکھا، بڑی بڑی آئیں لیکن انہوں نے کبھی اپنے کسی بھانجے، بھتیجے، بھائی یا اپنے بیٹے تک کو ٹیلی فون ملا کر یہ نہیں کہا کہ مجھ پر یہ اتنا ہے۔ میری اعانت کو آؤ۔

تیس دن اس کے ساتھ ہی اگر کسی اور کی چھوٹی سی تکلیف بھی پتہ چلی فوراً کا سہ گدائی اٹھایا۔ دفنوں کے باہر بیٹھے۔ لایا کر لوٹے۔ لوگوں کا بھرم رکھنے کے لیے ان کی عزت نفس کا تحفظ کرنے کے لیے انہوں نے سفارشیں کی۔ سب سے مانگا اپنا خرچ کم کیا لیکن میری اتنی ذلت ہوئی کبھی کسی پراحسان نہ دھرا کسی انسان کی کمر میں مکا مار کر کھینچ بھی نہیں کہا: ”تیری وجہ سے نیت تو دور کی بات ہے، وہ تو پختی اور موروثی غیرت مند تھے۔ ایک ہب سے ان کی غیرت خرابی اور خرابیاں جزی تھیں۔“

لیکن کیا کیا جائے انسان تو ہمیشہ تضاد کا شکار رہتا ہے۔ یہی ایک خوبی جو ان سنت خوبیوں کا باعث ہوتی ہے یہی اس کی خرابی کی وجہ بھی ہوتی ہے۔

میں صاحب بھی اپنے نسلی گروپ کی بنیادی خوبی ”غیرت“ سے آراستہ تھے۔ یوں وہ اپنی Genetics سے متاثر ہو نہ ہو سکے۔ شاید اسی بنیادی وصف کا ذکر قرآن میں ملتا ہے کہ تم قبیوں میں بٹ جاؤ تا کہ یہ قبیلے تمہاری عزت کا باعث ہوں۔ ایک اور مثال سے بات آگے بڑھائی جاسکتی ہے۔ سفید فاقوں کی بنیادی خوبی خلق خدا کی خدمت ہے۔ وہ خدمت کے جذبے کے تحت محبت کا جھنڈا اٹھا کر بڑے جوش و خروش سے رفاہی کام کرتے ہیں۔ اس موقع پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری کر کے کسی معاشرے کو تباہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ وہ بڑے جوش سے کسی ہستی کو تباہ کر کے پھر اس کو کھلی کھلی کھولیں گے اور بے دریغ مدد کریں گے۔ اسی خدمت کا تجربہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ غیرت کا غم البدل نہیں اور محنت کسی بھی طور خدمت کے درجے کو نہیں پہنچتی۔

میں صاحب بھی پٹھانوں کی طرح غیرت مند تھے۔ اسی خوبی نے انہیں بہادر بنایا۔ آدرشوں کی مشکل زندگی کو سہل کیا لیکن اسی خوبی نے ان کے اندر گہری چپ کو جنم دیا۔ وہ اپنے غم اپنی خوشی کو اندر ہی اندر چھو گم کی طرح رکھتے لیکن کسی دوسرے پر اندر کے موسم کا حال نہ کہتے۔ محنت زینتی خاں صاحب کو گونجا کہتے تھے۔ مسلسل کرید کے لیے دوست ہار جاتے لیکن ان کے لب تک کوئی حرف شکایت نہ آتا۔

میں نے خاں صاحب کی اس خرابی کے ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا۔ میں جانتی تھی اس رازداری کے باعث ہم نفسی ان کے ساتھ نہیں۔ وہ غیرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ غیرت مند طبقاً اس آدمی ہوا کرتا ہے۔ دوسروں کو آس نیاں بخشنے والا ہے۔ چپ اداس آدمی تھا۔

مجھے اسی غیرت نے بہت نفع پہنچایا۔ اسی خوبی نے خاں صاحب کو میری پوری کفالت کرنے پر آمادہ کیا۔ انہوں نے مجھے تو مجھے کبھی بگری سینٹ لانے کو نہیں کہا۔ آپ کو یقین تو نہیں آئے گا لیکن 121 سی میں جب ہم آئے تو مجھے کس طرح وہ ڈیوڑھا کام کرتے تھے۔ وہ گھر تعمیر ہوا کیسے ہوا کیسے اس کا نقشہ پاس کرایا گیا؟ ٹھیکے دار خدام کہاں کیسے رہتے تھے؟ بگری کیسے آئی؟ سر یا شیشہ کنڈے چھیکے کون خریدنے گیا؟ میں تو آرام سے بچوں سمیت اس وقت آئی جب گھر پینٹ پاش سے چمکتا دلہن کی طرح جگمگاتا کھڑا تھا۔

پتہ جس روز اس گھر کی بنیادیں کھودنے کا دن تھا ایک روز صبح سویرے خاں صاحب اپنی فوکسی میں آئے۔ پتہ سے واپسی شاذ ہی کرتے تھے۔ میں کھانے کے کمرے میں آند سے بیٹھی لکھ رہی تھی۔

”قدسیہ.....!“

”جی آپ کہاں؟“

”جلدی چلو اماں جی کار میں بیٹھی ہیں۔“

”تو انہیں اندر لے آئیے ناں۔“

میں نے سوال نہ کیا کہ اماں جی کار میں کیوں بیٹھی ہیں۔ کار تک پہنچنے میں انہوں نے صرف ایک منٹ

کیا: ”بچے کہاں ہیں؟“

”سکول جی۔“

”اچھا۔“

اماں جی سردار ٹیگہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہی گورا چٹا خوبصورت خوش مزاج وجود۔ بڑی خوش

میرے سلام کا جواب دیا..... فون کسی روانہ ہوگئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟

جہاں اب 121۔ سی ہے اس گھر کے باتیں ہاتھ سسکھوں کے زمانے کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔ باقی سارا

حد تک اجازت تھا۔ کار عین اسی جگہ آ کر رکی جہاں اب داستان سرائے کا بورڈ نصب ہے۔ ہادوی رنگ کی فونسی

صاحب اترے۔ میں بھی ان کی دیکھا دیکھی اتر گئی۔ اماں جی کسی سہارے ناٹھی کے بغیر آرام سے اتر کر خاں صاحب

ساتھ ہو گئیں۔

فضا میں تازہ منی اور اماں جی کے عطر کی خوشبو تھی۔ شاید آپ کو خیال آئے کہ اتنے برس گزر جانے کے

میرے اصلی جذبات میرے ذہن میں دھندلا گئے ہیں لیکن سچ بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت بھی خاں صاحب اور

کے تعلق پر حسرت نہیں آیا۔ میں اس وقت بھی اپنے آپ کو غائب سمجھتی تھی۔ آج بھی میرا خیال ہے جو نو جوان بہو پانچ

کے حقوق کو اپنے حقوق پر فائز نہیں سمجھتی وہ بڑی غلطی پر ہے۔

مجھے علم نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اجازتی جگہ پڑ سڑک پار ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ یہ ٹیوب ویل کا

تھا جو ماڈل ناؤن میں پانی کی ترسیل کا کام تھا۔ برساتوں میں پانی نالے سے نکل کر آہستہ آہستہ دور تک رستے لگا

زمین کے دائیں طرف سر ظفر اللہ خاں کا پرانا سکھوں کے عہد کا بنا ہوا گھر تھا۔

دائیں جانب بھی سکھوں کے عہد کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔ سر ظفر اللہ کی کوٹھی ہمارے آنے تک ان کی

ملکیت بن گئی..... لیکن وہ لندن میں رہتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ پاکستان آتی اور ربوہ جاتی تو ان کی طرف سے محبت

چارے کا بھر پور مظاہرہ ہوتا۔ ایک بار وہ مجھے ربوہ بھی لے گئی جہاں میں نے کالج کے ایک بڑے فنکشن میں شمولیت

ہماری زمین پر دو تین مزدور صورت آدمی کھڑے تھے۔ پھر ایک جھگی سے محمد علی ہمارا پرانا خدمت

ٹھیکیدار خادم برآمد ہوئے۔ ہم وہاں پہنچے جہاں بچوں کا بیڈروم بنا۔ خادم نے آتے ہی خاں صاحب اور اماں جی کو

اور اماں جی سے دعا کی است دعا کی۔ اماں جی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ہم سب نے تقلید کی۔

پھر اماں جی کے ہاتھ میں گینتی پکڑا کر کہا: ”اماں جی! یہاں تک لگا دیجیے۔ کھدائی ہم خود کر لیں گے۔“

بہتر دست تھیں۔ ایک ہی ہلے میں کافی گہرا ٹک لگا دیا۔ لیجیے داستان سرائے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس کے بعد کئی کئی گھنٹے کیوں کر بنا۔ اس میں کیا کیا کبھیڑے تھے۔ کیا کیا اڑچینیں تھیں، مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ میں صرف یہ جانتی تھی کہ حساب کتاب رکھنا تھا اور عبدالرزاق رات کو دفتر کے بعد جھگی میں سامان کی نگرانی کے لیے ہوتا تھا۔ جس روز وہ خاں صاحب مجھے لے کر یہاں پہنچے۔

پھر سامنے جیسے کھل جاسم سم بن کر ایک بنا بنا یا پختہ گھر پلک جھپکے وارو ہو گیا۔ خادم ٹھیکیدار برآمدے میں کھڑا تھا۔ مرمرو کے فرش فیشن میں ہیں۔ کچھ وی آئی پی فرشوں کو ٹیک کی کٹری سے وئیر کر رہے ہیں لیکن 1970ء میں یہ فرش انتہائی۔ جوں جوں وقت بدلتا ہے ایجادات نئی چکا چونڈے کر درتی ہیں۔ فیشن بھی تبدیلی کے آشنا ہو گیا۔ اب سنگ مرمرو اور مٹری سے آہنی فرش چکائے جاتے ہیں۔ آگے جانے یا ہوگا۔

خادم کے ہاتھ میں گھر کے مین دروازے کی چابیاں تھیں۔ ہم دونوں کے آنے پر اس نے بڑے فخریہ انداز میں کھول دیا۔ خاں صاحب کو چابی دینا چاہی۔

”مجھے کیوں چابی دے رہے ہو۔ بھائی مالکن کو دو۔۔۔۔۔ یہ جانے اور اس کی چابیاں۔۔۔۔۔“

میں کچھ مجھوب، کچھ رنگ، کچھ پریشان لہجے برآمدے میں چلنے لگی۔ ساتھ ساتھ خادم نے پہلے گیٹ روم پھر پچوں کے کمروں کے تالے کھولے۔۔۔۔۔ اوپر جانے والی سیڑھیاں دکھائیں۔

”بی بی جی اوپر ابھی صرف خاں صاحب کی لائبریری ہی بنی ہے۔“

”بہت ہے خادم بہت ہے۔ ہماری ضرورت کے لیے بہت ہے۔“

”پتہ نہیں جی کیا بات ہے آج محمد علی اور عبدالرزاق نہیں آئے۔“

یوں لگتا ہے کہ محمد علی وفاداری کا سہل بن کر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا۔ اس نے سارے گھر کا حساب کتاب لکھا اور کچھ کی لکھی ہوئی یہ کاپی ابھی تک موجود ہے جس میں پائی پائی کا حساب ہے۔ عبدالرزاق رات کو گھر میں سویا کرنا اس کی خوب نگرانی کرتا تھا۔

”مرید کام کر رہا ہے خاں صاحب اس سے مل کر جائے گا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ لیکن انہوں نے میرے ساتھ گیراج کا چکر نہیں لگایا۔ مرید گیراج میں مٹری کا کام کیا کرتا تھا۔ کوٹھی بنانے کے بعد اس نے گھر کے لیے پنگ، پنچیں، شیلٹ، کتابوں کی الماریاں بھی تیار کیں۔ ہم اپنے ساتھ وہ تخت سیٹ کھانے کی میز کرسیاں لائے جو کچھ سامان تو شیخوپورہ میں مہاجرین کا سامان نیلام ہونے کے وقت خریدا گیا تھا اور دھر دھر سے اکٹھا ہو گیا تھا۔

جس طرح بنا بنایا گھر مجھے ملا، اسی طرح سامان ڈھونڈنے اس کو فرنیچر سے سجانے اس میں پرانے پردے تانگنے، بیابانہ جلانے کا سب انتظام موجود تھا۔ میں نے ان امور خانہ داری میں نہ کوئی دلچسپی لی نہ یہ سمجھا کہ مجھے کسی قسم کے مزے ضرورت ہے۔

اس گھر کے پہلے مین خاں صاحب، انیق، انیس اور اشیر اور بانو قدسیہ مقرر ہوئے۔ 75۔ جی کا گھر بڑی لائق

سے چھوڑ کر ہم لوگ ایک نئے دور میں داخل ہو گئے۔ ابھی بچکان ڈویژن ماڈل سکول میں رمضان بھائی کے ساتھ تھے، لیکن یہاں سے سکول کا فاصلہ کافی تھا۔ فوراً ہی سائیکوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔

تینوں بچے ماسٹر بیڈروم کے ساتھ والے کمرے میں Discussion کرتے۔

”بھئی لینا ہے تو ریلے کا سائیکل ہی لینا ہے۔“

”ابو کی ہو پرل گئی ہے۔ اب وہ نیا سائیکل لے کر نہیں دیں گے۔“

”ہم تینوں کیسے ایک ہو پر پر جا سکتے ہیں سکول؟“

اشق بہادر بن کر کہتا..... ”تم ایشی ڈنڈے پر لانا کیر بیڑ پر اور میں سائیکل چلاؤں گا۔“

”اور نئے؟“

”وہ بھی ہوں گے تمہاری گود میں۔“

یہ مباحثے ضرور ہوتے لیکن جوڑی میں کمرے میں پہنچتی وہ تینوں چپ ہو جاتے۔ یہ بات یہاں اس لیے ذکر ہے کہ میں آپ کو کچھ بچوں کی حیثیت کے متعلق اور کچھ اپنی اور خاں صاحب کی تربیت کے متعلق عرض کر سکتا ہوں۔ اسے میرے بچوں کی جہتی کمزوری یا پیدا کنٹی گونا گپن کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کا کبھی برملا اظہار کرتے۔

شاید اسی لیے ان میں مسابقت کا جذبہ کم ہے۔ ہو سکتا ہے اسی گونگے پن نے ان میں خود اعتمادی پیدا کی ہوئی ہو۔ دی کیونکہ منوانے والا عموماً لیدر صفات کا حامل ہوا کرتا ہے۔ وہ مکا دکھا کر میز بجا کر انگلی اٹھا کر دوسروں کی پستی دیتا ہے۔ آج کے عہد کے بچے مانتے والے عہد سے نکل کر منوانے والے عہد کے نمائندہ ہیں۔ وہ ماں باپ کے ساتھ استاد کو بے وقعت اور اپنے سے عمر میں بڑے کی بے عزتی کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے۔

121۔ اسی میں آئے تو ہمارے بچے بکریاں تھے۔ شاید انہیں مجھ سے محبت زیادہ تھی یا خوف کا عنصر تھا۔ انہوں نے کبھی دو بدو بحث کر کے اپنی منوانے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی خواہشات کے بیان میں بھی غالباً یہی دو جذبے تھے۔ انہوں نے کبھی دھونس کے ساتھ کچھ نہیں، لگا۔ اشق احمد صاحب جب سکول میں فٹ بال ٹیم کے کھلاڑی بنے تو انہیں فٹ بال کے جوڑوں کی اشد ضرورت تھی۔ استاد کی جھڑکیوں سے عاجز آ کر بڑی لجاجت سے ایک روز انہوں نے کہا..... ”امی وہ فٹ بال کے ٹیچر ناراض ہوتے ہیں.....“

”کیوں؟“

”جب فٹ بال کی بست ٹھیک نہیں لگتی۔“

”کہاں کھیلتے ہو فٹ بال۔“

”یہ جی..... جو سکول کے سامنے گراؤنڈ ہے اس میں۔“

پہلے تو میرا جی چاہا کہ میں اسے فٹ بال کھیلنے سے منع کر دوں، پر وہ میرے منع کرنے سے پہلے بولا..... ”جی انہوں نے مجھے ٹیچر بھی مارا۔ کہتے ہیں اگر بوٹ نہ لائے تو اور ماروں گا۔“

تس ہمیشہ سے مار پیٹ کے خلاف ہوں۔ اس میں کچھ دخل میری خوفزدہ ذہنیت کا بھی ہے۔ خوف زدگی کئی اور صورتیں بنا کرتی ہے۔ خوف بزوری اور جھوٹ کو جنم دیتا ہے۔ سراسیمگی اور اداسی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر مشفاق سے ملوں گی اور ان میجر صاحبان کے خلاف مقدمہ دائر کروں گی جو میرے بچوں کو مارنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

”کون کون مارتا ہے تمہیں؟“

”ماتے تو سبھی ہیں لیکن سب سے زیادہ اردو کے میجر ہاتھ اٹھاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں یہ اردو کے اتنے بچے ہیں؟ خاک باپ کا نام روشن کرو گے؟“

مہنت پال کے بولوں کے لیے میں نے بیس روپے مارے ہاتھ سے انٹق کو دے دیئے۔ اس وقت یہ بہت بڑی

سیرے دن میں فلش میں بحری سکول پہنچی۔ ڈاکٹر مشفاق ایک بڑے ہی سنبھلے ہوئے مہنت سے ڈسپلن کرنے میں تھے۔ ان کا کیریئر دہلی کے ایک ماڈل سکول کو سنبھالنے میں ختم ہوا۔

میں نے کرسی پر بیٹھنے ہی کہا..... ”اگر میرے بچوں کو کسی نے ہاتھ لگا یا تو میں اسی دن انہیں سکول سے اٹھانوں گی۔ صحت میں..... مجھے اپنی تعلیم نہیں چاہیے.....“

میرے بچوں نے واقعتاً تعلیم کی طرف توجہ نہ دی۔ مجھے اس کی تین وجوہات نظر آتی ہیں۔ خاں صاحب مکمل پڑھتے نہ تھے۔ اس اعتماد کی غائبی وجہ ان کی اردو بورڈ میں مصروفیات اور پھر ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن سہولتوں اور کام بھی ایسا تھا کہ انہیں بچوں کی طرف سے غفلت برتا پڑی۔ وہ اپنے بچوں کو سوئمنگ سکھانے لگی تھی۔ سوئمنگ پول پر ضرور لے جاتے۔ اگر وہ کسی گاؤں میں رہتے تو یقیناً وہ اپنے بچوں کو گھڑ سواری بھی سکھاتے لیکن وہ علم حاصل کر رہے ہیں اس کی طرف ان کی توجہ نہ تھی۔

یہ تینوں اپنے اپنے گونگے پن میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ انٹق جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو ہم سے پیسے نہ دے سکتی جو اکثر ہوتا، وہ وہ اپنی پڑھائی پر گورنمنٹ کالج سے پیدل گھرا جاتا..... یہ ایک بہت لمبا فاصلہ تھا۔ اس نے کبھی شکایت نہیں کی..... انہیں کاریکارڈ ہے کہ اس نے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ کالج میں جانے کے بعد اسے کبھی بازار لے بھی جاتی تو بھی وہ خالی ہاتھ ہی لوٹ آتا۔ آج تک اس کی یہی عادت ہے۔ وہ دوسروں کی شکایتیں نہ کرتا تھا۔

تیسرے خاں ان دونوں سے قدرے مختلف ہے۔ وہ قدرے اپنی منوانے والا بچہ ہے۔ بچپن میں اسے جگر کا پتھر ہو گیا تھا۔ اس بیماری کا چکر لمبا تھا اور اسی کی وجہ سے ہم اسے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

پہلے تیسری سے استادوں نے ان سے رویہ سخت رکھا۔ ان میں وہ شفقت اور شاگرد نوازی نہ تھی جس کی بدولت ماسٹر صاحب کی زندگی میں گڈ ریا بن گئے۔ پھر جب خاں صاحب دھرم پورہ میں بابا فضل شاہ کے ڈیرے پر آئے تو ایک اور سمت کے مسافر بن گئے۔ اب ان کا فلسفہ حیات بدل گیا۔ ہمارے گھر میں برآمدے ہی میں دو بورڈ

نصب تھے۔ ان پر باباجی نوروالوں کے اقوال زڑیں اگائے جاتے تھے۔ ان میں جا بجا تعلیم کے منافی اقوال تھے صاحب گفتگو میں بھی عام طور پر یہ کہتے نظر آتے کہ:

”ان پڑھ انسان نے پاکستان کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے۔“

انہوں نے اس بات کا غالباً اندازہ نہ لگایا کہ مغرب اپنی تمام قوت Strategy اور علم کے ساتھ بہت دور رس نتائج کی سکیموں کے ہمراہ اسلامی ریاستوں کو رومانیت دین داری بھائی چارہ اور اخوت کی قدروں سے دنیاوی اور مادی ترقی کا عادی بنا رہا تھا۔ ہم دونوں نے بچوں کی مسابقت پر اکتہار نہ کیا۔ بچوں میں وہ خود اعتمادی جو مسابقت کی فضا میں جنم لینے والوں کی عادت بن جاتی ہے۔

سب سے بڑا نقص جو میرے بچوں کی تعلیم کا ہوا وہ میرا رویہ تھا۔ مجھے کام کو جانے بغیر اس سمندر میں کھانسی کی عادت ہے۔ میں پڑھانے کا فن نہیں جانتی تھی لیکن مسرتھی کہ انہیں میں ہی پڑھاؤں گی۔ مجھے سائنس نامی کسی چیز نہیں تھا لیکن میں ہندتھی کہ فزکس کی مسرتھی بھی میں ہی پڑھاؤں گی۔ میرے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ میں کتاب پڑھتی جاتی اور انہیں سناتی تھی۔

جتنی سمجھ مجھے آجاتی وہ تعلیم ناکافی تھی۔ میرے ساتھ اینق بیٹھے۔ وہ غالباً اس لیے کتاب پر توجہ دینے کی سعادت مند طبیعت میں میری محبت موجب تھی۔ اس کے بعد انہیں بیٹھا کرتا۔ وہ عموماً کتاب سے کچھ نقل کر کے مشغول رہتا۔ اشیر خاں بہت چھوٹا تھا۔ وہ یا تو چھٹی کر لیتا یا قاعدہ کا پی ویکھ کر وقت نالاز رہتا۔

اینق خاں کو بھی تعلیم کا شوق کم کم تھا لیکن اس نے بھی کبھی اندر آفتاب بھائی کا مقولہ ٹانگ رکھا تھا۔ بھائی ”اپنے والد کی خاطر“ وکیل بن گئے۔ اینق بھی اپنی ماں کی خاطر پی ایچ ڈی کر گئے اور ایم۔ ایس۔ سی (سائنس) میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔

جس روز اینق بیٹے کو گولڈ میڈل ملا۔ وہ پھولوں کے ہاروں سے لدا گھرا آیا تو اس کا خیال تھا سارے افراد میری والدہ ناناکا کی طرح خوشی سے چٹھیں ماریں گے۔ تا لیاں گونجیں گی اور اسے اپنی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ گولڈ میڈل ہاتھ میں لیے ہاروں سے لدا پھندا وہ ہمارے بیدروم میں آیا۔ خاں صاحب حسب عادت مخصوص ٹیبل کے آگے کرسی کھینچے کتابوں کی ورق گردانی میں مشغول تھے۔

”ایلیکسیو زی ابو.....“ اینق بولے۔

ابو نے نظریں کتاب سے اٹھائے بغیر آہستہ سے ”ہوں“ کہا۔

”ابو مجھے گولڈ میڈل ملا ہے۔ میں ایم ایس سی میں فرسٹ آیا ہوں۔“

اب بھی انہوں نے اینق پر نظر نہ کی اور اپنے خیالوں میں مشغول لائق سے بولے ”اچھی بات ہے“

”ہوا“

میں نے اشارے سے اینق صاحب کو بلایا: ”میرے پیچھے آؤ اور یہ ہار گلے سے نہ اتارو..... ہم تمہارے“

ہے۔ میں نے ”سڑک پر پہنچ کر میں نے ایک رکشہ رکوایا۔ اس میں ہم دونوں سوار ہوئے اور ڈویژنل پبلک سکول پہنچے۔  
صاحب کے دفتر کا دروازہ کھلا تھا۔ ہم دونوں اندر گئے تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”تمیہ آپ کا ہونہار انیق ہے سر۔ اسے ایم ایس سی میں گولڈ میڈل ملا ہے۔ میں سمجھتی ہوں آپ سے زیادہ کسی کو  
انیق خوشی نہیں ہو سکتی۔“ انہوں نے انیق کی طرف بڑھتے ہوئے دعاؤں کی ایک قطار لگا دی۔

”آپ دیکھیں گی یہ ملک وقوم کا نام روشن کرے گا۔ اسے نوٹل پرائز ملے گا۔ سکول کا نام تو روشن ہو گا ہی۔“

انیق نے اپنے ہاران کے گلے میں ڈال دیے۔ وہ ہاروں سمیت اس سے ہٹلگیر ہو گئے۔ ہم تینوں کی آنکھیں  
سے نم ہو گئیں۔ نہ کوئی پارٹی نہ مٹھائی بانٹی گئی۔ لیکن انیق اسی محبت پر خوش ہو گیا۔ اس نے اس رول آف آنر کو فریم میں  
لگا کر کسی دیوار پر نہانا لگا صرف اپنے دل کی تمنی پر کہیں چوری چوری آویزاں کر لیا اور بس!

سر مہری کا ایک واقعہ شیرخان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ بنیادی طور پر کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ این ڈی ایف سی  
سے بیٹکوں کے درمیان کرکٹ میچ کھیلے گئے۔ یہ اپنے بینک میں کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ حسن اتفاق سے این ڈی  
ایف سی ٹیم سارے بیٹکوں سے مقابلہ جیت گئی۔ شیر احمد خاں کو مین آف دی میچ کی ٹرافی ملی..... ایک بار وہ بھی ہاتھ میں  
کے کرکٹ پینچا تو خاں صاحب تقین شاہ لکھنے میں مصروف تھے.....

”ٹرافی ابو..... میں آف دی میچ“ لیکن ابو لکھتے رہے۔ نظر اٹھائی نہ ٹرافی دیکھی۔ نہ مین آف دی میچ پر نظر ڈالی۔  
”کتابوں کی الماری کے اوپر سجا دو“ شیر دل برداشتہ ٹرافی لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور ٹرافی کو اپنے  
کے نیچے چھپا دیا.....

میں اپنی Genes سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی ہمارے باپ دادا ہم میں سے اچانک برآمد ہو  
تے ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ہمارا بس نہیں چلتا۔ خوشی کے موقعوں پر اسی طرح کہیں سے بابا جی محمد خاں اشفاق  
کی شخصیت کو Take over کر لیتے تھے۔

خان صاحب بتایا کرتے تھے کہ بابا جی میں ڈھکا چھپا غصہ بمتہ اردافر تھا۔ کوئی انہیں خوشی کا اظہار کرتا نظر آتا تو  
میں میں آجاتے۔ ایک روز خاں صاحب کے بڑے بھائی اسحاق احمد خاں سکول سے انعام لے کر آئے۔ بابا جی  
کے ذہن کی ڈبیاں بیک کروا رہے تھے۔

”یہ دیکھئے بابا جی! سکول سے مجھے فرسٹ آنے پر انعام ملا ہے۔“

بابا جی نے آنکھ اٹھا کر بھی انعام پر نظر نہ ڈالی اور بولے: ”ججو! مجھے افسوس ہے تم انعام لینے والے ہو..... کاش تم  
سے لینے والے ہوتے تو مجھے خوشی ہوتی.....“

انیق پی ایچ۔ ڈی کر گئے اور ایم۔ ایس۔ سی (سایکلوجی) میں گولڈ میڈل حاصل کیا لیکن اس کی اصلی توجہ طلسم  
تکف العجب الف لیلی جیسی کتابوں پر مرکوز ہو گئی۔ وہ انجانے میں معلوم سے زیادہ نامعلوم شعور سے آگے لاشعور  
تقی سے نکل کر روحانیت کی طرف مائل ہو گیا۔ پھر سونے پر سہاگہ وہ محضلیں ہوئیں جب خاں صاحب واصف علی



واصف کی محفلوں میں جانے لگے۔ تین سال ایٹق ہر رات اپنے ابو جی کے ساتھ رات گئے تو واصف صاحب کی سمجھ میں شرکت کرتا رہا۔ اس کا وہ شوق جو Para-Psychology پر بیچ ہوا ان راتوں سے ہی شروع ہوا۔

انہیں کے لیے تعلیم بہت مشکل تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں کلاسوں کے بجائے باہر Oval میں بیٹھا رہتا۔ گھر لوٹنے کا وقت آتا تو عمو چپ چاپ بس لے کر گھر لوٹ آتا۔ اس کی سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ اس نے رات گھر کسی سے کوئی مدد مانگی نہ ہی اعانت چاہی۔ وہ بچپن سے باپ پرست تھا۔ ان کے سارے کام کر کے راحت محسوس ہوتی۔ میرے بچوں میں ایک وہی ہے جو بازار سے سودا سلف بھی لے آتا۔ ابو کے پروگرام ”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ بھی لے کر ذمہ داری تھی۔

اشیر نے سکول سے ہی کلاسوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ بمشکل ترمیموں میں جماعت کی اور ماڈل ٹائون کے کالج سے ہی داخلہ لے لیا، لیکن ایف اے کے امتحان سے چند سینیٹے پہلے اس نے کالج بھی چھوڑ دیا اور پرائیویٹ ایف اے کے لیے نیے آئرش میں ٹیوشن رکھوا لی۔

ٹیوٹر بھی وہ اپنی پسند سے گھر لے آیا۔ امجد ٹیوٹر سمجھا اور دوست زیادہ۔ ہمارے گھر ہی منتقل ہو گیا اور اشیر کو لاہور بری میں بیٹھ کر پڑھانے لگا۔ بد قسمتی سے اسے اچھی اپنے مستقبل کی فکر اشیر کی پڑھائی سے زیادہ تھی۔ اس نے کالج ہاں رہ کر Luims کے پیپوز کو کورس کیے۔ اپنے بے ایک مشین بنائی جو انٹرنیٹ کی کاپی تھی اور اس پر زیادہ توجہ دینے لگا۔ گورنمنٹ کالج میں میرے کسی بیٹے کو میرے پر داخلہ نہ مل سکا، لیکن ان میں موسیقی کا شغف قدرتی تھا۔ توسط انہیں داخلے ملے اور تینوں نے بی اے گورنمنٹ کالج سے کیا۔

طلبہ بچانے کے لیے ایٹق و ایک ماسٹر لکھ کر دیا تو وہ سڑ بھی قریب سا رادن گھر پر زرنے لگا۔ ایٹق تو صلیب دیکھتے ہی تھے لیکن اشیر بیٹے نے سن سن کر ہی اس میں مہارت حاصل کر لی۔ جب ایٹق امریکہ سدھارے تو حسب محمد کے ساتھ نیویارک میں ایک سٹیج شو میں ان کی سنگت کی تھی اور انہیں خوب سراہا گیا تھا۔

بی اے میں ایٹق نے اشیر کو ایک طریق سے ٹیوشن اختیار کر لی اور چونکہ اس کا مضمون بھی نفسیات تھا اس لیے اشیر میاں کو اس مضمون میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بی اے کے بعد اشیر نے G.R.E کا امتحان دیا۔ پرچے خوب ہوئے اور خیال تھا کہ وہ کسی فارن یونیورسٹی میں پڑھنے چلا جائے گا لیکن جی آرای کے پرچے گم ہو گئے اور اس طرح ایک بار تعلیم سے متنفر ہوا۔

اگر ایٹق اپنی صلاحیتوں کے مطابق ڈاکٹر بن جاتا تو اس انسانیت پسند کا کیریئر مختلف ہوتا۔ یا اگر وہ موسیقی سے وابستہ ہو جاتا تو شاید؟

انہیں انجینئر تھا۔ اسے عمارتیں اسارنے کا شوق تھا، لیکن اس نے باپ کے فیصلے سے مارے باندھے بیٹھے اے کر لیا..... برس برس Frustration کا ذکر میں تفصیل سے اس لیے نہیں کر سکتی کیونکہ پھر یہ کتاب ایک دوسری قسم کے ہو جائے گی۔ مجھے تو یہاں صرف اپنی اور خاں صاحب کی غفلت کے باعث جو نتائج نکلے ان کا ذکر کرنا ہے۔

اشیر نے بھی مارے باندھے فنانس میں ماسٹر کر لیا۔ اس کے علاوہ اس نے ہمیں خوش کرنے کے لیے بیکنگ

ہاں میں بھی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر لیں، لیکن اخیر سپورٹس مین تھا، اگر وہ کرکٹ میں چلا جاتا یا فلائنگ جس کا کیریئر کرتا تو شاید اس میں پروفیشن کا درست چناؤ تحریک اور خود اعتمادی کا باعث بنتا۔ ہم دونوں نے ان کے لیے یہ لیکن ان کی اصل مدد نہ کی۔

تو جے کے عہد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ماں باپ بچوں کو دھونس سے اپنی مرضی کی ڈگریاں دلوار ہے ہیں لیکن کچھ وقت میں انہیں سٹروں کی ایک پوری کھیپ راستہ بدل کر کبھی ایم بی اے کرنے نکل جاتی ہے، کسی کو بزنس کلاس اپنی کوششوں سے۔ ماں باپ میں وہ وسعت قلب یا وسعت نظر نہیں ہوتی جو بچوں کے رجحان، صلاحیت اور ارادوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

بچوں کے بچوں نے بظاہر دنیا جیت لی لیکن وہ اپنے اندر پچھلے اور اس رہتے چلے گئے۔ میں بھی ایک ایسی کوشش کی تربیت اور تعلیم دونوں ٹھک بازی تھیں۔ میں صرف pamper کرنے کو خوبی سمجھتی تھی۔ میں ان کو ہوم اسکول کے بجائے ان کا ہوم ورک کرنے کی عادی تھی۔ یہ تینوں اپنے آبائی لوگوں کی طرح بے حد شریف اور غیرت مند تھے۔ ہم سے گلہ کیا نہ کبھی دست سوال ہی دراز کر کے اپنے آپ کو شرمندہ کیا۔

میں نے کچھ دیر توقف کر کے ایک نتیجہ اخذ کرنے کی اجازت دیجیے۔  
 کتاب جو تجزیہ پیش کرنے لگی ہوں وہ علم کی بنا پر نہیں، تجربے کے طور پر میں نے زندگی سے سیکھا ہے۔  
 آپ کو سائیکالوجی کی کتابوں میں دانا اور دانشور لوگوں کے علم سے انسان کے متعلق محیر العقول انکشافات مل سکتے ہیں، خیال ہے کہ انسان کو یقیناً اس کی جبلت اور بچپن کا ماحول پروان چڑھانے اور شخصیت ڈھالنے میں بہت سے ہیں، لیکن اس سے بڑی ایک اور بات بھی ہے جو اللہ کی توفیق کی صورت میں اس پر برستی ہے، لیکن اس توفیق حاصل کرنے کا ایک ٹونا ہے۔

میں نے اپنی مرضی سے نہ کسی شخص کا فیصلہ بدلتا ہے نہ اس کی تجویز میں حارج ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ انسان اور اللہ کے درمیان ہے۔ آدم نے جنت سے نکلنے وقت حضرت انسان کی طرف سے کر لیا تھا۔ اگر فرد دعا کا سہارا لے کر اللہ سے دعا کرے اور ہو تو پھر اس کے ماحول، جبلت، سوچ، عمل اور رویے میں تبدیلی آنے لگتی ہے۔ شاید اسی لیے لوگ ماں کی دعا سے بہت ترقی پزیر ہوتے ہیں۔ آپ اللہ کی رحمت کے حوالے کرنے کے بعد دنیا کو بدلنے کے لیے جتن بھرتے ہی ہیں انسان خود بھی تبدیل ہونے لگتا ہے۔

تعمیرات دان Analyst اور Psychiatrist جہاں پہنچ کر بے بس ہو جاتا ہے دعا سے وہی مقام مل چھپکتے ہیں۔ ان کا یہ من جاتا ہے۔ غرضی کے اپنے کھیرے ہیں، لیکن امیری بھی کچھ پھولوں کی بیج نہیں۔ یہاں وہاں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مسائل ختم نہیں ہوتے۔ انسان کو جس اطمینان قلب کی ضرورت ہے، اپنی ذات کی جس تبدیلی سے اسے مدد ملتی ہے، وہ سوائے اوپر والے کے اور کہیں سے نہیں مل سکتی اور اللہ بھی آرزو مند ہے کہ ہم اس سے مدد مانگیں۔ اس کے کوئی اور دروازہ نہ کھٹھائیں۔

جتنی شرک سے نکل جانے والے کے لیے دونوں جہاں میں پناہ ہے۔ وہ نہ صرف اداسی بددلی اور بدحوصلگی

سے نکل جاتا ہے بلکہ صرف اللہ سے مانگنے والے اس درجہ مضبوط خود کفیل اور استقامت پسند ہوتے ہیں کہ پھر انہیں سے خوف نہیں آتا اور اس کی اس تبدیلی سے کئی بدنی ذہنی عقلی تبدیلیاں خود بخود اس کا نصیب بن جاتی ہیں۔

لیکن یہاں پہنچ کر پھر توقف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی دعا بھی کارگر نہیں ہوتی اور لوگوں برس اس ریاضت کا سہارا لے کر بدل ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک مرتبہ مانگی دعا قبول ہو جاتی ہے اور سارے دلہے جاتے ہیں۔ انسان کا علم قلیل ہے اور جتنے نفوس ہیں اتنے راستے اللہ کی طرف جانے اور اطمینان پانے کے ہیں۔ کم مجھے یہی راستہ سمجھ میں آیا ہے یعنی ہاتھ باندھ کر یقین محکم کے ساتھ اللہ کے حضور دعا مانگنے والا عموماً خالی ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خان صاحب کا خاندان موروثی اور جہلٹی طور پر کوٹکا ہے۔ یہ غم کا اظہار و اویلا ڈال کر نہیں کرتے نہ محبت ہی کو ظاہر کرنے کے لیے تالیوں، تہقبیوں یا چیخوں کا سہارا لیتے ہیں۔ بد قسمتی سے ان کو عموماً ایسے جیون ساتھی ملے جو خود جذبات کا برملا اظہار کرتے تھے۔

جب اسحاق بھائی ایئر فورس چھوڑ کر مزنگ روڈ میں آئے تو پہلا شدید رد عمل ذکیہ اور اماں جی میں اسی طرح بدولت پیدا ہوا۔ ذکیہ جی نے واصف کی سالگرہ منانے کا پروگرام بنایا۔ یہ سالگرہ کچھ آج جیسی پر بہار دعوت نہ تھی منانے اور سجانے کا اہتمام کچھ نہ تھا۔ ہم بھی ایک معمولی سا تحفہ لے کر پہنچ گئے۔ باباجی کے ملحق لمبے کمرے میں یہ سچے ایک پر موسم تہیاں روشن تھیں۔ گھر کے دوسرے افراد باجی ضیا پالو بھائی اور بچے موجود تھے۔

آفتاب بھائی اور خالد میاں بھی کچھ پریشان کچھ محبوب سے کھڑے تھے۔ اماں جی بار بار چہرہ پوچھتی تھی اپنی ناخوشی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جو بھائی بھی At ease نہ تھے..... لیکن سب سے بڑی بات کہ ذکیہ انفرمیشن کے باوجود باباجی محمد خاں عین بروقت گھر سے نکل گئے..... اس کا مال ذکیہ جی کو برسوں رہا لیکن میں نے اس کی حالت دیکھ کر نصیحت پکڑی کہ پھر کبھی بچوں کی سالگرہ منانے کی کوشش نہ کی۔

میری بیجاری بڑی بہو غزل کو بھی ایک تجربے سے گزرنا پڑا۔ اس نے اپنی بیٹی ارشیا کی سالگرہ بڑی عرصہ منانے کی کوشش کی۔ دیکھیں پکوائیں بڑا سا ایک بیوں سمیت میز پر حاضر تھا۔ کھانے اور چائے دونوں کا اہتمام (غزالہ) غزل ایک زندہ دل ہنستے کھیلتے گھرانے کا فرد تھی۔ وہ بند مٹھی کا فلسفہ نہ جانتی تھی۔ محبت کا اظہار اور گرم چٹائی کے لیے نیچرل تھی۔

جب میز سج گئی۔ بستیاں روشن ہو گئیں۔ سب تالیاں بجانے اور پی پی برتھ ڈے گانے کے لیے میز کے آگے گئے تو انیق کو جاناں جاناں کہہ کر غزل تلاش کرنے لگی..... کمروں میں لان پر سب جگہ تلاش کیا گیا..... لیکن جاناں جاناں انیق اس وقت لوٹے جب برتن واپس باورچی خانے میں جا رہے تھے۔

انیس بیٹا اپنی کارکردگی دکھانے اور اس پر داد حاصل کرنے میں نہیں پڑتا تھا۔ کام بھی اس طرح کرتے۔ شرمندہ کرنے کی نوبت نہ آئے۔ اسی کے گرد ہولے ہولے 121۔ سی میں دوستوں کا مجمع اکٹھا ہونے لگا، لیکن دوست اس گھر میں وہ بھائیوں کے ساتھ شیمز کرتا۔

ڈیویژنل پبلک سکول سے اس کے ساتھ قاسم اور بیس اور وسیم قاضی آنے لگے۔ یہ بچوں کی سعادت مندی ہے۔ نئے نیشنل کوڈ اور گپ شپ کو ماں باپ کے ضروری کاموں میں مغل نہیں ہونے دیتے تھے۔ کبھی کبھی راتوں کو یہ باہر نکل جاتے۔ تب ہی انہوں نے روجی کی فونسی کار چلانی سیکھی۔ جب روجی باجی ان کے کمرے میں سو جاتی تھی تو نکلنے سے نکلنے۔ کار چراتے اور باہر نکل جاتے۔ ان دنوں شہر میں امن تھا۔ گیٹ کو تالا لگانے کا رواج نہ تھا۔

سب سے پہلے انیس نے ڈرائیونگ سیکھی۔ اس کے بعد باری باری سب کا جھا کا کھلا۔ جب کبھی ثاقب شباب میں قیام کرتا تو رات کو یا تو آموں کی پہٹیوں سے آم چرانے جاتے یا باورچی خانے کا دروازہ بند کر کے ان سے کھانا کھا جاتا۔ نیشنل اشتیاق کو ان دنوں کا شوق تھا۔ جب بھی وہ ہمارے گھر شب بسر کرنا خوب خوب اندھے تھے۔ گھر نہ ہوتے تو جیسے ڈچ کر کے اندھے لائے جاتے۔

میں تصدیق کرتی ہوں عمو ماں باپ اولاد کے حق میں جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کے متعلق بچے اچھی رائے نہیں دیتے۔ اس سلسلہ میں خاں صاحب نے اپنی سی کوشش ضروری۔ جب انیق پروفیسر ہوئے تو فونسی کا ڈبہ استودے دیا۔ فونسی کو شوق تھا۔ اسی ڈبے پر انیق اپنے شاگرد بننا کڑھ لاتے۔ ان کی مفت ٹیوشن کرتے۔ گھر پر کھانا کھلاتے اور پھر ڈبے پر لوڈ کر کے واپس کالج چھوڑ آتے۔ گرو چیلے کی ایک اچھی مثال انیق بیٹے نے اپنے شاگرد کو پیش کی اور ابھی انیق خاں کو امریکہ ہجرت کیے چند روز سن ہو گئے ہیں ان کے بعض شاگرد ان کے ساتھ رابلے کیے ہوئے ہیں۔

انیس جب پی آئی اے میں ملازم ہو کر کراچی سدھارے تو ابو نے اپنی فونسی اسے بھجوا دی۔ یہ ضرور ہے کہ وہ کے ملازم تھے اور انیس سرکاری گاڑی ملی ہوئی تھی، لیکن وہ چاہتے تو فونسی کو گھر یلو استعمال میں رکھ سکتے تھے۔

میرا خلاڑی اشر نے جب بی اے کے بعد ایک "میڈاس" (Midas) نامی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کر کے صاحب نے اس کی عزت نفس کو بھائیوں کے مقابلے میں قائم رکھنے کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ مورس خرید کر دی اور اس پر اس پر اپنے کام پر جانے لگا۔ اس زمانے میں ایسی فراخ دلی ہمارے عزیزوں میں کسی نے بھی اولاد کے لیے نہیں کی تھی۔ خاندان میں چرچے ہوتے کہ شوق غلط مثال قائم کر رہا ہے اور اپنے بچوں کو بگاڑ رہا ہے۔

بہر کیف اسی فونسی ڈبے پر ان بچوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ جادوئی سفر بھی کیے۔ یہ پروگرام ہم سے بھی محبوب کر بنایا گیا۔ لیکن آخر اجازت طلب کرنے کے لیے انیق کو ابو کے سامنے پیش ہونا پڑا۔۔۔۔۔ رات کے وقت خاں نے مجھ سے کہا۔۔۔۔۔ "قد سید ایک مشکل ہے" میں گھبرا گئی۔

"جی؟"

"بچے فونسی ڈبے پر خیر اگلی جانا چاہتے ہیں۔"

"تو جانے دیں۔۔۔۔۔ جی" میں نے ہمیشہ کی طرح بے جھجی سے کہا۔

"خیر ٹھہرنے کا انتظام تو ہو جائے گا۔ وہاں اپنا چھوٹا سا بیکر کرنا گھر ہے۔۔۔۔۔ ٹھیکیدار ان کا خیال بھی رکھے گا۔۔۔۔۔"

"جی لیکن کیا؟"

”آخر بچے ہیں..... نا تجربہ کار..... بے کچھ..... سفر چھوٹا ہو یا بڑا..... اس میں Hazards تو ہوتے ہیں۔ وہ رات ہم نے الگ الگ سوچنے میں کاٹی..... پھر ہمیشہ کی طرح ناشتے کے وقت ایک حل مجھے سونپ دیا۔“

”خاں جی! اگر ریزی بھائی ان کے ساتھ چلے جائیں تو کیسا؟“

کچھ دیر تامل کے بعد خاں صاحب نے کہا..... ”ٹھیک ہے..... پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

بچوں کو اطلاع دے دی گئی۔ وہ خوشی سے ماموں کو منانے چلے گئے۔

ریزی میں ایک کھلنڈرے بچے کی روح بسی ہے۔ دھرم سالہ کے پہاڑوں کا عاشق، بچوں کا بچوں کے لیے بے تکلف دوست، فوراً ریڈی سٹیڈی (Ready Steady) ہو گیا اور جادوئی سفر کی تیاریاں جن میں ہم دونوں شامل تھے کرنی گئیں۔ ان کے دوستوں میں قاسم اور لیس، وسیم قاضی، شاہد خاں، لست پر تھے۔ توصیف احمد خاں کو بھی فوراً اجازت مل گئی۔ جادو تو ازل سے ایڈوانسڈ ہے، تجربہ نیا ہو اس میں کیسی مشکلات کیوں نہ ہوں، انہوں سے باز نہیں آتا۔

ہمارے پڑوں میں ہی اور لیس صاحب رہتے تھے۔ انہوں نے دونوں قاسم کو اجازت نہ دی۔ سچے سچے اور واپس آ گیا۔ اب انیق اور انیس اس کے پاپا کے پاس پہنچے۔ انہیں بتایا کہ سارا کام ماں باپ کی آشیر باد کے ساتھ ہے۔ ماموں کی ہمراہی بھی ہو گئی ہے اور وہاں خیراگلی میں ہمارا اپنا تین کمرے کا گھر ہے۔ اس میں رہنا ہوگا۔ قاسم کو بھی اجازت مل گئی اور بچے فوکسی کے ڈبے پر روانہ ہو گئے۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے غالباً سب نے برابر جوڑ کر رقم مہیا کی۔ زیادہ وقت گزری تو چلائی۔ راتے میں اونچے اونچے گانے گائے گئے۔ جگہ جگہ رک رکھنا اور چائے نوش جان کی گئی۔ خیراگلی میں چابی لے کر اندر سامان اتارا۔

خاں صاحب نے کبھی منہ سے اظہار نہیں کیا لیکن مجھے علم ہے کہ انہوں نے خیراگلی کا گھر میری سیٹھ تھا۔ انہیں علم تھا کہ میرا پہاڑوں سے کتنی پرانا ناطہ ہے۔ جب ہم 121 سی میں آئے تو خاں صاحب کو پتہ چل گیا کہ فوجیوں کی بیرکیں بک رہی ہیں۔ انہوں نے پتہ نہیں کب اور کیسے کتنے پاؤں تیل کر پیے اٹھنے کر کے یہ بیرک خریدیں۔ یہ ساتھ ساتھ جڑی ہوئی بیرکیں تھیں جو اب فوج کے استعمال میں نہ تھیں۔ مین بازار سے اوپر کی طرف چڑھ کر آگے تھوڑا سا کھلا احاطہ تھا۔ تین بیڑھیں چڑھ کر اوپر ایک سادہ سادہ سا دروازہ کھلتا تھا۔ پھر تین کمرے تھے۔ ساکرو۔ سامنے والے کمرے کو خاں صاحب نے مہمانوں کے لیے مختص کر دیا۔ اس کے بعد والے کمرے کو کھانا بنا دیا اور اس کے ساتھ والے کمرے کو ہمارا بیڈروم قرار دیا۔

یہاں پر چار پائیاں، تیل کا چولہا، دودھ، مکھن رکھنے کے لیے ڈولی خاں صاحب نے لوڈر میں رکھی۔ ساتھ سامنے بٹھایا اور ہم راولپنڈی سے ہو کر خیراگلی پہنچے۔ ایک بار پھر انہوں نے ٹھیکیدار محمد حسین سے چابی لے کر میرے سپرد کر دیں اور مجھے گھر کے اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ بچے اپنے ”جادوئی سفر“ پر اسی خیراگلی میں ٹھہرے۔ یہاں وہ خود ہی پکاتے رہے۔ روٹیاں حسب توفیق انیق احمد کی ذمے داری ٹھہری..... نہ پکا سکتے تو بے

تھے۔ اس جاوئی سفر کے دوران انہوں نے ایبٹ آباد، جھیل سیف الملوک اور اردگرد کی پہاڑیوں کی سیر کی۔ ان بچوں کے سفر کا اندازہ آپ اس معاہدے سے کر سکتے ہیں جس پر سفر سے پہلے تمام ممبران کے دستخط کرائے گئے۔

”کنٹریکٹ جاوئی سفر“

شاید آپ اسے تصحیح اوقات سمجھیں لیکن میں آپ کو صرف ایک نظر یہ سمجھانے کی خاطر بار بار ایک ہی طرف دہرائی ہوں۔ انسان اپنے Genes کا مجموعہ ہے۔ جو کچھ باپ دادا وراثت میں دے جاتے ہیں اس کا ذکر مذہب سے کیا جا رہا ہے کہ ہم تیار سے باپ دادا کے گناہوں کو وراثت میں تم تک پہنچاتے ہیں۔ نیک اعمال پر آمادہ کرنے کی کاہستہ روکنے کا یہ بھی ایک طرح کا روحانی طریقہ ہے۔۔۔۔ Genetic انجینئرنگ اسی سلسلے میں کئی قسم کے معجزے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دوسری طرف ماحول کی تربیت انسان کی شخصیت ڈھالتے ہیں کچھ کام کارثر ثابت نہیں ہوتی۔۔۔۔

## ضیاء الحق

ایضاح احمد کے دوست ضیاء الحق ہر وقت کے ساتھ رہنے والے نہ جانے اس سفر پر اس کے ساتھ کیوں نہ گئے۔ اس کی بھینجی لگی 65۔ سی میں رہتے تھے۔ یہ کونجی ان کے والد اور ان کے بھائیوں کی سانجھی ملکیت تھی۔ رات کے وقت دوست سائیکلوں پر نکلنے اور پیسے چندا کر کے نان چھو لے کھانے جاتے تو ضیاء ساتھ ہوتا۔

روحی باجی کی ہنز فو کسی عموں ہمارے گھر میں ہوتی۔ روحی تو مزہ سے اندر سوراہتی لیکن یہ بچے اس کی گاڑی نکال کر بیٹھ سکتے۔ ضیاء اور ایضاح اس عمل کو چوری سمجھتے تھے اور اس حرکت میں شمولیت نہ کرتے لیکن انیس تو صیف اور عروسیم نے اسی گاڑی پر ہاتھ سیدھا کیا۔

ہوتے ہوتے جب ایضاح پر ویسبر بن گئے اور اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں بہت سر دھڑکی بازی لگا رہا تھا تو ایک اور روپ دھارا۔ ضیاء کے گھر میں نیولپ روز پھولوں کی کیاریاں لگی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں ان کی کیاریاں کا گلدستہ ہوتا اور وہ یہ گلدستہ مجھے پیش کرتا۔ پتہ نہیں اسے کس کشف سے علم ہوا کہ میں اس پھول کو بے حد پسند کرتا تھا۔ کچھ وقت اسی طرح گزارا۔ پھر مجھے ضیاء ہی سے علم ہوا کہ وہ ایکٹرن بننے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایضاح نے بھی جاچکا تھا، لیکن ڈائریکٹر اس کی پہنچ سے باہر ہے۔

ان دنوں زین العابدین ”سدھراں“ کی تشکیل دینے میں مشغول تھے۔ میں نے زین سے التجا کی کہ وہ ضیاء کو اپنے ساتھ لے کر آئے۔ میں ایک اہم رول عطا کریں۔ زین ازل کا مروتی فوراً رضامند ہو گیا اور اس طرح ضیاء کی دیرینہ خواہش

لیکن کچھ عرصہ بعد ضیاء نے ایک نیا پروگرام بنا لیا۔

ایضاح نے کچھ اس کے مطلب کا پروفیشن نہ بن سکی۔ ضیاء نے کینیڈا کے لیے ہجرت کی اور وہیں ایک مسلمان لائبریری کے ساتھ شادی کر لی۔ چھ سات بعد ضیاء اپنی بیوی اور بچہ کامران کو لے کر پاکستان لوٹا۔ ڈور تھی مجھ سے ایسے ہی جیسے واقعی میں کامران کی دادی تھی۔

ابھی خاں صاحب کی تیسری برسی کے بعد دسمبر کے مہینے میں ضیاء الحق اپنی بیٹی ”سوزاں“ کے ساتھ ساتھ  
اترا۔ اتنی پرانی واقفیت کے باوجود ضیاء الحق کو اچھی طرح جاننے کا موقع پہلی بار ملا۔

کینیڈا میں ضیاء کے پاس گیارہ بارہ بیکریاں تھیں جنہیں بیچ کر کئی دکانیں ویڈیو شاپ کی وائٹڈ اپ کے  
بیس سال بعد وطن اس امید پر لوٹا تھا کہ بالآخر یہیں اپنے بیوی بچوں کو سیٹل کر لے۔ اتنی دیر بعد جب کوئی شخص مغرب  
لوٹتا ہے تو اس کے پاس معاشرے کو ناپنے کے دو معیار ہوتے ہیں۔ وہ ایک طرف ہو کر سوچ نہیں سکتا اور عموماً تڑپتا رہتا ہے۔

رہتا ہے۔ غالباً ضیاء بھی یہی سوچتا رہتا ہوا کہ کہاں رہنے میں اس کا گھرانہ بہتر زندگی بسر کر سکتا ہے۔  
پتہ نہیں وہ کس فیصلے پر پہنچے لیکن میں ایک سوچ میں مستحکم ہوئی ہوں۔ مغرب نے ضیاء میں بڑی خوب  
ہے۔ پہلے بھی وہ دینے والوں میں سے تھا فقط اس کے پاس دینے کے لیے پھول تھے۔ اب جب اس کے پاس  
روپے پیسے کی ریل ہیں تو وہ دائیں بائیں یہ نعمت بانٹنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

ہم بھی خوب لوگ ہیں۔ موقع تازہ اور خود غرض۔ غالباً اسی لیے ہماری غریبی سے نجات ہو نہیں پاتی۔  
سنا ہے کہ کسی بادشاہ نے خانہ بدوشوں کے پاس پڑا ڈکیرا۔ ان غریب لوگوں کی بد حالی دیکھ کر شاہ نے  
سے کام لیا۔ کھلے دل سے ان پر اپنی دولت بچھا کر تارا حتیٰ کہ جس صبح بادشاہ نے کوچ کا اعلان کیا راتوں رات  
غریب ہستی نے بادشاہ کے خیموں پر شب خون مارا۔ سارے اونٹ کھول لیے۔ خدمت گاروں کو ختم کر دیا۔ خیمے  
کر چھت ہو گئے۔ جب صبح بادشاہ کی آنکھ کھلی تو ہر طرف اجازت نظر آیا۔ حتیٰ کہ خانہ بدوش اس کے بال تک کاٹ  
لے گئے۔ بادشاہ خاک چھانتا پاؤں پیدل اپنی منزل کو روانہ ہوا۔

ضیاء کے ساتھ بھی یہاں ہم سب نے یہی سلوک کیا۔ دائیں بائیں ہر طرف سے لوٹ کھسوٹ مچی رہی  
کیا کیجیے کہ ہم اپنی غریبی کا مداوا اسی طرح کرنے کے عادی ہیں۔

ضیاء کے تین بچے ہیں کاہران، سوزاں اور سمیرا..... سوزاں کا نام فرانسیسی اور اسلامی ہے۔ وہ اسلامی  
کرتی ہے اور اپنا دوسرا نام آسیہ کم ہی استعمال کرتی ہے۔ خاموش، خوبصورت اور پڑھا کو ”سوزاں“ اس وقت  
مارکیٹنگ میں بی بی اے کر چکی ہے۔ یہاں اس نے انیس بیٹے کے پاس رہ کر ایک Orientation کورس بھی  
کی تعلیم کا حصہ ہے۔

میں سوزاں کے متعلق اس لیے تفصیل سے لکھ رہی ہوں کہ اس نے یہاں رہ کر مجھے ایک لمحے کے  
اجنبیت کا احساس نہیں دلایا۔ وہ اس محبت سے مجھے ”داوی“ پکارتی رہی کہ واقعی سچ لگتا۔ ہر جگہ مجھے سہارا دینے کے  
ہاتھ پکڑ کر چلتی۔ کھانا ڈال کر دیتی، رضائی اوڑھ دیتی۔ انیس اور اشیر سے کچھ ایسا ”چاچو چاچو“ کہہ کر پیار کرتی کہ  
سگی بھتیجی ہو۔

میں چونکہ خوشامد پسند ہوں اس لیے مجھ پر اس کی ان اداؤں کا گہرا اثر پڑا ہے۔ سوچتی ہوں کہ سوزاں کی  
کیا اس کی مغربی ماں سے ملی کہ اس میں ضیاء کے لہو کی تاثیر ہے..... شاید کچھ کچھ دونوں طرف سے یا شاید ساری  
اس کی اپنی کوشش ہو۔

صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

تخلیقی کام کی میرے تینوں بیٹوں میں اُنچ تھی۔ وہ اپنے Genes کے ہاتھوں مجبور تھے۔  
اشیر احمد کی کچھ تحریریں ملاحظہ ہوں:

تقسیمیں

تحریر پیش از تخلیقی کام

اے اللہ ہم پر تو ہمیشہ  
اپنا فضل قائم رکھیں تاکہ ہم  
اس دنیا میں کامیاب ہوں  
ہماری دعا عاجزی پر ہو  
نہ کہ خوف پر ہو  
تو سب سے بڑا اور نہایت ہی مہربان ہے  
اللہ تیرا سایہ مجھ پر  
اور میرے گھر والوں پر ہمیشہ  
قائم و دائم رکھ۔  
آمین

(1)

آج میری وجہ سے بالکل نہیں  
بس جو بھی ہے وہ اوپر کی ذات ہے  
باقی سب ایک دم سب جھوٹ  
کیا لکھوں بس دعا ہی دعا ہے  
کہ سب کچھ اس کی اور میری  
خوشی سے ہو جائے  
کوئی ایک خیال ہی انسان کی نجات کا سبب  
ہو سکتا ہے



اللہ کا ذکر ہی وہ نجات ہے جو ایک خیال ہے  
 باقی سب مسئلے ہیں  
 کہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ یا اللہ  
 بہت دنیا کا رنگ دیکھ لیا  
 اب کچھ اپنا بھی رنگ  
 تو دکھا

(2)

یہ خیال کیوں کب اور کیسے  
 ایک غیر اختیاری سوچ دماغ میں آئی جو  
 آپ کے محبوب کے خلاف تھی  
 آپ نے دن رات اسی سوچ میں گزار دیے  
 کہ یہ کیوں آئی جب کہ  
 یہ تو ایک بہت نادر مل سافتنہ ہے  
 تمہ ہے..... تمہ در تمہ

(3)

ڈرنقہ جیسی چیز ہوتی ہے  
 اس کو ایک دفعہ میں  
 جسم سے نکلنا چاہیے..... ورنہ  
 اس کے ہاتھوں ہم پھر تنگ رہیں گے  
 مضبوطی اور پھر مضبوطی پھر  
 قوی پھر قوی پھر ایک دم قوت  
 اور پھر قوت..... صرف ایک اس  
 کو کہنا یا آج سے ختم تو ہمارا  
 دوست سہی لیکن ہم تمہارے نہیں  
 اگر ساتھ چلنا ہے تو  
 اس کی ماں جس نے مجھے

تجھے پیدا کیا  
 پھر بس ایک دم چھٹی  
 کوئی بندہ نہ کوئی فقیر بس  
 سب ولی ہی ولی  
 ایک وقفہ بس صرف  
 ایک وقفہ..... ورنہ ہمیشہ  
 کی ناکامی ہی ناکامی

پتہ نہیں کب اور کیسے اینق بھی لکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ نظمیں کچھ انگریزی میں تھیں، کچھ اردو  
 محض انگریزی و نیلی ویرن ڈرامے کی طرف بھی جھک گئے، لیکن یہ سارے کام جزوقتی تھے۔ ان پر وہ توجہ نہ دی گئی جو  
 محض آڈیو کی طرف متوجہ کر دیتا۔ انہیں نیلی ویرن کے ڈراموں پر ایوارڈ بھی ملا لیکن ایوارڈ ہمارے گھر میں جس  
 سے تعلق سے دوچار ہوتے تھے وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔

اینق کے ڈراموں کی کتاب سنگ میل پبلشرز نے ”آب و دانہ“ کے نام سے چھاپ دی ہے لیکن نظموں کی  
 بھی کسی سے رجوع نہیں کیا گیا۔ یہ نظمیں آپ کی تفریح و طبع کے لیے درج ذیل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تحریر جو انہیں  
 سے چھاپ جانوروں سے محبت کے حصے میں ملاحظہ کریں گے۔

ان تحریروں، نظموں کا ذکر اس لیے کیا کہ اشفاق صاحب کے بیٹے ان کے بہن بھائی سب کی تحریروں میں  
 شہرت ہے اور یہ مماثلت ان کی وراثت سے Genes کی شکل میں پہنچی۔ صرف ان سب نے خاں صاحب کی طرح اس  
 شہرت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

جو بھائی نے ارشیا کے متعلق جو نظم لکھی تھی، وہ بھی Genes کے ضمن میں ایک پروف ہے۔  
 یہ نظم اسحاق بھائی نے اینق کی بیٹی ارشیا کی پیدائش پر لکھی۔

ارشوبابا

بابا کا ارشوبابا کا ارشوبابا

دادی کی یہ جان ہے کہاں سے آئی ہے

یہ پھولوں جیسا چہرہ پاکیزہ بھولا

یہ پریوں کی شہزادی ہے کہاں سے آئی ہے

ماموں کا یہ کھلونا ایک خواب سا سہانا

ماما کے دل کی جان ہے کہاں سے آئی ہے

بشی کو وہ بلائے شامیوں کو وہ ستائے  
 دونوں کی وہ جان ہے کہاں سے آئی ہے  
 نانا نانی سے پوچھو پڑ نانی سے بھی پوچھو  
 اس چیز یا قربان کہاں سے آئی ہے

(غزل کی ہمیں بشریٰ اور شہناز)

## انیق احمد کی چند انگریزی نظمیں

Aneeq ahmed

### I. Me and You

I walk alone in rain,

Keeping your image warm in my heart.

Making sure of what remains and what's lost.

There you stand in the middle of the painted blue fog.

Clear and unpredictable.

Hissing winds charge and bruise

My hands are clutched to the frame .....

Frame of my mind,

Gripped .....

I see a star and a flower floating near you

Stemless, breathless.

Newness is now an illusion,

A suffering of my own

A pain I wanted to disown.

A weak heart have I.

A weaker throb it has.

A few things to share,

And even fewer to bare.  
I have a deep seated soul,  
And even deeper is its hole.

Let me predict fortune,  
That God sends me.  
I hope to be humble  
And for no one else to see.

3. A drum to tune  
The sum immune  
The long felt pain  
Of a song in rain,  
On a picturesque plain,  
You may find a lane  
In this world profane  
Driving lane in lane

Noki

شاید کل کی اچھی گزرے  
شاید موسم اچھا ہو  
شاید دھند کے پردے میں سے  
چڑھتا سورج پورا ہو  
شاید بے گل کل نہ ہو دے  
شاید چھوٹا رستہ ہو  
شاید باغ درتے چکے میں اک  
جانا جانا چہرہ ہو  
شاید رت رنگین ہو جائے

شاید بادل چھایا ہو  
 شاید میرے شور کے اندر  
 اک سناٹا غالب ہو  
 شاید سب کو وہمہ گزرے  
 شاید پاگل راضی ہو  
 شاید خود سے باتیں کر کے  
 اپنا خواب ہی سچا ہو

Noki

جن دنوں گھر پر نوکی اور خاں صاحب کی وجہ سے شاعری کی فضا قائم تھی۔ یہ تخلیقی اعتبار سے ایک نیا تجربہ  
 خاں صاحب میڈیا میں قدم جما چکے تھے۔ رسالے لکھنے کی حسرت نہ رہی تھی۔ کہانی کار تو وہ ازل سے تھے لیکن فلم  
 فیلڈ میں نہ تو وہ اپنا لوہا منوان چاہتے تھے نہ انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس ہوتی تھی۔

ان کی کہانی 'گڈ ریا' نے وہ دھوم مچا رکھی تھی جو دس بارہ افسانوی مجموعے چھاپ کر بھی کسی ادیب کو  
 آتی۔ شاعری کے میدان میں ابھی انہوں نے قدم نہ رکھا تھا۔ پھر غالباً 1974ء میں ان پر پنجابی کی نظمیں  
 کی طرح برسوں۔ 'کھٹیاوٹیا' میں ان نظموں کو یکجا کر کے سنگ میل پبلی کیشنز نے فوراً چھاپ دیا۔

انٹق بیٹے کی نظمیں گوجھپ تو نہ سکیں لیکن اکٹھی ہوتی رہیں۔ اس میں بھی ہماری ہی غفلت رہی کہ ہم نے  
 کے اس کام کی طرف توجہ نہ دی۔ عموماً والدین بچوں کی کارکردگی کو کاٹا اور لے دوڑی کے تحت فوراً ترقی کے ذریعے  
 دیتے ہیں لیکن ہمارے گھر یلو، حوال میں اس طرح کی توجہ پنپ نہ سکی۔

یہ کام البتہ ضرور ہوا کہ میں ہمیشہ کی طرح خاں صاحب اور انٹق سے متاثر ہو کر نظمیں لکھنے لگی۔ اردو  
 بیشتر نظمیں تو ضائع ہو گئیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ انگریزی کی نظمیں ابھی زمانے کی دست بروسے بچ گئی ہیں  
 آپ کی خدمت میں دو ہر اسے دیتی ہوں۔ چونکہ یہ نقل کا کام تھا۔ اس میں اُچ اور صلاحیت نہ تھی اس لیے جلد ہی  
 سوکھ گیا۔

ریفری سیٹی و جا کے

کورواں تے پانڈواں نوں وردی پوا کے

یدھ کراوے

فاؤل دساوے

جت ہارتے مہر لگاوے

کی جینی گیندوں کسے وی نہ پھیا!

کہوڑے پاسے بوتاماریا

تے کہوڑا پاسا جتیا؟

☆☆☆

آجڑے گھراگے کتاروے

توین مکان اگے

نوئی کرلاوے

سینہ وچ بھگی لان نوں

پانی دیندی جاوے

تجی اوتے پے پے کے رون آلیا

تاپ جے نہ چڑھدا؟

تے علاج کنویں ہندا

☆☆☆

گھردا بڑا ای چاسی

کندھے کوٹھے باریاں

رنگ برنگے شیشے

باہر جان وے راہ بڑے سن

پر گھردا ملیا نہ راہ

گھردا بڑا چاسی

☆☆☆

کیویں اسی دکھ ہوئے ایدا کی تارنا

کھریا اسی بھل گئے تیتھوں چندوارنا

ڈٹی ہوئی بیڑی نوں ربا کج تارنا

ہنجواں دی کھیڈ وچ جتنا وی ہارنا

ٹٹی ہوئی منجی اوتے

☆☆☆

کب چھٹی ہوگی اس جگ سے

کب اپنے گھر کو جائیں گے

ذوالبھورت لوگوں کی سرزمین

کب اپنی جان بچائیں گے  
 اور سب سے جان بچا کر پھر  
 ہم روئیں گے  
 ہم گائیں گے  
 مکھی، مچھر اور چیونٹی کا  
 جب بکس بدلنا جائے گا  
 مچھلی مینڈک اور لدھر سے  
 جب سارے ناتے ٹوٹیں گے  
 جب لمبی تان کے سونیں گے  
 اور لمبی تان کے سو کر پھر  
 ہم روئیں گے  
 ہم گائیں گے  
 کب چھٹی ہوگی اس در سے  
 کب اپنے گھر کو جائیں گے  
 ☆☆☆

پتی دھرم نوں پالنا  
 بن چھیکاوے ریکٹ وچوں  
 چیوندنوں پارنا  
 چلگا جت جتا کے  
 پہلے بھوگ اچ ہارنا  
 پتی دھرم نوں پالنا  
 ☆☆☆

انت دا کھردا بولنا  
 تے روح دی دینی مار  
 کبھندے نے اوہ میرا سی  
 پر کدی نہ لکھیا یار  
 ☆☆☆

مٹی ہوئی منجی اوتے بیٹھی آں سرہانے

جی بھینڑا آج میرا آؤندا نہیں ٹھکانے  
 بدوں جدوں آوے میری جنڈری تے چھاں جی  
 تیں ہتھاں پیراں نوں تے جاوے جنڈ جان جی  
 یس گئی داویلا آ یا بھے نہ کوئی تھاں جی  
 کھڑے پاسے جاواں تے میں پچھاں تیراں جی  
 مٹی ہوئی منجی اوتے

If all my life was not so  
 Pledged,  
 Pawned  
 Or sold not,  
 If I could wriggle out a complete moment of paper  
 Vellum,  
 Or clean dust  
 If it was possible to adorn that movement with a kiss,  
 Name,  
 Or a tear  
 It would be easy to leave this quagmire life like a king,  
 Lover  
 Or a saint

Bano

Last night,  
 A shivering moon turned from my window  
 To your door.  
 Shamefacedly knocking,  
 Begging for a little warmth.  
 Did you in all austerity  
 Close the door on his face too?



Poor runaway from universe!

Bano

I love small flowers,

Songs that last

Only on house

And seasonal lore,

All recess

In festive dress

Into oblivion

Never do they vie or dream

of eternity

Yet leave a place for

More flowers

More love

Shining stepping stones to walk on

Through a long journey.

Bano

### A Lament

There is a tawny patch

That smears the lush green turf

It will not heal

It will not heal.

Sane tunes like an eagle

Just ready to fly

In the morning light.

Shapes into a receding triangle

In dusty eyes

Closing its desert ache.

Sometimes in hoary twilight

It melts into a wooden cross

Forsaken

It will not heal

Though watered by my tears

It will not heal

This tawny patch of green

That smears the lush green heart

It will not heal

It will not heal

It will not heal

I caress your memory

Like a little girl cuddles a dead kitten

Gone for ever

Yet not buried deep

It is feckless to love:

Broken tumblers

Men in air flights

And flowers of Leningrad

Loitering on a soldier's grave.

Bano

Rolling from east

Rolling from west

Fog rolls fast into the rest

Doors and windows clench their teeth

Hoping and fearing night hide

That other side of the street

May not be lost for ever

Who is she?

Ah! Who is she?

Who came like the fog?

But stayed like the rock

Barring all view

To windows to doors

Open but blind

To the other side of the street.

Bano

If I were allowed

To comfort love or cherish you

By people around

Who abound

The world at large

Like elves or archers

If I were allowed

To comfort love or cherish you

By myself

Who cheats

And lures to desires anew

Life's gasoline

If I were allowed

To comfort love or cherish you

By providence

Who likes to paint every door  
 With wash and wear sane bows to synthetic tears  
 It I were allowed

To comfort love or cherish you

I would decide

Life had been on my side

As I'd bang along

Through dreary life waving to all

Bano

For you to me

To erk the dark

Not for each other

But for the late rising morn

Wither is day's celestial light

Wither is yester-morn's glory fled

Your tears flow over my cheek

Mine unknown

Follow yours into

Nothingness

We simmer in Ice droplets

Not for each other

But what has been once

Is no more

And never shall be

Bano

Let a moment come nude to me

Curved  
 Arched  
 Throbbing with light  
 A vision of you  
 A vision of you  
 Let the moment speak  
 Only of you  
 Stay, wink, lean then depart  
 Un-touched  
 To lie on the couch of time  
 Copulating with eternity

Bano

Days back I saw your spectacles  
 Tainted with dust of me  
 Last night I heard your  
 Bare feet  
 Followed by a smothered cough  
 Today I perceived  
 A patch of green  
 Un-tended  
 Not watered  
 Hopefully wailing  
 For the pigeon in the sky

Bano



## خاں صاحب کا سیاسی مسلک

بھارتیوں کے آدھی کا نصیب یا فیصلہ یا مجبوری ہمیشہ ایک رہی ہے۔ یہ روایت مسلمانوں میں چودہ سو سال پرانی ہے۔ گروہ تو دوستوں اور خاندان دونوں کو حریز جاں سمجھتے لیکن اُن کے وصال کے بعد دوستوں اور گھروالوں میں محبت کا فرق بیدار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شیعہ اور سنی کے قابلوں میں ڈھل گیا۔

برصغیر میں قائد اعظم کی زندگی بھی اسی ڈویژن کا شکار ہوئی۔ گھروالے کہیں رہ گئے، فردا کیلا اپنی تلاش کا شکار ہوا۔ قائد اعظم نے پاکستان تعمیر کیا تو اُن کے گھروالوں میں سے کوئی اُن کے ساتھ نہ تھا۔ ویسے تو قائد اعظم کی ساری زندگی مختلف دورا ہے ہیں جنہوں نے اُنہیں اہم فیصلوں پر مجبور کیا۔ انہوں نے بڑی نیک نیتی سے کانگریس جو اُن کے لیے شہر شہر گھومے اور انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندو اکثریت اپنے صدیوں پرانے مسلک میں موجود اچھوتوں کے ساتھ ہم جن کی برتری کے کمپلیکس (Complex) سے نکل نہیں پائی۔

اس کا علاج بھی انہوں نے نیک نیتی سے تلاش کیا اور کانگریس میں ایک نامور فارمولا پیش کیا جس کے تحت ہندو اکثریت ہو وہاں سے نیشنل اسمبلی کے لیے مسلمان نمائندہ منتخب کیا جائے اور جہاں کی آبادی ہندو جاتی پر مشتمل ہے وہاں ہندو نمائندہ جن کر ممبر اسمبلی بنایا جائے۔ پہلے تو پنڈت نہرو مان گئے لیکن بعد ازاں وہ اس وعدے سے بھی بے وفائی سے ہندو لیڈر شپ کبھی مفاد سے علیحدہ ہو کر سوچ نہیں سکتی، اسی لیے وعدے کی پابندی نہیں کی جاسکتی۔ جب کشمیر میں شکست سے آشنا ہوئے تو بھاگ کر سکورٹی کونسل میں جا کر دم لیا اور جنگ بندی کی شرائط قبول کر کے جوئی سانس برابر ہوئے سارے وعدے وعید بھول گئے اور پھر اکھنڈ بھارت کے نعرے لگانے لگے۔

خاں صاحب کی زندگی میں پاکستان کے لیے جدوجہد میں شمولیت کے بعد انہیں اپنے ذاتی مسلک تہ دینے سے بے نیاز، بھائی بہن، دوست، چاہنے والیاں سب سے محبت تو کرتے رہے۔ اُن کے لیے جان تک دینے سے انہیں کوئی تردد نہیں ان محبتوں سے پہلے عملی طور پر انہیں پاکستان کے عشق نے تمام تر چوس لیا۔ اُن کی Priorities تبدیل ہو گئیں۔ انہیں نے بھی چودہ سو سال پرانی روایت کو نبھایا اور پاکستان دوستی اور ذاتی خاندان میں پہلے مسلک کو اپنایا۔

جب قائد اعظم نے کام کام کام کا نعرہ ہمیں دیا تو خاں صاحب نے ”کام کام کام“ کا سلوگن اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ تعمیر کیے بغیر مکین کو گھر کا سکھ نہیں مل سکتا اور کام کے بغیر گھر تعمیر نہیں ہوتے۔ اللہ کے نام پر یہ کام کیا ہوا ملک اب اللہ کی حاکمیت ماننے بغیر چلا یا نہیں جاسکتا۔ ملک کی محبت کو پکڑ کر وطن دوستی اور جانثاری کے ثبوت انہوں نے کئی پروگرام ریڈیو سے کیے، کیونکہ انہیں علم تھا کہ انسان پرنٹ میڈیا کے سحر سے نکل کر آہستہ آہستہ میڈیا کی حواگی میں جا رہا ہے۔ ”آج اور آج کا دن“ ”گھر گھر خوشیاں لایاں“ ”ضابطے خاں کی کارروائی“ اور ”ہم آگئے“ لکھ کر انہوں نے عام گھروں کی سوچ میں راہداری بنائی۔

”مانو منگو لیا“ تو سات قسطوں کے بعد بند ہو گیا لیکن اس کی بدولت کئی خوبصورت آوازیں ریڈیو کو مل گئیں۔ اکرم زبیر، میمون سلطان، منور کاظمی، غیور اختر، صدف ملک کے علاوہ ریاض محمود جو اس وقت بھی مشہور آرتس تھے پروگراموں کی روح رواں تھے۔

اشفاق صاحب ہی نہیں وہ تمام سرسردہ پود جنہوں نے پاکستان بنایا، پوری اہلیت، استقامت اور مستقل سے نئے وطن کے مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغیر ڈنڈی مارے اپنے چٹکار دکھانے میں مشغول تھی۔ گھر بساؤ مسائل ان گنت تھے۔ پھنڈے ہوؤں کی جدائی، راہ میں مارے جانے والوں کی بے کسی کی داستانیں، پریکٹسوں میں ٹھنڈی آہوں، گرم آنسوؤں کی گویا ایک بوجھاڑ تھی، جو کسی وقت نہ تھمتی تھی۔

خوشی کی اس کساد بازاری میں کچھ جی دار ایسے تھے، جو بڑے عزم کے ساتھ پرانی یادوں کو بچکیوں کے ساتھ بار دوہرانے اور سینہ کوبی کرنے کے بجائے راضی برضا اور صبر کے ساتھ نصیب کے مرحلوں سے گزر رہے تھے۔ نزدیک دنیا میں ہلا قیمت کوئی جنت حاصل کرنا ناممکن تھی۔ اس ارض پاک کی قیمت وہ چکا آئے تھے۔ اب ہی آبیاری، پھول کھلائی، تراوش و زیبائش کے وہ خودضامن تھے۔

انہوں نے گویا سمجھ لیا تھا کہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے والا کفران نعمت کا مرتکب ہو کر پتھر کا بن جاتا ہے۔ ان لوگوں نے ہیلچہ کدال اٹھایا اور مسائل کی دھرتی کو اتھل پھل کر کے رواں کر دیا۔ ان کے دماغوں میں اقبال کے آئینہ سانسوں میں قائد اعظم کا عزم اور دل میں ایک امت بنانے کا مجرہ گھر کر گیا۔

جتنے فردا تھے راستے، جس قدر لوگ اتنی ہی رنگارنگی۔ زندگی کے کارزار میں کچھ خوش نصیب شہید ہو گئے۔ راضی، کچھ غازی بن کر لوٹنے پر شاداں و فرحاں، کچھ اپنے نفع و نقصان کے عادی مال غنیمت سمیٹنے والے، کچھ مرتے پر بین صورت منڈلانے والے، کچھ راضی برضا، کچھ طوعاً و کرہاً دوسروں کے ساتھ چلنے پر آمادہ..... غرضیکہ پاکستان میں ایک سیلاب صورت لوگوں کا ہجوم اپنی اپنی آرزوؤں کی چابک تلے دوڑ رہا تھا۔ اسی دوڑ میں گھروں کے قفل ٹوٹنے، منٹ سٹم کی ڈولیدہ سری ابھری، نفاذی کا آئین بھی لاگو ہو گیا۔

شہر بہ شہر گھوم پھر کر اپنے لیے ٹھکانے کی تلاش نے نئے دوست نئے دشمن سامنے لا کھڑے کیے۔ دھندلکے میں روشنی کی تلاش تھی لیکن چند ہی جی دار تھے جو جنگل کے گھنا ٹوپ اندھیرے میں نور کی تلاش میں نہیں بھٹکتے۔ روشنی تھی۔ ایسے میں جو بے غرض انصاری کی روایات پر چلے، گھر کے بوہے باریاں کھول کر مجسم مہمان نواز بن گئے۔

سے آدرش راستے بھی مل گئے اور چلتے رہنے کی توفیق بھی میسر آ گئی۔

کچھ نے اپنے وجود کو کمپوس کی نذر کر دیا۔ کچھ محترم حضرات دیکھیں پکا کر ریزہوں پر لا دکر کمپوس میں لاتے۔ وہ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ نہیں لگا رہے تھے بلکہ ان چیزوں پر Have not کے لیے کام کر رہے تھے۔ جیب سے بساط نھر۔

پاکستان کے مسائل اور حب الوطنی کے مظاہروں کا عجب دور تھا۔

کچھ سیانے سوچ بچار کا ایندھن بنا کر برصغیر کے بنیادی مسئلے کو سمجھنے میں لگے تھے۔ ان میں سے ایک اشفاق احمد تھے جن کا رویہ، سوچ اور عمل ٹیٹوں مثبت تھے۔ وہ دوسروں کو سمجھانا جان گئے تھے۔

برصغیر کی دو مشکلات ایسی ہیں جن کی آمیزش سے یہاں کی سماجی شناخت متاثر ہوتی رہی ہے۔ گروہ کی اہمیت اور جہت ان ہی دو اڑچنوں میں کہیں گم نہ ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ برصغیر کے حملہ آوروں میں پہلے تو جوشال تھے جو شال سے آئے اور جنہوں نے اپنی برتری قائم کرنے اور رکھنے کی خاطر یہاں کے مقامی کول، دراوڑ، سیدھائیوں کے گم رو، غیر منہد، اچھوت لوگوں کو اپنے میں مدغم ہونے کی اجازت نہ دی۔ رفتہ رفتہ ان ہی آریاؤں نے فلسفہ حیات کی تشکیل دی اس کے دوران کان سارے معاشرے اور فرد کے اندر لہو اور ارادہ بن کر موجزن ہو گئے۔

ایک تو آواگون کا فلسفہ تھا اور دوسرے معاشرے کو برہمن، کھشتری، ویش اور شوہر میں تقسیم کرنے کی بانٹ اصل بنیادی وجہ ایک ہی تھی۔ وہ مقامی لوگوں میں گھل مل کر رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ہندو مذہب میں آواگون کا فلسفہ ہی بانٹ کو تقویت دینے کے لیے تھا۔ فرد کی توجہ سوسائٹی کی تفریق سے ہٹا کر اس بات پر مرکوز کر دی گئی تھی کہ بابا جی جیسے کرم ہوں گے ویسا ہی دوسرا جنم ہوگا۔ تم جو ن بدلتے پھر دو گے اور کبھی کہیں کسی خوش نصیب کو اعلیٰ عمل کے نتیجے میں حاصل ہو جائے گا ورنہ باقی خلق اسی چکر میں رہے گی۔

دوسروں کو اپنے سے بلا وجہ کمتر سمجھنے سے جو احساس جرم پیدا ہوتا اُسے نیک عمل کی ترغیب سے فوراً بھسم کر دیا جاتا تھا۔ یہ بھی حکومتیں اپنے ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لیے کمزور عوام کو اسی طرح Side track کیا کرتی ہیں۔

آریاؤں نے اس زہر کو سوسائٹی میں بظاہر اہمیت دے کر اس کی تکمیل چلا دی۔ اسے مسلمان حملہ آوروں نے بھاری بھاری۔ شمالی علاقوں سے جو حملہ آور وقتاً فوقتاً وارد ہوئے وہ بھی احساس برتری کی دولت سے مالا مال تھے۔ محمد مصطفیٰ (ﷺ) نے اسلامی رواداری، توحید پرستی، انصاف پسندی کا پرچم لے کر ساحلوں پر اترنا۔ اس کی عمر ایسی تھی کہ وہ آدرش پرستی کا شکار تھا لیکن اونچ نیچ والے معاشرے میں آسانی سے انصاف قائم نہیں کیا جاسکتا۔

اگر فرد یا گروہ اس فریب میں مبتلا ہو کہ وہ کسی سے ارفع یا اعلیٰ ہے تو وہاں انصاف کا آدرش پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ شہید محمد بن قاسم بھی اس بنیادی اونچ نیچ کا شکار نہ ہوتا لیکن اسے مہلت نہ ملی۔

ایسے اکثریتی معاشرے میں جہاں عمل کو تولنے والا کوئی معیار، توازن یا بنیادی اصول نہ ہو، عمل کی آڑ میں کئی Self Motive لوگ آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں۔ برصغیر کی مسلم اقلیت بھی ایک عرصہ سے انفعالیات کا شکار رہی۔ اسلام میں جو بنیادی اہمیت نیت کی ہے، وہ اسی رکاوٹ کو عبور کرنے کے لیے پیش کی گئی۔ ایک طرف نیت،



دوسری جانب معاشرے میں برابری اور تیسری طرف رزقِ حلال کا حصول ایسے معیاری اور مشکل اصول ہیں جو اسلامی معاشرے میں انصاف کو روح رواں بننے نہیں دیا۔

اس معاملے میں مغرب والے ہم لوگوں پر سبقت لے گئے۔ وہاں گروہی شناخت اور فرد کی اہمیت کی بجائے Ethnic Group، ذات، نسل، قبیلے کی مرہونِ منت نہیں۔ رنگ کا مسئلہ انہیں درپیش تو ضرور ہے لیکن انہیں ہمواری نے انصاف اور قانون کا احترام آسان کر دیا اور سچ بولنے اور حق دینے میں کچھ ایسی دشواری پیش نہیں آتی۔ شمال کی جانب سے آنے والے مسلمان حملہ آور ریائی قوموں سے کچھ مختلف نہ تھے۔ انہیں کھلی قدروں کی پاسداری ملحوظ نہ تھی۔ ساسانی، ایرانی، افغانی، یونانی سارے احساسِ برتری سے سرشار تھے، لیکن وہ ہمواری میں گھل مل کر اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتے تھے۔ رنگ و نسل کا تقاضا، رسم و رواج سے وابستگی، اسلام کے نام پر سے جواز ڈھونڈ لیے گئے اور مقامی لوگوں سے شادی بیاہ، مناجنا قریب قریب ناممکن ہو گیا۔

حملہ آور ویسے بھی فاتح کہلانے کے لیے دشوار گزار راستوں سے آئے تھے۔ وہ چاہے سکندر یا عظیم دوست یا محمود غزنوی اور نادر شاہ کے روپ میں ہلا کوہن کر تھیں نہیں کرنے آیا تھا۔ وہ مقامی لوگوں میں ظلم کی کہانیاں سناتا گیا، لیکن انصاف کے لیے ہلکتی رعایا کو کوئی علاج نہ پیش کر سکا۔

پنجاب کی سرزمین میں حملہ آوروں کے ساتھ ساتھ اور کبھی کبھی دور دراز سے علی جوہری داتا گنج بخش بھی لہیک پکارتے اس مقام پر آئے جسے ظاہر کہتے ہیں۔ بادشاہوں، حملہ آوروں، اونچی جاتی کے مہابہ شوں کے سر پر مرہم کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ ان ڈیروں میں پناہ گزین ہونے لگے، جہاں مفت روٹی ملتی تھی اور دکھڑا نہ۔ رحم دل بابا ملتا تھا۔

لیکن سچ کا راستہ پھر مسدود ہونے لگا۔ لوگ دنیا کے ستارے ہوئے ڈیرے پر آتے تھے، لیکن انہیں تلاش تھی، نہ معرفت حق۔ صوفی کے پاس دینے کو دنیا نہ تھی۔ وہ تو خود بہت کچھ تیاگ کے، دنیا کی راحتوں سے منہ پھرتے، کو خواہشات کے چنگل سے نکالنے کا خواب دیکھتا آیا تھا۔

مہابہ تابدھ سے لے کر ماڈرن عہد تک یہی کچھ سکھانے کے لیے کچھ اللہ کے لوگ گھروں سے نکلے تھے۔ کچھ صوفی ایک غریب کے کا سے میں ڈال رہا تھا، اس کی حاجت مند کو ضرورت نہ تھی۔ اس طرح عوام اور پیر کے مریدین اور خلیفہ حضرات کی دروغ گوئی کا ایک انوکھا سلسلہ چل نکلا اور غریب کو پھر صرف احساسِ کتری ملا۔ انصاف نڈل پایا۔

سچ کو خوشامد کی خوبصورت چادر اوڑھا کر دفن کر دیا گیا۔ بے بے نسب نامے عرب کے مقتدر قبیلوں سے جانے لگے۔ شجرہ لکھنے اور پڑھنے کا رواج ہوا۔ عام آدمی ایک بار پھر اتنی شان و شوکت کے سامنے ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے اپنے ارد گرد بھوٹ کے شامیانے گاڑھ لیے اور ان میں استراحت کرنے لگا۔ اپنی چوری سینہ زوری کے لیے گردی، عزت کی خاطر مرٹنے یا مار ڈالنے کا جواز اس نے مذہب اور رسم و رواج میں تلاش کر لیا۔

اس طرح مشرق میں انصاف اور قانون کا تصور باقی تو رہا لیکن اضافی شکل میں اس پر عمل مفقود تھا۔ مشرق

حیات کے سوالوں میں سمجھی رہے نہ تھے۔ انہیں حملہ آوروں سے بھی اتنا پالا نہ پڑا تھا۔ انہیں مختلف رنگوں سے بھی نپٹنے کی ضرورت نہ تھی۔ گورا، گندمی، گندم گوں، پیازی، سانولا، کالا ایسے الفاظ ان کی لغت میں نہ تھے۔ قدرت نے انہیں اس قدر عطر برابری عطا کر کے بڑی سہولت پیدا کر دی تھی۔

### ان کے دو اوصاف

مغرب میں انسان کی شناخت کے لیے دو چیزیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ یا تو انسان کے آداب (Manners) اس کی پہچان ہیں یا اس کا کام اور سوسائٹی کا عطا کردہ مقام اس کے Identity Card میں شمار ہوتا ہے۔ مغرب سے ایک بہت بڑی خوبی اُن میں پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ قانون کے پابند رہتے ہیں۔ ان کے لیے ہار بار آئین نہیں بنتا اور انصاف جو اسلام کا روحِ رواں ہے، ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور ان کے معاشرے کی پہچان بن جاتی ہے۔

طبقات وہاں بھی ہیں۔ وہاں بھی ناہمواری ہے۔ انسانی معاشرے میں مکمل برابری ممکن نہیں لیکن وہاں ایک سے دوسرے طبقے میں خروجِ قدرے آسان ہے اور انصاف کی شرائط پوری کرنا کارے دار نیست۔ خالص صاحبِ ذہنیت کو سمجھنے کے لیے بڑے پاپڑ پیلیے، بہت ساری کتابوں کی چھان بین کی۔ اُن کے کاغذات میں یہ تحریریں ملی

”ہندو یوما، میں ایک عجیب و غریب پرندے کا ذکر ہے جس کو داملیک اپنی رامائن میں جٹایو کے نام سے پکارتا تھے۔ بن کے بچوں سچ جٹایو گہری فینڈ سویا کرتا تھا۔ یہ پنچھی ساٹھ ہزار سال تک گدھوں کا راجہ بن کر رہا اور ان کے

ان گدھوں کے پر یوار میں جٹایو کا بڑا بھائی سمپتی بھی رہتا تھا، جس نے اپنے چھوٹے بھائی جٹایو کا جیون کے لیے اسے اپنے پر نوج کر دے دیئے تھے کہ وہ دھوپ اور گرمی سے بچا رہے۔ جٹایو اپنے بڑے بھائی کے اس

جب سری رام چندر جی، لکشمن جی اور سیتا جی بنوں میں مارے مارے پھرتے تھے تو ان کی مدد، بھیڑ بچھڑیوں کے جٹایو سے ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر گھبرا گئے، پر جٹایو نے سس نوا کر کہا، میں تمہارا مڑت ہوں اور تمہارے باپ شری دشر تھ کا

جٹایو نے شری رام چندر جی سے کہا کہ میں تمہارے گھر پر نہ ہونے کے سے سیتا جی کی دیکھ بھال کیا کروں

جب راون سیتا جی کو اٹھا کر لے چلا تو سیتا نے غل مچا کر جٹایو کو جگایا۔ جٹایو نے کہا ”ہے راکھشش! تیرے

پرانے سے دھرتی ڈانواں ڈول ہو جائے گی اور تیری آتما نرک کا بھٹنا بن جائے گی۔ اس ابلاناری کو چھوڑ دے۔

”اپنے کرودھ سے تیرا جنم جلا دے گا۔“

پر راکھشش نہ مانا اور اس نے اپنے بھالے سے جٹایو پر بلہ بول دیا۔ جٹایو نے اپنے پنکھ مارا ماریا اور ان کی

دھنش کو توڑ دیا اور اس کے اڑن کھٹولے کو دھرتی پر گرا دیا۔ سینا اور راوون اڑن کھٹولے سے اس روپ میں گرتے رہے۔  
 راوون کی گودی میں آگنی۔ گھڑی دو گھڑی راوون جٹایو کے ساتھ لڑتا رہا اور پھر بتیا چاری راکشش نے اُچھل کر جٹایو کے  
 دونوں پنکھ کنار سے کات دیئے۔ جٹایو دھرتی پر لوٹنے لگا۔ سینا نے جٹایو کو اٹھا کر اپنی نزل چھاتی سے لگا لیا، پر وہ تو  
 بجلائی آگ کی طرح ٹھنڈا ہو چکا تھا۔“

ہامیک کی رامائن پڑھ کر اشفاق صاحب کو بڑا دکھ ہوا کہ اس نے جٹایو کے کارنامے کو تو بہت بڑھا چڑھا ہے  
 ہے لیکن اس کے برادر اکبر سمپتی کا کہیں اور تذکرہ نہیں آیا جس غریب نے اپنے پر جٹایو کو دے کر اتنی بڑی قربانی کی تھی  
 جٹایو پر اے پھدے میں ٹانگ اڑا کر راہی منڈب عدم ہو گیا تھا۔ آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ رامائن کا تذکرہ لکھ کر سمپاتی کی  
 پر مزیروشنی ڈالوں کہ بعد میں اس کا کیا بنا۔

### مہا بھارت

گُہر شراداشی مہاراج جٹے کے شرپ یکیہ سے ہو کر ایک رشیوں کی منڈلی میں پہنچتا ہے اور وہاں اُن روایات  
 مہا بھارت کے قصے اور واقعات بیان کرتا ہے جو یکیہ کے دوران میں متفرق رشیوں نے بیان کیے۔

### شرپ یکیہ کی وجہ

چندر مننی خاندان جس کے چند مشہور افراد میں کرشن جی، راجہ شانتو (جس کے فرزند ہمیشم نامہ تھے) اور  
 بھرت (راجہ دغنت کا لڑکا) اور پانڈوؤں کا نام قائل ذکر ہے۔ اسی خاندان کا ایک مشہور بادشاہ پر تھت تھا۔ ایک  
 پر تھت سیر و شکار کی غرض سے توبن میں گیا۔ اچانک ساتھیوں سے چھڑ گیا۔ مارا مارا پھر رہا تھا کہ ایک رشی نظر آیا  
 مون بھرت (چپ سادھے) رکھے مانک سے لو لگائے بیٹھا تھا۔

راجہ نے لاکھ بلایا لیکن اُس کی زبان کو جنبش نہ ہوئی۔ آخر تھگ آ کر راجہ نے ایک ہرا ہوا سانپ سمیک  
 گلے میں ڈال دیا اور آپ رخصت ہوا۔ راستہ میں شرنگی رشی سے ملاقات ہوئی۔ اسے تمام حالات بتائے۔ اتفاق سے  
 شرنگی رشی سمیک کا بیٹا تھا۔ جھٹ سراپ دیا کہ جاتھے آج سے سات دن کے اندر اندر تلشک ناگ ڈس لے۔

باوجودیکہ ہر طرح سے حفاظت کی گئی لیکن تلشک ایک سیب میں داخل ہو کر راجہ کے پاس پہنچا اور چونکہ  
 نے سیب تراشا، ڈس کر چلتا بنا۔

اسی راجہ کا بیٹا جٹے جب بڑا ہوا تو اُس نے سرپ یکیہ کیا۔ تمام رشیوں منیوں کو اکٹھا کیا۔ ہون جلا یا جس  
 زمانے بھر کے سانپ اڑا کر آتے اور بھسم ہوتے رہے۔ آخر تلشک جو راجہ اندر کے ہاں پناہ گزیں ہو چکا تھا، آ گیا  
 ہو گیا۔ رشی آستک کے کہے پر راجہ نے سرپ یکیہ بند کر دیا۔

ویاس جی کی پیدائش (اٹھارہ پُران اور وید تصنیف کی)

جھڑنسی راجاؤں میں ایک راجہ ہو گا۔ اس کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ لڑکا تو اُس  
 کے تھوڑے اور لڑکی کو ایک ملاح کے سپرد کیا۔ لڑکی کے ذمے یہ کام تھا کہ ریشیوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے  
 پہنچائے۔ بارہ برس کا سن تھا۔ جب ایک دن یا راجہ جی جو ایک پنچے ہوئے بزرگ تھے، اس کی معیت میں پار جانے  
 کے لیے نئی پونکھ ملاحوں کی لڑکی تھی، اس لیے اُس کے جسم سے مچھلی کی بساند اٹھتی تھی، جس کا اُسے بہت خیال تھا۔  
 اس دن اُس پر آ گیا اور اسی ترنگ میں دعا دی کہ آج سے تیرے جسم سے صندل کی خوشبو آ کرے گی اور اگر حمل ہو  
 گا تو وہ اور جہاں پیدا ہوگا کہ باپ و شاییدہ..... ویاس جی پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے ہی جنگلوں کی راہ لی، جہاں ساری زندگی  
 وہ تنہا ہی گزارنے لگا۔

### راجہ دشننت و شکنتلا

راجہ جی اپنے خاندان کے حالات سن رہا تھا اور جانتا چاہتا تھا کہ ہندوستان کا نام بھارت ورش کیونکر پڑ گیا۔ سو  
 جاننے کے لیے بیان کیا کہ شکنتلا اور اہمیل و شوامتر رشی کی لڑکی تھی۔ رشی کا چپ تپ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ مہاراج اندر کو اپنے  
 کے لالے پڑ گئے۔ اس پر مینکا کو طیب کیا اور ختم صادر فرمایا کہ جا کر رنگ بھنگ کرو۔ مینکا نے کام دیا اور  
 کو ساتھ لیا کہ مدد کریں اور حکم خاتمہ نجانائی۔ شوامتر اور مینکا کے میل سے شکنتلا پیدا ہوئی۔ رشی مہاراج پھر چپ  
 تپ سے مشغول ہوئے۔ مینکا نے سوگ کی راہ لی۔ شکنتلا کو نورشی نے بیٹی بنا کر پال لیا۔

ایک دن راجہ دشننت جنگل میں آئے۔ شکنتلا کا روپ دیکھ کر دل آ گیا۔ گندھرب دادا کیا۔ شکنتلا نے بردان  
 کو حمل ہوا اور بچہ پیدا ہوا تو وہی تخت و تاج کا وارث ہوگا۔ دشننت نے بردان دیا اور گھر کی راہ لی۔ کورشی واپس  
 آئے تو دیکھا کہ شکنتلا یہاں ہی جا چکی ہے۔

کچھ عرصہ بعد راجہ بھرت پیدا ہوئے۔ ماں نے بچہ کو راجہ دشننت کے پاس بھیجا، جس نے پہچاننے سے اس لیے  
 کہ زمانے کی طعنہ زنی سے ڈرتا تھا۔ بالآخر آکاش سے آواز آئی کہ یہی فرزند تخت و تاج کا مالک ہوگا۔ سو شکنتلا  
 کو اپنی بیٹی بنا لیا اور یوں بھرت کے نام پر ہندوستان کا نام بھارت ورش ہوا۔

### بھیشم پتاما کی پیدائش

ایک روز برہم سجا کا اجلاس ہوا۔ اس میں مہا بھک راجہ بھی آئے اور یوتاؤں کی استریاں بھی تشریف لائیں۔  
 مہا بھک کا حسن و جمال افروز ایسا تھا کہ مہا بھک عاشق ہو گئے۔ برہما جی برا فروخت ہوئے کہ ایسی مجلس میں یہ ایسی بدگواہی۔  
 یہ کہی کہ جاؤ زمین پر ایک جنم بھوگ کر آؤ۔ یہی راجہ شاننو کے روپ میں پیدا ہوئے۔ گنگا جی کے دل میں بھی آگ  
 لگی تھی۔

مہا بھک کی وجہ سے اپنے باپ برہما سے اجازت لی اور دنیا کا رخ کیا۔ راستے میں آٹھ سو ملے کہ جنہیں دنیا  
 کی زندگی کاٹنے کا سراپ ملا تھا۔ گنگا جی نے وعدہ کیا کہ انہیں اپنے بطن سے پیدا کر کے جلد از جلد دنیا سے رخصت کر دے

گی لیکن ایک بچہ دنیا میں باقی رہے گا۔ ایک سبوجس کا نام دیوتھاراضی ہو گیا لیکن یہ شرط پیش کی کہ جب تک جیوں کا کچھ دنیاوی جھنجھٹ میں نہ پڑوں گا۔ یعنی شادی بیاہ نہ کروں گا۔

گنگا کی شادی شانتو سے ہوئی تو اس نے راجہ سے برانگا کہ جو کچھ میں کروں مجھے ٹوکنا نہیں۔ سات برس کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے۔ وہ بچہ پیدا ہوتے ہی گنگا کے سپرد کر دیتی تھی۔ جب آٹھویں بار حمل ہوا تو شانتو ناراض ہو گیا کہ اس بار بچہ میرا ہوگا۔ بچہ (دیو برت) پیدا ہوا تو گنگا رخصت ہوئی کیونکہ راجہ نے اسے ٹوک دیا تھا۔ اس طرح دیو برت جس کا نام بعد میں پتاما ہو اور جس نے ساری زندگی برہم چاری کی زندگی بسر کی۔

### راجہ شانتو کی متسودری سے شادی

متسودری جس کا نام اس کی خوشبو کے باعث جو جن گندھا پڑ گیا تھا، ایک دریا پر ملائی کرنے جاتی تھی۔ شانتو کو خوشبو کشتاں کشتاں کھینچے لائی۔ دیکھا تو صورت بھی بڑا کی نظر آئی۔ ملاج سے لڑکی کا مدعی ہوا لیکن ملاج نال گیا۔ پہنچا تو حالت غیر دیکھ کر بھیشم پتام نے وجہ پوچھی۔ جب علم ہوا کہ یوں جو جن گندھا کے لیے پریشان ہیں تو ملاج کے پانی پہنچا اور ہر ممکن شرط ماننے کو تیار ہو کھڑا ہوا۔ ملاج نے کہا کہ میری بیٹی کے بطن سے جو بچہ پیدا ہو وہی بادشاہ بنے۔ پتام نے وعدہ کیا کہ جیتے جی شادی ہی نہ کرے گا تا کہ متسودری کا بچہ راج گدی کا وارث ہو سکے۔ اپنے باپ کے لیے متسودری کو لے کر روانہ ہوا۔ یاد رہے اسی متسودری کے بطن سے ویاس جی بھی پیدا ہوئے تھے اور اسی رانی کا نام راجہ پتاما نے رانی ستوتی رکھا۔

متسوتی کے بطن سے دو فرزند تولد ہوئے۔ چترانگد اور پختر بیرج۔ ابھی دونوں کمسن تھے کہ راجہ شانتو کا انتقال ہو گیا۔ بھیشم پتام نے بڑے لڑکے کو گدی پر بٹھا کر نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیا، لیکن بڑا لڑکا نالائق ثابت ہوا اور ایک سال میں مارا گیا اور یوں پختر بیرج راجا ہوا۔ وہ بڑا نیک چلن اور راست باز تھا۔ بھیشم کی باتیں من و عن مانتا تھا۔ جب پختر بیرج سن بلوغ کو پہنچا تو ان ہی دنوں راجا کاشی نے اپنی تین راجبھاریوں ایسا، انبا لکا اور انبا لکا کا سونے رچایا۔ بھیشم پتامہ پختر بیرج کو لے کر پہنچے اور سوئمبر کے اصول جمنڈامیدواروں کے گوش گزار کیے۔

1- برہم وواہ: دفتر کو آراستہ کر کے ہاتھ میں پانی دے کر کنیا دان کیا جائے۔  
2- اُسردواہ: دولت کا لالچ دے کر عزیز و اقارب کو پھانس لیا جائے اور یوں لڑکی سے وواہ کیا جائے۔  
3- راکھش وواہ: زبردستی اور ظلم سے لڑکی کے والدین کو رضامند کیا جائے اور پھر لڑکی کی رضامندی کے خلاف شادی کی جائے۔

4- گندھرب وواہ: عورت اور مرد جوشِ محبت میں بیاہ کر لیں۔ افضل مانا گیا ہے۔  
5- آرش وواہ: یہ افضل تو نہیں لیکن رائج ہے۔ دو گائیں خاوند سے وصول کر کے لڑکی سپرد کر دی جائے۔  
6- دیو وواہ: اعلیٰ درجے کا مانا گیا ہے۔ سوئمبر اسی اصول پر ہوتے ہیں۔  
7- پر جابت وواہ: افضل مانا گیا ہے۔ جہیز دے کر لائق لڑکا ڈھونڈ کر لڑکی بیاہ دی جائے۔

بتاج وواو: حد درجہ کا ناقص اور داخل گناہ ہے۔ لڑکی کو جو اس باختہ پاکر یا نشہ پلا کر اُزلے جانا۔  
 ہیشم پتامہ نے اپنے زور بازو سے تینوں راجکماریاں سنبھالیں اور چلتے بنے۔ راہ میں کئی ایک راجوں سے  
 لڑائی ہوئی لیکن سبھی ہار گئے اور ہیشم پتامہ تینوں لڑکیوں کو لے ہستنا پور پہنچے۔ اپنانے موقع پاکر گزارش کی کہ چونکہ  
 تیری سنگیتر ہوں اس لیے مجھے معاف کیجیے اور اس کے پاس بھجوائیے۔

ہیشم مان گئے اور یوں پختہ بیرج کی دور انیاں ہوئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد راجا لا ولد ہی مر گیا اور مہارانی ستوتی  
 کی فکر میں ویاس جی کو بلایا کہ اب انتظام فرمائیے۔ جائز وارث کوئی نہیں اور رانیاں گھٹی مرتی ہیں۔ ویاس جی  
 سے کہ بن بھن کر میرے پاس آئیں اور نہ گھبرائیں۔ پہلے ابر کا گئی۔ پچاری ویاس جی کو دیکھ کر ایسی گھبرائی کہ  
 سانس نہیں۔ اسی لیے اندھے دھراشتر پیدا ہوئے۔ پھر اپنا کا گئی۔ دیکھتے ہی رنگ از گیا۔ اس کے بطن سے پانڈو پیدا  
 اس کے بعد ابر کا لے چالا کی سے ایک خواص بھیجی۔ اس کے ہاں بڑی پیدا ہوئے۔

### پختہ بیرج

(ماروی کے بطن سے)	پانڈو	دھرتراشتر
بُرمی	پانڈو	ابیکا (گندھاری کے بطن سے)
	ابنا کا (کنتی) کے بطن سے	ہر یودھن
	جد حشر	کنتی
	بھیم سن	دوشاسن
	ارجن	ہوم
	نکل	(موبھائی)
	سہد یو	

دھرتراشتر کی بیوی گندھاری کو ایک جوگی کا بردان تھا کہ سو بیٹے کھلائے گی۔ ابھی اس کو حمل باقی تھا جب اسے خبر  
 پائی کہ وہ خدا نے پانچ لڑکے عطا کیے تو مارے حسد کے پیٹ پیٹنے لگی۔ حمل گر گیا۔ اب اس نے جوگی کی دیوائی کہ وہ  
 نہ دیا۔ رشی جی کا نزول ہوا۔ حکم ہوا کہ گوشت کے لوتھڑے کو سو حصوں میں تقسیم کر کے سو گھی کے متکوں میں بند کر دو اور  
 کھد سو کورو پیدا ہوں۔

مہارانی کنتی جب چھوٹی تھی دربار ساراش نے اسے ایک منتر سکھایا کہ جب چاہو گی کسی دیوتا کو بلا سکو گی۔ جب  
 منتر پڑھی تو ایک دن اس منتر کی آزمائش کی اور سرج نارائن کو بلایا۔ وہ حاضر ہوئے تو آتے ہی عاشق ہو گئے۔ حمل ٹھہر  
 گیا۔ ہر دو دن دیا کہ بچے کی کسی کو خبر نہ ہوگی۔ وقت معین پر کرن پیدا ہوا اور کنتی نے پانی میں ڈال کر خدا کے حوالے کیا اور  
 پختہ بیرج کے رہبان نے بیٹا بنا کر پرورش کی۔

راجہ پانڈو ایک دن شکار کو گئے تو ایک ہرن ہرنی کو عین جنسی فعل کے وقت مارا جس رشی کا ہرن تھا اس نے  
 شکار کیا کہ تو بھی عین لطف زندگی کے وقت جان دے گا۔ راجہ پانڈو کا جی راج پاٹ سے بھر گیا۔ وہ اپنی دونوں رانیوں کو

لے کر جنگل میں رہنے لگا۔ اولاد کی اُمنگ دن پردن بڑھی اور آخر میں یوں دیوتاؤں کو لد و لدی کا داغ مٹانے کے لئے لے کر جنگل میں رہنے لگا۔

مہارانی کنتی اور سری دھرم راج (یم دوت) راجہ جد ہشتر  
 کنتی اور پون جی بھیم سین  
 کنتی اور راجہ اندر ارجن  
 ماروی اور اسوتی کمار نکل اور سہدیو

لیکن ایک دن پانڈو ماروی کے روپ سے بہت ہی متاثر ہو گئے اور موت کی پروا ابھی نہ کی تو یمن لفظ کے وقت جان نکل گئی۔ ماروی نے سستی ہونا قبول کیا اور کئی پانڈوں کو لے کر ہستنا پور آ گئی۔

دریودھن شروع سے ہی حسد تھا اس لیے بھیم سین کو زہر دے دیا لیکن باسکی ناگ نے سارا زہر کھینچ لیا اور بھیم سین بخیر و عافیت واپس لوٹا۔

درونا چار یہ کو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا گیا اور جب دونوں لائق ہو گئے تو ایک دن دریودھن بھیم سین کو زہر دیا۔ اس نے بار باسک ناگ کی دختر ایل متی سے شادی کر لی۔

حسد نے رفتہ رفتہ یہ صورت پکڑی کہ اسٹھے رہنا ناممکن ہو گیا اور فیصلہ ہوا کہ برناوہ میں پانڈو رہیں اور ہستنا میں کورو۔ ادھر دریودھن نے سیمبڑائی اور ایک لاکھ سجد کا عمدہ مکان تعمیر کروایا۔ تدبیر یہ تھی کہ سوتے میں مکان بن جائے۔ حسن اتفاق سے راجہ جد ہشتر کو علم ہو گیا اور جس رات مکان جلنا تھا اس رات وہ خا موٹی سے اپنی ماں کنتی سے برا گئے اور ان کی جگہ پانچ فقیروں اور ان کی ماں بھسم ہو کر رہ گئے۔ اب دریودھن خوش ہوا۔

اب یہ پانچوں بھائی آوارہ پھرنے لگے۔ راہ میں بھیم سین پر بڑھیا راکشسی فریفتہ ہو گئی اور بھیم سین نے اسے ساتھ گندھرب دواہ کر لیا۔ اس کیب طنن سے گھوٹ کچ پیدا ہوا۔ ان ہی دنوں میں مہاراجہ دروپدی کی بہن دروپدی پیدا ہوئی۔ شرط یہ تھی کہ ایک بھڑکتی چمکتی جواہرات کی مچھلی کو ایک تیل کے کڑا ہے میں دیکھ کر نشاندہ کیا جائے۔ چکرشن کرشن تھا۔ مچھلی پر نظر نہ جمی تھی۔ سب راج ہار گئے۔ ارجن جو برہمنوں کے بھیس میں تھا، اٹھا اور شرط جیت لی۔

جب دروپدی کو لے کر کنیا میں آئے تو ماں سے کہا کہ ایک مال لائے ہیں بہت ہی عمدہ۔ ماں نے کہا یہ بھائی ہانت لو۔ دروپدی پانچوں کی بیوی ہو گئی۔ پورا ایک سال ایک بھائی کے ساتھ رہتی تھی اور شرط تھی کہ اگر غلطی سے دوسرا بھائی خواب گاہ میں آ جائے تو اسے بارہ برس کا بن باس۔ ارجن ایک دن ایک برہمن کی رکشا کے لیے گیا اور وہ برہمن کا بیٹا تھا۔ اسی دن وہ برہمن کی بیوی سے شادی کر لیا۔

راجہ دھرتراشٹر نے سلطنت کے حصے بخرے کر دیئے۔ ہستنا پور کوروں کو ملا اور اندر پرست پانڈوں کو۔ ارجن نے اپنے بارہ برس کے دوران میں باسک ناگ کی لڑکی الوپی سے گندھرب دواہ کیا۔ پھر مہرے راہجکمار کی چندا گند اور اس کی بہن کو عقد میں لایا اور آخر میں کرشن جی کی بہن سوبھدرا سے شادی کی جس کے بعد اہنمبہ پیدا ہوا۔

راجہ جد ہشتر کو سری کرشن نے صلاح کی کہ راج سو یہ یکیہ کر داس میں اس نے پانڈوؤں کو بھی مدعو کیا جو اس جگہ کی حالت کو دیکھ کر ایسے جلے کہ انتقام کا موقع ڈھونڈنے لگے۔ آخر جد ہشتر وغیرہ کو اپنے ہاں مدعو کیا اور جوئے میں شگنی سے اس کا سب کچھ جیت لیا۔ حتیٰ کہ وہ پانچوں بھائی غلام اور درو پدی کنیر ہو گئی۔ اس پر بھی در یودھن کا کلیجہ کھٹک گیا۔ اس نے درو پدی کو سرد در بار برہنہ کرنا چاہا لیکن جوں جوں وہ شاسن چادر کھینچتا تھا، ستر لہبا ہوتا جاتا حتیٰ کہ در بار سے بھر گیا۔ پھر در یودھن نے راننگلی کی اور درو پدی کو دعوت دی کہ کوروؤں میں سے کسی کی رانی بن جائے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ٹرائی میں کرن کی جان لے گا اور در یودھن کی ران توڑے گا۔ جب رانی گاندھاری کو اس کا حکم ہوا تو وہ دوڑی آئی اور دھرا شتر کو شرمندہ کیا اور جد ہشتر کو راج پات دلایا۔

درو یودھن کے دل میں دکھ تھا۔ اس نے دوبارہ جد ہشتر کے ساتھ جو اٹھایا اور اس بار شرط یہ رکھی کہ جو بارے اس کے کو بارہ برس بن باس۔ اس کے بعد ایک سال ٹپت رہنا۔ اگر اس سال کے دوران میں دوسرا فریق پہچان لے تو اس کا ہن کا ہن باس۔ جد ہشتر ہار گیا اور یوں پانڈوؤں کا بن باس شروع ہوا۔ پانڈوؤں کے ہاتھ برہمنوں کا ایک لکڑاٹھ لکڑاٹھ سونے سونے سورج نارائن کے بردان کے باعث جد ہشتر ان سب کی تواضع کرتا ہی رہا۔

ارجن نے بہت دن تپسیا کی تو ایک دن مہاد یوجی بنفس نفیس آئے اور اسے آزمایا۔ دوران جنگ مہاد یو کا جسم ارجن سے چھو گیا اور اس طرح ارجن میں یہ قوت پیدا ہو گئی کہ وہ اسی جسم سمیت بہشت جاسکتا تھا۔ دھرم راج اندر وغیرہ میں لے گئے اور ہر قسم کا علم فن سکھایا۔ جب شستر ودیا (علم جنگ و جدل) بہت سیکھ گیا تو اندر نے چتر سین کے پاس گیا کہ گندھرب ودیا (موسیقی) بھی سیکھ لو۔ اس طرح جب ارجن اسپراؤں کے ساتھ ناچ گانے کی مشق میں مشغول تھا تو اس پر عاشق ہو گئی لیکن ارجن نے ٹالا۔ اس پر ارجن کی خوشگلیس ہوئی اور بددعا دی کہ جا ایک سال بیچھا بن کر رہے۔ یہ سراپ اس وقت کام آیا جب ارجن کو کوروؤں سے چھپنے کے لیے راجا براتھ کے ہاں پناہ لینا پڑی۔

راجہ جد ہشتر نے اس دوران میں تمام تیر تھوں کی زیارت کی اور رشیوں سے اپنے اسلاف کی کہانیاں سنیں جن سے اس کی دہشت کی داستان آج کل زبان زد عام ہے۔

### دل دہینتی

راجنل دہینتی پر عاشق تھا لیکن اس تک رسائی نہ تھی۔ ایک دن ایک ہنس قابو آ گیا۔ ہنس نے رہائی چاہی تو راجہ نے اسے ایک شرط پر۔ دہینتی سے جا کر میری محبت کا چرچا کرو۔ دہینتی نے جب راج ہنس کی زبانی راجہ کا احوال سنا تو ہزار ہنسی مینے ہو گئی۔ دہینتی کے باپ ”بھیم سین“ (پانڈوؤں) نے سوئمبر کی ٹھہرائی۔ اس سوئمبر میں شریک ہونے کو اندر، دھرم، گن اور برن دیوتا بھی جا رہے تھے۔ راہ میں راجہ اندر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ راجنل ہمارا ایک پیام کے پاس لے جاؤ کہ ہم چاروں میں سے کسی کو شہر بنانا قبول کر لے۔

راجنل نے الوپ انجن لگایا اور دہینتی کے حضور پہنچا لیکن وہاں تو اور ہی گل کھلا۔ دہینتی الٹے راجنل جی پر سو جانے نہ ہونے لگی۔ دوسرے دن جب سوئمبر میں دہینتی نے بے مالا ڈالنے کی غرض سے راجنل کو ڈھونڈا تو پتہ لگا راجنل کی سرت کے چار اور بھی بیٹھے ہیں۔ شپٹائی اور دعا مانگنے لگی۔ آخر خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ چار اگن، دھرم، اندر اور برن ہیں۔



سوچا تو دیوتا کی پہچان صاف نظر آئی نہ تو سایہ تھا نہ آنکھیں جھپکتی تھیں اور ان کے پاؤں تخت سے کچھ اونچے تھے۔ جب راجہ نکل کے گلے میں بے مالا ڈال دی۔ اس موقع پر دیوتاؤں نے نل کو بردان دیئے۔

1- تمہارے ایک میں تمام دیوتا اصلی صورتوں میں رونق افروز ہوں گے۔

2- عمدہ طور پر نجات ہوگی۔

اگنی دیوتا بولے

1- جب یاد کرو گے آؤں گا۔

2- مرنے کے بعد اس ست روشن جگہ ہو گے جہاں میں ہوں۔

دھرم راج بولے

1- تمہارے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیز ذائقہ میں بے نظیر ہوگی۔

2- اور ہار عنایت کیا جس کی خوشبو کبھی نہیں جاسکتی۔

برن نے کہا

جب یاد کرو گے پانی مل جائے گا اور جس خالی برتن کو دیکھو گے بھرا ہوا پاؤ گے۔

کلجک جود مینتی کا خواباں تھا۔ وقت پر سو نمبر میں نہ پہنچا۔ اب عرصہ کے بعد اس نے انتقام کی سوچی اور راجہ کے بھائی پشکر کو جوئے پراکسایا۔ نل نے تخت و تاج ہار کر دینتی کے ساتھ جنگل کی راہ لی اور اپنے لڑکے، لڑکی کو اپنے پاس کے پاس کندنا پور بھیج دیا۔

رائی نے بہت کہا کہ چلو میرے میسے چلو لیکن نل کو منظور نہ ہوا اور ایک رات جب اس نے موقع پایا تو دینتی کی آدھی چادر پھاڑ کر چلتا بنا۔ اب دینتی روٹی چلاتی بھکتی بھکتی راجہ چند ہری کے ہاں پہنچی۔ راجہ نل جب جنگلوں میں رہ رہا تھا تو کرکوکنگ ناگ آگ میں جل رہا تھا۔ راجہ نے اس کی جان بچائی لیکن اس نے موقع پاتے ہی کاٹ کھایا۔ جس سے راجہ کی ہیبت کڈائی ہی بدل گئی۔

اب ناگ بولا، یہ میری کینچلی نو، جب اصلی روپ میں آنا چاہو گے اسی کی بدولت آؤ گے۔ دینتی کو آخراپ نے ڈھونڈ نکالا اور پھر نل کی تلاش جاری ہوئی۔ راجہ نل راجہ رتو برن کا رتھ بان ہو گیا۔ رائی نے کچھ برہمن چارواگ بھیجے کہ چند اشلوک ہر جگہ سنائیں جہاں سے ٹھیک جواب ملے وہیں نل ہوگا۔ رتو برن کے رتھ بان یعنی راجہ نل نے اشلوک پڑھے اور جواب دیئے۔ اب دینتی نے رتو برن کے پاس پیام بھجوایا کہ چونکہ راجہ نل لاپتہ ہے اس لیے دوبارہ سو نمبر چارہ ہی ہوں۔ ایک دن میں پہنچو۔

رتو برن اور نل رتھ پر روانہ ہوئے تو گھوڑے ہوا ہو گئے۔ راجہ میں راجہ رتو برن نے ایک چھتھنار درخت کے ترپے پتے اور پھل گن لیے۔ نل متعجب ہوا کہ اتنی تھوڑی دیر میں ایسا حساب۔ سو فیصلہ ہوا کہ نل راجہ کو رتھ بان سکاٹے جس کے عوض راجہ رتو برن اُسے یہ فن سکھائے گا۔ جب دربار میں پہنچے تو رائی پہچان نہ سکی کہ نل کون ہے۔ سو اُس نے اپنی خواہش سنی کہ نل کے پاس دو خالی مشکینز دے کر بھیجا۔ جونہی نل کی نظر پڑی وہ پانی سے بھر گے۔ پھر نل کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتے

بغیر آگ کی چنگاری کے آگ جلائی تو دہشتی کو اعتبار آ گیا کہ ہونہ ہو یہی راجہ نل ہے۔  
 نل نے اپنے بچوں کو نل کی خدمت میں بھیجا۔ راجہ انہیں دیکھ کر رونے لگا۔ سو تصدیق ہوئی کہ یہی نل ہے۔  
 اس کے بعد پھر لشکر سے جوابازی کھیلی۔ اس بار چونکہ نل ایک بیڑے کے درخت کو ڈھا چکا تھا۔  
 اس لیے پشکر کی کوئی پیش نہ گئی اور یوں راجہ نل نے پھر

جنگل میں درو پدی پنچش تھی کہ ایک خوبصورت کنول کا پھول اس کے پاس آ کر رہا۔ اس نے بھیم سین  
 کو کہا کہ اگر ایسے ہی بچہ اور پھول میں تو کیا بات ہو۔ بھیم سین روانہ ہوا تو گندھ ماون پر بہت میں گزر ہوا۔ یہاں  
 اس نے اسے پھول لینے سے روکا کیونکہ یہ باغ گندھریوں کا تھا اور وہ ہی پھولوں کے چار حقدار تھے۔ ہنومان اور  
 بھیم سین اسے لینے سے روک رہے تھے۔ لیکن بھیم سین اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا اور جب اسے علم ہوا کہ یہی ہنومان ہیں تو اسے استدعا کی کہ  
 اسے چھوڑ کر اسے بھی بتائے جائیں۔

ہنومان نے رمان کے واقعات سننے کے ضمن میں کہا کہ جگ مندر جڈیل ہیں:  
 دھرم کی پوری عملداری کا زمانہ۔ وید ایک ہی تھے۔ شام بجز اتھرو اور روگ وید کی تخصیص نہ تھی۔  
 سنت جگ سے کم لیکن انسان راستی پسند اور عبادت سے غافل نہ تھے۔  
 دھرم میں کسی ایک وید کے بدلے چار وید بنے۔

جس میں ادھرم زوروں پر ہوگا۔  
 جنہوں نے جد ہشتر اور اس کے چاروں بھائی (ارجن بہشت میں تھا) بن باس کا ت رے تھے، ہری کشن بھگوان  
 کے ان کے پاس آئے۔ درو پدی اور سنت بھاماں میں پتی برتا عورتوں کے متعلق باتیں ہوئیں اور درو پدی  
 کی فطرت کی فضیلت بیان کی۔ مارکنڈ ہے جی جو درو پدی سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے راجہ جد ہشتر کو سیتاوان  
 کی کہانی سنائی جس میں ایک پتی برتا عورت کا اتہاس ہے۔

”امو پت“ مدرویش کا راجہ وار تھا۔ اس نے گلہ کیا اور ساوتری سے اولاد کی خواہش کی۔ جب لڑکی پیدا ہوئی  
 اس کا نام بھی ساوتری رکھا۔ جب بڑی تو امو پت نے اسے کھلی اختیار دیا کہ جس کے ساتھ چاہے شادی کرے۔  
 جب جنگل میں ساوتری کی پاکی جا رہی تھی۔ سیتاوان نظر پڑا۔ اس کا باپ امدھا تھا اور راج پانت کھو کر جنگل میں  
 رہتا تھا۔ ساوتری نے جب اس کے ساتھ شادی کی تمنا کی۔ ناروجی نے کہا کہ لڑکا تو اچھا ہے لیکن عمر فقط ایک سال باقی  
 ہے۔ پھر اسی سے شادی کی۔ جب ایک سال گزرا تو ایک دن سیتاوان کلہاڑ لے کر پھول نیل اور لکڑیاں لینے  
 کے لیے ساوتری بھی ساتھ ہوئی۔ کچھ دیر بعد سیتاوان اس کے زانو پر سر دھر کر سویا تو سوتا ہی رہ گیا۔ نگاہ اٹھائی تو سامنے  
 اس کے قالب کو انگوٹھے بھر کا بنا کر جانے والا تھا۔

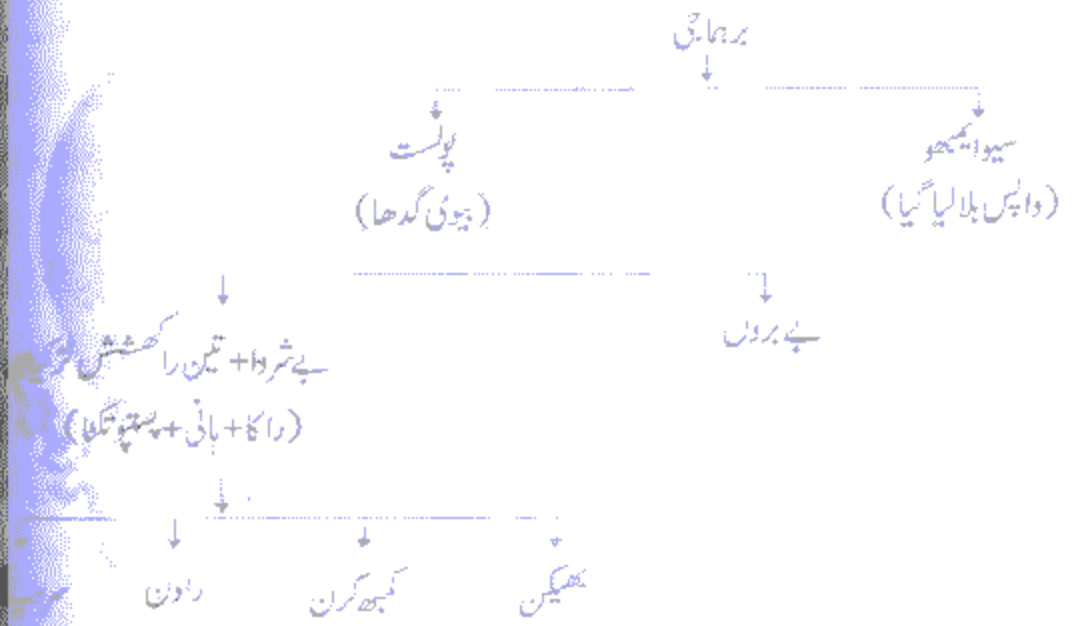
ساوتری میراج کے ساتھ ہوئی۔ میراج نے کہا کہ تو چونکہ پتی برتا عورت ہے سو مانگ کیا مانگتی ہے۔ فقط  
 یہ مانگنا۔ ساوتری نے کہا تو سسر کی آنکھیں دے دیجیے اور اقبال کے آفتاب کو گہن سے نکال کر

چکائیے۔ استدعا قبول ہوئی مگر اب بھی ساوتری پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ میراج نے دیکھا تو پھر بردان دیا۔ سردی سے سرسکے سر کو راج پاٹ دلوایئے اور دھر ماتا بنائیے۔

یہ بھی بات میراج نے مان لی لیکن اب بھی ساوتری ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور دھرم کی باتیں کیے جاتے۔ میراج نے کہا، اب کیا چاہیے؟ کہنے لگی کہ میرے بھائی نہیں ہے، ایسا بردان دیجیے کہ ماں کے سو بٹے ہوں۔ یہ سچ منظور ہوئی لیکن پھر جب میراج نے مڑ کر دیکھا تو ساوتری ساتھ بولے، مانگ کیا مانگتی ہے؟ ساوتری نے کہا کہتے ہیں ہے سوطا تورا، دھرم وہاں اور سعادت مند لڑکوں کی ماں بنائیے میراج نے کہا، مانا۔ اب ساوتری نے کہا، مہاراج! سنانے ہیں، جب ستیا وان ہی آپ کے ساتھ ہے تو میں ماں کیسے بنوں گی۔ سوستیہ وان کی روٹ واپس کی گئی اور میراج خوشی رہنے لگے۔

رام سیستا کا ذکر مارکنڈے جی کی زبانی

جب رام چندر وغیرہ بن میں تھے تو راون ایک دن سیستا جی کو اڑالے جانے بن میں آیا۔ راون نہایت دنیا کے تمام شہزادوں کا سرتاج تھا۔



برہاجی نے جہاں تمام خلقت بنائی وہاں دوفرزند بھی پیدا کیے۔ پولست رشی اور سیوا بھیسو۔ پولست کی بیوی گدھا تھا۔ اس کے بطن سے بے برون کی پیدائش ہوئی لیکن اسے بچپن سے ہی برہاجی نے سنبھال لیا۔ اب بے برون کی پیدائش ہوئی۔ اس نے ایسی چپ تپ کی کہ کوہیر جی نے سوچا جانے یہ عبادت کیا رنگ لائے۔ رکھششوں کی تیسہ جمیل لڑکیاں اس کے پاس بھیج دیں۔ (راکا۔ ہانی۔ پستھو تگلا) وغیرہ نے ان چار بچوں کو جنم دیا۔ بھیکسن (دھرم) تھا۔ راون۔ کبھ کرن (مہیب صورت) اور ہروپ نکھا (دھر ماتا لوگوں کی دشمن)

راون نے ایسی تپسیا کی کہ برہاجی اور مہادیو جی آئے اور کہا، دائمی زندگی کے علاوہ جو مانگتا ہے مانگو۔ دس مرتبہ سر کاٹ کاٹ کر چڑھایا تو بردان منظور ملا۔ جب چاہو گے دس سر ہو جائیں گے اور پھر لطف یہ کہ خوبصورتی

تو دوسرا بردان یہ دیا کہ سوائے انسان، ریچھ اور بندروں کے کوئی تمہیں مار نہ سکے گا۔ جب راون کو یہ بردان مل گیا تو اسے زور ہوا کہ دیتا بھی اس سے پناہ مانگنے لگے۔ اب انہیں فکر ہوئی کہ آخر راون سے کیونکر نجات ملے۔ صلاح دے کر یہ بتا ہندرا اور ریچھ بن کر دھرتی پر چلیں۔

یہ سنی جی کے سوئمیر میں رام چندر نے رشوکا، دھنش توڑ اور ستیا جی کو بیاہ لائے۔ جب راجہ دشرتھ بوڑھا ہوا تو اسے رام کو راج دے کر جپ تپ میں لگے لیکن منتر اخواس نے ایسی لگائی بھائی کی کہ رانی کیکئی نے اپنے وہ سابقہ شوہر تھ کہ منوا کر چھوڑے۔ ادا لیا یہ کہ بھرت کوراج گدی ملے اور دوہم رام کو چودہ برس بن باس۔

راجہ دشرتھ تو رام کے بن جاتے ہی جاں بحق ہوئے۔ ادھر بھرت اور شتر گھن ناہنل سے واپس آئے تو رنگ ہی رنگ میں رام اور سینتا بن باس کو جا چکے تھے اور بھرت راجا تھا بھرت نے رام کا پچھنایا۔ جتر کوٹ کے مقام پر بھرت نے لوٹ جانے پر اصرار کیا۔ رام نے باپ کے وعدے کا پاس کیا۔ آخر بھرت رام چندر کی کھڑا دیں لے کر چودہ برس راج کرتا رہا۔

جن دنوں رام چندر جی پنج وٹی میں مقیم تھے، اُن دنوں اس علاقے پر کھردو کھن کا راج تھا۔ سروپ نکھا اپنے بھائی کھن بن میں آئی۔ پہلے رام کو لکھنا پھر کشمن کے سر ہوئی۔ اس نے غصے میں آ کر ننگ کاٹ دی۔ کھردو کھن کے بیٹے جوتی گئی۔ سب راکھشش لڑنے آئے لیکن مارے گئے۔ اب سروپ نکھا راون کے پاس گئی اور اسے غیرت سے کہنے لگی کہ تم نے سحر کھائے ہرن بن کر ”مارچ“ کو بیچ وٹی بھیجا۔ چھلاوے پر چھلا دے کھائے۔ رام چندر سینتا جی کی بھرت نے کو نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد آواز آئی، دوڑو کشمن رام کی جان پر مبنی ہے۔

کھن گو سینتا کو تنہا چھوڑ کر جاننا چاہتا تھا لیکن سینتا جی بھرت ہوئیں کہ رام کی کنبہ کو پہنچو۔ چلتے چلتے پھمن سینتا جی کو سینتا میں بٹھا گیا۔ راون آیا تو سینتا جی نے کندلی کے اندر سے پھل پھول پیش کیے لیکن راون جو برہمن کے بھیس میں تھا کہ دیکھنا باہر نکل کر دی جائے۔

جب سینتا جی باہر نکلیں تو لے اڑا۔ راستے میں گدھ بنا یونے روکا لیکن راون سے پیش نہ گئی۔ سینتا جی راستے میں پہنچتی جاتی تھیں تاکہ رام چندر کو ڈھونڈنے میں سہولت ہو۔ لڑکا پہنچ کر سینتا جی کو اشوک بانکا میں رکھ کر راکھششوں کا حکم دیا کہ جب رام کشمن ڈھونڈتے ہوئے نکلے تو گدھ بنا لوانے تمام کیفیت بیان کی اور جاں بحق ہو گیا۔ پھر راہ میں ایک کھن ملا۔ اس نے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کچھ دور پینا سر تالاب کے پاس سگر یو اور ہنومان جی ملیں گے۔ وہ اس وقت سے واقف ہیں۔

سگر یو (بندروں کا بادشاہ) اپنے بھائی ہانی کے خوف سے روپوش تھا۔ جب رام چندر جی کو آتے دیکھا، سمجھا کہ آتے ہیں۔ ہنومان جی کو بھیجا کہ حال معلوم کریں۔ وہ برہمن کا روپ دھار کر پہنچا۔ پتہ لیا تو رام چندر جی تھے۔ رام نے فرمایا کہ چلیے سگر یو کے پاس چلیے۔ ہالی بڑا بھائی ہے سگر یو چھوٹا۔ اس نے چھوٹے بھائی کو مار بھگایا ہے۔ رام نے اسے دیکھا تو اسے ہالی کو شکست ہوئی اور سگر یو پھر بادشاہ بنا۔

اب بندر چاردانگ جاگتی جی کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ آخر مہابیر جی لنکا میں پہنچے۔ بھٹکن جو رام کی بیوی تھی، اس سے (بیٹا) جاگتی جی کا سراغ ملا۔ رام چندر کی انگوٹھی ان کو دی اور ڈھارس بندھائی۔ پہریداروں کو خبر ہوئی تو کراون کے پاس لے گئے۔ راون نے حکم دیا کہ دم میں آگ لگا کر بھسم کر دو۔ مہابیر جی نے لنکن میں آگ بجھانے کی کوشش کی، اشوک بانکا اور بھٹکن کا گھر سلامت رہا۔

جب رام بھٹکن پل باندھ کر لنکا میں اترے اور پالا ان کے ساتھ پڑا تو آکاش سے برہما جی، باقی جی، دشرتھ وغیرہ اترے اور جاگتی جی کی پاکدامنی کی تصدیق کی۔ بھٹکن کو ننگا راج دیا۔ بھرت نے استقبال کیا اور رام سے گیارہ ہزار برس حکومت کی اور ان کے بطن سے دو فرزند لو اور کش پیدا ہوئے۔

جب بارہ سال مکمل ہو گئے اور پست رہنے کا وقت آیا تو پانچوں بھائی مندرجہ ذیل کاموں پر راجہ برات مع دور پدہ کے ذکر ہو گئے اور نام بدل لیے۔

راجہ جد ہشرو:	تمار بازی	(کنک نام)
بھیم سین:	رسویا	(بلو)
ارجن:	بیچرانا چگانا پر مقرر	(ہر ہند)
نکل:	اصطبل کا مالک	(گر شقک)
سہد یو:	گوشالہ میں گایوں کی دیکھ بھال	(اوشٹ یی)
درو پدی:	سودیشا رانی کی مشاطہ	(سرز ہری)

ابھی کچھ عرصہ گزرا تھا کہ سو دیشا کا بھائی کچک درو پدی پر فریفتہ ہو گیا۔ لاکھ درو پدی نے سمجھنا شروع کیا۔ سناٹی۔ کہا کہ پانچ گندھرب میرے محافظ ہیں لیکن وہ باز نہ آیا۔ بھیم سین سے مشورہ کیا کہ اسی دن میں جہاں سے وہ رات کے وقت کچک کو درو پدی بلائے اور بھیم سین اسے قتل کر دے۔ یوں ہی کیا گیا۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ بھائیوں نے صلاح کی کہ درو پدی کو زندہ جلا دینا چاہیے لیکن عین موقع پر بھیم سین کے روپ میں آیا اور سب کو بھگایا۔ کو بچالایا۔

جب کچک کے مرنے کی خبر پھیلی تو در یودھن خوب خوش ہوا اور اسے خیال ہوا کہ اب راجہ برات کا منہ ماندا ہے۔ حمد کر دیا لیکن ارجن نے تجھ بانی کی اور وہ وہ جو ہر دکھائے کہ در یودھن کا سارا لشکرنا کام پلانا۔

اب تیرہ سال پورے ہوئے تو جد ہشرو وغیرہ نے اپنی اصلیت راجہ برات پر ظاہر کی۔ اس نے ارجن سے لڑکی اوترا سے شادی کرنا چاہی۔ ارجن نے اپنے لڑکے اھنمو سے اس کا وواہ کر دیا۔ اب راجہ برات نے در یودھن سے پاس اڑھے راج کے سفارت بھیجی لیکن وہاں تو در یودھن بھرا بیٹھا تھا۔ نکا سا جواب دے دیا۔ راجہ دھرت راجہ برات کے دونوں جانب گھومتا پھرتا تھا لیکن صلح کی سبیل نہ بنتی تھی۔ انخرف سے راج گھر کے راجہ برات اور راجہ در یودھن کے درمیان رہے تھے اور لڑائی کی ٹھن رہی تھی۔

اس سلسلے میں در یودھن اور ارجن دو اراک پہنچے۔ اس وقت مہاراج کرشن جی سور ہے تھے۔ ارجن پانچ

میں نے بیٹھ گیا۔ جب آنکھ کھلی تو ارجن سے پہلے پوچھا کہ کیوں آئے۔ اس نے کہا کہ میدان جنگ میں آپ کی مدد کرنی ہے۔ پھر راجہ یو دھن سے سوال ہوا۔ اس نے کہا، آپ کی مدد کا میں بھی خواہاں ہوں، جواب ملا..... ارجن نے کہا، میں آ رہا ہوں گا اور راجہ یو دھن کے ساتھ میری فوج اور خزانہ لیکن میں تمہارا کوا تھ نہیں لگاؤں گا۔

راجہ یو دھن کو سب نے سمجھایا لیکن وہ غصے کا بھوت تھا۔ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں فوج لے کر وکشیتر کے میدان جنگ میں ہوئے۔ ادھر پانڈو بھی پہنچے اور جنگ شروع ہوئی جس میں راجن کو شکست اور پانڈوؤں کو فتح نصیب ہوئی۔

یہ سب کچھ مشکل محاورے، الفاظ بھی خان جی نے اپنی رہنمائی کے لیے لکھتے ہیں)

مولفہ: افتخار

اونٹ کی چوری نہوڑے نہوڑے ہوگی:

چوری چھپے بڑی بات کا طے پانا (مہا بھارت)

چنے کا چبانا اور شہنائی کا بجانا ممکن نہیں:

کام کا آسان نہ ہونا

دھجائیں بھنڈا کشان

پتا کا نہیں: جھنڈا

چڑی مار کا ٹولا بھانت بھانت کا پیچھی بولا

اپنی اپنی بات

بھوت منڈنی

چوہا بیانا ہونا: پور بھی زور آور ہونا

تکھوری

تکلیا لیا: پاس ایک جھنڈی نہ رہنا

ایک ایک پوسلے میں کام تمام:

ایک ہی وار میں ترکی تمام

ٹوکنی:

اوکھیاں سنانا

ہوا اور ہونا:

حوصلہ دینا

آنکھوں پر ٹھیکری رکھنا:

شرح بانے طاق

چھوکارا:

گھوڑے ہانکنا

اشو بدیا:

اسپ دانی

استی:

ستائش

پرائے پیچھے پیچھے چڑھ بیٹھنا:

ہرایا مال تھینانا

غرے ڈبے:

دھمکیاں

سنگلپ:

ارادہ، خیال

سنگار:

ٹھوک بجا کر

دل اوچھا کرنا:

دل گھٹانا

بردی مار مارنا:

بہت مارنا

اکشونی:

لاکھوں

چھتارے:

خوب پتوں والا

اوپرے منڈے انج جو ان ہوئے جویں دودھ تے ملائی آؤندی اے کھٹو کھٹ لٹھاں کھلو گئیاں۔

ما تھا	متھ:
عنايات کيس	چھین نکلے بھنادیئے:
مینڈک کو بھی زکام	خوب رنگ لائی گلہری:
مل کر کام کرنا بے عزتی کا باعث	سانجھے کی ہانڈی چورا ہے پہ پھوٹی:
جیسے بخرے	سرت بھرتا کرنا:
خوف	کھینچے میں تھر تھری پرڈی:
بِراض	چرانڈے ہوئے:
فوجیں آراستہ ہوئیں	بندیاں بندھ گئیں:
پکی بات	کئی بدی بات:
بہت مینہ برسنا	وہ دو گز ابر سا وہ جھری لگی:
علم موسیقی	گندھرب:
تختہ گتھا	گتھا ڈہور ہا ہے:
سواری	با تیا:
پیسہ گرہ میں باندھو	دوست ڈب میں کرو:
طلاق	سٹا نجلی:
ہوا	ہوان:
کچھ نہ بچا	ایک بھٹکا بھی نہ بچا:
آسان کام	سہل سا لٹکا:
چار کوس	جو جن:
جپ تپ	سمرن:

ان تحریروں کا مقصد یہ ہے کہ خاں صاحب انتہائی سوچ بچار کے بعد، گہرے مطالعہ سے استفادہ کرنے کے نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندو اپنی اتہاس کا حصہ ہے۔ یہاں دیوتا زمین پر آکر شادیاں کرتے ہیں۔ راکھشش ان کی نونہل درپے ہیں۔ ان کے دھرماتما لوگ گندھرب شادی کر کے اولاد کے مالک بن جاتے ہیں اور پھر اپنی ہوس مٹانے کے اولاد کی پروا نہیں کرتے اور اپنے جپ تپ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس ہسٹری میں ایٹھائے وعدہ، استقامت اور حدود کی پہچان کم کم ہے۔ اسی لیے خاں صاحب ہندو مت کی طرف سے بہت Disillusion ہوئے لیکن اس سے بھی زیادہ کوفت انہیں پاکستان میں ساٹھ سال گزار کر شہ

تھے۔ تہہ پہ تہہ چلا کہ مسلمان بھی اونچ نیچ کا شکار ہیں۔ سید، پنہان، جاٹ اور دیگر ذاتیں مٹھی بند مقبض ہیں اور کسی طرح کس سے غم ہونے کو تیار نہیں۔ جس اخوت، بھائی چارے، مساوات کا خواب وہ دیکھ رہے تھے، اس کو بہت دھچکا لگا۔ یہ غالباً انسان کی تقدیر ہے کہ وہ آدرشوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا نہیں سکتا۔ اپنی نیت کے ہاتھوں خوار ہوتا ہے۔

ظاہر ہے پچھلے ساٹھ سال سے صورتحال ہولے ہولے بدل رہی ہے۔ ملی کانرم و نازک بچہ آنکھیں کھول کر دیکھ رہا ہے۔ اختر شیرانی کی سلسلی پر نظمیں ایک عرصہ سے اب طاق پر جا کر علمی ادبی سطح پر خاص کر انگریزی سے خوش آواز لگنے لگی ہیں۔ ”مد و جذرا سلام“ کے حالی، حفیظ جالندھری، علامہ اقبال، ظفر علی خاں اور دوسرے حساس لوگوں نے اس نئے دور کا اظہار خیال کیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ اصلی ہمت کونسی ہے۔

لیکن ہولے ہولے ادیب کی نظروں سے نوعیوں کی منزل بھی دھندلا رہی تھی۔ کشمیر میں لہو کی ندیاں بہ رہی تھیں۔ کوئی قابل ذکر کہانی لکھی نہیں جاسکتی۔ مشرقی پاکستان عیسویہ ہو کر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بڑے ادیب افسردہ تھے۔ ان کے دل میں شکاف نہ پڑتا۔ یہ متحجب تھے کہ میں اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھ رہی ہوں، بلکہ صرف یہ بات کہانی کی کوشش کر رہی ہوں کہ ہم لکھنے والوں نے اپنے لوگوں کے شعور کی تہذیب کرنے میں کیوں خاص مدد نہیں کی۔

ہمارے عہد کے ادیب ان پڑھیوں کو تو سمجھتے ہیں جن میں محبوبہ کے نقش پالتے ہیں لیکن ہم نے اس ایک نئے دور کی تمام محبتیں قربان کر دی تھیں۔ وطن پر نظمیں لکھنے والا دوئم درجہ کا شاعر کہلا گیا ہے۔ ماں، بھائی، دوست پر نظم لکھنے والے شاعر نہیں بن سکتا جتنا رومانی شاعر۔ ہم اختر شیرانی کی نظموں کو تو پھر یاد رکھتے ہیں حالی، حفیظ، اقبال اور ظفر علی خاں کے۔

ہندو مسلک کو سمجھ کر اب ایک بار پھر خاں صاحب سوچ رہے تھے کہ اب جو افتاد مسلمانوں پر پڑی ہے، ہو سکتا ہے اس لیے میں، ہمارا سب کچھ بہہ جائے اور وہ محبوبہ بھی نمک کی تلی سمندر کی اتھاہ لگانے نکل جائے اور کہنے کو کچھ باقی نہ رہے۔ انہوں نے اپنی تحریر میں نئی سمت تلاش کی۔

پاکستان اور صرف پاکستان کی بقا کا خواب!  
 بیسویں صدی کی آخری دہائی مسلمانوں کے لیے بڑی اہم، فیصلہ کن اور تھیر آ میز ثابت ہوئی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دنیا میں صرف وہ خطے انتشار کا شکار ہیں جہاں ابھی اسلام میں دم خم ہے۔ افغانستان میں کیسی ہنڈیا پک رہی تھی۔

ایران اور عراق کس طاقت کے ہتھے چڑھ کر آپس میں گھم گھما ہونے والے تھے۔ کشمیر میں آزادی کی کیا کچھ قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ روس کی اسلامی ریاستوں پر کیا کچھ ہو گا؟

ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے وہاں وقتاً فوقتاً ہر ایک سیکولر سٹیٹ میں کیسے کیسے فسادات مچتے ہیں؟ بامبری مسجد شہید کرنے کے لیے پانچ لاکھ ہندو مختلف مقامات سے کیوں اکٹھے ہوتے ہیں؟



سعودی عرب کی حفاظت کے بہانے تیسری عالمی جنگ کے لیے عین وہی دھرتی کیوں چنی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے لیے دنیا میں اہم ترین جگہ ہے۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے اور سوالات وقت سے بہت پہلے خاں صاحب کے ذہن میں جاگ اٹھے تھے۔ لوگ ان سارے مقامات پر صورتحال کو اقتصادی مسئلہ سمجھتے، کچھ ذہین لوگوں کا خیال ہے کہ جب کوئی چیز ایجاد ہو جاتی ہے پھر اُس کے استعمال کی وجہ بھی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ ترقی یافتہ ممالک میں ہتھیاروں کی پروڈکشن اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب ان کا اپنے انڈسٹریل ملکوں میں ذخیرہ اندوز رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اسی لیے وہ اپنی فلاحی مقاصد سے دوران ہتھیاروں کو رکھنا، استعمال کرنا اور نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔

ہتھیاروں کو عیسیت کرنے کے لیے وہ چاہے سمندر اور ریگستانوں کا رخ کریں لیکن اپنے پروڈکٹ کے استعمال کے لیے انہیں بحری بستیاں درکار ہوں گی جہاں سیاہ اور براؤن جانداروں کو کھینچوں کی طرح مار کر ان کا خمیسا ملامت نہ کرے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ: سبزی ملکیتیں اپنے اندرونی امتش روں کی وجہ سے غیر کے ہتھے چڑھ رہی ہیں۔ مسلمانوں کا مسلمان سے اس درجہ نفاق ہے کہ بھائی بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور مردہ گوشت کھانے سے انہیں نہیں کرتے۔ ایسے میں جب اندرونی خفشار نے ملکوں میں بد امنی پھیلا رکھی ہے، راج گدھ ہر طرف منڈلاتے نظر آ رہے ہیں۔

ہم ادیب لوگ ہیں۔ چاندنی، گیت اور ساز سے محبت کرنا ہمارے خمیر میں ہے۔ ادیب لوگ دراصل جذبات، حساس طبیعت اور اندر رہنے والی برسات کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں اور خاص طور پر برصغیر کا شاعر اور سماج ہی کی بنیے انصافیوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اس کے نزدیک آفت ارضی و سماوی میں سب سے بڑا جان لیوا گمراہی جاننا ہے لیکن یہ خاں صاحب کا شرف سمجھئے، ان کی بصیرت جانیے، وہ پاکستان پر وارد ہونے والی بلاؤں سے ہی بچنے کے لیے تھے تاکہ تمام عالم اسلام پر چھائے اندھیرے بادلوں کو بھانپ سکتے تھے۔ انہوں نے ذہنی مسکنوں کو طاق پر رکھ دیا تھا۔ سنا ہے کہ وہ انسان جسے ایک محبت بھی مل جائے زندگی کی لہروں پر اپنی ناؤ کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کروڑھ، لویجھ اسے ڈمگ ڈمگ کرتے رہیں۔ ڈیونے کی کوشش کریں لیکن محبت کا چوڑو بے نہیں دیتا۔ زندگی پایاب ہو تو کشتی سے اتر کر وہ اسے دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ پانی اتھاہ ہو تو وہی بے لوث محبت سمت قائم رکھتی ہے اور لاکھ آدمی آئیں کشتی کنارے لگ ہی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ خاں صاحب کو پاکستان سے کچھ ایسی ہی بے لوث محبت ملی کہ پھر سفر نہ بے سمت رہا نہ ڈمگایا۔ انہیں کسی اور راستے کی تلاش بھی نہ رہی۔

خاں صاحب کے پیتل کو چکانے والی ایک ماں سردار بیگم کی شخصیت تھی۔ دوسرے وہ داؤ جی تھے جنہوں نے خاں صاحب کی تربیت کی۔ تیسرے یہ وطن کی ان سے محبت تھی یا ان کی وطن سے رغبت جس کے باعث ان میں کیمپ میں ریفریجی لوگوں کے درمیان کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ وہ صبح سویرے اپنے ساتھ کھانے کی پوٹلی ہاتھ میں چلتے والٹن پہنچتے اور پھر سارا دن مہاجروں کے مسائل سلجھاتے۔

ممتاز مفتی کے ہمراہ کام کرتے پھر پیدل گھر پہنچتے۔ شاید اسی پیدل سفر کے دوران ان پر کھلا ہو کہ انسان دراصل  
 ہمتوں روحانی گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ مہاجر بڑے شوق سے لاتعداد قربانیاں دے کر اس وطن پر نثار مہیاں  
 کرتے تھے لیکن یہاں پہنچ کر اسی دل نے دیگر خواہشات کو جنم دینا شروع کر دیا۔

اب سبھی کو چھوڑی ہوئی پر اپنی درکار تھی۔ مال و دولت کی خواہش تھی۔ رجبہ، عزت اپنی تعریف سننے کی چاہ نے  
 کی۔ بونا کر دیا تھا۔ ہم پر جو احسان، قائد اعظم نے کیا، وہ بھولنے لگا۔ انسان بھی عجب ہے کہ جو شخص آپ پر احسان کرتا  
 ہے، اسے بھول جاتا ہے۔ یہی روحانی گراوٹ دیکھ کر اشفاق احمد نے اپنا راستہ بدل لیا۔ ان کے افسانوں میں عجب قسم کی  
 حقیقت نے لگی اور وہ جب گورنمنٹ کالج میں ایم اے اردو کرنے کے لیے پہنچے تو وہ ”ایک محبت سوانسائے“ کے لکھاری  
 تھے بلکہ ان کے اندر وہ دھندلی شاہراہ بھی تھیں اندر نظر آنے لگی تھی جس کے سنگ میل ابھی واضح نہ تھے۔

یہ دور پاکستان میں نووارد لوگوں کی Insecurity کا تھا۔ مسکوں اور آدرشوں کی خاطر قربانیاں دینا بڑا مشکل  
 ہے۔ پاکستان ایک آدرشی ملک تھا۔ اس کے آدرش دنیاوی حصول سے وابستہ نہ تھے بلکہ روح کی افزائش کی تلاش میں  
 تھے۔ مگر رفتہ رفتہ مہاجر لوگ اپنے مسائل کا حل دنیاوی حصول میں تلاش کرنے کے لیے رنگ رنگ کے جرم کرنے لگے۔  
 یہ محبت منوانے کی خاطر ہر طرح کی شیخیاں ماری گئیں۔ اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے نسل، رنگ، زبان نہ  
 مانتے تھے۔ لیکن باتوں کا سہارا لیا گیا۔

گھروں کے تالے توڑے گئے۔ مال غنیمت ہاتھ آیا تو الاٹ منٹ کے چکروں میں لوگ نیزھے ہو گئے۔ یہی  
 دور تھا جب قائد اعظم کا آدرش دھندلا گیا۔ ذاتی انداز مار کھ گئیں اور لوگ مادہ پرست ہو کر بھانت بھانت کی  
 چیزوں میں لگے۔

تمام مسکوں سے گزر کر ”کام کام کام“ کی حدت سے بھی نکل کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کبھی کبھی کام بھی سمت  
 میں رکھ سکتا۔ کام کی سمت اگر مثبت نہ ہو تو نفع کے بجائے نقصان پہنچ جانے کا احتمال ہے۔ انہوں نے خلق کے ساتھ  
 جس جمل بڑھانے کے لیے ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر یہ نتیجہ نکالا کہ پاکستان کے غریب عوام کا بالخصوص اور مسلم امہ کا  
 عوامی عزت نفس کا ہے۔ ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ انہیں کسی تقریب کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہوا۔ وہاں بااثر لوگوں کی  
 عزت میں پہلی بار خاں صاحب نے عزت نفس کا جھنڈا بلند کیا۔ انہوں نے وثوق سے کہا کہ ہماری ضرورت ہرگز ”روٹی  
 کے لیے مکان“ نہیں ہے۔ یہ چیزیں ہمیں ہندوستان میں بھی جیسی کیسی میسر تھیں لیکن اقلیت ہونے کے ناطے ہماری عزت  
 کا جھنڈا مجروح ہوتی تھی۔ اسی لیے یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔

خاں صاحب نے شعوری اور لاشعوری طور پر پاکستان کے لیے اس وقت جدو جہد شروع کی جب قائد اعظم  
 کے بغیر جیل میں قید ہونے کی بجائے انگریزوں کو آئین کی پابندی میں گھیر کر پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے۔

یہ جدو جہد شروع سے آخر تک خاں صاحب کا بنیادی مسلک رہی اور بالآخر ”عزت نفس“ کے مطالبے میں بدل  
 گئی۔ جی جھنڈا انہوں نے اپنے بیٹوں جیسے عمران خاں کو دے دیا۔ اسی جھنڈے کی سر بلندی کے لیے آج بھی عمران سر توڑ  
 کر رہا ہے اور آج 2007ء میں جب تمام جماعتیں اپنے مفاد کے لیے لڑ رہی ہیں اور بظاہر اسے خلق کی خدمت کا

نعرہ عطا کر رہی ہیں، عمران خاں اپنی نامزدگی کے کاغذات پھاڑ کر دعویٰ کر رہے ہیں۔

خاں صاحب کے کچھ کاغذات ایسے ملے ہیں جو ان کی خلق کی طرف مراجعت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ صاحب کی تحریر کے اقتباس)

1- 28000 روپے واپس کرنے والا تانگہ بان اور اس کی خبر اخبار میں لگانے کا قصہ۔

2- زندہ دل زندگی سے بھرپور سلطان میر پور ماسٹر کا بیٹا اور میر منٹو کا دوست اور بمبئی جا کر داد عیش دینے والا ناولٹ۔

3- ریاض پاڈا جو پہلے بھجروں کے ساتھ ملا۔ پھر دو انیاں اور طلا بیچنے لگا۔ آخر میں تقریریں کر کے اسمبلی کا ممبر بنا گیا۔

4- اصولوں کا ٹوٹنا اور قدروں کا فقدان اس کی وجہ۔ ٹیکنا لوجی اور مذہب۔

5- کلچر کیا ہے اور اس کو کس طرح سے دوسرے کلچر سے الگ مانا جاتا ہے۔

6- سلیم بونگا انٹر کے بارے میں تھیوری پیش کرتا ہے۔

7- Olga کے نام Varek کے خطوط۔ اسی طرح Malina کے نام کا فکا کے خطوط!

8- ملاصحت اللہ کی لڑکی اور اس کی کالج کی زندگی۔ اپنی سہیلی شازیہ کے ساتھ دوستی۔ اس کے کزن سے محبت۔ کزن کے والدین کو یہ خبر ہونے پر کہ وہ ایک مٹلا کی لڑکی ہے اس کا مشتعل ہو کر باپ کو خفیہ طور پر قتل کر دیا۔ شازیہ سلیم بونگا کی کزن ہے۔

9- مٹلا لوگوں سے سلیم بونگے کا انٹرویو۔ کمال اتاترک کی تعریف و توصیف کہ اس نے مٹلاؤں کا قلع قمع کیا۔ سیاسی مٹلا میں فرق (کیا سارے مٹلا مل کر اسلام کا ضابطہ حیات چھپوا کر دے سکتے ہیں۔)

10- سیکولر اور مذہبی میں فرق۔ سیکولر قوم اور سیکولر حکومت میں فرق۔ قوم ہمیشہ Tolerant ہوگی لیکن حکومت نہیں ہوگی۔

11- پٹرول پمپ کے پاس خوشی محمد کے گیراج میں شیطان سے ملاقات۔

12- دو تانے کی صوباں جس سے برکی نے شادی کی اور وہ دیہاتی لڑکی بیجم کے ایلوٹیم سٹور کی مالک بنی۔

13- بابا احسن کا قصہ جو شرافت نوشاہی صاحب نے سنایا۔

14- ایک ڈرامہ جو سلیم بونگے نے T.V. کے لیے لکھا اور جو reject ہو گیا۔

جانندھر کا ذکر: سمندر اور دریا کا بیٹا۔ منہ جو الاکھی پر ہے اور پاؤں ملتان میں دفن ہیں۔

بھوؤ چند: Founder of Kangra

جنم پتری: Vansavali

(نسب نامہ) طاقتور راجپوتانہ کے خاندان سے پرانے راجپوت ہیں اور کوچ راجپوت سب سے پرانے ہیں۔

سکندر بیاس کنارے رکاتا تو Ptolemy نے جالندھر کے ملک کا ذکر کیا لیکن سنسکرت کے ادب میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ بہتر تری گارتا کا ذکر موجود ہے اور راجہ سسار من کا ذکر بھی ملتا ہے جس نے کانگڑے کا قلعہ تعمیر کیا۔

ہیون تسانگ نے جس جالندھر کا ذکر کیا ہے اور جو اس کا علاقہ بیان کیا ہے۔ اس اعتبار سے چمبہ کی ریاست سہولت اور ساتاردو کی ریاستیں جالندھر کی ریاست میں شامل ہیں۔

سورکرافت جب 1820ء میں نداؤں کے علاقے میں آیا تو اس نے لکھا کہ کانگڑے کی ریاست میں تین قلعے ہیں۔

کنوچ چھنگار

کانگڑہ کان کی شکل سا

نگرکوٹ یا کوٹ کانگڑہ بھی دارالخلافہ کے نام ہیں۔

نگرکوٹ میں درگاہ کا مندر۔ یہ مورتی مرد کی لگتی ہے۔ سب اسے ماتا کہتے ہیں۔ مندر کی چھت اور فرش چاندی سے بنے ہیں۔ اسے ابوالفضل نے مہامایا لکھا ہے جو یہاں کی رانی تھی۔ لیکن دنیا میں بدی دیکھ کر آتم ہتھیا کر لی۔ کچھ عرصہ بعد مہادیویوں کی شہتی بھی سمجھتے ہیں۔

جوالا مکھی: بالاگھاٹ پہاڑ کے ٹھنڈے پانیوں میں سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ چندر منی کنوچ آبائی راجہ کے قلعے کا نام فرشتہ بھیم کا قلعہ لکھتا ہے جس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ قلعہ غالباً راجہ بھیم چندر نے

کانگڑہ نہ صرف جالندھر کا حصہ رہا ہے بلکہ یہ علاقہ کشمیر کے راجہ شکرور مانے بھی ختم کیا تھا۔ راجہ شکرور مانولا کھ کے تین سو ہاتھی لے کر گجرات فتح کرنے لگا۔ تری گارتا کا راجہ پر تھوی چندر پہلے ہی اپنا بیٹا یرغمال کے طور پر راجہ شکرور مانے کے چکا تھا لیکن جب اس نے سمدری فوج بڑھتے دیکھی تو فیصلہ نہ کر پایا اور قلعے سے اٹھ بھاگا۔

(ایسے کاغذات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خاں صاحب پران کے سیاسی مسلک کا گہرا اثر تھا اور اسی نے اسے انقلابی مسلک کو حانپ لیا تھا۔)

## اشفاق احمد کی بطور براڈ کاسٹر قومی خدمات

محمد جاوید پاشا

23 مارچ کی قیام پاکستان کے حوالے سے بہت اہمیت ہے۔ یہ قرار داد لاہور کا اہم دن ہے، وہ قرار داد جو قیام پاکستان کی دستاویزی شکل میں وجود میں آنے کا باعث بنی جس نے مسلمانوں کو باقاعدہ ایک قوم کی حیثیت سے ایک ملک بنانے کی بنیاد فراہم کی۔ قرار داد لاہور جو 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں منظور کی گئی، میں واضح طور پر کہا گیا کہ کوئی شخص جسے منسوبہ اس وقت تک قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا تا وقتیکہ وہ ایسے اصولوں پر وضع نہ کیا گیا ہو جس میں جغرافیائی طور پر مستقل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوط میں کی جائے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت

ہے۔ ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خود مختار اور مقتدر ہوں اور انہیں کئی اختیار حاصل ہوں۔ یہ صدیوں پرانا خواب تھا جس کی تعمیر کے لیے محمد علی جناح کی ذات کو اللہ تعالیٰ نے اس کی تشکیل کے لیے کیا تھا۔ قائد اعظم کی دورانِ اندیش نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ برصغیر سے انگریزوں کے نکل جانے کے بعد مسلمان حکومتیں جائیں گے۔ اسی لیے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ترک کر کے مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد شروع کر دی۔ کوششوں کے نتیجے میں ایک فیصلہ کن موڑ 23 مارچ 1940ء کا منٹو پارک کا جلسہ ثابت ہوا جس نے واضح طور پر پاکستان کی بنیاد رکھ دی۔ قائد اعظم اور ان کے ساتھیوں کی مدد اور قربانی سے 14 اگست 1947ء کو مملکتِ خداداد پاکستان وجود میں آ گئی۔

قیام پاکستان کے بعد بھی اس کی تعمیر اور ترقی کے لیے ملک کے بہت سے سپوتوں نے کام کیا اور اس کی نظریے کی حفاظت کے لیے روپے پیسے، محنت، علم اور قلم سے اس کی آبیاری کرتے رہے۔ ابلاغ عامہ نے خصوصی طور پر نظریہ پاکستان اور قومی نظریے کی وکالت اور فروغ کا ذمہ تادم تحریر اٹھائے رکھا ہے۔ اخبارات اور دیگر نشریاتی ادارے اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دیتے آئے ہیں۔ بعض شخصیات نے اس مہم میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں ایک بڑا نام اشفاق احمد کا ہے جو اپنی ذات میں عملِ نشریاتی ادارہ تھے۔ وہ ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار، صدا کار اور دانشور کی حیثیت سے نصف صدی تک ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ادبی دنیا پر حکمرانی کرتے رہے۔ ان کی تحریریں نمایاں موضوع اخلاقیات، وطن سے محبت اور نیکی کا پرچار رہا۔ تاہم اس کے لیے جو اسلوب اور ذرائع اور طرزِ تحریر اختیار کیے وہ نہ صرف نیا، انوکھا، دلچسپ تھا بلکہ لوگوں کے لیے بہت پرکشش بھی تھا۔ اگر کہا جائے کہ انہوں نے وعظ کو جدید شکل دی تو غلط نہ ہوگا۔ بالخصوص آخری عمر میں ان کا پروگرام ”زاویہ“ ایک جدید سکا لریک دانشورانہ گفتگو کا حسین نمونہ تھا تاہم اشفاق احمد کی بطور براؤ کا ستر قومی خدمات سب سے زیادہ قابلِ تحسین ہیں۔ ریڈیو سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ ان کے لیے کہنے کا جو فن اشفاق احمد کے پاس تھا، وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکا۔ ریڈیو ڈرامہ اور نیچر پروگرام کے لیے مانے جاتے ہیں۔ ایک ”تلقین شاہ“ کی مثال دینا ہی کافی ہے۔ چالیس سال کے طویل عرصہ پر محیط یہ نیچر پروگرام پاکستان لاہور سے ہر منٹے باقاعدگی سے چلتا رہا اور ان کی وفات تک جاری رہا۔ اس پروگرام کو وہ نہ صرف لکھتے تھے بلکہ اصل ہیرو اور روح رواں ”تلقین شاہ“ کا کردار بھی خود ادا کرتے تھے۔ وہ ایک طویل عرصہ تک اسے خود پروڈیوسر کرتے رہے۔ ”تلقین شاہ“ نے بطور پاکستان کی آواز جو خدمات انجام دی ہیں، شاید ہی کسی اور پروگرام کے حصے میں آسکیں۔ یہ اشفاق احمد کی قومی خدمات کی معراج تھی۔ گو انہوں نے پاکستان کے حوالے سے لاتعداد کھیل لکھے۔ جتنے بھی شاہ ایک شاہکار ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ”تلقین شاہ“ کا موضوع پاکستان تھا۔ پاکستان کی سیاست، سماج، پالیسی، معیشت، معاشرتی ترقی، ادب، تاریخ، نظریات، اخلاقیات، عالمی مسائل، مسلمانوں کی پسماندگی کے سبب قوموں کے عروج و زوال، عالمی سیاست و معیشت، غربت، علاقائی کشمکش، پاک بھارت تعلقات، کشمیر، فلسطین مذہب سائنسی ترقی..... الغرض کوئی ایسا شعبہ، ایٹھ، شخصیات اور علاقائی، قومی اور عالمی مسئلہ نہ تھا جو اس میں ایک خوبصورت اور پرکشش ڈرامائی انداز میں discuss نہ ہوتا۔ ”تلقین شاہ“ نے پاکستان کے نظریات کو نشریاتی دفاع سے منسوب

یہ ہر دور میں، ہر حکومت میں، ہر حالات میں پاکستان کے داخلی علاقائی اور عالمی خلفشار کو نہایت خوبصورت طریقے سے رو دینا کے سامنے رکھا اور اس کی وضاحت اور وکالت کی۔ اشفاق صاحب نے تلقین شاہ کے کردار میں تمام تر خوبیوں اور منفی رویوں کو اپنی ذات پر لے لیا اور اس کے ذریعے اصلاح کی راہیں بھی نکالیں۔ بالخصوص کشمیر کے متعلق اشفاق صاحب نے ”تلقین شاہ“ میں تسلسل سے پیش کیا اور اس مسئلے کو اپنے پروگرام کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رکھا۔ عام میں کشمیر کو ایک گلدان کے سہل کے طور پر پیش کیا گیا۔ ایک گلدان جو اس پڑوسی کی ملکیت ہے جس کو اس نے کبھی نہیں زبردستی سجا رکھا ہے اور واپسی کے لیے ہر مرتبہ نت نئے حیلے بہانوں سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ پڑوسی ہاشمی صاحب ہیں اور کشمیر کو گلدان کی شکل میں پیش کیا۔ تلقین شاہ کے معاون کرداروں میں ہدایت اللہ، زہرہ، سلیمان، رقیہ، جن صاحبہ وغیرہ مستقل کردار تھے۔ ”تلقین شاہ“ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشریح، حمایت اور وکالت کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ پاکستان پاک بھارت جنگ 1965ء اور 1971ء میں یہ پروگرام حکومت پاکستان اور مسلمانوں کی نمائندہ آواز رہا ہے۔ اس کے فوجی جوان سرحدوں کی حفاظت میں جان کی بازی لگا رہے تھے تو تلقین شاہ ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرتا تھا۔ 1971ء کی جنگ میں ”تلقین شاہ“ از خود سرحدوں پر پہنچ گیا اور اس کے عنوان اور کرداروں نے ایک نیاروپ میں اشفاق احمد دادو لوہا بن گئے اور پروگرام یوں شروع ہوتا ”دادو لوہا رو لہد شہکا لوہا، سکنہ کوٹری لوہاراں حال مقیم پل

آپ سے مخاطب ہے۔“

”تلقین شاہ“ پاکستان بلکہ برصغیر میں سب سے طویل عرصہ تک چلنے والا ریڈیو پروگرام ہے۔ اشفاق احمد نے اس کی فنکاری سے ادا کیا، لکھا اور پیش کیا۔ ان کی ذات براڈ کاسٹنگ کے شعبہ کی ایک جامع اور ماہر ترین مثال تھی کہ جس نے شہریات کے ہر شعبے کو سمجھتی تھی اور اس پر مہارت رکھتی تھی۔ اشفاق صاحب نے ”تلقین شاہ“ کے ذریعے جو قومی خدمت کی ایک طویل عرصہ تک کی ہے اس کی مثال شاید ہی کوئی دوسرا شخص دے سکے گا۔ ریڈیو یوں بھی از خود ملکی خدمات میں حثیت رکھتا ہے اور اس شعبے میں اشفاق صاحب کی حثیت ایک رہنما کی سی تھی۔ ریڈیو پاکستان کے لیے ”تلقین شاہ“ پاکستان کے مختلف ایڈیٹرز پر اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موثر ذریعہ ثابت ہوتا رہا ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے آجانے سے اشفاق احمد وہاں بھی ہانی لکھاری کے طور پر آئے اور اپنی وفات تک یہاں رہے۔ یہاں بھی ان کے ڈراموں کے موضوعات میں ملک سے محبت، اخلاقیات اور عالمگیر سچائی فرسٹ پر نظر آتی ہے۔ عظیم پاکستان، قیام پاکستان، پیدائش قائد اعظم اور دیگر اہم قومی دنوں، امور واقعات اور معاملات پر اشفاق صاحب نے بے موثر طریقے سے حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور ڈرامے پیش کیے۔ ان میں ان کا ”برگ آرزو“ اور ”نگلے پتھر“ طویل دورانیے کے کھیل شاہکار حثیت کے حامل ہوں گے۔ ”نگلے پاؤں“ میں انہوں نے دو بڑی طاقتوں امریکہ اور سوویت یونین کی عالمی بالادستی اور اس کے نتیجے میں چھوٹے ملکوں میں پیدا ہونے والے مسائل اور ان طاقتوں پر انحصار کی صورت و لچپ اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا تھا۔ اسی طرح ”برگ آرزو“ پاکستان کے حوالے سے ایک جذباتی کھیل تھا جس سے محبت کے جذبات پیدا کرنے میں کمال مہارت سے لکھا گیا تھا۔

اشفاق صاحب کی توجہ انفرادی اور کردار سازی پر بھی گہری تھی، معاشرتی برائیوں کو اس انوکھے انداز سے پیش

کرتے کہ دیکھنے والا یوں تو ایک دلچسپ ڈرامہ دیکھ رہا ہوتا تھا مگر در پردہ وہ اپنے اندر از خود تبدیلی محسوس کرتا اور غیر معمولی طور پر مثبت رویوں کی طرف مائل ہونا شروع ہوتا جس کی ایک مثال ”فہمیدہ کی کہانی۔ استانی راحت کی زبانی“ ہے۔ کھیل میں بیچا نمود و نمائش، شو بازی اور دکھاوے کو جس پُراثر انداز میں دکھایا گیا ہے، اس کی مثال ملنا محال ہے۔

اشفاق صاحب کی زندگی کے آخری پانچ سات سالوں نے ایک نئے اشفاق احمد کو دریافت کیا۔ یہ ایک اشفاق احمد تھے۔ اپنے ٹی وی پروگرام ”زاویہ“ میں وہ اپنی زبان، بصیرت اور دانشوری کی بہت اونچی منزل پر تھرتھرتے ہیں۔ انسانی معاملات، انسان سے انسان کا تعلق، رویے اور زندگی کے دیگر اہم پہلو پر ان کی سیر حاصل، پُراثر اور دلچسپ گفتگو ہر عمر کے لوگوں کے لیے مشعل راہ رہی ہے۔ قومی اور ذاتی اہمیت کے موضوعات کو ذاتی تجربات اور واقعات جس پُرکشش طریقے سے سجاتے تھے، اس سے ایک گل و گلزار کھل اٹھتا تھا۔

اشفاق احمد کو ہم ایک افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے تو خوب جانتے ہیں مگر ان کی تحریریں موضوعات کو اگر دیکھیں تو اس میں زندگی کے دیگر مسائل و معاملات کے علاوہ ایک قومی رنگ بھی نظر آتا ہے جو ان کے موضوعات میں نمایاں اور چھپایا ہوا ہے۔ یوں اگر ہم ایسی شخصیات کا ذکر کریں جنہوں نے پاکستان کی بھرپور خدمت کی تو ان میں اشفاق احمد نمایاں شخصیت کے طور پر نظر آتے ہیں جنہوں نے بطور لکھاری اور براڈ کاسٹر قوم کی غیر معمولی خدمت کی ہے۔ یوم پاکستان کے موقع پر ہریان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے کردار و عمل کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔

آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

”تلقین شاہ“ کا پروگرام ریڈیو پاکستان کا منفرد پروگرام رہا۔ گنیز بک آف انٹارنیشن میں اسے درج ہونے والے دوسرے درجے پر رکھا گیا ہے۔ یہ پروگرام 1965ء میں شروع ہوا۔ پھر جب 1989ء میں بے چین آئیں تو دو سال کے لیے تلقین شاہ بند کر دیا تھا۔ شاید اس کی تحریک ہندوستان دوستی یا پھر کوئی اور وجہ؟ ان ہی دو سالوں کے لیے خاں صاحب کی سرورس اردو بورڈ میں بطور ڈائریکٹر بھی معطل کر دی گئی۔ اس وقت خاں صاحب کو کل آٹھ سو ماہوار ملتے تھے لیکن یہ ماہانہ رقم ہماری ضرورت کے لیے بہت کافی تھی۔

جب نواز شریف تشریف لائے اور انہیں اطلاع ملی تو انہوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کیا اور خاں صاحب کو پروگرام ”تلقین شاہ“ بحال کر دیا۔ پھر نواز شریف نے اردو بورڈ میں بائیسویں گریڈ میں تقرری کر دی اور اس کے ساتھ ان کا Designation بھی ڈائریکٹر جنرل کا کر دیا۔ ان دنوں سارے صاحب لوگ اپنے رتبے کو اونچا کرنے کے سلسلے میں ڈائریکٹر جنرل بننے، کھلوانے میں سر دھڑکی بازی لگا رہے تھے۔ یقین جانیے انہوں نے اپنے نام کی ترقی کے ساتھ کبھی اپنے رتبے کا اضافہ نہ کیا بلکہ گھروالوں پر بھی اس رتبے کا رعب ڈالنے کے لیے کبھی گریڈ کا انکشاف تک نہ کیا۔ تلقین شاہ ان کے آخری ایام تک جاری رہا۔ کام کے سلسلے میں جو Passion یا جذبہ کہہ لیں، وہ تلقین شاہ کے لیے رکھتے تھے، اس کا مقابلہ کوئی اور پروگرام نہیں کر سکتا۔ تلقین شاہ پورے 39 سال چلتا رہا۔ اب تو تلقین شاہ پروگرام

تو میں بھی چھپ چکی ہیں اور اس کے ٹیپ بازار اور میوزک کی دکانوں پر دستیاب ہیں۔ گوان ٹیپوں کی مارکیٹ کو  
کے بے سنگ میل پبلشرز سے کوئی اجازت نہیں لی گئی لیکن اس ضمن میں سرقہ اور چوری غالباً اب پوری دنیا کی بدلتی  
تھیوٹر ہے۔ اس لیے اس کے متعلق میں اپنی رائے محفوظ رکھتی ہوں۔

تین شاہ کی بنیادی تقسیم ہمیشہ ایک رہی۔ اس میں خاں صاحب کی ایک ہی کوشش رہی کہ بھارت کو اس بات کا  
تعلق دیا جائے کہ سکیورٹی کونسل میں کشمیر کے لیے جس رائے عامہ پر بھارت نے اتفاق کیا تھا، اس وعدے کو ایفا  
کے لیے پہلے بھی ایک وعدہ کیا جا چکا تھا کہ جن ریاستوں میں مسلمانوں اکثریت ہوگی وہ پاکستان سے الحاق  
کے لیے اور جن ریاستوں میں ہندو اکثریت ہوگی وہ پاکستان کا حصہ نہیں گئے لیکن حیدرآباد وکن کی ریاست کا جو حال  
نے کیا، آپ کو معلوم ہی ہے۔

اسی فارمولے کے تحت پاکستان وجود میں آیا۔ ان وعدوں کو یاد دلانے کے لیے خاں صاحب نے 39 برس  
کے لیے بنیادی طور پر تو یہ جذبہ پاکستان سے والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان سے بہت پہلے اس کے لیے  
تھیوٹر کی تھی۔ جلد جگہ تقریریں اور پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعرے لگائے تھے۔

اس پروگرام میں انہوں نے گلڈان کو کشمیر کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ مسائے سے بروقت اس گلڈان کا  
تھیوٹر جس طرح بھارت ”اٹھنڈ بھارت“ کے خواب میں کشمیر کے سب وعدے بھول گیا، ایسے ہی خاں صاحب کا یہ  
تھیوٹر پورا نہ ہو سکا۔

اس پروگرام ایک ایک بڑی خوبی یہ رہی کہ خاں صاحب نے اس پروگرام میں طنز کو تھپتھپا رہنا یا۔ اپنے آپ کو  
تھیوٹر کے روپ میں پیش کیا جو ایک منفی کردار تھا اور نذر حسینی کو تمام تر مثبت اقدار کا حامل بنا کر پیش کیا۔ نذیر حسینی کو تلقین  
تھیوٹر اور بے دام غلام رہا۔ آقا اور مالک کے علاوہ اس کے منہ سے کبھی کوئی اور لفظ مخاطب کا نہ نکلا لیکن اس نے تلقین  
تھیوٹر کو بڑی معصومیت اور سادگی کے ساتھ مانسنے سے ہمیشہ انکار کیا۔

یہ دو کردار اور تقسیم ہمیشہ قائم رہے۔ باقی کردار آتے جاتے رہے لیکن ان کی ساخت اور تراش خراش بھی خاں  
تھیوٹر کے آدرش سے جزی رہی۔ ان میں ایک کردار (شیم) ہمسائی کا تھا، جو تلقین شاہ سے لڑنے بھگڑنے اور اس کی  
تھیوٹر دوسری خاصیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے لایا گیا تھا۔ یہ شیم فاطمہ صاحبہ مشہورہ معروف مصنف فضل الرحمن کی  
تھیوٹر تھیں جنہوں نے ”ادھ کھایا امرود“ جیسی معرکے کی کتاب لکھی۔ گونقاہوں نے ان افسانوں پر زیادہ توجہ نہیں دی  
تھیوٹر پر ان افسانوں کو اردو کے سنجیدہ قاری کی نظروں سے اوجھل نہیں کیا جاسکتا۔

شیم بیگم اچھی آواز ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا کھانا پکاتی تھیں۔ پروگرام کے دوران خاں صاحب کی عادت  
تھیوٹر کو جھڑکیوں سے نوازا کرتے لیکن جو نبی پروگرام ختم ہو جاتا۔ وہ ریشم کی طرح نرم ہو جاتے۔ چائے کا دور  
تھیوٹر سے فرمائش کرتے فلاں چیز پکا کر لاؤ۔ شیم یہ فرمائش پوری کرتی بلکہ فرمائشوں سے علیحدہ بھی بہت کچھ پکا  
تھیوٹر۔

شیم کے علاوہ بیگم خورشید حفیظ نے تلقین شاہ میں ایک مدت رقیہ کا رول ادا کیا۔ بیگم خورشید حفیظ مشہور زمانہ



پاکستانی حفیظ جالندھری کی بیگم تھیں جنہوں نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھا تھا۔ خورشید ہماری بمبائی بھی رہی تھیں۔ ان سے بڑے تعلقات رہے۔ حتیٰ کہ جب ہم آخری بار عمرہ کرنے گئے تو ان کی بیٹی رضا کے ہی پاس جدہ میں ٹھہرے۔ مشہور و معروف شاعر مرتضیٰ برلاس کی بیگم فریدہ بھی آخری سالوں میں تلقین شاہ کی زینت بنی رہیں۔ صاحب کے جانے کے بعد میری بہت دلجوئی کی۔ اپنے ہاتھ سے پھول بوٹے کاڑھ کر میرے لیے اوڑھنے والے چھوٹے لے کر آتی۔

ریاض محمود بہت جلد تلقین شاد کا حصہ بن گئے۔ ان کا کردار صاحبزادہ صاحب کا تھا، جو تھخیر کا سبب تھا۔ شاہ کی خوشامد اور طنز کے درمیان اصلی سچ کو تلاش کرنے میں لگے رہتے۔ آخر آخر میں اکرم زبیر بھی اس پروگرام کا حصہ بن گئے۔ اکرم زبیر سیاحت کے حلقہ میں اعلیٰ افسر بن گئے ہیں۔ لاہور میں کچھ بسنس Tourism کو پروموٹ (promote) کرنے کے لیے چلائی جاتی ہیں۔ ان بسوں میں اور بیرونی ممالک سے آنے والے سیاحت کے شائقین کو لاہور کی وہ تمام عمارتیں جو قبل ذکر ہیں اور جو امتداد و ترقی کے لیے ماضی کی آب و تاب قائم نہیں رکھ سکیں، سیاحوں کی دلچسپی کا موجب بنیں۔ ان بسوں کا سارا چارج اکرم زبیر کے پاس ہے۔ وہی ان میں فر فر بولنے والے گائیڈ مقرر کرتے ہیں۔ راستے میں Refreshment کا انتظام ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ Tourism کے ڈائریکٹر لارڈ شاری صاحب اسلام آباد اور رخصت ہو گئے تو اکرم زبیر کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئیں۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد اکرم زبیر اور ان کی بیگم انجم ابھی تک میری Rehabilitation میں لگے ہوئے ہیں۔ انجم جب کوئی مزے دار نعمت پکاتی ہیں تو مجھے ضرور بھجواتی یا لے کر آتی ہیں۔

لہجے پروگراموں میں وقت کی تبدیلی کے باعث کاسٹ میں رد و بدل ناگزیر ہے۔ کچھ دیر کے لیے انجم کو بانو قدسیہ نے بھی اس میں شمولیت کی۔ انیق بیٹا اس میں نفسیاتی مسائل، ان کا لہجہ ڈاؤر سلجھاؤ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک پروفیسر کا رول دیا گیا تھا، لیکن بہت جلد خاں صاحب سمجھ گئے کہ یہ ہمارے ڈھب کا کام نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری وجہ سے خاں صاحب کی ریکارڈنگ کے دوران جو بے تکلفی اور جھڑکا بھری گفتگویں ہوتی ہیں، خاں صاحب اس سے اجتناب کرنے لگے تھے اور باقی کاسٹ خاص طور پر نڈر جسینی بندھ کر رہ گئے تھے۔ خاں صاحب کچھ دیر کے بعد ہم سے رخصت چاہی اور ہم دونوں بڑے ادب سے تلقین شاہ کی سرحد سے نکل گئے۔

”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ کے متعلق تھوڑا سا اور بتاتی چلوں۔

اولاً یہ پروگرام ریڈیو پاکستان میں ریکارڈ کیا جاتا لیکن اس میں کچھ از چینس تھیں۔ کبھی سٹوڈیو وقت ملتا۔ کبھی مل جاتا تو ریکارڈنگ انجینئر مصروف ملتے۔ کبھی کبھی کاسٹ انتظار کر کے تھک جاتی یا انہیں کچھ اور سرگرمی کے پیش نظر جانا پڑتا۔ خاں صاحب کے لیے اتنی گڑبڑ قابل قبول نہ تھی۔ اسی لیے انہیں حل تلاش کرنا پڑا۔ سرائے میں سٹوڈیو بنا لیا گیا۔

داستان سرائے میں ریکارڈنگ کا پھر ایک مسئلہ پڑ گیا۔ انجینئر صاحب ریڈیو پاکستان ہی سے آتے تھے۔ ان کی مصروفیات کا کچھ ٹھیک پتہ نہ تھا۔ انہیں ان دنوں ٹیپ ریکارڈوں میں بہت گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ”نور الگوں“

تھا۔ صرف تھا کہ بگڑی ہوئی مشین فوراً درست کر لیتے۔ خاں صاحب نے ریکارڈنگ کا چارج انیس کو دے دیا۔  
تھا کہ جس طرح انیق بیٹا اور میں خاں صاحب کے ساتھ چل نہ سکے شاید انیس بھی کچھ دیر بعد پروگرام سے علیحدہ

بجب اتفاق ہے کہ بے حد خوش اسلوبی اور توازن سے انیس ریکارڈنگ کرتے رہے۔ کئی بار وہ خاں صاحب کو  
کہہ کر ریکارڈنگ دوبارہ کرتے لیکن خاں صاحب کی عادت تھی وہ صاحبِ علم و ہنر کے آگے جھک جاتے تھے۔  
میں اس وقت دقت پیش آئی جب یونیورسٹی میں انیس بیٹا ایم بی اے کر رہا تھا۔ گھر پر ان کے دوست شاہد  
کو پڑھاتے تھے۔

تھان سر پر تھا۔ یونیورسٹی میں ایم بی اے کا کورس نیا نیا تھا لیکن انیس خاں میں کام اور پھر کام کی گھڑتی،  
Genes سے ملی تھی۔ وہ ہاتھ پر بل ڈالے بغیر تلقین شاہ کی ریکارڈنگ کرتا رہا لیکن جب اس کی  
میں ہوئی تو پھر وہ بھی مجبور ہو گیا لیکن جانے سے پہلے ایک خوشگوار معجزہ ہو گیا۔

شیر احمد خاں کو قدرتی طور پر کرکٹ، ہوائی جہاز اور مشین سے لگاؤ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کرکٹ اور پائلٹ  
تو کھانی میں پڑ گیا لیکن ریکارڈنگ کا کام سنبھالنے سے دیر نہ لگی۔ انیس کے جاتے ہی اس نے تلقین شاہ کی  
کو چوری ذمہ داری سے سنبھال لیا لیکن جب وہ این ڈی ایف سی میں ملازم ہو گئے، انیس بینک میں دیر سویر ہونے  
مبادل تلاش کیا گیا۔ رفیق محمد کو ریکارڈنگ کے لیے تیار کیا گیا۔ وہ چیک وغیرہ نہیں بنا سکتا تھا لیکن ریکارڈنگ  
اشفاق ہو گیا۔

اسی دوران تلقین شاہ کے سارے اکاؤنٹ میری تحویل میں آ گئے۔ کاسٹ کے چیک، ٹیکس ایٹ Source کی  
کتاب میرے ذمے تھے۔ شکر ہے مجھے عزیز الرحمن جیسے ٹیکس وکیل مل گئے۔ وہ خود ہی پیش ہوتے اور رسید  
جائے جاتے۔ اس طرح تلقین شاہ کے پروگرام بغیر کسی التوا کے چلتے رہے۔

تلقین شاہ سے گزر کر اب انہوں نے کئی اور ریڈیائی اور ٹیلی ویژن پروگرام لکھے لیکن سب میں پاکستان اور  
ذاتی محبت سرایت کر گئی۔ جب وہ کفالت کے سلسلے میں روزی کمانے کے لیے سکرپٹ لکھتے تو بھی ان کی یہ  
Inner Co کسی نہ کسی سطر میں تقسیم میں ظاہر ہو جاتی۔ اس کی ایک بڑی اچھی مثال پیش کرتی ہوں۔

جب اشیر احمد خاں نے اپنی ذاتی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ”بوناسیرا“ کے نام سے کھولی تو اس نے ”روز پائل“ کے  
پروگرام تشکیل دیا۔ یہ پروگرام عورتوں کے استعمال کے لیے پیڈوں کی مارکیٹنگ تھی۔ اشفاق صاحب شاید اپنے  
پروگرام نہ لکھتے نہ اشیر بیٹا ہی ایسا پروگرام پیش کرتا لیکن باپ نے بیٹے کی خاطر اور بیٹے نے حلال روزی کے حصول  
پروگرام بھی تیار کیے۔ اس پروگرام کا نام ”مانومنگویا“ تھا۔ یہ سٹ کام تھا اور اس کا کلوزنگ انٹیم کچھ یوں تھا۔  
کام کے لفظ سے بھی میڈیا آشنا تھا۔

مانومنگویا..... مانومنگویا

سٹ کام سٹ کام

کالی قوم گوری قوم

ڈاٹ قوم ڈاٹ قوم

اسی طور ان کے تمام پروگرام تھے۔ اس میں بھی کالی قوم گوری قوم کی طرف اشارہ اس بات کو ظاہر کرتے ہوئے سوچنے والے انسان تھے۔

ہر ادیب میں ایک بات بہر کیف ساجھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے تجربات، مشاہدات تخیلات قاری کے share کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح فطرت انسان کے ساتھ اپنے اشجار، پھول، جھرنوں کی کن من، ہواؤں کا گھومنا صحراؤں کی وسعت، پہاڑوں کی سر بفلک اونچائیاں اور موسموں کی تبدیلیوں کو بھی شامل رکھتی ہے۔ آرٹسٹ اپنے سفر میں قاری کو ہم شریک مسافر بنا کر شامل کرتا ہے تو قاری اندر کے کپار نمٹ کی کھڑکیاں کھول کر وہ مناظر دیکھتا ہے جو وہ دران سفر ادیب کی نظر سے گزرتے ہیں لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ کبھی بھیا تک تقفن بھرے، تکلیف دہ مناظر سے زیادہ عریانی کے منظر آنے پر کچھ کھڑکیاں بند کر دوں۔ کچھ ادیب اس قدر سچ بولنے کے عادی ہوتے ہیں کہ رات کے مناظر اور غسل خانوں کے دروازے کھول کر جنسی بھوک اور جسمانی غلاظت کو بھی قاری کے ساتھ share پر بھندرتے ہیں۔ یہ مناظر نا کھچ سہی لیکن کسی کسی نفس طبع حیا دار قاری کے لیے بیزاری اور تقفن کا باعث بن جاتے ہیں۔ خاں صاحب کی یہی کوشش رہی کہ اسی قدر سچ بولیں جس قدر قاری ہضم کر سکے۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے نے کبھی قاری کے کندھے پر بوجھ نہیں ڈالا۔

ٹیلی ویژن کے لیے جب انہوں نے ”اور ڈرائے“ تحریر کیے تو اس میں صابرہ آپا کو نیسکوبی اور جمیل سکرپٹس بنا یا۔ یہ ہمارے بگڑے معاشرے کی قدروں کو بے نقاب کیا کرتے۔ اسی میں ریاض محمود نے بابو علم دین کا رول کیا جو دو نئے بابو علم دین کی بہن بن کر سامنے آئیں۔ یہ دونوں پھر خاں صاحب کے سیاسی منسلک کی جھلکیاں دکھاتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ”ناہلی تھلے“ ”ہم آگئے“ ”ڈھول کا پول“ اور ایسے ہی کئی پروگرام لکھے جن کے سچے خاں صاحب کی یہی سوچ تھی۔ خود بتائیے ایسے معمار پاکستان کی خوش نصیبی نہیں تو اور کیا ہیں۔

## ریڈ یوسکرپٹ

سیریل (دیہاتی پروگرام)	بند سے دے گھر (پنجابی)
سیریل (عورتوں کا پروگرام)	مسکن (اردو)
1	مجنون مرکب (اردو)
2	.....
3	.....
(بادلوں سے پرے) افسانہ	مشورہ (اردو)
دیہاتی پروگرام	چچ (پنجابی)

دیہاتی پروگرام	پھلیاں (پنجابی)
سیریل - دیہاتی پروگرام	پہلی دسے تھلے (پنجابی)
جنرل پروگرام	کھپتی (اردو ڈرامہ)
جنرل پروگرام	دلی (اردو ڈرامہ)
جنرل پروگرام	پناہیں (اردو ڈرامہ)
	نہریں
9.15 رات - 25 دسمبر 1956ء	مرواہ دان
دیہاتی پروگرام - 27 دسمبر 1956ء	پہلی دسے تھلے
بظور ریڈیو Voice	حیرت کدو
" " "	آج اور آج کا دن
" " "	وسنت سہنا
" " "	ضابطہ کارروائی



## 121- سی ماڈل ٹاؤن

”ذاتی مسلک“

یقین جانیے کہ جو کچھ بیرون میں ہوتا ہے، اس پر میں نے بہت کم نگاہ ڈالی ہے۔ یوں سمجھیے میری زندگی سے گریز، سنی سنائی، بنی بنائی، محسوس کی گئی، اندازہ لگائی گئی تحقیق سے بہت دور ہوتی ہے۔ ڈینا کو بنیاد بنا کر مساجد کے تاریخ و وارثیہ کے گوشوارے تیار کر کے لکھی گئی تصدیق شدہ کتابیں سائنسی طریق کار کے قریب ہوتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ میں نے کچھ واقعات غلط، کچھ حادثات بے ربط، کچھ بیانات افراط و تفریط کے ساتھ تحریر کیے ہوں۔ میں ابتدا معافی کی خواستگار ہوں کہ میں اشفاق احمد کو آپ کے ساتھ ساتھ سمجھنے کی کوشش میں برسرِ بیگانگی میں اشفاق احمد کون تھے؟ میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ ان کا مسلک کیا تھا؟

کیا اشفاق احمد دنیا دار تھے کہ صوفی؟

نرم دل تھے کہ پتھر پٹی چٹان؟

کام آنے والے کہ کام لینے والے؟

ان کے اندر کاشمیر بے مثال کیسا تھا؟

اشفاق احمد کیا احساسات کے غلام تھے؟

کیا ان پر عقلی، ذہنی، اعصابی، نفسیاتی دورے پڑتے تھے؟

کیا ایسا تو نہیں کہ نظر آنے والا اشفاق احمد اور تھا اور اندر چھپ کر سادھی لگانے والا، مراقبہ کرنے والا بخت تھا؟

اور قسم کا چھلا وہ تھا؟

غرضیکہ سوالوں کی ایک ٹیلی فون ڈائریکٹری میرے سامنے کھلی ہے اور عجیب معاملہ ہے کہ اب نمبر ملانے پر

فون مصروف ہوتا ہے یا گھنٹی بجنے پر answering مشین چل پڑتی ہے۔ کیا کیجیے زندگی میں بھی وہ کھل کر رہے

سمجھانے والے نہیں تھے! بعد ازاں تو اور بھی مشکل ہے!!

میں نے کچھ تو یہ تحریر اپنی صفائی میں پیش کی ہے۔ کچھ ان لوگوں سے دستہ بستہ عرض کرنے کے سلسلے میں

تاریخوں، تاریخی زاپچوں، بادشاہوں کی تزکوں سے سچ کو چھان پھنک کرنے کی عادت ہو کرتی ہے۔ یہ کتاب عیب کی قیاس آرائی، تحلیل آزمائی، ارادت کے سلسلے میں محاذ آرائی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

مگر فقط یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے احمقوں کی طرح محبت کی پُر خار وادی میں قدم رکھا۔ قدم قدم پر ٹھوکر کھاتی، نصیحت حاصل کی اور پھر ہولے ہولے اس نتیجے پر پہنچی کہ محبت کا دعویٰ دار بر خود غلط انسان کی طرح کھتا رہتا ہے۔ وہ ہر وقت صرف اپنی محبت کی عینک لگا کر بیرونی حالات کی رائے قائم کرتا رہتا ہے۔

اپنی محبت کے آگے ماں باپ اور خاندان کی عزت کا کوئی بھرم قائم نہیں رکھ سکتا۔ عزت کی خاطر بھاگ جانے کوئی کرنا ایک نقطہ نظر ہے اور جب تک سچ کے دونوں پہلوؤں نظر کے سامنے نہ ہوں، پورا سچ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ شخص کے دونوں طرف مختلف ٹھپہ ہوتا ہے اور دونوں کا اپنی عزت اور محبت کا دو پلڑا ترازو سچ ہوتا ہے۔

مشفق احمد خاں صاحب کے متعلق کچھ تحریر کرنے کا فیصلہ میں نے اس وقت کیا جب وہ میری رائے پر اثر انداز نہ کیے درمیان میں نہ رہے۔ اگر وہ جیت ہوتے اور اشارہ بھی مجھے منع کر دیتے کہ میں ان کو مشتہر نہ کروں تو مجھے ان کا احترام کرنا پڑتا لیکن آج جب وہ ہمارے سچ نہیں رہے تو ہولے ہولے دھند چھٹ رہی ہے۔ کسی فرد کی عینک پیمانہ ہے جس میں زندگی کو ناپنے کی صلاحیت ہے۔ ممکن ہے یہ پیمانہ معیاری نہ ہو لیکن اندازے اور پڑتے کے لیے اس سے رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ اس فرد نے کہاں ٹھوکر کھائی، کہاں ٹکرایا، کس کھائی میں گرا، کیسے کیسے گھسٹل میں پھنس کر اپنا اور دوسروں کے زیاں کا موجب ہوا۔

میں نے طفیل کیا سنورا کیا بگڑا۔ یہ سب مواد سمت نما ہوتا ہے۔ چھوٹے انسان کے تجربات سے بہت کچھ عبرت حاصل ہو جاتا ہے۔ خاں صاحب کی زندگی تو پھر بہت سارے حیرت انگیز واقعات سے بھری پُری رہتی تھی۔ ایسی باتوں سے چھپانا نا نظر ثانی مجھے اخلاقی بددیانتی لگتا ہے۔

خاں صاحب کو میں نے تھکے تھکے، چوری چوری، ہونٹوں کو دانتوں تلے دباتے ہوئے زندگی گزارتے دیکھا تھا جو اپنے خاندان کی محبت میں اس درجہ محو تھا۔ انہوں نے ایک اجنبی رابلے کی خاطر اپنے ماں باپ، بہن بھائی اور خاندان سے بے وفائی کی۔ اسے بانا خرابا نو قد سیاہ اور خاندان کے درمیان جب فیصلہ کرنا پڑا تو ان دیکھے کی محبت کو اپنی محبتوں کے زخم رستے رہے۔ ان پر کھر نڈ آ جاتا تو خاں صاحب خود ہی تہائی میں انہیں کھرچ کر ہرا کر کے باقی ماندہ زندگی اس احساس جرم سے شفا یاب نہ ہو سکی۔

غم کے متعلق میرا اندازہ ہے کہ ہر شخص کو بقدر ضرورت غم سے شفا بھی ملتی ہے۔ خدا کسی کو بلا وجہ آزار میں مبتلا نہیں کرتا۔ غم کا غم ایک کشتی کی مانند ہے جو زندگی کے بہتے دریا میں بہا دی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت، توفیق اور محنت کے مطابق اس کشتی کو ڈبوئے سے بچاتا ہے۔ خوش نصیب وہ ہیں جن کی نیا انہیں ہدایت کے سفر پر چلاتی ہے۔ یہ کشتی دوسرے کنارے پہنچ کر اللہ کی ہدایت کو پہنچ جاتی ہے اور وہ راضی برضا ہو کر اللہ کے فضل میں غرق ہو جاتے ہیں، حق غمستانے کی اہلیت کھودیتا ہے۔

بجراں بجرے کی افادیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور اسے ایک ایسی تلوار بنا دیا جاتا ہے، جو دوسروں کی حفاظت، درد

اور رہائی کے کام آتی ہے۔ غم کے بحرے میں سوار دلگیر مسافر کو اپنا کوئی ذاتی غم نہیں رہتا۔ وہ اب دوسروں کے غم سے اپنے غم کو خرد اپنے غموں سے مکمل چھکارا حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ بدنصیب غم غلط کرنے کے لیے تجویز کرتے ہیں۔ غم سے اپنے غم کی رنگینیاں بازو کھول کر منتظر رہتی ہیں۔ وہ طوائف کا عشق ہو۔ شام غم اجالنے کے لیے پینے پلانے کا عشق ہو۔ جوئے خانے کی Excitement ان کا غم ہدایت آشنا ہو کر انسانی سطح سے اٹھنے نہیں پاتا۔ وہ غم کو بہلانے کا فن تو سیکھتے ہیں لیکن ہدایت کی تلوار نہیں بن سکتے۔

خاں صاحب کی زندگی میں اپنے خاندان سے پھڑنے کا غم تھا۔ پھر جا بجا رنگین زندگی سے بچنے کے لیے لیکن ان کی کشتی کسی کی دعا سے اللہ کی ہدایت سے ہمکنار ہو گئی۔ ان کی کشتی ایک ہی کا یا پلٹ میں تلوار بن گئی۔ وہ کشتی رکشا کرنے والی، ظلم کے خلاف لہرانے والی، یتیم بیوہ، مظلوم کے لیے انصاف طلب کرنے والی تلوار بن گئی۔ میرا خیال ہے اسی کا یا پلٹ میں ان کی زندگی برائی اور سبق آموزی ہے۔ شہاب صاحب کہا کرتے تھے صوفی اور عام آدمی میں بنیادی فرق یہی ہے۔ واقعات دونوں کو ایک سے پیش آتے ہیں لیکن ردعمل دونوں کا مختلف ہے۔ صوفی بھی عشق کرتا ہے، ناکام ہوتا ہے۔ اسے بھی لالچ خود غرضی، حرص ستاتی ہے۔ اسے بھی قرض کی جستجو ہے۔ بی کلاس رزق کا خیال آتا رہتا ہے۔ وہ گرتا ہے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ معافی مانگتا ہے اور تائب ہو جاتا ہے۔ اُس کی روح پہلے سے زیادہ تہناک ہو جاتی ہے۔

میں نے تین لوگوں کو اسی طرح گرتے، اٹھتے اور پھر ہدایت پاتے دیکھا ہے۔ مفتی جی، شہاب صاحب صاحب۔ لیکن راستہ تینوں کا مختلف تھا۔ کشتی غم تینوں کی مختلف ساخت اور رنگ کی تھی۔ مستول ہر ایک کا یہ کھٹکا شخصیتیں مختلف ہونے کے باعث انہوں نے زاو راہ کا داندہ دکا بھی اپنی مرضی سے جمع کیا۔

شہاب صاحب نبی پاک کا نام بہت کم اپنے منہ سے لیتے تھے۔ شاید یہ ان کی عقیدت کی شدت تھی۔ تقاضا تھا۔ میں نے کبھی انہیں لہک لہک کر اپنی وابستگی کا اظہار کرتے نہیں دیکھا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ انسانی معیار، پیمانہ انسانیت نبی پاک کو اتنی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک سنت عمل ہی انسانی کوشش کی معراج ہے۔ انہوں نے انہیں اشریٹ سے کہتے سنا..... ”آج جب ہم جمعہ کی نماز پڑھنے جائیں گے تو مسجد سے نکلنے وقت اپنے وقت میں پہلے پاؤں دھرنا۔“

اشریٹ نے تو بالغ لڑکے کی ترنگ کے ساتھ پوچھا..... ”وہ کیوں شہاب پچھا؟“

”وہ اس لیے بیٹے کہ میں نبی پاک کی ایک ہی سنت اپنا سکا ہوں۔ اصل کام اس دنیا میں سنت نبویؐ ہی تو ہے..... اور آدمی یہاں کیا کرنے آیا ہے بھلا۔“

کہنے کو تو شہاب صاحب کہا کہ گئے۔ سننے کو تو اشریٹ نے سن لیا لیکن اس کے بعد شہاب بھائی کچھ ایسے ہوئے کہ پھر اس ناپک پر کوئی بات نہ ہو سکی۔

مفتی جی وہ دوسرے درویش تھے جنہوں نے مادہ سے روح کی طرف فلہ بازی کھائی۔ مفتی جی نے شہاب صاحب کہا کرتے تھے کہ وہ جنت کے مجذوب ہیں۔ وہ دنیا میں بھی مجذوبیت کے لشکارے دکھاتے تھے۔

جب ترقی پسند تحریک کے شیدائی ہو رہے تھے۔ مفتی جی سگمنڈ فرائیڈ کے نکتہ نظر سے وابستہ جنسی میلان کی لکھ رہے تھے۔

ترقی پسند پیٹ کی بھوک کے ستائے ہوئے لوگوں پر متوجہ تھے۔ مفتی جی جنسی بھوک کو انسانی بیچارگی کا اصل سبب سمجھتا تھا۔ اس کی کہانیاں لکھ رہے تھے جن میں دبے ہوئے جنسی رجحانات کی باتیں آزادانہ درآتی تھیں۔ مفتی جی جنسی بھوک کے سبب بڑے درد و کرب سے قلمبند کر رہے تھے۔ پھر مفتی جی کی کشتی غم کو یکدم ہدایت کا ساحل مل گیا۔ اس کے کسی لمحے میں وہ کا یا کلب کا شکار ہو گئے۔ انہیں نظر آیا کہ یہ ایک جہت ہے جس پر میں کہانی لکھتا آیا ہوں، اس لیے اسے لکھتا ہوں۔

ایک چیز ما بعد الطبیعیات بھی ہے۔ ایک سفر روح کا بھی ہے۔ ایک انتشار و ہاں بھی منتظر ہے جس کا جواب مادی دنیا میں نہیں دیا جاسکتا۔ جس کا کوئی منطقی تجرباتی Analysis نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ایک مدت فرائیڈ کے تتبع و تامل کے بعد اس نے اپنے ذہن کے اندر ایک نئی دنیا کا وجود تلاش کرتے کرتے یونگ نے بھی بڑی تھیکا و تھک محسوس کی تھی۔ وہ بھی Sub-Conscious. Cosmic-Consciousness کے پانیوں پر تیرتا Cosmic-Consciousness کی آگے تک جا پہنچا تھا۔

مفتی جی نے جب پلٹنا کہا یا تو وہ بابوں کی تلاش میں نکلے۔ انہیں 'تلاش' لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں 'تلاش' کی نئی پورک ایلٹی' کی نئی Interpretation کرنے کا خیال آیا اور انہوں نے 'الکھ نگری'، 'تحریر کی جس میں شہاب کو بے نقاب کرنے کی جرأت کی گئی۔ یوں ممتاز مفتی کو جو تلوار ملی، وہ اپنی نوعیت کی مختلف تلوار تھی۔ وہ ما بعد کا اس کی تصویر کے متلاشی ہو گئے۔

مفتی جی کی اس ترشول کا تیسرا نوکدار حصہ اشفاق صاحب تھے۔ وہ (اندر کی تلاش چھپانے) بابوں کے پتے چھاننے، ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے میں مصروف رہے جن کی غالباً خود انہیں بھی سمجھ نہیں تھی۔ انہیں کیا پتہ کہ وہ دراصل اپنے اور صرف اپنے لیے کیا چاہتے تھے؟ اس کا سراغ لگانے کے لیے انہوں نے بابوں کے پتے چھاننے کی ضرورت محسوس کی۔

مجھے اور تو کچھ علم نہ ہو۔ اس میں یہاں تک سمجھ پائی ہوں کہ انہوں نے نہ سنت رسول کی پیروی کی نہ ما بعد ہی کا فلسفہ میں مصروف ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو خالق خدا کے حوالے کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اللہ کو قرض سے سزا دینے کی رسم ڈال لی اور میں سمجھتی ہوں اسی قرض حسنہ کو اللہ نے وہ شہرت اور قبولیت بخشی جس کا فائدہ وہ آج بھی لے رہے ہیں۔ انہیں ہدایت کی کشتی مل گئی اور وہ تلوار ملی جو خلق کے آگے چلتی تھی۔

انہوں نے اپنے فرانسیسی اور اطالوی سوٹ، سیک لیدر کی جوتیاں، مہنگی خوشبوئیں ترک کر دیں۔ شلوار قمیض پہنے اور اللہ کی مخلوق کا حصہ بن گئے۔ اشفاق صاحب عموماً چھوٹی بات سے بڑا نتیجہ اخذ کیا کرتے تھے۔ وہ عجیب و غریب بیرونی مواد سے اندرونی ذاتی مسلک کی تراش تراش کرتے رہتے۔ ایک ایسی ہی تحریر ملاحظہ ہو۔

تھام ازل حساب کتاب کے معاملے میں کچھ اپنے جیسا ہی ہے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو بہت سی چیزیں



دی ہیں۔ پر ان کے استعمال کا شعور نہیں دیا۔ بہت سوں کو اس نے شعور دے رکھا ہے اور چیزیں مرحمت نہیں فرمیں۔  
 ”سپ اور“ پہننے کے لیے بھی شعور کی ضرورت ہے لیکن میرے اکثر دوستوں کے پاس سویٹر تو ہیں پر شعور نہیں۔

وہ ”سپ اور“ کو بھی اسی طرح پہنتے ہیں جیسے قمیض یا بنیان پہنی جاتی ہے۔ سویٹر پہننے کے لیے ذوق نہیں اور گھٹنے کی حس کے لطیف ہونے کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ کو اس وقت ”سپ اور“ پہننے سے گریز کرنا چاہیے جب تک کہ آپ کو رنگوں کے خواص کا علم نہ ہو۔ گہرے اور بھڑکیلے رنگ ہمیشہ غیر سنجیدہ نہیں ہوتے اور صوفیانہ رنگ مستقل طور پر نہیں کہلائے جاسکتے۔

اگر کوئی بوڑھا سفید ٹول کی قمیض اور ٹھٹھے کی براق شلوار پر گہرے ہنستی رنگ کا سویٹر پہن لے تو اس کی جسمانی حالت میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی بشرطیکہ اس کی چند یا بلور کی طرح ملائم اور شفاف ہے اور اس کے کانوں پر سیاہ رنگ کے فریمس اگے ہوئے ہیں۔ وہ تو ہنستی رنگ کے سویٹر میں انگریزی کے اس رسالے کی طرح دکھائی دے گا جو مکہ و کٹورہ کے صحافی شائع ہوا کرتا تھا اور جس میں گھڑسواروں کے کارناموں سے متعلق کہانیاں چھپا کرتی تھیں۔

اسی طرح اگر ستواں ناک اور گھٹنگر یا لے ہاؤں والی کوئی نوخیز لڑکی صوفیانہ رنگ کا ”سپ اور“ پہن لے گی تو اس کی دلکشی اور موہنی میں ذرہ بھر کمی بھی واقع نہ ہو سکے گی اور ہلکے بادامی رنگ کے سویٹر میں وہ ہمیشہ فرانسسیسی صاف دکھائی دے گی۔  
 طرح دکھائی دیتی رہے گی۔ دیدنی! بوسیدنی! بوسیدنی! پھر پتہ نہیں لوگوں نے یہ قاعدہ کیا ہے کیوں اور کیسے وضع کر لیا۔ صوفیانہ رنگ سنجیدہ اور شوخ اور بھڑکیلے رنگ غیر سنجیدہ ہوتے ہیں۔

”سپ اور“ پہننے میں قوت شامہ کے غیر معمولی ہونے پر میں اس لیے زور دیتا ہوں کہ سویٹر آپ کے جسم کے قریب رہنے والے جسم کے علاوہ چند ایسے غیر مرئی اجسام کی خوشبو کو بھی اپنے اندر سموئے رہتا ہے جس کا اثر آپ کو یوں نہیں ہوتا۔ رات کے وقت جب آپ اپنے بازوؤں کو علامت ضرب بنا کر سویٹر کا گھیرا ہاتھوں میں بچھتے اور ات آہستہ آہستہ اوپر کھینچتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز کا احساس آپ کو ہوتا ہے وہ اس دوست کی جدائی ہے۔ ابھی آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔

جونہی سویٹر کا گھیرا آپ کی ناک کے نزدیک پہنچتا ہے۔ آپ کو اس میں سے مٹی کے ذروں کی خوشبو آتی ہے۔ ایک صاف ستھرے سلپنگ روم میں ذرات کی خوشبو صحرائے کالیاباری میں ٹھنڈے چشمے کا درجہ رکھتی ہے اور جب آپ اپنی ناک سے آدھا گزر چکے ہوتے ہیں تو اس میں دن بھر کی دھوپ کی خوشبو آتی ہے۔ خند لگتی ہے کیسے ایک نئی خوشبو رات میں دھوپ کی مشام طرب انگیز ہے کہ نہیں؟ جونہی اس میں سے دھوپ کی خوشبو آتی ہے آپ کا وہ دوست جس سے آتا ہے جس سے ابھی آپ کی شناسائی نہیں ہوئی اور جونہی اس کا گریبان الٹ کر ناک کی پھٹنگ پر سے پھسکتے ہوئے احساس ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنے آپ سے گلے ل رہے ہیں اور آپ نے اپنے وجود کا بوسہ لے لیا ہے۔

”سپ اور“ پہننے کے شعور کا سب سے بڑا تقاضا یہ کہ ”پل اور“ کبھی نہ پہنا جائے۔ پل اور پہننے کے شعور کو یہی محسوس کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے تاجر باپ کے ساتھ بازار کے بھاؤ اور مندی اور تیزی کی باتیں کر رہا ہے۔ اس میں ملبوس ہو کر آپ کو یوں لگتا ہے کہ آپ اپنی ماں کی گود میں سر رکھے پڑے ہیں اور وہ ان میں سے سفید بال چھن رہے ہیں۔

تنگ اور کوتاہ ”سِلپ اوور“ پہننے سے نہ پہننا بہتر! تنگ ”سِلپ اوور“ پہن کر بہت ممکن ہے آپ جسمانی طور پر  
 صحت مند ہو جائیں، پر روحانی طور پر آپ گھٹ کے رہ جائیں گے۔ تنگ ”سِلپ اوور“ پہن کر آپ کی حالت یقیناً وہی  
 حالت ہو خیرتی کے سانگیل چلاتے ہوئے سپاہی کی سیٹی من کر ہوا کرتی ہے۔ ”سِلپ اوور“ پہن کر بھی اگر آپ کے  
 جسمانی ملبوس سے مستور نہ ہوئے تو اس کا استعمال بے جا ہے۔ کندھے پر سے گزرنے والی پٹی اگر زیادہ نہیں تو  
 ہٹائی ہوئی ضرور ہونی چاہیے کہ آپ کے بازو پر چپکے کے ٹیکے کا سب سے اوپر کا نشان اس کے نیچے رہے۔

جہاں تک اس کے پتے کا تعلق ہے۔ ”سنسپ اوور“ کے کوٹاؤں سے بلاشبہ بھاری ہونے سے بچ سکتے ہیں لیکن جسم  
 کے انسانی اشکال ہوں، کسی طرح بھی قابل قبول نہیں لیکن اگر آپ پٹاری میں تو ایسی اشکال کا سویٹر بھی پہنا

”سِلپ اوور“ کو تہہ کر کے رکھنا یا اس کو کھولنے پر ناگن اس کا ایمان ہے۔ کرسی کی پشت پر، کرسی کے بازو پر ڈالنا  
 بد تمیزی ہے۔ اسے ہمیشہ کرسی کی سیٹ پر یا کتابوں کے اوپر رکھنا چاہیے۔ اگر آپ کو ”سنسپ اوور“ کے گریبان  
 میں گانے کی عادت ہے تو بہتر ہے کہ یا تو آپ سِلپ اوور نہ پہنیں یا پٹا نہ خریدیں۔

”سِلپ اوور“ کے پھٹ جانے، کہتے ہو جانے یا تنگ ہو جانے پر اسے کسی مستحق، فقیر، غریب آدمی یا اپنے  
 عزیز یا بیٹے کو دینے کی بجائے پتھر کے گرد لپیٹ کر دریا میں ڈال دیں۔ بیسویں صدی کے پہاڑوں کی دیو مالا کے  
 پتھر کرنے سے اگلے موسم پر آپ کو اس سے بڑھیا ”سِلپ اوور“ ملے گا۔

یہ تمام باتیں عام ”سِلپ اوور“ پہننے والوں کے لیے ہیں کیونکہ اگر آپ سرکس میں ملازم ہیں تو آپ پر کوئی

خاں صاحب نے میرے رشتہ داروں کے ساتھ مجھے ایسے مابین رکھا کہ شرم و حیا دونوں طرفین کی قائم رہے۔  
 دوستوں اور بی بی خواہوں کے درمیان جب میں ہوتی تو وہ درمیان میں ایک ریشمی پردہ بن جاتے۔ اشفاق احمد  
 کے بعد مجھے کئی باتیں سمجھ میں آئی ہیں۔ اب میرے سامنے بیٹو بچو کہتا ہوا ہوشیار باادب ملاحظہ کہتا ہوا اور مجھ سے  
 تمہارے چلنے والا آدمی نہیں ہے۔ اب میں ٹھوکر کھا جاؤں، گر جاؤں، کسی کے کندھے سے بھڑ جاؤں، اب وہ شخص  
 مجھ سے آگے چلتا تھا اور مجھے بچاتا جاتا تھا۔ وہ شخص اب موجود نہیں۔

آج مجھے پتہ چل گیا جب میرے گھر ٹیکس کے کاغذات آتے ہیں۔ کبھی کبھی وارنٹ یا قانونی قسم کا سن بھی  
 ہے۔ پھر میرے پاس وہ بل آ جاتے ہیں جو بجلی کے زائد بل ہوتے ہیں۔ میرے پاس وہ منی آرڈر بھی آتے ہیں جن  
 کے لیے ”اشفاق احمد“ مجھے معلوم نہیں منی آرڈر کیسے بھرا جاتا ہے۔ چیک بھرنے کی باریکیاں بھی میرے علم کا حصہ  
 نہیں تھیں۔ پتہ چلا ہے کہ وہ ڈیڑھ گنا کام کرتے تھے اور میرے لیے آدھا چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے ”گواہی دینے  
 میں جاؤں گا۔ یہ کام میرے ہیں، باہر کے تمام کام میں سنبھالوں گا۔ تم بس گھر اور لکھنے پڑھنے پر توجہ دو۔“

اس حفاظت میں رہنے کے بعد، اس چادر اور چار دیواری میں رہنے کے بعد اب زندگی میرے لیے اچانک

بہت مشکل ہو گئی ہے۔ اب مجھے ان چیزوں کو دیکھنا اور ان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ جن کی مجھے سمجھ تک نہیں۔ اگر غلطی سے کھڑکی کھلی رہ جائے اور اس میں سے ہلکا سا ہوا کا جھونکا آئے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ Tornado داخل ہو رہا ہے۔

آپ یقین کیجیے اشفاق احمد کا یہ طریقہ کار تھا۔ ان میں خصوصیت تھی اور اس خوبی کا ان کو بھی احساس نہیں تھا۔ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کا بنیادی مسلک موروثی اور پشتینی غیرت تھی۔

اشفاق احمد ایک غیرت مند آدمی تھے۔ وہ اپنے اور لوگوں کے درمیان بھی ایک حجاب رکھتے تھے۔ داروں اور اپنے درمیان بھی ایک پردہ حائل رکھتے تھے۔ ایسا حجاب جو غیرت مند لوگ ہی رکھ سکتے ہیں لیکن عیسائی تھے۔ اشفاق احمد کو اپنی اس خوبی کا علم نہیں تھا۔ ان کے اور ان کے دوستوں کے درمیان کبھی ایسی باتیں نہیں ہوئیں جو اندر تک پہنچتی ہوتی ہیں۔

ممتاز منشی کہا کرتے تھے "اشفاق احمد گونگا ہے، اس نے اپنے اوپر صرف باتوں کے خول چڑھا رکھے ہیں۔" اصل بات کو کوئی نہیں جانتا تھا اور یہ سب ان کی موروثی اور پشتینی خوبی کی وجہ سے تھا۔ میں آپ سے عرض کروں گا بار عرض کروں کہ اشفاق احمد کو اپنی اس خوبی کا علم نہیں تھا۔ ہر قوم اور فرد میں ایک خوبی ایسی ہوتی ہے، جس سے اور محبت خوبیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں لیکن بنیادی طور پر خوبی ایک رہتی ہے۔

بتائیے ایسے انسان کو کیا اپنی خوبی پر کبھی فخر ہو سکتا تھا؟ ان کا ذاتی مسلک غیرت اور صرف غیرت تھا اور مجھے شادی کر کے اس ذاتی مسلک کو بڑی ٹھیس پہنچی تھی! ایسے لوگ گلی گلی جہاں، ایسے لوگ ہر عہد اور دور کی قسمت میں کہاں۔ مجھ جیسی بھگوان نورت بھی کہاں جس کی چادر اور چادر دیواری اس کا شوہر ہو۔

## جانوروں سے محبت

جانوروں سے محبت بھی خاں صاحب کے ذاتی مسلک کا حصہ تھا۔ جس طرح وہ غیرت اپنے موروثی مسلک سے لے کر آئے تھے۔ اسی طرح دیہاتی زندگی نے انہیں قدرتی طور پر جانوروں کی محبت عطا کی تھی۔ وہ اس محبت سے کچھ کارا حاصل نہ کر سکے۔

سمن آباد کے بعد برسوں ہمارے گھر میں کسی Pet نے قدم نہ رکھا لیکن جب ہم "داستان سرائے" میں منتقل ہوئے تو یہاں ایک دن کھلکو ڈیڈی یعنی خاں صاحب کے بڑے بھائی تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک چھوٹا کتا تھا، جس کا چہرہ خوفناک، جسم مضبوط، انداز بے حد مضطرب تھا۔ اس کا سارا جسم کہہ رہا تھا "مجھے چھوڑ دو، پھر دیکھو کتا کرتا ہوں۔"

خاں صاحب نے بڑی محبت سے اس کے سر پر پیار دیا۔

"کھلکو بھائی اسے کیا کھانا پلانا ہے؟" خاں صاحب نے سوال کیا۔

"وہ تو ایسا کچھ مسئلہ نہیں۔ اسے دن میں دو بار میر ضرور کرانا ہے۔ میر کے بغیر یہ مر جائے گا۔"

ہارے گھر میں گیت سے گھستے ہی سیدھا چلتے جائیں تو آپ کو گیراج کا ایک سیاہ پھانک والا گیت نظر آئے گا۔  
 سوائے اندر پوائنٹر کو رکھا گیا۔ اس کی صورت ایسی خطرناک تھی کہ بچوں کو میں نے اس سے بالکل پرے رکھا۔  
 بس ان دنوں سوات کا تاجدار ملازم تھا۔ یہ نوجوان سیر کے لیے ماسور کیا گیا۔

دو چار دن تو خال صاحب پوائنٹر کو سیر پر لے گئے۔ ساتھ تاجدار کو بھی ٹرینگ دی گئی کہ کیسے زنجیر ڈھیلی بھی رکھنی  
 ہے۔ تھینچا بھی نہیں لیکن تاجدار کا چہرہ سیر کے وقت فق ہو جاتا۔ کتا اسے بڑی تندہی سے گھسیٹتا لے جاتا اور گھسیٹتا ہی  
 رہتا۔ اس وحشی سے ویسے بھی گھر بھر میں کسی کی دوستی نہ ہو سکی۔ شہری زندگی میں ایسے چونچلوں کے لیے کسی کے  
 ساتھ نہ تھا۔

ماڈل ٹاؤن سے "حق ان دنوں کھیت ہی کھیت تھے اور افتخار بھائی نے یہاں ٹھیکے پر زمینیں لے رکھی تھیں۔ ایک  
 دن آئے۔ مجھے گیراج میں ساتھ لے گئے۔ پوائنٹر کو دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی۔ "کا کی! یہ تو بہت ماڑا ہو گیا ہے۔"  
 "جی ڈیڈی جی، ڈبلا تو ہو گیا ہے۔"

"اسے سیر کون کراتا ہے؟"

میں نے کمزور تاجدار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ لڑکا لے جاتا ہے جی لیکن کتنا شہ زور ہے۔ اس کے بس کی

"تو شوق سیر کرانے لے جایا کرے۔" کھکھو ڈیڈی بولے۔

"وہ تو شوق سے لے جائیں لیکن دفتر پہنچنا ہوتا ہے۔ شام کو وہ دیر سے آتے ہیں۔"

"پھنکتا میں داپس لے جا رہا ہوں۔ شوق تو تادینا۔ یہ نعمت تمہارے بس کی نہیں۔"

کھکھو ڈیڈی مسٹر پوائنٹر کو لے گئے۔ تاجدار کی جان میں جان آئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ دکھا کر کہا "دیکھو آ پ  
 اے جب کھینچتا تھا تو ہم بھی ساتھ ہی گھسٹتا جاتا تھا۔" اس کے خراشی ہاتھ دیکھ کر مجھے بزار نچ ہوا۔ میں نے کتار کھنے  
 کی اور ایک طرح کی تسکین محسوس کی لیکن جب خال صاحب گھر لوٹے اور گیراج کی طرف جانے لگے تو مجھے  
 ہوا۔

میں نے محنت سے کہا "وہ جی کھکھو ڈیڈی آئے تھے، وہ لے گئے۔"

"مجھے تو پوچھ لینا تھا قد سید۔" انہوں نے مجھے جھڑکے بغیر کہا۔

"وہ جی تاجدار کے ہاتھ بھی بالکل زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھ لیجیے۔ بڑا شہ زور تھا پوائنٹر۔ یہ غریب اسے کیا

نبیوں نے اپنی براؤن آنکھوں میں تھوڑا سا دکھ بھر کر کہا "میں سیر کے لیے کوئی اور انتظام کر دیتا۔ بڑی اچھی نسل  
 تھی۔ تم نے ایسے ہی جانے دیا۔"

ساری تنبیہ شکایت بس اتنی تھی۔ اس کے بعد نہ کبھی پوائنٹر کا ذکر انہوں نے کیا اور نہ میں نے اس کی بات ہی کی  
 ۔ دن جب تاجدار بیٹھا پڑھ رہا تھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپا جی آپ کا شکر یہ۔ اگر وہ کتار ہتا تو مجھے سوات

جانا پڑتا اور آپ کو معلوم ہے میرا باپ فوت ہو گیا ہے۔ ماں نے اور شادی بنا لیا ہے۔ ہمارا دونوں بھائی بہت پریشاں ہے۔ ہم بھی پریشان ہو جاتا۔“

لیکن خاں صاحب بھلا جانوروں اور پرندوں کے بغیر کیسے خوش رہ سکتے تھے۔ پوائنٹر کے کچھ عرصہ بعد مرغیوں کو آگئیں۔

گھر کی آخری دیوار کے ساتھ چھوٹا سا گودام چار فٹ چوڑا اور قریباً آٹھ فٹ لمبا تھا۔ اس میں ہر قسم کے مرغیاں جاتا تھا۔ فرش دھونے والی بالٹی، فرشوں پر پھیرنے والی ٹائیاں، گندے جھانڑن، جھاڑو۔ یکدم اس میں مرغیوں کا پنجرے بن گئے اور ان میں انڈے دینے والی مرغیاں آگئیں۔ ہم میں سے کسی کو مرغیوں سے تو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انڈے گنتے، پکانے، چرانے میں سبھی ماہر تھے۔

انڈوں کی زیادتی ہوئی تو ب آلیٹ، کیک، بسکٹ بڑی خوشی سے پکنے لگے۔ انڈوں کی ڈشیں تیار ہو جاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ ایسا ہو گیا کہ انڈے گم ہونے لگے۔ گودام کا دروازہ کھولتے تو کبھی انڈے ملتے کبھی پنجرے خالی نظر آتے۔ ان کی فیڈ تلاش کر کے لانا، اسے شور کرنا، مرغیوں کے پاس کھڑے ہو کر ان سے باتیں کرنا۔ چال پوچھتا خاں صاحب کا کام تھا۔ انیس، اور خاں صاحب کی جانوروں سے محبت سائنسی تھی۔ ان دونوں کو بھلی بھلی مرغیاں، مرغیاں بھلی لگتی تھیں۔

فیڈ اور بوسے باوجود انیس لالہ اور خاں صاحب ادھر کا رخ کر ہی لیتے تھے۔ البتہ نوکی اور چیری میں سے انہوں نے کبھی نہ مرغیوں کی پذیرائی کی نہ کبھی انڈے اٹھا کر لائے۔ جب کبھی نیبل اشتیاق آ جاتا تو انہوں نے لے لے انڈوں کا ہنگامہ چلتا۔ اشتیاق کے بیٹے بنی کو دھشت کی حد تک انڈوں کا شوق تھا۔ وہ اس شوق میں سب کو کھینچتا اور بڑی رونق رہتی۔

انڈے پک رہے تھے۔ انڈوں پر تھرہ، تنقید، تعریف چاری ہے لیکن اس شغل میں صرف پچھلے وقت کی یاد دہانی ہوتی۔ اشتیاق کے بچے، صدیقہ جاوید کے تو صیغہ، ٹولید، ہیا اور ہمارے بچے کبھی کبھی اگر ثابت شہاب آ جاتا تو انہیں میلے میں شامل ہو جاتا۔ آسموں کی پینیاں، انڈوں کا دھڑان تھتہ۔ یہ آدھی رات کو رہنے والے مشغلے تھے۔ صبح آسمان غائب۔ نہ کوئی انڈے کا چھلکا نہ کسی آم کی گھٹنی نہ ترچھے ٹیڑھے گول چوکور بچوں کے پکانے ہوئے پراٹھے۔ ہر شے ہوتی اور پختہ ہی نہ چھتا رات کیا نھر مچا ہوا تھا۔

لیکن مرغیاں اور ان کے انڈے جب چوری ہونے لگے اور فیڈ لانے کی دقت بڑھ گئی تو شہری زندگی میں مشغلے کو بند کر دیا گیا۔ مرغیاں چونکہ گھر کی پالتو تھیں، اس لیے خاں صاحب نے انہیں زنج ہونے سے بچا لیا۔ نہ جس کس کے نصیب کی تھیں اور کہاں چلی گئیں۔ بہر کیف پنجرے خالی ہو گئے۔ گھر سے دیہات کی خوشبو ایک بار پنجرے سے لپکتی لیکن پچھلے گودام کی قسمت پھر جاگ اٹھی۔

اس بار خاں صاحب کہیں سے بطنخیں لے کر آ گئے۔ داستان سرائے کے سامنے کچی سڑک کے پار ان دنوں ایک نالا بہتا تھا۔ اگر پہاڑوں پر یہ چشمہ نہ

سے قبول کہتے۔ اس کا پانی گہرا اور لمبی گھاس سے دونوں جانب گہرا ہوا تھا۔ ابھی ہماری سڑک کے پاس اُم عمارہ کے پاس تک کوئی گھر نہ تھا۔ بطنخیں آئیں تو انیس صاحب جن کو سب لالہ کہتے تھے، ان کا گوڈا فادر بن گیا۔ اس میں نہ تیرہ، نہ پندرہ، نہ چھ ماہ کی بچہ بولتی ہے کہ جانور اور بچے اس پائیدہ پائیر کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ پندرہ بیس بطنخیں پچھلے وقت کے گھر میں بن گئیں۔ آگے آگے لالہ ہاتھ میں شہوت کی چھڑی پیچھے پیچھے قیس قیس کرتی بطنخیں۔ یہ ٹولہ بڑے آرام کے ساتھ گھر میں آتا۔ کبھی کسی کار کے نیچے بطنخ کے کچے جانے کا حادثہ پیش نہ آیا۔

نالے کے قریب ایک چار پائی پڑی رہتی۔ لالہ اور دوسرے بچے کبھی چار پائی پر کبھی نالے کے پانی میں غوطہ زن ہوتے۔ یہ نہیں وقت کا کیا اندازہ تھا یا بطنخوں اور بطنخوں میں کیسے اور کیا طے تھا؟ وقت مقررہ پر آرام سے لالہ گھر کا رخ کرتے۔ ان کے پیچھے پیچھے بڑی ریت پریت کے ساتھ چلی آتیں۔ کبھی لالہ نے کسی کو شہوت کی چھڑی نہ ماری نہ کسی کو گھر میں بولا۔ بس گھر نوٹے وقت قیس قیس کی آواز کم ہوتی گویا سکون سے بچے لوٹ رہے ہوں۔

میں آپ سے پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ میری تربیت اور سرشت میں جانوروں اور پرندوں کی دیکھ رکھیہ پر گھر میں پیدا گیا۔ میں نے ایک مرتبہ ایک کوکر سٹائل پہاڑوں پر پلایا تھا۔ اس بد نصیب کو ایک رات پہاڑی چیتا برآمد سے کھانے کو لے گیا۔ میں نے صبح عہد کیا کہ اب میں کبھی ایسا بیوپار نہ کروں گی جس میں پوچھے بغیر سامان کو اٹھائے جانے کا

اس قسم کے باوجود سن 1948ء میں جب میری والدہ لیڈی میڈیکل کالج کی پرنسپل تھیں، انہیں کسی نے ایک بچہ پیدا دیا۔ بد قسمتی سے اس کتے کی ساری حواگی میرے ذمے ٹھہری۔ کچھ عرصہ بعد نہ جانے کسی آفت نے کتے کو کھانا کھانے سے روک دیا۔ ایک دن میرے پاس آیا۔ بے بسی سے اپنا سر میری گود میں رکھا اور جان دے دی۔ نم کے ساتھ اس روز میں کتے کی پورسٹی سیکھا کہ زندہ جان کا بیوپار دراصل اپنا آپ مفت بیچنا ہے۔

کبھی کبھی جانور اٹھایا نہیں جاتا وہ خود بخود رخصت ہو جاتا ہے۔ نہ کسی کو الزام دے سکتے ہیں، نہ جانور کو واپس لے کر کوئی تدبیر کی جاسکتی ہے۔ بس ان ہی دو تجربوں کے بعد میں کچھ تو طبعاً جانوروں سے محبت کرنے والی نہ تھی۔ اوپر سے یہ واقعات نے دل میں اور فاصلہ ڈال دیا۔

ابھی بھی کہیں اندر خاں صاحب کے دل میں کتے کی محبت کھلبلا رہی تھی۔ وہ اس محبت سے مکمل طور پر فارغ نہیں تھے۔ کتوں کے بعد خاں صاحب نے ملی پالنے کا تجربہ کیا۔ انیس کی زبانی ملاحظہ ہو کہ ”یوگی“ بلا ہمارے گھر کا فرد بن گیا۔

### تحریر: انیس احمد خاں

بڑے لوگوں کے گھر پیدا ہونا بھی مشکل مسئلہ ہے کیونکہ ہر شخص یہ توقع کرتا ہے کہ شاید اولاد بھی اسی طرح کی ہے۔ میرا ادب سے کوئی خاص تعلق ہے نہ تصوف کو میں سمجھتا ہوں۔ میں صرف ایک باپ کے رشتے کے حوالے سے ہی

ابو بہت مصروف زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی Activity میں پڑے رہتے تھے۔ انڈر مغربی حصے کی گلی میں بے بہا منگے رکھے ہوتے، جس میں وہ طرح طرح کے سر کے بناتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی بنا دیا، کبھی کبھوروں کا سر کہ بنا دیا، لیکن ایک بات عجیب سی ہے۔ جیسا کہ اصغر ندیم سید نے کہا کہ وہ انسان کی عزت تھے اور احترام انسانیت ان کی ہر بات کا موضوع ہوتا تھا۔ ان کی یہ بات خالی کہنے تک نہیں تھی۔

1980ء کی بات ہے۔ میں اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔ یہ ان سردیوں کی بات ہے۔ لاہور میں دھند کی چاندنی آتر آیا کرتی تھی اور کالج کے گیت بند نہیں کیے جاتے تھے بلکہ کھلے ہی رہتے تھے۔ جب سر کے کالج کے لیے لکھتا تو اکثر امی ابو صبح کی سیر پر گئے ہوتے تھے اور ہماری نانی ہی ہمیں الوداع کہتی تھی۔ ایک صبح کالج چارہا تھا تو ابو براؤن کوٹ پہننے ہوئے امی کے ساتھ آ رہے تھے تو انہوں نے مجھے دور سے اشارہ کیا تھا۔ گیا۔

کہنے لگے ”تسی کالج جا رہے او۔“

میں نے کہا ”جی۔“

میں نے دیکھا کہ ابو کا پیلا ڈریسنگ گاؤن آگے کی طرف سے کافی پھولا ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک چھوٹا بچہ جو کافی غلیظ حالت میں تھا، وہ ان کے کوٹ سے باہر نکل آیا۔ میری نانی جو میرے پیچھے ہی کھڑی تھی، کتے کو دیکھ کر گھبرائی۔

”شقاقتے مصیبتاں گھٹ نہیں جبر اتوں بتا چک لے آیا میں۔“

(اشفاق کیا پہلے مصیبتیں کہ تمہیں جو تم ایک ستا اٹھا کر لے آئے ہو۔)

ابو کہنے لگے ”امی یہ کتا نہیں ہے، یہ جوگی ہے۔ تھوڑی دیر کا مہمان ہے چلا جائے گا۔ یہ آپ کو ذرا غصہ کرے گا۔ بس دس بارہ دن ہی رہے گا۔“

ابو نے خیر اس کتے کی اتنی سیوا نہیں کی۔ البتہ ماں کی ڈیوٹی ضرور بڑھ گئی۔ ظاہر ہے اسے نہلانا پڑتا تھا۔ پر دو روزہ وغیرہ پلانا۔ ایک روز جب اس کتے کی حالت خراب ہو گئی تو ابو کہنے لگے، اسے کسی ویٹرنری ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں اور ہم ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا، اشفاق صاحب اسے ٹھیک ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔

اس پر ابو کہنے لگے ”ڈاکٹر صاحب! اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ یہ عزت نفس کا مارا ہوا ہے۔ یہ اپنے کتے علیحدہ ہو گیا ہے۔ یہ اس لیے اس طرح کا ہو گیا ہے۔“

آپ لوگ یقین کریں کہ ٹھیک دس بارہ دن کے بعد وہ بلا جوگی تھا اور جو واقعی ابو کا لاڈلا بھی ہو گیا تھا، وہ دس دن کے بعد نہ ہمارے گھر رہا اور وہ تندرست ہو کر خود ہی چلا گیا۔ شاید وہ بلا ابو کی بات سن کر کبھی گیا تھا اور اسے جتن جتن دیا گیا تھا، وہ پورا ہونے پر وفاداری سے چلا گیا۔

اب نہ وہ جوگی ہے نہ جوگی کا رکھنے والا۔ بہر حال یہ زندگی کا دستور ہے۔ یہ Creative لوگ خدا کے ہوئے لوگوں میں سے ہیں۔ یہ خود ہی لکھ لیتے ہیں۔ خود ہی گالی لیتے ہیں۔ یہ روشن آراء، بیگم کے اندر سے خود بخود ہی سر نکالتے ہیں۔ یہ سکھائے نہیں جاتے۔

میں خوش قسمت ہوں کہ میرے والدین دونوں ہی خدا کے چنے ہوئے لوگوں میں سے ہیں۔ خدا میری والدہ کو رحمت عطا کرے لیکن ابو کی جو کمی ہے، وہ ہر وقت رہتی ہے۔

آج بھی جب میں ان کی الماری کھولتا ہوں تو مجھے اس میں سے ابو کے بالوں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ میں سے یہ بو کیلکسا سو میٹر مانگ کر لے گیا ہوں اور اس میں اب بھی ابو کی تھوڑی تھوڑی خوشبو رہ گئی ہے، خدا کرے وہ ہمیشہ

بھاہر گھر جوگی سے خانی ہو گیا۔ مجھے کچھ فراغت مل گئی۔ میں اپنے کام ایک طرف ہو کر کرنے لگی لیکن خاں صاحب نے معاملے میں مجھ سے مختلف تھے۔ وہ تلخ و شیریں کے الگ الگ خانے نہ بناتے۔ انہیں لاشعوری طور پر علم تھا کہ کھانا بیٹھا دونوں ہی شامل ہوا کرتے ہیں۔ مصیبت اور راحت تو بچوں عام بچوں کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بیٹھا بیٹھا ہڑپ اور کڑوا کڑوا اٹخ تھو الگ الگ نہیں ہوا کرتے۔ کبھی حلق میں بیٹھا اتر جاتا ہے، کبھی بوند بوند کے گھر سے کہیں سے آ جاتے ہیں۔ اسی لیے انہیں نئے تجربات کرنے آسان تھے۔ کھانے پینے میں بھی وہ کافی، کبھی کبھی گل گھوٹو پیر اور ساتھ ساتھ کھٹے میٹھے چونسا آم بہت شوق سے کھاتے۔ قلمی آم، بیٹھا خربوزہ، کیلے، مکی کھجور کی پسند تھی۔ شرا میں جو شرابوں سے ملیں تو مزہ کس قدر بڑھتا ہے۔ اس کا اندازہ تو کسی شرابی ہی کو ہوگا لیکن بیٹھا ساتھ ساتھ چلیں تو اس کی گرائمر صرف خاں صاحب خوب سمجھتے تھے۔

شہری زندگی میں جانوروں کا پالنا کس طرح بوجھ بنتا ہے۔ اس کے لیے غالباً میں تیار نہ تھی لیکن میرا رویہ غیر معمولی تھا۔ مجھے لگتا کہ اتنے سارے اور کاموں کے ساتھ یہ اضافی گھریں نہیں کی جاسکتی لیکن اس بار خاں صاحب پر اس کا اثر نہیں۔

اچانک ایک روز صبح باہر نکل تو علی کھڑا تھا۔ اس کے پاس چھوٹی ٹوکری تھی اور اس ٹوکری میں کوئی چیز بل رہی تھی۔ خاں صاحب کے پاس سحر القلوب کا کوئی تعویذ تھا یا ان کی مسکراہٹ میں ایسی کوئی موہنی تھی کہ ہر شخص ان کے ہاتھ سے کوئی شے کوڈوڑتا۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو علی بولے.....

”میں خاں صاحب کے لیے سیامی بلا لایا ہوں۔ کل جب ”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی تو یہ ہرسل وقت انہوں نے بتایا تھا کہ انہیں سیامی بلیاں پسند ہیں۔“

لیجے گھوڑا گھر سال میں پہنچ گیا۔

سیامی بلا خاں صاحب کی گود میں پڑھ بیٹھا۔ کچھ بچکانے، ماتھے پر کھینچنے، ہاتھ چٹوانے میں دقت لگا ہو تو لگا کھینچنے پر نہیں لگتی۔ یہ پہلی نظر کا عشق تھا۔ شام کو بچوں سے تعارف کراتے ہوئے خاں صاحب بولے..... ”بھی یہ ہے۔ ذرا سا بڑا ہوگا تو دیکھنا کتنا خوبصورت نکلے گا۔ ابھی تو چھوٹا سا روٹی کا پھنبہ ہے۔“

سامبا سے اینٹ خاں کو محبت ہو گئی۔ وہ کالج جاتے ہوئے اور واپسی پر ضرور سامبا سے دست پنچ کرتا لیکن سامبا کو ہر شے خرمی تریج خاں صاحب تھے۔ صبح جب وہ ناشتے کے لیے آتے تو اپنی کرسی ذرا سی میز سے پیچھے رکھتے اور جھولی



کو پیارے سامبا کا انتظار کرتے۔ پھر کہیں سے سامبا صاحب کی بارگی بلہ بول کر ان کی گود میں آ کر بیٹھ جاتا۔

خان صاحب گود میں براجمان سامبا سے کوئی بات نہ کرتے نہ اسے پچکارتے۔ صرف جسم کی گرمی دوسرے کی بات خوب سمجھتی تھی۔ وہ شانتی پرانتی ناشتہ کرتے رہتے۔ سامبا گود میں خرخر کرتا اپنی محبت کا اظہار کیے باجائے یاد ہے ایک دن شہاب بھائی آئے اور غلطی سے خان صاحب والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد مسٹر سامبا نے چٹائی لگائی اور شہاب بھائی کی گود میں چڑھ گیا۔ اس وقت شہاب بھائی کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ وہ تمام تر گھبراہٹ، ہناؤ اور بھاگ جانے کے موڈ میں تھے۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر بڑی حاجت سے کہا۔

”اے اٹھ لو اشفاق! اٹھ لو جلدی۔“

میں نے شہاب بھائی کو کبھی اس قدر گھبرائے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی ناگوار سی ساری کی ساری آنکھوں کے پسینے میں جھگی ہوئی تھی۔ خان صاحب نے بلا صاحب کو اٹھ کر اپنی گود میں لے لیا۔ پھر خرخر کرنے کی آواز آئی۔ شہاب صاحب کے رد عمل پر کسی قسم کا تبصرہ نہ ہوا اور چائے کا دور بڑی ہمواری سے جاری ہو گیا۔

یہ صرف خان صاحب کے ساتھ ہی ممکن تھا ورنہ کچھ اور قسم کے لوگ ہوتے تو بڑے آرام سے بحث کر سکتا تھا کہ ملی مکروہ ہے کہ حلال ہے۔ اسے گود میں بٹھانا چاہیے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی نور والے بابا جی کی صورت ہے وہ بڑے عجیب انداز میں نوٹ کہہ کر ایک ایسا جملہ کہہ دیتے کہ تربیت چاہنے والے کی زندگی بدل جاتی اور عام زندگی خوش اپنی سادہ زندگی گزارے چلا جاتا۔

بابا جی فرمایا کرتے تھے..... ”جینا نوٹ! ہمیشہ برائی سے نفرت کرنا ہے۔ برائی کرنے والے سے نفرت کرنا اور نہ آپ میں وہ برائی پیدا ہو جائے گی اور اس پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔“

گھر میں سامبا کا راج تھا۔ وہ دن میں دو مرتبہ کچی قیمر کھاتا۔ مونا تازہ شیر بہر سا اپنی مرضی سے چھب سے باہر بھاگ جاتا۔ اس کی زندگی من مانی پلاننگ پر چلتی تھی۔ نہ وہ کسی ڈسپین کا دست نگر تھا۔ نہ کوئی قانون ہوتا۔ ایک روز جب میں سامبا کو قیمر ڈال رہی تھی تو رمضان بھائی جو پیدائشی بزرگ ہیں، بولے ”آپا جی! قیمر پورے بیالیس روپے کا قیمر کھا جاتا ہے۔ اس کا کیا فائدہ! اتنا قیمر تو کسی غریب آدمی کا سارا خاندان پالنے کو کافی ہے۔ میں چپ ہو گئی۔ رمضان بھائی وہ قناعت پسند شخص تھے جو بیچپی میں روٹی پونچھ کر گزر بسر کر لیتے تھے۔

انہوں نے کسی پھل کی رغبت ظاہر کی نہ کسی بوٹی شوربے پر ان کا دل لپایا۔ موٹی سبزیاں، پھل ان کی ڈکٹری میں موجود تھے۔ اپنی خواہشات اپنے نفس کے اندر بند رکھنے پر قادر تھے۔ نیا خوبصورت لباس عید بقر عید پر پہنتے۔ پھر وہی بے رنگ اور دھلے ہوئے کپڑے ان کے تن پر ہوتے۔ جھاڑو ہوتا۔ ان کی گھاس ہوتی۔ سائیکل ہوتا اور بازاروں کے سود سے ان کے جیبوں کے مبینے میں وہ لان میں لگے انار کے درخت تلے گھاس پر نماز پڑھتے نظر آتے۔ رمضان کا موسم

والا تھا۔ جب ایک روز شہاب صاحب نے خان صاحب سے کہا۔ ”اشفاق یار! تم اس مہینے رمضان بھائی سے قریبی چکن کا دھندا چلا یا کرو۔ اس سے زیادہ حلال کی پاک کمائی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔“

حلال کی کمائی کھانے والے سامبا کے قیے پر اعتراض کر رہے تھے اور میں مجبوراً ہی سوچ رہی تھی۔

تو پتھر میں بھی روزی دیتا ہے۔ اگر..... اگر سامبا کو روز ایک کلو قیرہ کھانے کو دلوں ہا ہے تو یہ اس کی حکمت ہے۔ غالباً یہ اس وقت ہوگا جب میں اپنے لیے روز یہ قیرہ بھون کر کھاؤں اور ڈنکے کی چوٹ اسے اپنا حق سمجھوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رمضان بھائی کی طرح سمجھ نہیں سکتی۔ وہ سارے کے سارے ایک اور طرح کے آدمی تھے۔ میں ساری کی ساری بھی تیز اور کبھی بئیر اس لیے جلد ہی میں نے ان کی بات بھلا دی۔

کچھ لوگ مذہب، مسلک، مقولے، سب اپنے آرام، سہولت اور آسانی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جو نبیؐ کی تعلیم کا جواز پیش کرنا ہوان کے پاس بڑی ٹھوس، من چاہی دلیل ہوتی ہے۔ میرا شمار ایسے ہی مطلبی خدا پرستوں میں ہے۔ اس لیے رمضان بھائی کی بات کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

سامبارت کے وقت غائب ہو جاتا۔ مجھے تو کچھ ایسا فرق نہ پڑتا کیونکہ ان دنوں گھروں کے دروازے رات کو بند ہوا کرتے تھے۔ سامبا صاحب صبح کے وقت گھوم پھر کر آ جاتے اور کسی کسی کرسی صوفے پر گھوک سورتے۔

ایک روز جب ہم ناشتے کی میز پر تھے تو حسب معمول سامبا نے چھلانگ لگائی اور خاں صاحب کی گود میں چھو گیا۔ اس کے تن پر اتنے خوبصورت بال تھے کہ پتہ نہ چلا کہ سامبا کا تو سارا پیٹ چاک تھا اور انتڑیاں نظر آ رہی تھیں صاحب کی جھوٹی لبو آلود ہو گئی۔ اس تکلیف کے باوجود سامبا نے محبت میں آ کر ترخ کرنا نہ چھوڑا۔

”اس کا کیا کریں؟ دیکھو تو سہی کیا ڈوکل لڑ کر آیا ہے کسی رقیب کے ساتھ۔“ خاں صاحب بولے۔

”آپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں، ٹانگے لگیں گے چھ سات ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔“

خاں صاحب خود ڈاکٹر محمد خاں کے بیٹے تھے اور جانتے تھے کہ جانوروں کو بھی ایسی حالت میں محبت کی کتنی بات ہوتی ہے۔ ان کے چہرے پر تھوڑا سا ملال آ گیا۔ ”لیکن ڈاکٹر تو ہے نہیں آج کل۔“

”کیا مطلب؟“

”تم دن ہوئے ڈاکٹر ڈاکٹر مجھے فاروقی کی دکان پر ملا تھا۔ وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ اب کیا کریں؟“

قیام پاکستان کے وقت ایک مہاجر کو ہمارے گھر کے سامنے کرپان لگی تھی۔ نانا اس زخمی کو گھر کے اندر لے آئی تھی۔ میں نے سادہ سنٹ ایڈ کی تھی۔ کچھ دن کے بعد وہ چل کر پتہ چلا گیا تھا۔ ابھی کچھ دن ہوئے وہی آدمی مجھے اتار کلی کہنے لگا ”بی بی جی! آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میری مرہم پٹی کی تھی آپ نے، گرد اسپور میں۔“

”خاں صاحب! آپ کہیں تو میں سامبا کا علاج کروں۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”لیکن یہ وحشی تمہیں ہاتھ لگانے دے گا؟ دیکھو ناں ساری انتڑیاں نظر آ رہی ہیں۔“

مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ خاں صاحب کی گود میں سے میرے پاس آ جائے گا لیکن باقاعدگی سے قیرہ کھلانے کی بات وقت کام آئی۔ میں نے سامبا کو اٹھایا تو اس نے خاں صاحب کا ہاتھ چاٹا لیکن مزاحمت نہیں کی۔ اسے اٹھا کر کمرے کے کمرے میں لے گئی۔ پہلے گرم پانی میں تھوڑا سا ڈیول ملا کر سارے زخم کو دھویا۔ عجب بات ہے کہ میں نے اس کے پتھرے رکھا۔ خون دھویا لیکن اس نے ایک بار بھی اعتراض نہ کیا۔ پھر اینٹ خاں نے دوائی کے پھاہے تیار کیے۔

تین سب سے سپورٹ جاری رکھی۔

میں نے تین چار انچ لمبے زخم پر پٹی باندھی اور تعجب اس بات پر کہ نہ وہ کسمایا، نہ غرایا نہ کسی قسم کا ڈر۔ پٹی بندھ گئی تو وہ آرام سے انیق خاں کے پلنگ پر چڑھ کر سو گیا۔ اس طرح کچھ دن پنیاں بدلنے کے بعد ایک دن سارا زخم مندمل ہو چکا تھا۔ محسوس بھی نہ ہوتا کہ کسی پلے نے اپنے دانتوں سے چیر پھاڑ کی ہوگی۔ مشکل یہ آن پڑی کہ سامبا صاحب تندرست ہوئے ادھر انہوں نے رات کی آوارہ گردی جاری کر دی۔ اب خاں صاحب کا چہرہ شکر

ایک دن پریشان باپ کی طرح صبح ناشتے کی میز پر بولے۔ ”رات یہ پھر غائب تھا۔“

”یہ راتوں کو جا گئے والا ہے۔ آوارہ گرد ہے، اسے گھر پر کیسے قید کریں؟“

”اس کا علاج شادی ہے۔“

”شادی۔“

”جب کسی کو قید کرنا ہو، اسے آوارگی سے بچانا ہو تو اس کی شادی کر دینی چاہیے۔ انسان کی ضرورت ہے

ہو جائے تو وہ آوارگی سے بچ جاتا ہے۔“

شادی کا فلسفہ جانوروں پر لاگو ہوتے ہیں نے یہی بار سنا۔

”آپ کا مطلب ہے۔۔۔۔۔“

”اس کے لیے ملی تلاش کریں۔ اس کی نسل کی نہ ملے تو جنگلی سہی۔ زیادہ دیر نہ کریں۔ غصہ اور ضرر

بھولا ہے۔ پھر کسی دن چیر پھاڑ کرا کے آجائے گا۔“

خواہشات میں عجب قسم کی کھینچ ہوتی ہے۔ اگر کبھی کسی کے لیے بے غرض و غایت معصوم اور اچھی

جائے تو نہ جانے وہ کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔ ابھی خاں صاحب لڑکی تلاش کرنے لگے بھی نہ تھے کہ ایک دن

گھر کی دیوار پر ایک سیامی بلی بیٹھی نظر آئی۔ سر ظفر اللہ خاں کی بیٹی مسز اویس ہرے ہمسائے میں رہتی تھیں۔

ہمارے گھر کی دیوار ساٹھی تھی۔

چھوٹی سی بلی اسی دیوار پر بیٹھی آنکھیں سوندھے دھوپ سینک رہی تھی۔ خاں صاحب نے بڑی پرہیز

بڑھایا تو وہ بنا چوں و چرا اُن کے ساتھ آئی۔ سامبا کے ساتھ کوری میں قیمہ ڈال کر دیا تو دونوں یوں کھانے لگے

کا ساتھ ہو۔

نہ جانے یہ آوارہ بلی تھی کہ خاں صاحب کی خواہش مجسم ہو گئی تھی لیکن بلی کامل جانا معجزے سے کم نہ تھا۔

اعتبار سے سیامی، دہلی تلی، نیلی آنکھیں، بادامی بال اور سیاہ کان۔ کچھ حصہ کالا سیاہ بھی تھا۔ غالباً اسی کی رعایت سے

صاحب نے اس کا نام نیرا رکھ دیا۔ اب گھر میں بڑی رونق تھی۔ سامبا صاحب کی بڑی شو ہو گئی۔ جہاں جاتا پھیلتا

کر چلتا۔ پہلے جگہ سو گھٹا، دیکھتا اور پھر نیرا کو وہاں بیٹھنے، لیٹنے، سونے کی اجازت دیتا۔

وہ بھی ایسی کام چور، جاہل آرام طلب تھی کہ جب تک سامبا اس کے قیے کو چیک کر کے پاؤں سے خوب

اُس کی طرف نہ بڑھاتا، مہارانی جی قیے کو منہ نہ لگاتی۔ کالجوں سے واپسی پر بچے ان دونوں میں مشغول ہو جاتے

اب راتوں کو آوارہ گردی کے لیے نہ نکلتا اور دونوں برآمدے میں کھیلتے کودتے، ہنسی خوشی رہنے کے عادی ہو گئے

پھر نیرا خانم نے اٹھلا کر چلنا شروع کر دیا۔ اب وہ پہروں بیٹھی اپنے ناخن چاٹتی رہتی۔ چلتی تو اترا تلی ہوئی۔  
 کچھ نہیں اب اسے پسند نہ تھیں۔ وہ اپنے آپ کو سامبا سے کچھ کچھ بہتر سمجھنے لگی تھی۔ ایسے میں اس کا قیام بھی بڑھا دیا  
 ہے ہر کمرہ میں زچہ بچہ کی جگہ تلاش کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔

پھر عجیب سی بات ہے کہ نیرا سارے گھر میں ڈھونڈتی رہی۔ ہر کونے کھدے میں اس نے آنے والے سیامی  
 کے لیے کنسوئیاں لیں۔ اوپر لائبریری سے لے کر باورچی خانے تک سب طرف ڈھنڈیا ڈالی لیکن  
 نیرا کے نسل خانے کے ساتھ والے ڈریسنگ روم میں میرے پیڑوں والی الماری کو چن لیا۔

یہ الماری بیدروم اور ڈریسنگ روم کے درمیان کھلنے والے دروازے کے پیچھے ہے۔ عجیب سی بات ہے کہ  
 گھر میں یہی ایک دروازہ ہے جس کے پیچھے کسی الماری کا پتہ بھی کھلتا ہے۔ یوں سمجھیے اگر کوئی شخص الماری کھولے  
 تو نیرا روم کا دروازہ کھول کر کوئی دوسرا اندر آنا چاہے تو دروازہ الماری کھولنے والے کو زور سے لگ بھی سکتا ہے۔

گھر والے تو کبھی دستک دے کر اندر آتے لیکن کئی صاحبہ نے اس بے آرامی کا خیال نہ کیا اور الماری میں اس  
 کے پیچھے کیے کہ شیلڈ میں کپڑے نکال کر بھی مشکل ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے روئی کے بادامی گلابی پھا ہے۔ شملواروں  
 کی سوتے۔ انہیں دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔

عجیب سی بات ہے کہ نیرا بھی قیام کھلانے والے کو پہچانتی تھی اور انسانوں کی طرح احسان فراموش نہ تھی۔ میں  
 اسے کھول کر دیکھتی، قیام کھلاتی، جگہ صاف کرتی تو نیرا کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اگر کوئی اجنبی بندہ ذرا سی آہٹ بھی  
 کرے تو نیرا کو کراہنے لگتی۔

میرے بچے بڑے ہو گئے تو انہیں نیرا برا مدے میں لے آئی لیکن سامبا بچوں سے بے نیاز تھا۔ نہ کبھی  
 اسے ان سے کھیلتے دیکھا نہ کبھی وہ ان کے ساتھ ہی چلا۔ اب یہ بہر شکر بس اتنی گھرائی کرتا کہ جدھر بچے کھیلتے اُدھر کمر  
 کے نیچے کس میخار ہوتا۔ ذرا کوئی قریب سے گزرتا تو اس کے پیچھے نکل آتے اور ماتھے پر غصہ آمیز شکن پڑ جاتی۔

نیرا کے بچے بڑے ہی خوبصورت، کھلندرے اور تماش بین قسم کے تھے۔ ذرا سا اخبار کا ٹکڑا، روئی کا گولہ،  
 پتھر کوئی گری پڑی چیز مل جاتی تو چاروں سب کچھ بھول بھال کر اس کے ساتھ کھیل تماشے میں مشغول ہو  
 جاتے۔ آدھے میں میز پر فون پڑا رہتا۔ اس کی تار اوپر جاتی تھی۔ اس پر چڑھنا، لڑھکنا اور گر کر دوبارہ چڑھنا ان کا  
 معمول تھا۔

اب ان بچوں کے دان دکشنا کی باری آئی۔ آہستہ آہستہ ان کو ہم ٹھکانے لگانے کی سوچنے لگے۔ ایک بچہ چھوٹی  
 سی تھی۔ ایک فہیم اچھی لے گیا۔ دو بچے انیق خاں نے کسی دوست کو دلوا دیے۔ نیرا کمروں میں ان کو تلاش کرتی رہی  
 لیکن اس میں موت کے ساتھ سمجھوتہ کرنا اور جیتی جان کی بے وفائی برداشت کرنے کا عجب ملکہ ہوتا ہے۔

بہت جلد جدائی کو زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ نیرا اور سامبا نے بھی جانے والوں کی تلاش میں کچھ  
 نہیں کیا۔ پھر راضی برضا ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد نیرا نے ایک بار پھر بچے دیے۔ ان تین بچوں کو ٹھکانے لگانے  
 کے بعد سم دل میں خوش تھے کہ ایک رات نیرا جہاں سے آئی تھی جس طرح آئی تھی ویسے ہی غائب ہو گئی۔

سامبا پھر اپنی تنہائی اور آوارہ گردی کی نذر ہو گیا۔

ایک صبح سامبا کو دیکھا کہ بے طورے پر قے کیے جا رہا تھا۔ خاں صاحب اسے ڈاکٹر کے پاس لے  
واپس آئے تو سامبا کی طبیعت پہلے سے بھی خراب تھی۔ منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور بار بار وہ غش کی حالت میں  
تھا۔ اسے پریم سے لٹاتے ہوئے خاں صاحب بولے۔ ”ڈاکٹر کہتا ہے اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہے۔“

”کون سی زہریلی چیز؟“

”کوئی مری ہوئی چھپکلی، سانپ۔ پتہ نہیں کیا۔“

جس وقت امینق خاں کالج سے لوٹا، اس نے جلدی جلدی سامبا کو کچھ ہومیو پیتھک پڑیاں چٹائیں لیکن  
کھانے کی ہمت بھی نہ رکھتا تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور جان آفرین  
اپنی جان کر دی۔ آخری لمحہ بھی وہ شیر صفت نہ بیزار ہوانہ بلبلایا۔ موت اسے ساتھ تو لے گئی لیکن پسپا نہ کر سکی۔  
امینق خاں نے گیت کے ساتھ ہی جہاں بعد میں پوسٹ کے لیے لال ڈبہ لگایا گیا، عین اس کے  
کھووا۔ بچوں نے اسے سفید کپڑے میں لپیٹا اور قبر میں ڈال دیا۔ کئی دن اس کی قبر پر پھول نظر آتے رہے۔ جس  
گھر سے نکلتا یا واپس آتا اس کا چہرہ ادھر ضرور ہو جاتا۔

سامبا کے جانے کے بعد خاں صاحب نے بھی گویا جانور پالنے سے توجہ کر لی تھی۔ شہری زندگی  
بوجھل بھی تھی اور تکلیف دہ بھی۔

کوئی بھی جانوروں کو وقت نہ دے سکتا ہے۔ کوالٹی ٹائم سے کسی جاندار کا دل نہیں بھرتا۔ سورج کی روشنی  
درکار ہوتی ہے۔ محبت کی مسلسل یقین دہانی کے بغیر سانس رکنے لگتا ہے۔ دیہاتی زندگی میں کنار یوڈ کے ساتھ  
ہے۔ چرواہا بھی قریب ہی دونوں کی گمرانی کرتا ہے۔ سورج کی روشنی ملتی رہتی ہے نہ کتے کی طرف سے  
چرواہے کی جانب سے اقرار کیا جاتا۔

اب چونکہ زندگی نے فاصلے پیدا کر دیئے ہیں۔ وقت اہم ہو گیا ہے۔ اس لیے کوالٹی ٹائم بھی  
جانور کو میر پر لے جانا اسے پیار کرنا ضروری ہے۔ سارا دن کا ترسا ترسا زیادہ مانگتا ہے۔ دوسری طرف انسان  
سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد اظہار ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ خوشی کے بجائے ذمہ داری کی پھانسی لگ جاتی ہے۔  
صنعتی انقلاب سے پہلے ماں آنگن کی زینت تھی۔ وہیں وہی بلوکی جاتی، چارہ کاٹنے والی مشین جاتی  
پکتیں، بچے آنگن میں کبھی مرغیوں کے پیچھے کبھی بلیوں کے ساتھ کھیلتے۔ پلٹ پلٹ کر ماں کو دیکھ لیتے، شانت  
کھینے لگتے۔ ماں کی مثال دانی کی سی تھی جسے چھونے کے بعد کوئی چور نہ بنتا۔ دانی ہر وقت نگاہ میں تھی۔ گر گئے تو اس کے  
سے لگ کر تسلی حاصل کر لی۔ بھوک لگی کنوڑی میں مکھن، سالن، دہی جو میسر آ یا ڈلوا کر باسی روٹی کے ساتھ کھا لیتا  
خیر سلا۔

کوئی Privacy نہیں، کوئی ذاتی ملکیت کا تصور نہیں۔ گرمیوں میں قطار در قطار چار پائیاں بچھی تھیں  
بچے اکٹھے سو رہے ہیں۔ سیکورٹی اور خوشی بغیر پوچھے مانگے ملتی ہے۔

شاہد خاں صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کے پاس پالتو جانوروں کے لیے نہ وقت ہے نہ استطاعت، نہ  
تین پتھر ایک واقعہ ہوا۔ صبح کے وقت سردیوں کے دن تھے۔ ہم دونوں نے ایک ایک کبیل گاگاؤن سلوالیا  
کرینگ گاؤن کارنگ کیسری ماہل تھا۔ خاں صاحب کا گاؤن چوکیٹ اور بادامی ٹکڑیوں کے تانے بانے

سم دونوں اپنا اپنا ڈیرینگ گاؤن چڑھا کر کمر میں Tassle والی ڈوری باندھ کر سیر کو جایا کرتے۔ عجیب لطف تھا  
لیکن نہ آیا کہ یہ لباس سوزوں نہیں۔ ابھی لباس اور کھانے میں ٹڈل کلاس کے لوگ آزاد تھے۔ وہ کسی کو مرعوب  
تھانے اور حسد دلانے کے لیے لباس کا استعمال نہ کرتے تھے۔ ایک روز ہم سیر سے لوٹے تو ہمیں باہر انیس متشکر  
تھیں پھر چپ چاپ لوٹ گیا۔

تین دنوں اشیرینا پانچویں جماعت میں تھا۔ اسے بخار وقتاً فوقتاً گھیر لیتا۔ یہ بخار کبھی کبھی 106 ڈگری تک پہنچ  
تھا۔ پٹیاں سارے بدن پر کھنی پڑتیں۔ ہماری تشویش تو ایک عرصہ پہلے 75۔ جی میں ہی شروع ہو گئی تھی لیکن ابھی  
تہ ہو پائی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر طوسی، پاری ڈاکٹر جن کا کلینک نکلسن روڈ پر تھا اور میو ہسپتال کے ڈاکٹر اختر  
تھانے لگا دیا گیا۔

ایسی ہی ایک رات جب ہم بیماری فوکسی میں گھر لوٹ رہے تھے تو انیس اور اشیر ہمارے ساتھ تھے۔  
کچھ دیر بعد انیس بولے ”ابو..... چیری کو تو پھر تیز بخار ہے۔“

”آپ کے سامنے ڈاکٹر کو دکھا کر لارہے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مجھے اس فوکسی کی خوشی نہیں ہوتی ابو۔ یہ کسی طرح ٹھیک ہو جائے گا۔“

سب خاموشی سے اتر گئے لیکن مجھے علم ہے کہ انیس کے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔

”داستان سرائے“ میں جب اشیر پانچویں میں تھا تو کچھ ٹسٹ کروانے کے بعد بعد پتہ چلا کہ اشیر بیٹے کے جگر  
Abcess ہے۔ خوف یہ تھا کہ اگر اس کا آپریشن نہ کرایا گیا تو کہیں یہ کینسر میں بدل کر لا علاج نہ ہو جائے۔

مقررہ وقت پر ہم دونوں اشیر کو لے کر میو ہسپتال پہنچے۔ اس آپریشن کے دوران ڈیڈی جی کے بڑے بیٹے ڈاکٹر  
تھانے ہمارے بہت مدد کی۔ اشیر کو آپریشن سے پہلے باہر گیلری میں سسٹرنے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔ میں تھوڑی  
تھانے تھی۔ میں نے بے ہوش اشیر بیٹے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ خاں صاحب کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔

اتنے میں وارڈ قلی باہر نکلے اور اشیر خاں کو تھیمڑ میں لے گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے آنسو ضبط کر رکھے تھے۔  
میں نے جگر (طارق) لکھو نکلا، اس نے پچاسے کہا۔ ”چاچا جی! یہ کوٹ پہن لیں اور اندر چلے آئیں۔“ ہم دونوں ڈاکٹروں  
پہنچ کر اس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے ہمیں مبارکباد دی۔ Abcess کو سرج سے خالی کر دیا گیا تھا۔  
سے ہم خوشی خوشی فارغ ہو کر گھر آئے لیکن بخار کو ساتھ لائے۔

پتہ نہیں Abcess کے کچھ اثرات باقی تھے کہ اس کے لہو میں ایسا کوئی مادہ تھا جو ایسا مواد بناتا تھا جو اس ساری  
بباعت تھا۔ بہر کیف میں نے تو اپنی زندگی سے یہی سیکھا ہے کہ جب اللہ کو انسان کی مدد کرنا مقصود ہوتی ہے تو امداد

نبی معجزے کی شکل میں آتی ہے۔ ایک روز دن چڑھے مجھے اطلاع ملی کہ ڈاکٹر احمد خاں آئے ہیں۔ یہ وہی ڈاکٹر صاحب تھے جو ملتان میں سرکاری زمینوں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے اور جنہوں نے میری والدہ کے ساتھ بھائیوں کا سلسلہ کیا تھا۔ میں باہر گئی۔ ڈاکٹر صاحب برآمدے سے نیچے کھڑے تھے۔

”اندر آ جائیے ڈاکٹر صاحب۔“

”نہیں بیٹا۔ میرا کلینک کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ گھر پر کون بیمار ہے؟“

میں نے اشیر کے متعلق تفصیل سے بات کی۔

”رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی مجھے بتا رہا ہے کہ قدسیہ کے گھر میں خیر نہیں، تم علاج کرو۔“

”کل تم اشیر کو لے کر کلینک آ جانا۔ میں مشین میں اس کا تھوک لگا کر دیکھوں گا اور پھر دوائی بھی درست

جائے گی۔“

ہم نیچے کو لے کر موہنی روڈ ڈاکٹر صاحب کے کلینک پہنچے۔ وہ گویا منتظر بیٹھے تھے۔ ہمیں ذرا انتظار نہ کیا اپنے دفتر میں لے گئے۔

میں نے ایسی کوئی ہومیو پیتھک مشین یا میٹ پہلے نہ دیکھا تھا۔ اس پر گول دائرے میں دوائیوں کے

تھے۔ مریض کا لعاب مشین پر رکھ کر اسے آن کر دیا جاتا۔ جلد ہی ایسے میٹ کے بعد ڈاکٹر احمد خاں نے کہا۔ ”قدسیہ

بگڑا ہوا میٹریا ہے جس سے جگر متاثر ہو گیا ہے۔ چائنا دینا پڑے گا اور وہ بھی باقاعدگی سے۔“

علاج شروع ہو گیا۔ بخار ٹوٹ گیا لیکن اشیر ایک اور مشکل میں پھنس گیا۔ اس کے پرچے اچھے نہ ہوئے

پانچویں جماعت میں رہ گیا۔ اسے اپنی بیماری سے زیادہ نفل ہو جانے کا رخ تھا۔ اس کے بعد اس کا سکول تھری

اسے چھٹی جماعت میں داخل کرایا گیا لیکن پڑھائی میں کمزوری کا دھچکا اس کے ساتھ رہا۔

خاں صاحب کو ریجنس بک سوسائٹی کے سامنے کتابیں بیچنے والے نے ایک نوٹ کا بتایا..... ”خاں صاحب

کبھی کوئی آپ کے گھر میں بیمار پڑ جائے تو کچھ سرنے خرید کر کچھ دن بیچرے میں رکھ کر اڑادیں۔ جب گھر کے کوئی

سرنے پسند آ جائیں تو پھر یہ سرنے آزاد کر دیں۔“

اس روز خاں صاحب نے کتابیں نہ خریدیں بلکہ سرنے خرید کر گھر آ گئے۔ پرندوں سے گہرے تعلق کو

راستہ مل گیا۔ سرنے پالنے اور پھر ان کو راہ فرار دکھاتے وقت سب سے زیادہ رنج اشفاق صاحب کو ہوتا۔ خاں صاحب

اپنی ایک تحریر انیس کے بیٹے بلال کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ اس میں سرخوں سے متعلق ان کے جذبات کا ذکر ہے۔

خاں صاحب کی باتوں سے متاثر ہو کر ٹولید نے بھی ایک سُر خا پال لیا لیکن اس سے بلال خاں کچھ

گیا کہ اسے چھوڑنے کی جرأت ماں باپ نہ کر سکے۔ اس واردات کو خاں صاحب کی تحریر میں پڑھیے۔

سُر خا

زندگی کا مزاج بھی بڑا شاہی مزاج ہے۔ آپ اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس

تھے۔ بارے میں یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ دشنام ملے گی یا خلعت عطا ہوگی۔ رکنے کا عمل ہو گا یا چلنے کا۔ دکھ ہو گا یا

عمل میں زندگی اتنی بڑی ہے کہ اس کے سامنے رخ رحمان، عمل نفل، ارادے تجویزیں اس کی ذیل میں آ جاتی ہیں۔ کسی کی اندھی ہوئی بہان سب کے اوپر سے گزر جاتی ہے۔ یہ واقعہ کوئی ایسا غیر معمولی نہیں اور نہ اس کا زندگی کے حوالے کوئی گہرا تعلق ہے لیکن چونکہ اس نے مجھے حد درجہ متاثر کیا ہے اس لیے میں یہ آپ کو سنانے پر مجبور ہو گیا

یہ بات ہے تو بلاں کی لیکن اس کا پورے انسان سے تعلق ہے۔ مجھ سے، آپ سے، بلاں کے والد سے، اس کی

بہن سے، اس کے ارد گرد بیٹے والے سارے انسانوں سے۔ بلال میرے ہتھکے بیٹے کا بیٹا ہے اور اس نے حال ہی میں سکول جان شروع کیا ہے۔ چونکہ سکول میں اس کے یہ ابتدائی ایام ہیں اور بلال ابھی تک حصولِ علم پر ٹھیک سے نہیں لگا۔ اس لیے ہمیں اسے طرہ طرہ کے حوالے دیے جاتی تھیں۔ دے کر سکول بھیجنا پڑتا ہے۔ سب سے اچھی ترغیب اس کی والدہ کی فراہم کر دے ہے جو اس کی محراب میں پنجرے کے اندر محفوظ پیش کے کندھے سے لٹک رہی ہے۔ یہ ایک سُرخا ہے جو باجرے اور گندم کے پھولے چھوٹے کوزوں کے درمیان پھدکتا رہتا ہے اور صبح سویرے بیدار گھر والوں کو اپنی چپکار بھی سنا تا

بلال کا کام صبح سویرے اٹھ کر اس پنجرے میں انگلی ڈال کر لال کو بیٹھو کہنا ہے۔ پھر آدھے کپڑے بدل کر اس کے سامنے کھڑے ہو کر سیٹی بجانا اور پھر بھاگ کر باقی کے کپڑے پہننا اور آخر میں سکول جاتے ہوئے سُرخے کو حوالے دینا مبارنی سنا کر جانا ہے۔ واپسی پر گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ کے بھاگ کے سُرخے کے پاس جانا۔ اسے تمس کرنا۔ اس کے احوال پوچھنا اور اپنا بچ اٹھا کر اس کے پاس آ کر کھانا اور کوزوں میں چیس اور برگر کے ٹکڑے کھانا بھی شامل ہے۔ بلال جب تک گھر پر ہوتا ہے اس کا سارا وقت سُرخے کے پاس گزرتا ہے اور جب نہیں ہوتا تو سڑک یا دیوار میں گزرتا ہے۔ جہاں جہاں اس کی ماں اسے ساتھ لے جاتی ہے اور جس جس گھر میں بلال پہنچتا ہے، وہاں اسے مریجہ فون کر کے اپنے سُرخے کی عافیت ضرور معلوم کرتا ہے اور فون سننے والے کو سُرخے کے بارے میں ہدایات دیتا ہے۔

ایک روز جب وہ سکول سے آیا تو اس کا سُرخا اپنے پنجرے میں کمر کے بل لیٹا تھا۔ دونوں ناگہیں آسمان کی طرف تکیں اور دونوں پر ادھڑے ہوئے چیتھڑوں کی طرح پنجرے کے فرش سے چمپے تھے۔ بلال نے رورور کر آسمان کی طرف دیکھا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو چپ کرانے کی اہل نہ تھی۔ گھر کے سب لوگ اپنی اپنی طرز کا زور لگا رہے تھے لیکن وہ نہیں ہوتا تھا اور اس کی فریاد تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔

میں نے پہلے اسے اپنے ساتھ لپٹایا، پھر گود میں اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ماحول کی تبدیلی سے فائدہ اٹھانے میں نے یقین آ میز لہجے میں کہا ”دیکھو بلال! اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ سُرخا تمہارا مر گیا۔ اس کا ہم سب کو



افسوس ہے لیکن چلے جانے والے کے لیے یوں تو جان ہلکان نہیں کیا کرتے۔ اللہ نے صبر کا بھی تو حکم دیا ہے اور کچھ عرصے تک حکم ہر حال میں اور ہر رنگ میں تسلیم کرنا ہے۔“

بلال غور سے میرے چہرے کو دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔ ”اب ہم یوں کریں گے کہ تمہارے اس سرخے کا پھندا جنازہ تیار کریں گے اور اسے دھوم دھام سے دفن کریں گے۔“

وہ میری بات اور غور سے سننے لگا تو میں نے کہا ”میرے پاس ایک چھوٹا سا ریشم کا رومال ہے جس کے گوشے زرخس کا پھول بنا ہوا ہے۔ ہم سرخے کو اس ریشمی کفن میں لپیٹیں گے اور تمہاری امی سے بیعت کا وہ خوبصورت ڈبہ لیں گے جو اس کی سنگار میز پر رکھا ہے۔ اس کو ہم سرخے کا تابوت بنا لیں گے۔ اس کے بعد گھر کے سارے لوگ اور تمہارے سارے دوست اور سارے ملازم بڑی دھوم دھام سے یہ جنازہ لے کر سامنے باغ میں جائیں گے۔ وہاں ہم نمک کے تیلے اس کی قبر بنا لیں گے اور سرخے کو دفن کرنے سے پہلے ہم سب مل کر اس کا مرثیہ پڑھیں گے۔ پھر تم لوگ اس کی قبر میں تقریریں کرو گے اور ہم بگل بجا کر اس کا تابوت قبر میں اتاریں گے۔“

بلال نے کہا ”دادا! ہا! ہم اس کو نیم کے بیڑے تھے دفن نہیں کریں گے۔ سہل کے درخت نیچے کریں گے۔ درخت زیادہ خوبصورت ہے اور بہت بڑا ہے۔“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے، سہل کا درخت بہتر رہے گا اور جب ہم اسے دفن کر کے گھر جائیں گے تو یہ بات ہی اس کا سوئمہ کریں گے۔“

بلال نے میری بات کاٹ کر کہا ”سوئمہ اسی دن تھوڑی ہوتا ہے دادا! اب۔۔ وہ تو تیسرے روز ہوتا ہے۔“ میں نے کہا ”ہم اس کا سوئمہ اسی روز اور اسی وقت کریں گے کیونکہ تمہارے دوست روز کیسے آئیں گے۔ بلال نے خوش ہو کر کہا ”بالکل ٹھیک ہے۔“

پھر میں نے کہا ”سرخے کے سوئمہ پر میں تمہارے دوستوں کے لیے آئس کریم اور پیسٹری منگواؤں گا۔“ بلال نے بات کاٹ کر کہا ”اور برگر بھی دادا!۔“

میں نے کہا ”کیوں نہیں برگر بھی۔“ بلال نے کہا ”میرے لیے پائن اپل جوں اور میرے دوستوں کے لیے مینگو جوس۔“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے۔“ اور شام کو ہم میوزیکل چیئرز بھی کھیلیں گے۔“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے اور جب ہم سوئمہ سے فارغ ہو جائیں گے تو میں تم سب کو اپنے ڈبے میں بٹھائے جوائے لینڈ لے جاؤں گا۔“

بلال نے جوش میں آ کر تالی بجائی۔ صوفے سے اٹھ کر تین چار مرتبہ قلمین پرا بھرا اور میرا ہاتھ کھینچنے لگا۔ میں ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ ساتھ والے برآمدے میں کچھ گڑ بڑ بڑ ہوئی اور مجھے مالی کی آواز سنائی۔

دونوں بھاگ کر برآمدے میں گئے تو ہمارے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پنجرے کے اندر ہمارا پیارا سُر خاموت کی آواز

صرف پھنس گئے تھے۔ سائنسی اور عقلی نکتہ نظر لے کر ڈیرے پر آئے تھے۔ قلبی اور وجدانی علم نافع کی نذر ہو گئی۔ یہ عمرہ قول سے وابستہ سننے کے مقام پر ہے۔ پھر ماننے کی صورت حال پیدا ہوئی۔ باہاجی نوروالے فرمایا کرتے تھے: ”صاحب! یہ ہمارے ڈاکٹر اشرف فاضلی بڑے بڑے دل کے آدمی تھے۔ بڑی مشکل سے مانے ہیں۔“

... ان کی صحبت ان کے قول سے فعل تک مطابقت ایک مدت بعد ڈاکٹر فاضلی میں پیدا ہوئی۔ اسی میل جول نے ان کے چلے جانے کے بعد ”تفسیر فاضلی“ کا روپ دھار لیا۔ مجھے فقط اتنی بات اس قیام میں سمجھ میں آئی کہ کسی نہ کسی صورت پر پہلے ملتی ہے، کسب بعد میں ہاتھ لگتا ہے۔ ہر ڈاکٹر ایک مدت پڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر مر بیٹوں تک اس کی خدمت میں آتا ہے۔

ستار، لوہار، کسان، صنعت و حرفت کے تمام شعبے، فنونِ لطیفہ کے سارے امکانات کبھی اعلانیہ، کبھی گپ چپ، کبھی سے کبھی نظر خانہ سے زیرِ تریبیت رہتے ہیں۔ پھر ان کی پریکٹس شروع ہوتی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ کئی روکاوڑی کو مختلف طبقوں، ترقیوں اور جموں سے تشکیلیں دیتے رہتا ہے۔ خاں صاحب کو بھی علم نہ ہو سکا۔ ان کے ڈیرے سے نوکر و اصف بن و اصف، سخی رازی اور کئی دوسرے ہائے نہیں زاویے کے لیے تیار کرتے تھے۔ ان کے مٹا دے نے کہا بیوں کا دستور ہاؤس، Anecdotes کی انتھالوجی، واقعاتی مواد، Archives کی شکل میں محفوظ تھا لیکن انہیں علم نافع بنانے کا سارا دم اور تربیت انہیں باؤں سے ہی نصیب ہوئی۔ تربیت، عادت اور سائنس کرنے میں ایک مدت لگتی ہے۔

یہ خاں صاحب کی اس وقت کی حالت کا بیان ہے جب ابتدائی دور پنڈولم کا سفر تھا۔ کبھی خاں صاحب شانت تھے کبھی عجیب قسم کے تذبذب میں چلے جاتے جیسے وہ ہر وقت موجود اور ناموجود کے درمیان رہتے۔ کبھی انہیں شبہ تھا کہ وہ کبھی پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ خواب ہے۔ وہ جاگیں گے تو شعوری زندگی پھر باسعی ہو جائے گی۔ کبھی سوچتے تھے کہ وہ اصل ہو چکے ہیں۔ ان دنوں اردو سائنس بورڈ میں بہت کام ہو رہا تھا۔ دھڑا دھڑ کتابیں ترجمہ، تالیف اور تصدیق میں تھیں۔

ان کا دفتر، فائلیں، میٹنگیں، دفتر سے لانے لے جانے والی کار کے پھیرے، کار کا دروازہ کھولنے والے پھیرے، پھر پورچ سے دفتر کی کرسی تک پہنچانے والے افسر کی اہمیت دکانے والے کلرک، بیکر ٹری، سپرنٹنڈنٹ، کونسلر، والی انفری، دفتری کائنات کے چھوٹے بڑے پرزے بے وقعت نہیں تھے۔ یہ سارے ایک بڑی مشینری کے حصے تھے۔

ساری مشغولیت میں خاں صاحب کا اپنا وجود، ان کا اندازِ نشست و برخاست، بھگم دوڑ، چھوٹی چھوٹی شکلیاں، تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی تنگ دود۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ اندر کی بات بتانے کے قائل نہ تھے۔ سادہ سادہ، ناراضگی، جیرانگی، بددلی، بے دلی انہوں نے دل کے لا کر میں بند کر رکھی تھی۔ دفتری تنگ دود اور اس کے پھیرے میرے خیال میں واضح طور پر ان کے لیے انجانا کا اسباب پیدا کر رہے تھے۔ مجھے فکر رہنے لگی کہ پھرے پر کسی بیماری کی چھاپ بھی واضح تھی۔

دراصل ڈیرے سے میری وابستگی عفت کی وجہ سے ہوئی۔

شہاب صاحب کا خاں صاحب سے ملنا جتنا میری شادی سے پہلے کا تھا۔ سن پچاس سے پہلے ہی شہاب صاحب نے مزنگ روڈ میں آیا کرتے تھے۔ وہ مفتی جی کی طرح خاں صاحب کے پاس تو نہ ٹھہرتے لیکن اس تاریخی چوہدری کے ان کا پھیرا ضرور ہوتا۔ یہاں جدت پسند، شتو جی نے مٹی کے مٹکے میں پیتل کی ٹوٹی فٹ کر رکھی تھی اور اسی میں پانی کرتے تھے۔

شہاب صاحب اسی ٹوٹی ٹوکھوں کر ہاتھ دھوتے، کافی کے رسیا خاں صاحب کیوینٹر میں کافی بنا تے۔ دوست مزے سے فرش پر بچھی چٹائی یا فرش بستر پر بیٹھ جاتے اور کافی کی چسکیاں لگاتے۔ تکلفات دراصل تعلقات حجاب بن جاتے ہیں۔ جب درمیان میں یہ حجابات نہ ہوں تو کسی کی اصنیت تک پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ ان دونوں میں ایک دوسرے پر چڑھے پرت اٹارنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ دونوں جلد سمجھ گئے کہ دونوں کے مزاج میں کتنا مماثلت ہے جس پر واضح طور پر انگلی نہیں رکھی جاسکتی۔

خاں صاحب کو مفتی جی نیچے پہنچ کر آوازیں دیا کرتے تھے اور اپنی آمد کا ڈنکا بجاتے تھے۔ شہاب صاحب کبھی آواز دی نہ کسی کے ہاتھ اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وہ کسی راہب کی طرح ہولے ہولے اوپر چڑھتے۔ اشفاق صاحب بھی نہ اٹھتے نہ سلام کا نعرہ لگاتے۔ دونوں طرف سے مدہم آوازیں میں سلام اور سلامتی کا پیغام پہنچتا۔ دونوں ہنسنے گفتگو جاری رہتی۔ پھر بلا تکلف شہاب بھائی اٹھ کر چلے جاتے۔ خاں صاحب کبھی انہیں نیچے تک الوداع کہنے نہ دیتے۔ شہاب صاحب نے کبھی ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ ان کے رویے میں یہ دونوں باتیں پنہاں تھیں۔

1- مزنگ روڈ کے اشفاق چوہدرے میں کوئی صوف کا ڈوچ نہیں تھا۔ پھر بھی ملنے والوں کی ریل جیل دیال سنگھ میں ان سے پڑھنے والے طلب علم، ساتھ پڑھانے والے پروفیسر جن میں جناب غلام علی خاص طور پر ہیں۔ ریڈیو سیشن کے آرٹسٹ، کافی ہاؤس کے ملاقاتی ادیب آتے رہتے۔

جب کوئی ملنے والا اپنی نینک، رونا ل یا چاہیاں اوپر بھول جاتا تو نیچے پہنچ کر خاں صاحب کو آواز دیتا۔ صاحب متعاندہ چیز لے کر نیچے نہ جاتے۔ کونٹھے سے چیز کو پھینک دیتے اور متعلقہ چیز مالک بڑی اچھی فیلڈنگ دیتے ہوئے نیچے کر لیتا۔

جب ہم 479-480 میں شفٹ ہوئے تو ہمارے حساب سے یہ گھر کافی کھلا ڈالا تھا۔ اس میں مہمان رکھنے تھی۔ شہاب آتے جاتے رہے لیکن طعام کے علاوہ انہوں نے کبھی قیام نہ کیا۔ اس گھر میں عفت کبھی کبھی ساتھ آتی لیکن وہ ان دنوں اپنی بڑی بہن جمیلہ اور کبھی اپنی چھوٹی بہن کشور حبیب کے پاس رہتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ اور حسن کے بدولت انسانی مدافعت کی سرحدیں توڑنے کی عادی تھی۔

خاں صاحب کی طرح اس میں کھل جاسم سم قسم کا جادو تھا۔ وہ جلد ہی ملنے والے کو ease at کرواتی۔ موڑوں پر بیٹھ کر وہ ہمارے ساتھ باورچی خانے میں آلوکی پوریاں، تازہ تازہ پھلکے، سادہ ساکن یوں کھاتی گویا مسکراتے ہو۔ جب صدر ایوب کا دور دورہ تھا۔ ان دنوں شہاب صاحب کی جھڑل بجی خاں سے ان بن ہو گئی اور انہیں ایسے

تھی۔ اس لیے 75۔ جی اور 36۔ جی میں ان سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

جب 121۔ سی میں ہمارا قیام ہوا تو شہاب صاحب واپس اسلام آباد آ چکے تھے۔ عموماً وہ داستان سرائے میں رہتے اور کاسنی کمرے میں ہی ٹھہرتے۔ میری ان سے ملاقاتیں سرسری تھیں۔ ناشتے کی میز پر وہ شوق سے پراٹھے کھاتے۔ پھر خاں صاحب کے ساتھ دفتر روانہ ہو جاتے۔

تقدیر! میں اشفاق کے دفتر میں اوپر والے کمرے میں بیٹھ کر خط لکھ لیتا ہوں۔ اخبار بھی توجہ سے پڑھی جاتی ہے۔ پھر پوٹ اور اشفاق علی خاں سے ملاقات کا سبب بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی عفت بھی ساتھ ہوتی لیکن ان دنوں عفت کمرے پاس نہ ٹھہرتی۔ دو شہاب صاحب کے بڑے بھائی کی بیٹی شریا شہاب کے گھر قیام کرتی۔

میں عفت اور شہاب صاحب کے اندرونی حالات سے واقف نہ تھی۔ عفت کب لندن میں اپنے بھتیجے ڈاکٹر کے پاس بیمار ہو کر پہنچی اور کب چارہی اسلام آباد واپس آئی۔ مجھ اتنی خبر نہ تھی کہ عفت کے مُردے جواب دہے اور سوزوڈاکٹروں نے ناک ٹوئیں، مارکر کئی نتائج نکالے۔ کسی نے کہا دماغ کا کوئی Gland فنکشن نہیں کر رہا۔

تھکی بڑی میں نقص نظر آیا۔

آخر آخر میں پیسلسٹ کے ایک گروپ نے حتمی فیصلہ سنایا کہ سارا عذاب گردوں کا ہے۔ انہوں نے کام کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹروں کے نزدیک یہ مرض نا علاج تھا۔ نینٹے میں ایک ون اس کا Dialysis ہوتا تھا۔ اسے ہسپتال میں رکھا۔ وہاں پانی کی بوتلیں اسی طرح لگائی جاتیں جیسے عام طور پر ہونکی بوتلیں لگتی ہیں۔ گردے دھوئے جاتے، یورک دیا جاتا۔ ان آلائشوں کے نکل جانے کے بعد ہفت بھر شائق رہتی۔ پھر وہی Dialysis دہرایا۔ عفت کئی سالوں سے ڈاکٹروں کا چوبانی رہی جس پر تجربہ بات کیے جاتے ہیں۔

ہر جسم کی بلڈ رپورٹ

ہر جسم کا ایکس رے

ہر طرح کی کیس ہسٹری

اور ان سب کے بعد ایک بڑا سا سوالیہ نشان۔ ابراہام کا دائرہ... سائنس کی بیچارگی۔ انسان کا سائنسی علم اپنے آپ کو Precision کے باوجود کتنا محدود اور مجبور تھا۔ کچھ بھی حتمی نہ تھا۔ جو تھیوری آج جوان ہوتی... نئے نئے تجربے کے ہاتھوں کچھ عرصہ بعد ٹوٹی ہوئی بیساکھی بن جاتی ہے۔ پہلے ماں کا دودھ چھڑا کر بچوں کو بوتل پر لگایا گیا۔ پھر نئے ثابت کیا کہ ماں کے دودھ میں کچھ ایسے اجزا ہوتے ہیں جن سے بچہ بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ دوبارہ بچے کو

کے سینے سے لگا کر دودھ پلانے کی تحریک جاری ہوگئی۔ انسان کیا مانے اور کہاں تک مانے؟

کیا خدا اور سائنس میں مقابلہ تھا کہ مغابمت... کیا یہ دونوں رقیب تھے کہ جنم؟ سائنس تو پھر نظر آتی تھی لیکن

تھے خدا کو انسان کیسے مان لے؟

کیا ضعیف الاعتقادی جہاں سے شروع ہوتی ہے وہاں سے ایک نئے علم کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگ جو

کہتے ہیں کس Frequency پر کون سی web-site پر انفرمیشن لیتے ہیں۔ اوپر والے بڑے کل کے علم میں کتنے

ان جانے جزو تھے جن تک ہماری رسائی ان ہی بابوں کے وسیلوں سے ممکن ہے یا ایسے تھے کہ باہر بھی روحانیت کے  
میں ٹاک ٹوئیاں مار رہے تھے؟

ایک روز خاں صاحب شہاب بھائی کو ایئر پورٹ سے سیدھا ہمارے گھر لے آئے۔ عفت ہمیشہ خوش نشہ  
ملتی رہی تھی۔ اس بار بھی اس نے بہادری کا مظاہرہ کیا لیکن ڈیڑھ گھنٹہ اونچے برآمدے تک دو چڑھ نہ سکی۔ میں نے عفت  
اٹھا کر برآمدے میں کھڑا کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گو یا کسی دس بارو برس کی بچی کو اٹھا کر کھڑا کیا ہو۔ ان کا وزن بہت کم  
تھا۔ رنگ بدی مائل، ناک کا پانسہ ذرا سا نیڑھا، آنکھیں اندر کو دھکی ہوئی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اس نے ”اے اے اے“  
میں نے اپنے اندر چھپی ہوئی قد سیدہ کو باہر نکالا۔ ہم گلے ملیں لیکن اس کی چہمیں میں زور نہ تھا، آواز میں ترانہ نہ گونج  
تانا، نا تو تم تو مہین کر کھلتا رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایسے ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اس بار عفت بھی اپنے اندر گھس گھس  
”میں اب تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی عفت۔ نہ جیلہ کے پاس نہ کشور کے پاس۔ تمہاری بہنیں  
جاؤں، مجھے پروا نہیں۔“

”اور اقبال شہاب کے پاس وہاں تو جانے دوں گی؟“ اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

”کبھی نہیں... اور کہیں نہیں۔“

”عفت ہمارے پاس رہے گی قہر۔ اسے بابا جی نوروالوں کے پاس لے جانا ہے۔“

میں نے خاں صاحب کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے عفت کی بیماری کا مسجدگی سے کوئی علم نہ تھا۔  
صاحب نے وضاحت کی نہ خاں صاحب نے کوئی انفرمیشن فیڈ کی۔ شہاب صاحب دو چار دن کا سنی کمرے میں  
پھر اسلام آباد چلے گئے۔ عفت ہمارے پاس رہ گئی۔ وہ سارا دن کا سنی کمرے میں گزارتی لیکن جو نمبی بچے آجائے  
کے کمرے میں چلی جاتی۔ کبھی نوکی میاں کو کیمسٹری پڑھاتی، کبھی لے لے سے باتیں کرتی، کبھی چیری کو ساتھ لٹا لٹتی۔  
وہ میرے بیڈروم میں شاذ ہی آتی تھی۔ بس ہم دونوں برآمدے میں دھڑی مشین کے آس پاس باور  
میں، لان میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ اس نے کبھی اپنی بیماری کی تفصیلات، اپنی نکالیف کا کچا چٹھا بیان نہ کیا۔ اس  
دوران خاں صاحب مجھے اور عفت کو بابا جی نوروالے کے پاس لے گئے۔

جس روز ہمیں ڈیرے پاک پر جانا تھا خاں صاحب باورچی خانے میں تشریف لائے۔ گیارہ بجے کا  
دونوں بچے اپنی اپنی سائیکل پر سکول جا چکے تھے۔ گھر معمول کے مطابق پرسکون تھا۔ عفت پوری تیار خاں صاحب  
پچھلے سے جھانک رہی تھی۔ خاں صاحب نے کہا: ”قد سید! اب کام جیونی رمضان پر چھوڑو، ہم ڈیرہ پاک جا رہے  
جب خاں صاحب عفت اور مجھے لے کر پہنچے تو اس وقت سدا سہا گئیں ڈیرے کے باورچی خانے کے  
ناچ رہی تھیں۔ یہ مرد حضرات کی ایسی ملاستی ٹولی تھی جو عورتوں کے لباس میں ملبوس بڑی بڑی ہتھ ناک میں ڈالے  
نکالے اپنے روٹھے یار کو ناچ ناچ کر منانے میں مشغول تھیں۔ خاں صاحب کو اس وقت علم نہ تھا کہ عفت کا علان ڈیرہ  
کیسے ممکن ہوگا۔

اس کی Mechanics کیا ہوگی۔ علاج بالغذا کا کیا طریقہ ہے اور کس طرح اس کے کوائف پر

کے بہت بعد میں عفت نے مجھے بتایا کہ وہ اس وقت سدا سہا گنوں کو ناپتے دیکھ کر ڈیرے کے علاج بالغذا سے مایوس ہو چکی تھیں پتہ نہیں کیوں وہ لوٹ نہ سکی اور اپنے آپ کو باباجی کے حوالے کر دیا۔

حسب معمول ڈیرے پر لوگوں کی بھینٹری تھی۔ چھوٹی سی پٹری پر لوگ آ جا رہے تھے۔ بائیں ہاتھ کچھ لوگ مٹی کے برتن لیے وضو کر رہے تھے۔ باباجی اپنے تخت پوش پر بیٹھے تھے۔ سہا گنوں کا طائفہ جو حضرت میاں میر کے عرس پر پہنچنے دینے آیا تھا، وہاں سے باباجی کاسن کر ادھر آ نکلا۔

سب نے عورتوں جیسے رنگدار بھڑکیلے لباس پہن رکھے تھے۔ سر پر خوبصورت دوپٹے تھے۔ چہروں پر داڑھیوں جیسے ہردوں کے ناک بھی چھدے ہوئے تھے اور چھوٹی بڑی نشتیاں چہرے پر لگی تھیں۔ ان کے ناپنے کے انداز میں کئی گفتگو، بے حیائی یا دلنوازی نہ تھی۔ وہ منٹ طائفوں کی یاد بھی نہ دلاتے تھے جو شادی بیاہ کے موقع پر ”جیوے“ جیسے سہرے گانے کے لیے ذوقی تانے کے ساتھ آ جایا کرتے ہیں۔

ڈھول کا ارتعاش، سدا سہا گنوں کے گھنگھروؤں کی آواز نضا میں جادوئی ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ سدا سہا گنیں جیہذا ملامتیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ اپنی انا کی مہم کوٹ کوٹ کر چھوٹی کر رہے تھے۔ جوان تو انامرد عورت کی سی تھی فردوسی اور بے بسی سے یارکمن نے بس مصروف تھے۔ انہیں یہ علم بھی نہ تھا کہ انہیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ عفت نے بابا جی کے قریب ہو کر پوچھا۔ ”باباجی اس کا فائدہ؟“

خاں صاحب غالباً باباجی سے عفت کی بیماری کا ذکر کر چکے تھے۔ آہستہ سے یاد دہانی کے طور پر بولے۔

”باباجی یہ ڈاکٹر عفت ہیں۔ شہاب صاحب کی بیگم صاحبہ۔“

”چلو چلو پتہ..... ان کو نیچے لے چلو۔ سب خیراں ہیں۔ بیٹا سستے خیراں۔“

پہلی نظر میں ہی باباجی نے عفت کو مکمل طور پر اپنا لیا۔ اتنی دیر ہالینڈ، لندن میں رہنے والی ڈاکٹر عفت اندر ہی اندر سوچ رہی تھی کہ میرے علم میں تو ایسے لوگوں کا نہیں ذکر نہیں۔ کیا واقعی یہ سب جہالت ہے۔ کیا انسانی روح کی کوئی ایسی جہت ہے جہاں دنیاوی علم بیکار ہو جاتا ہے؟ کتاب کا علم گفت و شنید کا علم..... تجربات کا علم۔

بابا جلال ہمیں تہہ خانے والی کونھری میں لے گیا۔ یہ نشیبی کرہ کچی اینٹوں سے بنا تھا۔ اس کی چھت پر پرانے بے نور پھوس کی چھت تھی۔ طاقتوں میں باسی ہارا اور تیل سے سنے دھوئیں سے میلے دیئے تھے۔

فرش پر عفت کچھی تھی اور پشت ٹیکنے والی دیوار پر سر کندوں کی چھتیں تھیں۔ عفت کے چہرے پر تھکاہٹ تھی اور جوت کی حس اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ غالباً وہ اپنی روشن خیالی اور تعلیم کے پیش نظر بڑے شہات میں گھری ہوئی تھی۔

آہستہ سے عفت بولی ”انسان اپنی مشکلات کے سامنے کتنا بے بس ہے؟ ہم اپنی ضروریات کے سامنے کیا کیا سمجھتے نہیں کر لیتے۔ میں نے اپنی صحت کی خاطر وہ سائنسی نظریات بھی چھوڑ دیئے جن پر میرا اگلی اعتماد تھا۔ میں نے بھی اپنے نعیم کے ناطے کیسے کیسے لات و منات پال رکھے تھے؟ کیا وہ بت چھوٹے تھے اشفاق بھائی! کہ میری ضرورت کی بے بسی تھی کہ اس کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

پھر وہ گاؤں کے سہارا لے کر قریب انیم دراز حالت میں بیٹھ گئی۔

خاموشی کا ایک لمبا وقفہ کوٹھڑی میں ابا بیل کی طرح چکر لگانے لگا۔

”اشفاق بھائی... میں نے رات باباجی کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے بتانے لگے، آپ کو پتہ نہیں ہے

سمجھانا بھی آئے گا کہ نہیں۔“

”ہاں ہاں ٹرائے کرو... میں زیادہ کون نہیں ہیں۔“ خاں صاحب بولے۔

”باباجی نے میرے خواب میں فرمایا۔ مجھے... یوں لگتا ہے کہ سارا انگلستان بالآخر بند ہو جائے گا۔

ہرے رانا ہرے کرشنا کی صدا کہیں گونجیں گی۔ ہر حرف کھڑتا لیس بھیں گی۔ تھنیوں کی صدا کہیں آئیں گی۔ گر جا گھر

میں بدل جائیں گے۔ سفید موٹے ہاں منڈوا کر لمبی لمبی بو دیاں پال کر گئے میں جینووا بن کر قشتے کھینچے کھڑتا لیس

وان دکھنا مانتے پھریں گے۔ لندن کے گھروں میں گھر گھر گائے بندھی ہوگی۔ انگریز لڑکیاں کیمری ساز ہیاں پہنے

میں دیپ لیے بڑے بڑے رُجوں کی طرف جائیں گی۔ جہاں حضرت عیسیٰ کی بھی مورتی بن جائے گی۔ وہاں آرتی

جائے گی۔ بگن گائے جائیں گے۔ بس خواب واقعا ہے لیکن مجھ میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔“

خاں صاحب مسکرائے... ”تبدیلی تو آتی رہتی ہے عفت۔ تبدیلی ارتقاء کا ایک ضروری عنصر ہے۔“

”تبدیلی پتہ نہیں کیوں آتی ہے اشفاق بھائی؟“ عفت ایسی فلسفیانہ باتیں کرنے کی عادی نہ تھی۔ پتہ

نشینی کنیا کا اثر تھا کہ سدا سہائوں نے سوچ کی کوئی رنگ پچکاری فضا میں چھوڑ دی تھی۔

”پتہ ہے اشفاق بھائی! عموماً تبدیلی نفرت سے جنم لیتی ہے۔ جب کسی انسان، معاشرے، کسی رہنما

اعتقاد سے نفرت کی جاتی ہے تو یہی نفرت ہمارا مقدر ہو جاتی ہے۔ اس نفرت کی یہ سزا ہے کہ ہم میں بڑی تبدیلی

ہم جس انسان، معاشرے، منسلک سے نفرت کرتے ہیں، اسی میں ڈھل جائیں۔ نفرت کی سزا ہمیں اسی طرح لیتی ہے

سرتا پانچم اس بیسے ہو جاتے ہیں جس سے ہم نفرت کرتے ہیں۔ میں سوچتی رہی ہوں کہ انگریز جب شروع شروع

ہندوستان میں آئے اور ہندو دھرم کے مرتکب ہوئے تھے، ان کی بت پرستی، رسم و رواج سے چڑتے تھے۔ مجھے

شہاب نے کہا تھا کہ اشرف علی تھانوی کہا کرتے تھے کسی کا منسلک چھیڑو نہیں اور اپنا منسلک چھوڑو نہیں۔ یہ

Liberalism ہے۔ اللہ ہماری نفرتوں کی سزا اسی طرح دیا کرتا ہے۔ ہمیں نفرت سے محبت کرنے کی یہی سزا ملتی ہے

تبدیلی اسی طرح آتی ہے۔“

عفت ہم سے بات نہیں کر رہی تھی۔ وہ خود کھڑی میں مشغول تھی۔ وہ یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ

ڈیرے جیسی جگہ سے کیسی نفرت تھی، وہی نفرت اب محبت میں بدل رہی تھی۔

اور شاید امریکہ میں بالآخر اسلام ہی حاوی ہو جائے گا۔ شاید سفید فام فرقوں کو ان کی اس نفرت کی سزا

رہے گی جو وہ مسلمانوں سے کرتے ہیں۔ میں نے سوچا۔

عیسائیت جو محبت کا پرچار کرتی ہے۔ اس کے پیروکاروں نے جس قدر نفرت سیاہ فام لوگوں سے کی ہے

ساری دنیا جانتی ہے... حضرت بلالؓ ہر طرح کا ظلم و تشدد برداشت کرتے رہے ہیں۔ کیا جنگل کا نئے والے

بنانے والے، امریکہ کو موسیقی سکھانے والوں سیاہ فام افریقی لوگوں سے نفرت کا بدلہ نہ لیا جائے گا؟

کیا جو اس قسم کی لاشیٰ مئیے بغیر، عقل کی بیساکھی چھوڑ کر اللہ کا تجربہ کیا جاسکتا ہے؟  
اس وقت بابا جلال داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خیری روٹیوں سے لدا چھابا کنوروں میں شلغم کا شوربہ تھا۔ اس  
نے قرینے سے سب کچھ لگا دیا۔

”کھاؤ باباجی..... بسم اللہ کرو، دیکھو حال پر کیا عطا ہو رہا ہے۔“ بابا جلال نے پرتپاک لہجے میں کہا۔  
خان صاحب نے باجوں و چراکھانا شروع کر دیا۔ اس وقت امریکن نژاد شمس اندر آیا۔ وہ ہم سے کچھ دور بیٹھ  
نے لگا۔ اس کے آگے کتورہ اور روٹی رکھ دی اور وہ نہ موٹی سے کھانے لگا۔ شمس نے سفید شلواری قمیض پہن رکھی تھی  
کے دراز قد پر بہت سچ رہی تھی۔ اس کے پیروں میں کھڑاویں اور گٹے میں گیندے کا پار تھا۔ عفت کو پہلے ہی دن سدا  
کے بعد دوسرا چوکاشس کا لگا۔

”اس وقت تو میں شوربہ روٹی نہیں کھا سکتی پلیر، ابھی تو ناشتہ کیا ہے۔“ بابا جلال کے پیش نظر عفت نے انگریزی  
صاحب سے کہا۔

”نعمتوں میں سے کچھ اٹھا لینا چاہیے ورنہ کفران نعمت ہوتا ہے۔“ خان صاحب نے انگریزی میں عفت سے  
کہا۔

”کھاؤ جی کھاؤ، بسم اللہ۔“ بابا جلال نے پھر کہا۔  
بابا جلال سکون بھری مسکراہٹ کے ساتھ قرینے سے چیزیں لگانے میں مصروف تھا۔  
”آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ اتنے سارے ٹوٹے جاتے ہیں۔ بڑی مصیبت ہے۔“ عفت نے  
کہا۔

”ناں بیٹاجی مصیبت نہیں۔ ہمارے باباجی نوروانے فرماتے ہیں۔ نماز کی قضا ہے پر خدمت کی کوئی قضا  
ہم تینوں کو انگریزی بولتے دیکھ کر شمس ہری طرف متوجہ ہو گیا۔

کھانا کھانے کے بعد لال چائے آگئی۔ کیکر کی چھال کی سوندھی سوندھی خوشبو کے ساتھ کمرہ منگنے لگا۔  
بابا جلال اپنی خدمت کے دوران باباجی نوروانے کے ذریعے احوال بیان کرتا رہا۔ ہماری تواضع میں طعام بھی تھا  
تھا۔ شمس اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا..... ”میں قاری بھی سمجھ لیتا ہوں اور بول بھی لیتا ہوں لیکن اردو اور پنجابی ابھی  
میں کی نہیں اور صوفیائے کرام کا جو خزانہ اس دھرتی میں دفن ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔“  
شمس دہلا پتلا دراز قد امریکن تھا۔ اس کے مسلمان ہونے کی داستان بھی بڑی دلچسپ تھی۔ وہ تونیا میں رہا۔  
سین اولیا کے مزار پر بھی حاضری دیتا رہا لیکن نوروالوں کے ڈیرے پر آ کر وہ مسلمان ہو گیا۔

”میں یہاں آیا کرتا تھا۔ باباجی بس ایک ہی بات پر زور دیتے تھے کہ میل جول رکھو۔ باباجی کبھی قول سے مجھے  
شمس کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے بھئی مثال دیکھ کر ڈیرے کی زندگی میں رچ بس کر خود ہی کچھ تبدیلیاں آجائیں گی۔ صوفیا  
شمس نہیں کرتے، متاثر کرتے ہیں۔ جس روز میں نے مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی تو باباجی فرط جذبات سے مغلوب



ہو گئے۔ گویا اپنی حیثیت سے بڑھ کر اعزاز ان پر تھوپا گیا ہو۔ باباجی نے دونوں بازو اٹھا کر فرمایا، ”ناں جانی جان۔۔۔۔۔۔ بھائی ناں۔۔۔۔۔۔ یہ بڑا کام ہے۔۔۔۔۔۔ یہ مسجد میں ہوگا۔۔۔۔۔۔ ہم مجذوب لوگ۔ یہاں یہ کام نہیں ہوتا۔“ ڈاکٹر اشرف فاضل نے کہا۔  
 گیا۔ شمس کا Jenkins امریکن نام بدل کر باباجی نے وضو کرایا اور شمس کو مسجد بھیج دیا جہاں مولوی صاحب نے اسے مشیت بہ اسلام کیا۔

شمس امریکی انگریزی بولتا بولتا چپ ہو گیا۔ جب بھی وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بات کرتا اس کی گونج بھئی کی لوئیس سرخا سرخ ہو جاتی۔ سبزی ماہل نیلی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔ جب بھی وہ اندر کے احساسات کی بات کرتا اس کی آنکھیں، ہونٹ، نتھنے تا ثیر میں بھیک بھیک جاتے اور یوں لگتا کہ اس کی گفتگو دراصل اس کی آنکھوں کی آواز ہے اور ہونٹوں میں تھکیل پارہی ہے۔ عفت نے ابھی تک کھانے کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔  
 ”کھائیے۔۔۔ شاید میں نکل ہوا ہوں۔“ شمس نے اصرار کیا۔  
 ”جی مجھے بھوک نہیں۔“ عفت بولی۔

عفت نے پنجابی میں خاں صاحب سے کہا۔ ”کل رات اشفاق! بھائی زیرو کا بلب میرے کمرے میں بج رہا تھا۔ سارے کمرے میں کاسنی روشنی پھیلی تھی۔ باباجی کے بعد یہ شمس بھی میرے کمرے میں آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح براڈ لاف میں ایک لڑکی نے اس کے سینے پر ملے مار کر کہا تھا کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جس پر توجہ دینی چاہیے۔ جس نبی نے اتنی ازواج کا دل توڑا ہو۔۔۔۔۔۔ جہاد بھی کیے ہوں۔۔۔۔۔۔ اتنا سخت پروگرام دنیا کو پیش کیا ہو تم اس کو مستحق سمجھتے ہو۔“

شمس نے برجی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا کہ میرے لیے اپنے سے مخالف رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ بھی سمجھنا ضروری ہے۔ Ideas are not for ever۔ یہ شمس کل رات میرے کمرے میں آیا تھا۔ اشفاق بھائی نے مجھ سے یہ ساری باتیں کی تھیں جو اب یہ کر رہا ہے۔ پتہ نہیں خواب تھا کہ۔۔۔۔۔۔ کیا۔“  
 خاں صاحب نے بولے سے کہا۔ ”خواب بھی عجب شے ہے عفت۔ کبھی کبھی روئے صادق بھی نصیب ہوتی جاتی ہے۔ یہ سچھ اور طرح کے معاملات ہیں۔ انہیں سائنسی، منطقی، تجزیاتی یا تجرباتی انداز میں سمجھا نہیں جاسکتا۔ ابھی تک کا علم ناپختہ اور تھکیل ہے۔“

یکدم شمس نے کہا ”آپ کچھ میرے متعلق بات کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ زبان کا بھی عجب حجاب ہے۔“  
 ہمارے درمیان کئی قسم کے حجابات تھے۔ نسل، رنگ، جغرافیائی فاصلے، ثقافتی بعد، رسم و رواج، رہن سہن۔ لیکن ان پردوں کے باوجود شمس اپنا ہونے کا احساس دے رہا تھا۔

”کل رات میں نے آپ کا خواب دیکھا۔۔۔۔۔۔ ہو بہو یہی باتیں۔۔۔۔۔۔ براڈ لاف کا ذکر۔“  
 اس نے ابرو اٹھائے۔۔۔۔۔۔ ”واقعی میں براڈ لاف سے آیا ہوں۔ میں آپ سے پہلے کبھی نہیں ملا لیکن مجھے لگتا ہے جیسے میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔“  
 ”لیکن میرا خواب تو ہو بہو۔۔۔۔۔۔“

شمس نے بڑے عالمانہ انداز میں کہا..... ”جب نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس وقت حواسِ خمسہ ظاہری طور پر تعطل ہو جاتے ہیں۔ جو سنی، ناسوتی دھواں دن بھر انسان کے گرد رہتا ہے، پھٹنے لگتا ہے۔ ہر انسان مسافر ہے اور جسم کے نچرے سے نکلنے کی خواہش رکھتا ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہو اور انسان آزاد ہو جانے کی شدید خواہش بھی رکھتا ہو تو یہ حالت نچرے میں اور بسا اوقات انکشافات ہونے لگتے ہیں۔“ بڑی آسانی اور روانی سے وہ انگریزی میں سمجھاتا گیا۔

”یعنی ہر خواب انکشافات کا درجہ رکھتا ہے شمس؟“ میں نے نا سمجھوں کی طرح سوال کیا۔

”یہ آپ کی خواہش پر منحصر ہے۔ آزادی طلب روجوں کے عجایبات جب اٹھ جائیں تو جن امور کو وہ خواب میں دیکھتے ہیں، جاننے پر انہیں نہیں بھولتا اور اگر خواہش کمزور ہو تو قوت بدر کہ جائے پر خواب کو منتشر کر دیتی ہے۔“ شمس نے ہنس بولنا۔

”اور یہ رویائے صادقہ کیا چیز ہے اشفاق بھائی؟“ عفت نے پوچھا۔

خاں صاحب رک رک کر بولے..... ”میرے قلیل عم کے مطابق عفت رویا کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی نعمت اس قسم کی کو دکھائی دیتی ہے جو نفس مطمئنہ کا مالک ہو۔ اس کا خواب اسے ایسے مقامات کی سیر کرا دیتا ہے جو عقل انسانی کے دائرے میں بھی ممکن نہیں۔ دوسری قسم خواب کی وہ ہے جس سے نفس لواہ کو سابقہ پڑتا ہے یعنی ایسی روح جو ابھی خواہش سے محروم نہیں پا سکی۔ اس لیے اسے ایسے خواب آتے ہیں جو دنیا سے وابستگی ظاہر کرتے ہیں۔ آنے والے واقعات کچھ Premonition، کچھ Forebodings، کچھ پیش گوئیاں..... لیکن تیسری قسم خواب کی وہ ہے جو نفس امارہ کو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب شیطانی ترغیبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی سچے ہو جاتے ہیں لیکن ان سے انسان کی روح کو نجات نہیں ہوتا۔ کیوں کیا میں کچھ ٹھیک سمجھ پایا ہوں شمس؟“

”ول ڈن ول ڈن..... کچھ کچھ میں سمجھ گیا۔“ وہ بچے کی سی معصومیت سے بولنا۔

شمس سرخ گردن کیے بڑے انہماک سے خاں صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔

چند لمحے ہم خاموش رہے اور عفت نے چائے کے پیالے کو منہ لگا لیا۔

”اشفاق صاحب! کیا آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان ایک وقت میں دو جگہ موجود ہوتا ہے۔ تو یہ

تو ایک درویش نے مجھے بتایا کہ ہر انسان کی چھ Duplicate کاربن کاپیاں دنیا میں ایک وقت پر موجود ہوتی ہیں۔ کیا یہ بات پر ایک وقت میں ہونا اسی Phenomena کا حصہ تو نہیں؟“ شمس نے بات کی۔

کچھ دیر سر میں انگلی پھیرنے کے بعد خاں صاحب نے بولے..... ”جو لوگ حظ نفس کو چھوڑتے ہیں اور نعمتوں سے بچھڑتے ہیں۔ ان کے لیے بہت کچھ ممکن ہے۔ وہ Levitation بھی کر سکتے ہیں اور Linear travel بھی ان کے لیے ممکن ہے۔“

عفت کی طرف دیکھ کر شمس بولا۔ ”کل رات مجھے لگا کہ میں براڈ لاف میں ہوں۔ چھ سال پہلے میرے باپ نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔ وہاں ادیبوں کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ باپ نہ جانے کیوں بیٹوں سے اتنی امیدیں وابستہ کر پیتے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں فاکنر (Faulkner) کی طرح ایک بڑا ناول نگار بنوں۔ پتہ نہیں کیوں اولاد ماں باپ کی

آرزو پر کم و بیش کبھی پوری نہیں اتر سکتی۔“

عفت کا نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے شمس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ عفت کا چہرہ بخار میں تپا ہوا تھا۔  
ہے اشفاق بھائی وہی ہے..... میں بھی کل رات اسے دیکھ چکی ہوں۔“ عفت نے اردو میں کہا۔ ایک ہی وقت میں  
مقامات پر موجود ہونے کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یوں سمجھیے براؤڈ لاف میرا قبلہ اول ہے۔ وہاں میں داؤد سے ملا۔ وہ افریقی سیاہ فام اتنا طاقتور تھا کہ  
بڑے میں انسان کو جڑ سے اتار پھینکتا اور..... اور..... اس نے اپنی یہ طاقت ہمیشہ لوگوں کو پھانسنے کے لیے استعمال کی۔  
نے اپنی ساری طاقت استعمال کر کے مجھے کہا..... شمس..... تو یہ سچے جاؤ..... یہ براؤڈ لاف تمہارے مطلب کی جگہ نہیں ہے۔  
یہ کہہ کر وہ یونیورسٹی سے غائب ہو گیا۔ ندج نے کہاں چلا گیا لیکن میری سمت مقرر کر گیا۔ اس نے کوئی مشورہ نہیں دیا۔  
بحث مباحث نہیں کیا لیکن باہجی کی طرف نیک نظر سے میری منزل مقرر کر دی۔ سیاہ آدمی میں کسی کو پھانسنے کی کتنی قوت  
ہے۔ پتہ نہیں کیوں وہ یہ طاقت دنیا حاصل کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔

اللہ نے سفید فام اور سیاہ جلد والوں کی سعی مقرر کر دی ہے۔ سفید آدمی ہمیشہ دنیا سیدھی کرتا ہے۔ وہ ساری  
ہاتھ پٹو کر ساری قوت مجتمع کر کے حال و درست کرتا ہے لیکن سیاہ انسان کو اس دنیا کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ روح کو گام  
مابعد کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی آپ نے سوچا کہ سفید قوموں میں نبی کیوں نہیں آئے؟ انہیں اللہ کی رضا سے  
دنیا سنوارنی ہے۔ وہ اسی دنیا کے لیے بنائے گئے ہیں۔ جب کبھی کسی سفید آدمی کو میری طرح مابعد کی تلاش ہوگی،  
کی آرزو ہوگی، اسے مشرق کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ پھر چاہے وہ صیب اٹھالے، چاہے اس کے بیٹے مارے جائیں  
یہاں زندہ رہیں۔ چاہے وہ جہاد میں شہید ہوں..... القاب اس کا اپنا ہوگا لیکن راستہ مشرق والے دکھائیں گے۔“  
باہر سے اذان کی آواز آنے لگی۔ دھمال والوں کے گھنٹھر و سمٹ کر چپ ہو گئے۔ ڈھول تاشے بجنے بند ہوئے۔  
شمس نے اپنے گلے سے گیندے کا بار اتار اور عفت کے گلے میں ڈال کر بولا۔ ”یہ ہار بڑی چیز ہے جی، اسے پہنیں۔“  
باباجی فرماتے ہیں۔ ہر پھول کی بھی آرزو ہوتی ہے کہ وہ بالآخر محبوب کے گلے کا پار بنے۔“

”عفت مجھے دیکھتے۔“ شمس نے عفت پر نظر ڈالی اور اس کا دل بہلانے کی غرض سے بتانے لگا کہ ہر پھول  
میں اسے وہی برجی ملی تھی جو عفت کے خواب میں آئی تھی۔ وہیں اسرائیل کی نائے قدر کی شاعرہ، گھانا کا جوشیلا جرنلسٹ تھا۔  
ہندوستان سے آیا ہوا، نائی سوٹ پہننے والا بری بھوشن تھا۔ بری بھوشن اور شمس اکٹھے ایک کمرے میں رہتے تھے اور یہ  
آدرشوں پر گتھم گتھا بھی ہو جاتے تھے۔ ”میں ادیب تو نہیں تھا لیکن میرے سکول ماسٹر باپ کی آرزو تھی کہ میں ایک  
فائزر بن جاؤں اور نونیل پرائز پاؤں۔ مجھے اندر سے معلوم تھا کہ فائزر بننا کسی انسان کے اپنے بس کی بات نہیں لیکن  
اپنے سکول ماسٹر باپ کی آرزو کو بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ کینسر کا مریض میرا باپ زیادہ  
نہیں رہے گا۔ اسی لیے میں براؤڈ لاف چلا گیا تھا۔“

اسرائیلی برجی کا قد چار فٹ گیارہ انچ تھا۔ جب ہم دونوں براؤڈ لاف کی خوبصورت لائون پر گھومتے تو وہ  
میرے سینے تک آتی۔ برجی نے مجھے شہد کھانا سکھایا۔ وہ ناشتے پر، دو پہر لंच کے وقت، شام کی چائے میں، رات کے کھانے

مجھ سے اڑائیں بھر رہا تھا اور دونوں کوزوں کے درمیان اپنے جلوے دکھارہا تھا۔ مجھے اس کے سکتے سے نکل کر پھر  
 صوبے پر بے انتہا خوشی ہوئی۔

میں نے خوشی سے آنکھیں نچاتے ہوئے بلال کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھوں میں مایوسی تھی  
 پھر سس سی تیوری تھی۔ اس نے میری کلائی اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔  
 ”دادا! اسے مارو۔ اس سڑے کو حلال کر دو۔ یہ پھر سے کیوں زندہ ہو گیا ہے بھلا؟“



## بابا نوروالے اور دیگر

”نوروالوں کا ڈیرہ“

جب خاں صاحب اردو بورڈ میں بطور ڈائریکٹر کام کر رہے تھے، ان کی کل تنخواہ آٹھ سو روپے کے قریب تھی لیکن ہمیں کوئی مانی پریشانی نہ تھی۔ ایتھ خاں صاحب کچھ بچھے بچھے، بے زار سے، کچھ روہانسے سے نظر آتے۔ یوں گتے گتے گویا ان کے اندر کوئی مدھانی پھر رہی ہو لیکن کسی قسم کا کھن اوپر نہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے کام کی زیادتی پر محمول کیا۔

خاں صاحب گلبرگ کے دفتر سے بوریا ہسٹرا اٹھا کر 299۔ اہد مال میں شفٹ کر گئے تھے۔ یہ زمین خاں صاحب نے اپنے نام سے خریدی تھی کیونکہ مالک مکان شکی قسم کا آدمی تھا اور کسی صورت حکومت کو زمین بیچنے پر اسے راضی نہ تھا کہ کون جانے کس وقت کسی نئے افسر کے آنے پر حکومت یہ زمین واپس نکلیں گے۔

خاں صاحب نے ہڈنگ میں اردو بورڈ کی کتابیں بیچ کر جو دن بچھ جمع کیا تھا، اس سے تعمیر کی تھی۔ حکومت نے کسی قسم کی اعانت لیے بغیر غالباً یہ پہلی عمارت تھی جو کسی ادارے نے بنائی تھی۔ کچھ یار دوستوں نے خاں صاحب کو اس سے بھی دیا کہ ہڈنگ تمہاری ہے اب حکومت سے سرمایہ وصول کرو لیکن خاں صاحب ایسی باتوں پر ہنس دیا کرتے تھے کہ میں نے دنوں تو انھیں کسی بات پر ہنس آتی ہی نہ تھی۔

میں نے حسب عادت نہ تیس گوراہ وی، نہ اُن کے اندر کے موسم کی کنسوٹی لی۔ ان کے اندر کی چوکیوں کی کال میں نے کوئی اندازہ نہ لگایا۔ دفتر میں حنیف رائے خاں صاحب کے نیچے کام کرتے تھے۔ حنیف رائے غالباً اس کے دور سے خود بھی گزرتے رہتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی رشید احمد چوہدری جب بھی دفتر آتے تو خاں صاحب سے ضرور ملتے۔ ایک بار باتوں باتوں میں نوروالوں کے ڈیرے کا ذکر ہوا۔ اس لیے وہ خاں صاحب سے نوروالوں کے ڈیرے پر لے گئے۔

ڈپریشن کی بیماری ازل سے انسان کے تعاقب میں رہی ہے لیکن انسان جب زرعی دور سے گزر رہا تھا، نیچے کے قریب تھا۔ کچی سبزیاں، فصلیں، پھل، جڑی بوٹیاں استعمال میں تھیں۔ اصطبل میں گھوڑے، گھروں پر بھینس، بکریاں، گائے، بچھڑے اس کی زندگی کو تصنع اور نمائش سے دور رکھتے تھے۔ تب بھی ڈپریشن ہوتا ضرور تھا لیکن یہ مرض موسمی، موسم

بروز کی طرح جلد صحت سے آشنا ہو جاتا۔ تب ڈپریشن کا تعلق پیدائشی معذوری کی شکل میں ابھرتا تھا۔ پاگل پن، اور ڈپریشن کا زیادہ تعلق ماحول اور تربیت سے نہیں تھا بلکہ کہیں وراثت میں Genetics کی کارستانی ہو کرتی

لیکن آج کے عہد میں ڈپریشن کی بیماری نے وہائی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کی بظاہر وجہ یہی لگتی ہے کہ اب نئی نئی ترقی کو صرف مادی ترقی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ دنوں میں امیر ہونے کا خواب ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کوٹھی، کار، گاڑی کے لیے بڑھیا انگریزی سکولوں کی تعلیم (صرف پرائیویٹ سکولوں کی تعلیم ہی اصل تعلیم سمجھی جاتی ہے) ہر انسان کی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔

پے در پے کوشش کے باوجود جب نوجوانوں کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا تو نوجوان اپنے آپ کو ٹھنڈا اور نا اہل سمجھنے لگتے ہیں۔ اس میں مسابقت کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا شعور اسے سمجھتا ہے کہ وہ دنیا اور دنیاوی زندگی کے لیے لڑ رہا ہے۔ اسے بھول جاتا ہے کہ اللہ بعض کو بعض پر فوقیت دیتا ہے۔ کسی کو رزق، کسی کو حسن، کسی کو دانشوری سے نوازتا ہے اور کج اور حسد کے زخمے میں پھنس کر آج کا نوجوان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ حواسِ خمسہ کی عطا کردہ حالیہ نعمتوں سے کھینچتا ہے۔

وہ ایسی مسرتوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے جو جسم و ولدت دیتی ہے۔ روح کی بالیدگی کا تو سرے سے اسے علم ہی نہیں ہو پاتا۔ جب دذوق پاؤں اٹھانے لگتے ہیں تو ڈپریشن کا مریض موت کی خواہش کرتا۔ دنیاوی زندگی وہ حاصل نہیں کر پاتا اور روح کے سفر کا علم اسے نہیں ہوتا۔ ایسے میں جو توڑ پھوڑ ہوتی ہے، وہ عمل مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ ڈپریشن کا مریض اپنے آپ کو ناکارہ سمجھتا ہے اور دیکھتا ہے گویا کسی محبوبہ کے خیا لوں میں غرق ہو۔ آج کے عہد میں خود کش حملے اور خود کشی کے واقعات معمولاً اسی ڈپریشن کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کرائمر کی دنیا اسی ڈپریشن نے آباد کر رکھی ہے۔

کچھ خوش نصیب ہر دور میں ایسے ہونگے۔ ہیں جو ڈپریشن میں جانے کے بجائے یہ سمجھ بیٹے ہیں کہ روح کے سفر میں دنیاوی یافت ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ دنیا کو اپنے ارادے اور اختیار سے پس پشت ڈال کر فقیری چال اختیار کر لیتے ہیں۔ نبیوں کا راستہ، مہاتما بدھ، مہاراجہ رام چندر، ابراہیم اوہم اور بڑے بڑے قطب ولی اسی راہ کے مسافر ہیں۔ وہ دنیا کو وہاب سمجھ کر دنیا کے لیے تنگ و دو تنگ کرتے اور عجب اتفاق ہے زمانوں پر اپنی مہر لگا کر چلے جاتے ہیں۔

دھرم پورہ میں بابا فضل شاہ صاحب کا ڈیرہ تھا۔ بابا جی اپنے بچوں سے غافل، دولت کی خواہش سے تہی، حب سے منزہ، ایک ایسی اجتماعی زندگی گزار رہے تھے جہاں وہ نا امید لوگوں کے دیئے میں امید کا تیل ڈالتے اور اسے روشن کرتے۔

مجھے نڈیرے کا علم تھا نہ رشید احمد چوہدری یا حنیف رامے کی رہبری کا۔ پھر اچانک ایک دن خاں صاحب نے مجھے ہاتھ کے وقت کہا ”قد سید حنیف رامے مجھے بابا جی نور والے کے ڈیرے پر لے جاتے رہے ہیں۔ وہاں کا عجب حال ہے۔ ہر طبقے کا آدمی گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ سارا دن ٹیکر کی چھال کی گڑ والی چائے ملتی ہے۔ آپ جب جائیں آپ کے آگے کھانا لگا دیتے ہیں۔ پیالے میں سالن چھابے میں روٹیاں۔“

”کوئی لٹچ ٹانم، ٹی ٹانم نہیں؟“

”نہیں بابا کے ڈیرے پر لٹچ ٹانم یا ٹی ٹانم نہیں ہوتا۔ جو نبی کوئی داخل ہوتا ہے۔ بابا جی کہتے ہیں لو بھی نہیں طواف کرو، جانی جان آئے ہیں۔ اتنی خوشدلی سے کسی کا سواگت کرتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔..... چلو گی دیکھو خاں صاحب نے ڈرے ہوئے اشتیاق سے کہا۔

”ضروری ضرور۔“

خاں صاحب کی عادت تھی وہ ہمیشہ کسی نئے خیال، جذبہ، محنت، کھلی سے پہلے خود ملتے۔ سارے حدود و دہانے خود واقف ہوتے۔ پھر جہاں کہیں پھسلن ہوتی وہ اس مقام کو گول کر جاتے ورنہ مجھے اس فوٹو گرافر کی طرح جو آپ کے کلا کپڑا ڈال کر کہتا ہے ”دیکھو دیکھو یہ قطب صاحب کی لاٹ ہے..... بارہ من کی دھو بن کو سلام کرو..... دیکھو دیکھو آیا.....“ مجھے ایسے ہی وہ برقناشا دکھا دیتے۔

آپ نے بھی شاید کبھی بچپن میں یہ شعبہ باز فوٹو گرافر دیکھا ہو جو اپنا کمرہ، سلا بیڈز، تین ٹانگوں والے چکر پر رکھ کر کٹٹری جاری رکھتے ہوئے دنیا جہاں کے عجائبات دکھایا کرتے تھے۔ خاں صاحب میں بھی ایسے شعبہ باز کی تھی۔ وہ ایک مرتبہ لندن سے جادو کا سامان بھی لائے تھے جس میں رنگ بدلنے والے رومال، جادو کی تاش، برقعے، گیندیں شامل تھیں۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے خود Jugglery بھی کرنے کی کوشش کی لیکن گھر والے ہمیشہ کی طرح خوش فروش کے ساتھ متوجہ نہ ہوئے۔

خاں صاحب کو حیران ہونے اور حیران کرنے کی عادت تھی۔ اسی میں ان کی ساری نشوونما تھی۔ مجھے بھی یاد ہے کہ وہ خود تو جادو گر نہ بن سکے لیکن ایک شام انہوں نے بہت سارے ادیبوں کی دعوت کی اور مجھ سے کہا..... ”مگر اس دعوت پر نہ ادبی باتیں ہوں گی نہ غیبت ہی چلے گی۔ ہو سکے تو آپس میں جو شہرت کی ہوس اور حسد ہے اس پر بھی چڑھا رہے۔ بتاؤ کیا کریں کہ ادیب حضرات ایک دوسرے کی غیبت میں کھسر پھسر نہ کریں اور ان کا دل بھی لگا رہے گا۔ میں نے کچھ سوچنا چاہا لیکن وہ سر ہلا کر بولے..... ”پالیا..... پالیا.....“

جب کبھی انہیں کوئی نئی بات سوجھتی تو وہ ارشیدس بن جاتے جو مہ میں بیٹھا سوچتا تھا کہ کسی چیز کی Bouncy کیسے معلوم کی جائے اور مہ میں اس پر انکشاف ہوا کہ جس قدر پانی کوئی مادی چیز displace کرتی ہے وہی Bouncy ہے۔ ارشیدس مہ میں سے برہنہ نکلا اور روم کی گلیوں میں چلا تا گیا..... ”پالیا..... پالیا.....“ خاں صاحب اور مجھ میں بھی ”پالیا..... پالیا“ کی ایک پوری روایت موجود تھی۔ ”اس بار میں ماسٹر جگھر بلاؤں گا وہی ان ادیب جو مجھ کی سٹی گم کرے گا۔“ خاں صاحب جذبے سے بولے۔

اس دعوت میں احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، سلیم اختر، مشکور حسین یاد، ساجد اور بہت سے اہم ادیبوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ چائے کے بعد ساری ادیب برادری باہر لان میں جمع ہوئی۔ خاں صاحب نے اپنی جادوگری تو نہ دکھائی البتہ ایک پروفیشنل جادوگر کو بلوایا۔ اس نے کچھ ایسے کرتب اور شعبہ دے دکھائے ادیبوں کو آپس میں باتیں کرنے کا وقت نہ ملا بلکہ انہیں عام انسانوں کی طرح خوش ہونے کا موقع ملا۔

ایک اور مرتبہ یوں ہوا۔ باجرہ سرور جب حیات تھیں اور کراچی سے آئی ہوئی تھیں۔ خدیجہ نے خاں صاحب کو  
 ”کیا تم نے کوئی اطلاع دی تو خاں صاحب بولے ”بھائی بڑی خوشی کی بات ہے لیکن.....“  
 ”لیکن کیا؟“ خدیجہ نے پوچھا۔

”اس خوشی کے موقع پر کچھ ہو جائے۔“

”کیا ہو جائے اشفاق بھائی؟“

”کوئی دعوت، کوئی ٹی پارٹی.....؟“

تو طے پایا کہ ادیبوں کو چائے پر مدعو کیا جائے۔ مجھے بلا کر خاں صاحب نے کہا ”کیا تم ان حضرات کو کچھ پارٹی  
 (Games) کھلا سکتی ہو۔ کوئی Pillow Fight، رسمہ ششی، آنکھ بھونکھن کا کھیل؟“

اس دن سب سے کامیاب کھیل وہ تھا جب سب ادیب دائرے میں بیٹھے تھے۔ ایک ادیب کو میں ایک پرچی  
 دیتی اور ہدایت دیتی کہ اسے کھونا نہیں اور دوسرے ادیب کو جلدی سے پکڑا دینا ہے۔ پیکروں پر موسیقی جاری ہو گئی۔  
 میں موسیقی رکتی جس ادیب کے ہاتھ میں جو پرچی نکلتی اسے صوں کر اسے پڑھنا پڑتا اور پھر جو سزا اس پر لکھی ہوتی اسے  
 پڑھنا پڑتی۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاتھ میں جب پرچی پکڑی گئی تو اس پر لکھا تھا ”گا نا سنا یے۔“ بیچارے کھیل کی ہدایات  
 کے مطابق اور درمیان میں کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے دو تین اشعار گن کے ساتھ سنائے۔ خوب تالیاں بگیں۔  
 میری سٹی گم کرنے کے لیے خاں صاحب مجھے ڈیرہ پاک لے گئے۔

اس سے پہلے بابوں کا مجھے تھوڑا سا تجربہ تھا۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ان دنوں میری خالہ  
 کے گورنمنٹ سکول میں ہیڈ ماسٹر تھیں۔ میانوان میں نیازی پٹھانوں اور صوفی حضرات کا ان دنوں زور تھا۔ خالہ  
 نے یہاں پر اسی جو بنیادی طور پر صوفائی تھا، خالہ کے پاس آیا۔  
 ”جی آپ سے ایک عرض کرنی ہے۔“

امیر محمد قریشی خاموش آدمی تھا۔ وہ کبھی ذاتی غرض لے کر ان کے پاس نہیں آیا تھا۔

”کیا بات ہے قریشی؟“

”یہاں سے کچھ دور نئے والی ہے۔ وہاں ایک شاہ صاحب رہتے ہیں۔ بڑے کرنی والے ہیں۔ کیا پتہ آپ

کے ذرا سفر کب لاہور ہو جائے۔ ان سے ملے بغیر یہاں سے چلے جانا.....“ باقی بات میری خالہ سمجھ گئیں اور شاہ صاحب  
 سے ملنے کی شافی۔

خالہ کے ماتحت آپا مبارک کام کرتی تھیں۔ ان کا آبائی گھر لاہور میں کلکتہ روڈ پر حسین لاج میں تھا۔ باپ ڈاکٹر  
 تھے۔ انہیں انگریز حکمرانوں کی طرف سے خان بہادری کا تمغہ ملا تھا۔ آپا مبارک کو نوکری کی ضرورت نہ تھی۔ وہ فقط شادی  
 سے پہلے وقت کٹی کے لیے کام کر رہی تھی۔ آپا مبارک کی دو بہنیں اور ایک ڈاکٹر بھائی تھا۔

خالہ فیروزہ نے شاہ صاحب کے ایڈونچر میں آپا مبارک کو بھی شامل کر لیا لیکن اس مشغلے کو سکول کے ڈسپلن کے  
 خوف سمجھتے ہوئے خالہ نے یہ تجسس آگے نہ بڑھنے دیا۔ چھٹیوں میں جب خالہ حسین لاج آپا مبارک کے ساتھ گئیں تو



دلے والی کے شاہ صاحب بھی وہاں پہنچے۔

آپا مبارک، عزیز آپا اور سعید روزے کے دنوں میں ہمارے پاس دھر مسالے آتے۔ ہمیں جب بھی دوست ہوتا ہم حسین لاج ٹھہرتے۔ سعید کے ساتھ میری گہری دوستی ہو گئی جو اب تک قائم ہے۔ مجھے بابوں کا پہلا تجربہ شہر سے جیسی سعید کے حسین لاج میں ہی ہوا۔ دلے والی کے بابا جی نواب کا لا باغ کے بھی پیر تھے۔ ان کی شہرت دور دور تک پہنچی ہوئی تھی۔ حفیظ اللہ شاہ صاحب کی نیلی آنکھیں، تیکھے نقوش اور امیرانیوں جیسی رنگت تھی۔ وہ نگاہیں نیچی رکھنے اور چہرے کے پلو سے چھپانے والے بزرگ تھے۔ ان میں کچھ تصرفات ضرور تھے لیکن وہ انداز یہ بھی ان کا اظہار نہ کرتے۔ کبھی بند مٹھی ہوا میں لہراتے۔ پھر اسے کھول کر ہمیں ایسے میوے پیش کر دیتے جو بے موسمی ہوتے۔

حفیظ اللہ شاہ صاحب کی معیت میں ایک پٹواری صاحب بھی ہمارے گھر آیا کرتے جو سورۃ المزمل کے تھے اور سنا ہے کچھ جنات ان کے قبضے میں تھے۔ وہ باواز بند سورۃ المزمل پڑھتے۔ پھر اندھا کبر کا نعرہ لگاتے۔ ایک بار فرس پر ہارنے کے انداز میں آگے کرتے اور نا فرغیب سے موسیٰ پھل سفید کھچی ہوئی چادروں کے گرنے لگتے۔ ہم حیرت سے انہیں دیکھتے اور فریاد کشیں کرتے۔

”مچھلی تو منگوا دیں شاہ جی۔“

”کھا جو کھانے کو جی چاہتا ہے۔“

”پان..... پان“ میری منہ بونی بہن معینہ کہتیں۔

وہ اونچے اونچے سورۃ المزمل پڑھتے پھر مٹھی بند کر کے سفید چاندنی پر اشارہ کرتے۔ گرم گرم مچھلی پان، جلیبیان، گلاب جاکن فرس پر ہوتے۔ میری والدہ نے بھی ان سے سورۃ المزمل کا وظیفہ لیا تھا اور وہ تاجیہ پڑھتی رہیں لیکن کسی قسم کی شہدہ ہازی یا تصرف ان کے ہاتھ نہ آیا۔ میں نے اپنے تجربات کا ذکر ان سے نہ کیا۔

ایک مرتبہ ہم سب کلکتہ روڈ پر حسین لاج کے اوپر والے مہمان خانے میں بیٹھے تھے۔ پٹواری صاحب

جاری تھا۔ پھر یکدم پٹواری صاحب بولے۔ ”کوئی جا آتا رہا پر سے ٹیلی گرام اتار لائے۔“

میں ہابری گئی، پڑے سکھانے والی تار پر واقعی ایک تار لگی ہوئی ہوا میں ڈول رہی تھی۔

خاں صاحب نے پھر تصدیق کے طور پر میری سٹی گم کرنے کے انداز میں پوچھا۔

”قد سید ڈیرہ پاک چلو گی۔“

”ہاں جی ضرور۔“

”تم کبھی پہلے کسی ڈیرے پر گئی ہو؟“

”نہیں خاں جی..... مجھے معلوم نہیں ڈیرہ کیا ہوتا ہے۔“

”بڑی آئیڈیل جگہ ہے۔ بڑا آئند ملتا ہے۔ آدمی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔“

میں جی میں سوچتی رہتی۔ پتہ نہیں بابا جی نوروالے کیسے ہوں گے؟ دلے والی کے حفیظ اللہ شاہ صاحب جیسے

تھیں چمکی ہوئی، نمی نمی مسکراہٹ، جمال ہی جمال..... کہ پیواری صاحب کی طرح عقل و نگ کرنے والے کسی شخص کی طرح حیرت کے حوالے کر دینے والے۔

دھرم پورہ میں انٹرنی روڈ پر بائیں ہاتھ باباجی کا ڈیرہ تھا۔ ہم اس پٹری پر چل دیے جو باباجی کے باورچی کے لئے صرف جاتی تھی۔

ہم دونوں ایسے داخل ہوئے کہ خاں صاحب دو فٹ آگے تھے اور میں کچھ خوفزدہ سی اچنتی سی نگاہ ماحول پر ڈالتی رہتی تھی۔ بائیں ہاتھ چٹائیاں بچھی تھیں، جن پر کچھ لوگ عبادت میں مشغول تھے۔ دائیں ہاتھ کے چھدرے سے بڑھتوں سے کمریاں بندھی تھیں۔ ہر چارہ ڈالنے والے اپنا کام کیے جا رہے تھے۔ ایک پکا کمرہ دائیں ہاتھ تھا، جہاں کھانے اور دوا کے ڈالنے والے اپنے کام میں مشغول تھے۔ چھوٹا سا راستہ گزرنے کی طرف جاتا تھا جہاں عمو، باباجی اپنے مکانات سے تعلیم فرمایا کرتے تھے۔

ڈیرے کے راستے پر سب سے پہلے بابا جلال سے ناکرا ہوا۔

بابا جلال دبے پتلے سے سبز توب میں ملبوس تھے۔ وہ انسان سے زیادہ پرندہ لگتے تھے۔ غالباً باباجی ان کی سے زیادہ خوش نہ تھے لیکن مودی خانے کا سارا آٹا، تیل، چینی ان کی تحویل میں ہوتا اور وہ پھدکنے کے انداز میں تیس دنوں تک تول میں گئے رہتے۔

ڈیرے کے پیچھے بہت آگے "علاج بالغذا" کا ہسپتال زیر تعمیر نظر آ رہا تھا۔ وہاں مزدور، راج، مستری بڑے بڑے وقت کے ساتھ خوش دلی کے ہر ادویاد میں اُسارنے، پلستر کرنے میں مشغول تھے۔ محمد علی صاحب اور باباجی پیچھے سامنے چولہے جل رہے تھے، دگچے چڑھے تھے اور باباجی کفگیر چلا رہے تھے۔ ننگر تیار ہو رہا تھا۔ باباجی فضل شاہ نے دوائی کے شاہ صاحب جیسی نورانی، خوبصورت ڈاڑھی اور پیوچہ پر لیے بغیر پارہ چہرہ..... میں نے کبھی بابا جلال کی صورت کو بڑے غور سے نہیں دیکھا..... لیکن اس ابھی بزرگ کے چہرے پر بڑی شائستگی، شائستگی اور نمی جیسی چھائیں جیسی مسکراہٹ تھی۔

"آؤ جی آؤ جانی جان آگئے..... جانی جان آگئے۔"

باباجی کی آواز نے سواگت کیا۔

"میں جی قدسیہ کو لایا ہوں باباجی۔"

"لو جی..... ہماری بیٹی آگئی..... سب خیراں ہو گئیاں..... نیچے چل کر بیٹھو جی..... نیچے چل کر، جی رانی آئی

سے آج تو۔"

ہمیں بابا جلال نشیبی تہ خانہ نما کمرے میں لے گئے۔ اوپر کی سطح سے یہ کمرہ دس بارہ فٹ نیچے تھا۔ لیپ کی ہوئی پین، فرش پر بچھی دریاں، چٹائیاں، عجب سماں، عجب روشنی..... ابھی ہم نیچے ہی تھے کہ بابا جلال چائے لے کر آگئے۔ آج بخورہ نما روغنی پیالوں میں گرم گرم لذیذ چائے تھی۔ یہ چائے میکرو کی چھال ابال کر اس میں وافر دودھ اور گڑ..... کرینائی جاتی تھی۔ میں نے اسے گھر پر بنانے کی ناکام کوشش کی لیکن اس کی لذت غالباً باباجی کی محبت سے کشیدگی جاتی

تھی۔ وہ اپنے مستی پہرے میں ایسی نادر چیزیں سیکھ آئے تھے جن کی نقل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔

چائے پینے کے دوران مجھے خاں صاحب نے بتایا تھا کہ چودہ برس کی عمر میں باباجی پر جذب کی کیفیت ہو گئی تھی۔ باباجی پر غلبہ حال ہوا تو آپ آہادی سے دور جنگلوں میں نکل گئے۔ اس عالم میں یا تو باباجی گریہ و زاری کرتے خود کو بلی کرتے۔ اس حالت میں منہ سے جو کلمہ دیتے پورا ہو جاتا۔ پورے بارہ سال یہی جذب و مستی کا عہد رہا۔ پھر جاندھر میں میاں خدا بخش سلسلہ قادریہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ جو کچھ مرشد نے کھلایا بابا افضل شاہ نے کھایا جو بیست دن آیا۔ سنا ہے چودہ سال زیر تربیت رہ کر چار مقامات پر تصرف ہو گیا..... پہلا قول..... دوسرا عمل، تیسرا علم و اخلاص یعنی تصوف کا بی۔ اسے پاس کر لیا اور میاں خدا بخش سے لوگوں سے میل جول کی اجازت مل گئی۔

کچھ دیر بعد باباجی تشریف لائے۔

”ناں نال دھی رانی نے نہیں اٹھتا۔“

باباجی نے اس وقت اذھیہا ڈھکڑا رکھ کر تانا، ہڈری کا تہہ اور موٹی ٹمل کا صافہ پہن رکھا تھا۔ چائے پینے میں نے دیکھا کچھ کھلیاں بچھنے رہی تھیں اور بارہا پیالے کی منھاس پر ڈنڈ آتی تھیں۔ میں نے پہلے تو رومال سے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن پھر ان سے چھٹکا رہا۔ ان کے لیے پیالہ پرچ میں اوندھا رکھ دیا۔

”ناں نال دھی رانی۔ سیدھے کونھی لٹھنا نہیں کرتے۔“

یہ تربیت کا پہلا جملہ تھا۔ میں دورگئی دنیا کی باسی تھی۔ جہاں اٹکا کر نا اپنی ذہانت اور برتری کا ثبوت کرتے دوسرے کے نقص بیان کرنے سے اپنی برتری ثابت کی جاتی تھی۔ مجھے یوں ڈائریکٹ انداز میں کسی نے بتا دیا کہ خیال تھا کہ بابا لوگ یا تو خواہشیں پوری کرتے ہیں یا پھر چپ تپ، ورد و وظیفہ آپ کی حوائج میں دے دیتے۔ اٹلے کو سیدھا کرنے کی ترغیب کبھی نہیں دیتے۔

اس روز کے بعد عموماً میں خاں صاحب کے ساتھ ڈیرہ پاک جانے لگی لیکن میرا رد یہ محتاط ہو گیا۔ ایک عرصہ وہاں جاتے نہ ٹرانا تھا کہ باباجی نے اپنے روز مجھ سے ڈیرے پر کڑا ہی گوشت پکوا دیا۔ میں گھر سے اپنی کھانے ساز و سامان لے کر گئی۔ جب کڑا ہی تیار ہو گئی تو باباجی نے ذرا سا چکھ کر کہا ”کھڑی ہے کھری..... لیں صاحب..... نکل میں بانٹ دیں۔“

اس وقت خوش ہو کر خاں صاحب نے باباجی کو دعا دی۔ ”بیان اور بڑھ جائے گا۔ بیان اور بڑھ جائے گا۔ نوٹ! بیان اور بڑھ جائے گا۔“

غالباً یہی وہ لمحہ تھا جب ”زاویہ“ پروگرام کی نیور کھی گئی۔ ”مقلین شاہ“ کو قبولیت کا شرف عطا ہوا۔ سنا ہے کہ روہیں جو اپنے لیے کچھ نہیں مانگتیں، ہر صورت راضی برضا رہتی ہیں۔ ان کی آرزو کو حق تعالیٰ فوراً مان لیتے ہیں اور یہ دعوات بن جاتے ہیں۔ منہ سے جو کچھ لوگوں کے لیے مانگتے ہیں، پورا ہوتا ہے۔

جس طرح مجھے ڈیرہ پاک لے جا کر خاں صاحب نے محو حیرت کیا اسی طرح بولے بولے بچوں کو بھی دنیا کے مختلف رنگ دکھانے کے لیے ساتھ لے جانے لگے۔ ہم شام کے وقت پی ڈیلیو آر کی کلب میں سوئمنگ کے لیے

تھے۔ خاں صاحب بڑے اچھے تیراک تھے اور وہ بڑے آرزو مند تھے کہ بچے اس طرح تیرنا سیکھیں گویا مچھلی ہیں۔ بچہ پانی کے چھینٹے اڑاتا شپ شپ پاؤں چلاتا تو ان کی رومن ناک پر تھوڑی سی ناخوشگوار سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ وہ کہتے چاہے بٹرفلائی سٹائل ہو چاہے فری سٹائل تیرنے کی شرط ہے شور شرابہ نہ ہو..... نہ پانی میں نہ اپنے اندر۔ بی ڈبلیو آر کی یہ کلب نہر سے کچھ ہٹ کر اندر کی طرف تھی۔ نہانے کے بعد بچوں کو بھوک لگ جاتی۔ میں گھر سے کچھ کھانے لے کر لے جاتی تھی۔ اشتیاق منزہ بھی آ جاتے۔ ہم اپنے ساتھ کبھی کبھی آ پا صاحبہ اور رومی کو بھی لے جاتے۔ اچھی کھانا کھا سنا بن جاتا۔

ایک روز پی ڈبلیو آر کے سوسنگ پول کے بعد اچانک خاں صاحب بچوں کو ڈیرہ پاک لے گئے۔ ہم نے تہہ نہیں سمجھ کر لنگر کیا۔ اینق، اینس اور ایشیر حیرانی سے چاروں کھونٹ دیکھ رہے تھے۔ پتہ نہیں ان ناپختہ ذہنوں نے اس کو بٹرنیا ہوگا؟ اتنا ضرور لگتا تھا کہ اس Exposure سے وہ خوفزدہ سے تھے۔ جب ہم گھر جانے کے لیے تہہ خانے کے کچھ کھانے تو اچانک باباجی کفگیر دیکھ چھوڑ کر باہر آ گئے۔ اینق احمد خاں کی طرف دیکھ کر انہوں نے سوال کیا..... ”بیٹے کا کھانا کھا لیا ہے؟“

”اینق..... باباجی اینق۔“ خاں صاحب نے جواب دیا۔

”نیک سے اینک..... تمہارا یہ بیٹا مغرب میں چلا جائے گا اور بہت سرفراز ہوگا۔..... نیک سے اینک.....“ کہتے ہوئے وہ لنگروالے لٹھے پر واپس چلے گئے اور چونکی پر بیٹھ کر کفگیر سے روغنی پیالے میں شوربہ بناتے گئے۔ یوں لگتا تھا گویا انہیں علم ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں؟ عجب سی بات ہے لیکن 1989ء میں اینق بیٹا امریکہ چلا گیا۔ 2008ء تک وہیں ہے۔

باباجی کے ڈیرے پر جانا، وہیں لنگر کرنا، مزے اڑانا، خالی الذہن ہونا، فکر فاقے سے اپنے آپ کو آزاد کرنا میرا مقصد تھا۔ باباجی نے کتنا طریق تھا۔ نہ کبھی ان کے درجات کے متعلق سوچا نہ کبھی اس طرف دھیان گیا کہ ان کے کشف و کشف سے کچھ مجھ میں تبدیلی آ رہی ہے۔ یہ خاں صاحب کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔ وہ پتہ نہیں کس تلاش میں تھے۔ انہیں باباجی کی تلاش میں مرہم بن کر لگ رہے تھے۔ وہ ایمان کی نیچ درست کرنے کے ورپے تھے یا انہیں واقعی خدا کی تلاش تھی؟ کتب کا راز کبھی مجھ پر نہ کھلا۔ اتنا مجھ پر واضح تھا کہ باباجی چند ذمہ داریوں پر مبنی اور معنی در معنی جملے بول کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے اور ہمیں ڈاکٹر اشرف فاضلی کے سپرد کر دیتے جو ان کی وصیت کے مطابق قول کے بھی بادشاہ ہیں اور ہمیں بھی بادشاہ ہیں۔ ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب سے ہماری پہلی ملاقات جھٹپٹے کے قریب ہوئی۔ دبلے پتلے، صاف سرے سفید شلوار قمیض میں ملبوس ڈاکٹر صاحب ہم سے دور کھڑے تھے۔ باباجی نے انہیں آواز دیئے بغیر بلایا۔

”سرکار مجھے بلایا؟“ ڈاکٹر صاحب نے پاس آ کر استفسار کیا۔

”یہ ہمارے جانی جان آئے ہیں۔ انہیں اپنے حجرے میں لے جائیے۔“

ڈاکٹر صاحب بہت ذہین، نکتہ بین، باباجی سے تھوڑی بہت Liberty لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہم سے کچھ کہتے۔ جب پہلی بار میں ڈیرہ پاک گئی تھی ڈیرے کے راستے پر دائیں ہاتھ مجھے ایک ماڈرن قسم کا پارٹمنٹ نظر آیا تھا،

جس کے دروازے پر براؤن پینٹ تھا اور دروازہ کھلا تھا۔ صاف ستھرائی، نفاست اور آرائش میں یہ حصہ ڈیرے کو سمیٹا تھا۔ ہم اندر گئے، نشست گوفرش تھی لیکن فرش پر قالین اور آرام دہ گدیاں، گاؤں کیے دھرے تھے۔ قریب ہی پلنگ تھا۔ محفل کی رضائی تھی۔ کمرے میں ہر طرف کتابیں آراستہ تھیں۔

یہاں سے ایک اور Association شروع ہوگئی۔ باباجی گفتگو، تبادلہ خیال کے مجلسی آدمی نہ تھے۔ کبھی کوئی تعلیم دینے پر آمادہ ہوتے انگلی اٹھا کر فرماتے۔ نوٹ

”عمل کو فضیلت نہیں رخ کو فضیلت ہے۔“

”ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔“

”ورد سے مرد بنتا ہے درد نہ ہو تو مرد نہیں۔“

”محفل سے علم حاصل ہوتا ہے۔“

”سوال نہیں جواب بنو۔“

باباجی اپنی دانشمندی، تجربہ، فضیلت، احساس حق کوزے میں بند کر کے پیش کر دیتے اور پھر مصروف ہو جاتے۔ چودہ برس مستی پہرہ میں رہنے والا مجذوب بابا اپنی بولی بول کر آجاتا۔ اسے نشر و ترویج، غرض دنیایت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بس سمت درست کرتا اور باقی سب سمجھ آپ کی ذات کے انتخاب کے لیے چھوڑ جاتا۔

ڈاکٹر اشرف فاضلی بڑے خوش گفتار تھے۔ اب ہم جب ڈیرے پاک جاتے ان کے پاس حجرے میں لنگر کرنے لگتے۔ مزید ارچائے بار بار آتی۔ جو کچھ نہ کھا سکتے، ساتھ پیک کر دیا جاتا۔ یہاں کے کھانوں کا بھی کھانا تھا۔ سارے سالن لذیذ ہوتے۔ ڈیرے پاک کی کوئی بانڈی کبھی ایسی نہ ملی جسے بد مزہ کہہ سکیں۔ وہ موسمی سبزی ہلکی کھانے پرانی دال ہویا بیکجا کیے ہوئے کئی سالن، دیسی گھی کا تازہ بھجار گرم گرم تندوری روٹیاں اشتہا تیز کرنے والے یہ کھانے کسی فائیسٹار ہوٹل میں ملے نہ کبھی اپنے گھر میں نصیب ہوئے۔

طوائف کے ڈیرے پر تماشہ بین کے لیے دو ضرورتوں کا اہتمام ہوا کرتا ہے۔ وہاں جنس اور اشتہا۔ انسانی کمزوری سمجھ کر ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ ڈیرے پر صرف اس بات کا دھیان رکھا جاتا ہے کہ بھوکا آدمی درنگی سے کھا سکتا۔ پہلے بھوکے کی بھوک مٹاؤ پھر اس سے اس کی فہم و فراست کے مطابق جانچ تول کر بات کرو یعنی جس قدر کھا سکتا ہے۔ بات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر نہ ہونی چاہیے ورنہ قوت بے اثر ہوگا اور عمل بھی تبدیل نہ ہو سکے گا۔ جو بات کھانے پلے نہ پڑی اس پر عمل کیسا؟

ڈاکٹر صاحب خود کبھی کچھ نہ کھاتے۔ ہمیں ہی کھلانے جاتے۔ ایک روز میں نے پوچھا..... ”ڈاکٹر صاحب جی کیا شوق سے کھاتے ہیں؟“

ڈاکٹر صاحب نے کہا ”کبھی کبھی کوئی ہڈی چوس کر رکھ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں ہڈیوں کا چور اور کھانا ہے۔ یہ تو کتوں کی خوراک ہے، ہڈیاں ان تک پہنچنی چاہئیں۔ ہڈیوں کو دانتوں تلے دبانے والا عموماً خود غرض سے کھاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب باریک بین ہیں۔ ہال کی کھال اتارنا ان کے جہیز میں ہے۔ وہ افضل شاہ کے نوری چوڑھے میں

تھوڑے وقت شہد استعمال کرتی تھی۔ اسے Honey mania تھا۔ وہ اس کی تاثیر اس کے اجزاء، افادیت سے متاثر ہوئی تھی۔

یوں لگتا تھا وہ شہد آمیزی کے اثر حاصل کر کے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ شہد کے علاوہ اس نے مجھے اسلام کے بارے میں کچھ سنا کر جاننا تھا۔ میں ہر مسلمان کو کروڑھ کی نظر سے دیکھتا، اس کے ہر عمل کو دیر تک پرکھتا چاہتا تھا۔ ”Jen Kius“ کبھی کسی ختنہ شدہ مسلمان کے بچے سے دوستی نہ کرنا۔ وہ تمہیں دغا دے گا! حالہ۔۔۔“

”لیکن ختنہ تو حضرت موسیٰ کی امت بھی کرتی ہے برہمن۔“

”ہماری اور بات ہے۔۔۔ لیکن یہ ختنہ شدہ کتے بڑے فتنے ہیں فتنے۔“

پتہ نہیں انسان کی یہ کیا کمزوری ہے۔ اپنے دل میں وہی بات بری نہیں لگتی، دوسرے میں میں وہی غیب ناقابل تصور آتا ہے۔ نو آغاز محبوبہ سے چھیڑ چھاڑ میں بڑا لطف ملتا ہے۔ میں برہمن سے کہتا۔۔۔ ”بڑے افسوس کی بات ہے تم ختنہ شدہ مسلمان کا جو حال کرو یا پھر کبھی تمہارے دل میں ان کے خلاف بغض بھرا ہوا ہے۔“

”یہ ہماری سر زمین ہے۔“

”کیسے بھی کیسے۔۔۔ زمین تو قابو بنا ساری خدا کی ہے۔“

”اس لیے کہ حضرت موسیٰ اسی ریگستان میں میرے آباؤ اجداد کو لائے تھے۔“ برہمن طرارہ بھرتی۔  
”اور تم لوگوں نے یہاں آباد رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ تم من و سلوٹی کھاتے کھاتے تھک گئے تھے۔ یکدم تم نے پلٹ کر اور مسور کی دال، گئے تھے۔ یاد ہے۔۔۔“ میں نے اسے محض گرم کرنے کے لیے کہا۔

برہمن نے میرے سینے پر ہاتھ مارے اور چلا کر کہا۔۔۔ ”کرچھین کرچھین!“

”میں نہیں میری ماں کرچھین ہے اور وہ بھی رومن کیتھولک۔۔۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ کبوتو یہودی ہو جاؤں۔“  
”یہودی ہوتے نہیں۔۔۔ یہودی پیدا ہوتے ہیں۔ اب پتہ چلا کہ تم یہودیوں کے لیے اتنی سخت باتیں کیوں کہتے ہو؟“

میں اب منہ کے انداز میں کہتا۔۔۔ ”پیاری برہمن! جس قوم میں برہمن پیدا ہو جائے اس کے متعلق کوئی سخت بات نہیں کہی جا سکتی ہے۔“

”چلو خوشامدی جھوٹے!“

”اگر ایک بات کہوں تو برا تو نہ مانو گی۔“ میں نے کہا۔

”کہو۔“

”یہ جو اسرائیل کا خط ہے جس کے ارد گرد تمہاری گولڈاما سیر کسی کو قدم دھرنے نہیں دیتی۔ یہ جنت تمہیں ہی ملے گی۔“

”ناں نان نان۔ کوئی یہودیوں کی وجہ سے نہیں منکر۔۔۔ یہ عیسائیوں کی یہود پرستی نے نہیں اسلام دشمنی نے یہ

خطہ دلویا ہے۔ عیسائیوں کو ہم سے محبت نہیں لیکن انہیں مسلمانوں سے نفرت ہے۔ اتنی نفرت اتنی نفرت کہ وہ مسلمانوں سے نفرت کرنے کے لیے یہودیوں سے محبت کرنے کو بھی برا نہیں جانتے۔ ہم تو سانچے دشمن کی محبت میں ایک ہوئے ہیں۔

”عیسائیوں کو یہودیوں سے نفرت.....؟ تو بہ کرو تو بہ۔“

”تو جرمی سے ہمیں نکالنے والے کون تھے؟“

”ہم امریکن تو نہیں تھے۔ ہمیں تو یہودیوں سے عشق ہے عشق۔“

میں اسے منانے کی کوشش کرتا لیکن وہ چپ ہو جاتی، اندر سے اُٹتی رہتی۔ برجی میں اس قدر جوش و خروش عزم، ایسی تیز استدلالی قوت تھی کہ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر پھر اسی موضوع پر حتم گتھا ہو جاتی۔

ایک روز ملکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ براڈ لاف کی لان پر پانی کی بوندیں، برجی کے براؤن بالوں میں قطرے تھے۔ ہم چوری چوری تخلیقی ادب کی کلاس سے نکل کر چھوٹے سے ریستوران میں جا بیٹھے۔ کافی کے ساتھ گلاسکوٹ پر شہد لگا کر کھاتے رہے۔ اس روز برجی نے مجھے ایک خوبصورت ماڈتھ ہارمونیکا دیا۔ میں نے اس پر چوڑی سے بجایا۔

Should old acquaintance be for God

And never brought to mind

جھپ کر برجی نے مجھ سے ہارمونیکا چھین لیا اور سختی سے بولی۔ ”اس لیے کر دیا ہے کہ تم ابھی سے مجھے واقف کار بنا لو..... اچھا شکریہ ہے۔“

ہم دونوں نے کافی ختم کر کے پھر لمبی گھاس گا ہوں کا رخ کیا۔ بے مصرف ادھر ادھر..... کبھی مشرق کی طرف مغرب کی جانب۔ پھر برجی نے یورپ کے پناہ گزینوں کی باتیں شروع کر دیں۔ ”میری ماں برلن سے بھاگ کر آئی تھی۔ فرانس میں بھی نازیوں کا راج تھا۔ اس نے تین دن انڈر گراؤنڈ گٹر میں چھپ کر بسر کیے۔ پھر وہ ایک نازی کیمپ چڑھ گئی۔ اس نے پورا ایک ماہ میری ماں کو دھبیوں کی طرح استعمال کیا اور بعد ازاں فوجیوں کے حوالے کر دیا۔“

میری ماں کا کیا قصور تھا۔ تاہا اس میں میرا کیا جرم ہے کہ میں یہودی ہوں۔“

میں نے اس کے آنسو اپنے رومال میں جذب کیے اور زہرناک گفتگو جاری رکھی۔ ”برجی! تمہاری آ صدیوں سے اصل مسکن کی تلاش میں ہے۔ یقیناً تم لوگوں نے ظلم تو سہے ہیں۔ تمہیں تو مظلوموں سے محبت ہونا چاہیے۔“

”ہے..... ہے ہم ظلم کو کسی روپ میں برداشت نہیں کرتے۔“

”پھر ان فلسطینیوں کے متعلق کیا حکم ہے جنہیں اپنے ہی ملک میں تمہاری وجہ سے جلا وطنی نصیب ہوئی ہے۔“

برسوں سے غاروں میں رہتے ہیں اور اسرائیل کی طرف چہرہ اٹھا کر یوں دیکھتے ہیں جیسے زمین سورج کی طرف منسوب ہے۔

”ہے..... ہر صبح۔“

برجی کا سر میرے سینے تک آتا تھا، اس نے بازو اٹھا کر میرے سینے پر ٹکوں کی بارش کر دی۔

”تم بھی Philistine ہو..... فلسطین..... فلسطین۔“

جب برجنی بھڑک اٹھی تو میرے مسام کھل جاتے۔ میرے لبوں کی گردش تیز ہو جاتی۔ میں مکمل طور پر اس کا متاثر ہوتا ہوں۔ جوں جوں برجنی بھڑکتی، مجھ میں شہوت کی زیادتی کچھ ایسی ہو جاتی کہ میرا جی چاہتا میں برجنی کو پلیٹ میں اس کے جسم کے نازک مقامات کو چھری کانٹے سے کاٹ کاٹ کر کھا جاؤں۔

ان ہی دنوں جب برجنی نے مجھے ہتھیلی پر شہد ڈال کر چاٹنا سکھایا، میں نے اسلام دشمنی کا سبق بھی ورق ورق سے یاد کیا۔ میں نے اسی کی دور بین لگا کر ہر مسلمان کو جانچنے، پرکھنے اور دھتکارنے کا عمل سیکھ لیا۔ ایسی ہی گریڈ 10 میں مجھے سوڈان کا سیاہ فام داؤد نظر پڑا۔ اس اویب کی جلد اتنی سیاہ تھی کہ ترچھی روشنی میں اس کی جلد تھوڑی سی نیلی بھی نظر آنے لگتی۔ اس کا قد مجھ سے دو انچ چھوٹا تھا۔ اسے چلتے پھرتے دیکھ کر کبھی احساس نہ ہوتا کہ وہ کسی مسلمان کا آدمی ہے۔

اس کی چال میں وقار، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ، آواز میں مدہم آرگن کا سوز تھا۔ وہ بات سننے سے پہلے بات شروع دیتا۔ ہر مناظرے میں آپ کو جیت جانے کے موقعے بہم پہنچاتا۔ اپنی چیزیں دوسروں میں بانٹ کر راحت دیتا۔ لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کر کے بذال Honorated محسوس کرتا۔ بس میں ہم جماعتوں کی تکلیفیں خرید کر کبھی مسلمان نہ کرتا۔ جب کبھی کسی کے ساتھ کھانا پائے کافی پیتا کبھی ڈچ (Dutch) کرنے پر اصرار نہ کرتا بلکہ سارا بل خود ادا کرتا۔ کسی کے ساتھ چلتا تو سارا راستہ چھوڑ کر ذرا سا پیچھے رہ کر ہم سفری اختیار کرتا۔ اپنے لائبریری کارڈ پر دوسروں کو شکر لینے دیتا۔ اپنے کو پین دوسروں کو مستعار دے دیتا۔ داؤد ساری کلاس سے مختلف تھا۔ شاید اسی اختلاف کے باعث ہم سب میں نمایاں بھی تھا۔

”برجنی! تم داؤد کے رنگ کی وجہ سے اس سے نفرت کرتی ہو؟“

”جہیں..... میرے کئی سیاہ فام لوگ اچھے دوست ہیں۔“

”پھر اس کی آنکھیں، بال..... وہ تم سے مختلف ہے اس لیے۔“

”نہیں۔“

”پھر اس نفرت کی وجہ کیا اس کا اخلاق ہے؟“

”خاک اچھا اخلاق ہے۔ سارا ڈرامہ ہے ڈرامہ..... وہ ساری کلاس سے اپنے احساس کمتری کو چھپا کر اپنے

کو بے ترتیب ثابت کرنے کی مصیبت میں پڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا خاص اخلاقی طریقہ..... جنگ ات۔“

”شاید یہی انسانی عمل کی معراج ہے۔ اخلاق کی جیت۔“

”بھاڑ میں جائے داؤد، اس کا اخلاق غارت ہو، برباد ہو۔“

”اتنا غصہ، اتنا غصہ..... اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی تمہیں نہیں دیکھا۔ شاید سڑک پر وہ تمہیں پہچان بھی نہ

سکے۔ میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔“

”ہاں نہیں دیکھتا۔ یہ کمبخت مسلمان یہ تعدد ازدواج کے بھوکے..... شہوت خورے۔ یہ ہر عورت کو دیکھتے

پتلی ماں بیٹی بہن کسی کو نہیں چھوڑتے حرامی۔ اپنی کزن سے شادی کر لیتے ہیں۔ چوری چوری دیکھتا ہو گا مجھے۔ جانتا



ہے میں اسے قتل کر دوں گی اگر اس نے سیدھا دیکھا۔“

”غالباً تمہاری خواہش ہے کہ وہ تمہیں دیکھے، جب نہیں دیکھتا تو تمہاری بیٹی ہوتی ہے۔“

پہلی مرتبہ برجی مجھ سے سنجیدہ طور پر ناراض ہوئی۔ اس نے کلاس میں میرے ساتھ بیٹھنا چھوڑ دیا۔ براڈ لاف کی خوبصورت لائون پر ٹہلنے کے لیے ہم اکٹھے نہ نکلتے۔ مجھے معافی نامہ لکھ کر اسے منانا پڑا۔

اس واقعے کے قریباً دس روز بعد ہم سارے نوآموزا دیب رات کو دس بجے ہوٹل کے کامن روم میں گئے ہوئے۔ ہمیں برجی کی ساگرہ میں شریک ہونا تھا۔ ساگرہ میں شہویت کے لیے سب کو اپنے اپنے کمرے سے کھانے کی چیز لے کر پہنچنا تھا۔ میں نے شراب کی دو بوتلیں پھولوں کی ٹوکری میں سجائیں اور لٹکتا منگتا پہنچا۔ داؤد مجھے دروازے میں ملا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے راست چھوڑ دیا اور بڑے سے ٹیکہ کو سنبھالنا ہوا دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

سارا جگہ اس خوبصورت ٹیکہ کی وجہ سے ہوا۔ دو فٹے چوڑے اور چھ فٹ لمبے ٹیکہ پر ایک نخلستان بن گیا۔ ہم سب نے اونچے اونچے پی پی برتھ ڈے لویو گانا شروع کیا۔ سب سے خوبصورت آواز داؤد کی تھی۔ کسی نے برجی کو کالے کالے والی چھری پڑائی۔ ٹیکہ پر پھلنے والی چھوٹی چھوٹی موم بتیاں جگمگ جگمگ جل رہی تھیں۔ برجی اپنی جگہ سے ہنس مسم نہ ہوئی۔ آوازیں رگ گئیں۔ کمرے میں خاموشی چھانے لگی۔

”چلو برجی اتنی جگمگ نظر نہ بنو۔ ٹیکہ کا ٹو۔“

”میں کسی مسلمان آدمی کا تحفہ قبول نہیں کر سکتی۔ یہ ٹیکہ داؤد لایا تھا۔“

داؤد نے آہستہ سے کتب اٹھایا اور غالباً وہ اس وقت محض سے چلا جاتا، اگر کچھ لوگ اسے پکڑ نہ لیتے۔

”نہیں بھئی نہیں، تم ہرگز ہر نہیں جانتے۔“

برجی بڑی ہرولعریز ترکی تھی لیکن چار فٹ گیارہ انچ میں سا رہا رو وہی بھرا تھا۔

”جانے دو جانے دو۔۔۔ میں ٹیکہ کالے آدمی کی خاطر اپنی پارٹی خراب نہیں کر سکتی۔“

داؤد جواب دروازے سے تھوڑی سی دور تھا، یکدم رک گیا۔ جیسے فیموں کے بہروز کا کرتے ہیں۔ پھر وہ

آواز میں بولا۔ ”کالا آدمی؟ کیا حضرت آدم سفید تھے۔۔۔ کیا حضرت موسیٰ کی جلد، حضرت عیسیٰ کا وجود سفید تھا۔

لوگوں نے انہیں اپنے جیسا بنایا ہے لیکن وہ صحرائی تر جیسا نہ تھا، ہم جیسا سیاہ آدمی تھا۔“

اب فضا میں قہقہے ابھرنے لگے۔

”یہ ہے مسلمانوں کی ذہنیت، یہ ہے ان کی عقل اور پھر کہتے ہیں Dark Ages میں ان کی تہذیب۔“

سائنس عروج پر تھی۔ یہ تو ان کا علم ہے اب۔ برجی نے اونچی آواز میں کہا۔

کہیں سے ایک کریم رول اڑ کر داؤد کے ماتھے پر لگ کر پڑا۔

”مسلمان Barbarians تو ہوتے ہی ہیں۔ آج پتہ چلا احمق بھی بلا کے ہیں۔ ٹیکہ لے آیا ہے۔“

وقوف۔ برجی کی ایک دوست بولی۔

کہیں سے ایک اور آواز آئی۔ ”بھی تم لوگ توحید پرست کہلاتے ہو تو پھر مکہ میں جا کر حجر اسود کیوں چومتے  
ہے۔ بت پرستی نہیں ہے؟“

”Idolatry..... بت پرستی..... بت پرستی.....“ کچھ کورس میں کہنے لگے۔ اب عیسائی اور یہودی اسلام دشمنی  
شراب بن گئے۔ کہیں سے ایک سینڈویچ داؤد کے سر کو چھو کر دیوار سے ٹکرائی۔

”شیم شیم اتنی شادیاں۔ عورتوں کے حقوق نہیں جانتے تم مسلمان لوگ۔“

اب جیلی کا ایک تودہ داؤد پر آگرا۔ اس کے خوبصورت سوٹ پر جا بجا گوشت کے ٹکڑے سے چپک گئے۔  
پاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے دھری چھوٹی سی میز پر ایک دھڑو یا۔ اسے نہ نخلستان کی پروا تھی نہ اپنے  
کھانے والی چیزوں کی۔ وہ آسانی سے اس ذلت سے بھاگ بھی سکتا تھا لیکن نہ جانے وہ صبر کی کونسی کیل تھی جس  
سے بچ گیا۔

کسی کسی لمحے میں بڑا جادو ہوتا ہے۔ موقع فراہم کیا جاتا ہے آپ کی جہت سمت بدل جاتی ہے۔ میں پتہ نہیں  
چلاؤ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ برقی بھاگ کر میرے پاس آئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح میرے سینے پر ٹٹے مارتے  
تھے۔ ”اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ کلکٹر۔“

پتہ نہیں کیوں میری ساری محبت کہیں کا فور ہو چکی تھی۔ میں نے برقی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”اپنے سرے  
کو لے کر باہر چلی جاؤ ورنہ تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔“  
محفل خاموش ہو گئی۔

میں نے پتہ کر داؤد کی طرف دیکھا۔ اس کے آنکھی چہرے پر آنسو تیزی سے بہ رہے تھے۔ وہ اپنے سامنے  
کے نخلستان کو فور سے دیکھ رہا تھا۔  
”داؤد.....“ میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”مجھے رحم کی ضرورت نہیں ہے دوست۔ میں ان کی ہر بات کا جواب دے سکتا ہوں لیکن میں... طائف پہنچ  
تے ہیں میں نے اس لمحے نامہ حدیبیہ کو اپنے پر وارد ہوتے پہچان لیا۔ میں کوڑا پھینکنے والی مائی برجی کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔  
یہ لوگوں کے نبی نے تو دوسرا گال پیش کرنے کا حکم دے رکھا ہے... پھر... پھر یہ سب کیا ہے؟“  
وہ چپ چاپ ایک وہیں چھوڑ کر بڑے بڑے قدم دھرت چلا گیا۔

اس وقت باباجی نور والے اندر آئے۔ پتہ نہیں وہ بروقت آنے کا حکم کیسے جانتے تھے۔ شمس نے اپنی رام کہانی  
یعنی سرو قد کھڑا ہو گیا اور باباجی سے کہنے لگا۔ ”باباجی! میرے وطن میں اتنا علم ہے، اتنا عمل ہے۔ ہم علم میں اس قدر  
تعمیر ہو چکے ہیں کہ کامن پین کا سرا کہیں اور بنتا ہے اور اس کی سوئی کہیں اور تیار ہوتی ہے۔ ہم میں specialize  
کرنے کا رواج ہے۔ ہم Communication کے دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے Specialization اور  
Communicate۔ ہم وہ تمام جنسی خیالات جو چار سال کی عمر میں ہم پر سکول سے وارد ہوئے۔ سب دوسروں سے  
communicate کرنا چاہتے ہیں۔ پوچھیے پوچھیے بولی میں سے کیا افہام و تفہیم اس قدر ضروری ہے۔ کیا برجی کی طرح

مجروح کرنے والا سچ بولنا ضروری ہے؟“

باباجی نے فرمایا۔ ”ہٹ شمس! سچ اپنے متعلق بولا جاتا ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب آپ کو ضرورت ہو۔“

ضرورت ہو اور آپ لوگوں کی نظر میں اپنا قد گھٹانا چاہتے ہوں۔“

خاں صاحب نے باباجی کی طرف دیکھ کر پرچھا۔ ”اور باباجی افہام و تفہیم کے لیے بولنا۔“

”یعنی مناظرہ کرنا۔ بحث مباحثے میں داخل ہونا۔“

”جی ہمس تو Discussions کا بہت شوق ہے۔“ خاں صاحب نے اعتراف کیا۔

”جان لو صاحبو! مناظرہ جب بھی ہوتا ہے کم علمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور شوکتِ نفس کے لیے کیا چاہتے ہیں۔“

ساری محفل کو ایک اُمی نے چپ کرادیا۔

جب ترجمہ کر کے شمس کو معنی سمجھائے گئے تو اس کی نیلی آنکھیں جیسے وجد میں بھر آئیں اور پھر ہونٹوں سے

کہنے لگا۔ ”داؤد سچا تھا..... داؤد سچا تھا..... ایک اور بھی علمِ نافع ہے نبیوں کا علم..... جسے آج کا پڑھا لکھا Secular

بھولتا جا رہا ہے۔ بھولتا جا رہا ہے۔ بدنصیب۔“

باباجی گویا شمس کے سوال کا جواب دینے آئے تھے۔ ترنت ہی وہ واپس چلے گئے اور اس سے آگے کوئی

کی۔

شمس کی باتیں سن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ کیا شمس مغرب کے ایسے والدین کا بیٹا تھا جو دنیا بھر کی

کم عمری میں بچوں کو پیش کر کے زندہ رہنے کی Excitement بچوں سے چھین لیتے ہیں، جو سات برس سے جسمی

شکار ہو کر تیس برس کی عمر میں گڑھست آشرم میں داخل ہو جاتے ہیں اور چند سال یہاں بسر کر کے جنگوں میں

شہروں میں، نئے پتروں میں اپنا آپ گنوانے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کیا یہی تحریک ایسے ہی سرچشموں کی

باری تحریک تھی؟

یاشمس کسی ایسے گھرانے کا چشم و چراغ تھا جہاں ماں باپ بچے کو کوالٹی ٹائم دے کر بری الذمہ ہو جاتے

جہاں ماں باپ کو علم نہیں کہ دھرتی تو ہمہ وقت سورج چاہتی ہے۔ بچہ تو ہمیشہ ماں باپ کی توجہ کا طالب ہوتا ہے۔

ہو کر اپنی ذات کو کھو بیٹھتا ہے۔ اسے کسی کوالٹی ٹائم سے سیر نہیں کیا جاسکتا۔

کیا شمس مہاتما بدھ کا پیروکار تھا..... سب کچھ تیاگ چکا تھا۔

کیا شمس صائین میں سے تھا؟ ایسا پرہیزگار جو ہستی ہستی تلاش حق میں نکلا کرتے ہیں؟

ہو سکتا ہے وہ سی آئی اے یا کسی اور فارن ایجنسی کا ایجنٹ ہو جو ہمیں بدل کر جیبوں میں نفعی ٹیپ ریپ

کر جگہ جگہ کی رپورٹ پیچھے کرتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وطن واپسی پر شمس ہمارے لوک ریت میں ڈوبے پس ماندہ ملک

کتاب لکھنے والا ہو جیسی مارگریٹ میڈ، روٹھ Benedict نے لکھی۔ رسم و رواج، لوک ریت، دھرم راج کی گنجگ

مجھے بھی ہمیشہ کی طرح شمس کی اسلام قبولی پر پورا اعتماد نہ تھا۔ میں بھی سونے میں کھوٹ کی تلاش میں تھی۔

شمس خاں صاحب کے قریب بیٹھا تھا اور بڑی رازداری سے کہہ رہا تھا..... ”پتہ نہیں کیوں میں آپ

تھے۔ پر مجبور ہوں لیکن کوئی چیز مجھے اکساتی ہے کہ میں سب کچھ بتاؤں۔ چھوٹی چھوٹی تفصیل۔ شاید میں اپنے اوپر کسی سبب سے متاثر ہوں۔ سنیے اشفاق صاحب! میں ایک مرتبہ زبردست اسلام دشمنی کا شکار بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم تھا کہ جب عزت کا چکر پورا مکمل ہو جاتا ہے تو پھر محبت کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنڈولم بھی ایک ہی سمت میں

یہ حملہ بول کر شمس خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنا سر زانو پر دھر لیا۔ اس وقت نہ جانے وہ قونیہ میں تھا کہ براڈ لاف میں۔ افغانستان کے کسی زاویے میں بیٹھا تھا کہ عراق کی گلیوں میں۔ ہم نے اسے واپس لانے کی کوشش نہ کی اور چپ بیٹھا آئے۔

خاں صاحب بہت آہستہ آہستہ کھانا کھاتے تھے۔ خاص کر جب ان کے سامنے والے دانت اور کھچیل داڑھیوں کے ساتھ تو وہ تیزی سے کھا، چبا نہیں سکتے تھے لیکن ممن آباد میں ہی جب ان کا وزن بڑھنے لگا اور وہ پہلی بار ڈائٹنگ کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ایک لفٹن دان خرید لائے۔ اس کے تین ڈبوں میں سبزیاں اور نچلے ڈبے میں پانی ڈالا جاتا تھا۔ پھر سب سے پہلے پر رکھ کر پکاتے۔ نچلے پانی میں بھاپ پیدا ہوتی اور سبزیاں اسی بھاپ میں پک جاتیں۔ پھر احتیاط سے ڈبہ

عموماً یہ لفٹن کیریر یا تو محمد علی کھولتا یا پھر خاں صاحب خود دھیان سے اسے نکالتے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کھانا کھاتا ہوں۔ میں ڈبہ کھولتے ہوئے گرم پانی اپنے پرائڈ میں لٹکتی ہوں۔ خود گر کر ڈبے کو اپنے اوپر گرانے کی اہل ہوں۔ تو یہ دھیان، اپنے خیال میں مگن قسم کی روح تھی کہ تو تھ برش پر پیست لگانے کے بعد ٹیوب کو ڈھکنا لگا نا بھی بھول جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ”ٹیوب بند کرتے اور پھر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتے ”حرام دیکھے ڈھکنا تو لگا دیا۔ ٹیوب سوکھ جاتی ہے۔“

ان کے مونا پے کا مجھے تب کم احساس تھا اور انہیں زیادہ۔ جب ان کے دانت نہیں ٹوٹے تھے لیکن تب بھی وہ کھانا کھاتا تھا۔ آہستہ آہستہ چبا کر اور مزے مزے سے کھاتے تھے۔ جیسے اللہ کی نعمت کو انجوائے کر رہے ہوں۔ اس کے برعکس میں جیسے ایسے کھانا کھاتی ہوں جیسے کتے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ ہر نوالے کے ساتھ میرے دماغ پر ان کاموں کی یادیں آ جاتی ہیں جو پھانے سے رہ گئے۔ خطوں کے جواب، فون کال، سفارشی خط، استری والے کپڑے وغیرہ وغیرہ۔ تب ہی اس وقت اس مجھے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔

میرے ساتھ ساتھ زندگی کو لیمن ڈراپ کی طرح چوسنے کا فن خاں صاحب کی عادت بن گئی۔ وہ بات کرتے تو کھانا کھانے پر دین کرنے کے لیے، کھانا کھاتے تو کام و دین کو خوش کرنے کے لیے۔ لباس پہننے چاہے وہ کھدر کا کرتہ ہی ہو۔ سب سے بڑے اہتمام سے۔ سوچتے تو ایک ٹانگ زانو کھڑا کر کے دوسری ٹانگ کو آدھی چوکڑی کی شکل میں اس طرح رکھتے۔ سرے پاؤں کو ہاتھ سے پھانے کے لیے خالی رکھتے۔ انہیں اس طرح نیم دراز آسن میں دیکھ کر لگتا جیسے آنند دیکھ کر کسی مٹھ میں سادھی لگائے براجمان ہے۔

وہ ہر کام کو پورا وقت دے کر اس کا احترام کر کے اس پر پوری توجہ صرف کر کے کیا کرتے تھے۔ سر کہ ڈالنا ہو،

انگلیٹھی پر کہا ب لگانے ہوں، جڑی بوٹیاں کوٹنی ہوں، سکر پٹ لکھنا ہو۔ وہ کبھی بھاجڑ، بھگدڑ، ہم پناخے سے بھاگ کرتے۔

یہ بات تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ اشفاق احمد صوفی تھے یا نہیں تھے لیکن میں نے کالج میں ہی یہ بات سنی تھی کہ ان کے تیور مختلف ہیں۔ ان میں دو باتیں عام لوگوں جیسی نہ تھیں۔ صوفی اور عام خلق میں واضح فرق Handling کا ہے۔ اپنی فریٹ کی سطح پر صوفی بھی ان ساری برائیوں میں وقافو قفا گرفتار ہوتا ہے جس سے عام مسلمان دوچار رہتا ہے۔ گندا اور صاف ابو ہر خاکی کے اندر بہتا ہے۔ وہ ہر مقام پر دوئی سے نبرد آزما ہے۔ صوفی بھی اپنے نفس میں مبتلا رہتا ہے اور کبھی کبھی ناکام بھی ہو جاتا ہے۔

اسے بھی عشق ہو جاتا ہے۔

وہ بھی جھوٹ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

وہ بھی قرض لے کر مگر سکتا ہے۔

حقوق العباد سے غافل ہو سکتا ہے۔

وہ ہر مقام پر بردقت اسی طرح خطرے کی زد میں رہتا ہے جس طرح آپ اور میں رہتے ہیں لیکن صوفی اپنے چھوٹے بڑے گناہوں کو ہم سے مختلف طریق سے حل کرتا ہے۔ وہ اللہ کی قائم کردہ سرحدوں کو جہاں نفس سے کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ جو عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ توبہ کا دروازہ کھٹکھٹانا ہو یا اپنے آپ کو مصائب صوفی جلد یاد دیر اللہ کو راضی کرنے کا فن جانتا ہے۔

خاں صاحب نے مجھے نسخہ تو نہیں بتایا لیکن قرآن سے لگتا ہے وہ اللہ کو منانے، راضی کرنے اور اپنا کارنامہ کافن جانتے تھے۔ دوسرا اہم کام خلق کی رعایت سے ہوا کرتا ہے۔ صوفی برائی کرنے والے سے اللہ کی مخلوق سمجھتا ہے۔ چور کی چوری کو برا فعل سمجھتا ہے لیکن چور سے نفرت نہیں کرتا بلکہ چور کو قطب بننے میں مدد دیتا ہے۔ جھوٹ سے نفرت کرتا ہے، جھوٹے سے قطع تعلق نہیں کرتا۔ شرابی کی اس Failing پر ناخوش ہوتا ہے، لیکن شرابی سے نفرت نہیں چھوڑتا۔

خاں صاحب ہر قسم کے لوگوں سے ملتے تھے۔ جن میں سارے شرعی عیب تھے، ان سے بھی اور وہ بھی چھپ کر عیبوں کی چھالیہ چہاتے رہتے ہیں۔ میں نے انہیں کبھی کسی کو اس کے عیب کی وجہ سے چھوڑتے نہیں دیکھے گوٹالی کرتے۔ نہ نکتہ چینی۔ شاید چپکے چپکے دعا کرتے رہتے ہوں۔ شاید صدقہ خیرات کرتے ہوں لیکن اعلانیہ نہیں۔ میں نے مجھے نسخہ تو نہیں بتایا لیکن میں نے ان کی صحبت میں کئی ایسے لوگ دیکھے جو راستہ بھولے ہوئے تھے اور پھر اپنی اپنی خوشی سے لوٹ آئے۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ خاں صاحب صوفی تھے لیکن بدی کی Handling میں ان کا وطیرہ صوفیوں جیسا تھا۔ Wisdom کے ساتھ ساتھ یہاں کی Folk Wisdom پر بھی ایمان تھا۔ وہ ایسے محاورے اکٹھے کرتے رہتے تھے مشعل راہ ہو سکتے ہیں۔ شاید اسی بصیرت کی تلاش انہیں بار بار نور والوں کے ڈیرے پر لے جاتی۔ کچھ محاورے

کے لیے رقم کرتی ہوں۔

1- ہونٹوں میں نیشکر ہونا۔

2- بھیڑ کو بھیڑیوں کی حمایت میں جانے کی ترغیب دینا۔

3- کسی سوئی کی دو تیز نوکیں نہیں ہوتیں۔

4- وہ شیر کی طرح نچے سکیڑ کر بیٹھا ہے۔

5- ایسی آری کی طرح جس کے دونوں طرف دندانے ہوں۔

6- مٹر کا دانہ اپنی پھلی کو بھول جاتا ہے۔

7- جو تک سانپ بننا چاہتی ہے۔

8- آگ لگ جانے پر کنواں کھودنا۔

9- ایک گونگے آدمی کے خواب کی طرح۔

10- وہ چوتھڑوں کی آگ ہے۔

11- قند کا بنا ہوا تپلا۔

12- مردہ گھوڑے کو نعل بندھوانا۔

13- جو درخت پر چڑھتا ہے وہ دو گنا دیکھتا ہے۔

14- شکر میٹھی ہوتی ہے خواہ اندھیرے میں ہی ملے۔

15- درمیان سے کئے ہوئے درخت تلے لیٹنا۔

16- کیا سینگ بیل کے لیے بہت بھاری ہیں۔

17- گدھے کے لیے کنگھی۔

18- بیوہ سے شوہر مانگنا۔

19- نہ میں شہد مانگتا ہوں اور نہ ڈنگ چاہتا ہوں۔

20- ایسا گاؤں بسا نا جہاں پانی نہ ملتا ہو۔

21- جب جھاڑی ہی کھیت کھانے لگے تو پھر حفاظت کون کرے گا۔

22- کیا تم اس درخت سے پھانس لے مرو گے جسے تمہارے باپ نے لگایا تھا۔

23- تیل کا پیانا ہمیشہ چکنا ہوتا ہے۔

24- غصے والی عورت سے منکنے والا گھر بہتر ہے۔

25- بیٹکن کے تخم سے کدو پیدا نہ ہوں گے۔

26- اگر کپڑا کسی خاردار جھاڑی پر پھیلا ہو تو اسے احتیاط سے اتارنا چاہیے۔

27- تمر ہندی خشک ہو کر بھی املی ہی رہتی ہے۔

28- جو محبت کرتا ہے محنت کرتا ہے۔ (پشتو)

29- چا تو اپنے دستے کو نہیں کاٹتا۔

30- ریچھ پہاڑ میں بولے سینا بنا پھرتا ہے۔

نورواہلوں کے ڈیرے پر بھی خاں صاحب ایسی ہی بصیرت، ایسے ہی اقوال زریں کی تلاش کرنے جانتے تھے وہاں میں اور خاں صاحب تو ڈاکٹر اشرف فاضلی سے مل چکے تھے لیکن عفت کی ملاقات چند دنوں بعد ڈاکٹر اشرف سے ہوئی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق بابا جی پیش گوئی بہت پہلے کر چکے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کا بھی بادشاہ ہیں اور ویسے بھی بادشاہ ہیں۔

یہ ایک اور علم تھا، اس تک ہماری رسائی نہ تھی۔ اس سے پہلے سدا سہانوں اور شمس کی ملاقاتوں نے تذبذب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ اپنی مغربی تعلیم اور ڈاکٹری کی تعلیم کے باعث ایسے نہیں علم کے متعلق بڑے شکوکہ سے اسے غالباً کسی علم پر یقین محکم باقی نہ رہا تھا۔

اس روز ہم حسب عادت دھرم پورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ریل کا پھاٹک گزرتے ہی وہی آدھے فوہرے دور خانہ بدوشوں کی جھلیاں تھیں۔ ان کے سچے اور بچوں ہی جیسے پیارے پاتو کتے کبھی کبھی ریل کی پٹری تک بھاگتے کرتے تھے۔ دوسری طرف کانئی جے جو ہڑ کے کنارے پلے نیم خستہ بغل در بغل آباد گھروں میں کھڑک نما لوگوں کا گھونٹا تھا۔ جو ہڑ کنارے اُگنے والے نرسلوں کے باعث یہ گھر پکی سڑک سے بڑی دور دور لگتے تھے۔

لیکن خانہ بدوشوں کی گھری..... اپنی مثیالی عورتوں، تنگ دھڑنگ بچوں، سلور کے برتنوں اور ڈبوکتوں کی کافی نزدیک محسوس ہوتی ہے۔ ریل کے پھاٹک سے بازار تک کوئی آدھ فرلانگ راستہ تھا۔ بازار سے گزرتے ہوئے دونوں جانب مدل کلاس شرفاء کے مکانات بھی تھے۔ ان لوگوں نے مکانات کو پینٹ بنانے کی کوشش میں پینٹ سڑے، کپے قفل، کنڈیاں زنجیروں سے یوں گھر ٹھونس رکھے تھے کہ گرمیوں میں یہ تین پانچ مرلے کے مکانات جاتے۔

اسی گرمی کے پھاڈ کے لیے چار پائیاں باہر نکل آئیں۔ لوگوں نے نیم، دھریک اور کیکر کے درخت پھاٹک رکھے تھے۔ صرف دور ایک امتاس کا درخت اس ساری سڑک کی زینت اور بابا جی کا سہل تھا۔ جب ہم ریل کے پہنچے تو بجلی سے چلنے والی ریل ٹھکا ٹھک کھٹا کھٹ گزر رہی تھی۔

خاں صاحب نے بریک لگائی۔ گاڑی کے گزرنے کا انتظار کیا اور پیچھے مڑ کر پوچھا ”تھک تو نہیں گئی؟“  
تھکی ہوئی غنودگی کا شکار عفت بولی..... ”نہیں اشفاق بھائی تھیک ہوں۔“  
”بس اب پہنچے ہی سمجھو۔“

پھاٹک کھلا۔ نرسلوں سے ڈھکی آبادی میں کوئی کوئی جتی روشن ہو چکی تھی۔ ہم جلد ہی ڈیرہ پاک کے امتاس کے درخت تلے پہنچ گئے۔ اس درخت سے ڈیرے کی چوکھٹ تک ستراسی فنٹ کا فاصلہ تھا لیکن یہ راستہ صحیح ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ ہم چبوترے کے پاس سے گزرے تو بائیں طرف چٹائیوں پر ابھی کچھ لوگ وردوٹھے سے

دوسری طرف چار پائیوں پر دنیا کے روگی، راندہ درگاہ جسم اور دل کے داغوں سے بے زار، شفا اور شفا عمت کی  
مجھ لے مایوس صورت بیٹھے تھے۔

زیلے پاک پر بھی دنیا کا ہر وہ رنگ موجود تھا جو اللہ کی مخلوق کا نظام ہے۔ دنیا دار، سیانے، عاشق، دیوانے، فقیر  
میں سے لے کر رقت سے لبریز، چور اور چوری سے بیزار چور، خیرات میں سب کچھ بانٹ ڈالنے والے، اپنی بچی کو بیچ کر  
دیکھنے والے، بے نیکی کا نکاح کروانے والے، راست باز دروغ گو..... ایک اللہ کا رنگ وحدت کی سفید روشنی، الماس کے درخت  
کے پتوں میں ان گنت رنگوں میں بٹ گئی تھی۔ الماس کا درخت مخطوطہ مستوی (Prism) تھا جس میں سے وحدت کی ایک  
رنگ نکل کر دوسری جانب کثرت کے رنگوں میں بدل گئی تھی۔ تھڑے پر چٹانوں کے اوپر، وہلیوں پر، چار پائیوں پر  
اللہ کی وحدت نے کثرت کا روپ دھار لیا تھا۔

اس دن سدا سہاگنیں تھکی ہاری روٹی کھانے میں مشغول تھیں۔ دو بھرائی خوب سرسوں کا تیل لگائے بالوں کی  
لے چسکے لے رہے تھے۔ ایک درمیانی عمر کا فریبہ جسم، عیاش صورت بڈی سے گودا نکالنے کی غرض سے اسے ہتھیلی  
پر رکھ کر وہ سدا سہاگن نہ ہوتا تو ضرور کامیاب ٹرک ڈرائیور ہوتا۔ اس کی ناک چھدی ہوئی تھی جس میں چاندی کی  
سرپریشی پچکا تھا۔ جب وہ ناچتا تو اسی پکے کا گھونگھٹ بنا لیتا۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے باباجی کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت ایک روگی کو چینی کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے۔ ہر نوالہ  
تھے منہ میں بھی خود ڈالتے اور ہریار مسکرا کر اسے کھانے پر آمادہ کرتے۔

”لوجی بڑی خیر ہوگی..... یہ دو ٹرکیاں اور..... بس۔“

روگی لڑکے نے بیزار ہو کر کہا..... ”نہا بابجی یہاں رولا بہت ہے..... مجھے رولے سے تے آتی ہے۔“

”ناں پت ناں..... یہاں کوئی رولا نہیں..... رولا تو وہاں ہوتا ہے جہاں مولا نہ ہو۔ یہاں تو مولا ہی مولا

حسب عادت ہمیں بابا جلال نیچے تہ خانے میں لے گیا۔ وہی منظر۔ فرش پر سندھی اجرک کا فرش، نیچے روگی  
سے سرکنڈوں کی چٹوں کے ساتھ ساتھ چھینٹوں کے پرنٹ کے گاؤٹیکے، دیواروں پر جا بجا عقیدت مندوں کی  
پا جاسے، تہ میں کھوٹیوں سے لگی ہوئیں۔ سارے میں بھونے ہوئے پھول کھانوں کی خوشبو۔ تھوڑی دیر بعد بابا  
تعمیر ہو جکتے ہوئے آ گئے۔

”بڑی تکلیف ہے باباجی۔“ عفت بولی۔

”بڑی خیر ہوگی..... بیٹھو بیٹھو..... بیٹا! تکلیف سواری ہوتی ہے۔ جب تک تکلیف سواری نہ بنے یہاں تک

تعمیر ہو سکتا۔“

”پتہ نہیں مجھ سے کیا خطا ہوگی ہے باباجی! جس کی اتنی بڑی سزا ملی ہے۔“ عفت نے دکھ سے کہا۔

”جب تک انسان سے خطا نہ ہو، رب کی طرف سے عطا نہیں ہوتی۔ صاحبو جان لو، جتنی بڑی خطا ہوگی اتنی

تعمیر ہونے والی ہے۔ بشرطیکہ انسان سچے دل سے توبہ کر لے۔“ حجرے میں سے بے شک بے شک کی آوازیں



آئیں۔ اس سے پہلے مجھے احساس نہ ہوا تھا کہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر فاضلی اور شمس تہہ خانے میں بیٹھے تھے۔

بابا جلال ہمیشہ کی طرح دسترخوان بچھانے میں مشغول تھا۔ عفت نے شمس کی طرف دیکھا۔ پھر حیران سے جی طرف نظر اٹھائی۔

”ٹھیک ہو جائے گی بی بی۔ آپ فکر نہ کریں اشفاق صاحب۔“ بابا جی مسکرا کر بولے۔

”کیوں پُت بھوک لگتی ہے۔“

”نہیں بابا جی۔“

”لگے گی لگے گی انشاء اللہ۔ ہم دو آئی دیں گے۔ رب اس میں شفا شامل کر دے گا۔“

بابا جی پھر تھبو تھبو کر کے چلے گئے۔ کمرے میں سے سانسٹا کلوڑ چلا گیا۔ چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کو کھلونوں میں پیک کر کے لمبی لمبی جرابوں میں گھر گھر لے جانے والا سانسٹا کلوڑ جو ہمیشہ چمنی کے راستے، آدھی رات کو کمرے میں آیا کرتا ہے اور ہر گھر میں رات کے اندھیرے میں چنگ کے ساتھ جراب باندھ کر رخصت ہو جاتا ہے۔ مسکراتا ہوا بابا۔

بچوں کے لیے کھلونے، عورتوں کے لیے ملبوسات، سینٹ کی شیشیاں، میک اپ کا سامان۔ مردوں کے اخروت کی لکڑی کے پائپ، گھڑیاں، شمینین کی بوتلیں وغیرہ وغیرہ۔ سانسٹا کلوڑ نے اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ گھروں پر آہستہ آہستہ گرتی ہے اور فضا میں حمد یہ گانوں (Card Singing) کی آواز مدغم پڑ جاتی ہے تو۔ ہے۔ رات کے پچھلے پہر۔

مغرب کا سانسٹا کلوڑ ایک خوبصورت Ritual کی روایت تھی۔ اس نے کرمس کے تہواروں کو انسانوں قابل تقلید بنا دیا ہے۔

ڈیرے کا بابا ایک اور قسم کا سانسٹا کلوڑ تھا، جس نے حال کی گھڑی پر ایک اور قسم کا سماں باندھ رکھا تھا۔ بابا جی کے جانے کے بعد ہم اٹھ کر شمس اور ڈاکٹر فاضلی کے پاس جا بیٹھے۔ شمس نے اگر عینک نہ پہن رکھی ہوتی تو اس کا سینا ہوا چہرہ حضرت عیسیٰ کی ان شبیہوں سے ملتا جو یہودیوں کے آرسٹ بنا یا کرتے ہیں۔

دراز قد سانولے ڈاکٹر فاضلی نے بڑی رواں انگریزی میں شمس سے باتیں شروع کر رکھی تھیں۔ عفت تھوڑی دیر کے بعد غنودگی کا شکار ہو جاتی، ان باتوں کی ٹوہ میں چوکس بیٹھی تھی۔ یہ ساری مخلوق کیسی تھی؟

شمس مکمل عقیدت بنا بیٹھا تھا۔ دراز قد ڈاکٹر فاضلی نفس کشی کے باوجود اپنے اندر کہیں انا کا ستارہ چمکنا نظر آتا تھا۔ وہ دونوں بے تکان انگریزی میں ”سکینہ الاولیاء“ کی باتیں کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اسے تفسیر بیان کر رہے تھے۔ مسئلہ جبر و قدر کو آسان مثالوں سے بیان کر رہے تھے۔ شمس مجسم حیرت بنانے کی باندھے، کلیجہ شوق کیے حاضر خدمت تھا۔ اس وقت سارا علم نگاہوں سے کانوں سے اندر اتارنے کی گھڑی تھی۔

بالآخر شمس نے کہا۔ ”ہم مغرب والے بہت بیمار ہو چکے ہیں ڈاکٹر صاحب! ہماری روح کو کئی قسم کے کیڑے لگے ہیں۔ ہم ڈارون کی طرح صرف بگ بینگ پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم یہ جان ہی نہیں سکتے کہ زندگی کسی خدا نے بھی بنائی ہوگی۔ ہم نے Sex کو فرائیڈ کی طرح اپنے اوپر سوار کر لیا ہے۔ اب جنس کی آرزو پوری کرنا ہی اہم ہے۔ جنس کا یہ حق نفسیاتی امراض کو دعوت دینے کے برابر ہے۔“

کارل مارکس نے بھوک اور غربی کا جو علاج کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ واحد علاج ہے۔ ہم کارل مارکس کو جاننے والے جان ہی نہیں سکتے کہ خدا رزق دیتا ہے۔ کسی کو زیادہ کسی کو کم۔ اسی امتحان میں وہ انسان کو پتلا کرتا ہے کہ کون کونسا حق سے حضرت عثمان کی طرح آخرت خریدتا ہے اور کون نہ ہونے کے مقام پر پیٹ پر چھر ہاتھ کر سوتا ہے اور کون نہیں کرتا۔

دراز قد ڈاکٹر نے بڑی ملامت سے کہا۔ ”ناں صاحب نانا۔ سائنس بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے لیکن انیسویں صدی دور تک نہیں جاتی۔ اوپر والے کی مرضی، ایک وقت پر وہ کس قدر عظم عطا کرے۔“

شمس نے رو ہانسی آواز میں کہا۔ ”ہم بکھر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! کبھی آپ نے سوچا کہ سفید فام قوموں میں کبھی کبھی پیدا ہوتے؟ کبھی نہیں سوچا ہوگا۔ یہ ساری عطا براؤن سیاہ قوموں پر کیوں؟ میں بتاؤں سفید لوگوں میں کبھی کبھی کی کمی ہے۔ وہ Humble ہونا نہیں جانتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں اور کوئی نہیں جان سکتا۔ ہماری خودی کا یہ عالم ہے کہ ہم اگر حضرت عیسیٰ کی تصویر بنا لیں گے تو وہ گورا ہوگا۔ ہم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ شاید حضرت عیسیٰ نے ہوں گے۔ ڈارون، فرائیڈ اور کارل مارکس نے تو مغربی سوچ کا بھٹے ہی ہٹھا دیا ہے۔“

”ناں جی نانا ایسا نہ کہیں۔ یہ علم بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔“

”بسم اللہ کیجیے۔“ بابا جلال نے دسترخوان لگانے کے بعد کہا۔

شمس اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے اپنے پیالوں میں شور بہ ڈال لیا اور آہستہ آہستہ کھانے لگے۔

”آپ بھی لیں اشفاق صاحب۔“

خاں صاحب نے تھوڑا سا ساٹن ڈال لیا اور مودب انداز میں کھانے لگے۔

”کھاؤ بی بی.....“ ڈاکٹر صاحب نے فاصلے سے کہا۔

”آپ کھائیے مجھے بھوک نہیں۔“ عنفت بولی۔

”دولتے سہی، ہمارا کھانا پاک ہو جائے گا۔“

”پاک ہو جائے گا..... یہ کیا منطق ہے؟“

”بابا جی کا کہنا ہے جو آدمی اپنے کھانے میں سے کسی کو کھلاتا ہے، وہ اپنا کھانا پاک کر لیتا ہے۔ بڑے بڑے

صحابہ کرام، قطب اولیاء کا یہی مسلک ہے۔ حضرت ابراہیم کی روایت ہے جی کھانا کھلانا۔“ شمس کھاتے ہوئے کہنے لگا۔

ہم سب کھانے میں مشغول ہو گئے۔

شمس نے کہا ”ڈاکٹر صاحب! ہمارے معاشرے میں چھوٹی چھوٹی کئی قسم کی بغاوتیں ہو رہی ہیں۔ ہماری

عورتیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے Wilt اور Red Stocking کی تحریکیں چلائی ہیں۔ انہوں نے صدیوں کی غلامی کا طوق اتار پھینکا ہے۔ صدیوں کی غلامی کے عوض انہیں کیا ملا۔ مرد نے ہمیشہ انہیں اپنے سے کمتر ہی سمجھا اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔“

وہ کسی خبریں پڑھنے والے کی طرح کھٹک دار آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”سینے ڈاکٹر صاحب! مغرب نے وہیں علیحدہ ہو کر نبیوں کے علم پر Secular تعلیم کو ترجیح دے کر اپنے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ میں نے مشرق کے زاویے، ڈیرے، عبادت گاہوں میں رہ کر سیکھا ہے کہ عورت عارفِ دنیا ہے اور مرد عارفِ مولا ہے۔ دونوں کا سفر حوالہ ہے، متقابل نہیں۔ دونوں کی سعی مختلف ہے۔ عورت پرورش کے لیے بنی ہے اور مرد کفالت کے لیے۔ چونکہ اسی دنیا کھلی بنا ہے۔ اس لیے مرد کو عارفِ دنیا کو خوش کر کے وین کا کندن اسی سونے سے تیار کرنا پڑتا ہے۔ عورت چونکہ اللہ کی طرف پرورش کرتی ہے، اس لیے مختلف قسم کی مصروفیت کے باعث اسے دین عارفِ مولا کے بغیر مل نہیں سکتا۔

دونوں قدم بہ قدم متوازی چلتے ہیں لیکن مغرب میں ایسا وقت آ گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مد مقابل گئے ہیں۔ مغرب کا مرد عورت کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ عورت جب بھی اس کا مقابلہ کرے گی، منہ کی کھائے گی۔ چونکہ وہ فطرتاً کمزور اور ناقص ہے۔ مسابقت کی بھیئت چڑھ جائے گی۔ ادھر عورت پرورش میں خدا کا ساتھی بننے کے بجائے مرد کے نیچا دکھانے پر تلی ہوئی ہے۔ بھلا جب معاون مد مقابل بن جائیں گے تو انتشار کے علاوہ کیا ملے گا۔“ شمس بلا سکان امریکہ انگریزی میں بولے جا رہا تھا۔

عفت نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور مہوت اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

”ہمارے سکول، کالج، ہمارا تعلیمی نظام جس پر ہمیں اس درجہ فخر ہے۔ کیسے بچے بنا رہا ہے؟ ہمارے بچے کتنے belong نہیں کرتے۔ وہ خالی گھروں میں اپنی چابی سے دروازہ کھولتے ہیں۔ اپنا سیریل بنا کر خود کھاتے پھر کھول کھول کر ایک لا اعلق Information oriented دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ٹی وی پر کارٹون دیکھتے ہیں اور کھیل سروس والے Giants بن جاتے ہیں۔ ان کا سراپا بنا ہو جاتا ہے کہ کسی دروازے سے نکلنا ممکن نہیں رہتا اور کھیل صرف دروازوں سے نکلنے کا نام ہے۔“

ڈاکٹر صاحب بولے ”جان من! گھبرائیں نہیں۔ یہ سارا علم بھی اوپر سے عطا ہو رہا ہے۔ آپ جھگڑانے کو اس وقت سفید لوگوں پر اللہ کی طرف سے نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ Empirical evidence سے تجربات کر کے سیکھ رہے ہیں۔ بیچارے اللہ کے سفید چوہے بنے ہوئے ہیں۔ اگر اپنے منہ کو گھٹ کے پکڑے رہتے تو زیادہ شور مچا اٹھائی پڑتی لیکن جیسی اوپر والے کی مرضی۔ جس طرح چاہے وہ جیسا رکھے۔“

جس وقت یہ دونوں بے تکان بول رہے تھے، باباجی پھر اچانک آ گئے۔ باتیں انگریزی میں ہو رہی تھیں۔ جی انگریزی نہیں جانتے تھے۔ پتہ نہیں یہ ٹیلی پیٹھی کا کون سا مقام تھا کہ باباجی نے مباحثہ کو یوں ختم کر دیا۔ آپ نے بچوں کو علم کی اہمیت ضرور بتا دی ہے لیکن یہ نہیں سمجھایا کہ عقل چراغِ راہ نہیں ہے۔ صداقت چراغِ راہ ہے۔ صداقت ہمیشہ نئی سے ملتی ہے۔ وہ صداقت کا مجرہ ساتھ لاتا ہے۔“

باباجی کے ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل، سونف کا عرق اور مروارید کی مجون تھی۔

”تھوہت خیر ہو جائے گی۔ اللہ نے چاہا تو بیماری ٹل جائے گی۔ جب پیاس لگے انار کارس پینا ہے۔ چاہے دو

پھراںہوں نے ہاتھ میں کچھ کرلی تلمیس خاں صاحب کے سپرد کرویں اور ان کے استعمال کا طریقہ بھی ان ہی کو

”میں نے تو سنا ہے باباجی موت کا وقت معین ہے۔ ٹل نہیں سکتی۔“ عنفت نے پوچھا۔

”ٹلتی ہے ٹلتی ہے، وہ کسی بات کا پابند تھوڑی ہے۔ وہ اپنے ویوں کو کرامت اور اپنے نبی کو معجزہ عطا کرتا ہے۔

موت کی برکت سے بہت کچھ ملتا ہے۔ زندگی کا وقفہ لمبا ہوتا ہے۔ موت کی گھڑی ٹلتی ہے۔“

”لیکن کیسے حضور؟ کیسے؟“ عنفت نے سوال کیا۔

”پت! ہمارا قصائی موت کے شنبے میں آیا ہوا تھا۔ گھر والے اسے روپیٹ چکے تھے۔ پھر اس کا جوان بیٹا ہاتھ

سے ہارے پاس آیا اور کہنے لگا۔... باباجی! حریص ہوں، حرص کی بات کرنے آیا ہوں۔ جانتا ہوں میرا باپ کافی

توڑ چکا ہے لیکن دل اس کی موت پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا کوئی چارہ لگتا ہے تو لگا لیجیے۔ ہمارے بس سے تو بات

کے محبت اللہ کا حکم ہو گیا مانگو، ہم قصائی کے گھر پہنچے۔ بڑھے قصائی کے زخروے سے موت کی آواز آرہی تھی۔ چہرے

تھکے بیٹا تھا۔ آنکھوں کی جوت ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے رب سے دعا کی، ربا سے بخش دے تو آخری حکم، آخری

کرم ہے۔ تجھے کسی نے پوچھنا نہیں۔ تجھے کون سوال جواب کرے۔ ڈیرے پر تیری خلق روٹی کھاتی ہے۔ یہ قصائی اچھا

توڑتا ہے۔ ابھی اس کی ضرورت ہے۔ تیری داڑھی تھک گیا..... جانے دے ہمارا دن رکھ لے۔ لوبلی بی دوسرے دن

آ گیا دکان پر..... ابھی تک اسی کی دوکان سے گوشت آتا ہے۔“

”جب سے یہاں آئی ہوں مجھے ہر وقت نیند آتی رہتی ہے باباجی..... کیا کروں؟“

”خیر ہوگئی پت خیر ہوگئی۔ اب ہمیشہ آرام سے سوئے گی دھی رانی۔ انار کے رس سے عنفت نہیں برتی۔ پت جو

ہوا ہے اس نے موت کا ڈانٹہ چکھنا تو ضرور ہے۔ ہم تو مہلت مانگتے ہیں۔ وقت ٹالنے کو کہتے ہیں۔ وہ ضدی

کسی مان لیتا ہے۔“

کمرے میں جو بھی موجود تھا اس بات کا آرزو مند تھا کہ عنفت آرام سے بیٹھے، صحت مند ہو جائے۔ میں تھوڑی

تھوڑی کا شکر تھی۔ بھلا انار کارس، بادام روغن اور ایک معمولی سی مروارید کی مجون فیمل ہوتے گردوں کا کیسے علاج ہو سکتے

ہیں۔ ہو سکتا ہے کہیں یہ مرید پھانسنے کا طریقہ نہ ہو۔ عین ممکن ہے خاں صاحب کی پوزیشن کا ڈیرے پر اثر ہو گیا ہو۔ اتنی

سخت فطری محبت سے مجھے عجیب قسم کی وحشت ہو رہی تھی۔ کیا یہ خوشامد تھی؟ کیا خیر خواہی اسی طرح مفت بھی مل سکتی ہے؟

ڈاکٹر صاحب بولے۔ ”اپنے باباجی کہا کرتے ہیں کہ اگر آپ طیب خوراک کھانا چاہتے ہیں تو اس میں تھوڑا سا

کھسی، بوبو بھی کھلائیے۔ اگر اپنی روزی پاک کرنا چاہتے ہیں تو اپنی کمائی میں کسی اور کو بھی شریک کیجیے۔ جب اپنے گھر کے

لئے سودا خریدو تو کسی بیوہ، کسی سفید پوش، ضرورت مند کے لیے بھی اسی قدر سودا سلف بھجوا دیا کریں۔ اپنے بچوں کی تعلیم

پاک کرنی ہو تو ویسے ہی کسی یتیم، نادار کے بچے کی تعلیم مکمل کروادی۔ اس کی کتابوں، فیس، یونیفارم کے ذمہ دار ہو گئے۔  
لباس پاک کرنا ہو تو پہلے دو جوڑے سلوا کر دے دیئے۔ پھر اپنے جوڑے بنوائے۔“

”پتہ ہے ایک دھویا ایک پہن لیا۔“ ایک مرید کو نے میں سے بولا۔

”ناں جان من ناناں..... ایک خود پہن لیا، ایک کسی ایسے شخص کو دے دیا جو سلائی بھی نہیں دے سکتا۔ نئے سوتے سے اس کی عید ہو گئی۔ آپ کا جوڑا پاک ہو گیا۔“

یہ تو میں جان گئی تھی کہ ڈیرے کا قاعدہ تھا کہ جو نبی کوئی حاجت مند تکلیف کی سواری پر سوار ادھر آتا اس کی مرض کی تشخیص سے پہلے دسترخوان بچھ جاتا ہے۔ اس دسترخوان پر ہر چیز کا لطف، رنگ، لذت موجود ہوتی جیسے ماں کے دودھ میں کسی آمیزش کا گمان نہیں ہوتا۔ یہ کھانے بھی شیر ماور کی طرح محبت کی چاشنی سے بھرے ہوتے۔ کھانے کے پہلے ہر وقت گجراتی روغنی بیانون میں کیکر کی چھال سے بنی ٹوکڑی چائے آتی۔

”آپ کے ڈیرے نے مجھے حیران کر دیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ تو اضع کا یہ معیار بیسویں صدی میں کہیں نہیں۔“ عفت بولی۔

”بی بی یہاں سب کچھ صداقت پر مبنی ہے۔ ہر قول کا فعل شاہد ہے اور ہر فعل پر کسی شاہد کی نظر ہے۔“

خاں صاحب تو ایک عرصہ سے یہاں آتے رہتے تھے۔ وہ یہاں کی Terminology سے خوب واقف تھے لیکن میرے لیے فعل، شاہد، صداقت..... اور ایسے ہی دوسرے الفاظ بالکل نئے تھے اور میں نے انہیں ان معنوں میں استعمال نہ کیا تھا۔

”کیا یہاں ڈاکٹر صاحب ہر طرف خیر ہی خیر ہے؟“ عفت نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

”جی نہیں...“ ڈاکٹر صاحب نے قطعیت سے جواب دیا۔

اشفاق صاحب یوں مسکرائے جیسے جواب پہلے سے جانتے ہوں۔

”کیا مطلب؟“ عفت نے سوال کیا۔

”دیکھی آپ نے مقناطیس کا چھوٹا سا ٹکڑا دیکھا ہے۔ اس ٹکڑے کے دو حصے ہوتے ہیں شمالی قطب اور جنوبی قطب..... مقناطیس کو درمیان میں سے کاٹ کر دیکھیے اور کوشش کیجیے شمالی اور جنوبی قطب علیحدہ ہو جائیں، آپ کو کئی ٹکڑے مل گئے کہ نئے دو ٹکڑوں میں پھر شمالی اور جنوبی قطب پیدا ہو جائیں گے۔ آپ مقناطیس کو کاٹنے کے عمل سے چھوٹا کر کے چھوٹا کر کے جائیں تو مقناطیس کے آخری مولی کیول میں بھی ایک سر شمالی اور دوسرا جنوبی قطب ہو گا۔

انسان کا بھی یہی حال ہے بی بی۔ اسے خیر اور شر دونوں سے بنایا گیا ہے۔ اس میں آگ اور پانی یکساں موجود ہوتے ہیں۔ گو ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن چراغ اندھیرے کے بغیر روشن نہیں ہو سکتا نہ خوشنما ہی لگتا ہے۔ ایک بات ہے کچھ اللہ کے بزرگان دین اپنے شر کو اپنے نفس کو شیطان کی ترغیب کو اپنے اندر کے خیر کے تابع کر لیتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی کرامت انسانی ہے۔ کتا موجود ہو لیکن زنجیر سے بندھا رہے۔ بھونکے تو ضرور صرف کاٹ نہ کھائے۔ شمس نے اپنے گرتے سے ہاتھ پونچھ کر سوال کیا۔ ”میرے لیے کوئی راستہ؟“

”ہر تلاش کرنے والے کے لیے راہ ہوتی ہے۔“

شمس نے آہ بھر کر کہا۔ ”ہاں بشرطیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے؟“

”آرزو ہو تو راستہ خود بخود دکھائی دے جاتا ہے برادر.....“ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

”میں نیویارک کا رہنے والا ہوں۔ میری ماں اوپرائسنگ تھی۔ میرا باپ سکول ماسٹر تھا۔ بچوں کو تعلیم دیتا، ڈسپلن

دیتے بڑے بڑے لوگوں کی مثالیں دیتا۔ ان کے علم کی خوشہ چینی کرتا۔ وہ ایک معمولی Clergyman کی طرح اندر سے

سیدھا تھا۔ دوسروں کو سیدھا کرتے کرتے وہ خود کبڑا ہو گیا تھا۔ گھر، باغ، غسنخانہ ہر جگہ اس کی جماعت کا کمرہ تھا لیکن

ان کے گلے میں ایک آزاد پرندہ تھا۔ کبھی کبھی وہ باورچی خانے میں برتن اٹھاتے، ہنسی کاٹنے کے وقت گانے گنتی تو

گنتی پڑھتا میں اس کی آواز کے ساتھ سڑوں سے ارتعاش کے ساتھ نضاؤں میں گم ہو جاؤں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا

مجموعہ کے ساتھ کائنات کا سفر کر سکتا ہے؟ کیا وہ کسی بلیک ہول میں تو ختم نہیں ہو جائے گا؟“

”آپ کے پاس شب معراج کی شہادت موجود ہے۔ ویسے تو اب لوگ Levitation کو بھی سائنس بنانے

کے ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی میں اپنی تعلیم کی وجہ سے تشکیک کا شکار ہو جاتا ہوں۔ جس Data کو لیبارٹری میں نہیں لے

سکتے ہیں پرنٹنگی ایمان نہیں لایا جاسکتا، ہم جیسے لوگوں سے۔“ شمس بولا۔

میں نے دل میں ڈاکٹر صاحب کی بات سے اتفاق نہ کیا۔

”میں بھی اس ذریعے پر تشکیک کا تیزاب لے کر آیا تھا۔ بڑے بڑے دل کا آدمی تھا میں..... لیکن..... بابا جی

میں نے میری سنی گم کر دی۔ میرا تیزاب شہد بن گیا۔ اخلاق ہی معیار ہے۔ اسی کی انجی ٹیپ سے فٹ بھی ناپے

تے ہیں اور گز بھی۔ سیدھا کرنے کے لیے ہمیشہ اخلاق کی داب کام آتی ہے۔ معیار کا میاب آدمی نہیں۔ معیار اچھے

تو والا انسان ہے۔“

”آپ کون ہیں ڈاکٹر صاحب؟“ عفت نے سوال کیا۔

”میں ضلع فیصل آباد کا رہنے والا ہوں۔ میرے آباؤ اجداد پشت با پشت سے بل جوتے، فصلیں بوتے،

شمس کاٹتے آئے ہیں۔ ان کسان لوگوں کو اللہ کی رحمت بادلوں میں نظر آتی رہی ہے۔ وہ رحمت کی تلاش میں اوپر

گئے آئے ہیں۔“

”عفت پوچھتی ہے ڈاکٹر صاحب! پھر سوچ کر جواب دیجیے، آپ کون ہیں؟“ شمس نے سوال کیا۔

شمس کی نیلی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”تو آپ اتباع رسول کے پیروکار ہیں۔ واقف منزل ہیں آپ؟ آپ

نہیں ہیں کس راستے پر چل کر انسان معراج کو پہنچ سکتا ہے؟“

”ہاں چلتے رہنا شرط ہے۔ یہاں وہاں منزل کا تعین نہیں۔ بس اس راستے پر سبھی Pedestrian (راہ رو)

۔ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے منزل پائی۔“

شمس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر کہا۔ ”بس ڈگڈگانا نہیں۔ چلتے رہنا اپنی رہنمائی کرتے رہنا۔ اپنے آپ کو حوصلہ

دے کر چلنے پر آمادہ کرتے رہنا ڈاکٹر صاحب۔ ابھی مجھ سے میرے ہم شکل میرے کئی ہم وطن ادھر تلاش میں آئیں گے۔

میرے ہم وطن نہیں جانتے کہ روشنی کدھر سے آرہی ہے۔ وہ صرف اس قدر جانتے ہیں کہ جدھر وہ ہیں، اُدھر گھپتے ہوئے ہے۔ مایوسی ہے۔ آنے والے ضرور سوال کریں گے پلیز انہیں جواب دینے کے لیے، ان کی رہبری کے لیے ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ انہیں مایوس نہ کرنا۔ مایوسی سے بچانا ڈاکٹر صاحب!

شمس اور ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں بنگلگیر ہو کر عہد و پیمان کرنے لگیں۔ عفت نے جو نوالہ اٹھا رکھا تھا، پیالے میں ڈال دیا۔ خاں صاحب نے بڑی مینھی مسکراہٹ کے ساتھ پیالے میں نظریں گاڑ دیں۔ گویا شمس اور ڈاکٹر صاحب کے لیگل کاغذوں پر گواہ بن کر دستخط کر رہے ہوں۔

اس وقت تہہ خانے کا دروازہ کھول کر ایک بھاری بھر کم سفید قام بڑا ہی تنومند آدمی داخل ہوا۔ اس کی چوٹی فلمی وٹن جیسی، جسم پر دو شالا، رئیس ابن رئیس جیسے ہاتھ پاؤں خود اعتمادی میں بھنگی ہوئی آواز میں گھڑائی سی گرج۔ اس نے گلے میں ایک بڑا سا گیندے کا بار پہن رکھا تھا، جس کے پھول نوج نوج کروہ ادھر ادھر پھینک رہا تھا۔

”فراڈ ہے بابا..... چکر ہے..... جان پھیلا رکھا ہے با بے سنے..... بادام روغن کی بوتلیں بیچی جا رہا ہے۔ معجونیں گھوٹ گھوٹ کر پکڑا رہا ہے سب کو..... آلو شورے کھلا اٹھا رہتا ہے کہ وہی خلق خدا..... لچا بد معاش..... پوتی بیٹھی ہے کو..... جہانت سکھا دی سب کو، پاکھنڈی ہے بابا..... پینا خلق خدا کا فائدہ کرو..... خلوت خلوت ایک کرو..... یہ خلوت کیا ہوتی ہے؟..... کیا ہوتی ہے صحت جوت؟ خلوت خلوت..... خلوت خلوت۔“

اس نے وحال ڈالنے والوں کی طرح خلوت خلوت کی تھا پ پر ناچنا شروع کر دیا۔ پھر یکدم ایک ہتھوڑے پٹ کروہ زار زار رونے لگا۔

عفت خوفزدہ ہو کر بولی۔ ”گھر نہ چلیں اشفاق بھائی۔ مجھے..... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“  
ہم تینوں خاموشی سے اٹھ آئے۔ نہ کسی نے ہمیں روکا نہ کسی قسم کا اصرار کیا۔  
اشفاق صاحب کے ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل اور معجون تھی جسے وہ بڑی احتیاط سے اٹھائے ہم نے آگے چل رہے تھے۔

نوار نے ڈیرے کا تسمخرازا کر ایک بار پھر عفت کے ارادے کو متزلزل کر دیا۔ اس کے چہرے سے روشنی تم ہو گئی۔ شکر اور گمان نے چھاپہ مار کر اسے جھنجھوڑ دیا۔ واپسی پر خاں صاحب اوپر اپنے خلوت خانے یعنی لائبریری میں چلے گئے۔ ابھی ”تلقین شاہ“ کا سنوڈیو انہیں خاں کی تحویل میں تھا۔ وہی اس کی ریکارڈنگ کرتا، اس کا حساب رکھتا اور تلقین شاہ کی ریکارڈنگ کے دوران ”کٹ اٹ“ مؤدب زبان میں بولتا اور ساتھ ساتھ ایم بی اے کی تیاری کرتا۔

سنوڈیو سے ملحق ریکارڈنگ روم، غسل خانہ اور اس کے بعد اوپر چڑھنے والی گول *Spiral* میڑھیوں سے منزل کا حصہ تھیں۔ یہیں سے خاں صاحب کی باہر والی لائبریری شروع ہو جاتی تھی۔ تینوں طرف الماریاں اور ایک طرف میز پر کھلنے والی کھڑکی اور دروازہ تھا۔ اس لینڈنگ پر وہ میز بھی دھری تھی جس پر بیٹھ کر خاں صاحب سوچتے، لکھتے، پڑھنے میں مشغول ہو جاتے۔

اسی لائبریری میں ایک الماری تھی جو سسل خانے سے ملحق دیوار میں جڑی تھی۔ اس میں چپ بورڈ کے تختے تھے جن پر لکھی ہوئی تھیں۔ لندن، امریکہ سے لائے گئے پن، بال پوائنٹ، مارکر، ہائی لائنر، ربو، سیاہی مٹانے والے آلے، ڈائریاں، نوٹ بکس، ان پر لکھے ہوئے نوٹس، کافی کے ڈبے، جن سنگ اور قسم تقسم کے قبوے، لنز، چابیاں، پینسل، پین، پینسل، ہیلتھ چینز، نیل کٹر، فالکس..... یہاں ایک کانکٹ

ان تمام چیزوں کو زیر استعمال لانے کا خاں صاحب کو شوق نہ تھا۔ یہ تو ایک Memory Box تھا۔ جب وہ ایک پن اٹھا کر ایک گھڑی دیکھ کر کسی واقعہ، شخص، وقت کو حاضر کر لیتے۔ وقت اور مقام میں یوں آسانی سے سفر کرنا کے لیے آسان ہو جاتا۔ اس بازیچہ اطفال سے گزر کر وہ اپنی کتابوں میں گم ہو جاتے۔

ان کتابوں کا سلسلہ کسی محبوبہ کی داستان تھی۔ کچھ کتابیں ان کے ساتھ ملکر سے آئی تھیں۔ کچھ 1- مزنگ روڈ سے لگنی ہو گئی تھیں۔ وہ کسی شکاری کتے کی طرح سونگھ کر کتاب تلاش کر لیتے۔ امریکہ، اطالیہ، لندن سے کتابوں کے پتے آتے۔ انارکلی کے فٹ پاتھیے، ان کے یار تھے۔ جونہی ہم دونوں کسی کسی اتوار کو انارکلی میں داخل ہوتے۔ پچاس پچاس پچاس سے ملحق دیوار کے آگے فٹ پاتھ پر کتابیں پھیلائے کباڑیے ہمیں لپیک کہتے۔ انارکلی کے دہانے پر پتھر پرانی کتابیں مر عام منتظر ہوتیں۔ خاں صاحب چنتے رہتے۔ وہ کتابوں کو ٹھونکتے رہتے۔ مطلب کی سیکنڈ ہینڈ کتب خرید کر لگ جاتا۔ وہ ہر کباڑی کے ساتھ عورتوں کے انداز میں بھاؤ تاؤ کرتے۔ یہ ان کا کباڑیے کے ساتھ قائم کرنے کا طریقہ تھا۔ کار پارکنگ کرنے والوں سے ضرور پوچھتے کہ کار کا کرایہ کس قدر ہے اور یہ ریٹ کتنا ہے یا کم..... یہ بھی دوسرے کو گفتگو میں گھسیٹنے کا سر بندھ تھا۔

یوں کباڑیے کے ساتھ بحث مباحثے کے بعد بغیر گنے اسے پیسے دے دیتے اور واپسی پر جو کچھ بچ رہتا کسی کتے کے فٹ پاتھ پر ڈھیر فقیر کے سر ہانے رکھ کر گھر لوٹ آتے۔ جتنی دیر خاں صاحب اور کباڑیوں میں نوک جھونک، سبب ہوتا میں کوئی ایک کتاب اٹھا کر فٹ پاتھ کنارے بیٹھ جاتی اور اچھی خاصی کتاب پڑھ لیتی۔ رفتہ رفتہ مجھے دیکھ کر کباڑیوں کے مالک مجھے کوئی کرسی لادیا کرتے۔ میں سہولت سے پڑھتی رہتی۔ خاں صاحب پنگ پانگ کی بازی میں کبھی کبھیل کھیتے رہتے۔

واپسی پر ان کتابوں کی چھان پھنک ہوتی۔ وہ ان پر چڑھانے کے لیے سینٹ کے خالی براؤن کاغذ سے بنے تختے لگاتے۔ یہ تھیلے عموماً میوہ ہسپتال کے سامنے والے کباڑیوں سے حاصل کیے جاتے۔ گھر لا کر انہیں وزن تلے رکھ کر سیدھا کیا جاتا۔ کچھ دنوں بعد کھول کر کاغذ سیدھا کر کے انہیں کتابوں پر چڑھایا جاتا۔ کتابوں کی پشت پر موٹے مارکر سے سیدھا کرنا سے بڑے سلیقہ اور ترتیب سے سجایا جاتا۔

یہ سارا Ritual خاں صاحب کے لیے کسی تہوار کی طرح دلچسپ تھا۔ انہوں نے کتابوں کو انسانوں کا روپ دیا تھا۔ ہر کتاب کو خاکی لباس پہنا کر وہ اسے اپنی الماریوں کی رجمنٹ میں رکروٹ کر لیتے۔ ایک بار جب امجد



اسلام امجد اور فردوس ہمارے گھر آئے تو امجد نے کہا۔

”خاں صاحب..... یہ کتابوں کو کاغذ کون چڑھاتا ہے؟“

”میں اور کون؟“

”اور ان کے پستے پر کون نام لکھتا ہے کتاب کا؟“

”بھائی میں..... اور کون؟“

امجد ابھی حیران ہونے میں مشغول تھا کہ فردوس بولی۔ ”اور امجد آپ نے اپنی کتابیں گیراج میں یوں رکھی ہیں

رکھی ہیں جیسے عید کے دن او جڑیاں پڑی ہوتی ہیں سڑکوں پر۔“

بیپاری فردوس کو عظم نہ تھا کہ خاں صاحب ہر کام کا پراجیکٹ بنا لیتے ہیں۔ اسے مرنے کے انڈے کی طرح

ہیں اور جب اس میں سے چوزہ نکلتا ہے..... یاد کا ہلکا زرد چوزہ..... تو پھر خاں صاحب کو عجیب سی خوشی ہوتی ہے۔ جیسے

خواہشات کو تسخیر کرنے والے جکشو کو اپنے کاٹے میں پڑے باسی کھانے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ خواہشات کو فی الفور

میں جو آند تھا۔ اس عزم کو خاں صاحب سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ گھر آ کر کتابیں پڑھنا شروع نہیں کرتے تھے۔

خواہش پر اتواء کا ڈھلکانا گاتے۔ کتاب کی عزت افزائی میں مشغول رہ کر اسے ایک تہوار میں بدل کر وہ اپنی تربیت

رہتے تھے۔ کتابوں سے نکل کر خاں صاحب کو عفت کی فکر سمیٹ لیتی۔

لیکن باباجی کا تسخیر اڑانے والا عفت کو ایک بار پھر متزلزل کر گیا تھا۔

گھر پہنچ کر خاں صاحب نے عفت کے تذبذب کو بھانپ لیا لیکن وہ اسے کسی نتیجے پر جبراً پہنچانا نہیں

تھے۔ گھر کا بڑا پھانک نما دروازہ کھول کر اندر داخل ہو کر خاں صاحب Spiral میزھیوں پر گول گول چڑھتے اپنی

میں چلے گئے۔ میں عفت کے لیے انار کارس نکالنے باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ عفت کا سنی مہمان خانے میں

تھوڑی دیر کے بعد میں اُس کے لیے دیسی اناروں کا رس نکال کر کمرے میں گئی تو وہ پلنگ پر نیم دراز کشور سے بات

تھی۔

”ہاں ہاں..... بابا ہاں۔“

ادھر سے کشور سے غالباً کہا..... ”کہاں تھیں تم۔ میں نے تمہیں تین فون کیے ہیں۔“

”میں نے کہاں جانا ہے۔ باباجی کے علاوہ اور کہاں؟“

”ایک ڈاکٹر ہو کر تم کس جہالت میں پڑی ہو عفت؟“ کشور بولی۔

”وہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ وہاں رنگ رنگ کے آدمی ہیں۔ مجھ جیسے جسمانی مریض، کچھ ذہنی مریض

گزار، اڑب، چور، غنڈے، اچکلے۔“

”میں حیران ہوں لندن، ہالینڈ، فرانس کے بعد تمہیں یہی جگہ سوچھی ہے۔“

”باباجی کہا کرتے ہیں چونکہ اب جہالت انتہا کو پہنچ گئی ہے، اس لیے رحمت بھی انتہائی جوش پر آ گئی ہے۔“

”آخر یہ بابا ہے کون؟“ کشور نے سوال کیا۔

سیدھے سے بزرگ ہیں۔ اُن کے مرید باباجی کو نوے سالہا کا بتاتے ہیں۔ بڑے خوبصورت، گورے چہرے،  
 کہتے ہیں امی ہیں۔ مستی پہرہ گزار چکے ہیں۔“ عفت بولی۔  
 ”مستی پہرہ؟ وہ کیا ہوتا ہے؟“ کشور نے پوچھا۔

”جنگلوں میں نکل جاتے تھے۔ جانوروں سے باتیں کرتے تھے۔ بس درختوں سے پھل توڑ کر کھا لیتے۔  
 پورے چودہ برس پھر بزرگان دین میں سے ایک سائیں خدا بخش کے حضور پہنچ گئے۔ برسوں  
 کی تعلیم کیے گئے اور پھر تے پھرتے اب افسطری روڈ پر ڈیرہ ہے۔ کہتے ہیں..... ایک لفظ پڑھنا نہیں آتا۔  
 سے نہ ایک لفظ نہیں بولتے۔“

”لے یہ کیوں؟“

”کیوں اس لیے کہ فرماتے ہیں مناظرہ ہمیشہ شوکتِ نفس کے لیے ہوتا ہے۔“  
 ”کیا ٹھی ٹھی باتیں سیکھ آئی ہے ڈیرے سے..... ہسپتال گئی تھی؟“ عفت کی چھوٹی بہن کشور نے کہا۔  
 ”رس ملی لو عفت، باباجی نے فرمایا تھا۔“

”یہ تو کھٹا ہوگا، اس کا گلا پکڑا جائے گا قدسیہ، انار کارس مت پلاؤ۔“ کشور نے مجھ سے کہا۔  
 ”نہیں ویسی اناروں کا رس ہے، کھٹا نہیں ہے۔“

عفت کورس کا پینا اچھا تو نہ گا لیکن وہ چپ رہی..... ”ہسپتال گئی تھیں؟ بول۔“  
 ”نہیں۔“

”بلڈ ٹسٹ کروایا تھا؟“

”نہیں۔“

”ایکس رے؟“

عفت نے نفی میں سر دائیں بائیں ہلا دیا۔

”یورن ٹیسٹ؟“

”اوائے بابا نہیں نہیں نہیں۔“ عفت نے چڑ کر کشور سے کہا۔

”شہاب بھائی کو فون کرتی ہو۔ وہ بات کریں گے تیری اس نہیں نہیں نہیں کی۔“

عفت مسکرائی اور بولی..... ”وہ فون کرتے رہتے ہیں۔“

”لندن کب جاؤ گی چیک اپ کے لیے؟“

”شاید کبھی نہیں۔“

”لیکن یہ تو خطرناک ہے عفت۔ شہاب بھائی منع نہیں کرتے؟“

”انہوں نے قدسیہ کو منع کیا ہے۔ مجھے تو کچھ نہیں..... میں جو مرضی کروں۔“

”کیا منع کیا تھا قدسیہ؟“ مجھ سے کشور نے پوچھا۔

”شہاب صاحب نے مجھے منع کیا تھا کہ میں باباجی کی بیعت نہ کروں۔ یہ زمانہ بیعت کا نہیں ہے۔“

”یہ قدسیہ بڑی وہمی ہے۔ باباجی بیعت تھوڑی کرتے ہیں۔ وہ تو وضو کراتے ہیں۔ پاک کرتے ہیں۔“

انہوں نے مجھے وضو کرانا تھا، یہ وہاں گئی ہی نہیں کھوتے کا سر..... بڑی جاہل ہے۔“ عفت بولی۔

”لیکن بیعت کیوں نہیں کرنی قدسیہ..... کیا وجہ؟“ کشور بہت پریشان تھی۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا ”شہاب بھائی کہتے ہیں بیعت کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اگر آداب

ماننے کا عہد کر لے تو پھر شیخ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ اگر باباجی نے تینوں سپوت ڈیرے پر رکھ لیے تو کیا میں

کر لوں گی۔“

”ایویں..... باباجی کیوں ایسا کریں گے؟“ عفت نے کہا۔

”اگر باباجی ثاقب کا بیاہ کسی اندھی لڑکی سے کر دیں تو مان جاؤ گی عفت؟“ کشور نے سوال کیا۔

ہیں شہاب بھائی۔ اب اتنا پڑھ لکھ کر تو آدمی بیعت شیت نہیں کر سکتا۔“ کشور نے بیعت کا ناپک بند کر دیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ کمرے میں دھند لکا چھا گیا تو عفت نے وہ بید لیپ روشن کر دیا جس

کا بلب روشن تھا۔ زبرد کے بلب میں یہ خاصیت ہو ا کرتی ہے کہ وہ دوسرے بلبوں کے مقابلے میں تو بے حیثیت

عطا کرتا ہے لیکن اگر آدھی رات کو اندھیرے میں روشن ہو تو اس کی نرمل روشنی میں ہر چیز کی جسامت، ماسخت

بڑی ہو جاتی ہے۔

عفت کی چھوٹی بہن کشور بڑی مایوس ہو گئی تھی۔ عفت تازہ مغرب پلٹ تھی۔ میرے خیال میں اس

سے مانوس کرنے والے ان پڑھ جاہل نالائق پیردکار نہ تھے۔ یہاں بھی ڈاکٹر صاحب اور شمس کی روشن باتوں نے

حصار میں لے لیا تھا۔ یہاں بھی مغربی چمک، سچائی، روشن خیالی ہی کام آئی۔ مغرب نے ہی عفت کو مشرقی

سے روشناس کرایا۔

چند دنوں کے بعد عفت اور میں ڈیرے پر پہنچیں تو باباجی ڈیرے پر موجود نہ تھے۔ ہم باہر ہی

بیٹھ گئیں۔ علی محمد صاحب حسب معمول کھانا تیار کر رہے تھے۔ بابا جلال نے پختے ہی لال چائے کے کپڑے

دھر دیئے۔

”ابھی باباجی آ جائیں گے۔ آپ چائے پیئیں۔“

اس وقت شمس کہیں سے آ گیا اور بے تکلفی سے ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے دل میں سوچا، یہ بھی

ہے کہ باباجی جیسے بزرگ کو شہرت سفید قام شمس سے مل رہی ہے۔ ان پر ایمان کو مضبوطی بخشنے والا مغربی تھا۔ شمس

باتیں سوچنے کی عادی تھی۔

گھر پہنچ کر عفت سے اشفاق صاحب نے پوچھا۔ ”طبیعت کیسی ہے عفت؟“

”ٹھیک ہے اشفاق بھائی۔“

”دنا رکارس بیاتھا؟“

جی۔“

قدسیہ کو یاد دلاتی رہنا۔ دن میں کم از کم تین بار..... ویسی انار..... قندھاری نہیں۔ اس کے کئی اور بکھیرے

جس نہ جائے۔“

نہیں جی یہ بھولتی نہیں۔“

عزق..... مجنون؟“

”جاری ہے، آپ فکر نہ کریں۔“

”عفت میں سوچ رہا تھا.....“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

”میں سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں ڈیرے پر لے جانا تو چاہیے تھا لیکن وہاں کے علاج کے سپرد کرنا زیادتی نہ ہو

کونسا اس طرح کے علاج میں بڑا Risk ہے۔“

”ہونے دیں..... مجھے رسک پسند ہے۔“

”بڑی خطا ہو جانے کا احتمال ہے۔“ خان صاحب بولے۔

”آپ نے سنا نہیں تھا اشفاق بھائی۔ بابا جی فرماتے تھے جہاں خطا ہے، وہیں عطا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی..... اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو شہاب مجھے کیا کہے گا۔“

عفت کھڑی رہی۔ اس کی مزاح کی جس اس وقت ماند پڑ گئی تھی۔ نہ اس نے ”اے ہے“ کہا نہ مسکرائی۔ خاں

صاحب کو گرائی جوتے اتارنے میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ پہلے خاں صاحب کا دل کسی سرہنگ زادے کا دل تھا۔

کلی کر لیتے تھے۔ نیا تجربہ ان کے تو سن تخیل کو بھاگنے پر مجبور کرتا۔ مشکل سے مشکل امتحان میں بھی کبھی ان کا پٹھا

وہ ہر بڑے امتحان میں خم ٹھونک کر زندگی کو مات دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

صاحب کے والد بابا محمد خاں فوت ہوئے تو میت گھر پر تھی۔ لوگوں کا انتظار ہو رہا تھا اور اسی کمرے میں بیٹھے خاں

صاحب کھینچنا لکھ رہے تھے کیونکہ دوسرے دن ریکارڈنگ تھی اور وہ کبھی ذمہ داری سے بھاگنے والے نہ تھے۔

وہ غالباً اس احساسِ جرم میں مبتلا تھے کہ عفت کو بابا جی کے حوالے کر کے وہ کہیں کوئی بڑی غلطی تو نہیں کر رہے۔

ان کی دانش پرکھی ایمان تھا۔ وہ اس خطے کی موروثی Wisdom کے دل سے قائل تھے لیکن مغربی تعلیم اور سائنس کے

شے بھی ان کے سامنے تھے۔ وہ ہر روز سائنسی کتابوں کی ورق گردانی اور ان کے ترجموں کی رسائی میں وقت صرف

تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی خاموشی کی اصل وجہ یہی تضاد تھا۔ میں نے کبھی سوال تو نہ کیا لیکن اندر ہی اندر

خوف نہ تھے کہ کہیں عفت کا علاج غلط تو نہیں ہو رہا۔ کہیں اس طرف کا چسکا لگا کر میں شہاب سے زیادتی کا تو

سے دور رہا۔

راتیں سرد ہو چکی تھیں۔ عفت کے لیے یہ سردی قیامت کی تھی۔ اس کا جسم خاطر خواہ حد تک لہو بنانے سے قاصر

تھا۔ وہ سارا دن ہیٹر چلائے کمرے میں بند رہتی۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو لان میں جا بیٹھتی۔ بچوں کی واپسی کے ہمارے کمرے سے ملحق بچوں کے کمرے میں چلی جاتی۔ بچے اپنی سکھی سہیلی عفت سے باتیں کرتے۔ کیمسٹری چھانڈنے کے سول کی باتیں سناتے اور ان کے سونے پر عفت پھر کاسنی کمرے میں چلی جاتی۔

ایک روز خاں صاحب ہمارے ساتھ ڈیرے نہ جا سکے۔ پتہ نہیں ان کے اندر کے احساس جرم نے یہ سب ڈالی کہ دفتری کاموں کا الجھاؤ تھا۔ بہر کیف ہم دونوں ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ہی ڈیرہ پاک پہنچیں۔ راستے میں یہ طرح میں نے اسے سمجھانے کے سلسلے میں سعی شروع کر دی۔

”عفت تھوڑی سی عقل کرو، جرمی چلی جاؤ۔۔۔ پلیز۔“

عفت نے سر جھکا کر کہا۔ ”ساری بات Faith کی ہے قد سید۔“

”چلو یہ دل لگی بھی جاری رکھو لیکن Dialysis سے غفلت نہ برتو۔“

اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سے اپنی صحت کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتا۔ شاید مرنے کا خوف نہیں تھا لیکن شہاب بھائی کا فکر تھا۔ ہو سکتا ہے چھوٹے نائب کے متعلق کچھ اندیشے ہوں گے۔ چہرے پر سوسے، سوچیں، امید ناامیدی عیاں ہو رہی تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ضعیف الاعتقادی پر پچھتاری ہو لیکن ڈوبنے سے پہلے تنکے کا سہارا بھی ہوتا ہے۔ حیران کن تھا۔ ڈیرے کے متنوع لوگ، بابا جلال، ڈاکٹر اشرف فاضلی، شمس اور ان سب میں ”جلوت خلوت“ بھاری بھر کم شخص۔

”عفت سوچ لو۔ سوچ لو، آخری بار یہ سودا مہنگا نہ پڑے۔“

عفت نے املتاس کے درخت کے پاس بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ضرور یہ کم عقلی ہے، جہالت ہے۔ اپنی مرضی کی موت کیوں مرنے نہیں دیتیں۔ تم چاہتی ہو میں فیکوں سے چھلنی کسی سرجری کی میز پر لہو اور گھونٹ کر ڈالی ہوئی مر جاؤں۔ میرا سانس کسی آکسیجن ٹینٹ میں گھٹ کے بند ہو جائے۔ تم لوگ نہیں چاہتے کہ جب تم میری حوریں لینے آئیں۔ نہروں اور باغوں میں میرا ٹھکانہ ہوا۔“

اس کے بعد میں نے کچھ نہ کہا۔

ہمیشہ کی طرح بابا جلال ہمیں تہہ خانے میں لے گیا۔

عجب اتفاق تھا کہ اس روز تہہ خانے میں کوئی موجود نہ تھا۔ بابا جلال چائے لے کر آگئے۔ ہم دونوں تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بابا جی ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل لے آگئے۔

”لوجی بڑی خیر ہوگئی پُت۔۔۔۔۔ آج تو ہم نے خود بادام روغن نکالا ہے صاف ستھرا۔“

بابا جی ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ عفت بولی۔ ”بابا جی! سارے لوگ مجھے اس علاج سے مایوس کرتے ہیں۔“

”کروں؟“

”ناں ناں پُت۔ مسلمان کو مایوس ہونے کا حکم نہیں۔ شیطان کا اور کیا کام ہے پُت۔ وہ صاف تھکتا ہے۔“

”جس کرتا ہے۔ آدمی کا معجزے پر اعتماد ختم کرتا ہے۔ ناں ناں پُت مایوسی گناہ ہے گناہ۔“

”پر باباجی۔“

”پر..... ور کوئی نہیں پُت۔ اوپر والے پر کھٹی ایمان رکھو۔ جن کا ایمان مضبوط ہوتا ہے ان کے لیے ستم

ان کے لیے معجزے ہوتے ہیں۔“

یکدم انہوں نے تہہ خانے میں نظر دوڑائی۔ پھر حیران ہو کر بولے۔ ”اشفاق صاحب ہمارے جانی جان

ہیں۔“

”خال صاحب تو آج نہیں آسکے باباجی۔“

باباجی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”ناں بیٹا ناں محرم کے بغیر کہیں نہیں آنا جانا۔ حج اور عمرے پر بھی نہیں۔ جہاں محرم

ہو وہاں شیطان تیرا فریق بن بیٹھ جاتا ہے۔ پھر خطرہ تو ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ شاباش پُت۔ واپس جاؤ۔ محرم کو

تھم لاؤ..... نہ آسکے تو پھر سہی۔ شاباش پُت۔“

ہم آزادی پسند پر اعتماد اپنے راستے اور فیصلے خود کرنے والی عورتیں تھیں۔ اس بات سے ہم دونوں کو ٹھیس سی

جب ہم گھر پہنچے تو عفت کی بڑی ماہن جمیلہ اور کشور کو اپنے انتظار میں پایا۔ وہ تینوں لان میں کرسیاں ڈالے چپ

حوش انداز میں بیٹھے تھے۔ لان ہی میں ایک چار پائی کچھی تھی جس پر عفت کا بستر لگا تھا۔ ہم نے سر دمہری سے ایک

کراہی کا استقبال کیا۔ عفت چپ چپ بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ شہاب صاحب کے بھانجے اقبال شہاب کا چہرہ ایسے لگتا تھا

جیسے آپ کو اس بیماری کا ذمہ دار سمجھتا ہو۔

”پت نہیں ماموں جان کو کیا ہو گیا ہے؟“ اقبال شہاب یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

”کیا ہو گیا ہے شہاب کو؟“ عفت ابرو اٹھا کر بولی۔

”میں خط لکھتا ہوں۔ جواب نہیں دیتے۔ ٹریا فون پر بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ آئیں یا میں شاکمیں کرتے

ہیں۔ وہ تمہیں جرنی لے کر کیوں نہیں جاتے۔ مجھے معلوم ہے وہاں تمہاری یہ ری کا پکا پکا علاج ہے۔“

”پھر؟“

”وہ خود تو فیصلہ نہیں کرتے اور ہم سب کو مفت میں پریشان کر رکھا ہے۔ آخر ہمارا بھی تو تم پر حق ہے۔ خود تو

میں سے اسلام آباد میں بیٹھے ہیں۔ کشور نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں کوئی بڈھا (Quack) تمہارا علاج بالغذا کر رہا ہے اور

ان پڑھ ہے بابا بیچارہ۔“

عفت نے ہمت سے جواب دیا..... ”نبی سہمی ان پڑھ تھے اقبال۔ کسی نبی کے پاس پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری نہ تھی

سارے پڑھے لکھے لوگوں سے افضل تھے۔ کیا حضرت ابراہیمؑ، کیا حضرت موسیٰؑ، کیا حضرت عیسیٰؑ۔“

کشور اس وقت اقبال کی کک کو پیٹتی۔

”پلیز عفت understand۔ میں Faith-healing کے خلاف نہیں ہوں لیکن اس وقت تمہاری حالت

جیسی کہ اتنا بڑا Risk لیا جاسکے۔ ہم تمہارے ساتھ بحث کرنے نہیں آئے عفت پلیز..... پلیز پلیز۔“

عفت نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا اور پیٹھ موڑ کر لیٹی رہی۔ وہ تینوں چپ چاپ چلے گئے۔ اتنی بات سن کر ہونکی کہ دوسرے دن اچانک شہاب بھائی آ گئے۔ میرا خیال ہے انہیں اقبال شہاب نے فون کیا ہوگا۔

جب سے عفت ہمارے پاس تھی شہاب بھائی کم کم اسلام آباد سے آتے۔ کبھی کبھی ثاقب ان کے ساتھ ان دنوں ثاقب کے ساتھ مل کر رات کو بچے بڑا اودھم مچاتے۔ سب مل جل کر کھانے پکاتے۔ سب اپنی اپنی ترکیبیں لگاتے اور ہیڈ لک اینٹ میاں سب کی مان لیتا۔ اس ہیڈ باورچی کی ماننے کی خصلت کے باعث کبھی لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ تک عفت کی بیماری، ڈیرہ پاک کا علاج، ہم سب بڑوں کے دوسے کبھی ٹرانسمٹ نہ ہوئے۔ وہ رات کو سائیکلوں پر نکل جاتے۔ نہ ہمارے کالے پھانک کو کبھی تالا نہ صیب ہوا۔ نہ مائل ٹاؤن کے گھروں ہی میں ابھی دروازے پھاٹک کرنے کا رواج تھا۔

شہاب بھائی جب بھی ہمارے پاس آتے وہ بہت کم ہمارے ساتھ ڈیرہ پاک جاتے۔ انہوں نے اس فیصلے کی آزادی دے رکھی تھی لیکن اس بار جب وہ آئے تو ان کے چہرے پر تشویش تھی۔ ہم نے ایسی فگر مائنڈ ان کے چہرے پر نہ دیکھی تھی۔ عفت ڈیرے پر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہمارے دروازے پر دستک ہونے نے دروازہ کھولا۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ اتنے برسوں بعد بھی وہ عام لوگوں کی طرح ہم سے بے تکلف نہ ہوئے تھے۔  
 ”آئیے آئیے۔“ میں نے خوش ولی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ خاں صاحب کتاب چھوڑ کر ان کے بیچ پر آ بیٹھے۔

”تم سے ایک بات کرنا تھی اشفاق۔“

خاں صاحب مکمل توجہ تھے..... ”فرمائیے، حکم دیجیے۔“

”انسان میں تو ازن سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ باقی رہے تو انصاف قائم رہتا ہے۔ انسان گھڑی کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر نہیں ہوتا۔ بہر حال تم خود دینی کتب کا مطالعہ کرتے رہتے ہو..... مجھے عفت کے لیے تو اتنا اندیشہ نہیں ہے لیکن ڈیرہ پاک اور ہسپتالی علاج کے درمیان پنڈولم کی طرح چکر لگاتے لگاتے وہ الجھتی ہے ڈرے کہ کہیں ڈیرے پاک پر اس قدر اندھے اعتقاد کے باعث اس کی عاقبت برباد نہ ہو جائے۔“  
 ہم دونوں بچروں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”تم جانتے ہو شرک اسلام میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ خدا کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک کرنا بھلا گستاخی ہے۔ اگر عفت یہ سمجھ رہی ہے کہ کوئی آدمی وہ کچھ کر سکتا ہے جو خدا نہیں چاہتا تو اس کی بڑی بھول ہے۔“  
 میں عفت کی طرف داری میں بولی۔ ”لیکن وہ اپنے پاک بندوں کی سن تو سکتا ہے۔ عفت بھی ڈیرے چھوڑ کر برکت کے لیے جاتی ہے۔ باباجی کی دعا پر اسے بھروسہ ہے۔“

”یہاں ہی قدر سیر تھوڑی سی غلطی ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کو جب یہ گمان ہو جاتا ہے کہ وہ پاک ہے تو وہ شے کہیں وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہو..... نیکی کا راستہ بھی پیدل سفر کا راستہ ہے۔ آدمی چلتا رہے، چلتا رہے..... اور بس۔“

”جی وہاں خطرہ تو ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ باباجی بھی یہی فرماتے ہیں۔“ میں نے جھٹ علمیت بگھارنے کی

”اگر وہ یہ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں عفت ان سے کسی معجزے کی توقع نہ لگا بیٹھے۔ دل

کھٹکے تو ٹھیک ہے لیکن.....“

وہ چپ اٹھ کر چلے گئے۔

ہم تینوں ڈیرے پاک جانے کے لیے تیار ہوئے تو شہاب بھائی باہر نکلے اور ہمارے ساتھ ہو لیے۔ کچھ کہے

”گھول..... اور بیٹھے ہوئے کہا۔“ کیا اجازت ہے اشفاق؟“

سارا راستہ خاموشی رہی۔ ہم نے گاڑی باہر پارک کی اور اندر کی طرف چلے۔ اللہ کی وحدت کثرت میں عی

سے میں پھیلی تھی۔ کچھ لوگ چھپکی کی کٹی ہوئی دم کی طرح تڑپ رہے تھے، کچھ راضی برضا ہونے کی کوشش میں ابکائی

تھے، وہیں صورت بیٹھے تھے۔ کچھ مجسم سوال اور کچھ مکمل جواب صورت تھے۔ ہم باباجی کے پاس لنگر والی جگہ جا بیٹھے۔

سب معمول دیکھے چڑھے تھے۔ علی محمد صاحب ان میں مصروف تھے۔ باباجی روغنی پیالوں میں لنگر بانٹ رہے تھے۔

گڑ والی چائے کا دور چیل رہا تھا۔

”آگے ہمارے جانی جان..... چلو پت نیچے چلو۔“

”آج نہیں باباجی۔ آج ہمیں جلدی واپس جانا ہے۔ شہاب نے اسلام آباد واپس جانا ہے۔“

باباجی چپ ہو گئے۔ ہمیں چائے کے کٹورے تازہ دم کرنے کے لیے وے دیے۔

شہاب بھائی نہ ڈیرہ پاک دیکھ رہے تھے نہ ان کی توجہ باباجی پر تھی۔ وہ بار بار چور نظروں سے عفت کی طرف

دیکھتے تھے۔ عفت بار بار جھوک کھا جاتی اور پھر قوت ارادی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو متوجہ کرتی۔ شہاب صاحب کسی

کے حذر میں اس کے راز معلوم کرنے والے نہ تھے۔ پورے تین سال لندن میں رہ کر عفت کے ساتھ ہسپتالوں کی

تعمیراتی میں انہوں نے کچھ ایسے سبق سیکھ لیے جن کا ذکر ان کی تحریر میں تھا نہ لبوں پر۔

کچھ دیر کے بعد خود ہی عفت اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا باباجی اجازت دیں۔“

اتنی لائق سے ہم کبھی ڈیرہ پاک نہ گئے تھے۔

پتہ نہیں عفت نے شہاب بھائی کی تشویش بھانپ لی تھی یا اسے ثاقب کی کچھ فکر تھی۔ ہو سکتا ہے وہ اقبال شہاب،

تھے اور جمیلہ کی وجہ سے گڑ بڑا گئی ہو۔ وجہ جو بھی تھی ہمیں معلوم نہ ہوئی۔ اس بار شہاب بھائی نے کاسنی کرہ چھوڑا تو عفت

کچھ سمجھ چلی گئی۔

اس کے بعد ہمیں اس وقت پتہ چلا جب اقبال شہاب نے انہیں میوہ ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ کچھ ماہ بعد جب

ثاقب بھائی ہمارے گھر آئے۔ میں نے عفت کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ پتہ نہیں کیا حجاب تھا۔

”عفت منہ سے تو کچھ نہیں کہتی..... لیکن مجھے لگتا ہے وہ تمہیں یاد کرتی ہے۔“



”میں آؤں گی اسلام آباد اس سے ملنے۔“

”نہیں۔ وہ اسلام آباد میں نہیں ہے۔“

”پھر کہاں ہے جی؟“

”یہاں لاہور..... میوہ ہسپتال میں۔“

”تو اس کے پاس ہسپتال میں کون ہے شہاب بھائی؟“

”نوزیہ ہے۔“

”آپ مجھے کہتے شہاب بھائی میں اس کے پاس رہ لیتی۔“

میں نے اشفاق کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں انہیں کیا چیز ستا رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ کچھلی مرتبہ عفت اور شہاب بھائی لندن گئے تھے تو عفت اپنی ایک غریب رشتہ دار کو ساتھ لے

تھی۔ عابدہ کا کام عفت کی نگہداری تھی۔ شہاب بھائی کی عدم موجودگی میں اسے ہسپتال سے لانا لے جانا پڑتا تھا۔ کچھ عفت کو  
 کہ جب تھوڑی دیر کے بعد عابدہ کو ایک ایسی فرم سے کام مل گیا جو کپڑوں میں بنٹا نکلنے کی اچھلی بھلی اجرت دیتی تھی۔  
 فرم کی دین پر سے سلائے کپڑے گھر آ جاتے۔

عابدہ گنتی کر کے بن دھاگہ، سوئی اٹھنا نہ پڑتی اور دن بھر بنٹا نکلنے میں مشغول رہتی۔ صوفے کرسیاں  
 عفت کے پلنگ پر بھی کپڑوں کا ڈھیر لگنے لگا۔ ہسپتال جانے میں بھی ناغے ہونے لگے۔ دوائیاں بھی عابدہ کو بھول  
 جاتیں۔ عفت نے منہ سے تو عابدہ کو کچھ نہ کہا لیکن جب وہ لاہور لوٹی تو پھر عابدہ کو یہیں چھوڑ گئی۔

مجھے پتہ نہیں کیوں اس خوف نے گھیر لیا کہ شاید شوقی اور مجھ سے بھی عابدہ جیسی کوئی بھول نہ ہوگی۔  
 اپنے کاموں میں گم، بچوں میں گھرے، عفت کو وہ توجہ نہ دے سکے ہوں جس کی اسے ضرورت تھی۔ ہم نے بھی  
 کے ساتھ عابدہ کا سا سلوک نہ کیا ہو۔

”کیا سوچ رہی ہو قدسیہ؟“

”کچھ نہیں جی۔ جب آپ جائیں گے تو میں..... ساتھ چلوں گی۔“

شام گہری ہو گئی تھی۔ شہاب بھائی اور میں میوہ ہسپتال پہنچے۔ گاڑی سے اترے تو شہاب بھائی کے پاؤں  
 تھے۔ انہوں نے ایک ٹانگہ ہلکے سے جھٹکی پھر تھوڑا سا لنگڑا کر چلے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے Comprehensive Care  
 پہنچی۔ عفت آکسیجن نٹ میں تھی۔ نیچے بیڈ کے ساتھ پیشاب کی تھیلی لٹکی تھی۔ اوپر بلڈ اور غائبانہ شوگر کی کمی کے پانٹ  
 کی شفاف تھیلی نالی کے ذریعے سے عفت تک پہنچ رہی تھی۔

میں نے بغیر کسی سے پوچھے اپنا ہاتھ آکسیجن نٹ میں ڈالا اور عفت کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے لمحے بھر کو  
 کھولیں جیسے مجھے پہچان لیا ہو۔ ایک نرس ڈیل کی سی تیزی سے ہماری طرف آئی..... ”پلیز آپ ہاتھ نٹ کے  
 ڈالیں۔“

میں نے اس جھڑکی سے مرعوب ہو کر ہاتھ کھینچ لیا۔

آپ دونوں باہر چلے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب راؤ نڈر پر آنے والے ہیں۔ ویسے بھی اس مریض کو کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ہم دونوں اپنا سامنے لے کر واپس کار میں پہنچ گئے۔ شہاب صاحب میرے ساتھ پیچھے بیٹھ گئے۔ مال روڈ تک پہنچنے کے بعد نے اپنی کھڑکی کا رخ کر کے باہر بیٹوں کی طرف دیکھنے میں وقت صرف کیا۔ میرے آنسو بلا تکلف گر رہے تھے۔ پل سے کچھ پہلے مجھ سے سسکیاں ہی سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر شہاب بھائی کی طرف دیکھا۔ زندگی میں غالباً پہلی بار ان کا نظم و ضبط جواب دے گیا تھا۔ ان کا جسم بچکولے لکھ رہا تھا۔

”شہاب بھائی۔ اب کیا ہوگا؟“

وہ سسکیوں سمیت بولے۔ ”بس ازوی اینڈ قدسید۔“ “This is the End.”

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کسی قسم کی تسلی نہ دی۔ ہم نہ انجم کے لیے تیار تھے نہ اس انجم کے آگے ہتھیار اٹھانے کی صحت تھی۔

شہاب بھائی مجھے چھوڑ کر اقبال شہاب کے گھر چلے گئے۔

پھر عفت اپنے اصلی گھر چلی گئی۔ اس کا جنازہ اس کے خاندان والے لے کر اسلام آباد چلے گئے۔ شاید خاں صاحب کو سارے حالات کا علم تھا لیکن مجھ سے انہوں نے کسی قسم کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے بابا جی نے جیسے عفت کا تعاقب کیا۔ عفت اور بابا جی نور والے دونوں ہم سے جدا ہو گئے۔ ڈیرے پر بابا جی کے بڑے بیٹے خلیفہ ہو گئے۔ اب ڈیرہ پاک میں کسی نذر رہ گیا۔ ڈاکٹر فاضلی بھی ڈیرے سے جدا ہو گئے۔

اس وقت نہیں یہ ہر بڑے آدمی کا نصیب ہے۔ اس کے جاتے ہی خاندان اور دوست دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہتے۔ حالانکہ دودھ اور پانی دونوں طیب ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے میں ضم ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔ عفت اور بیگانگی کی بجائے حسد اور مقابلے کی ہوا میں چلنے لگتی ہیں لیکن کیا کیا جائے شاید یہ وہ قیمت ہے جو ہر بڑے آدمی کو اپنی شہرت، ناموری اور بڑائی کی اپنے رب کے حضور پیش کرنے کا حکم ہے۔

خاں صاحب بھی ڈیرے پاک سے جدائی کے بعد کچھ دیر ستائے۔ ان کی تلاش کسی معمولی آدمی کی نہ تھی۔ کارخانے کا رخ سخی رازی کی طرف ہو گیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر ان کے ڈیرے پر جاتے رہے۔ آخر ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔

”قدسید..... سخی رازی صاحب کا ڈیرہ لاہور سے قریباً بیس میل دور نہر سے کچھ دور ہے۔ سخی رازی صاحب نے کہا ہے۔ ان کی آواز میں جو سندھی لب ولہجہ ہے، وہ بہت خوبصورت لگتا ہے۔ خاص کر جب وہ پنجابی بولتے ہیں۔ ارد گرد کے لوگ ان کے پاس آتے جاتے ہیں۔ باقی تم خود چل کر دیکھ لو..... یعنی اگر جانا چاہو تو..... میں مجبور نہیں کرتا۔“

ہم دونوں نہر سے ہو کر سخی رازی صاحب کے ڈیرے پر پہنچے۔ بابا جی نور والے جیسے انتظام تو نہ تھے نہ ویسے مخلوق تھی۔ ڈیرے پر سخی رازی صاحب کی دانش رس رہی تھی۔ بیاسی زمین جیسے لوگ میرا بھور ہے تھے۔

سائیں سخی رازی سے ہوتے ہواتے خاں صاحب واصف علی واصف صاحب تک پہنچے۔ واصف صاحب ان

کے پاس اپنی کتاب ”شب چراغ“ کا دیباچہ لکھوانے اردو بورڈ آئے تھے۔ خاں صاحب نے جلد ہی ان کی وسعت بھانپ لیا۔ پورے تین ساڑھے تین سال خاں صاحب اور انیق بیٹا ان کی رات کی محفلوں میں جاتے رہے۔ یہ محفل والٹن کی جانب ایک سکول میں منعقد ہوتی تھیں۔

خاں صاحب قریباً گیارہ بجے ساتھ والے کمرے سے انیق کو جگاتے۔ دونوں دبے پاؤں باہر نکلتے۔ لاک کرنے کا تب رواج نہ تھا۔ عام لوگوں کے شکوک رفع کرنے اور انہیں تفریح اور تسلی کا پھانسا لگانے کے لیے واصف صاحب اپنا بیان جاری رکھتے۔ رات کو یہ محفل ٹوٹی اور جس طرح دبے پاؤں باپ بیٹا جایا کرتے ویسے ہی خاموشی سے لوٹ آتے۔

یہ ڈیرہ ذرا اپنی نوعیت کا تھا۔ یہاں ایک سکول ٹیچر براجمان تھا۔ سارے بیان ٹیپ پر ریکارڈ کیے جاتے تھے۔ کاریکارڈ رکھا جاتا۔ جب واصف صاحب کی مصروفیات ان بیانات کو تحریر میں لانے کی طرف مائل ہو گئیں تو یہ سلسلہ ختم گیا لیکن خاں صاحب سے تعلق ہمیشہ برقرار رہا۔

سید سرفراز شاہ صاحب کا تعارف ممتاز مفتی کی وجہ سے ہوا۔ مفتی جی خود تلاش کے آدمی تھے۔ ان کے علمی زندگی کا مقصد سمجھنے کی ہوس تھی۔ انہوں نے خاں صاحب کو سرفراز صاحب کے ڈیرے کا پتہ دیا۔ شاہ صاحب اقبال کے میں رہتے تھے۔ پیچھے رہائش تھی اور سامنے ڈرائنگ روم کو انہوں نے غلق کے بیٹھنے کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ دیوہ کے ساتھ معذور اور بوڑھوں کے لیے صوفے تھے۔ درمیان میں قالین بچھا تھا۔

اس ڈرائنگ روم کے دو حصے تھے۔ ایک بنیادی طور پر ڈرائنگ روم تھا جس میں بیضوی میز کے گرد کرسیاں بچھی پھر ڈرائنگ روم تھا۔ دونوں کے درمیان جالی کا پردہ تھا۔ سرفراز شاہ صاحب کا طریقہ واردات بالکل مختلف تھا۔ شام مردوں سے ملتے اور جمعرات کی شام عورتوں کے مسائل سلجھاتے۔ ان محفلوں میں پہلے تو کچھ دیوہ و نیادہ کے مسائل کے متعلق جنرل باتیں کرتے۔ پھر اندر بیضوی میز کے سرے پر جا بیٹھتے۔

ان کی خلیفہ ایک خاتون تھیں۔ وہ ہر آنے والے کو پہلے آئیے پہلے پائیے کے اصول پر ایک نمبر پکڑتی تھیں۔ کمرے سے جو نبی شاہ صاحب ریٹائر ہو کر اندر جاتے۔ مسائل پوچھنے والوں کو نمبر وار اندر بھیج دیا جاتا۔ گھر کے کچھ مسائل میں شاہ جی، ان کی والدہ، بیگم ساجدہ، بیٹیاں اور بیٹے رہتے تھے۔

خاں صاحب جب تک ہم لوگوں میں رہے۔ سرفراز شاہ صاحب کا رشتہ خاں صاحب سے نہیں ٹوٹا۔ سدھارے تو وہاں سے خاں صاحب کے نام شاہ جی کے خط آتے رہے۔ سرفراز شاہ صاحب چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے۔ بڑی فرموں میں پورے طور پر ان کا فنانس ڈیپارٹمنٹ سنبھالتے تھے لیکن کہیں ان کے اندر ایک ایسی تربیت نہ تھی۔ نا آسودگی ضرور تھی جو انہیں ایک ان پڑھ مرشد کے پاس لے گئی۔

یہ مرشد انارکلی کی دہانے پر مسجد کے پیچھے گلی میں رہتے تھے۔ ان ہی مرشد صاحب نے شاہ جی کی تربیت کی۔ انہیں کشف کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا اور غلق کی خدمت کی پڑیا چنای۔ یہی علم شاہ جی کے اس وقت کام آیا جب انہوں نے اقبال ناؤن میں لوگوں کے سوالوں کا جواب علیحدگی میں دینا شروع کیا۔ یہاں بیضوی میز کی سرے والی کرسی پر بیٹھتے

کے صحبت سنتے۔ پھر آنکھیں بند کر لیتے۔

تھوڑا سا لرزہ ان پر طاری ہو جاتا۔ وہ جیسے مستقبل کے پانیوں میں ڈوب کر موتی اور مونگے نکالتے۔ کبھی کبھی  
کے ہاتھ آجاتی۔ عموماً دنیا داروں کو دولت، عزت، نوکری، تبدیلی، صحت کے مسائل درپیش ہوتے۔  
نے برابری کی طرح ہمیشہ یہی کوشش کی کہ انسان مایوسی کی طرف قدم نہ بڑھائے۔

میرے تینوں بچوں کی ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ چھوٹی عمر میں انہیں بابوں اور ڈیروں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ زیادہ  
کی اور کم محنت کے باعث وہ اس طرح دنیا حاصل نہ کر پائے جس کی وجہ سے ان کا دین اور دنیا دونوں گنڈھ ہو  
کے شروع میں تین بار خاں صاحب اشیر خاں کو شاہ جی کے ڈیرے پر ساتھ لے گئے لیکن پھر سرفراز صاحب نے اشیر میاں  
کے ساتھ دو ست بنالیا۔ شاہ صاحب کی انتہائی مہربانی کہ وہ چیری کو اپنی کار میں بٹھا کر ڈرائیو پر لے جاتے اور اس طرح  
سکھتوں کی طرح سلجھاتے۔

یکدم شاہ جی اور خاں صاحب کا رشتہ سمر سالٹ کھا گیا۔ کہاں تو شاہ جی مرشد کے درجے پر تھے۔ اب وہ خاں  
صاحب کو اپنا والد سمجھنے لگے۔ یہ رشتہ کچھ ایسا گہرا اور خفیہ تھا کہ جب شاہ جی لندن سدھارے اور وہاں جوق در جوق لوگ ان  
کے متعلق حاصل کرنے لگے تب بھی خاں صاحب اور ان میں خط و کتابت جاری رہی۔ فون پر رابطہ رہا۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد یہ رشتہ کچھ دیر تو جوش و خروش سے جاری رہا لیکن جب وہ کیولری گراؤنڈ میں  
کے ہو گئے اور ان کے عقیدت مندوں کی زیادہ یورش ہو گئی تو میں اکیلی یہ رشتہ نبھانہ سکی۔ ان کی نیگم ساجدہ نے البتہ مجھ  
سے رابطہ رکھا۔ بنیادی طور پر ساجدہ ایک ادیبہ ہے۔ شاہ صاحب کی خواتین مرید نیاں جس ذوق و شوق سے ان کی طرف  
توجہ کرتی ہیں، یہ رویہ ایک عام عورت کے لیے تکلیف دہ ہو سکتا ہے لیکن ساجدہ ادیب ہونے کے ناطے جلتی تو شاید  
صحبت کی طرح ہو لیکن سمجھوتہ کرنے کی اس میں صلاحیت تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ زندگی بہت سے رنگوں کی تو س قزح ہے۔  
کئی شخص اسے اپنی مرضی سے یک رنگی نہیں کر سکتا۔ سر جھکانے میں ہی عافیت ہے۔

ہر رمضان کی ستائیسویں کے دن ان کے چاہنے والے اقبال ناؤن میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں روزہ  
کھانا کھایا جاتا ہے۔ دیکھیں کتنی ہیں۔ بالالتزام مردانہ، زنانہ الگ رکھا جاتا ہے۔ کھانا اور پھل وافر مقدار میں کھلایا جاتا  
ہے۔ پہلے یہ تقریب شاہ جی کی رہائش گاہ سے ملحقہ سڑک پار کر کے گراؤنڈ میں منعقد کی جاتی تھی لیکن اب کچھ فاصلے پر ایک  
گراؤنڈ کے اندر روزہ کھلوائی کی رسم جاری ہے۔

شاہ جی مردانے کا خیال رکھتے ہیں۔ بار بار عورتوں کی طرف آتے ہیں۔ ان کی مردت کا یہ عالم ہے کہ اتنی مصروفیت  
کے باوجود اگر کوئی عورت ان کی خصوصی توجہ کی طالب ہو اور کسی مسئلے کا حل چاہتی ہو تو وہ سب سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتے  
جس پر درجہ جاری رہتا ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے کسی ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے انہیں مسائل کا جواب پکڑنا ہوتا ہے۔

اب نہ اشفاق صاحب ہیں.....

نہ باباجی.....

نہ سخی رازی صاحب.....

نہ عفت..... نہ شہاب بھائی.....

سنا ہے دانش کا سلسلہ کبھی ٹوٹا نہیں۔ حسین زنجانی کے جانے سے پہلے حضرت داتا علی بجویری کو لاہور لے آ کر ڈرل جاتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی پشت در پشت چلتا ہی چلا جاتا ہے۔ امید قائم رکھنے والے سلامت رہیں۔ (ڈیرے پر نوجوان نے آ کر کہا، میں ترک دنیا کرنا چاہتا ہوں اور فقیری اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو منہ بکھیرے، یہ ساز و سامان، یہ لٹم پٹم میرے بس کاروگ نہیں۔ جواب دیا گیا رہبانیت زندگی کے منافی ہے۔ اس سے راہب کو فائدہ پہنچتا ہے نہ اس کے ارد گرد کی دنیا کو۔ ہمارے دین اسلام میں اس کی سخت ممانعت ہے۔)

خال صاحب کہا کرتے..... "ہمارے گھر کو تو چاہیے ہر وقت سجدے میں رہے۔ وہ کوئی نعمت ہے جو جو رب نے ہمیں دے نہیں رکھی۔ ہم اس سے اور کیا تقاضا کریں قدیر۔"

کبھی کبھی کہتے "جب اللہ یوں بھر دے تو پھر آدمی کبھی اوپر کے طبقے کو نہ دیکھے ہمیشہ نیچے والوں میں رہے۔ جہاں نعمتیں کم ہیں۔ ویسے بھی بابا جی نوروالے فرمایا کرتے تھے۔ "امیر آدمی کی خدمت میں رہنا اپنی مرضی سے وقت ضائع کرنا ہے۔"

چند دنوں سے میں ایک عجیب الجھن میں مبتلا ہوں۔ ہمارے یہاں کلچر پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ کلچر کی بجائے اپنی Roots کی تلاش کو دین سے مقدم کر دانا جاتا ہے۔ لیکن.....

1- دین انسانیت کو آگے کی طرف لے جاتا ہے اور کلچر ماضی کی طرف۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سورۃ رحمت میں سورۃ یسین میں مجھے ایک آیت ایسی بھی نظر آئی جس کا مطلب یہ ہے کہ "اللہ کو ہر روز ایک نیا کام ہے۔" اس وقت دین کا آگے ہی آگے بڑھتے جانا ثابت ہے۔

2- جب ہم کلچر کی بات کرتے ہیں تو ساگ روٹی، تیل گاڑی کا سفر، ہاتھ کی پٹھھی، پرانے کونوئیں کا خشک میلے ٹھیلے، پنگھوڑے بھنگڑے یاد کرتے ہیں۔

3- جب ہم اپنی روٹس کی طرف مراجعت کرتے ہیں تو ہم حاکم کو سجدہ کرنے، سونے کے کنگن پہننے، پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کرنے اور بیوہ کو سستی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

4- حضور سائیں صاحب اس سلسلے میں پیوند کا ذکر کیا کرتے تھے کہ جب پیوند لگ گیا تو زندگی ماضی علیحدہ ہو کر حال سے وابستہ ہو گئی۔ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جاہلیہ کی رسوم ختم ہو گئیں۔

ڈیرہ پاک پر میری موجودگی میں حضور نے تین مرتبہ اس (پیوند) کا ذکر کیا مگر میں ہر مرتبہ ان سے فہم نہ ہونے کی وجہ سے ان کے الفاظ ٹھیک سے catch نہ کر سکا۔ پھر حضور کا بیان ایسا ہوتا تھا کہ چند جملے بول کر چپ ہو جاتے تھے۔ بہت سی باتوں کو ان کے سیاق میں جوڑنا پڑتا تھا۔ اس کام میں آپ ہی ہمارے موہڈی تھے۔ اس لیے ہم جو کچھ آپ سے رجوع کر لیا کرتے تھے۔ اب بھی آپ کی وہی ہی ضرورت ہے۔

(خال صاحب کے کاغذات)

یہ چاند، سورج کا طلوع وغروب محض وقت کے احساس کی اکائی بنا لیے گئے ہیں اور ہم وقت کو ایک خاص وقت

فرض کریں کہ چاند سورج نہ ہوں تو کیا ہو۔ صرف اندھیرا، جو کہ مسلسل ہوگا تو گویا پھر ایک ہی جیسی کیفیت میں وقت گزرنے کا احساس کیسے ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کا بچپن، بڑھاپا وقت کے چلنے کا احساس دلائیں مگر انسان کی عمر میں تبدیلی کا یہ عنصر ختم کر دیا جائے تو پھر وقت کا احساس کیسے ہوگا۔ گویا Timelessness ایک جیسی ایک بھی Physical State کو کہا جائے گا۔

یہ فرق زمان و مکان میں قید اور آزاد کرتا ہے۔

دراصل وقت ایک صدوری کیفیت ہے۔ یہ کہنا کہ کائنات ارتقاء میں ہے، غلط ہے۔ وقت صرف انسان کی کیفیت ہے۔ اس کی ذات کے علاوہ کوئی چیز بھی اس اندرونی کیفیت سے باہر نہیں۔ تغیر اور ارتقاء اندرونی واردات سے ہیں۔ ہر واردات میں فوٹی سرایا کی نقیوں افراد کی شکل میں چھپاتی ہیں۔ چھپائی اندر رفتار میں ہے۔ اس رفتار کا نام ہے۔ اگر اس رفتار میں کمی بیشی ہو جائے تو اندر لنگڑا، لولا، اندھا چھینے لگتا ہے۔ حوادث اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔

جب عارف کا ذہن ایک لمحے کے لیے صدوری کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے تو بے اعتدالیوں دور ہو جاتی

ارشاد: سائیں کے پاس بیٹھا ہوں کہ ایک لنگڑا آدمی وہاں سے گزرتا ہے جو سائیں سے فریاد کرتا ہے، اسے دیکھا جائے۔ سائیں ایک نظر اس کی طرف دیکھتا ہے تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

ارشاد: اس واقعہ کی توجیہ دریافت کرتا ہے تو وہ اس کو مندرجہ بالا وضاحت دیتا ہے یعنی سائیں چھپائی کی رفتار کو دیکھتا ہے۔

کسی کا دیوار یا کسی اور ٹھوس چیز سے گزر جانا۔

کائنات میں کششِ ثقل ہی سب کو تھامے ہے اور اشیاء اسی ثقل کے باعث ایک دوسرے کی حرکت میں پیدا کرتی ہیں لیکن ثقل لطیف اشیاء کے راستہ میں زیادہ رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس طرح اگر کسی کا دماغ تجلی الہی میں ہو جائے جو کہ نہایت لطیف ہے تو جسم ذہن کے تابع ہونے کی وجہ سے ثقل کی منزل سے آگے چلا جاتا ہے۔ اس طرح ٹھوس اشیاء میں سے انسان گزر جاتا ہے۔

ایک سے زیادہ جگہوں پر ایک ساتھ نظر آنا۔

اس کی مثال فوٹو ہے۔ اس میں پہلے ٹیکنیو تیار کیا جاتا ہے۔ پھر پوزیٹو بنایا جاتا ہے۔ ایک ٹیکو سے ہم جتنی تصویریں تیار کر سکتے ہیں۔ یہی حال روح کا ہے۔ روح ایک Negative ہے اور گوشت کا جسم اس کا پوزیٹو۔ اگر ہم نفس کے ذہن کا Lense مصفی اور طاقتور ہے تو چاہے تو وہ خود کو یعنی روح کو پوزیٹو کی شکل میں کئی جگہ ظاہر کر سکتا ہے۔ ساری مثال ٹی وی ہے۔ اولیاء اللہ اس علم روح کی نشریات کو بیک وقت کئی سکرینوں پر متحرک کر دیتے ہیں۔

روح

پوری کائنات اور اس کے اندر تمام مظاہرات ایک سرکل میں سفر کر رہے ہیں اور ہر شے دوسری سے متعارف ہے۔ تعارف کا یہ سلسلہ خیالات پر مبنی ہے۔ کائنات کی ہر شے دوسری کو ”فکر“ کی لہروں کے ذریعے سے جانتی ہے۔

سائنس دان روشنی کو تیز ترین سمجھتے ہیں مگر تفکر کی لہریں ان فاصلوں کو حاضر ہی نہیں سمجھتی جن کو روشنی کم کرتی ہے۔ اس میں حضرت سلیمان کی مثال دی جاسکتی ہے۔ جب انہوں نے ملکہ سبا کے آنے سے پیشتر اس کے تخت کو منگوانے کو کہا تو نے کہا کہ میں آپ کے دربار پر خاست ہونے سے پہلے وہ لاسکتا ہوں جبکہ ایک اہل علم نے پوک جھپکنے میں وہ تخت کو منگوانے سے انکار دیا۔

دراصل اس آدمی کے خیال کی لہریں تخت کے اندر کام کرنے والی لہروں میں جذب ہو کر تخت کو منتقل کرنے کے ذریعہ بن گئیں۔ اس طرح حیوانات اور جمادات صرف تفکر کی لہروں سے گفتگو کرتے ہیں۔ سائنس نے کائناتی تفکر کو نام دیا ہے۔ تصوف میں اس کو روح کا نام دیا گیا ہے۔ مکمل موت نہ تو انسانی پر وارد ہوتی ہے نہ روح پر۔ روح کو جو علم دیا گیا ہے وہی خیالات، تصورات اور احساسات بنتا ہے۔ یہ دونوں لہروں اور شعاعوں پر بروقت مصروف عمل رہتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان لہروں کو پڑھنے اور ان کو حرکت دینے پر قدرت حاصل کر لے تو ہم کائنات میں تصرف کر سکتے ہیں۔

### دریائے وحدت

چاروں طرف آسمان کے اوپر دائرے میں نور کا دریا بہ رہا ہے۔ یہ دنیا سے بالکل قریب ہے۔ یہ وحدت ہے، اس میں سے آواز آتی ہے..... ”لوگو! ٹھو۔ میں تم سے بہت قریب ہوں۔ جاگوتا کہ میں تمہاری مشکل کروں۔ تم پر رحمت کروں۔“

اس میں لوح محفوظ کا ایک مقام ہے۔ یہاں سے اللہ کے احکامات دنیا پر نازل ہو رہے ہیں۔ یہ روشنی شکل میں ہیں۔ اس مقام پر دنیا کے ہر فرد کے متعلق احکامات کا ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرہ سے روشنی کی لہریں دھار کی شکل میں نکل کر اس فرد کے اندر داخل ہو رہی ہیں۔ یہ تمام نظام آٹوینک ہے (کن کن کن کن.....) جہاں سے آٹوینک تحت روشنیاں (احکامات کی) ہر ہر فرد تک پہنچ جاتی ہیں۔

تجلی ذات کے نقطہ وحدانی سے 11,000 صفات الہیہ کی روشنیاں حکم کن کے ذریعے نکلتی ہیں اور ہر فرد میں تقسیم ہو جاتی ہیں یعنی 12 ستارے، 12 برج بن گئے اور ایک برج میں اس ستارے کے ماتحت اربوں ستارے آگے اور ان سب کو برج کے لیڈنگ ستارے سے روشنی تقسیم ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ایک نقطہ وحدانی کے بارہ برج ہیں۔ اس سے کائنات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ خیال بھی کہ کیا اتنی بڑی کائنات میں محض ہماری زندگی پر زندگی ہے؟ نہیں بلکہ ہزاروں عالمین اور ہیں۔ ہر عالم کا ایک جدا گانہ رنگ ہے۔ جیسے ہماری زمین پر آسمانی رنگ ہے کیونکہ ہر عالم میں مختلف صفات کام کر رہی ہیں۔ اس لیے رنگ مختلف ہیں۔ زمین ہی کی طرح زندگی، فرسوس، باغات ہیں۔ ہر شے کی حقیقت اللہ کی نگاہ میں ایک ہے۔ روز ازل سے اللہ نے ہر شے کو جس قانون اور فارمولے کے تحت پیدا کیا تھا۔ اس میں ابد تک کسی رد و بدل کا اندیشہ نہیں۔ عالمین میں ہر شے کا وہی متعین فارمولا ہے جو ازل میں تھا۔ اس شے کی حقیقت ہے۔

### درویش شریف

درویش شریف ایک خاص نور کی دھار ہے جو خاص تناسب رکھتی ہے۔ جب اسے پڑھا جائے تو یہ لہروں کو ستر گونہ

تھک پہنچ جاتی ہے اور حضور اس شخص کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ درود شریف روشنی کی وہ لہر ہے جس کا کنکشن حضور سے ملتا ہے۔

اگر ڈرامے میں درود شریف پڑھاتے دکھائی دے تو اس طرح کہ لائن میں لوگوں کے ہاتھوں میں دیئے ہوں یا کسی نظر آئیں اور جیسے جیسے وہ شخص درود شریف پڑھے۔ ایک کے بعد ایک بلندی کی طرف رہے۔ روشن ہوں اور آسمان کی طرف روشنی جائے۔ (اندھیرے میں) یاد میں منورہ کی طرف جاتے ہوئے دکھایا جائے۔

اگر آپ نور کی فضا کائنات میں دکھائیں تو ایسے کہ ایک کالی چادر یا کاغذ پر ”محمد ﷺ“ لکھیں کر کے نکھیں اور اس طرح کمرہ سے دکھائیں کہ کائنات پر محیط نظر آئے اور ہر لفظ سے روشنی کی لہریں نکل کر لوگوں تک پہنچ رہی ہوں۔ جب خدا کے جہان میں بنائی تھی اس سے بہت پہلے یہ لفظ نور کی فضا میں لکھ دیئے گئے تھے۔

اگر آپ یہ دکھانا چاہیں کہ سائیں یا صاحب ارشاد کسی کو نسبت دے رہے ہیں تو نسبت عطا کرنے والے کے لئے روشنی کی لہر دوسرے کے دل میں جذب ہو جائے گی۔

لائٹوں کے ذریعے سر کے اوپر روشنیاں ڈال سکتے ہیں۔ اگر ارشاد دوائے میں ہے، اس کے اطراف دائرے میں روشنیاں حرکت کرتی ہوئی دکھائیں یا کمرے میں تیل کی روشنی کی دھار جو باریک ٹارچ سے ڈالی جاسکتی ہے، جو جلتی بجھتی ہے۔ کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف۔

کیونکہ روشنیاں باشعور ہیں۔ وہ گفتگو بھی کرتی ہیں۔ آپ ارشاد کی کسی روشنی سے گفتگو دکھا سکتے ہیں۔ روشنی اپنے شمار ہی ہو۔ آپ دل کی صفائی ایسے دکھا سکتے ہیں کہ پہلے دل کو کالا دکھائیں، پھر نور سے وہ آہستہ آہستہ سفید چمکدار ہو جائے۔

لطائف سہ سے ہر شخص روشنی حاصل کرتا ہے جو کہ تصوف میں کام آتی ہے۔ سائیں اپنے لطائف سہ سے روشنی دے سکتا ہے۔ ان مقامات سے روشنی کی دھاریں نکل کر ارشاد میں جذب ہو سکتی ہیں۔

آپ ارشاد کو یا کسی کو نور کے دریا می دکھا سکتے ہیں۔ سفید دھوئیں میں ڈوبا ہوا دکھا دیں۔

آپ مختلف رنگوں کی روشنیاں دکھانے کے لیے اندھیرے میں مختلف رنگ کے بلب استعمال کر سکتے ہیں۔

آپ نور کی بارش دکھا سکتے ہیں۔ لائٹ آبار کی طرح گرے۔

تصوف کا طریقہ یہ ہے کہ سائیں یا مرشد اپنے دل میں ارشاد کے دل کی طرف لائٹ بھیجتا ہے۔ یہ دھاریں جمع ہو جاتی ہیں تو جس پر پڑتی ہیں اس میں Charge پیدا کرتی ہیں جیسے کوئی بیمار ہے، اس کے دل پر جا کر اس کے دل میں حرکت پیدا کرتی ہیں۔

آپ کسی کو ایسا خواب دیکھتا دکھائیں کہ وہ لائٹ کی دھار پر جتی ہوئی آسمان پر پہنچے۔ ایک کمرہ میں داخل ہو جیں بہت سے لوگ مشینوں پر ہوں۔ دیوار پر تصویریں ہوں۔ وہ ان سے پوچھے کہ یہ تصویریں کیوں ہیں تو وہ دکھائیں کہ اس طرح تصویر ڈال کر ہم روزانہ اس شخص کے اعمال کا جائزہ لیتے ہیں۔ مومن کی تصویریں کمپیوٹر میں ڈالیں تو جلدی جلدی اس کی زندگی ٹی وی پر دکھائیں اور بتایا جائے کہ ہم انسان کے اعمال کے مختلف خانے ہیں اور ہم روزانہ اس میں اس کے



اعمال کی Marking کرتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اسے اصلاح کی طرف لائیں۔

### خواب اور بیداری میں فرق

ہماری روح کی بناوٹ ایسی ہے کہ وہ ہر لمحہ مضطرب ہے۔ دن میں تو ہم کام کرتے ہیں مگر رات کو جب سو جاتے ہیں تب یہ روح اپنے لباس میں یعنی جسم مثالی کی شکل میں حرکت کرتی ہے اور تمام کام کرتی ہے مگر ہمارا جسم چونکہ سو جاتا ہے، اس لیے اسے خواب کا نام دیا جاتا ہے۔ مادی جسم کشش ثقل میں قید ہونے کے باعث محدود ہوتا ہے جبکہ جسم لطیف ہونے کے باعث کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

زمان و مکاں کی تھوڑی کوڑسکس کریں، جو کہ پہلے والے پیمبر ز میں تفسیلاً ہے۔

دراصل زمان و مکاں ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہیں۔ ایک نکلے کے درخ ہیں اور مکانیت، زمانیت

طرح سے نقل ہوئے بنے ہیں اور یہ ایک مشین پر ایک ساتھ چھپ رہے ہیں۔

### واقعہ سورج

تیز رفتار سواری ہو تو وقت کم لگتا ہے۔

یہ تمام کائنات اللہ کے نور سے بنی ہے اور ہر شے میں اللہ کا نور مختلف متنوع مقداروں میں کام کر رہا ہے۔

چاند ستارے سب اللہ کے نور سے روشن ہیں۔

اس کائنات میں مختلف لہریں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور تیز رفتار، تفکر کی لہریں ہیں۔

کائنات قائم ہے۔ اسی کے ذریعے سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ تفکر کی لہر فرش سے عرش تک ایک لمحہ میں پہنچتی ہے۔

اور یہی لہر تصرف کی قوت حاصل کر کے انسان کو عرش تک پہنچا دیتی ہے۔

زمان و مکاں Related ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ آپ کو پیدل جانے میں جتنا وقت لگتا ہے۔

سائیکل رکشہ، جہاز استعمال کریں تو وقت اتنا ہی کم ہو جائے گا، فاصلہ وہی رہے گا۔

### کشش ثقل کا قانون

تخلیق کا قانون ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا وجود دو رخنوں پر قائم ہے۔ اگر آدم میں حوا نہ ہوتی تو

پیدائش ناممکن تھی۔ دوسری مثال مریم سے حضرت عیسیٰ کی ہے۔ فرد میں ایک پرت مغلوب اور دوسرا غالب رہتا ہے۔

مغلوب ادھورا پرت اپنے آپ کو مکمل کرنے کے لیے دوسرے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی سے جنس مخالف میں کشش

کرتا ہے۔

### زمان ماضی ہے۔

سمجھا جاتا ہے کہ زمانہ گزرتا ہے حالانکہ زمان ماضی (ریکارڈ) ہے حال اور مستقبل ماضی کے اجزاء ہیں۔

جو کچھ ہونے والا ہے قلم اس کو لکھ کر خشک ہو گیا ہے۔ زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ زمانہ ماضی

اتوار، پیر.....) شعوری ہے۔ دوسرا وہ جہاں زمان لا حساب ہے جیسے کہ خواب ہیں۔

اصل میں زندگی کی نغمہ بنائی گئی ہے اور اب لوح محفوظ سے سکریں پرری پلے کی جا رہی ہے۔

جیسے سینما میں ہم فلم میں ماضی، حال، مستقبل کا سوچتے ہیں مگر اصل میں تمام فلم ماضی میں بنتی ہے۔ یہی حال ہے کہ تم کو چلایا جا رہا ہے، سب کردار اپنا کام کر رہے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کا خط اشیر کے نام

سندھ

11 فروری 1983ء

پیارے بیٹے اشیر! اسلام علیکم۔ تمہارا خط ملا۔ کئی بار پڑھا۔ افسوس صرف یہ ہوا کہ یہی صورت حال پہلے ہی بتادی تھی کہ میری مانو تو کسی عامل یا مجذوب وغیرہ کے پاس جانے، ان سے کچھ کھانے پینے یا تعویذ لینے کی ہرگز ہرگز کوئی نصیحت نہیں ہے۔ ارے بیٹا! اگر کسی لڑکی سے محبت ہو گئی تو کیا ہوا لیکن اس سے آگے تم نے پوری طرح نہیں لکھا کہ مصیبت کیا ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ مجھ کو ذرا اور Confidence میں لے کر پوری طرح بتاؤ کہ مصیبت کیا ہے جسے تم نے سخت سے محسوس کر رہے ہو؟ اس کے بعد ہی تفصیل سے کوئی مزید مشورہ دے سکوں گا۔

یوں وسوسوں کی حد تک کسی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ آتے ہیں تو آنے اور گزر جانے دو۔ ان کی طرف سے کوئی توجہ بھی نہ دو۔ نماز، سورہ حشر کی آخری رکوع کی آیات باقاعدگی سے پڑھتے رہو لیکن اعتدال کے ساتھ، بہت زیادہ سختی سے نہیں۔

زندگی کی مسرتوں کی اصلی کنجی اعتدال میں ہے یعنی ہر چیز میں نارمل رویہ اختیار کرنے کی۔ عبادت میں بھی، کھانے میں بھی، دیگر ہر شے میں بھی۔

اس میں تمہارے اگلے خط کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔ اس وقت تک انشاء اللہ میں آنکھ کے آپریشن سے بھی کچھ غم چکا ہوں گا۔ اگر تم واقعی مجھے اپنے Confidence میں بننے کے قابل سمجھتے ہو تو ضرور لکھنا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ تمہاری کوئی ایسی پرابلم یا مصیبت نہ رہے گی جو حل ہو کر بہت جلد دور نہ ہو جائے۔ فی الحال کالج کی پڑھائی سے ہر چیز میں مقدور بھر نارمل حد تک دل لگائے رکھو۔ تمہارے لیے دل سے دعا کرتا ہوں۔ میرے لیے بھی دعا کرنا۔

تمہارے اگلے خط کا جواب انشاء اللہ زیادہ تفصیل سے لکھوں گا۔

نانا، اشفاق اور بانو کو سلام۔ نوتی اور کیسی کو پیار۔

تمہارا

قدرت اللہ شہاب



## برکلی ایکسچینج

### Berkeley Exchange

ابھی ہمیں داستان سرائے میں آئے بمشکل چار سال ہوئے تھے کہ برکلی Exchange کے تحت ہمارے پاس ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔ ڈیوہ پاک پر آپ نے شمس سے ملاقات کر ہی رکھی ہے لیکن اب کچھ سالوں کے بعد گھر برگو یا امریکیوں کا راج ہو گیا۔ برکلی سے شاگردوں کا تبادلہ پاکستان اور پاکستان سے اسیوں طالب علموں کے قابل ذکر لوگوں کو امریکہ سے متعارف کرانے کا پلان تھا۔

خاں صاحب اس پروگرام کے تحت 1963ء میں مدعو ہو چکے تھے۔ اب میزبانی کی ہماری باری تھی۔ پاکستانی گھروں میں بطور مہمان رکھنا انہیں اورو پنجابی سے یہاں کے رسم و رواج، رہن سہن سے شناسائی کے لیے روپے پیسے کی پہچان عطا کرنے کی یہ ایک معمولی سی کوشش تھی۔ مجھے اس پروگرام کی تفصیل معلوم نہیں تھیں نہ مجھے کسی انفرمیشن ہی لینے کی عادت تھی۔

ایک دن خاں صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے ”قدسیہ! مجھے معلوم ہے تمہارے پاس کام نہ پایا ہے۔ میں کسٹ ہو چکا ہوں۔ تمہارے پاس کل ایک مہمان آئے گا۔“

”ٹھیک ہے آنے دیں..... بس اُسے یہ بات ضرور بتادیں کہ میں اُسے گفتگو سے entertain نہیں کرتا۔“

”ٹھیک ہے..... ویسے بھی وہ پڑھنے لکھنے کا شوقین ہے۔ اپنے میں گن رہے گا۔ کبھی کبھی میں اُسے زمیں پر لے جایا کروں گا۔“

باب ہیز پہلے غالباً Y.M.C.A. میں اُترا۔ پھر خاں صاحب اُسے گھر لے آئے۔ ابھی شہاب صاحب کا سنی کرہ خالی تھا۔ باب کو اس میں ٹھہرا دیا گیا۔ ڈبلے پتلے دراز قدمہمان سے متعارف ہونے میں دیر نہ لگی۔ اُس نے کسی کھانے کے لیے اصرار نہ کیا نہ مجھ سے کسی چیز کی فرمائش ہی کی۔ مجھے ایک واقعہ اچھی طرح سے یاد ہے۔

روزوں کے دن تھے۔ بچے تک پابندی سے روزے رکھ رہے تھے۔ میں دوبارہ صبح اُٹھ کر باب کے لیے

تھکن یہ ناشتہ عموماً انڈے پر اٹھے تک محدود ہوتا۔ کبھی کبھار اس میں مکھن تو س کا اضافہ کر دیا جاتا۔ میں ناشتے پر اس میں بیٹھ جاتی، کبھی بچوں کو خدا حافظ کہنے گھر کے کام کاج میں مصروف ہوتی تو وہ اکیلا ہی ناشتہ کر لیتا۔

ایک دن صبح وہ برآمدے میں آیا۔ خاں صاحب اُردو بورڈ جانے والے تھے۔ باب نے اشارے سے انہیں محبت سے انگریزی میں بولا..... ”اشفاق! کل سے میں آپ لوگوں کے ساتھ سحری کھاؤں گا اور رات کو روزہ افطار

”اونٹاں بھائی ناں۔ تم اپنا معمول جاری رکھو۔ ایسی مصیبت کی ضرورت نہیں۔“

”لیکن میں ایسا کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو کیا تمہارا عقیدہ بدل گیا ہے؟ مسلمان تو نہیں ہو گئے نہیں؟“

”جی نہیں! ابھی تک نہیں..... ابھی تک میں Eck Anker کی تعلیم پر کاربند ہوں۔“

”پھر یہ روزے کس لیے؟“

”بات یہ ہے خاں صاحب! کما ہی کام کے لیے تو میں پاکستان آیا ہوں۔ یہاں کے رسم درواج کو قریب سے

گہ ڈوب کر دیکھوں..... اور غور سے دیکھنے کے لیے عمل میں داخل ہونا ضروری ہوتا ہے۔“

لوجی طے ہو گیا۔ باب نے بڑے اطمینان سے روزے رکھے اور سحری اور افطار ہم لوگوں کے ساتھ مل جل کر

تک سے کھاتا رہا۔ عید سے کچھ دن پہلے جب بچوں کے عید کے جوڑوں کی تیاری شروع ہوئی تو خاں صاحب نے

باب سے پوچھ لو اس کے لیے کیا چاہئے۔“

”جانے دیں خاں جی..... ہم اس طرح کی مہمان نوازی afford نہیں کر سکتے۔ پھر وہ نہ جانے کس مذہب کا

ہے۔“

”بھائی! وہ Paul Tillich کا پیردکار ہے جس نے انسان کی روح کی تربیت کا طریقہ ایک تہی رپیزار گرو

کا نام اس میں گرو کی بہت اہمیت ہے۔ مرشد کی توجہ سب کچھ ہے..... آج کل ڈارون نامی ایک امریکن پال ٹلش کا

نام بھی ہے اور باب اسی کا پیلا ہے۔“

”لیکن مجھے کیا لینا ہے ڈارون سے یا ٹلش سے۔ جس راستے پر جانا نہیں اُس کا نام کیا لینا۔“

لیکن باب سے کپڑوں کے متعلق بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے دن وہ میرے پاس باورچی خانے

تعمیر کھینے لگا..... ”بانو! کیا آپ میرا ایک کام کر سکتی ہیں؟“

”کیا باب؟“

”مجھے عید کے لیے ایک شلوار قمیض بنوادیں گی۔ میں میے دے سکتا ہوں۔“

”وہ کیوں باب؟“

”میں خاں کے ساتھ عید گاہ جاؤں گا۔ سب کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔“

”مجھے اس ادا پر تعجب تو ہوا لیکن میں نے ازراہِ تفضن کہا ”اچھا تو بھلا کیا رنگ پسند کروں..... گہرا سبز بنوادوں؟“

”گہرا سبز بھی برا نہیں..... یہ گھاس کا درختوں کا خدا کی روئیدگی کا رنگ ہے لیکن مجھے ہلکا نیلا رنگ پسند ہے۔ آسمان کی طرح بے گراں بے پناہ۔“

”جی.....؟ لیکن روز قیامت یہ گلابی ہو جائے گا..... تو گلابی میں کیا ہرج ہے باب؟“

وہ مسکرایا..... ”لیکن روز قیامت تو ابھی آیا نہیں۔“

باب ہیز کا جوڑا مع ٹوپی کے تیار ہو کر آ گیا۔ عید کے روز سب صبح ساڑھے سات بجے عید گاہ جانے کے تیار ہوئے تو آہستہ سے اہلیق بیٹے نے خوف بھری آواز میں کہا ”مجھے عید کی نماز پڑھنا نہیں آتی۔“

ابو نے تو پتہ نہیں یہ بات سنی یا نہ سنی۔ باب ہیز فوراً بولا..... ”اہلیق! تم کو کچھ نہیں کرنا بس مجھے دیکھتے جاؤ۔ میں روع میں جاؤں تم بھی چلے جانا..... جب میں سجدہ کروں تم بھی سجدہ کر لینا۔“

شاید خاں صاحب بھی یہ Ritual بھول چکے تھے۔ اُن کے لیے بھی سہولت ہو گئی۔

ہمارے گھر میں یہ رواج ہے کہ عید کے دن میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر قرآن کریم لے کر بیٹھیں۔ جو نبی مرد حضرات مسجد سے لوتے ہیں وہ اس قرآن کریم کے نیچے سے گزر کر مجھے عید مبارک کہتے ہیں۔ وصول کرتے ہیں۔ اس میں عمر کا التزام ضرور رکھا جاتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے گھر کا سب سے بڑا داخل ہوتا ہے۔ قطار میں باری باری سب آ جاتے ہیں۔

ڈرائنگ روم میں ہی دو چھوٹی میزوں پر یا ٹرولی کے اوپر سویاں، نمکین وال اور سویاں وغیرہ پیلے کی جاتی ہیں۔ مسجد سے واپسی پر قرآن کریم کے نیچے سے گزر کر اپنی اپنی عیدی وصول کر کے سارے مرد کھاتے شروع ہو جاتے ہیں۔

جس عید پر باب ہیز مسجد گیا تھا۔ وہ بھی خاں صاحب کے ساتھ واپس لوٹا۔ پہلے خاں جی اندر داخل ہوئے۔ باب۔ اس کے بعد ترتیب وار تاجدار، غفار، شاعر گھر کے اندر آئے۔ سب نے سادہ چیزیں کشمیری چائے کے ساتھ فرمائیں۔ بچوں نے سویاں سویاں کھانے کے بعد شربت پیا۔ انہیں ابھی کسی قسم کی چائے کا چسکا نہیں پڑا تھا۔ سادہ چائے۔

سردیوں کے دن تھے۔ بچھلی لان میں بڑی خوشگوار گرم دُھوپ پڑتی تھی۔ کبھی کبھی میں بال دھو کر کھانے کے لیے باہر آ بیٹھتی۔ یہیں بیٹھ کر شتو جی اور میں مونگ پھلیاں اور ریوڑیاں اور عمو مانگنے چوسا کرتے تھے۔ اسی حیرت میں بچے کرکٹ کا شوق پورا کرتے۔

ایسی ہی بیٹھکوں کے دوران باب مجھ سے Sandy کی باتیں کیا کرتا۔ وہ شادی کے بغیر سینڈی کے ساتھ تھا۔ دونوں اکٹھے سفروں پر جاتے۔ ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں بسیرا کرتے اور اس Living together پرستی نہ والدین نہ اُس کی اپنی ذات ہی نے کبھی کوئی اعتراض کیا تھا۔

باب ہیز کو اپنے والدین سے بڑی شدید محبت تھی۔ وہ بڑے لاڈ سے اُن کی باتیں کیا کرتا۔ لیکن کسی بھائی، بہن کا ذکر میں نے کبھی اُس کے منہ سے نہیں سنا۔

ان ہی دنوں میری کتاب "امریل" کی رونمائی ہوئی۔ میں شہرت، نام و نمود کی خواہشمند نے ایک روز فیض سے استدعا کی کہ وہ میرے اس فنکشن کی صدارت کریں۔

"نہاں بھائی ہمیں تمہاری کتاب پڑھنی پڑے گی۔"

"تو پڑھ لیں کچھ ایسی بری بھی نہیں۔"

"چلو پڑھ لیں گے۔" فیض صاحب نے ان مانے جی سے صدارت کے لیے حامی بھری۔

اور فنکشن کا دن آئیپنچا۔ الحمر ابال جو ان دنوں چھوٹا سا تھا، اس میں فنکشن ہوا۔ باب ہیز نے اپنے طور پر از خود سخن کہنے کی آفر دی۔

مضمون پڑھنے والے کم تھے۔ فنکشن فریبانہ تھا۔ البتہ خاں صاحب اور باب ہیز نے میری حوصلہ افزائی پر جوش سے کی۔ باب کا مضمون پڑھ لیجئے اور پھر اپنا سا اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری میزبانی کا اس نے کیسے صلہ دیا؟

"باوجود اس کے کہ میں بانو قدسیہ کو بہت تھوڑے عرصے سے جانتا ہوں، لیکن ان کی شخصیت ایسی ہی ہے۔ ملنے سے محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ ہمیشہ سے انہیں جانتا ہو۔ گوانتے تھوڑے عرصے میں کسی کے متعلق کچھ جانتا اور کسی کے بارے کرنا قریب قریب ناممکن ہے، پھر بھی میں ان کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں سے ایسے متاثر ہوا ہوں کہ چند کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

جب تک New Critics کی تحریک ترقی پر رہی فنکار کی شخصیت پر کچھ کہنا حرام تھا۔ لیکن اب ہم اس بات کو بے پروا ہو گئے ہیں کہ فنکار اور اس کے فن کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ رقص اور رقص کرنے والا دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ میں آنے لگی ہے کہ فن اپنے واضح مطلب کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔

فن ایک خاص سطح پر آگاہی ہے۔ ایک قسم کا شعور عطا کرنے والا ہے اور کوئی فن محض اس لیے کامیاب نہیں ہوتا کہ وہ خوبی کے ساتھ آگاہی کی اس سطح کو بیان کر رہا ہے بلکہ اس کی عظمت اس میں ہے کہ وہ سطح بجائے خود ایسی ہو جو کہ جی ہو اور ارفع اور اعلیٰ بھی۔

مشرق کو ازل سے ہی یہ بات معلوم ہے کہ روحانیت کی بنیاد ایک فنکار کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ تخلیقی قوت خود ہی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بانو قدسیہ میں روحانیت کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ روحانیت سے میری مراد کسی خاص یا رسمی و رواج کی پابندی نہیں بلکہ ایسی روحانیت جو زندگی کی فراوانی سے پیدا ہوتی ہے۔ شدید طور پر وقوف کردہ اور محبت سے جنم لیتی ہے۔ بے غرضی سے ابھرتی ہے۔

عورت کی زندگی بجائے خود اس کا فن ہے۔ بانو قدسیہ اس حقیقت کو سمجھتی ہیں اسی لیے وہ لکھنے سے کسی قدر بدکتی ہیں لیکن ان کی وسعت نظر اور روحانیت کی فراوانی نے ہمیں نہ صرف کسی ایک زندگی کی بصیرت بخشی ہے بلکہ کئی محسوس میں جھانکنے کا موقعہ دیا ہے۔ اپنی کہانیوں میں انہوں نے اس بات کو واضح کیا ہے جو ہر ایک پر واضح ہونی چاہئے کہ ہم صرف آزادی نسواں نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ روح کی نجات کا ہے۔"

خاں صاحب جس طرح دسترخوان پر وال چپاتی بھی دوسروں کے ساتھ مل کر کھانے میں خوشی محسوس کرتے تھے ویسے ہی باباجی کو بھی دوسروں سے share کرنے میں انہیں راحت ملتی۔ ایک روز میں نے باب ہیز کو جنجور سے لے کر باہر والے برآمدے میں منتظر پایا۔

”کہاں کے اروائے ہیں باب؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”میں اور خاں صاحب تو باباجی نوروالے کے پاس جا رہے ہیں۔“

باب نے بولے سے جواب دیا ”مجھے معلوم نہیں مجھے اشفاق تیار رہنے کے لیے کہہ گئے ہیں۔“

میں نے خاں صاحب کی Surprise ضائع کر دی۔ ہم تینوں نے دھرم پورہ کا رخ کیا۔ ڈیرہ پاکستان کے باورچی خانے کی سڑک کے ارد گرد اللہ کی مخلوق ہمیشہ کی طرح بے ترتیب گردپوں میں بیٹھی تھی۔ بکریاں چاہت تھیں۔ کچھ لوگ گھاس کھونے تراشنے میں مصروف تھے۔ خاں صاحب آگے آگے تھے۔ کچھ فاصلے سے شوقی سے آواز میں کہا:

”السلام علیکم باباجی..... آج میں آپ کے لیے ولایت سے ایک مہمان لایا ہوں۔“

باباجی نے دایاں بازو اٹھا کر سلام کا جواب دیا۔ ”نوروالے! بیٹا ولی ہمیشہ ولایت ہی سے آتے ہیں۔ خاں صاحب نے یہ جملہ ترجمہ کر کے باب کو سنایا تو اُس کا چہرہ سروی کے باوجود پسینے سے بھیگ گیا۔“

”آؤ پت آؤ؟“

ہم نے بیٹھنے کی کوشش کی تو باباجی بولے ”یہ آدمی کھرا ہے..... اسے نیچے لے جائیں..... ہم ابھی آؤ۔ ڈاکٹر فاضلی ہمیں نیچے لے گئے جہاں ہم نے ہمیشہ کی طرح سیر ہو کر لنگر کھایا۔ سرخ چائے پی کر ملاقات یہاں ہی باباجی سے ہوئی۔“

”آجاؤ آجاؤ بلکہ ضرور آجاؤ۔“

”میں آپ کو اپنی کچھ ٹھیس دکھانا چاہتا تھا بڑی سپوٹی عمر سے یہ نظمیں میرے اندر کھلباتی تھیں۔“

دیکھیں گی۔“

کچھ دیر بعد اسی برکھے پروگرام کے سلسلے میں ایک لڑکی جس کا نام Cathy تھا ہمارے پاس آ کر بیٹھیں۔ صاحب نے اُس کا نام ”نوری“ رکھ دیا۔ بھولی بھالی صورت، کھوئی کھوئی سی صورت نیچے گول سیزھیوں کے پتے پر رہتی۔ جب کسی کو وقت ملتا وہ اُس سے باتیں کر لیتا ورنہ لا تعلقی کے ساتھ فضاؤں میں جھانکتی رہتی۔ وہ آرام سے کمرے میں ہی رہنے لگ پڑی۔

Cathy کے بعد برکھے طالب علموں کے Exchange پروگرام کے سلسلے میں ایک اور لڑکی باورچی خانے کی ماڈل ٹاؤن ہی میں ایک گھر میں رہائش پذیر تھی۔ وہ ہمارے گھر آتی جاتی۔ کبھی کبھی رات بھی رہ جاتی۔ ایک

بہتر بھرتیوں کا نمائندہ بن کر ہمارے پاس آیا۔ خاں صاحب ڈھوپ میں بیٹھے موگ پھلیاں کھانے میں

”اشفاق! اگر تمہارے لیے تکلیف نہ ہو تو فرید الدین گنج شکر کے مزار پر لے چلو۔ ماریا وہاں پاکپتن شریف  
پر حاضر دینا چاہتی ہے..... لیکن اگر نہ جاسکو تو ہمیں ٹرین پر سوار کرادو..... ہم خود چلے جائیں گے۔“  
خاں صاحب نے فوراً ساتھ چلنے کی حامی بھری۔

میں دل میں سوچنے لگی کہ یہ لوگ کون ہیں۔ ان کا امریکہ کی اکثریت میں کیا مقام ہے۔ کیا مادی ترقی کے داعی  
یہ لوگ الٹا پیہر چلا رہے ہیں؟ سائنسی ایجادات کے زمانے میں روح کی فلاح کے متلاشی ہیں؟  
خاں صاحب نے اپنی بڑی آپا مرحمت کو اطلاع دی تو انہوں نے جواباً فون پر کہا کہ جہاں تک رات آپا کے  
سفر میں ہے۔ پھر دوسری صبح وہ اپنی گاڑی پر ہمیں باہر فرید الدین گنج شکر کے مزار پر بھجوا دیں گی۔

شیڈول کے مطابق ہم منظمی پہنچے۔ ابھی اس کا پاکستانی نام ساہیوال نہ چلا تھا۔ صبح تیار ہو کر ہم پاکپتن شریف  
پر پہنچی دروازہ دیکھا۔ سب اپنے اپنے طور پر گمن ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے ماریا کو دیکھا تو میری تعجب  
کی نکل گئی۔ ماریا کی آنکھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی نیلی پتللیاں غائب تھیں اور آکھ کا صرف سفید حصہ نظر آ رہا  
تھا۔ مگر خاں صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دونوں مزار کے باہر بیڑی کے درخت تلے کھڑے تھے۔ سنا ہے باہاجی فرید  
الدین بیڑی تلے کھٹے آسان سے رحمتوں کے نزول کا انتظار کیا کرتے تھے۔

”خاں صاحب! وہ جی ماریا کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ کچھ بولتی نہیں۔“

لیکن خاں صاحب نے اپنی توجہ بیڑی پر رکھی۔ اس میں سرایت کیے ہوئے باہاجی کے معجزاتی کشف و کمال کی  
تعمیر ہے۔ باب ہیز دیکھتے دیکھتے آگے بڑھا اور اس نے اپنی سگریٹ کی ڈبیا ایک شاخ پر لٹکا دی۔

”اشفاق! آپ ہولی مین کو کیا نذرانہ دے رہے ہیں؟“

خاں صاحب نے فوراً نذرانی پاکٹ سے اپنا پرس نکالا اور پوچھا..... ”کتنے پیسے باب؟“

باب مسکرایا..... ”یہ نذرانہ نہیں اشفاق..... کوئی اپنی خراب عادت یہاں اس کی دلہیز پر چھوڑ جاؤ تو اس کا دل خوش  
نہ ہووے۔ سامنے گولڈ فلیک کی خالی ڈبیا..... میں نے ہولی مین سے وعدہ کیا ہے کہ اس کے بعد میں کبھی سگریٹ کو ہاتھ  
نہیں لگائے گا۔“

خاں صاحب غالباً اس وعدے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن وہ کسی امریکن سے بازی ہارنا بھی نہیں چاہتے تھے۔  
میں نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالے اور جس طرح کوئی اپنی من چاہی مجبورہ کو کھڑا چھوڑ کر جاتا ہے ایسے ہی ڈبیا کے  
ساتھ گئے ڈبیا کو چوما اور ایک شاخ پر لٹکا دیا۔

سگریٹ چھوڑنے کے بعد برسوں خاں صاحب ان سگریٹوں کے لیے تڑپے تھملائے پریشان رہے۔ اس  
کے تیس برس بعد انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا ”قدیر! ابھی بھی مجھے یہ چھوڑی ہوئی منزل یاد آتی ہے۔ جس  
کے میں کوئی سگریٹ پی رہا ہو وہاں بیٹھ کر مجھے آندھ ملتا ہے..... دھواں اندر جاتا ہے خوشبو سے سابقہ پڑتا ہے تو مجھے



بڑی راحت ملتی ہے۔“

واپسی پر ٹرین کے سفر کے دوران ماریسا پر گویا کسی گم سم مجذوب کی کیفیت طاری تھی۔ باب اُسے زبردستی سے لے کر آ گیا۔

گھر پہنچے تو ماریسا اور باب میرے پاس باورچی خانے میں آئے۔

”یہ آپ کو انفورم کرنے آئی ہے؟“

”کیا؟“

”یہ دہلی جانا چاہتی ہے۔ اسے نظام الدین اولیاء نے بلایا ہے۔“

”یہ مجھے کیوں انفارم کرنا چاہتی ہے۔ باب! تم جانتے ہو میں روحانیت کے سفر کو نہیں جانتی۔“

”بات یہ ہے قد سید! کہ یہ سمجھتی ہے آپ اسے پاکستن شریف لے کر گئیں، وہیں اس کا مسئلہ فیصلہ کن ہے۔“

”پہنچا۔“

میں نے معاملہ خاں صاحب کے سامنے پیش کیا تو وہ بولے..... ”بھائی جو یہ چاہتی ہے کرے۔ جن کے گھر میں

کھڑی ہوئی ہے اطلاع دے۔ میری حیثیت صرف اتنی ہے کہ جس کی جو تلاش ہو اُسے راستہ بتا دوں..... باقی چلنا تو انہوں نے خود ہی ہے۔“

ہمارے گھر کے پچھواڑے جہاں بعد میں تانستان لگا اور اس کے بعد کب پارٹی کے لیے جگہ بنائی گئی تھی

صاحب کہا اپنے بن کر سینوں پر کباب لگاتے گویا صدیوں سے یہی پیشہ رہا ہو۔ ابھی سٹوڈیو اور سرورنٹ کو آرڈر کے ساتھ

خالی جگہ میں مکنی کا کھیت لگا تھا۔ جس روز وہ ہم سے رخصت ہوئیں ماریسا مجھے پچھواڑے لے گئی۔ اس وقت مجھے سلسلہ

کہ وہ مکنی کے کھیت میں کیوں جا رہی ہے۔

وہ کچھ دیر سہمی کھڑی رہی۔ شاید چاہتی تھی کہ میں کہیں ادھر ادھر ہو جاؤں لیکن میں نے اسے ہی شرم

نوازی سمجھا کہ میں اس کے ساتھ چٹھی رہوں۔

اُس نے بچوں کی سی Sheepishness کے ساتھ اُونچے اُونچے مکنی کے ٹائڈوں میں ادھر ادھر

کپڑوں کی چھوٹی سی گھڑی نکالی۔ یہ کچھ کی طرح میلے کپڑے تھے۔ وہ اُنہیں نکال کر بولی..... ”مجھے افسوس ہے کہ

آئی تھی میں نے اپنے میلے کپڑے یہاں چھپا دیئے تھے۔“

”کاش تم مجھے یہ کپڑے دے دیتیں تو میں اُنہیں دُھلا دیتی۔“

وہ سر جھکائے آہستہ سے کیتھی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ وہ اس دنیا کی روح نہ تھی۔ اُس نے کسی کے رخصت

رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی۔

ماریسا چلی گئی۔ باب ہیز کے جانے سے کچھ دیر پہلے ایک اور بم پھٹا۔ ہوا یہ کہ ہم سب لان میں بیٹھے تھے

باب نے خاں صاحب سے کہا ”اشفاق! ماریسا کی اطلاع آئی ہے۔“

”خیریت سے ہے؟“

”پائلن خیریت سے! اُس نے نظام الدین اولیاء کے دربار پر تمکو اسلام کر لیا ہے اور اب وہ تمہاری Sister in Faith ہے۔“

نوری نے واپسی کا کٹ کٹا لیا۔

بہت عرصہ بعد ماریا ہمارے گھر چاٹک آ گئی اور اُس نے ہمیں اطلاع دی کہ اُس نے پشاور میں ایک فیوڈل کے موقع سے شادی کر لی ہے۔ بعد میں یہی شوہر وزیر بن گیا اور ماریا کی عزت میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ دو تین بار پھر گھر میں گھر کا حصہ نہ بن سکی۔ نہ جانے اُسے زندگی بھرا کہاں لے گئی؟ اُس کی اسلام پسندی نے اُس کے لیے کیا کیا مسائل پیدا کیے اور کیا کیا مشکلات کھڑی کیں؟

میں نے ایک دن ازراؤ نقشو خان صاحب سے کہا۔

”خاں صاحب! یہ امر کہیں لوگ کیا بلا تیں۔ جو چاہتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں کر لیتے ہیں۔ انہیں اتنی آزادی کے قانون نے دی ہے معاشرے نے عطا کی ہے یا فیملی سسٹم ٹوٹنے سے ہی ہے؟“

”تینوں نے سُن جل کر لیکن اب یہ اُن کا Way of life ہے۔ وہ آزادی کی خاطر سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔“

”اشفاق جی! لیکن اتنی آزادی سے بے راہ روی کا راستہ بھی تو کھلتا ہے۔ آوی خود غرضی کی بھیجٹ بھی نکلتی ہے۔“

”پائلن پائلن وہ بھی ممکن ہے اور ہوتا ہے لیکن یہی آزادی انہیں بالآخر اسلام سے بھی ہٹا کرے گی۔ ایک دن میں نکلیں گے جیسے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی افریقہ کے جنگل الاسکا میں تیل کی تلاش کرتے ہیں..... پھر انہیں بھی کہیں نہ کہیں اسی تلاش کے دوران مل جائے گا۔ سکون کی تلاش اطمینان کی تلاش انہیں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام کا علم پکڑا دے گی۔“

میں اُن کی بات کو پورے طور پر سمجھ تو نہ پائی لیکن اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں بار بار کہتا ہوں کہ اب اسلام کی ترویج اور اشاعت کہیں الاسکا کے بندے کسی یورپین کسی امریکی یا کسی اور کی ذمہ داری ہوگی..... وہ ایک نکلے پڑھ کر مارے کا سارا مسلمان بن جائے گا اپنی مرضی سے۔ ہم لوگ جو پیدا ہوئے مسلمان پیدا ہوئے ہیں اسلام کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ ہم اس کا جھنڈا اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ ہم نہ مساوات پر یکساں سہ سے نہ کبھی ہم نے بھائی چارے ہی کا سبق سیکھا۔ جب بنیادی اصول ہی ہم سمجھ نہیں پائے تو ہم اس کی ترویج اور اشاعت کا بوجھ کیونکر اٹھا سکتے ہیں۔“

میں ابھی تک لباس زبان اور رہن سہن میں اسلام کو مقید سمجھتی تھی۔ مجھے جنیز اور شریں پہنے ہوئے مسلمانوں پر کبھی نظر نہ آتا تھا۔

باب بیہزہ بات برداشت کر لیتا تھا لیکن امریکہ پر اگر کسی قسم کی تنقید کی جاتی تو وہ آپے سے باہر نکل جاتا۔ اُس وقت وہ ہر خار سرخ ہو جاتا۔ وہ استدلال کی لائن چھوڑ کر اُلٹی سیدھی شیا م گھات پر مجبور ہو جاتا۔ اُس کی ساری فراخ دلی اور

لبرل نظریات خاک میں مل جاتے۔

ایسے ہی ایک دن اُس پر منفی موڈ طاری تھا۔ میں نے احمق پن سے بھونڈوں کے کھکھر کو چھیڑ دیا تھا اور سے امریکہ کے معاشرتی تقاضے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

اُس وقت تو وہ خار کھا کر اپنے کمرے میں غائب ہو گیا لیکن شام کو جب میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی میرے پاس آیا اور فتح مندی کے انداز میں کہنے لگا۔

”قد سید! یہ بتائیے کہ اسلام کا Essence کیا ہے؟“

میں کبھی کہ سیدھا سا جواب ہے۔ میں نے جواب دیا ”توحید۔“

”لیجئے یہ تو سبھی مذاہب سکھاتے ہیں۔ کیا یہودی وہ خداؤں کو مانتے ہیں؟ کیا عیسائی توحید پرست نہیں ہیں؟

یہاں تک جانتا ہوں ہندو مذہب میں جہاں بتوں اور کفر کا فتویٰ آپ لگا سکتی ہیں وہاں بھی اور کا تصور موجود ہے۔ بتائیں کہ اسلام میں وہ کون سی خوبی ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہے؟“

”بھائی چارہ..... یہ روایت جب انصار نے مہاجرین پر سب کچھ قربان کیا یہاں تک کہ ان کو اپنی جائیداد سے

بھی شریک ٹھہرایا۔ یہ روایت کہیں اور نہیں ہے۔“

”لیکن کون سا مذہب ہے جو Universal Brotherhood نہیں سکھاتا۔ کیا عیسائیوں میں بھائی چارہ

نہیں ہے؟ کیتھولک کیا ایسے نہیں ہیں؟ ہم ایک خدا میں تین سمتوں کا تعین ضرور کرتے ہیں لیکن بھائی چارہ تو ہم میں بھی

طرح کم نہیں..... اسرائیل کی طرف دیکھ لیجئے۔ کس کس دلیس سے یہودی آکر آ رہے ہوئے ہیں۔ وہ قرن سن دھن سے یہ

دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ چھوڑیے آپ لوگ ایسے ہی احساس برتری کا شکار ہیں..... اصل میں آپ کا مذہب بھی

پچھلوں کی کہانیاں ہیں اور کچھ نہیں۔“

مجھے باب کی بات پر چھی کی طرح لگی۔

اس وقت دونوں وقت مل رہے تھے۔ آسمان پر ہلکی سرفی مائل زردی غائب ہونے کو تھی۔ باہر اس لمحے کے

عالم میں پرندے گھرداں کوڈاروڈار لوٹ رہے تھے۔ میں نہتی سی احساس کمتری میں مبتلا لمبے شیشے والی دیوار نما کونکے

کے سامنے جا کھڑی ہوئی..... مجھ میں اتنا علم نہ تھا کہ میں باب سے مناظرے میں جیت جاتی۔ اور اس ہار کا مجھے

سے افسوس تھا۔

ہمارے سامنے کی لان میں سندری کا ایک درخت ہوا کرتا تھا۔ سندری کے درخت سے سارنگی کا سا زینب

ہے۔ اس کی لکڑی بہت قیمتی شمار کی جاتی ہے۔ ساگوان سے بھی مہنگی..... سنا ہے اس درخت کے تنے میں رات کے

ورد کی آواز سنی جاسکتی ہے۔

میں اس کی طرف نمناک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ یکدم سارا درخت روشنیوں سے بھر گیا۔ اس کا پتہ

شاخ تانان دیکھے نور سے جگمگانے لگا..... اور پتہ نہیں اس کے اندر کے سر مجھ تک پہنچے یا مجھ پر وجدان کی کیفیت

ہوگئی۔ مجھے اسلام کا نچوڑ پتہ چل گیا۔ ایسا Essence جو کسی اور مذہب میں موجود نہ تھا۔ میں نے بھاگ کر فتح مندی

”بلوہ رووازہ کھولو..... مجھے جو اسپلنگ گیا ہے رووازہ کھولو۔“

ہاتھ میں جھاڑن لیے وہ باہر نکلا اور ابرو اٹھا کر بولا..... ”ہاں! کیا بات ہے؟“

”تم نے پوچھا تھا کہ اسلام کا وہ کون سا وصف ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔“

”ہاں تو؟“

”اسلام نے رزقِ حلال و حرام کا تصور دنیا کو دیا ہے..... یہ تصور کسی اور مذہب میں نہیں۔ دوسرے مذاہب میں

Command میں اوامر اور مناسی کی فہرست ہے لیکن کہیں حرام و حلال کا تصور نہیں۔“

”ہمیں رزقِ حلال کمانے کی تاکید ہے..... چوری چھپے کی آشنائی حرام..... ہم دو دو تین تین بیویاں رکھ سکتے

Living together نہیں کر سکتے..... غصہ حرام ہے..... طیش میں آنا حرام ہے..... مایوسی حرام ہے۔“

وہ چپ ہو گیا..... میں خود ابھی حرام و حلال کی جزئیات سے نا آشنا تھی اسی لیے بحث بند کر دی گئی..... باب بیس

میں ایک بیچ ہو گئی۔ وہ پاکستان سے چلا گیا اور کچھ برسوں بعد اُس دن کے گیان نے ”راجہ گدھ“ کی صورت

میں یقین جاسیے، راجہ گدھ جسے خاں صاحب نے نہیں پڑھا اور جسے میں نے نہیں لکھا کہیں سے مجھ پر وارد ہو گئی تھی

میرا توں کا کوئی عقلمانی جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔

ایک روز بغیر دستک دینے میں باب کے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے خیال تھا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے اور میں صفائی

کے ساتھ اُس کے صاف کمرے کو مزید صاف کروانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ بغیر کپڑوں کے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

”سوری باب! اوریری سوری۔“

”کوئی بات نہیں..... لیکن کبھی میرے کمرے میں دستک دیکھے بغیر آنے کی کوشش نہ کیجئے خدا آپ نہ کوئی اور۔“

میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ یہ کیسا مہمان تھا جو مجھے حکم دے رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا یہ

ضیاء نام لوگوں کا احساس برتری ہے جو ہر وقت براؤن اور سیاہ قوموں کو عقل سکھانے میں مشغول رہتے ہیں۔

اُس نے میرا مشکوک چہرہ دیکھ کر کچھ قیافہ لگایا اور بولا..... ”آپ مجھے ایک جھاڑن عطا کر دیں۔ میں اپنے

کمرے میں ٹاکی بھی پھیر لوں گا اور اس کی ڈسٹنگ بھی کر لوں گا۔ بس کوئی میرے کمرے میں تشریف نہ لائے۔“

”لیکن کیوں؟“

”بات یہ ہے کہ میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں تمام کپڑے اُتار کر Levitation کی مشق کرتا ہوں۔

میں زمین سے چند گز اوپر اٹھ سکتا ہوں لیکن آپ یہ منظر دیکھ کر ڈر جائیں گی اس لیے میں آپ کو پہلے ہی Warn

کرتا ہوں۔“

یکدم میرا دھیان شب معراج کے عظیم معجزے کی طرف مبذول ہو گیا اور میرے دل میں باب کے لیے قدرے

ت کا مقام پیدا ہو گیا۔

”مبارک ہو باب! جو بھی تمہارا راستہ ہے کاش تمہیں اس پر چل کر سکون اور اطمینان حاصل ہو۔“

وہ ہولے سے مسکرایا اور بولا "اطمینان اور سکون نہ ملے تو کوئی چمٹا ہے ایسے راستے پر..... لیکن ایک شہر ہے  
 آدمی چننا ہے۔ تبدیل نہ ہو۔ استقامت کے ساتھ لگن کے ساتھ آنکھیں موندھ کر۔ اندر سیر ہی اُتار کر..... باہر سے  
 توڑ کر اندر جوڑ کر..... Paul Tillich (پال ٹیلش) اس کا پہلا گرو تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد Eck Anker  
 ڈارون دے رہا ہے۔"

"اچھا باب..... جو کچھ بھی ہے جس طرح بھی ہے تمہیں مبارک ہو۔"

باب ہیز واپس امریکہ چھو گیا تو اُس نے خاں صاحب کو چند سارے افسانوں بھیجنے سے اس تجویز کو  
 جاسکتا ہے۔ بہت سے ایک لہ کی ایجاد کردہ تنظیم ہے جسے ریزو (Rezou) نام سے پکارتے ہیں اور جس سے  
 امریکن مہنت پارٹنرشپ نے ان کا اس راہنما چھنا سیکھا۔

کرتے کرتے اور بڑے بڑے باب ہیز صاحب جو سنا کا وقت آ گیا۔  
 سارا سامان سلیڈ سوزوں اور پلاسٹک کاوا چاچکا تھا۔ سب سے پاس ڈیوڈ تھا۔ ہم دونوں مشورہ کر رہی تھیں کہ  
 کس طرح خدا کا فقہا جانے اور خاں صاحب سے اس زمانہ سے اس کے اور کئی ایسے ایسے ایسے ایسے ایسے  
 تک چھوڑ دو۔ مجھے آج دفتر میں نہ رہنے کا ہے۔  
 "ماموں آپ بھی نہیں رہیں گے۔" ڈیوڈ بولی۔

لیکن ماموں صاحب باب ہیز سے ہاتھ مل کر رخصت ہو گئے اور برائے کو گئے دیا۔

"کیا تم جوڑے ساتھ آ رہی ہو ڈیوڈ....." باب نے ہمیشہ ڈیوڈ کو قویاں پر شکر ہے۔ ہم اسے طویلہ نہ سمجھتے  
 کے قویاں پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

راستے میں باب نے میرے ساتھ اس کو کیا جیتے ہیں سہرا والوں سے ہنسنے لگا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر  
 سے کہا۔ "ڈیوڈ! مجھے معاف کرنا۔ کئی کئی برس نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ میں کبھی میری نیت ہمیشہ  
 میں اپنے تیرے کو کبھی نہیں بھولوں گا اور آپ نے تمہاری اپنی تمام تصویروں کے اوپر اکاؤں گا۔"

ہیز پورٹ آئی وہیں غریبوں کو دینا اور ہم دونوں وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئے تھے اور ابھی چیک  
 (check in) کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ہم تینوں بہرہری لان پر بیٹھ گئے۔ کئی کئی ڈھوپ تھی۔ لیکن ڈھوپ میں ٹھنک  
 نہ تھی۔ ٹھنڈا بڑھاپ ڈھوپ پینے کے بعد اس کے فلاح میں گھٹنے لیٹ ہوئی ہے۔ ہم وہاں گھر آ گئے۔

اور جب دوبارہ جانے کا وقت آیا تو قویاں میرے پاس آئی..... "نہی! آپ بیٹھ نہ جائیں۔ میں باب  
 آؤں گی۔ اُنہیں آجاتا تو اسے ساتھ لے جاتی لیکن وہ دونوں بھائی ابھی کالج سے نہیں لوٹے۔"

باب ہیز بڑے رسمی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ لیکن یوں نہ سمجھے کہ اُس نے ہم سے  
 دیا۔ وہ باقاعدگی سے نہیں لیکن وقتاً فوقتاً خط لکھتا رہا۔ سینڈی سے اُس کی شادی ہوئی۔ پھر دو بیٹیاں چھوڑ کر وہ کہیں  
 باب نے دوبارہ شادی کی اور میکسیکو میں Colme کے ایک میوزیم میں ڈائریکٹر لگ گیا۔

جب انیس وہاں گئے تو عجیب سی بات ہے۔ انیس نے اُس سے رابطہ تو قائم کیا لیکن مغرب کی تیز رفتار زندگی

## اینڈریوز

(Andrews)

باب ہیز کے جانے کے بعد ایک دن خاں صاحب جب اردو بورڈ سے لوٹے تو اُن کے ساتھ کرسٹوفر (Christopher) تھا۔ موٹا نہیں لیکن مائل بہ فرہبی ضرور تھا۔ چوڑا چکلا سینہ تھوڑا سا سانسے پھیلا ہوا گول منول پیٹنا تھا۔ ہماری ہاتھ لیکن جب بھی بولتا بات کرتا اُس کے چہرے پر معصومیت چھا جاتی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا تو کسی حد تک بچے کی طرح مظلوم سا نظر آتا۔ اُس کے ہاتھ میں بالکل چھوٹا سا بیگ تھا۔ اُس نے پہلے ہی دن خاں صاحب سے مجھے معلوم نہیں تھا کہ پاکستان میں اتنی سردی ہوتی ہے میں اور کوٹ نہیں لایا۔“ خاں صاحب نے فوراً اپنا اور کوٹ اُس سے وے دیا.....“ تو اب آپ کیا کچنیں گے شوقی؟“

وہ میری کمیگنی پر ہلکا سا مسکرائے اور بولے.....“میرا ڈریسنگ گاؤن مونے مبل کا ہے۔ ایک نہیں دو گاؤن پاس ہیں وہ پین لوں گا۔ پھر سواتی جب نما کوٹ بھی ہے۔“ میں جانتی تھی کہ وہ اور کوٹ واپس لینے والوں میں سے تھکے رہے۔ اس لیے چپ ہو رہی۔ اس ہٹل میل کے علاوہ کرس نے مجھ سے کبھی زیادہ بات چیت نہ کی۔ وہ خاں صاحب کے ساتھ دفتر چلا جاتا۔ وہاں سے اُسے ڈرائیور ہماری فوکسی پر شہر اور لاہور کی قابل دید عمارتیں دکھانے لے جاتا۔ شالیمار قبرستان جہاں گلیز قلعہ نور جہاں کا مزار مسجد وزیر خاں اور اندرون شہر کی گلیاں بازار..... کبھی ڈرائیور دن بھر کی واردات بتاتا تھا۔ کبھی انٹرمیشن بھی نہ ملتی۔ میں نے بھی دلچسپی لینا چھوڑ دی۔

کرس جس آہستگی سے آیا تھا ایک روز اسی بے تکلفی سے ملے بغیر رخصت ہو گیا۔ نہ کوئی شکریے کا خط نہ کوئی تحفہ ہی جملے نہ اشک ہاریاں نہ زریب مسکرائیں۔ یہ قیام میں نے کولڈ سنوریج میں رکھ دی اور قریباً تیس سال بعد آج نکال کر آپ کو پیش کر دی۔

ابھی کرس کو گئے چند دن ہوئے تھے کہ ایک اور امریکن سا گا پیش آیا۔

یہ تب کی بات ہے جب خاں صاحب برکلے پروگرام سے واپس تھے۔ یوں سمجھئے کہ یہ دور ہمیں امریکن لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع بہم پہنچانے کے لیے آیا۔ پہلے خاں صاحب اٹلی میں تنہائی 'غربی اور تذبذب کا ایک عہد گزار چکے تھے لیکن اُن میں ایک عجیب وصف تھا۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔ اندر کیسی بھی بارشیں جل تھل کیے رکھیں۔ وہ صبر کی بے سرنی اوزھ فرافرض سے وابستہ رزق کمانے کے لیے ضرور نکلتے۔ میں نے انہیں کبھی موڈ کے تابع زندگی بسر کرتے نہیں دیکھا بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ ہمیشہ موڈ کو اپنے عزائم کے تابع کر لیتے۔ کبھی کبھی اُن کی زباں کھٹارنگی ہو جاتی 'سارا منہ کڑوا ہو جاتا تھا۔ وہ ڈاکٹروں کے درپے نہ ہوتے۔ انجانا کی تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹری دوائیاں پیتے 'گھریلو ٹونکے استعمال کرتے، حکیمی علاج آزما تے، ہومیو پیتھک پڑیاں پھاںکتے اور خم ٹھونک کر کام پر کھڑے ہو جاتے۔ انہیں حالات نے کبھی پسپا نہ کیا۔ میں نے کوئی کام نہ پیسے کے لالچ میں کیا نہ شہرت اُن کے لیے قابل اعتناء چیز تھی۔ بس کام کو وہ ہرانے کے موڈ میں

رہتے۔ گویا وہ بھی کوئی پہلوان تھا جسے دھوبی پٹڑا کرا سکتا تھا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب داستان سرائے میں امریکنوں کی آمدورفت زیادہ تھی۔ ان ہی لوگوں میں اینڈریوز تھا۔ تب 121۔ سی کے سامنے کھیت تھے۔ ایک نالہ یہاں بہتا تھا جس سے کھیتوں، سڑکوں، لانوں کو سیراب کرنے کا معمول تھا۔ اسی نالے میں انیس خاں اپنی بطخیں نہلانے کے لیے لے جایا کرتے تھے اور بڑی محبت اور ڈلار کے ساتھ واپس لاتے تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے نالے کے پار کوئی کوٹھی ابھی تعمیر نہ ہوئی تھی۔ پھانک بھی واجبی سا پانچ فلپا تھا جس کے آر پار دیکھنا آسان تھا۔ ابھی قانون کو اپنی گرفت میں لینے والے بے روزگار لوگ اتنی تعداد میں نہ تھے اور اگر تھے تو انہیں غریبی کے ساتھ رہنا کچھ مشکل نہ تھا۔ دہشت گردی، چوری، چکاری، ڈاکہ زنی، دھونس، دھول، دھپا، سوسائٹی کا جھگڑنا تھا۔ ہم لوگ باہر پنکھا لگا کر لان میں سونے کے عادی تھے۔ کبھی دروازے بند کر دیئے جاتے کبھی ان کی کنڈیاں نہ لگتی جاتیں، کبھی پھانک کو تالا لگا دیا جاتا، کبھی ہم بھول بھی جاتے۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپا فرخندہ اسی گیٹ کو ٹاپ کر کھڑی بھی آ جاتیں اور اگر ہم باہر لان میں ہوتے تو وہاں ورنہ کوٹھے پر آ جاتیں اور ہمارے پاس ہی لیٹ جاتیں۔ یہ امن کا وقت تھا۔ غلطیاں تب بھی ہوا کرتی تھیں لیکن اُن کا خیزہ اتنا نہ بھگتنا پڑتا۔ یہ خوف و سوسے تب بھی جنم لیتے لیکن ان کا پھل زیادہ دیر کے لیے نہ ہوتا۔

ایسے ہی بھلے دنوں کی ایک صبح میں انھی تو گیٹ کے پار سڑک پر نالے سے متصل ایک وین کو کھڑا پایا۔ اس میں کچھ امریکی سوار تھے۔ سفری ٹولے میں سے چند اتر کر نالے کے پانی سے نہا دھو رہے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ مسافروں کی بے سرو سامانی دیکھ کر میں اندر گئی۔ خاں صاحب کو بتایا کہ کچھ پروسیسی ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ شاید کچھ درکار ہو۔

خاں صاحب چپ چاپ باہر چلے گئے۔

ابھی بچے نان پر سو رہے تھے۔ سکول جانے کا وقت بھی نہ ہوا تھا۔ باورچی خانے کی زندگی بھی نہ جاگی۔ گرمیوں کی صبح تازات سے نا آشنا ہلکی ہلکی ہوا میں بولے بولے آگے بڑھ رہی تھی۔ اچانک بڑا پھانک کھلا اور خاں صاحب امریکنوں کے ساتھ اندر وارد ہوئے۔

”قدسیہ! انہیں صابن تو لیے دو۔ یہ آٹھ دس دنوں سے نہانے نہیں ہیں۔“

پھر خاں صاحب جوئی اور اینڈریوز کے ساتھ اوپر والی منزل کی طرف چل دیئے جہاں خاں صاحب لائبریری تھی۔ میں نے پہلے بچوں کو سکول بھیجا، پھر مہمانوں کے لیے ناشتہ تیار کیا۔

جب خاں صاحب اپنے مہمانوں کو لے کر نیچے آئے تو یوں لگتا تھا کہ وہ مدتوں سے ان لوگوں کے دوست چکے ہیں۔ میرا اُن سے تعارف کراتے ہوئے خاں صاحب نے کہا:

”قدسیہ! یہ جوئی ہے۔ جوئی گیون (Joey Gavin) اس کے والد لندن میں ڈاکٹر ہیں۔ اسے زندگی کے ساتھ شطرنج کھیلنے کا شوق ہے۔ یہ تجربات کرتی رہتی ہے۔ یہ سیر و سیاحت بھی جوئی کے لیے ایک تجربہ ہے اور یہ صحت اینڈریوز ہے۔ یہ اپنا آپ خود سمجھا دے گا۔ اور یہ ہمارے بچوں کی نانی ہیں۔ ہم سب انہیں نانا کہتے ہیں۔“

”میں نے کچھ سمجھا نہیں سکتا اشفاق صاحب! میں خود سمجھنے کے لیے مشرق میں آیا ہوں۔ ہم لوگ اتنے Materialistic, Practical, Objective Instrument نہیں رہے۔“

میں نے باہر نکل کر دیکھا تو دین جا چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ ناشتے کے بعد چلے جائیں گے لیکن دین کو کچھ کر مجھے تشویش ہوئی۔

”وہ آپ کی دین نظر نہیں آئی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو چلے گئے۔ ان کے ساتھ بیٹی طے تھا۔ وہ تو اس وقت واہگہ پار کر چکے ہوں گے۔“ اینڈریوز نے کہا۔  
نئے مہمانوں کو میرے سپرد کر کے خاں صاحب بولے ”حیران نہ ہوں قد سیر! یہ تمہارے مہمان ہیں۔ خدائی نعمتوں کا شکر یہ ادا کرو۔“

”کتنی دیر تک خاں صاحب؟ کتنی دیر کے لیے؟“

”چلے جائیں گے بھائی چلے جائیں گے۔ بیچارے دین ہی میں سوتے تھے۔ اسی میں ناشتہ کھانا بناتے تھے۔ میں جھوٹا سا باورچی خانہ فرنیچر سب کچھ موجود تھا..... جب وہ لوگ لینے آئیں گے تو چلے جائیں گے۔“  
لیکن دین اپنا بوجھ ہمارے گھر اتار کر پھر کبھی نہ آئی۔ شاید باقی مسافر بھارت چلے گئے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں یہ سب C.I.A. کے مخبر نہ ہوں؟ اور اپنے طور پر کے کوائف حاصل کرنے کی ڈیوٹی پر نہ مامور ہوں؟ اب میں نے عورت سے بڑے شک و گمان کے ساتھ اپنے پر نظر ڈالی۔ اینڈریوز بہت ڈبلا پتلا قریباً تیس برس کا نوجوان تھا۔ جوئی نہ موٹی نہ ڈبلی۔ بس درمیانے قد کی عورت تھی۔

اینڈریوز نے مجھ سے پوچھا ”کیا یہ کسی ایجینٹ کا گھر ہے؟“ اس تعریفی جملے نے مجھ پر خاطر خواہ وار کیا۔  
”تعریفی اور خوشامدی جملوں کے آگے کس قدر نہتا ہو جاتا ہے۔“

”ایجینٹ کا تو نہیں ایک درویش کا گھر ہے۔“

”ایک ہی بات ہے۔“ اینڈریوز نے ایک اور تیر چلایا۔

اور یوں داستان سرائے میں اُن کا قیام طے پا گیا۔

اب اینڈریوز اور جوئی ہمارے مہمان خاص تھے۔ وہ دونوں شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں رہتے تھے۔  
میں نے سوچا کہ شہاب صاحب کے کمرے میں رہنے کے لیے ضرور ہے کہ انہوں نے کبھی مجھے کھانا تیار ہوتا ایک آواز پر آن مچتے، مرچوں والے سالن، پراٹھے، اچار سب کچھ جو سامنے دھر دیا کھا بیٹے۔ انہوں نے کبھی کسی پکیرے پر کسی قسم کا اعتراض نہ کیا۔ دن میں ایک آدھ بار وہ سیر پانے کے لیے شہر چلے۔  
شام کے کھانے کے بعد خاں صاحب کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے لیکن مجھ سے اُن کی بیٹھکیں کم ہوتیں۔

یہ دونوں بالآخر یہیں رہ گئے۔ پتہ نہیں، مسافر ساتھیوں نے دعا دی یا ان دونوں نے اچھا ٹھکانہ مل جانے پر انہیں



بھگا دیا۔ بہر کیف جو بھی معاملہ تھا میرے لیے اجنبی کی بات نہ تھی۔ میں اب تک امریکیوں کے سیلانی بن کو کچھ نہ کچھ سمجھتی تھی۔ وہ اپنے لیے سفر کو وسیلہ نظر بنانے میں بڑی تگ و دو کرتے تھے۔ ایک مدت کام کی روٹین سے وابستہ رہنے پر جوڑتے رہتے اور پھر اس رقم سے بڑیک پر چلے جاتے۔

امریکن تو اس چھٹکارے کو تو انانیاں اکٹھی کرنے اور نئے تجربے سیکھنے کو ”بڑیک“ کا نام دیتے تھے لیکن مجھے چاہتی تھی کہ اسے اسلامی نقطہ نظر سے بھی سمجھا جائے اور مہمان بھی اس سفر میں سیکھنے کے عمل کو اپنے لیے وسیلہ نظر جانے میرے لیے اس جوڑے کو رکھنا آسان تھا، لیکن کچھ دنوں کے بعد میرے لیے ایک مشکل پیدا ہوئی۔

مجھے پتہ چلا کہ اینڈریوز لندن کے کسی کالج میں انگریزی کا پروفیسر ہے اور جوئی پوری ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر ہونے کے ناتے اُس کی جان کاری بہت ہے لیکن وہ ڈاکٹری کی پریکٹس نہیں کرتی۔

پروفیسر اینڈریوز اور ڈاکٹر جوئی دونوں میاں بیوی نہیں تھے اور اکٹھے رہنے کا پلان بنا چکے تھے۔ میرے چوری چھپے کی آشنائی تھی جس کی میرے ذہن میں کوئی اجازت نہ تھی۔ ان کے نیسے یہ معمول کا فعل تھا کہ جب تک کہ کرایہ دوسرے کی طبیعت کو جان نہ لیا جائے، لمبی ہمسفری قبول نہیں کرنی چاہئے اور شادی کا طوق اپنے گلے میں نہیں چاہئے۔

جوئی کا والد ایک بڑا مشہور و معروف ڈاکٹر تھا اور لندن میں ایک سٹریٹ ہسپتال میں بڑی اہم پوسٹ پر تھا۔ میں حیران تھی کہ اُس نے بغیر نکاح کے جوئی کو انگلش کے پروفیسر کے ساتھ کیسے جانے دیا۔ لیکن تب مجھے وہاں ”آزادی“ کی خاطر انسان ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہے اور والدین اپنی آزادی اس طرح خریدتے ہیں۔ آزاد کر دیتے ہیں۔

بہر کیف یہ تجربہ میرے لیے نیا تھا۔ اب میڈیا کی بدولت مشرقی ماحشروں میں بھی شادی سے پہلے together کچھ ایسے اجنبی کی بات نہیں لیکن آج سے قریباً تیس برس پہلے ایسی بات سن کر منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ یہ دونوں اپنے میں لگن رہتے۔ بہت کم آ میز تھے۔ باپ کی طرح مناظرے اور بحثوں میں شریک۔ دن کے وقت جوئی اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رکھتی۔ اینڈریوز شلوار میض پہن کر سر پر نمازیوں والی قمیض چھپت ہو جاتا۔ ایک روز جب وہ باہر جا رہا تھا میں آک کے درخت سے تھکڑی بجلی کا ٹیل دیکھنے میں مشغول تھی۔ ایک روز اینڈریوز باہر نکلا تو ہم دونوں ایسے ہی سرسری علیک ملیک کرنے لگے۔

”تم کہاں جا رہے ہو اینڈریوز؟“ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”بھائی! وہ تم جوئی کو پیچھے چھوڑ جاتے ہو۔ وہ کمرے سے نہیں نکلتی۔ لُج کے لیے بھی نہیں۔“

”وہ اُس کی مرضی ہے آپاچی..... grown up ہے۔ اپنے آپ کو Look after کر سکتی ہے۔“

”کریں۔“

”تم چاہو تو میں تمہیں کوئی سینڈوچ بنا دیا کروں؟“ میں نے بڑی دریاہالی سے کہا۔ اس جملے کے ساتھ

اپنی برتری کا احساس ہوا۔

”میں بانو آ پا! مجھے کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں۔ میں روز کشمیری بابا کے پاس جاتا ہوں۔ وہ میری تربیت بھی کرتے ہیں اور مجھے لنگر بھی کھلا دیتے ہیں۔“

میں نے داتا گنج بخش کا نام تو سنا تھا لیکن کشمیری بابا کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔

اینڈریوز نے مجھے بتایا کہ کشمیری بابا نکلسن روڈ کے آخری کونے پر رہتے ہیں۔ وہ زیادہ وقت ذکر فکر میں مشغول رہتے ہیں اور لوگ ان سے اپنی مشکلات کے حل کے لیے آتے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اینڈریوز کی طرح راہ سلوک، عرفان اور حق الیقین حاصل کرنے کی تربیت بھی حاصل کرتے ہیں۔

کچھ مہینے ایسے ہی گزر گئے۔ ان کے دوران خاں صاحب کو جوئی کے والد نے چند خط شکر بے کے لکھے جن میں خاں صاحب کا اظہار تو ضرور تھا لیکن اس کے انتخاب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

پھر اچانک دونوں نے غالباً اکتوبر میں واپس لندن جانے کی ٹھانی۔ جس سہولت سے وہ ہمارے گھر کا فرد بنے ہیں آسانی سے وہ اچانک صرف خاں صاحب سے مل کر ایئر پورٹ رہا نہ ہو گئے۔ لندن پہنچ کر ایک دو خط اینڈریوز کے لکھے لیکن نہ یہ معلوم ہوسکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس بات کا پتہ بھی نہ چلا کہ وہ دونوں اکٹھے بھی ہیں کہ نہیں۔

پھر اچانک کرمس سے کچھ دیر پہلے اینڈریوز اور جوئی بغیر اطلاع دیے ٹیکسی میں سوار گھر آ گئے۔

میں ان کے آنے پر بڑی خوش ہوئی۔ سفید رنگت مجھے ہمیشہ مرعوب کرتی رہی ہے اور مجھے اندر ہی اندر محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی اس خوبی کے آگے ہر قسم کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ ان دنوں میں کرمس کے قریب تھوڑا سا جوش و خروش تھا۔ اینڈریوز میرے پاس آیا اور کہنے لگا..... ”بانو آ پا! آپ کے چولہے میں بڑا اچھا oven ہے۔ کیا میں اس میں کرمس ایک بنا سکتے ہیں؟“

”شوق سے مجھے صرف سوڈے بنا دو..... میں منگوا دوں گی۔“

”جی نہیں سوڈے میں خود لاؤں گا۔ آپ کو کچھ منگوانا نہیں ہے..... صرف اجازت دینا ہے۔“

”دوپہر کے وقت جب چیونٹی، بہن باورچی خانہ چھوڑ دیتی ہے ہم کیک بنالیں گے۔“

وہ سوڈے خود لا رہے تھے۔ اس چیز نے مجھے اطمینان کا سانس لینے پر مجبور کیا..... یہ کینگی ضرور تھی لیکن میں سمجھتی کہ نہ جانے وہ کیا کچھ منگوا بیٹھیں اور اس پر کتنی لاگت آ جائے۔

کرمس کی پچیس تاریخ سے چند دن پہلے انہوں نے قریباً چھ پونڈ کا براؤنی شکل و صورت کا کیک تیار کر لیا۔ اس کو کمرٹ اور میوے ڈالے اور اس کے اوپر کرانچ کرانچ کرنے والی چینی کی مہکلیاں سی سجائی گئی تھیں۔ جوئی نے آدھا کیک کھا کر اپنے والدین کو تیز رفتار ڈاک سے روانہ کر دیا۔ باقی کیک اس نے اپنے کمرے میں رکھ لیا۔

پچیس دسمبر کو بچوں نے قائد اعظم کی سالگرہ کے سلسلے میں کوٹھے پر موم بتیاں جلائیں۔ بڑا سا سبز جھنڈا جس پر ہماری باتھا لہرایا۔ غالباً ان دنوں نے یہ سمجھا کہ ہم کرمس کی خوشیوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ رات کو وہ دونوں بارہ بجے قریب کھانے کے کمرے میں آئے۔ بچوں کو چپکے سے بلایا۔ کیک پر موم بتیاں لگائیں۔ کچھ حمد و ثنا (Carolls) پڑھیں۔ کیک کا ٹاٹا کھایا اور سو گئے۔

ہمیں انہوں نے جگانے یا شریک ہونے کی زحمت نہ دی۔ صبح تھوڑا سا ایک صبح چند موم بیوں کے کالے سیر پڑا تھا۔ ہم نے اسے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کھایا اور معترف ہوئے کہ واقعی اس رنگت اور مزے کا ایک ٹیکہ نہیں ملتا۔ لیکن ہمیں خدا نے یہ توفیق نہ دی کہ اس بات کا ذکر ان دونوں سے کرتے۔

اب یہ بات پایہ تصدیق کو پہنچ چکی تھی کہ وہ دونوں عیسائی تھے اور اپنے مسلک پر استقامت سے گامزن تھے۔ شادی شدہ نہ تھے۔

لیکن جلد باز انسان کے یہ احمق پن کی دلیل ہے کہ کافی شواہد اور ڈیٹا جمع کیے بغیر کچھ معاملات پر حتمی فیصلے دیتا ہے۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔

ایک روز اینڈریوز اپنے ساتھ تھوڑی سی مٹھائی لے کر گھر آیا۔ ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے اور اپنے وقت کا تیاپانچ کرنے میں مشغول تھے۔

”یہ مٹھائی آپ کے لیے ہے۔“

”کس خوشی میں اینڈریوز؟“ خاں صاحب نے پوچھا۔

”میں آج کشمیری بابا کی مہربانی سے مسلمان ہو گیا ہوں۔ اب میرا نام اینڈریوز سلیمان ہے۔“ آپ نے

صرف سلیمان پکار سکتے ہیں۔“

پھر وہ پہلی بار شتو جی سے بغلیں ہوا۔ بیچے اور ان کے دوست اس خبر کو پا کر بہت خوش تھے۔ اب مجھے یہ دیتے ہوئے بھی کچھ ایسی خوشی نہ ہو رہی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ شاید ملت کے۔ یہ یہ کوئی گراما یہ اضافہ نہیں۔ پھر مجھے نے سب میں مٹھائی تقسیم کی۔ اینڈریوز کو مبارک دی اور رات کے وقت پلاؤ پکانے کا ارادہ کیا۔

میرے دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ میں اُسے اخلاقیات اور خاص کر اسلامی اخلاقیات پر کچھ لیکچر دینا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ میرا علم کم اور ناقص تھا اس لیے چپ رہی۔

چند دن بعد اینڈریوز اور جوئی سامان باندھے برآمدے میں موجود تھے۔ وہ واپس جانے کے لیے برآمدے

تھے۔

”اینڈریوز کہاں؟“

”بھگسر... بندن۔“

”لیکن میں تو تمہارے اعزاز میں ایک دعوت کرنے والا ہوں۔ مفتی جی کو بھی اطلاع دے دی ہے۔“

”مشکل یہ ہے خاں صاحب کہ جوئی اب یہاں رہنا نہیں چاہتی۔“

”پر کیوں؟“

”وہ عیسائی ہے اور میں مسلمان..... ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

”بھائی اسلام میں صاحب کتاب کے ساتھ شادی جاتا ہے۔ وہ کیوں گھبر رہی ہے؟“

”یہ تو اسلامی فراخ دلی ہے خاں صاحب! وہ عیسائی ہے اور وہ مسلمان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اُسے

نے اچھے نہیں لگتے..... فیصلہ اس کا ہے۔“

کچھ ہی دن بعد کا ذکر ہے کہ میرے کمرے میں کھلنے والے غسلخانے اور ڈریسنگ روم سے ملحق باکس روم کا منتقل ہو گیا۔ میں نے چابی اندر چھوڑ دی اور کڑک کر کے دروازہ کھینچ کر اندر سے تالا بند کر دیا تھا۔

چابیاں اندر چھوڑ کر دروازہ بند کرنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس کے بعد یہ غلطی میں نے کئی بار کی لیکن اُس روز سنا تھا۔ میں پریشان ہو گئی۔ پہلے تو بڑی دیر مختلف چابیاں لگا کر تالا کھولنے کی مہم جاری تھی کہ دروازے پر دستک صاحب کی عدم موجودگی میں اینڈر یوزر کبھی میرے کمرے میں نہ آیا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں حیران ہوئی۔

”کیوں سلیمان..... کیا میں کچھ کر سکتی ہوں؟“

”میں نے سنا ہے کہ آپ کا تالا بند ہو گیا ہے اور اس کی چابی نہیں ملتی۔“

”ہاں..... ٹھیک سنا ہے تم نے۔“

”میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“

میں نے جھنجھلا کر کہا..... ”اوہ بھائی! تم کیا مدد کرو گے۔ چابی تو اُس کی اندر رہ گئی ہے۔“

اینڈر یوزر نے اپنے گرتے کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ اس میں ایک نمبر نے کی شکل کی چابی نما چیز

”میں دو سال چور رہا ہوں۔ ہر قسم کا تالا کھول لیتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کوشش کر سکتا ہوں۔“

میرا جی تو اُس کی مدد لینے کو نہ چاہتا تھا لیکن میں نے حافی بھرنی۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ میں نے ان سے اُس کا شکریہ ادا کیا اور نئی الجھن کو سینے بیٹھ گئی۔

یہ تو مسلم اینڈر یوزر کون تھا؟

بغیر شادی کے کاسنی کمرے میں جوئی کے ساتھ رہنے والے کی اصلی شناخت کیا تھی؟ سر پر دو تہوں کی پگڑی پہننے والی چابی کی درگاہ پر روز جانے والا یہ شخص اچھا تھا کہ برا؟ میں اُسے کس خانے میں ڈالوں؟ مسلمان ہو جانے والا تو کون تھا کیا تھا۔

اس سوچ کا ذکر خاں صاحب سے بالکل نہ کیا کیونکہ وہ عموماً کہا کرتے تھے ہمیشہ دماغ ہی استعمال نہ کیا کرو کبھی کبھی اس کی قید سے رہا بھی کر دیا کرو.....

یہ وہ دور تھا جب خاں صاحب کے چھوٹے بھائی اشتیاق احمد کا ہمارے ہاں خوب آنا جانا تھا۔ تقو کے صائل، ہم دہمی میرے بچوں کے دوست تھے۔ اس کی بیوی منزہ کبھی اس کے ساتھ آ جاتی، کبھی صبح کے وقت اکیلی ملنے کے عموماً اپنی تمام تر خوش دلی انسان دوستی کے ساتھ کچھ پکا کر سجا کر لے آتی۔ باورچی خانہ اُس کے کھلے دل کی وجہ سے کھولا جاتا۔ وہ گلاب جاسن بناتی، کیک بیک کرنے کے طریقے سمجھاتی، کڑھائی گوشت بنانے کی ترکیب سمجھاتی، ہم وہ سب کو اپنی چھوٹی انگلی کے ساتھ لپٹنے کا فن بھی جانتی تھی۔

خاں صاحب کا رابطہ خلق سے اور طرح کا تھا۔ منزہ اور طرح سے جال پھینکتی تھی۔ خاں صاحب جانتے تھے کہ

جب انسان میں زیادہ خوبیاں اکٹھی ہو جائیں تو خطرے کی گھنٹی کہیں نہ کہیں بجتی ہے۔ دولت، حسن، دانشوری یہ سب نعمتیں دین تو ضرور ہے لیکن اسی دین کے باعث اللہ آزما تا بھی خوب ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ نعمتیں جھولی میں ڈالنے والا محتاط ہے کہ نہیں۔ جہاں غریبی، بدشکلی، کم عملی کا ساتھ ہو وہاں بھی آزمائش ہی مطلوب ہوا کرتی ہے۔ اللہ جانچتا ہے کہ نہ صرف یہ شخص صابر ہے کہ نہیں۔ ہمارے عہد میں غریبی کا امتحان قدرے آسان تھا۔ ابھی غریب آدمی میں بیوی اور حرص ایسے مہلک مرض نہ بنے تھے۔ امیری بھی نمائش، زیبائش، آرائش کی عادی نہ تھی۔ سوسائٹی کی آزمائشیں کم تھیں۔ بس کچھ منزہ جسے ہم شرمیلا ٹیگور کہا کرتے تھے ہار یک بین ڈوراندیش پہلے تول پھر بول والی خاتون کی شکل چاہتی کر لیتی جسے چاہتی اپنا بنا لیتی..... غیبت پر آئے غیبت کرنی، تعریف کو دل چاہا سراہنے پر آمادہ ہو گئے تو آسمان کے قلابے ملا دیے۔ نہ اپنے اعمال پر نازاں نہ احساس جرم میں مبتلا۔ بہت جلد اس کی اینڈ ریو ز اور جوئی سے دو ٹوک ہو گئے وہ آتے ہی دھڑلے سے ان کی طالب ہوتی۔ وہ بھی گویا منزہ ہی کے منتظر ہوتے۔ پھر محفل جستی، خوش گپیاں، پکڑے کا زور ہوتا..... گھنٹے پر یوں کی طرح داستان سرائے کے اوپر سے اڑ جاتے۔

ایک روز بڑا شکر چہرے لیے منزہ میرے کمرے میں آئی۔ کچھ دیر دو سوچتی رہی پھر بولی..... ”پتہ نہیں کہنا چاہئے کہ نہیں..... لیکن آپ کو پتہ ہے میں آپ کو کچھ بتائے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔“

”کیا ہوا؟“

”یہ جو اینڈ ریو ز ہے ناں.....“

”ہاں..... ہمارا اینڈ ریو ز۔“

”بالکل اور یہ جو جوئی ہے ناں۔“

”ہماری جوئی؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہ دونوں شادی شدہ نہیں ہیں۔“

”اچھا پھر؟..... اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”کرنا..... کرنا کیا ہے؟ یہ مغربی لوگ ایسے ہی ہیں۔ یہ Living together کو برا نہیں سمجھتے۔“

تجرباتی طور پر ساتھ رکھتے ہیں۔ پھر اگر نبھ جائے تو شادی ورنہ.....“

پہلی بار میں نے گھبرا کر کہا ”لیکن..... اگر بچوں کو پتہ چل گیا..... دیکھ لو ناں..... ٹولید تو صیف، پیا.....“

تمہارے بچے..... کبھی کبھی تو ڈیڈی جی کے بچے عدنان، لبنی اور عائشہ بھی آ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے تو کچھ دماغی پر کیا اثر پڑے گا..... پھر اسلام میں تو ویسے بھی چوری چھپے کی آشنائی نہیں کر سکتے..... منع ہے۔“

”تو یہ کون سا مسلمان ہیں کا کی..... تم پریشان مت ہو جانا۔ تمہاری عادت ہے۔ دوسروں کے مسکنوں میں اپنے سر پر مت اٹھالینا۔ ان کی اپنی اخلاقی قدریں ہیں۔ یہ سیکولر لوگ ہیں۔ یہ ہماری طرح اولڈ فیشنڈ نہیں ہیں۔“

میں نے سیکولر کا لفظ پہلی بار یوں استعمال ہوتے سنا۔ ابھی میں اس لفظ کے استعمال، معنی اور بھرم سے واقف نہ تھا۔

ایک روز ہم باباجی کے ڈیرے سے لوٹے تو بچے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان کو چھوڑ کر

میں پہنچے۔ برآمدے میں منزہ اپنے گدگدے ہاتھوں کے اشاروں سے جوئی اور اینڈریوز کو کچھ سمجھانے میں لگی۔ ہم دونوں ٹیوں کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ ابھی ہمیں زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ منزہ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”بیادیں شقو بھائی!“

”آئیے آئیے۔“

منزہ کا چہرہ خوشی سے تمٹمایا ہوا تھا اور وہ کلاکاریاں مارتے بچے کی طرح معصوم لگ رہی تھی۔

”شقو بھائی! سینمان چاہتا ہے کہ وہ جوئی سے شادی کر لے۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اس طرح نہیں رہنا چاہتا۔“

”بڑی خوشی کی بات ہے..... لیکن جوئی تو مسلمان نہیں ہوئی۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔

”اہل کتاب سے نکاح جائز ہے۔ میں نے جوئی کو سمجھا دیا ہے! اسے مسلمان نہیں ہونا پڑے گا۔ تیاری چکڑو

نے بڑا کرم کر دیا، بڑی خیر ہوگی پت.....“ یہ کہتے ہوئے خاں صاحب باہر اینڈریوز اور جوئی کے پاس چلے گئے

منزہ کے پاس بیٹھ کر نکاح سے متعلقہ تیاریوں میں لگن ہو گئی۔

یہ منزہ کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔

اس نے جوئی کو جاننے کے لیے زیور سے لے کر ہاتھ والی بدکی تیاری تک ڈھونڈی، بچانے والیوں کو بلانے

نے ہر میلہ منانے تک چھوٹی چھوٹی تفصیل کے ہمراہ ایک ہنگامہ خیز شادی کا اہتمام کر لیا۔ گھر میں ہر وقت بھرا بھری کی

تعمیرات کو منجے لگیں، ڈھولک کی تھاپ سارے محلے میں خوشیاں بکھیرنے لگی۔ ہر وقت آنے جانے والیوں کا تانتا چل نکلا۔

ایندریوز ایک روز باورچی خانے میں میرے پاس آیا۔ کہنے لگا..... ”ہانو آیا! میں ایک کیک بنانا چاہتا ہوں۔“

”کیک؟ کیسا کیک؟“

”وہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ شادی کے کیک کے بغیر شادی مکمل نہیں ہوتی۔ Wedding کیک میں بناؤں

تھاپ اجازت دیں گی۔“ اس نے باورچی خانے کے اوون کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں کیوں نہیں..... کیا کچھ درکار ہوگا؟“

”باقی سب کچھ میں نے آؤں گا۔ گھر پر کیا براؤن چینی ہوگی۔“

”ہاں شکر مل جائے گی۔“

”بہت اچھا۔“

منزہ نے ایک مولوی صاحب بلا کر نکاح تک پڑھوایا۔ عموماً بعد میں اصل بھید کھلا۔ نکاح میں مردوں کے علاوہ

شریک نہ ہوا لیکن بعد ازاں کیک کاٹنے کی رسم تمام تر عورتوں کے حوالے ہو گئی۔ کوئی دس پونڈ کا کیک موم بتیوں سے سجا

کھانے کے کمرے کی سیاہ میز پر پڑا تھا۔ جوئی اور اینڈریوز نے اسے کاٹا اور بانٹا۔ پھر قریباً ایک چوتھائی کیک اینڈریوز

کے کمرے میں لے کر جانے لگا تو میں نے پوچھا ”اسے کیا کرو گے سلیمان؟“

”یہ میں ڈاکٹر گیون کے گھر بھیجوں گا۔ وہ بہت خوش ہوں گے..... ہم نے کرمس پر بھی انہیں کیک بھیجا تھا۔“

ابھی سلیمان اور جوئی کی شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ پتہ لگا وہ دونوں اپنی مومن منانے لندن جا رہے

ہیں۔ خاں صاحب اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارتے۔ اشتیاق منزه بھی آجاتے تو باتوں میں گرما گرمی پیدا ہو جاتی۔ گیسٹ ہاؤس میرے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ بچے بھی اس شادی پر بڑے خوش تھے اور جوئی کو زیادہ محبت سے جوئی آپا بلانے لگے تھے۔ پھر جوئی اور سلیمان لندن چلے گئے۔ ایک عرصہ تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں۔ ایک روز آیا تو جوئی اُس کے ساتھ نہ تھی۔

”یہ میری بیوی ہے۔“

میں نے بیوی پر نظر ڈالی تو سوائی چادر میں ڈھکی ڈھکائی عورت جوئی نہ تھی۔

”یہ اطالوی لڑکی ہے..... مسلمان ہو گئی ہے اور یہ ہماری بیٹی ہے۔“

میں نے دل میں سوچا کہ سلیمان نے بھی مسلمان ہوتے ہی بیوی بدلنے کا ہی سوچا اور کوئی نیک کام اب سوچا۔ چھوٹی بچی سوائی لباس میں تھی۔ فراک نما کرتا نیچے دروازے والی چنت دار شلوار۔ سر پر سوائی ٹوپی۔ میں نے سوچا کہ بیسوی صدی میں بغیر Pampers کے کسی بچے کا میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہاں شلوار میں اتنا بڑا اشکاف تھا جس سے بچہ اپنی حاجات پوری کر لیتا اور گیلیا بھی نہ ہوتا۔ اطالوی لڑکی نہ انگریزی جانتی تھی نہ اردو۔ اس لیے اُسے بات کرنے کے لیے صرف خاں صاحب ہی میسر آئے۔ وہ دونوں اطالوی میں دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ایسے میں اینڈر ویو لکھنا ان کا منہ ٹکا کرتے لیکن کچھ سمجھ نہ پاتے۔

کچھ دن قیام کے بعد اینڈر ویو صبح بولا..... ”آج ہم واپس جا رہے ہیں۔ ٹماٹر کی فصل تیار ہو گئی ہے۔ نے چاچا حمید سے کہا تھا وہ خیال رکھتا ہوگا۔“

اس کے بعد سلیمان کب چلا گیا؟ میں اُس سے جوئی کے متعلق کچھ نہ پوچھ سکی جوئی نے کیوں اُس سے کہا؟ یہ سوال ہی رہے کیونکہ میں جانتی تھی کہ کسی کا ہاتھ پکڑنا بھی اپنی ضرورت کے تحت ہوتا ہے اور اُس ہاتھ کو چھونے اپنی ہی جملہ خواہشوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ کوئی شخص نہ کبھی کسی اور کے متعلق کچھ سوچتا ہے نہ اُس کو مد نظر رکھ کر فیصلے لیکن میں نے اپنی لاتعلقی کی خواہش کا اظہار نہ کیا۔

سلیمان اور اُس کی اطالوی بیوی کے جانے کے بعد میں کاسنی کمرے میں گئی تو سارا کمرہ صاف تھا۔ فرش پھیری ہوئی، غسل خانہ دھلا ہوا تھا۔

اس بار سلیمان ہم سے یوں رخصت ہوا جیسے امیر رشتہ داروں کے گھر سے دیہاتی غریب رشتہ داروں کے گھر میں۔ اُس نے نہ ہمیں اپنا پتہ دیا نہ گرم جوشی سے الوداعی جملے ہی کہے۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ یہ گھرانہ مغربی تہذیب کے نرنغے میں آ گیا ہے۔ بچے انگریزی کتابیں پڑھتے ہیں۔ آپاجی اور خاں صاحب بھی اب مشرقی تہذیب کا نمونہ رہے۔ پتہ نہیں سلیمان کا آدرش ٹوٹ گیا تھا یا اُس نے ایک نئے معاشرے میں آزادانہ اپنا مقام پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چھٹکارا حاصل کرنے داستان سرائے سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے میں ہی عافیت سمجھتا ہو۔ وجہ جوئی کے کہنے کے بعد سلیمان ہمارے ماضی کی داستان پارینہ بن گیا۔ اُسے صدا دیتے بھی تو بیکار تھا کیونکہ ماضی کبھی ملاقات کر سکتا۔ اُسے دفن ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک دن میں نے اُس کا ذکر کیا تو خاں صاحب بولے..... ”جو شخص اپنے ماضی کی

مستقبل کے اندیشے میں زندہ اُس کا حال بیکار ہو جاتا ہے۔“

زندگی نے ہمیں اور مصروفیات عطا کر دیں اور ہم ان دونوں کے قیام کو بھول گئے۔ ایک دن اچانک مجھے سوات کے ایک خط ملا۔ عجیب سی بات ہے لیٹر پیڑا داستان گو کا تھا لیکن لفافے پر مہر سوات کی تھی۔ خط میں رقم تھا کہ میں نے سوات میں کچھ زمین خرید لی ہے اور یہاں کاشتکاری کرتا ہوں۔ اس زمین کے عوض میں نے اپنی لندن کی زمین ان سواتیوں سے خرید لی ہے۔ ان کو لندن میں رہنے کا شوق ہے۔ میں یہاں اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرتا ہوں۔ کئی سال میں یہاں تیسری کی۔ نو جوانوں کو پڑھایا۔ مہذب لوگوں کو قریب سے دیکھا۔ اب میں پرندوں کی طرح معصوم لوگوں میں رہتا ہوں۔ سفری تہذیب سے بہت دُور..... کھوٹی پر اپنا سامان لا کر منڈی لے جاتا ہوں (بہت دیر تک ہمیں سمجھ نہ آئی کہ یہ کتنے کیا چیز ہے۔ پھر انیق بے نے عقدہ حل کیا کہ خچر کو کہہ رہا ہے۔)

خاں صاحب انگریزی کی ڈکشنری پھر ورنے میں مصروف تھے۔ نوکی نے خط لے کر پڑھا اور بولا:

”ابو! اینڈریوز کے پاس اب پندرہ گدھیاں ہیں جن پر وہ سامان لا کر منڈی لے جاتا ہے۔“

ایک روز اینڈریوز اپنے ساتھ ایک سواتی لڑکی کو لے کر آ گیا۔ یہ خوبصورت لڑکی اُردو پنجابی سے بالکل ناواقف تھی۔ چڑھی لکھی ہونا تو درکنار وہ تو اشاروں کی زبان بھی نہ سمجھتی تھی۔ یہ اینڈریوز کی تیسری بیوی تھی۔

”میں نے سوات میں اس لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا ہے..... یہ کھیتی باڑی کے ایسے گر جانتی ہے کہ مجھے وہاں کام

کرنے میں مشکل نہیں رہا۔“

خاں صاحب نے حیران ہو کر کہا..... ”بھائی! تم لوگ عجیب اخلاقت ہو جو چاہتے ہو کر لیتے ہو۔ اپنی زندگی سے

یہ کھیتاؤں کے ساتھ ایسے ایسے تجربات کرنا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ وہ اطالوی بیگم کیا ہوئی؟“

”وہ مسلمان تو ضرور تھی۔ گاؤں میں نہیں رہ سکتی تھی چلی گئی۔ اُس کا کلچر اُسے گھسیٹ کر واپس اٹلی لے گیا۔“

ہوا یوں کہ لندن میں اینڈریوز کے پاس زمین تھی اور اُس کی سواتی بیوی کا باپ لندن امیگریشن کے چکر میں تھا۔

یہ لڑکی پہلے تو اپنے سر کی زمین میں کھیتی باڑی کرتا رہا پھر جب امیگریشن کے کاغذات مکمل ہو گئے تو اینڈریوز پندرہ

کھیتوں اور سواتی زمین کا مالک ہو گیا۔ ان ہی گدھیوں پر سامان لا کر منڈی لے جاتا ہے۔ سادی زندگی سے وابستہ ہے۔

یہ تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس نے زندگی کے ساتھ تجربات کرنے بند کر دیے ہیں کہ ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

جانے وہ سوات میں ہے کہ کہیں جاپان، ملیشیا یا کہیں چین میں رہتا ہے۔ اُس کی سواتی بیوی ساتھ ہے کہ لندن

اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ لیکن نہ تو ہمارا تجسس اس قدر تیر بہدف ہے نہ ہماری دلچسپی ہی برقرار رہی۔ رابطہ ہو تو کیسے۔

میں نے چند نظمیوں میں لکھی ہیں جو کبھی کبھی اُس کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

اس خط میں ایک اور صفحہ پر ایک نظم درج تھی اس کے نیچے 1975ء درج تھا۔ غالباً یہ نظم ہمارے پیڑ پر ہمارے

گھر میں ہی لکھی گئی لیکن پوسٹ سوات سے ہوئی۔ لکھا تھا۔

بانو قدسیہ کے لیے ازلی شکر یہ کے ساتھ!

جو حصہ آپ نے مجھے سلیمان ہونے میں ادا کیا اور دوسری مہربانیوں کے لیے (نیچے نظم تھی)



ایک مسلمان ملک میں ابھی تک میں بوہی مہاں پرشوں کی تلاش میں ہوں۔ مادہ سے بھری دنیا میں روئے  
ڈھونڈ رہا ہوں۔

میں دریا کنارے پیسا ہوں.... سوپر مارکیٹ میں بھوکا کھڑا ہوں۔

چائے خانوں سے ”چائے“ کی صدا آتی ہے۔

”روٹی اور ترکاری“

مسجد سے اذان کی آواز اٹھتی ہے ”اللہ ہو اکبر“

اللہ سب پر حاوی ہے

دنیا بے معنی ہے

اللہ کہو اور ان سب کو بے کار ٹھیل تماشے کے لیے چھوڑ دو

میری آنکھیں برساتِ حجاب ہیں

محبت کی رسی پکڑ کر Illusion کے بادلوں سے گزر کر مجھے سات بلند یوں پر چڑھنا ہے

پہاڑ کی اُس سفید چوٹی پر پہنچنا ہے جہاں میرا آقا میری راہ دکھاتا ہے

وہ ہمیشہ ایک ہے

ہمیشہ تنہا ہے

میری محبت کے بغیر ادا ہے

میں اپنی منزل بھول گیا اور کھیل کود میں مصروف رہا

اے اللہ مجھے سکھا

اے نبی ﷺ مجھے یاد دلا

”اپنا کام چھوڑ اور نماز پڑھنے جا“

ایک انعام تجھے آخرت میں ملے گا لیکن اطمینان قلب تجھے آج ہی نصیب ہو جائے گا“

سلیمان اینڈریوز

1975ء

اسی نظم کی پشت پر ایک اور نظم بھی درج ہے۔ یہ نظم اینڈریوز نے 1967ء میں لکھی تھی جب وہ ابھی مسیحی

ہوا تھا اور اپنی پریشانی کی بندگلی سے نکلنا چاہتا تھا۔

”بند انجام“

وہ اُس شخص کو اختتام تک پہنچ چکا تھا

اُس گلی کے آخر تک

اُس پاپ سانگ کے انجام کو  
 اپنے خیالات کے ایسے لمبے سلسلے  
 جنہوں نے اُس کی زندگی کے مضافات کو  
 سہ پہروں تک ڈھانپ لیا تھا  
 اُسے اپنے کمرے سے کیوں اتنی نفرت تھی؟  
 اسی مسئلے کو سب سوچوں نے گھیرے میں لے لیا  
 پھر اُس نے سب کچھ ڈھینڈھا چھوڑ دیا  
 ہر شے کو زمین پر بکھرنے دیا  
 وہ فرش پر ٹھنڈا لینا سگریٹ پیتا رہا  
 دیوار پر بارش اور سورج بھسنے رہے  
 اور وہ کھلی آنکھوں انہیں دیکھتا رہا  
 وہ تذبذب تھا.....  
 شاید دیر ہو چکی تھی  
 اور اس دیر کے اصل میں کیا معنی تھے  
 وہ ہر شے کے معنی کھو چکا ہے  
 تذبذب ہے کہ کیا کبھی کوئی چیز با معنی بھی تھی  
 وہ اپنے آپ کو ایک ٹھنڈا ستارہ سمجھتا ہے  
 جس نے اپنی مروت میں سورج کو جنم دے رکھا ہے  
 وہ آرزو مند ہے کہ کسی دن ہر امید ختم ہو جائے  
 پھر وہ پارک میں کھلی زھوپ میں اگتا رہے گا  
 گھاس کے لاکھوں beds میں ایک تنکا  
 جیسے صبح کے وقت گھاس کا ٹٹنے والی مشین کا بلینڈ  
 کاٹ کر دھردے  
 وہ سبزے کے فوارے میں تیرتا رہے گا  
 اُسے شدید آرزو ہے کہ  
 یا تو اُسے پروا ہو یا وہ بے نیاز ہو جائے  
 وہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا وہ مر رہا ہے  
 یا زندہ ہے

یا کیا؟

اینڈریوز

-1967-

اینڈریوز کی نظم پڑھ کر ہم دونوں دیر تک چپ رہے۔ یوں لگا جیسے ایک مدت بعد کوئی گمشدہ انگنٹھی ملی ہوگی۔ ہیرا گر چکا تھا۔ خاں صاحب نے ہلکا خرم بڑی جرأت سے کہا ”زیادہ مت سوچو قد سہا! بڑے سے بڑا ادیب بھی کہانی نہیں بن سکتا۔ سلیمان بھی ایک ایسی ہی کتھا ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا..... بس وہ ہمیں سے نکلتا ہے۔ کہیں ختم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو..... جو نہیں ہو سکتا اُس کی آرزو میں اپنا آپ جسم نہ کرو۔ آرزو سیکھو بھاگنے والا چاہے مجھوں ہو..... چاہے کوئی سائنس دان کوئی صوفی ہو یا شریعت کا پابند..... آرزو کے تعاقب میں کتنا درست نہیں۔ اس کے لیے شائقی کا آسن لگا کر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ آخر اُس وحدہ لا شریک کی طرف سے..... کیوں ہے نہیں..... بلکہ کیا ہے..... یہی بڑا راز ہے۔“

### سفر (اوسلو)

سن 1982ء میں Loriters Ilision Oslo نے مجھے اور خاں صاحب کو اوسلو مدعو کیا۔ ناروے کے خوبصورت شہر کی عمارتیں گویا آئینہ خانہ تھیں۔ بڑکیں دھلی ڈھلائی لوگ شائستہ سفید اور نرم طبیعت تھے۔ تھمیں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ ناروے میں کیا تھا۔ بہت سے ادیبوں سے بھی واقفیت ہوئی لیکن زبان آڑے آئی لیکن Helge Vatsend کو ہم اپنی زبان پتھاری میں ساتھ لے آئے۔ اس سے Trolls کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ وہ شاعر ہیں۔ اُس کی کچھ نظمیں انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں۔ ناروے کے لوگ Trolls میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ Trolls ایک نوعیت کی دیومالائی مخلوق ہیں جیسے جن اور پری کا تصور ہمارے ادب اور لوگ کہانیوں میں ہے۔ ان ٹروڈ کا کام انسانوں کی مدد کرنا اور مشکل وقت میں اشارے کنائے سے انتباہ کرنا ہے۔

قریباً سال کے بعد ہیملے ویٹ سینڈ کا خط ملا۔ اُس کی چند نظمیں بھی ملفوف تھیں جو آپ کو سنائے دیتے ہیں۔ (انگریزی ترجمہ Olav Grinde نے کیا ہے)

(1)

”چیتیں“

ہر روز تکنیک (Perfect) ہوتی جاتی ہے

ہمارے لوگ روم میں اب شو ہوتا ہے

دنیا کے ریکارڈ

نیا گرا کی گھن گرج  
 گھاس کے blades پر کیڑے مکوڑوں کی زندگی  
 بے رحمی کی حد تک بے نقاب  
 لیکن خوبصورت رنگوں میں موجود  
 لیکن ایسے دن بھی آتے ہیں  
 جب ٹی وی کے رنگ گرے ہو جاتے ہیں  
 جس طرح خزاں کی بارشیں مناظر ڈھنڈلا دیتی ہیں  
 اور چہرے ڈھنڈلا دیتے ہیں  
 لیکن جلد ہی دوسرے پروگرام ان کی جگہ آ جائیں گے  
 چینل کا سوچ کھل کی آزادی کا سہل ہے  
 جھنڈا اور تھیٹھا ہے  
 ہم پھر یور نہیں ہوں گے  
 پھر ہم سڑکوں پر اکٹھے ہو کر  
 بے صبری سے تبدیلی کے نعرے نہیں لگائیں گے  
 دنیا کی تصویر پر ہمارے لیے اور بھی perfect ہو جائے گی  
 ہماری زندگی سے حیات کا رس  
 لہہ بہ لہہ پہر در پہر چوتھی ہوئی

(2)

Light Rope Art (ایک جھلکن)  
 شعبہ باز اونچا آسمان میں چڑھا  
 مسکراتا ہے  
 وہ تہی ہوئی سرکس کی رسی پر تہا ہے  
 جانتا ہے کہ اگر وہ گر پڑا  
 تو پھر سب کچھ ختم ہے  
 کیونکہ سکریں پر صرف Perfection دکھائی جاتی ہے  
 ہم Sirens بجاتے چیتے  
 اُس کے گرنے کا انتظار کرتے ہیں

ریس کاریں اپنے راستوں سے گر کر اٹلتی ہیں  
 ڈرائیوروں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں  
 سیلابی لہریں  
 بہوں سے مہار گھر  
 ہمارے عہد کی تباہیاں  
 آج کے نو وارد وقت

لیکن ہمیشہ وہی چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں  
 وہی الفاظ  
 اُن لوگوں کے منہ سے جو نیلی ویرن کو اپنی گرفت میں لے بیٹے ہیں  
 الفاظ تصویریں  
 متوازن آراء  
 رسی پر چلنے والا شعبدہ باز مسکراتا ہے  
 صرف ہم ہی شکوک کے ساتھ رہتے ہیں

(3)

(The Unspeakable. Translated by Olav Grinde) (ناگفتنی)

جان من ایک خاردار لمبے راستے پر پہنچ کر  
 ایک ایسے ناگفتنی مقام پر پہنچنا  
 جہاں الفاظ کی اشد ضرورت ہو  
 ہم اُس متن میں  
 اپنی خالی جگہیں بنا لیتے ہیں  
 جہاں صرف خاموشی ہوا کرتی ہے  
 ایک ایسی چپ جسے دانش کہا جاسکتا ہے  
 کھنٹی کی طرح خالی  
 باہر اندھیرے میں گھاس کے blade جیسی  
 مسل ٹو کے نیچے دیئے گئے بوسہ کی مانند  
 ایک مکمل بات

ہمیں پرانی دانش سے بھری کہاوتیں  
اپنی خاموشی پر چھائی لگتی ہیں  
جو ایک بلی کی طرح  
اپنے نرم پنچوں پر  
دائروں میں چلتی ہے

(4)

(Silence) سناٹا

کچھ بھی تو نہیں ہوتی  
دن آہستہ آہستہ نرتتے ہیں  
شام کے وقت  
تھکے ہارے رپورڈ کی طرح گھر لوٹتے ہیں  
چھتے چلا تے آگے بڑھتے  
تغاب میں تیز تیز

منتظر

ایسے شگون کے لیے  
جسے آسمان میں بادل  
ہو اس Tension ہے  
اور جسم خارش سے بھر گیا ہے  
آنے والا اکل  
دھرتی کے سخت سینے  
بل چلانے آئے گا  
ایسا بل جو ہمارے بل سے بھاری ہوگا  
ہم منتظر رہتے ہیں  
ہماری پریشانی معکوس ہو  
ہماری روح میں گھس بیٹھتی ہے  
ایک دن یہ خاموشی  
ہمارے کان کے پردے پھاڑ دے گی

سفید موت  
خاموشی کی سفید موت  
برف زمین سے ڈھانپ دی جائے گی  
اور اُس پر لہو ہوگا

(5)

Game (کھیل)

سکہ مشین میں ڈالا جاتا ہے  
Pin Ball مشین کی ساری حرکتیں مشینی ہیں  
میرے متحرک جذبات اس کے حریف ہیں  
فتح مندی دولت آزادی  
ایسے الفاظ سے میرے خواب اور امیدیں وابستہ ہیں  
ایک دن ایسا لمحہ ضرور آئے گا  
ایسا لمحہ شگاف  
جب پچھے ٹھیک بیٹھ جائیں گے  
جس طرح کوئی نظم اچانک دل کو بلا دیتی ہے۔

یہ نظمیں غالباً ستر کی دہائی میں لکھی گئیں اور مجھ تک 1983ء تک پہنچیں۔ یورپ کے یہ لوگ مشینی زندگی کی برکات اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی سے دنیا میں سب سے پہلے آشنا ہوئے۔ ان کی برف پر انسانی لوگ کی قتل سے نہیں بلکہ انسان کی آئیڈیلز کی ٹوٹ پھوٹ سے بہ نکلیں۔  
میں نے یہ نظمیں اس لیے گوش گزار کی ہیں کہ ابھی ہم نے Perfection کی دوڑ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اکثریت ٹیلی ویژن کے آگے بیٹھ کر کار رلیں، سونامی کے سیلاب، زمانے بھر کے اشتہار نہیں دیکھتے تھے۔ ہمارے بچے سکے ڈال کر جوا کھیلنا نہیں سیکھا تھا۔ ہم ابھی دیہات کے سوائے ہوئے کلچر اس کی جہالت، رسم و رواج، مذہب اور اس سے حاصل شدہ سکون سے آشنا تھے۔

جس کیفیت سے گزر کر یورپین ادب اور ہیلگے جیسے نامعروف شاعر کی نظمیں وجود میں آئیں یہ دور بیسویں صدی کے آغاز میں یا اس سے کچھ ہی دیر پہلے ملا۔ مشرق کی سخت زمین میں بل چل رہا تھا۔ تبدیلی آرہی تھی لیکن ابھی ہمیں شعوری طور پر اس کا کلی احساس نہ تھا۔

## آخری ایام (گھر کو واپسی)

کچھ تو خاں صاحب کی بیماری نے کم توڑ دی تھی کچھ نفسیاتی، قلبی ذہنی طور پر میں خوف سے تتری تتری ہو گئی تھی۔ ایک خوش الحان راست گوسا تھی سے بچھڑنے کا برا خواب ہر وقت ساتھ تھا جسے میں گس راس سے اڑاتی رہتی تھی، یہ نہ خواب در ماندہ پیچھا چھوڑتا تھا نہ ہونی ملتی ہی نظر آتی تھی۔

چھ ستمبر کی رات عجیب بے کسی سے پا پیادہ چل رہی ہے۔ خاں صاحب کی ذوقی نبض اتنی دھیمی تھی کہ بار بار شبہ ہوتا بھی ہے ابھی نہیں ہے۔ سرخ و سپید چہرہ جس نیکی پر دھرا تھا اسی کی مانند سفید ہو چکا تھا۔ بازوؤں کا گوشت جھا لہر صفت بن رہا تھا۔ نہ بالوں میں آب و تاب باقی تھی نہ داڑھی میں چمک تھی۔ درو مسلسل چھاپے مار رہا تھا، لیکن اُن کی آواز میں بے حسرتی، ناشکیبائی یا رتی بھر شکایتی لہجہ در نہ آیا تھا۔

وہ بار بار اٹھتے مجھے ہلاتے۔ میں اٹھتی پاس جاتی وہ کمزور مدہم آواز میں کہتے ”میں نے تمہیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔“ میں جواب میں کچھ نہ کہہ پاتی۔ کچھ دیر میں اُن کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھتی۔ پھر وہ بڑے تردد کے ساتھ مجھے کہتے ”سو جاؤ اور اب میرے ہلانے پر بھی نہ اٹھنا۔“

اُن کی تکلیف اس قدر زیادہ تھی کہ اندر ہی اندر یہ ڈکھ مجھے ستارہا تھا کہ کاش وہ قوت برداشت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے روئیں چلائیں، واویلا مچائیں۔ لیکن خاموش شیر قالین تو صاحب فرماں تھا۔ ہم دونوں جاگ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو سٹلانے کا مشغلہ اپنائے ہوئے تھے۔

رات قطرہ قطرہ گزر رہی تھی جیسے ڈرپ میں لگا خون۔

کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی آواز چہرے پر منڈلانے والی کبھی کی طرح بجنھنا رہی تھی۔ کمرے میں لگا کلاک نے محسوس پھیلانے کے انداز میں سیکنڈ کی سوئی بجائے جا رہا تھا۔ آج اس کی آواز گویا کوچ کا نغمہ تھا۔

کمرے میں زیر و کا بلب روشن تھا جس کی روشنی پر یاس کا پیلا پن نمایاں تھا۔



کتابوں سے لدی الماریاں جامد باسی اور پرانے کاغذوں کی بو باس کمرے میں پیرے کر رہی تھیں۔ یہ سب کیوں میری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا تھا کہ تمام خاکستری کتابیں زرد رنگ کی ہو چکی ہیں اور ان پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کتابوں کے عنوانات جو خاں صاحب کی لکھائی میں کتابوں کے پشتوں پر چھپے پڑھے نہ جاتے تھے۔

اُبھرنے والی صبح پچھڑنے والی رات سے گلے مل رہی تھی۔ گویا کسی مستقل دھجوزے سے خوفزدہ ہو کر آنسو سے بھیبت گئی ہو۔

قریباً چار بجے تھے جب انہوں نے مجھے بلایا۔

”ستوا نہیں خاں کو فون کر دو..... وہ آ جائے۔“

میں نے پُر امید ہونے کے انداز میں غلط جواب دیا..... ”آپ فکرنہ کریں خاں صاحب! ابھی صبح ہوتا ہے۔ وہ خونہ مخواہ پریشان ہو جائے گا۔“

”اچھا۔“ انہوں نے اپنی کربل سرٹیں کرتی پریشانی کو برداشت کے پتھر تے دبا لیا۔

پھر چھ بجے کے قریب انہوں نے ”وازی“ بانو..... ہوئیں؟“

میں جان بوجھ کر آنکھیں ملتی اٹھی ”جی خاں جی!“

”یہ ذرا میری نبض دیکھنا۔“

وہ بدھا روپنی چہرہ لیے لیٹے تھے۔ چہرے پر رتی بھر پریشانی نہ تھی۔ رُرد نیم باز کا قرض چکانے کے بعد تھی

اطمینان کی صورت۔

میں نے نبض محسوس کرنے کی کوشش جاری رکھی..... انہوں نے بھی اپنے ایک ہاتھ سے دوسری کلائی کو تھام لیا۔

دونوں چپ رہے۔

پھر میں نے ہائی فون کے ڈاکٹر عاطف کے موبائل کا نمبر ملایا اور اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ میں نہیں

تھی کہ وہ میری آواز سے کچھ اندازے لگائیں۔

”عاطف! پلیز آپ آ جائیں۔ خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”کیا ہوا؟“

”بس جی نبض بہت آہستہ چل رہی ہے اور.....“

”آپ فوراً ڈرپ لگوائیں۔“

”اچھا جی..... آپ آ جاتے اگر تو تسلی ہو جاتی۔“

”میں ضرور آ جاتا لیکن اس وقت میں ایئر پورٹ جا رہا ہوں۔“

میں واپس کمرے میں آ گئی۔

”عاطف کو بلایا؟“ اُن کی آواز میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔

”وہ ایئر پورٹ جا رہے ہیں..... اسلام آباد..... میں اشر بیٹے کو جگلاؤں؟“

”وہ ایئر پورٹ جا رہے ہیں..... اسلام آباد..... میں اشر بیٹے کو جگلاؤں؟“

”ناں ناں..... پہلے وہ رات ایک بجے تک بیٹھا رہا ہے۔ بیٹلر کی نیند خراب نہیں ہونی چاہئے۔ بڑی ذمہ داری کا

”میں نہیں کو فون کروں؟“

”ناں ناں..... تم بھی سو جاؤ۔ اب میں ٹھیک ہوں۔“

خاں صاحب نے مسکرانے کی کوشش میں ہونٹ ٹیڑھے کر لئے۔

میں ڈاکٹر عطف گوہیر کو فون ملانے میں مصروف ہو گئی۔ سائیکہ ہسپتال والے ڈاکٹر گوہیر.....

ووغا اباً موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب! خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں.....“ میں چپ ہو گئی۔

”ابھی ڈرپ لگائیں گے ٹھیک ہو جائے گی۔“

مجھے یوں دگا گویا وہ پہلے سے ہسپتال کی ایسولینس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی میں سوچ بھی نہ پائی تھی کہ کیا کرنا

ہے۔ کیا ہونا درکار ہے کہ ڈاکٹر گوہیر آن پہنچے۔ ہم قریباً دس منٹ میں باہر آ گئے۔ سینے ڈاکٹر صاحب نے شتو جی کو

ہاتھوں میں سوار کرنا چاہا پھر کچھ سوچ کر بولے انیس میری کار میں، تھکا دیتے تھے۔

اس وقت جب ہم انیس کرسی سے فرنٹ سیٹ پر منتقل کر رہے تھے۔ اشرف خاں بینک کے لیے تیار ہو کر آ گئے۔

”میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں ابو.....“

باباجی

(از ڈاکٹر عطف گوہیر)

صبح سات بجکر پچیس منٹ پر بانو آپا کی مخصوص سکون آمیز آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”ڈاکٹر صاحب

کی طبیعت کی معافی۔ خاں صاحب کی طبیعت چار بجے سے کچھ ٹھیک نہیں۔ ٹھنڈے پینے آ رہے ہیں اور کسی کروٹ آرام

نہیں۔“ میں نے پچھلے چھ ماہ کے اس کٹھن امتحان سے گزرتے ہوئے کم ہی کبھی بانو آپا کو پریشان دیکھا تھا۔ اس

کٹھن میں پسند شفیقت و ممتا کی باڑعب دیوی کو جو سفید لباس اور سفید کھلے دوپٹے میں اپنے آپ کو پسینے رکھتی تھی جب خاں

صاحب کے بارے میں زیادہ تشویش ہوتی تو وہ پنجابی کے بجائے اردو میں اس کا اظہار کرتیں۔ اس دن آپ کی اردو

تھیں کہ میرا دل ایک ہارٹ بیٹ مس کر گیا۔ خیال آیا کہ اشفاق احمد صاحب جو پچھلے تقریباً چھ ماہ سے انتہائی تکلیف دہ

حالت کا مقابلہ مرحلہ وار احسن طریق پر کر رہے تھے۔ شاید آج اس دنیا میں اپنا آخری فرض بھی عالمانہ نحل اور صوفیانہ

سیر و لیری سے سرانجام دینے لگے ہیں۔

آغا جی کا قول ہے کہ دل میں جو پہلا خیال آتا ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ میں نے

اس سوچ کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اشفاق صاحب کو آسانیاں

فرمائے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اشفاق صاحب سے میری ملاقات صدیوں پہلے ہوئی تھی۔ یادداشت کو کریدو۔ تبھی بھی بچپن میں ریڈیو پر تلقین شاہ کا یکساں انداز اور ہر لعل عزیز مثبت مزاحیہ بیان اُبھرتا ہے جسے میں بڑے شوق سے اپنے منہ کے ساتھ بیٹھ کر سنتا تھا۔ اس زمانے میں آپ کی سبق آموز باتیں تو سمجھ میں کم آتی تھیں مگر ہلکی پھلکی خوش باش مٹھسے ضرور لطف اندوز ہوتا تھا۔ پھر تقریباً سات سال پہلے ساڑھے نو مہینے ہسپتال کی ایک تقریب میں آپ سے بالمشافہ ہوئی اور آپ بہت بھلے لگے۔ اس وقت آپ بلا شک و شبہ اپنے منفرد انداز بیان اور صوفیانہ گفتگو کی وجہ سے ساری دنیا کا ایک جداگانہ عالی و قابل رشک مقام بنا چکے تھے۔ آپ کی فکر کا کوئی استاد اور عالم جو بات کو کہانی کا رنگ دے کر آسان انداز میں کسی بھی محفل میں نہایت طمانیت سے ذہن نشین کر سکے اور سمجھا سکے کم ہی کوئی نظر آتا تھا بلکہ آج بھی نظر آتا۔ آپ ترقی پسند تھے اور زمانہ شناس تھے۔ اولیاء اللہ اور علماء میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ اولیائے کرام زمانہ شناس نبض پہچانتے ہیں اور حاضرین اور معتقدین کی ذہنی قابلیت کو سامنے رکھتے ہوئے بات سمجھاتے ہیں۔ دوسری طرف اکثر زمانے سے نا آشنا اپنے علم کی بھاری بھری سہلوں کو دوسری کے سروں پر دھونستے ہوئے فرعونی اہرام مصر تعمیر کرتے چکر میں رہتے ہیں۔

بانو آپ سے فون پر بات کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ خود چل کر اشفاق صاحب کی حویلی پر جا کر آؤں۔ پھر خیال آیا کہ بیگم کو بھی ساتھ لے چلوں کہ اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ بانو آپ کا ساتھ دے گی۔ آٹھ بجے سے کچھ پہلے داستان سرائے پہنچے۔ مجھی خدمت گزار جوان سال ریاض ہمیں جلدی سے اشفاق صاحب کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس مجھی خدمت گزار اور اس کے بھائی اعجاز کو ہمیشہ فرض شناس چابک دستی سے اشفاق صاحب کی خدمت کرتے دیکھا۔ اشفاق صاحب ہمیشہ انہیں بیٹا یا پتر کہتے اور وہ انہیں ابو۔ ویسے بھی جس گھر کا میں ایک ننھا خداترس صوفی عالم ابو ہوا اور جس گھر کی مالکن ایک درویش صفت عجز و انکساری کی بیکر آپا ہوتی اس سرائے میں والا ہر جمادونہات اور ذی روح کھلی بانہوں اور بے ٹمکن جن میں سے اپنے آرام کو پس پشت ڈال کر دوسرے کے آرام سوچے گا اور اس دنیا دار فقیر کے توانداز ہی نرالے تھے۔ میں نے کبھی نہ دیکھا کہ آنے والے کی آؤ بھگت ایسے شکوے ہو جیسے وہ ہی خاص الخاص ہے۔ رنگ برنگے مشروبات، میٹھے لذیذ کچوان اور سیلے موکی پھلوں سے لدی پھندی فریاد کے ساتھ ساتھ کمرے میں آ موجود ہوتی۔ قسم قسم کی جزی بوٹیوں سے بنے ہشاش بشاش کر دینے والے قبوے میں سرائے کا خاصہ ہیں۔

بلبہ کے جاں لیوا کینئر نے اشفاق صاحب کے منہ کا ذائقہ بدل کے رکھ دیا تھا۔ ابتدائے مرض میں انہیں کھانا تو لگتی تھی مگر کھانا بمشکل نیچے اترتا تھا۔ آخری ایام میں تو بھوک بھی مرگئی تھی اور جسم آدھا رہ گیا تھا۔ ایک روز میں شہسخت وقت گیا تو نہادھو کر صاف شفاف لباس زیب تن کیے لیٹے تھے۔ فرمانے لگے آج میں نے نہانے کے بعد اپنے جسم کو دیکھا تو یہ تو بہت چھوٹا چھوٹا سا رہ گیا ہے۔ آپ کی خوش خوراک کی دیدنی تھی۔ نہایت انہماک سے دیسی مرغی کے شہسخت گرم روٹی کے لقمے ڈبو ڈبو کر آپ کو کھاتے دیکھ کر میں خوب محظوظ ہوا کرتا تھا۔ مگر اب آپ کا گزارہ بمشکل دو چھ اور دو دو وہی اور شربت پرتھا۔

اس انتہا درجے کی جسمانی کمزوری کے باوجود آپ کا ذہن آخری لمحے تک چاق و چوبند رہا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آپ کی دلچسپی، مفصل اور پُر مقصد تمہید باقی نہ رہی۔ اب آپ چند جامع اور کھرے جملوں میں بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کا حل بتا دیتے تھے۔ وصال سے آٹھ دس روز پہلے میں نے اس بوستانِ علم و ہدایت سے جب دریافت کیا کہ کیا قرآن مجید کا فلسفہ خودی تصوف کے فلسفہ بے خودی سے ہم آہنگ ہے۔ تو فرمایا: ”بیٹا! اصل میں اقبال کی خودی وحدتِ حق پر ہے۔“

سلسلہ شفا سے متعلق کئی ڈاکٹر، حکیم، ہومیو پیتھ، جوگی، غائب اور فن کار اس عالمِ صوفی کے درو کا کچھ مداوا کرنے پہنچے۔ ایک صدی سے کچھ اوپر اُلٹ و جت کے اس مہیخ کی گھنٹہ، تحریر اور گفتگو کا اثر تو انہوں نے شاید بہت زیادہ نہ لیا تھا مگر وہ ہمیں ضرور دھنتے رہے تھے۔ آپ کو اور بانو آپا کو خوب علم تھا کہ شفا ان نعمتوں میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ خود بانٹتا ہے۔ یہ کبھی اونچے اونچے دستے چمکتے صنعتی ہسپتالوں کے سوا گروں کے ذریعے اور کبھی کسی طبیب کی دقیقہ نوسی بے دام و دھن میں پائی جاتی ہے۔

آپ پیدائشی طالبِ علم تھے۔ خوب جانتے تھے کہ اصل علم ہمیشہ طالبِ علم رہتا ہے۔ وصال سے تقریباً سال پہلے آپ کی ملاقات سسٹہ لکھنؤ کے روحانی پیشوا آغا جی سے ہوئی۔ دونوں کی یہ کوشش رہتی کہ وہ دوسرے کو وہی علم سکھانے دیں۔ ایک دن تو اشفاق صاحب کہہ ہی اٹھے ”آغا جی لوگ میری بات سننے آتے ہیں لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ آپ آپ تشریف لائیں تو میں چپ ہو کر آپ کی باتیں سنتا ہوں۔“ ہم وہ خوش قسمت ہیں جنہوں نے کئی بار ان سے یہ بات سنی اور نفع بخش محفلوں کے مزے لوٹے۔

تفصیص مرض اور ایک پیچیدہ اور میجر سرجری کے کٹھن مرحلے سے گزرنے کے بعد ایک دن آغا جی اشفاق صاحب سے فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی لامحدود حکمت میں انسان کی بنیادی ضروریات انسان کو فری مہیا کر رکھی ہیں۔ لیکن انسان کے لیے انسان کو کسی کار ووازہ کھٹکھٹانا نہیں پڑتا۔ یہ بازاروں میں فروخت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہدایت اللہ چاہتا ہے جب چاہتا ہے فری مہیا کر دیتا ہے۔ یہ مہنگے داموں مہنگی مہنگی درگاہوں سے خریدی نہیں جاسکتی اور یہی حال ہے۔ اللہ یہ نعمت بھی خود بانٹتا ہے۔ یہ جنس تجارت نہیں۔ اشفاق صاحب چمک اٹھے اور ماتھے پر ہاتھ مار کر فرمایا ”یہ سچا دینی دینی بات تو مجھے پتا تھی مگر یہ ہدایت اور شفا والی بات اب سمجھ میں آئی۔“

آپ منہ کا ذائقہ بحال کرنے کے واسطے جوارش کمونی اور جوارش تھر ہندی کا استعمال کرتے۔ درد کو زور کرنے والے ہومیو پیتھ اور ایلو پیتھ کی ملی جلی گولیاں لیتے۔ جب طلائی کا استعمال بھی خوب کیا کہ یہ مقوی قلب ہے اور آغا جی کی طبیعت ان گولیوں کی خوب حفاظت کرتے۔ یہ مسور کے دانوں سے آدھی بلکہ اس سے بھی کہیں چھوٹی گولیاں تھیں جن کی ایک ہی میں آٹھ ماہ سے اوپر کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ آپ انہیں شرارت سے بچھدکتی بے قرار گولیاں کہہ کر یاد کرتے۔ جسمانی کمزوری آپ کو بہت زچ کیے دیتی تھی مگر میں نے آپ کو کبھی گھبرایا ہوا نہ پایا۔ تقویت حاصل کرنے کے لیے آپ باقاعدگی سے دھن لیتے اور کئی بار ہم انہیں طاقت و توانائی کی ڈرپ دیتے۔ آپ سب معالجین کے مشورے بغور سنتے اور پھر اپنی بہت نزع اور ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرتے۔ مگر جب فیصلہ کر لیتے تو اس پر کار بند رہتے۔

ایک روز سائرہ ہسپتال میں اوپر پرائیویٹ کمرے میں آپ ریگولر معائنے کے بعد پروٹین اور کالیم ڈرپ لگوار ہے تھے۔ فزیشن ڈاکٹر فواد صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ کی دل سے متعلقہ ادویات میں کچھ فرقہ برسرِ حال ہے۔ کہنے لگے یہ دل کی دوائیوں والا نسخہ پروفیسر ڈاکٹر زبیر صاحب ہارٹ سپیشلسٹ کا ہے۔ ان کے مشورے کے مطابق اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ میں نے جلدی جلدی زیر صاحب سے رابطہ کیا۔ وہ حسب وعدہ ایک آئی۔ بی۔ سی۔ سائرہ ہسپتال پہنچ گئے۔ ساری بات سنی اور ہنس کے کہنے لگے خاں صاحب یہ نسخہ تو میں نے آپ کو چھ ماہات سائیکھ دیا تھا۔ اشفاق صاحب نے کہا ”جی ہاں! لیکن ان دوائیوں سے مجھے فائدہ ہے اس لیے میں اس وقت سے اس نسخے سے روزانہ لے رہا ہوں۔“

اُس دن بیگم اور میں صبح آٹھ بجے سے کچھ پہلے آپ کے کمرے میں پہنچے۔ تین دیواروں پر نہایت دلچسپ سے تھی ایک جیسے خاکی کاغذ میں لپٹی ایک جھکی سیاہی اور ایک ہی قلم سے مارک شدہ کتابیں آراستہ تھیں۔ جب بیگم نے اپنی بیگم کو اشفاق صاحب سے ملوایا تو وہ اتنی محنت اور باریک بینی سے محفوظ شدہ اس خزانے کو دیکھ کر خاموش رہی کہہ اٹھی کہ واہ کتنے سلیقہ اور شائستگی سے یہ کام کیا گیا ہے۔ اشفاق صاحب نے اسے بتایا کہ یہ کام انہوں نے خود سے کیا ہے۔ سینٹ کے تھیلوں کو صاف کر کے ان سے یہ کتاب پوش بنائے ہیں اور بازار سے کافی سارے ایک روپے کے لیے تھے کہ تحریر بھی مماثل رہے۔

اس کمرے میں سامنے میز کرسی اور آپ کا قلمدان آراستہ تھا۔ دو اطراف صوفے اور ایک جانب کرسی کے لیے گداز پڑا تھا۔ اشفاق صاحب کا بستر ان کتابوں کے زیر سایہ مغرب کی جانب لگا تھا جس کی پابندی کی ضرورت نہ تھی۔ چسپاں خسرو کا ایک شعر دریائے محبت کی الٹی روشوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ آپ سفید کرتا پہنے اور سفید چادر لٹا کر فرما رہے تھے۔ سلام دعا کے بعد کہنے لگے ”عاطف میاں! رات تکلیف ڈرا زیادہ ہوگی اور تمہاری آپا کو کبھی آپ کو پیٹ میں شدید درد تھی اور پسینے اتنے چھوٹ رہے تھے کہ آپ کے پٹے شرابور تھے۔ آپ کا جسم ٹھنڈا رہنے کے کسی بھی حصہ میں کوئی بھی نبض محسوس نہ ہو رہی تھی۔ مگر آپ بقائم ہوش دحواس گنفتگو کر رہے تھے۔ گرمی ہوئے آپ نے بانو آپا سے کہا کہ اے سی چلا دو۔ پھر چند منٹ بعد پگھلا بند کر دینے کو کہا۔ میں نے بہتر بنانا کہہ کر ہسپتال شفٹ کروں۔“

سائرہ ہسپتال فون کر کے میں نے ایسبولینس منگوائی اور خود ورد کا ٹیکہ لینے داستان سرائے سے غیر موجودگی میں اشفاق صاحب نے میری بیگم سے کہا ”آج ڈاکٹر صاحب کو پتہ نہیں کیوں اتنی جلدی پہنچی ہے۔ اسے ناشتہ کر کے نہادھو کے ہسپتال چلتے۔“ پانچ آٹھ منٹ میں ایسبولینس بھی پہنچ گئی اور میں ٹیکہ بھی لے آیا۔ آپ باہر بازو خود میری طرف بڑھایا اور قیض کا بازو اوپر کرنے لگے۔ اس اثنا میں آپ کے چھوٹے صاحبزادے ایشیہ صاحب نے میں ٹائی پٹے کمرے میں آگئے۔ وہ اپنے بینک جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

درد کا ٹیکہ لگنے کے بعد آپ کے دونوں مجتبیٰ خدمت گزاروں نے آپ کو ایک مضبوط کرسی پر بٹھایا۔ اس کے عمل کے ساتھ آپ کو اٹھا کر باہر پورچ میں لے آئے۔ ایسبولینس کچھ تو ویسے ہی اونچی تھی اور کچھ اس کی ٹینس

اشفاق صاحب کا اس میں بیٹھنا دشوار تھا۔ ساتھ ہی میری گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے ان سے کہا اس میں چلے۔ مگر سیٹ پر بمشکل اشفاق صاحب کو دراز کیا۔ اب وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ ریاض نے کچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ان سے انہیں سہارا دیا۔ پھر بانو آپ نے ریاض کو چند ضروری ہدایات دیں اور اس کی جگہ خاں صاحب کے پیچھے بیٹھ گئے۔ ہم داستان سرائے سے ماڈل ٹاؤن کی رنگ روڈ پر نکلے تو اشفاق صاحب کا سر کچھ دائیں جانب کو

آخری مہینوں میں انتہائی نقاہت کے باوجود آپ نے مطالعہ کی عادت ترک نہ کی تھی۔ ”عظیم ہوشربا“ پڑھنے لگے تھے مگر ہلکے پھلکے رسالے پڑھتے رہتے تھے۔ ان دنوں ”ریڈرز ڈائجسٹ“ پڑھتے میں نے انہیں کئی بار دکھا۔ مگر اس میں کہانی مختصر ہوتی ہے۔ میں ایک آدھ نشست میں پڑھ لیتا ہوں۔ اخبار کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتی اور بین الاقوامی حالات پر گہری نگاہ رکھتے۔

جب حکومت نے ”پہلے پاکستان“ کا نعرہ لگوا دیا تو اشفاق صاحب نے اس سوچ پر سخت ناپسندیدگی اور تنقید کیا۔ فرماتے تھے ”اس طرح تو میں نعرہ لگاؤں پہلے لاہور یا پہلے ماڈل ٹاؤن۔ یہ ایک غلط اور منہنی سوچ ہے۔ میرا صادق والی سوچ ہے کہ اپنا گھر بچانے کے لیے سانچے دشمن کے ساتھ مل کے اپنے ہم مذہبوں اور ہم قوموں کو کرو اور دشمن بھی ایسا کہ جس کے متعلق اللہ سبحانہ تعالیٰ نے قرآن میں فیصلہ صادر فرما دیا ہو کہ وہ تمہارا خیر خواہ اور دوست ہو سکتا۔“

دنیاے اسلام کے حالات دیکھ کر اشفاق صاحب دل ہی دل میں بہت کڑھتے تھے۔ عراق، فلسطین اور کشمیر کو دیکھ کر دن شہید کر دیئے جانے والوں کا حساب کر کے مجھے گنوا تے کہ آج اتنے مسلمان شہید ہوئے اور آج اتنے مسلمانوں سے ملاقات کے بعد وہ سمجھ چکے تھے کہ ان ہلاکت خیز اور آفت انگیز حالات سے مسلمانوں کا لگنا صرف اسی لیے ہے کہ انہیں ایک عاقبت اندیش باوقار اور پر نور رہنما مل جائے۔ وہ ہر ملاقات میں آغا جی سے پوچھتے عالم کب ہوگی؟ امام مہدی کا ظہور کب ہوگا؟

رسالہ سے ہفتہ دس دن پہلے آپ کی آغا جی سے آخری ملاقات ہوئی۔ اشفاق صاحب نے نہایت رنج و غم سے پوچھا ”دیکھیں آغا جی! اب تو اسرائیل اور امریکہ شام میں بھی گھسنے کی تیاری کر رہے ہیں۔“ آغا جی ہنس کر کہنے لگے ”شام پر حملے کا تو ہمیں انتظار ہے۔ شام میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں۔ جب آنحضرت ﷺ نے من کے مطابق شام پر حملہ ہوگا تو یہ چالیس ابدال اکٹھے ہو کر اللہ سے فریاد کریں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں نجات دہندہ بھیجے گا۔“ اشفاق صاحب تسلی میں آگئے اور سر نیچے پر رکھ کے مطمئن ہو کر لیٹ گئے۔

ہسپتال تک کا سفر ہم نے ایسے طے کیا کہ میں نے آپ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے بازو پر آپ کو بٹھا دیا اور بانو آپ نے بائیں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے گال سے لگائے رکھا۔ جب ہم رنگ روڈ سے سارہ سڑک پر گئے تو اشفاق صاحب کا بائیں ہاتھ آپ کے گالوں سے کچھ نیچے کھسک گیا اور آپ کو گمان گزرا کہ آخری سفر

یہ گمان اور خیال بھی خوب ہوتے ہیں۔ اشفاق صاحب ایک بار کہنے لگے یہ خیالات بھی بڑی بے وقوفی سے زور شے ہیں۔ انہیں لگام دینا بڑا مشکل فعل ہے۔ میں نے ہاں میں ہاں ملائی کہ ہاں جی یہ سوچیں ہی ہمیشہ مروان جی پوچھا کیا ہمارے خیالات اللہ تعالیٰ کے کنٹرول میں ہیں؟ ذرا تنگ مزاجی سے جواب آیا ”چھوڑو جی! اس کے کنٹرول میں اس کے اپنے خیالات بھی نہیں ہیں۔“

بانو آ پا اور اشفاق صاحب کی جوڑی بھی کمال جوڑی تھی۔ ان کا آپس کا پیار محبت اور ادب و لحاظ قابلِ ستائش نہیں مثالی بھی تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ان میں کون طالب ہے اور کون مطلوب۔ کبھی بانو آ پا انہیں ایک پل کو بے اختیار سے انکاری نظر آتیں اور کبھی اشفاق صاحب کو میں یہ کہتے سنتے کہ کیا کمال کی خاتون ہے۔ اور آپا کے ناول ”راجہ“ کی تعریف میں تو میں نے اکثر سنا کہ آپ اسے اردو ادب کا ایک نہایت ہی زوردار ناول گردانتے۔

اشفاق صاحب سناتے تھے کہ ایک بار وہ اپنے باباجی سے بحث میں الجھ گئے۔ کہتے تھے کہ میں ان سے سوال جواب کرتا تھا۔ باباجی ان کو سمجھا رہے تھے کہ دنیا میں کوئی چیز ساکت نہیں۔ یہ سورج چاند ستارے سب سب محور میں گھوم رہے ہیں اور اشفاق صاحب بھند تھے کہ جدید سائنس کی زد سے سورج ساکت ہے اور زمین اس کے محور پر گھومتی ہے۔ باباجی نے آ خر کہا اشفاق میاں! صرف مطلوب ساکت ہوتا ہے۔ سب طالب اس کے گرد گھومتے ہیں۔ صاحب کہتے تھے میں جدید دنیا کا رہنے والا پڑھا لکھا انسان تھا جو سائنس کی ترقی سے بھی خوب واقفیت رکھتا تھا۔ باباجی کی یہ دلیل جو انہوں نے قرآن اور تصوف کی روشنی میں دی تھی، قبول تو نہ کی مگر طالب اور مطلوب کی نسبت بہت پسند آیا۔ کہتے ہیں گھر پہنچا تو ایک جدید سائنسی جریدہ کے سرورق پر درج تھا کہ سائنس نے یہ راز پایا ہے۔ ساکت نہیں اور ہر لمحہ گردش میں ہے۔

سازھے آٹھ سے تھوڑا اور ہم ساڑھے ہسپتال پہنچے۔ اشفاق صاحب کو بشکل ویل چیئر پر بٹھایا گیا اور ان میں پہنچا دیا۔ بانو آ پاساتھ ساتھ تھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میرے آفس میں تشریف لے جائیں۔ اشفاق صاحب کی طرف دیکھا وہ بے جان خاموش اور ساکت تھے۔ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا۔ پھر دوبارہ ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہتے ہوئے وہ میری بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس دوران ڈاکٹر فواد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے ای سی جی کی۔ سکرین پر ایک سند یہ دے رہی تھی کہ طالب نے مطلوب کو پایا ہے اور اس کی طلب تمام ہو چکی ہے۔ اشفاق صاحب کے سکون و اطمینان تھا جیسے محبوب کے پہلو میں بنا خوف رقیباں عاشق دراز ہو۔ کوئی شکن چہرے پر نہ تھی۔ تھوڑے اطمینان بخش موت اللہ کے ولی کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسے جیسے وہ اس اٹل تجربہ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اور اشفاق صاحب نے تو ایک عمر اولیائے کرام کے درمیان گزاری تھی۔ مجھ سے کئی بار فرمایا کہ

انہوں کا حل کبھی کسی صوفی اور کبھی کسی درویش بابا کے چرنوں میں بیٹھ کر ملا۔ صوفیائے کرام کے غرض میں رہنے کے قصے اکثر سناتے اور وہاں سے فیض حاصل ہونے کا اعتراف کرتے۔ ایک روز فرمانے لگے ”عاشق میں نے تمہاری تیسوری ہے۔ جو تیسوری کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان حاکم ہے۔“

کے بھائی اور مسلمان ملتے ہیں سوائے چین کے۔ باوجودیکہ چین پر مسلمانوں نے آٹھ صدیاں حکومت کی، آج وہاں کوئی مسلمان نہیں رہا۔ حالانکہ علم و ادب اور سائنسی ترقی کے حساب سے چین ایک بہت ترقی یافتہ سوسائٹی تھی اور جدید دنیا کی سائنسی ایجادیں استوار کرنے میں چین کے مسلمانوں کی خدمات بے مثل اور دیرپا تھیں۔“ میں نے کہا یہ تو جج ہے۔ کہنے لگے کہ میں نے مسلمانوں کے نام و نشان ملیا میٹ ہو جانے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ سائنسی ترقی و تمدن میں کسی سے پیچھے تھے بلکہ یہ تھے کہ میں کوئی صوفی کوئی پیر کوئی ولی کوئی بابا کبھی پیدا نہ ہوا اور نہ ہی وہاں رہا۔“

اشفاق صاحب معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے ضمن میں بابوں اور رویشوں کی انمول خدمات کا ذکر اکثر مجھ سے کرتے۔ وہ زمانہ شاہ صوفی تھے۔ دورِ حاضر کی ضروریات سے آگاہ اور روشی اور تصوف کی حقیقتوں سے بہرہ مند۔ یہ بتاتے تھے کہ اسلام دشمن عناصر نے مسلمان کو قابو کرنے کے لیے اس انسان دوست مذہب کی بنیادوں پر چھلی کئی کئی طرح سے کاری ضریم لگائی ہیں اور اس واسطے خانقاہوں اور روحانی پیشواؤں کو خصوصی طور پر نشانہ ہی نہیں بتایا بلکہ کئی کئی بار تو غلے امام اور ذہبی پھر کھڑے کر دیئے۔ یہی نہیں بلکہ جعلی نبی بھی بنا کر پیش کر دیئے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا۔ جب انگریز اس ملک میں آئے تو 1860ء کے محکمہ انہوں نے ایک کمیشن بٹھایا کہ کس طرح مسلمانوں کو قابو کیا جاسکتا ہے اور اس کمیشن نے یہ مشورہ دیا کہ اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کی روحانی خانقاہوں کو نشانہ بنایا جائے۔ کہتے تھے دیکھو یہ چال اس قدر کامیاب رہی ہے کہ آج کل اس نے ”خلیفہ“، ”مولوی“، ”پیر“ اور ”مرشد“ جیسے پاکیزہ القاب کے معنی تک بدل کے رکھ دیئے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گویا اپنی گفتگو اور تحریر میں تصوف اور روحانیت کے ٹھوس اور حقیقت بنیادی پیغامات اور اسباق کو آسان فہم کہانی کے طور پر ادا کرنا اور نثری طریقہ پر پیش کرتے تھے۔

ذکر اور مراقبہ پر ایک روز گفتگو ہوئی تو فرمانے لگے صرف مرشد ہی انسان کو ذکر منتقل کر سکتا ہے اور اس کے دل کو سنبھال سکتا ہے اور ہم تن مراقبہ کے لیے تصویر کشی لازمی ہے۔ میں نے فوراً پوچھا تو آپ نے ”زاویہ“ میں مراقبہ پر کیا کام کے دوران یہ بات کیوں چھپا کر بیان کی اور مرشد کا ذکر تک نہ کیا۔ آپ سوچ میں پڑ گئے اور چند لمحوں بعد فرمانے لگے ہاں اب جب اللہ نے موقع دیا تو یہ بات بھی صاف لوگوں تک پہنچاؤں گا۔“

مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اشفاق صاحب کے وصال کی خبر یا تو آ پاتک پہنچا سکوں۔ میں اشیر احمد صاحب کا ہاتھ کرنے لگا۔ وہ بینک کی کتھیاں دفتر پہنچ کر فون بجے کے قریب ہسپتال پہنچے اور انہوں نے اپنی والدہ صاحبہ کو یہ خبر دی۔

نہ کوئی زلزلہ آیا اور نہ کوئی طوفان ہی اٹھا۔ نہایت تحمل و بردباری سے وہ شفقت و ممتا اور پیار و محبت کی دیوی جیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ صدیوں میں کوئی ایک ہی بنا کر اس جہان فانی میں کریمانہ بھیجتا ہے اپنے صاف و شفاف سفید لہادے میں جس میں ساڑھے ہسپتال کی ایمر جنسی میں داخل ہوئی۔ آپ نے اپنے طالب و مطلوب کی جانب ایک نگاہِ شفقتانہ ڈالی جو بے حد شفقت و مہربانی میں لپٹا احساسات کے عالم غیب میں رونق افروز ہو چکا تھا۔ نہ کوئی شکوہ ہوا نہ کوئی شکایت۔ نہ زبان نے کئی کئی بار نہ آنکھ میں آنسو آیا۔ وہ خاموشی سے اس پاکیزہ جسدِ خاکی کے پاس آئیں اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ پاؤں تھام کر اسے چند لمحے تکتی رہیں۔ لبوں نے جنبش کی اور آپ نے ان قدموں کا بوسہ لیا اور پھر ان قدموں کو اپنی



آنکھوں سے لگا لیا اور ساتھ پڑی ہوئی کرسی کے دامن میں اپنے آپ کو سمیٹ لیا۔  
 خسرو دریا پریم کا الٹی واہ کی دھار  
 جو ابھرا سو ڈوب گیا جو ڈوبا سو پار

”ناں ناں..... ڈاکٹر عاطف آگئے ہیں تم بینک جاؤ۔ تمہارے پاس لا کر کی چابیاں ہیں تمہیں لیتے آئے۔“

چاہئے۔“

اشیر خاں کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ ہمیشہ ہر بیماری میں ہمارے ساتھ ہسپتالوں میں رہا لیکن ساتھ ہی اُس کی بات کبھی کاٹی نہ تھی۔ اشیر کی کار اور ڈاکٹر عاطف کی کار پھانک سے نکلنے ہی ایک دائیں اور ایک بائیں مڑ گئیں۔  
 خاں صاحب راضی برضا بندے کی طرح مطمئن سیٹ سے کمر لگائے بیٹھے تھے۔ میں پچھلی سیٹ پر آگئے۔  
 اُن کے گلے پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ اُن کی آواز گودھی تھی لیکن نہ اُن کے حواس پر اگندہ ہوئے نہ اُنہوں نے اپنے گلے سے ہتھکڑی ہٹانے کا احساس دلایا۔

چھ ستمبر کی رات اُن کے صبر کی تصویر تھی۔ اُن کے درد کا یہ عالم تھا کہ بار بار چہرہ اس درد کا شاکی ہو جاتا تھا۔  
 میں اسی درد کے باعث خوف اور پریشانی لکھی تھی لیکن برداشت کا یہ عالم تھا کہ کسی حرکت آواز اور اشارے سے اُن سے اتنی انداز کی حالت کا اظہار نہ کیا۔

پاسپورٹ بن چکا تھا

دیزہ لگ چکا تھا

نکلت، بیگیج چیک ہو چکا تھا۔

انہیں شاید سیٹ نمبر بھی معلوم تھا، لیکن اُنہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر اُن کا سر ڈونڈا کر دیا۔  
 ”گیا۔ وہ اپنے بے جان ہاتھ سے میرا ہاتھ تھپتھپاتے رہے..... وہ اپنے گھر جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔“

داستان سرائے سے ساڑھے ہسپتال تک کا راستہ ڈور نہ تھا۔ راستے میں درخت پرندے سڑک سے سب سے پہلے الوداع کہہ رہے تھے۔ جونہی کار رُکی وہیل چیئر پر اُنہیں بٹھایا گیا..... میں اُن کے ساتھ تھی۔ پھر سسٹر مجھے ڈاکٹر صاحب سے حکم کے مطابق ڈاکٹر کے دفتر میں لے گئی۔

”آپ پلیز یہاں بیٹھیں..... ہم اُنہیں آکسیجن لگانے لگے ہیں۔“

اس وقت میں نے دو رکعت نفل پڑھے..... خاں صاحب کہتے تھے جب بھی کوئی لمبے سفر پر روانہ ہو تو اس کے دو نفل ضرور گزارنے چاہئیں کہ اللہ میاں کا مال واپس کرتے وقت نہ جھگڑا ہو نہ تقاضا نہ ندامت ہونے پچھتہ۔  
 حقدار کے سپرد کرنے کے بعد کسی قسم کا ملال نہ ہونا چاہئے۔

ایسے ہی دو نفل میں نے اپنی والدہ کی رخصتی کے وقت پڑھے۔

ایسے ہی دو نفل میں نے اپنے بھائی کے جانے کے وقت پڑھے تھے۔

علیم مطلق جانتا ہے کب اور کس وقت کس کی روانگی موزوں برحق اور پردہ پوش ہے۔  
دفتر میں سسر طاہرہ اندر آئی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ساتھ لے گئی۔

وہ ہمیشہ کی طرح آنکھیں موندے ہوئے لیٹے تھے۔ اُن کی ڈرپ ایک طرف لٹکی ہوئی تھی۔ انیس اور اٹھیر اُن کی  
سج کمرے تھے۔ نہ جانے کب اور کیسے ڈاکٹر صاحب نے انہیں راستوں ہی سے بلا لیا تھا۔ مجھے خاں صاحب کی حاشیہ  
تھی۔ چھٹی مل گئی تھی۔ انہوں نے مجھے برطرف کر دیا تھا اور کوئی سفارشی خط بھی لکھ کر نہیں دیا تھا کہ میں کسی اور جگہ اسامی  
مقرر ہوں۔

یوں لگتا تھا، اپنی کے جہاز میں وہ اس وقت اپنی سیٹ بیٹھ باندھ رہے تھے۔ لاہور کا منظر چھوٹے چھوٹے  
گھر، ہرے ہرے قطعوں اور بے مصرف سوئی ہوئی سڑکوں سے اُوپر جا رہا تھا۔ پچھلے منظر ہندو لارہے تھے۔  
ایئر ہوسٹس نے بڑی توجہ سے پوچھا ہوگا "اشفاق صاحب شراب طہورہ کہ کوئی زمینی مشروب؟"  
اشفاق صاحب نے اپنی براؤن آنکھیں اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ لڑکی کی پلکیں گالوں سے چمکی ہوئی تھیں۔  
Eye contact سے گھبراتی تھی۔ ایسی لڑکیوں کے متعلق خاں صاحب نے سنا تھا کہ وہ خیموں میں مستور ہیں۔ اُن کو نہ  
کسی عین نے ہاتھ لگایا نہ کسی انسان نے ہی۔

شاید انہیں اس شہر اُس کے رہنے والوں سے پھٹنے کا اتنا غم نہ تھا جس قدر گھر جانے کی خوشی تھی!

کب چھٹی ہوگی اس در سے

کب اپنے گھر کو جائیں گے

کب روئیں گے اور گائیں گے

کب چین کی ہنسی باجے گی

ہم اپنا گیت سنائیں گے

ہم اپنا گیت سنائیں گے

کب چھٹی ہوگی اس در سے

کب اپنے در کو جائیں گے؟

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹی۔ ہم گھر لوٹ رہے تھے۔ گیلی منی سے  
جسٹ کی پٹری بمشکل تمام چھانچ اُونچی تھی۔ کار سے نکلنے اور پٹری پر پاؤں دھرنے میں کچھ ایسی ناہمواری تھی یا جسم  
تھیرے حوازن ہو گیا تھا کہ ذرا سا پاؤں رپٹا اور ہڈی ٹوٹ گئی۔

اسے ہی غالباً۔ تھا کال کہتے ہیں کہ ہونی اپنے حملے کے صرف بہانے ڈھونڈتی ہے۔ ذرا سی چوک ہو اور وار  
گرے..... شاید اسی کے لیے بابے کہتے ہیں کہ ہونی ٹلا نہیں کرتی۔ اُسے چاہے راکھی باندھو بھلے رادھا بناؤ۔ وہ ڈیوڑھی  
میں بیٹھی جھوٹی چوکی بھرتی ہے۔ ادھر کوئی چوکا ادھر اُس نے اپنا وار کیا۔

ہونی کو ماننے والی ایک تو آیت الکرسی تیر بہدف ہوا کرتی ہے دوسرے کسی چاہنے والے کی دُعا۔ صاحب کہا کرتے تھے کچھ صاحب دُعا ایسے بابرکت ہوتے ہیں کہ اُن کی خیر خواہی کی خواہش ہی کن فیکون بن جاتی ہے۔ ادھر انہوں نے wish کیا ادھر willing کا معجزہ ہو گیا۔

میری والدہ بھی کہا کرتی تھیں کہ میرا سارا اسلام آیت الکرسی ہے..... میں نے ساری بیوگی جی سے سہارے کاٹی۔ اپنے بچوں کو اسی کے سپرد کر کے نوکری کی۔ دورے کیے اکیلی ریٹ ہاؤسز میں رہی۔ اسی کا جیب تپا کرتی میں رات کو بارہ بارہ بجے زمینوں پر اکیلی پہنچ جاتی تھی۔ لاہور والی بس مجھے پکی سڑک پر اتارتی۔ میں چومس فاصلہ اسی آیت الکرسی کے سہارے چلتی۔ راستے میں گیدڑ بھگیا ڈسٹ سنبولیے، جینگی بے بھولے بھٹکے سہارے کبھی راہ چلتے دیوانے راہ پر ملتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ کبھی کسی نے نہ اُن پر حملہ کیا نہ قریب آنے کی جرأت کی..... سب آیت الکرسی کی بدولت۔

غالبا اُس روز نہ تو کسی چاہنے والے نے اُن کے لیے دعا کی تھی نہ ہمارے گھر میں کوئی آیت الکرسی کا ترانہ موجود تھا۔ بس خاں صاحب ڈرا سے ڈولے اور پوٹوں کی بڈی ٹوٹ گئی۔ بڈی ٹوٹنے کے بعد وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں کے درمیان بڑے صبر سے اندر چلے آئے۔ بس ایک بار وہ خاموشی سے آدھی رات کو اُٹھے۔ زیرو کے روشن بلب کی روشنی میں ڈراسا لڑکھڑا کر غسٹخانے کی طرف گئے۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے دیوار سے لٹکر ریک پر سے کوئی دوا نکالی جیسے کوئی سلیپنگ پلننگ چلا..... فلش چلنے کی آواز نہ آئی۔ میں نے پڑتا لگا یا کہ غالباً انہوں نے گولی نگلی اور ڈراسا ڈالتے ہوئے والی طرف آئے..... نیند کی گولی نے اثر دکھایا۔ صبح قریب تھی جب وہ گھوک سو گئے۔

خاں صاحب چپکے چپکے اپنا علاج کرنے کے عادی تھے۔ وہ کسی ڈاکٹر کو بھی اپنا پورا حال سمجھاتے ہوئے نہیں رہتے۔ میں نے جلد ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ خاں صاحب ذاتی سطح پر بڑی Privacy کے قائل ہیں۔ سچوٹی سمیٹتی چیزیں، ننھی ننھی خوشیاں، سسکنے والی خواہشیں، بار بار ابھرنے والی نارمانیاں، سچڑا دلانے والی چیزیں پر اندے کی طرح ٹپکنے والے غم سب کو اپنے صبر کے اخوان پوش سے ڈھانپنے رکھتے۔

وہ اُن کے بھائی بہن بچپن کی باتیں دیہات میں گزرے ہوئے واقعات، اُن دنوں کی ملاقاتوں کا ذکر، کسی تفصیل کے فرق سے یوں بیان کرتے ہیں گویا بیت المال سے رقم لے رہے ہوں۔ ان واقعات کے بیان میں کبھی نہیں کوئی شرمندگی نہیں۔ ڈھکا چھپا فخر، حیرت افزا یادیں جو ایک ہی پنڈورا بکس سے نکلتی ہیں۔ یہ ایک خزانہ عامرہ سے سب سے سب بھائی بہن بلا تکلف فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سب یادیں بانٹ کر خوش ہوتے ہیں۔ کسی کی بات سن لیں آپ کسے کہ یہ واقعہ اسی کی میراث ہے۔

خاں صاحب جب بھی ان یادوں کا پتلا رکھولتے، قلم اور کاغذ پر کہانی کے رُوپ میں ڈرامہ کی صورت یا کسی شکل میں وہ اپنے سننے والے پڑھنے والے ناظرین تک بخوبی پہنچ جاتے بلکہ ان کہانیوں سے ”گذریا“ جیسی کہانیاں لیتیں، ڈرامہ ”قرۃ العین“ وجود میں آتا۔ ”زاویہ“ کی شہرت دُور دُور تک پہنچ پائی لیکن یہ دُور مارکا تو س اور تھے۔

تھیں تھیں، جو ان کے اپنے اندر سجیلی تھیں اور زمین دور تھیں۔ ان میں سے جب کوئی سرگم بھٹی تو خاص صاحب گرتے گرتے ہڈی ٹوٹ جاتی، آپریشن کرانا پڑتا۔ گھنٹے تک ٹانگ پلستر میں چلی جاتی، لیکن وہ اس اندرونی بھول سے کسی کو نہ چلنے دیتے۔

خاں صاحب میں شادی کے بعد ایک واضح فرق آچکا تھا۔ شادی سے پہلے جب تک میں دوری پر تھی وہ اپنی بات مجھے بتانا چاہتے تھے۔ لوجہ لوجہ کا قطرہ قطرہ کا حساب دینا چاہتے تھے۔ وہ مجھے روم سے جو خط لکھتے رہے وہ اس کے ذریعے لکھتے ہیں کہ یہ عہد بے نقاب ہونے کا تھا۔ ہر منصوبہ حرکت، سوچ، عمل، مجھ تک نیلی گرا لک انداز میں ترسیل کرنے کا عہد تھا۔

شادی کے بعد انہیں خیال تھا کہ بیوی زیادہ سچ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بیوی کو اللہ نے حسد کے خمیر اور شوہر کو بے حسد کے سوڈا ہائی کارب سے گوندا ہے۔ وہ سچ جو محبوبہ کی انا کو تسکین دیتے ہیں بیوی کی انا کو ٹھوکر لگا سکتے ہیں۔

عورت ہمیشہ مرد کی محبوبہ رہنے پر اصرار کرتی ہے اور شوہر کچھ اپنی جبلتی کمزوری کے باعث کچھ کمانے اور کفالت سے دوامیوں سے تھک کر کچھ عورت کے عمر ڈھلنے کے باعث عاشق کا رول اچھی طرح ادا کرنے پر قادر نہیں رہتا۔ یہاں جمبول پڑ جاتے ہیں۔ اللہ نے مرد کو کھیتی میں سچ ڈالنے پر مامور کر رکھا ہے۔ وہ زمین و مٹی ہو، بجر ہو، ہر یا ول سے لدی ہو، ہوائے پلن کی شکل میں بار آور کر کے مرد کی جبلت ہی خدا نے ایسی بنائی ہے۔

اگر مرد صرف خوبصورت عورت سے ہی ہم بستری کر سکتا تو شہر میں گنتی کی ماہ پارہ عورتیں ہی بچوں کو گود کھلاتیں۔ عورتیں بونے کے معاملے میں قدرت نے ایسا اندھا بنایا ہے کہ موٹی، ٹھٹھی، بوڑھی، معذور حتیٰ کہ بسا اوقات دیوانی عورتیں بھی شہریت کے مطابق اسی کم عقل بے وفائے ہری چک سے بار آور ہو جاتی ہیں۔ یہ آفریش کی پلاننگ ہے کہ دھرتی پر مخلوق کو جس سے وفار بے وفائی غالب آتی رہے۔ کھیتیاں ہری ہوتی رہیں اور باقی رہے نام اللہ کا۔

ادھر عورت ہمیشہ کسی ایک کی ہو رہے اور کسی ایک کو اپنا کر رکھنے کا خواب دیکھتی ہے۔ اس خواب کا مرکز اُس کی بیوی بنتا رہتی ہے۔ اسی برس کی بڑھیا بھی اپنے حسن کے کرشمے بیان کرتے نہیں سکتی۔ بڑھاپے میں بھی اُس کا یہ خواب شہریت کا تعبیر ہونہ ہو وہ خواب دیکھنے سے نہیں چوکتی۔

محبوبہ اپنے عاشق کو کسی اور کے گھر کا چوکیدار نہیں بننے دیتی..... وہ تو بیابا بیوی سے لے کر بڈھی بیوہ تک اسی خواب کی بنا پر حسد کی آگ میں جلتی ہے۔ اگر خواب پورا بھی ہو جائے تو بھی خواب اُس سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ شاید اگر..... تھیں.....؟ اُس کی جان نہیں چھوڑتے..... مرد کی جبلتی منشا ہے ایزدی اور عورت کا یہ خواب ہر سطح، ہر ملک، ہر موسم میں مرد و زن کے ذرائع میں مختلف قسم کے رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ اسی رنہ کشی سے رنگ کائنات قائم و دائم ہے اور رونق حیات ہے۔ اسی وفائی طلب اور بے وفائی کی ضرورت سے مرد اور عورت کا باہمی اتصال اور مولی کیول بنتا ہے۔

یہ شاید میرا اندازہ ہے کہ شادی کے بعد وہ پردہ پوش ہوئے، قرین قیاس تو یہ بات ہے کہ بچپن سے ہی خاں صاحب اندر کی گپت غار میں سادہ صورت سادھی لگا کر زندہ رہنے کے عادی تھے۔ اسی غار میں اُن کی جڑی بوٹیاں، من جوئی کتابیں، جگہ جگہ سے تلاش کی ہوئی قلم دواتیں، بال پوائنٹ، ہائی لائٹر، مارکر، ڈائریاں، ان گنت قسم کے پیڈ، بادام پستے،

اخروٹ، لیمن ڈراپ، چوکیٹ، کیلکولیٹ، فون، گھڑیاں..... وہ اپنی غار میں علی بابا کی طرح رہتے تھے۔ پرانی یادوں کی طرح ڈراپ کی طرح چوستا سیکھ لیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے کھل جاسم سم کہہ کر یہ سارا خزانہ ہتھیا لیا اور اُن کے چہرے والوں میں جن کی وجہ سے یہ خزانہ جمع ہوا تھا، اپنی پراپرٹی بنا لیا۔

پھر جن کے اظہار محبت کے سلسلے میں یہ مال اکٹھا ہوا، لونانے کی کوشش کی۔

عجیب سی بات ہے کہ میں کئی مہینے اُن کی یادوں کو مال مسروقہ سمجھ کر بانٹتی رہی اور غار خالی نہ ہوئی۔ اُن کی یادوں میں میں نے کبھی اُن کے تھلیے میں جھانکنے کی کوشش نہ کی۔ کبھی کوئی اُن کا خط نہ پڑھا۔ اُن کے تحریر شدہ خطوں کو چوری پڑھنے کی جسارت نہ کی۔ اب وہی خط پڑے ہیں۔ ان سے کارڈن بھرے ہیں اور پڑھنے کی نوبت نہیں آ رہی۔ وہ کبھی جن کو کوئی ہاتھ لگاتا تو اُن کے اندر 'سی' کی سی کیفیت پیدا ہوتی۔ الماریوں میں پڑھنے والے چھوٹے والے کی رہائش ہیں لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

میں نے اس گونگے خاں صاحب کو بہت جلد پہچان لیا تھا۔ اس کی سادھی اس کی گیت گھما کی activity سمجھ لیا تھا اسی لیے ہم دونوں بڑے آئندہ سے بڑی سہولت اور شافی سے ساتھ ساتھ رہے..... لڑنے جھگڑنے اور جانے کے جتنے مواقع تھے ہم دونوں نے ضائع کر دیئے اور ہر قیمت پر امن کا سفید جھنڈا لہرائے رکھا۔ اس میں سادھی اور حسن سلوک اور نرمی کا مظاہرہ خاں صاحب کی شخصیت میں تھا۔ وہ کبھی مجھے اُجھارنے، اُکسانے، اشتعال دلانے کی کوشش کرتے۔

مہاراجہ رام چندر کی طرح شافی سروپ مہارانی سینا کی جگہ سنگھاسن پر خالی رکھتے۔ اُن کی جگہ کوئی اور نہیں تو وہ لوگوں کی عقیدت، محبت، پذیرائی کا اناؤ ایسے مزے مزے سے جلاتا اور میری ناسوں میں ایسی دھوئی دیتا کہ میری بدن میں آگ لگ جاتی اور میں ہنگارتی چلتی واویلا مچاتی گھر گھر ٹیلی فون در ٹیلی فون اپنے خدشات، جلاپے کی دھواں لے کر پھینکتی۔

لیکن وہ تو ہر تھنڈا اظہار عقیدت کا سبب، چھوٹے سے روشن دینے کی طرح اپنی غار میں لے جاتے۔ چاہے والے شہر سے، دُور دراز ملکوں سے جو بھی نادر زمانہ جیجیجی وہ اس سوغات کو اللہ کی رحمت سمجھ کر نظروں سے چھینے پھر گیت غار میں اس پرانام کے دیئے کو جلنے کے لیے رکھ دیتے۔

اُن کے پاس ان گنت پن، مارکر، بیٹریاں، کیلکولیٹ، ٹرانسسٹر، سینٹ نہ جانے کیا کیا ساز و سامان اکٹھا تھا۔ لیکن یہ سامان وہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ اُن کی غار میں خانہ کعبہ کے وہ پتھر سب سے اونچے دھرے تھے مجھے لائے تھے جب صحن کعبہ سنگ مرمر کا نہ بنا تھا اور جس پر عقیدت مند جہلا اپنے کفن آپ زم زم سے دھو کر سوکھنے کے پچھایا کرتے تھے۔

ان پتھروں کے آس پاس وہ خزانہ الماریوں میں، فرش پر، اندر الماریوں میں، درازوں میں پڑا تھا۔ میں نے اس خزانے کو نہ دلخراشی کے لیے کھولا نہ فخر ذات کو متکبر کرنے کا باعث بنانے کے لیے استعمال کیا..... یہ سارے دیئے کی سادھی کا حصہ تھے۔ وہ مان رکھنے مان بڑھانے، عزت نفس بحال کرنے کے لیے یہ تحفے قبول کرتے تھے۔

تعمیر موندے زندگی کو صرف ضرورت بھر استعمال کرنے پر قادر ہو کر ہر خوشی ہر غم کو لہیک کہتے ہوئے زندگی کو لیمن کی طرح چوستے اپنے مخصوص آسن میں بیٹھے رہتے۔

ان کی عادت تھی جب کبھی وہ کسی کو قریب کرنا چاہتے اُسے اہمیت دے کر اپنے سے بڑا درجہ دینے کے لئے سجدہ ہوتے تو اُس سے فرمائش کرتے..... بھٹلے بیٹے انیس خاں کا فون آتا..... ”ابو! میں لندن جا رہا ہوں..... کچھ کھانے کی فون کے لیے دیکھنے..... کوئی چیز جو آپ کے لیے لاؤں۔“

اب خاں صاحب بڑے اشہاک سے اُسے قلم پین سیاہی مار کر اور جانے کیا کیا نکھواتے..... وہ بھی سعادت مند کی طرح ساری تفصیل لکھتا..... اب دونوں میں ان ہی چیزوں کے سلسلے میں کئی فون آتے جاتے۔ پھر ٹویڈ کو بھی تاکید کی جاتی کہ ”انیس خاں بھول جائے گا تم اسے یاد دلانا میں نے یہ چیزیں لکھوائی ہیں۔ کوئی چیز کم نہ ہو۔“

میں قریب بیٹھی ایک ماں کی طرح سوچتی کہ بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ انیس بیٹے پر خواہ مخواہ اتنا بوجھ کیوں..... ہر طرف کی طرح میں بھی صرف یہی سوچنے پر قادر تھی کہ بیٹے کو سوائی بھر تکلیف نہ ہو۔ میرا تخیل وہاں نہ پہنچ سکتا تھا جہاں پہنچ کر اس کی اٹھانے کی ٹریننگ دینا بیٹے کو فرمائشوں سے نبٹنے اور اپنے کو بان پر کاٹھی ڈالوانے کا علم بھی آنا چاہئے۔ اور یہ علم صرف باپ عطا کر سکتا ہے..... ماں کا بس چلے تو بیٹا ہمیشہ اُس کی گود میں بیٹھ کر دو دھ پنے اور کبھی اپنے پاؤں چننا بھی سمجھے..... اپنا بیٹا ہو جائے پر اُس سے بندھا رہے۔

واپسی پر ادنیٰ فرصت میں انیس خاں اور ٹویڈ تھپے لے کر وارد ہو جاتے۔ ابو اشفاق ان کے بہت قریب بٹھرتے۔ اب ایک ایک پن نکال کر دیکھا جاتا۔ اُس کی قیمت کو عینک ٹھیک کر کے خاں صاحب پڑھتے۔ ٹویڈ کہتی..... ”میں پہلے ہم سفر تاج گئے وہاں تو یہ برانڈ تھا ہی نہیں..... ایک افریقی لڑکا سڑک کنارے فٹ پاتھ پر کچھ سامان لگائے بیٹھتا وہاں یہ موجود تھے۔ اس برانڈ کے پن انیس دیکھ ہی رہے تھے کہ دُور سے پولیس مین آ گیا..... ٹلے کو دیکھتے ہی جی لڑکا سامان لے کر بھاگ گیا۔ یہ پن چھوڑ گیا..... اس پر کچھ خرچ نہیں آیا۔“

”نہیں نہیں..... ٹویڈ! یہ وہ پن نہیں ہے۔ یہ تو ساؤتھ ہال والی دکان سے ملا تھا جب ہم اسما سے منے گئے تھے۔“

اب ٹویڈ انیس ساؤتھ ہال کی باتیں سنانے لگتے اور خاں صاحب ایسی حیرت سے سنتے جیسے وہ کبھی ساؤتھ ہال سے لڑماں سے ملنے ہی نہ گئے ہوں۔ انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ لندن سے ساؤتھ ہال کیسے پہنچا کرتے تھے؟ وہاں ایشیائی لوگوں کا رہنا سہنا کیسا ہے۔ زندگی کس سٹیج پر گزرتی ہے۔ وہ اپنے بولنے کی پٹاری بند کر کے کانوں کے ہائیکروفون کھول دیتے..... خاں صاحب بڑی عاجزی سے گفتگو کرتے تھے لیکن اس ساری حیرت انگیز خوبی کی بنیادی وجہ ان کے سننے کا عمل تھا۔ وہ انتہائی توجہ کے ساتھ سنتے۔ ون ٹوون گفتگو میں وہ مجسم کان بن جاتے۔ اپنی بولی بند کر کے بغیر گلے لگائے ہاتھ بندھے بات کرنے والے کی تخت نشینی میں حاضر باش قسم کارویہ اپنا کر مودب رہتے۔ سننے کے مقام پر وہ مجسم حیرت ہوتے۔ یہی حیرت اپنی گفتگو میں منتقل کر دیا کرتے۔

انیس خاں کے سامنے یوں ان بھول بیٹھے رہنے سے ایسا رابطہ بنتا جو کسی اور طور ممکن نہ ہو سکتا۔ اُس کے جانے کے بعد سارے تخفے کئی بار آنکھوں سے عقیدت رنگ دیکھنے کے بعد ان میں سے ایک دو چیزیں ہی استعمال کے لیے

رکھتے۔ باقی سب کسی الماری 'درازا' ڈبے میں بند کر کے گپت غار کا حصہ بنا دی جاتیں۔ محبت سے یوں قریب آجنتے باپ بیٹے کی یہ یاد بھی لیمن ڈراپ بن جاتی جسے سادھی کے وقت وہ شانتی سے چوتے۔

ریاض محمود کو فون کرتے..... "مریں! پگلی ہانڈی نہیں پکتی تجھ سے.... خرچے سے نہ ڈراندا اور دے گا۔" کے روز پگلی ہانڈی پکا کر لے آئیں۔"

بہتے کے روز ریاض محمود جسے ہم سب شاہی باورچی کہا کرتے ہیں! پگلی ہانڈی سمیت حاضر ہو جاتے۔ گھر میں اس کی خوشبو پھیل جاتی۔ مجھے وہم ہوتا کہ ریاض محمود کو زحمت ہوئی ہوگی.... خاں صاحب کا خیال تھا کہ پگلی ہانڈی کے باعث سارے 121۔ سی میں درک پا گیا ہے۔

ریاض میاں کی ہانڈی بھی کشمیری کھانوں کی طرح بڑی انوکھی ایجاد تھی۔ 'ولاش' کھنے بیٹنگن 'شب' کشمیری کھانے نصیر انور، کشور نصیر اور لانی جان نے ہمیں کھلانے تھے لیکن پگلی ہانڈی کی ایجاد ایک ایسے باورچی تھا جو کھانا پکانا نہ جانتا تھا۔ اُسے جو کچھ بھی باورچی خانے میں مہینا ہوا بازار سے دستیاب ہوا اسے گوشت میں ٹھکانا مسالہ دہی جو کچھ ملتا گیا، ریاض میاں ڈالتے گئے۔

بانو باجی دم بخود کچھ منع کرنے کے انداز میں کچھ حوصلہ افزائی کے دستور پر چل کر ڈلواتی رہیں۔ گوشت کا سالن تیار ہو گیا جس کی ترکیب سوائے ریاض میاں کے کسی دوسرے کو معلوم نہ تھی۔ اسی صدری نئے گوشت لگائے شاہی باورچی کا خطاب خاں صاحب سے لے کر اور اسے خلعت کے طور پر سینے پر سجا کر ریاض آتے رہتے۔ یہی فرمائش یہی رساں سے بات سننے کا عمل رہی کا وہ مضبوط پل بن گیا جس کے نیچے سے زمین کا کھلبلا تاپانی نکر میں مارتا گزر رہا ہے لیکن دونوں ساتھ آتے رہے جاتے رہے۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہم بوم اکٹنا کلس کالج گئے.... یہاں لڑکیوں کو گھر داری کا علم سکھایا جاتا ہے۔ اس سے لے کر کھانے مینو اور چھوٹی انجم میں بڑے ورژن ویبے کا فن بھی فیڈ کیا جاتا ہے۔ لڑکیاں پڑا امید چلتی خود اعتماد کام کاج میں مستعدی سیکھ کر گھر داری کو بڑے منظم سائنسی طریق پر کرنا سیکھتی ہیں۔ تمام لڑکیوں کو کھانا بانٹ کر انہیں الگ الگ Homes لات کر دیئے جاتے ہیں اور کبھی کبھار سارے گروپ مل کر کسی قابل ذکر شخص سے کر کے اُس پر اپنے علم و فن کا رعب گانٹھتی ہیں۔

اسی ہی ایک تقریب میں خاں صاحب گئے۔ میں بھی ساتھ شامل باجہ تھی۔ تمام چیزیں بڑی نفاست سے خود نمائی کے انداز میں پیش کی گئی تھیں۔ ہم دونوں نے بحری قزاقوں کی طرح خوب رنج کھایا اور درباری جی جنسٹی والوں کی طرح خوب دل کھول کر داد پیش کی۔ واپسی کے وقت طالب علم ایک دوسرے کے بازو کمر ہاتھ جوڑے۔ ہالہ بنائے کھڑی تھیں۔ اس چاند ہالے سے خاں صاحب نے کہا..... "کچھ سامان خورد و نوش بچا ہے کہ نہیں؟" "جی بہت کچھ بچ گیا ہے۔"

"تو مر و ساتھ کچھ نہیں دینا.... میرا سنا ف کیا کہے گا کن تھوڑو دیوں کے مہمان بن کر گئے تھے۔" وہ ساری چوکڑیاں بھرتی رخصت ہو گئیں۔ اس وقت خاں صاحب نے جیب سے کارینا کی ٹیکٹ

صحت کی دو گولیوں سمیت منہ میں ڈالیں اور انہیں چوسنے لگے۔ وہ جب بھی دل رکھنے خوش کرنے کے لیے بیسارنوشی کرتے اور ان کا معدہ جواب دے جاتا تو وہ اسی طرح بعد ازاں باضے کے لیے کئی ٹونکے استعمال کرتے۔ دوائیوں کے لیے بھیس چورن، آیورو ویدک پڑیوں، ایلو پیتھک گولیوں، Effervescent الکالینز، اینوز سے لدی پھندی تھیں جن کو کھانے پوری نظر بھر کر کبھی نہ دیکھا..... وہ علاج معالجہ بہت شرمات کے ساتھ کرتے تھے گویا سمجھتے ہوں کہ یہ عمل تو کل سے

ہرنیاں چوڑی بھرتی ہوئی قحقہ لگاتی، تالیاں بجاتی غائب ہو گئیں..... خاں صاحب راضی کر کے راضی ہوئے تھے پینے کا سامان جوڑا اور اہ بنا کر لائے تھے اردو سائنس بورڈ میں اپنے شاف کے لیے اُتار کر گھر آ گئے۔  
 شاید 2002ء کا واقعہ ہے۔

مجھے A.R.Y. نے دس ہزار ڈالر انعام دیا تھا۔ یہ انعام لائف ٹائم کارکردگی کی وجہ سے ملا۔ اس میں میری شکرگاہی کم اللہ کا فضل اور بھائی جمیل الدین عالی کی کوشش بمقدار وافر اور جج صاحبان کا حسن ظن زیادہ شامل تھا۔  
 میں نے ہولے ہولے چاروں کھونٹ مشاہدہ کر کے دھیرے دھیرے چھان پھٹک کے بعد ایک بات جانی ہے باقی تھیں تو شاید انسان مان ہی لے لیکن ایک بات پر اس کا دل کبھی راضی نہیں ہوتا کہ اُس کی کمائی ہوئی دولت اور چکا چونڈ کر دینے والی عیبت مند کے فضل اُس کی دین اُس کی مہربانی کے باعث حاصل ہوئی۔ وہ زبانی کلامی بنے واقعی کیا شک ہے کہے لیکن اندر ہی اندر ہی تصور سے منمناتا رہتا ہے کہ سارا کچھ اُس کی اپنی محنت کا ثمر ہے..... یہ پٹی اُسے نفس رٹا تادی چلا جاتا ہے۔  
 میں بھی بظاہر منمنی ہی جنیم الطبع، انکساری کی پوٹ بنی لیکن اندر اپنی کتابوں اور ڈراموں کی تکفنی کرتی اپنی محنت پر جس کو اپنی پہچنی تھی۔ انسان میں یہ بھی وصف ہے کہ وہ قرآن کو بھی اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا کرتا ہے۔ رزق حاصل کرنے کی جو اہمیت ہے اُسے جاگ لگا کر خوب خیر اٹھا کر اپنے نفس کو یہ باور کرا لیتا ہے کہ یہ جو گل و گلزار کھلا ہے اُس کے سنبھلے گودنے کیاری کیاری خون پسینا ایک کرنے سے وجود میں آیا ہے۔

خاں صاحب ہمیشہ کی طرح میری چادر اور چادر دیواری بنے ساتھ تھے..... وہ خطرے کے مقام پر آ گئے ہوتے وقت آخری سیٹوں پر جا بیٹھے۔

اسی قیام کے دوران ایک روز چلتے پھرتے عظمیٰ سے ملاقات ہو گئی۔

اس نٹنکشن پر جاتے وقت تو عظمیٰ گیلانی اور رمیض راجہ مجھے فلائٹ پر نہ ملے لیکن واپسی کے وقت ایئر پورٹ پر سے ملاقات ہو گئی۔ رکی مبارکباد کے بعد رمیض راجہ بولا..... ”آپاجی! میں آپ کے گھر کرکٹ کھیلنے آیا کرتا تھا..... میں شہر خاں کا دوست ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ میں آپ کے گھر اشیر کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا لیکن آپ کو یہ علم نہیں کہ ایک بار جب میں نے فل ٹاس ہٹ کیا تو گیند آپ کے برآمدے میں لگی کھڑکیوں سے جا ٹکرایا..... وہ شیشہ میں نے توڑا تھا آپاجی..... گو ہمارا اشیر خاں نے اپنے ذمے لیا۔“



”وہ ایسا ہی ہے رمیض میاں..... اچھا ہی ہوا تم نے مجھے بتایا نہیں ورنہ لمبا چوڑا بیکچر تمہیں بھی مل جاتا۔“

چند تائیے دو چپ رہا پھر بولا..... ”آ پاجی! آپ نے اشر کو فرسٹ کلاس کرکٹ میں کیوں نہ جانے دیا۔“

تو آ گیا تھا۔ اگروہ کرکٹر بن جاتا تو بڑا نام کھاتا۔“

”بھائی! تمہیں علم نہیں خوف میرا بنیادی وصف ہے..... خوفزدہ لوگ بچوں کو کسی عمل یا سوچ کی آزادی نہیں

سکتے..... خوف کو آپ محبت تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ اپنی طرز کی Concern ہے..... میں اُسے کیونکر جانے دیتی.....“

میں اُسے کیسے کھلے میدان سخت Pitch کے حوالے کر دیتی۔ میں تو کرکٹ کی لال گیند کو بھی ماتھے میں لگنے والا

تھی..... پھر میں اُسے اتنے بڑے امتحان میں کیسے جھونک دیتی؟ ”میرا خیال تھا کہ اس ٹینڈ کے لوگ خورتوں سے بچ سکتے

اور اس کھلی ذہنی زندگی میں پھنسا پھنساؤں کے لیے گناہ نہیں رہتا..... پھر تو ہی بتا جہاں اتنے خطرے ہوں اس جہلوں

کیسے جھونک دیتی۔ میری اتنی بیسی کہاں۔“

خان صاحب نے کبھی اپنے بچوں کے کیریئر میں زیادہ مین مینڈ نہیں نکالی۔ شاید اُن کا یقین تھا کہ عزت

شہرت سب اللہ کی دین ہے۔ ہو سکتا ہے اُن کے پاس ایسی باتوں کی نہ اہمیت ہو نہ وقت..... اُن کے برعکس آج کل

پہلے اپنے بیٹے کو اپنی سیٹ کے لیے تیار کرتا ہے اور پھر رینائر ہوتا ہے..... آرٹس ٹرینٹ ہی اپنی اولاد کو باہم

کر پھینا ہوتا ہے۔ پہلے زمانے میں بھی باپ دادا کا پروفیشن نسلوں چلتا تھا لیکن تب Awareness نہ تھی اور اولاد

سنبھرنے مستحق دیکھنے کی عادت بھی والدین میں نہ ذرا آتی تھی۔

لوہار کا بیٹا لوہار بنا سنا بڑھئی کی اولاد زینہ قرب کی وجہ سے غیر محسوس طریقے سے سارا علم

جیسے کشش پانی میں پڑے رہنے سے میٹھی تو نہیں رہتی لیکن بہت سا پانی چوس لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

ایک دن اسی فنکشن کے دوران عظمیٰ گیلانی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اور خاں صاحب ”پاداشی

دوران“، ”زردبان عرفان“ کی باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ پھر اچانک عظمیٰ نے کہا ”خاں صاحب! میں چلتی

بہونے ایک فرمائش کر رکھی ہے اُسے پورا کرنا ہے۔“

”اچھا؟ تمہارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ فرمائشیں پوری کر سکو۔ سنا ہے تم ایک بڑی ایڈورٹائزنگ

رہی ہو، سی بی کے ساتھ؟“

کچھ دیر عظمیٰ گیلانی بتاتی رہی کہ کیسے رضا میر کے بیٹے اُس کے ساتھ مل کر ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ

چلا رہے تھے اور کیسے اب اُس کا زوال بھی شروع ہو چکا تھا۔

”آپ کو معلوم نہیں اشر بھی تو میرے ساتھ ہوتے تھے Midas میں۔ سنا ہے اب وہ اسلاک انوسٹ

میں چلے گئے ہیں۔“

”میں کچھ پوچھتا ہوں تو کچھ اور بتاتی ہے۔ جو ایک ٹرائی لائنز یاد کر کے نہیں آتے انہیں عموماً فضول قصے

بیان کرنا پڑتی ہیں۔“

اپنی خوبصورت آواز میں عظمیٰ نے سوال کیا۔

”تو جی آپ کیا پوچھ رہے تھے خاں صاحب؟“

”عقل کی کوکون! میں پوچھتا ہوں کیا تو فرمائشیں پوری کرتی ہے لوگوں کی؟“

”لوگوں کی تو نہیں..... لیکن بہو کی فرمائش تو ضرور پوری کروں گی..... اُس نے مجھ سے نمکو مانگی ہے۔ یہاں کی

صحت مشہور ہے خاں صاحب۔“

”اُس سے ڈرتی ہے ناں؟“

”ہاں جی کچھ کچھ۔“

”عجیب سی بات ہے آج کل ساس بہو سے ڈرتی ہے..... پہلے بہو کی جان جایا کرتی تھی ساس سے، لیکن اگر تو

صحت مند ہے تو بھی تو ہی خوفزدہ ہوا کرتی۔“ خاں صاحب بولے۔

”وہ کیوں جی؟“

”بھائی میرے ایک اچھے فنکار میں اگر خوف نہ ہو تو وہ اچھی طرح پرفورم نہیں کر سکتا..... کرشن کال سے پہلے عام

پرفورمنس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جایا کرتے ہیں۔ کیمروہ روٹنگ کی آواز سن کر خوف سے ایکٹرسن ہو جاتے ہیں۔“

”بچی خاں صاحب! ”زردبان عرفاں“ میں جب فاروق ضمیر مجھے کندھے پر لاؤ کر ساہوکار کے دروازے پر لایا

تو میرے سوا چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں اور پھر کبھی نئی ویژن سٹیشن میں قدم نہ دھروں۔“

”اچھا یہ بتا مجھ سے کبھی ڈر لگا تھے؟“

”ریہرسل کے وقت جان جایا کرتی تھی لیکن جب taking ہوتی اور آپ آ جاتے تو پھر حوصلہ بڑھ جاتا۔ لگتا

یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گرجی یہ کچھ مگڑنے نہیں دیں گے۔“

”اچھا تو جب بہو کے نیے نمکو خریدنے جانے میرے لیے بھی چڑوے والا نمکولانا..... بھول نہ جائیں مرہیں۔“

”دلیں میں بھول سکتی ہوں جی۔“

انتظار حسین، عظمیٰ گیلانی اور ہم دونوں فائو سٹار کی چوتھی منزل میں تھے۔ عموماً نیچے اُترنے سے پہلے ایک

سے کو فون کر لیتے۔ کھانے پر اُترتے وقت لفٹ میں ملاقات ہو جاتی۔ ایک کا مہمان آتا تو دوسرے کو علم ہو جاتا کیونکہ

یہ شخص کے حوالے سے قریباً سارے مہمان ساٹھے تھے۔

اسی طرح عظمیٰ سے لفٹ میں ملاقات ہوگی۔ وہ بازار سے نمکو کے تھیلے اٹھائے اوپر جا رہی تھی۔ ہم کھانے کے

نیچے جانے کے لیے سوار ہوئے تھے۔

”اُترے اُترے خاں صاحب! یہ اپنے نمکو کمرے میں رکھ لیجئے۔“ چار نمبروں والی منزل پر ہم تینوں اُترے اور

نے کئی تھیلے مجھے پکڑا دیے۔

”یہ تو بہت زیادہ ہیں عظمیٰ اتنے سارے تھیلے۔“ میں نے ہچکچا کر کہا۔

”زیادہ کہاں ہیں کم ہیں..... ہاں بھئی بوری بازار سے بس اتنے ہی ملے؟“ خاں صاحب بولے۔

”عظمیٰ میرا بیگ اتنا بڑا نہیں کہ یہ سب اُس میں سما سکے۔“ میں بولی۔

”چلے میں لاہور پہنچ کر گھر پہنچا دوں گی۔“

خاں صاحب نے بڑے ندیدے انداز میں تھیلے پکڑے..... ”ناں جی قدسیہ! اس کا کیا اعتبار۔ یہ تھیلے چلتے کو پکڑا دے گی..... یہ ایسی ہی ہے نعمتیں بانٹنے والی۔“

خاں صاحب نے لاہور پہنچ کر یہ نمکوا ایک آدھ بار کھایا اور پھر اسے مہمانوں کی نذر کر دیا۔ رکھنے والے صاحب نے یہ ضرور اسے بھی اپنی گیت گھما کا حصہ بنا لیتے اور پھر بھول بھال جاتے۔

شیمم فاطمہ خاں صاحب کے ساتھ تلقین شاہ میں کامیاب کرتی تھیں۔ ”ادھ کھایا امرود“ لکھنے والے قصبے خاں کی بیگم اور انگریزی کے پروفیسر ضیاء الرحمن کی والدہ تھیں۔ بڑی پائت دار آواز ہے لاگ لہجہ بلا لکھتے تھے۔ ڈھنگ..... جب بے دھڑک ”تنتقیہ“ کہہ کر خاں صاحب سے مخاطب ہوتیں تو پروگرام کرارا ہو جاتا۔ پتہ نہیں کہیں کہ جس قدر شہرت فضل الرحمن صاحب کو ملنا چاہئے تھی نہ ملی۔ ”ادھ کھایا امرود“ کا لکھنے والا گنامی میں ہی مر گیا۔ فاطمہ کی آواز سارے پاکستان میں گونج اٹھی..... یہ اللہ کے بھید ہیں جن میں کسی کو دخل نہیں۔

شیمم فاطمہ پریم کی ڈوٹی چلا کر خوب سارے میوے ڈال کر شیر خرا پاکا کر لاتیں۔

اور خاں صاحب کہتے ”شیمم! ہمارے ایک ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب ہیں۔ ان کی ”تفسیرہ“ تمہاری نظر سے گزری ہو۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ سویاں اور جلوه بغیر میوے کے پکانے چاہئیں۔ یہ چیزیں کھانے میں بن جاتی ہیں.....“ لیکن خاں صاحب کی بات سن کر بھی شیمم رکاوٹیں ڈالنے سے باز نہ آئیں اور خاں صاحب کے کھانے کے ہاتھ کے پکے ہوئے شیر خرا کو پسند کیا۔

فون کی گھنٹی بجتی ”میں شہزاد احمد بول رہا ہوں..... ذرا خاں صاحب سے فون ملا دیجئے۔“ اب لڑکی ہو جاتا۔ دونوں آواگون سے لے کر وجودیت تک انسانی سوچ کی جھلک ڈوریوں کو سکھاتے۔ شہزاد احمد کا اور جوش ہے۔ وہ غیر نصابی فلسفے کی کئی کتابیں تخلیق کر چکے ہیں۔ خاں صاحب زندگی کو صوفی رنگ کی عینک پہن کر دیکھتے تھے۔ جہاں ایک سفید کرن پوری تو بن قزح بن جاتی ہے۔ نور کی وحدت کیسے کثرت میں ہے۔ جلوہ ایک ہی ہے کبھی خوشبو بن کر پھیلتا ہے کبھی رنگ بن کر نکھرتا ہے کبھی کرنوں کی طرح ہر روپ کو اپنا کرتا ہے۔ لیکن ساری گفتگو کے بعد پریم کہانی اُدھوری رہتی۔

خاں صاحب کہتے ”شہزاد یارا وہ تیرا تھوم کا اچار بس دو تین دن کا رہ گیا ہے۔ اس سے میرے نوحہ کرتے رہتا ہے..... پتہ نہیں بھائی میرے تو کیوں بھول جاتا ہے کہ میں انجانا کا مریض ہوں۔“

میں نہ مصلحت سمجھتی تھی نہ دانائی۔ غلط وقت پر بیجا بولنے میں راسخ..... جب فون بند ہو جاتا تو میں کہتی ”خاں جی! ابھی تو پوری بوتل اچار کی پڑی ہے۔“

وہ نہ مجھے سرزنش کرتے نہ میری دانائی یا بچ کو چیلنج کرتے۔ بس مسکرا کر کہتے ”آنے دو..... آنے۔“ یہ سن کر میں ان کو آتے رہنا چاہئے..... اس جذبے سے رزق پاک ہوتا ہے۔“

میں اُن کی منطق کو تو نہ سمجھتی تھی لیکن چپت ہو جاتی..... ایک بار اُنہوں نے میری موجودگی میں عطاء الحق قاسمی کو بلایا! ایک روز..... مجھے اچھی طرح سے تو نام یاد نہیں شاید داراشکوہ تھا..... یا شاید کوئی اور شہزادہ..... یہ شہزادہ تھے سونے کی اشرفیوں سے ٹھنسنے ہوئے لے کر میاں میر صاحب کے آستانے پر پہنچا اور دست بستہ عرض کی حضور! اس وقت یہ کچھٹ پران گنت سوالی آیا کرتے ہیں۔ میری عرض ہے کہ یہ آپ خلق خدا میں تقسیم کر دیں..... اُن کا سوال بھی میرے ذہن پر برق بھی پاک ہو جائے۔

میاں میر صاحب ذرا سا لرزے۔ پھر دونوں ہاتھ بے انداز اُنکا رُٹھا کر بولے ناں بابا ناں۔ میں چھوٹا سا جو بڑے ہوشیار اور محنت کا تحمل نہیں ہو سکتا..... یہ ماں اسباب تم دا تا گنج بخش کے ہاں لے جاؤ وہ سمندر ہیں..... علی جھویریؒ نے سب کی طرح سب کچھ سمیٹ کر بھی اُجھٹے کا اُجھار ہتا ہے..... ہمیں ایسی تجاہل سے معاف ہی رکھو۔“

”سنا ہے..... جونہی وہ شہزادہ والا جا رہا تھا عثمان جھویریؒ کی درگاہ پر پہنچا..... ایک ساعت بھی نہ گزری تھی کہ وہ لہو سے لہو توڑے چو سے ہوئے آسمان کی طرح خانی ہو گئے..... دا تا نے انہیں ہاتھ بھی نہ لگایا نہ کوئی بات کی نہ کہیں سے بھی ترنت ہی تھیلیاں بانٹنے کا حکم دیا اور سب بھول گئے۔ اشرفیاں..... شہزادہ اور تھیلیاں..... ایک حکم کے ساتھ وہ باغ ہو گئے۔“

یہی کچھ خاں صاحب بھی کیا کرتے تھے..... اُن کے پاس فتوحات آتیں..... کھانے پینے کی اشیاء ترنت بانٹ کر رکھنے والی چیزوں کو گیت نار کا حصہ بنا دیا جاتا اور باقی سب کو فوراً ہی بھلا دیا جاتا۔

افضل حیدر اُن کے ساتھ اُردو پورہ میں کام کرتے تھے..... اُن کے گھر سے ساگ اور کئی کی روٹیاں رسالوں کی طرح پکائی جاتی۔ ان دونوں چیزوں کا گھر والوں کو بہت انتظار رہتا۔ جب کبھی اقبال شہاب یا افضل حیدر کے گھر سے ساگ لے کر صاحب چسکے لے کر کھاتے اور کہتے..... ”قدسیہ! کیا ایسا ساگ ہم نہیں پکا سکتے۔“

”کئی کی روٹی تو چکلے بیلن پر میں پکا سکتی ہوں لیکن یہ..... ایسا ساگ مجھ سے نہیں پکتا۔“

میں خاں صاحب کی توجہ ساگ سے ہٹا کر اپنی کئی کی روٹیوں کی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی۔ مجھے ارمان ہوتا تھا کہ میں چپاتی کی طرح چکی کئی کی روٹی صرف قدسیہ ہی پکا سکتی ہے..... مجھے کھانا پکانے کا علم بھی خاں صاحب نے ہی دیا تھا۔ جب میری شادی ہوئی تو مجھے ہانہ ہانہ اندا بھی بنانا نہ آتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے کڑوے کرینے کچے آلوؤ الذائین سے بھی کئی روٹیاں ٹھنڈی چائے پنی پی کر اُنہوں نے مجھے رام کر لیا۔ وہ کھانے میں نقص نہیں نکالتے تھے۔ صرف سے اجتناب کرتے اور میری انا کو اسی تعریف کی تلاش تھی۔

جب کبھی فتوحات میں کوئی اچھا مزیدار کھانا آتا وہ پکانے والے سے محبت کا اظہار اس طرح کرتے کہ ساری محبت بچھتے اور کچھ ایسے وضاحت سے سوال اٹھاتے کہ میری تربیت ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے ایک بار شاہد کے گھر سے کئی روٹی لے کر آیا۔ انکل ظفر کے یہ بھانجے غیبی طور پر ہماری توجہ میں رہتے تھے۔

انکل سے روسٹ کی ترکیب پوچھی تو وہ صرف کھانے تک شمولیت کرتے تھے۔ ترکیبوں سے اُنہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ”قدسیہ! آپ شاہد کی والدہ سے مل کر ترکیب پوچھ لیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے..... تم کسی دن اُس کے پاس جا کر طریقہ وزن پوچھ آؤ..... یہ آسان ہے۔“

میں شاہد کی امی کے پاس گئی..... ساری ترکیب کان اور کاپی کھول کر لکھی..... کئی مرتبہ روسٹ پکا لیا.....

بنا لیکن وہ لذت پیدا نہ ہو سکی جو شاہد کی والدہ کے ہاتھ سے روسٹ میں منتقل ہوتی تھی..... پتہ نہیں کیا بات ہے ہر شخص

شخص اپنا پریم رنگ اپنی سائیکی اپنا روحانی زور کیسے منتقل کر دیتا ہے..... عمارت ہو یا فنون لطیفہ کھانا پکا کر

تریت..... عمل کی حد تک پرویس ایک ہوتا ہے لیکن نتیجہ کبھی ایک سا نہیں نکلتا..... تاش کے باون پتے انسانی جڑوں

چھبیس چیز اتنی رنگارنگی پیدا کرتے ہیں کہ ارتقاء ختم ہونے میں نہیں آتا..... کائنات ختم نہیں ہو سکتی۔

یہ سوال سائنس دان پوچھتا چلا جاتا ہے۔ نئے نئے جوابات بھی تشکیل کیے جاتا ہے لیکن صوفی ہاتھ اٹھا کر

”علموں بس کریں او یا.....“ عظم رضا و رغبت پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے..... عمل راستہ چلنا سکھاتا ہے لیکن راستہ

پر منتج ہوا اس کا تعین نہیں کر سکتا..... بس نیت کی درستی سے رضا و رغبت کے ساتھ چلتے رہنے میں ہی راحت اور عافیت ہے

مجھے یاد ہے

ایک روز سمن آباد میں خاں صاحب اور میں پچھلے دیڑھے میں بیٹھے تھے کہ اماں جی آگئیں۔ ان کے

الطاف ناموں بھی تشریف لائے۔ اماں جی ہمیشہ کی طرح شرمندہ شرمندہ ہنستی ہوئی بغیر استری کے ریشمی شلواری

تھیں۔ اب اماں جی ڈرتے ڈرتے اپنے بیٹے کے گھر بھی آنے لگی تھیں۔ باتوں باتوں میں خاں صاحب نے

”اماں جی کر لیلے کیسے پکتے ہیں؟“

اماں جی ہمیشہ کی طرح ہنسنے لگیں..... ”بس دو تین نمکین پانیوں سے دھو لیا۔ پھر تھوڑا سا بھون کر پانی

ساتھ ہی پیاز چھوڑ دیا۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔

”پانی چھوڑ دیا کر یلوں میں؟“

ماں جی الطاف بولے ”ناں بی بی ناں..... اشتقاق بیٹا..... کر یلوں کو بھونتے جاؤ..... ڈھکنا دو..... پھر

ڈھکنا دو..... پھر بھونو..... پانی وانی نہ ڈالنا۔ قد سیدہ بیٹی! کر لیلے کڑوے ہو جائیں گے۔“

ماں بیٹے نے اپنی ترکیب پر نہ اصرار کیا نہ ترکیب دوہرائی..... بس چپکے سے میرے گوش گزار کر دی

طرح سہرا کہا کرتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے کر لیلے دھو دھو کر چٹے سفید کیے..... ڈرتے ڈرتے پانی ڈالا..... کھانے والی

ترکیب سے پکے کر یلوں کی ہمیشہ تعریف کی لیکن وہ ذائقہ پیدا نہ ہو سکا جو اماں سردار بیگم کے کھانوں کی خاصیت

کے قلب سے ڈوئی تک اور ڈوئی سے ہانڈی تک جو چیز منتقل ہوتی تھی اُس کا عرفان مجھے نہ ہو سکا۔

ہم نئے نئے امیر ہوئے تھے۔ نو دولتوں کی طرح ہمیں بھی نئی چیزوں کا شوق ہونے لگا تھا۔ میرے

مہمان و رطہ حیرت میں چلا جاتا ہے اور اخبار سے لے کر ہر انسان تک تھوڑا یا زیادہ دوسرے لوگوں کو حیران کر کے

ہے۔ چائیز کھانے نئے نئے رائج ہوئے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ میں بھی چکن کارن سوپ، ہاٹ اینڈ سائز

وغیرہ پکاؤں لیکن دو چار مرتبہ کوشش بیکار گئی۔ دسترخوان کے طفیل لوگوں کو مرغوب کرنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔

عالمی وہی عورتیں بالآخر اچھی باور چینیں بھی جاتی ہیں، جنہیں دسترخوانی تعریف من بھاتی ہے۔ مروت لحاظ اور صفائی کے تحت لوگ پسندیدگی کا اظہار بھی کرنے لگے تھے لیکن اندر مجھے یقین تھا کہ ابھی ناچخت ہے۔ پھر ایک کورس کا تجربہ میں چھپا۔ یہ کورس چینی کچوانوں کی سکھلائی کا تھا اور غالباً اس کی سپانسر حیات احمد صاحب کی بیٹی غزالہ تھیں۔ وہی حیات احمد خاں جو کلاسیکی موسیقی کی بقائے دوام کرتے کرتے اس دنیا میں کل پاکستان موسیقی کا نفر نسوں کو گھس گھسے۔ اس گھرانے کو احمد بشیر صاحب کے خانو اوے کی طرح فنون لطیفہ سے گہری وابستگی تھی۔ غزالہ تخلیقی انج کے تھے۔ اہتمام سے خلق خدا کے لیے کورس وغیرہ ترتیب دیتی رہتی تھی۔ اس سے پہلے سکھانے کا بھی ایک شارٹ کورس لگایا تھا جسے میرے بیٹے اینق اور انیس بڑے ذوق و شوق سے امینڈ کرتے رہے تھے۔

چینی کھانوں تک میں ایسے سہولت سے پہنچ جاؤں گی اس کی سب سے زیادہ خوشی خاں صاحب نے منائی۔ مے کونگ کا چینی شیف ہمیں ماہر کرنے پر مامور ہوا..... ہزیاں کا مے کافیں ہم نے سیکھا ضرور لیکن جس طرح ہزیاں پکڑتے اور چھری چلاتے یہ ممکن نہ تھا۔ ترکیبیں تو قریباً سب سمجھ میں آگئیں لیکن ہزیاں کا ٹاٹا عموماً خاں صاحب کا ہی نمونہ ہوتا۔ شیف صاحب کو نقل کرنا آسان تھا لیکن وہ پریکٹس ہاتھ آئیں نہ کبھی ویسے رزلٹ نکلتے۔ البتہ تعریف کا ایک اور دروازہ کھل گیا۔

مجھے یاد ہے ایک روز شہاب بھائی اور خاں صاحب کہیں باہر گئے تھے۔ واپسی پر پتہ چلا کہ انہیں ”کونج“ میں دعوت دی تھی۔ چکن کارن سوپ ہاٹ اینڈ سارڈ فرائینڈ چکن رائس اور پران اینڈ ویکٹی ٹیبل مینو میں تھا۔ شہاب صاحب نے گھستے ہی کہا..... ”ہمارا چینی کھانا بہتر ہوا کرتا ہے..... ہے ناں اشفاق“ خاں صاحب چپ رہے۔

مجھے خوب علم تھا کہ شہاب صاحب دلی رکھنے کی روایت قائم رکھے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی اُن کی تعریف سن کر زبان باغ ہو گیا۔ انسان بھی کیا گھٹیا Species ہے۔ اس کا بہرا من تو تانا کوئی وصف ہے نہ ذات..... بس اپنی تعریف سن کر خوب خود آزدی چھوڑ کر ہتھکڑی پہننے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ جاگیر دار اور میراثی اسی تعریف کی زنجیر سے بندھے رہتے ہیں۔ جاگیر دار اپنے غلے کا منہ کھلا رکھتا ہے اور خوشامدی میراثی کو واہ جی واہ کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔

ننو مزار سے میراثی کی ضرورت کبھی پورے طور پر پوری ہوتی ہے نہ نمبر دار جاگیر دار فیوڈلی لارڈ ہی کا تعریف سے بھرتا ہے۔ دونوں ننڈیں بھر بھر کرتے رہتے ہیں۔ رہٹ چنتی رہتی ہے۔ طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ سٹم کچھ بولے نہیں پایا۔ شہروں میں دیہاتوں میں پڑھے لکھے لوگوں میں یہ سٹم چھوٹے بڑے رڈ و بدل کے ساتھ جاری ہے۔

## سفر در سفر

### سفر لندن

تشخیص کے بعد مجھے بلڈ کیسز کا مرض بتایا گیا اور میں مستقل طور پر ہسپتال میں رہنے لگی۔ دو تین بوتلیں دن کے لیے لگائیں لیکن صبح بلڈ کاؤنٹ کم نکلتا۔

ان ہی دنوں جب میں ایم آئی آر اور بلڈ میٹ کے چکروں میں تھی ایک روز جیلہ ہاشمی چند ایبوں کے ہمراہ گھر آ گئیں۔ خاں صاحب کی پیشی ڈرائنگ روم میں ہوئی۔

”سنو اشفاق (نہ بھائی نہ شائی) تم قد سیدہ کولندن کیوں نہیں لے جاتے۔ وہاں اس کا علاج ہو جائے گا۔“  
سائنس نے کینسر کا علاج معلوم کر لیا ہے۔ Para-medical staff بھی بہتر ہے اور ڈاکٹر بھی۔“  
”بھائی میری پہلی نہیں ہے۔“

”اگر تمہاری پہلی نہیں ہے تو ہم سب ادیب مل کر خرچ برداشت کر لیں گے۔“

”ضرور ضرور میں جلد جواب دوں گا۔ اس کے دو تین سٹ اور ہو لینے دو۔“

خاں صاحب کو بظاہر جھوٹے ہی نظر آتے ہوں وہ لڑنے بھڑنے مناظرہ کرنے اور دل آزاری سے بچتے تھے۔

اب وہ اسی سوچ میں مبتلا تھے کہ کیسے اس گھر آئی بلا سے جان چھڑائیں؟

پھر پتہ نہیں کیسے B.C.C.I کے بینک کو خبر ہوئی۔ ان دنوں برنی صاحب اس بینک کے صدر تھے۔ صاحب وائس پریذیڈنٹ..... نہ ہا جاوید طارق (جیدی) نے میری مخدوش حالت دیکھ کر مشتاق احمد یوسفی صاحب کو دی۔ ان دنوں جیدی M.C.B بینک میں آفیسر تھا۔ اُس نے یوسفی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور پتہ نہیں کیا کہ کون سا لیکن یوسفی صاحب کا خاں صاحب کو فون آ گیا کہ آپ قد سیدہ کو لے کر آئیں تو ہم سارے سفر کا خرچ برداشت کرتے۔ چوری چوری اعانت کرنے والے یوسفی صاحب ایک لمحہ کے لیے محسن کی شکل میں سامنے نہ آئے اور انہوں نے برنی صاحب کے سر تھوپ دیا۔

ہم ڈرتے ڈرتے پہنچے۔ جب ہتھرو وائس پورٹ پر اترے تو ابھی سامان نہ آیا تھا۔ خاں صاحب نے والی بیلٹ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھا گئے۔ میری ساتھ والی سیٹ پر ایک قد آور مضبوط مرد بیٹھا ہوا تھا۔ شاید انہوں نے میری شکل سے اندازہ لگایا۔ وہ اٹھے اور سامان باہر لے جانے والی ریڑھی اٹھا کر اور بیلٹ کے پاس کھڑے خاں صاحب سے کہا ”بھرا جی! آپ فکر نہ کریں۔ مجھے صرف اپنا بکس اٹھانے سے کھڑکی میں اُتار دوں گا۔ آپ بی بی کے پاس رہیں۔“

خاں صاحب چپ رہے۔

اس سے پہلے ہمارا سوٹ کیس دو بار بیلٹ پر چکر لگا چکا تھا۔ اب سردار جی نے ترنت ہی سوٹ کیس اٹھا کر ریڑھی میں رکھ دیا۔ خاں صاحب نے ہوائی جہاز کے اندر جانے والا بیگ اور ایک آدھ اور بیگ اوپر رکھے اور ہمیں کھڑکی کا شکر یہ ادا کر کے چلتے بنے۔ حسن اتفاق سے سکیورٹی پر جو آفیسر تھا اُس نے سوال کیا ”آپ اشفاق صاحب تھے؟“

”جی۔“

”ایک محبت سوانسائے والے۔“

”جی۔“

”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی..... چلئے کوئی چینگنگ نہیں۔“

اب فکر یہ تھی کہ ہمیں کون لینے آئے گا اور ہم کہاں ٹھہریں گے؟

جونہی باہر پہنچے ایک خالص انگریز Placard اٹھائے جنگلے سے باہر کھڑا نظر آیا۔ ہمیں شبہ بھی نہ ہوا کہ ہمارے لیے یہ کھڑا ڈرائیور بھی آسکتا ہے۔ جنگلے سے باہر نکلے تو ڈرائیور نے فوراً سامان کی گاڑی سنبھال لی۔ ہم دونوں اپنے اپنے کھمبات معزز سمجھنے لگے۔ سڑک پار کر کے ہم پارکنگ لائٹ میں پہنچے۔ ڈرائیور صاحب نے سامان لوڈ کیا۔ ہمیں Cromwell ہسپتال سے تھوڑی دور ایک دو منزلہ مکان کی اوپر والی منزل میں لے گیا۔ کسی سفید قام انسان سے پہلی بار ملنے محبت کیس اور بیگ اٹھوائے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ یونانی صاحب آگئے۔ ہمارے پاس سر دست اُن کی تواضع کے لیے کھڑے تھے۔ میں نے فریق میں دیکھا تو چند جوس پڑے تھے۔ یہاں سے ایک جوس نکال کر یونانی صاحب کو پیش کیا۔

اُن کے گھنٹے کے ساتھ ایک بڑا سا شاپر تھا۔ اب انہوں نے اسے مجھے دے کر کہا ”اس میں کچھ کچی رسد ہے جسے بقیہ کھسن چینی سب موجود ہے..... لیکن میں دوبارہ یہ مہربانی نہ کر سکوں گا۔ یہ لندن ہے۔ یہاں ساری Groceries خود لانا پڑتی ہے۔ واشنگ اور کوئنگ کرنے کے لیے کوئی ملازم نہیں ہوتا۔“

مشرق میں تو لوئرڈیل کلاس میں بھی کپڑے دھونے برتن مانجھنے کے لیے عورت مل جاتی ہے۔

یونانی صاحب بولے ”قریب ہی ٹیوب سٹیشن ہے۔ آپ جہاں بھی جانا چاہیں ٹرین سے جا سکتے ہیں۔ ویسے تو یہ سب بھی قریب ہے اب آپ دکار بھی نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ ”ہوم“ ہے اور اس کی مراعات سب کے لیے ایک سی

ہر یونانی صاحب ہمیں مغرب کی سب سے بڑی قدر Self-reliance ہاتھ میں پکڑا کر چلے گئے۔ ہم لوگ سڑکوں کے عادی ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑنے پر ایسا تادہ اور راستہ پوچھنے والے لوگ تھے۔ پھر خاں صاحب جو سفر کے چلنے میں تاک ضرور تھے لیکن ایک بیمار عورت کے ساتھ پر کچھ اڑے اڑے سے لگتے تھے۔ اسی روز جاوید عبداللہ چلے پاس آئے۔ وہ ہمیں ٹیوب سٹیشن دکھانے لے گئے۔

ٹیوب کا کمال بھی انسانی پھرتی کا میٹ تھا۔ بس یہ منٹوں کے لیے رکتی اور جھٹاپٹ روانہ ہو جاتی۔ ایسی تیزی سے چھوٹی کچھ مجھے پریشان کر گئی۔ اس ٹیوب پر دوسرے تیسرے دن سوار ہونے کا اتفاق ہوا اور ساتھ ہی دہشت گردی کا یہ سحر آنکھوں سے دیکھا۔ ابھی ہم سٹیشن پر پہنچے ہی تھے کہ سر پھرانو جوان بندوق لے کر کہیں سے برآمد ہوا اور دائیں بائیں ٹھاٹھا گولیاں داغ دیں۔ بچے اور عورتیں بدحواس ہو کر تتر بتر ہو گئیں۔ جونہی ٹیوب آئی اور ہم سوار ہوئے۔ جناب دہشت گرد بھی بندوق لے کر بیڑھیاں چڑھ آئے۔ ٹکٹ چیکر غالباً ایسے سر پھروں کا عادی تھا۔ وہ شانتی سے کھڑا رہا۔ دہشت گرد نے بندوق تانی اور سیٹوں پر بیٹھے مسافروں کو کافی پریشان کیا۔

پہلے ہی دن جاوید عبداللہ کے علاوہ نعیم ہمیں ملنے آیا۔ آپ عمر بکری کے نام سے تو غالباً واقف ہیں۔ عمر بکری بھارتوں کا رسیا تھا۔ اس کا ذکر خاں صاحب کے ”سفر در سفر“ میں تفصیل سے موجود ہے۔ میرے بھائی ریزی اور عمر بکری صدی عمر پہاڑوں کے رسیا رہے۔ نعیم اُن ہی عمر بکری کے داماد تھے اور لندن میں رہتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا



”آپ مجھے اپنی رپورٹیں دے دیں۔ میں انہیں لے کر کراچی میں ہسپتال ابھی پہنچا دیتا ہوں۔“ اس نے ڈاکٹر خیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور رپورٹوں کے ہمراہ ایکس رے اور بلڈ کاؤنٹ کی باقاعدہ دن وار تفصیلات ہم پہنچائیں۔

”آپ ہسپتال جانے کی کوشش نہ کریں۔ میں کل تک آپ کو ڈاکٹر سے ٹائم لے کر بتا دوں گا۔“

اس کے بعد ہم Edgware Street گئے۔ یہاں ٹویلد اور انیس موجود تھے۔ وہ کراچی سے آئے تھے۔

تھے۔ چونکہ انیس میاں Manager Agreements and Handling تھا۔ اس لیے اُسے پی آئی آئی کے ٹریننگ اور رہائش ملی ہوئی تھی۔ ٹویلد نے ہمارے لیے بڑا عمدہ پلاؤ اور آلو گوشت تیار کر رکھا تھا۔ مزے لے لے کر اس کے بعد وہ ہمیں ایک سنڈے مارکیٹ میں لے گئے۔

یہ مارکیٹ ایک پاکستانی مہاجر لگا تھا۔ ادھر ادھر سے ہر عمر اور سائز کے کپڑے خرید لاتا اور اسے پانچواں طبقے کے داموں پر بیچ دیتا۔ اب تو پاکستان میں بھی اتوار بازار جمعہ بازار ایک عام چیز ہے لیکن تب یہ ایک نیا اور انوکھا بازار تھا۔ میں نے وہاں پر کچھ سوٹ نچھے میں دینے کی غرض سے خریدے۔ ٹویلد اور انیس نے مجھے خاں صاحب کو چند سوٹ خرید دیے۔ میں جانتی تھی کہ انیس کی تنخواہ زیادہ نہ تھی۔ میں اصرار کرتی رہی کہ یہ فضول خرچی ہے۔ باز آ جاؤ لیکن مجھے خوف تھا کہ بارہ سو روپے کی تنخواہ میں اُس کے پاس اس اسراف کے لیے کہاں گنجائش تھی لیکن انیس بیٹے کی تنخواہ کم تھی۔ انیس نے کہا کہ بازار میں وہ اپنے لیے آپ کو کچھ خریدنے نہیں دیتا۔ کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتا لیکن آپ کے معاملے میں کبھی بغیر نہیں رہتا۔

شام کو اردو مرکز کے کتب خانے میں خاں صاحب کی کتاب ”اُجٹلے پھول“ کا فنکشن تھا۔ انیس نے کہا کہ وہاں لے کر گئے۔ لندن کے ادیبوں کا خوب کٹھ تھا۔ زیادہ تر تعریف ہوئی۔ کچھ سوال بغلی گھونسلے جیسے بھی کیے گئے۔ ایسی گفتگوں میں ہوتا ہی ہے۔

مشاق یوسفی صاحب سے یہاں ملاقات ہوئی۔ ابھی انہوں نے ”آپ گم“ نہ لکھی تھی اور بیٹکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جانے جاتے تھے لیکن اُس وقت بھی اُن کی طبیعت کی شگفتگی اور مزاح کی حس نے بہت متاثر کیا۔

دوسرے دن صبح صبح ٹویلد اور انیس ہمارے پاس پہنچ گئے۔ اُن کے ہمراہ Cromwell ہسپتال کے ڈاکٹر خالد حمید سے ملاقات ہوئی۔ اتنی تیز رفتار زندگی اور مصروفیت کے باوجود اُن کے چہرے پر ایک شگفتگی تھی۔ رپورٹیں دیکھ کر وہ شائستگی آواز میں بولے۔

”ہمارے اور میو ہسپتال کے ڈاکٹر خیر کی رپورٹیں ایک سی ہیں۔ ہم آپ کے ڈاکٹر سے اتفاق کرتے ہیں۔“

کو بلڈ کیسٹریٹ ہے..... لیکن ایک اختلاف ہے۔“

خاں صاحب کچھ گھبرائے۔

”وہ کیا ڈاکٹر صاحب؟“

”آپ ڈاکٹر خیر سے کہیں کہ وہ ٹائپ رائٹر بدل لیں۔ اگر انہیں پاکستان میں نیا ٹائپ رائٹر ملے۔“

یہاں سے مجھ کو ادوں گا۔“

ہم دونوں کی جان میں جان آئی۔

طے یہ پایا کہ ہم چند دن بعد چرچل ہسپتال میں ڈاکٹر شارپ سے مل لیں۔ وہی کینسر کا علاج کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ایک نرس کو حکم دیا کہ وہ میرے بلڈ کا ایک اور سیکل شارپ کے معائنہ کے لیے لے لیں۔

ابھی ہمیں گھر پہنچا کر انیس اور ٹویلیڈ کو گئے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ تقو آ گیا۔ اُن دنوں وہ عاشق حسین بنا لوی کا دست بوس ہونے کے گلے کر کے کنگال رہتا تھا۔ چونکہ ملازمتی ادارہ رجسٹرڈ کلاش قیمن تھا۔ وہ کبھی نہ مشریت بس لیتا نہ کبھی ٹوبہ سے ستر کرتا۔

ابھی ہم حال چال معلوم کرنے کی سٹیج میں تھے کہ کرومویل ہسپتال سے فون آیا۔ اشتیاق نے فون اٹھایا۔ کچھ دیر بعد اگلے سنتار ہا۔ پھر بولا..... ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے پتہ چلا کہ لندن کا پیرامیڈیکل سٹاف اتنا Efficient نہیں جس سے تم آپ لوگوں کو سمجھتے ہیں۔“

پھر کچھ دیر دوسری طرف سے کچھ کہا گیا..... اس کے جواب میں تقو بولا ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں تمہاری سٹ ڈاکٹر خالد حمید سے نہیں کروں گا لیکن پتہ چلا سسر کہ تم لوگ ہم کالے آدمیوں کو کیا سمجھتے ہو۔ بڑی فرعونیت ہے بڑا... لاتا ہوں لاتا ہوں ابھی۔“

فون نیچے رکھ کر اُس نے شتو جی سے کہا..... ”تم نے سسر کی حرکت دیکھی۔ پہلے ہی کا کی میں بلڈ کی کمی ہے۔ اوپر سے سسر کو سارا بلڈ گرا دیا۔ کہتی ہے مریض کو ہسپتال لے آؤ لیکن ڈاکٹر خالد حمید کو پتہ نہ چلے..... یہ تو لندن والوں کا حال ہے سمجھ کے پٹھے۔“

خاں صاحب کو تقو ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہوا۔ ہم دونوں پیدل کرا مویل ہسپتال پہنچے۔ تقو کے جانے کے بعد جاوید عبد اللہ آ گئے۔ اُس کے ساتھ میں لندن شہر گھومنے پھرنے لگے۔ لندن ٹاور Westminster Abbey۔ پھر سے کنگڈم ہیلس دیکھتے چلے گئے۔ دوسرے دن جاوید عبد اللہ ہمیں Bond Street لے گئے۔ یہاں Selfridge سٹ ماٹیکل اور Littlewood کے سٹور دیکھے۔ اُس وقت تو احساس نہ ہوا کہ مغرب مارکیٹنگ کی وبا میں مبتلا ہو چکا تھا۔ سٹروں نے لوگوں کی خواہشات کا بازار گرم کر رکھا تھا اور لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کو ایک اہم خوشی سمجھنے لگے تھے۔ صرف زندگی میں در آ یا تھا اور لوگ ضرورت بھرا شیا پر قانع نہ رہے تھے۔

اگلے دن ہمیں نعیم میاں ونڈسرا کا قلعہ دکھانے لے گئے۔ پھرتے پھرتے Eton اور Slough کا علاقہ زیرِ بحث آیا۔ واپسی پر انیس اور ٹویلیڈ کو گھر میں موجود پایا۔ اُن کے دو بیگ اور کچھ دستی سامان ساتھ تھا۔

”ابو آپ ذرا اطلاع نہیں دیتے کہ آئندہ کیا پروگرام ہے؟ میں اور ٹویلیڈ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم اب یہیں ٹھہریں گے اور آپ کے ساتھ نکھی ہو جائیں گے۔“

”تم دونوں کیوں اپنی چھتیاں برباد کرتے ہو۔ ہم مزے میں ہیں۔ جاوید اور نعیم ہمیں خوب سیر کر رہے ہیں۔ اب چرچل ہسپتال جانا ہوگا ہم تمہیں اطلاع دیں گے۔“

”نہیں نہیں ابو..... اب ہم آپ کو نرسٹ نہیں کرتے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“

دوسرے دن ہم چرچل ہسپتال پہنچے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں میرا Bone marrow ٹسٹ دوبارہ ڈاکٹر شارپ نے ہم سب کو مخاطب کر کے کہا ”دیکھئے ہم نے مریضہ کو admit کر لیا ہے۔ رات کو انہیں سلا دیا جائے گا۔ شوہر حیات ہے؟“

”جی یہ ابو ہیں ہمارے۔“

”پھر یہی رہ سکتے ہیں۔ آپ دونوں جائیے۔ ہسپتال میں ایک آدمی سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے اندر لیبر رٹری میں لے جاتے وقت وہ پھر ٹویلد اور انہیں سے مخاطب ہوا.....“ آپ لوگ جائیں۔ بے ہوش کر کے ٹسٹ کریں گے..... کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

رات کے وقت مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لایا گیا۔ خاں صاحب کے سامنے بے ہوشی کا ٹیسٹ پھرا نہیں جانے کا حکم ملا۔ وہ رات انہوں نے کسی کرسی پر بیٹھ کر گزار دی۔

صبح کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو ڈاکٹر شارپ اور خاں صاحب پاس کھڑے تھے۔

رات کس وقت Bone marrow ٹیسٹ ہوا مجھے معلوم نہیں۔ یہی ٹسٹ جب میوہسپتال میں ہوا تھا۔ قدر تکلیف ہوئی تھی کہ الامان۔

ڈاکٹر شارپ نے خاں صاحب سے پوچھا ”آپ واپس کیسے جائیں گے؟“

”کوئی بس لے لیں گے۔“

”آئیے۔“

ڈاکٹر شارپ نے ہمیں اپنی کار میں بٹھایا اور لے چلا۔ کافی دُور جا کر بس سٹاپ ملا۔ ہمیں ایک صاحب سے مخاطب ہوا ”میں آپ کو گھر پہنچا دیتا لیکن مریضہ ٹسٹ کے لیے آچکا ہوگا۔ میں کسی کو انتظار کرنا نہیں سمجھتا۔“

ایک ہی ٹسٹ کے دوران دو تجربے ہوئے۔ سفر نے بغیر کسی معذرت کے اشتیاق کی کسی بات کا تو نہیں دوسری بار یوں لہو کا سیمپل لیا جیسے کسی جانور کا لہو نکال رہی ہو اور کسی ٹسٹ کے دوران ڈاکٹر شارپ جیسا ہمدردی کا ہر قسم کا گلہ دھو ڈالا۔ Generalities کے ساتھ Exceptions ہمیشہ رہتی ہیں۔ سائنس کے اصول بھی اس سے نہیں۔ ہم افراد کے اختلاف سے نہیں ان کے Behaviour کے عمومی رویے سے قومی مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور غالباً یہاں کسی قوم کو سمجھنے کا بہترین طریقہ ہے۔

کچھ چینی بھی تھکنو کام چورا اور بھگوڑے ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر وہاں محنت کا راج ہے۔

جاپانی لوگ شائستہ مہذب اور دوسرے کے آگے کمر جھکا کر تعظیم کرنے کے عادی ہیں لیکن اس عادت کے ساتھ ساتھ ایسے افراد بھی ضرور ہوتے ہیں جو بد تمیز تھو تھو کرنے والے اور آپ کو نکلے نڈ بٹھنے والے ہوتے ہیں۔

لندن میں اب لہذا قیام ممکن نہ تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر شارپ کی رپورٹ ویسی ہی تھی جو ڈاکٹر جی نے دی تھی۔ ان ہی دنوں میں ہمیں امپیریل کالج نے مدعو کیا۔ یہ بھی انٹرویو کی شکل کی ملاقات تھی۔ لندن میں ہمیں

بے بسی سے آئے تھے لیکن یہاں وہ گرما گرمی تھی جو اردو مرکز کی محفل میں تھی۔ پھر بھی ہماری انا کے لیے یہ شام بھی بے بسی کی بخش تھی۔

اسی سفر کے دوران ہماری ملاقات ایک بڑے ایکٹریڈ سے بھی ہوئی۔ اس نے پاکستان میں خاں صاحب کے نئی ڈراموں میں شرکت کی تھی۔ اس کے گھر ایک معرکے کی دعوت ہوئی جس میں چند مقامی ایکٹروں سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ہمیں ”سیکنڈ اور سنڈریلا“ کا ٹیپ بھی دیا جسے ہم نے انیس اور ٹیپ کے ہمراہ دیکھا۔ اسی قیام کے دوران Ingman Bergman کی Autumn Sonata دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا اور ہم ورلڈ کلاسک بنانے والے ایک گھرانے سے پہلی بار متعارف ہوئے۔

لوگوں کی اتنی ساری محبتیں سمیٹ کر جب ہم لاہور کے ایئر پورٹ پر واپس لوٹے تو عجب طرح کی ادا اسی ساتھ تھی۔ صرف ڈراما یورگازمی لے کر موجود تھا۔

گھر کا کالہ پھانک کھلا۔ ہم اندر داخل ہوئے اور پھر لاہور کے روزمرہ کی لپیٹ میں آ گئے۔

سفرِ دراوڑ

پتہ نہیں کیا تحریک تھی جس کی بنا پر ہم لوگوں نے قلعہ دراوڑ کا رخ کیا۔ اس سفر میں ہم دونوں کے ہمراہ جیلہ ہاشمی بھی شامل تھیں۔ اس قلعے کی حیران کن بات یہ تھی کہ سارے کا سارا مٹی سے بنایا گیا تھا۔ فلگمری کے علاقے میں ایسا پختہ اور پختہ مٹی آپ قلعہ دیکھ کر ہم سب حیرت میں ڈوب گئے۔

اتنی ساری یادیں دُھندلا گئیں لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس قلعے کی تصویر کبھی کبھی آنکھوں میں گھومتی

ہمیں دراوڑ کے قلعے کے علاوہ ایک اور رانی کوٹ کا قلعہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تب ہم حیدرآباد میں مقیم تھے۔ وہاں کے کچھ ادیب ہمیں رانی کوٹ کا قلعہ دکھانے لے گئے۔ سارا قلعہ دیکھنا ممکن نہ تھا اس لیے ہمیں ایک کتابچہ بھی عطا کر دیا گیا۔ قلعے کا حسن کچھ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں کی پرانی عمارت اور آثارِ اصنا دیدنی تھیں۔ ساتھ بڑا سوتیلا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ ایفٹینٹ کرنل (ر) خواجہ عبدالرشید مرحوم نے رانی کوٹ کے قلعے پر ایک اہم کتابچہ ”پہرہ قلم کیا تھا جو“ اقبال ریویو“ (1965ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس قدیم قلعے پر یہ تحریر اہم معلومات کی حامل ہے۔

سفرِ اوسلو

13 اگست 1983ء کو پورے ساڑھے تین بجے صبح آدھی رات کو ہم اوسلو ہوائی ایئر پورٹ Forne Bu پر پہنچے۔ یہاں چند لوگ ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں Grandvig Raguar Segard کے علاقے میں پہنچا دیا گیا جو سمیاگلی سے مشابہ ہے۔ شام کو یہاں کے ادیبوں نے پاکستان کے یومِ آزادی کو جشن کی صورت منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ”رخاں صاحب آزادی کی اس Celebration میں صدر تھے۔

شام کو ہمیں قیصر سعید اُس کی بہن عذرا درانی، سلیم بیگ اُس کی بیگم شہناز لینے آئے۔ یہ فنکشن رائٹرز یونین نے ایک بہت عالیشان محل میں کرایا۔ اس میں مہمان خصوصی یہاں کی منسٹرف جینس تھی۔ ہمیں آزادی کی مبارک دی اور

بڑے تپاک سے پیش آئیں۔

اب تقریباً رو نمائی آزادی کے فنکشن ہونوں میں مل جل کر باہمی ستائش کے پروگرام عام سی بات ہے۔ تب یہ معاملات اتنے روزمرہ کا معمول نہ تھے۔ خاں صاحب نے ایسی تقریر کی کہ ہال میں موجود تمام لوگوں نے کھڑے ہو کر داد دی۔ ہال بھرا ہوا تھا اور سائیڈوں پر کئی لوگ کھڑے تھے۔ پاکستانی تو موجود تھے ہی لیکن اس شام ناروے کے بھی اتنی تعداد میں آئے کہ ہم حیران رہ گئے۔

جب میری باری آئی تو میں نے تقریر میں کہا کہ کوئی معاشرہ بھی جب تک تو ازن اختیار نہیں کرتا، اس کو نہیں ہو سکتی۔ آزادی اور Cooperation دونوں میں Balance نہ ہو تو انسان مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار ہے۔ مغرب نے اپنے معاشرے کی بنیاد آزادی بنائی ہے۔ یہاں مرد اور عورت اس قدر آزادی کے خواہاں ہیں کہ عورت کا دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ممکن نہیں رہا اسی لیے شادی کا ادارہ بے کار ہو گیا ہے۔ بچے چھوٹی عمر سے خود مختار ہو کر گھر چھوڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ زسری میں ان کے گلے میں گھر کی چابی لٹکا دی جاتی ہے۔ جو نبی بچہ گھر چھوڑ کھول کر اندر جاتا ہے، فریج سے دودھ نکالتا ہے، Cereals ڈالتا ہے اور کھا کر ہوم ورک کرنے لگتا ہے۔ بیٹے باپ کو ’بوڑھے گھروں‘ میں منتقل کر دیتے ہیں اور کمرس کے قریب ان سے ملنے کی گنجائش بنائی جاتی ہے۔

اس طرح حاصل کی گئی آزادی سے جو تنہائی ملتی ہے اس کا لاکھ علاج تلاش کریں انسانی روج تھیں اور دھرم شرق کا معاشرہ خاندانی روایات کا پابند ہے۔ یہاں دو تین پشتیں ساتھ رہتی ہیں۔ مشکلات ہوتی ہیں ان کو روگ، نفسیاتی، ذہنی اور قلبی بیماریوں کو اس طرح فروغ نہیں دیتا جس طرح مغرب میں اس کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فنکشن کے بعد ذرا تھا۔ اس کھانے پر میرے دائیں ہاتھ فن تھسین Finn Thiesen بیٹھے تھے۔ قرآن پاک کا ترجمہ ناروے میں کیا تھا۔ فن تھسین Indo i ravsk institut میں پڑھاتے تھے۔ Boks 1035 اور وہ اوسلو کے Blindern کے علاقے میں رہتے تھے خاں صاحب اپنے ساتھ ٹیبل پر نوٹس لکھے۔ Srennbly سے مصروف گفتگو رہے جو کشمیری زبان پڑھاتی تھیں۔ ان سے انہوں نے چند ناروے میں حروف لے لیے اور ان کو بلا تکلف استعمال کرنے لگے۔

خدا حافظ

Adjq

بادیو

السلام علیکم

morn

سون

شکریہ

thant

تھک

ساتھ ساتھ انہوں نے لڑکیوں کے پرانے اور نئے نام معلوم کیے۔ فیملی نام اور لڑکوں کے نام یاد کیے۔

لڑکیوں کے نئے نام

لڑکیوں کے پرانے نام

Anne

آنے

Eva

ہیو

Mona

مونا

Ingborag

انگم بورگ

Liv

لیو

Helma

ہلیما

Toeil	تھویل	Sigrid	سگریڈ
	فینلی نام		لڑکوں کے نام
Hansen	ہانس	Olav	اولاد
Olsen	اولسن	Knut	کھنوت
Petersen	پیترسن	Per	پیر
Berg	Berg	Hans	ہانس
Rud	رود		

لڑکوں کے کام

لڑکیوں کے کام

1- ہول اینڈریسٹورٹ

1- صفائی

2- فیکٹری

2- نرسری میں زبان کی تعلیم

3- صفائی

3- فیکٹری

4- ڈرائیونگ وکل ٹرانسپورٹ

4- دوکانوں پر کام

5- برانس

خاں صاحب اپنے سفر کو سونا بنانے میں مشغول تھے۔ میں ہمیشہ کی طرح حیرت میں تھی۔ تھسٹن نے اپنا تخلص لکھ کر دیکھا ہوا تھا۔ اس نے اسلام قبول نہ کیا لیکن قرآن پاک کا ترجمہ تارو تکلم میں کیا۔ یہ ناروے میں ہونے والا پہلا ترجمہ تھا۔ تھسٹن کئی آیتوں کو زبانی سنا سکتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ کس طرح اس شخص نے اتنا کام کیا۔ ساتھ ہی میں خاں صاحب کی تفصیل پسندی پر بھی حیران ہوئی۔ انہوں نے اس کے ساتھ آٹھ دنوں کی ڈائری تیار کی جو آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں۔

### خاں صاحب کی تحریر سے اقتباس

ایک خوبصورت گھر میں ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد مجھے اپنا ہوائی سفر یاد آ گیا۔ پچھلے دنوں دنیا میں ہوائی زندگی کے سوال پورے ہونے پر بڑے فنکشن ہوئے۔ سواری کے جہازوں اور فوجی جہازوں کا ڈسپلے ہوا اور ہم نے اخباروں میں وہی پرائیے ایسے جہاز دیکھے جو پہلے نظر سے نہیں گزرے تھے..... میرے ساتھ ہوائی جہاز کا رشتہ بڑا پرانا ہے مگر اتنی ہی بددستی کے باوصف ہم میں گہری مناسبت پیدا نہ ہو سکی۔ 1947ء میں پاکستان بننے کے دوسرے ہی مہینے میں رملیفو جی ٹیپ میں ہیڈ کلر کی کے عہدے پر فائز تھا.....

گرمیوں کی چھیٹوں میں روم سے میڈرڈ گیا۔ میں تو سپین پہنچ گیا مگر میرا سوٹ کیس کہیں اور چلا گیا۔ کمپنی میں نے کہا آپ کا بیگ آپ کے ہوٹل پہنچا دیا جائے گا۔ میں ہوٹل کا نام نکھوا کر ہوٹل آ گیا۔ سارا دن تین کپڑوں میں گزارا۔ رات کو زیر جامہ میں سو گیا۔ اگلا دن پھر ایسے ہی۔

کپڑے دھونا..... قرطبہ کا سفر لاری میں صبح منہ اندھیرے چل کر سہ پہر قرطبہ پہنچا۔ وہاں تین دن قیام میں

کپڑے نہیں دھوئے۔ مسجد میں دو وقت آنا ہوتا لیکن کپڑے دھونے کی ضرورت نہ تھی کہ وہاں جماعت ہی نہ ہوتی تھی۔ سامان نہ ہونے کی بدولت آزادی۔ بھلا ہوا میری گھگھری ٹوٹی۔

واپسی سفر: بیٹنگروالے سے کہا اس کے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔

روم میں گھر پہنچ کر دیکھا میرا سوٹ کیس پہلے سے موجود تھا۔ میں پھر چیزوں میں اور سامان میں گھبرایا۔

سفر (اوسلو)

سن 1983ء میں Writers' Union نے مجھے اور خان صاحب کو اوسلو مدعو کیا۔ ناروے کے اس شہر کی عمارتیں گویا آئینہ خانہ تھیں۔ سڑکیں دھلی دھلائی لوگ شانستہ سفید اور نرم طبیعت تھے۔

بہت سے ادیبوں سے بھی واقفیت ہوئی لیکن زبان آڑے آئی لیکن Nelga Uafsen کو ہم اپنی چوڑی چوڑی چٹائیوں میں ساتھ لے آئے۔ اس سے Trolls کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ وہ

اور اس کی کچھ نظمیں انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں۔ ناروے کے لوگ روپ میں Trolls بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ٹروڈز ایک قسم کی روہیں ہیں جو انسانوں کی مشکل میں امداد فیسی کے طور پر اچانک نمودار ہو جاتی ہیں۔

مشابہت پریوں سے ہے اور وہ کسی Fairy God Mothers کی طرح انسان کو دکھائی پڑتی ہیں۔ ہر خطے کی روحانی امداد کی تقسیم کرنے کا خواب ضرور دیکھا ہے.... تاریخ گواہ ہے کہ جغرافیائی تقسیم کے باوجود اس عجیب قسم کی مماثلت ہے۔

Trolls ایک نوعیت کی دیوانائی مخلوق ہیں۔ جیسے جن اور پری کا تصور ہمارے ادب اور لوگ کو

ہے۔ ان ٹروڈز کا کام انسانوں کی مدد کرنا اور مشکل وقت میں اشارے کنارے سے انتہا کرنا ہے۔

یہ نظمیں قابل سٹر کی دہائی میں لکھی گئیں اور مجھ تک 1983ء تک پہنچیں۔ یورپ کے یہ لوگ مشین

کی برکات اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی سے دنیا میں سب سے پہلے آشنا ہونے۔ ان کی برف پر انسانی

قتل سے نہیں بلکہ انسان کے آئیڈیلز کی ٹوٹ پھوٹ سے بہہ نکلیں۔

میں نے یہ نظمیں اس لیے پسند کیں کہ ابھی ہم نے Perfection کی دوز میں حصہ نہیں لیا تھا۔

کے آگے بیٹھ کر کاررئیس سونامی کے سیلاب زمانے بھر کے اشتہار نہیں دیکھتے تھے۔ ہمارے بچوں نے سکھ ڈیل کرنا نہیں سیکھا تھا۔ ہم ابھی دیہات کے سوئے ہوئے کلچر اس کی جہالت رسم و رواج مذہب اور اس کی وجہ سے سکون کے آشنا تھے۔

جس کیفیت سے گزر کر یورپین ادب اور ہیگلے جیسے نامعروف شاعر کی نظمیں وجود میں آئیں یہ

بیسویں صدی کے آغاز میں یا اس سے کچھ ہی دیر پہلے ملا۔ مشرق کی سخت زمین میں ہل چل رہا تھا۔ تبدیلی آ رہی تھی۔

لیکن ابھی ہمیں شعوری طور پر اس کا کھنی احساس نہ تھا۔

1985ء میں جب ہم انگلینڈ سے لوٹے تو ان دنوں میری صحت کا معاملہ اتنا گڑبڑ تھا کہ خاں صاحب کے





تقلید نہیں۔ بابا امید کا جو دیا جلاتا ہے..... جس اگر بتی کا مشام انگیز دھواں چھوڑتا ہے کیا وہ قابلِ نفرین ہے۔ سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں کے چہرے دیکھے جو کسی مزار سے باہر نکلتے ہیں۔ جھولیوں میں ہاتھوں میں باسی پھول کھانے کے تمام مصیبتوں کے باوجود چہرے پر امید کی کرن..... جو صلے کی چمک..... چکروں میں پھنسے ہوئے نادار انسان کے لیے کیا یہ کم آسودگی ہے؟“

اب ڈاکٹر صاحب نے سنجیدہ سا پکا سامنہ بنا کر کہا..... ”اور وہ جو شرک ہے..... اللہ کی ذات کے ساتھ صلہ ملانے کا گناہ..... وہ جو دھواگے باندھتے ہیں۔ مزاروں پر منتیں مانتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کی آس لگاتے ہیں۔ وہ سارا تو شرک ہے..... ہے نا.....“

”لیکن ڈاکٹر صاحب..... پھر انجو پلاسٹی ختم..... اب میں چھتا ہوں۔“

ڈاکٹر زبیر حیران ہو کر بولے ”ہیں ہیں وہ کیوں؟“

”میں بھی شرک کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے علاج سے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ حالانکہ یہ سب مجھے

مجھے سب کچھ اللہ پر چھوڑنا چاہئے۔“

”لیکن اونٹ کا گھٹنا باندھنا چاہئے اشفاق صاحب!“

”غریب لوگ بھی صرف گھٹنا باندھتے ہیں۔ کچھ واقعی بابے کو خدا سمجھتے ہیں اور حاجت روائی کے لیے

ہیں..... لیکن یہ ان کی مایوسی کی آخری سٹیج ہوتی ہے..... وکیل اور ڈاکٹر ب کے نعم البدل ہیں۔ ان کی طرف سے

کمرے ہی کرے۔ ایسے ہی بابا ایک رُخ سے سائل کا حل ہیں۔ رہا شرک کا معاملہ تو یہ رب اور بندے کے درمیان

ہے۔ ہمیں..... اس کی فکر نہ ہونی چاہئے..... ہاں جی تو کون سا Anesthesia تجویز کرتے ہیں آپ؟“

خاں صاحب جانتے تھے کہ گفتگو اس سے آگے ڈاکٹر صاحب کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے تو

پتہ نہیں خاں صاحب بابے تھے یا نہیں تھے۔ وہ کشف و کرامات کے متعلق کچھ علم بھی رکھتے تھے کہ

نے انہیں نمازوں کی پابندی اور وظائف میں بھی زیادہ گھرے ہوئے نہیں دیکھا..... ہاں خلق میں رلے

دل نوازی و دلداری اور مہمان داری میں وہ خوب ماہر تھے۔

اگر آپ کبھی کسی ڈیرے پر گئے ہوں تو آپ کو مظلوم ہوگا کہ بابے ہمیشہ میل جول پر اصرار کرتے ہیں

قائم رہیں۔ میل جول میں کمی نہ آئے تو کبوتر کبوتروں کی ہمرکابی میں پلے گا۔ کوئے اپنے جیسے کوئے تلاش کر لیں گے

زانی جوئے باز کو اپنے مطلب کی صحبت مل جائے گی۔ نیکو کاروں کی ہمراہی میں گناہ تو سرزد ہوتے رہتے ہیں

گھڑی ڈور نہیں ہوتی۔ انسان نیک عمل کے بعد اتراتا تو رہتا ہے لیکن اس شیخی پر احساسِ جرم بھی جلد یا بدیر ہونے لگتا ہے۔

خاں صاحب بھی میل جول پر اصرار کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک خاص خوبی یہ بھی دیکھی کہ جو ان سے

جس کو ان کی ذرا سی قربت نصیب ہوئی جو کوئی ان کی صحبت سے فیضیاب ہوا وہ یہی احساس لے کر اٹھا کہ

صاحب کو جانتا ہے۔ وہی ان کے قریب تر ہے اور اسی کی راہ خاں صاحب دیکھا کرتے ہیں۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جو بھی ان کی یاد میں شریک ہونے کے لیے آیا اس نے ایسی

سے زیادہ قریب کوئی تھا ہی نہیں، جیسے وہ مقرب خاص انہیں جانتا تھا باقی سب تو محض حاشیہ آرائی کیا کرتے تھے۔ جس سے وہ گلاس بھر سیر ہوئے، جنہیں تو اتر سے نصیب ہوا وہ جل تھل کی کیفیت میں یوں آئے جو ان کے ساتھ شریک بنے انہوں نے بارش میں بھگینے کا سا احساس پایا۔

”زاویہ“ دیکھ کر تو یوں احساس ہوا کرتا ہے جیسے وہ غیب میں بیٹھے ناظرین کا دل موہ لینے میں ثانی نہیں رکھتے تھے وہ لوگ جو منہ در منہ فقط ایک بار ملے انہیں بھی یہی اعتراف کرنا تھا کہ وہی خاں صاحب کے قریب تھے.....

دوسری خوبیوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن میل جول کی افادیت اور لنگر کھلانے پر ان کا اصرار ہوا کرتا تھا۔ غالباً باپے جانتے ہیں کہ انسان دو ضرورتوں کے آگے نہتا ہے جنسی آسودگی اور پیٹ کی بھوک..... ان دو چیزوں کو پورا کرنے والا احسان کرتا ہے اور باسانی رابطہ قائم کر دیتا ہے۔ جنسی آسودگی کے معاملے میں تو باپے شرع کی سماعت سے ہیں، لیکن کھانے کے بارے میں ان کی فراخ دلی کا کوئی جواب نہیں.....

اہتمام کے بجائے انتظام کے قائل ہوتے ہیں۔ جو کچھ گھر پر موجود ہے اس میں مروی جانے اسراف کرنے کی آرائش کے ساتھ کھانے پلانے کی شرط نہیں۔ اگر گرم روٹی اور اچار مہیا ہو جائے تو یہی لنگر ہے اور بھوکے کو کھانے سے..... امیر کے لیے دال چپاتی اور غریب کے لیے مرغی گوشت لنگر کی اعلیٰ قسم ہے کہ دونوں کے دسترخوان پر یہ کھانے ہوتیں۔

ڈاکٹر زبیر کے ساتھ جس صبح انجو پلاشی کا مرحلہ تھا اُس دن میں نے دیکھا خاں صاحب قدرے متفکر تھے۔ انکی طبیعت کج میں تھی۔ خاں صاحب اشرار اور میں ہمیشہ کی طرح میوہ پھال پہنچے۔ اشرار ابو کے ساتھ تھیٹر کے اندر چلا گیا۔ ڈاکٹر زبیر بھی میں اوٹ کر کے بٹھا دیا گیا۔ ڈاکٹر زبیر ہمیشہ کی طرح مجھے نا دیدنی منظر سے بچانا چاہتے تھے اس لیے اندر تھیٹر کی ٹیبل کے پاس نہ لے گئے۔

میں نے ہمیشہ کی طرح واقعہ سے کوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں اور ایک مرتبہ بھی اُس سکرین پر نظر نہ ڈالی، جس پر کھیل پینٹ آپریشن کا منظر چلا آ رہا تھا۔ میں ہمیشہ سے چھوٹے چھوٹے خطرات کا مقابلہ آنکھیں کھول کر اور بہادری سے کرتا ہوں لیکن جو نبی معاملہ میرے بس کا نہیں رہتا میں اس سے ایسی چشم پوشی کرتی ہوں گویا طوطا چشم ہوں..... غرضیکہ آپریشن ہو گیا۔

لیکن اس کے بعد کچھ ستم کی بدولت لبو بس کرنا ننگ میں اترنے لگا اور ساری ننگ لبو لبان نظر آنے لگی۔ میں جب انہیں بہت تکلیف تھی اور ڈاکٹر جواد اور ڈاکٹر زبیر بہت متفکر تھے وہ نہ تو فکر مند ہوئے نہ کسی کو پریشان کیا۔ کھانے کو بچا کر کے پڑے رہتے۔ وقت کا انتظار کرتے اور شاید دل ہی دل میں لبو کے رُک جانے کی راہ دیکھتے۔ انسان طرح صبر کو ڈھال کی طرح استعمال کرتا ہے اور کیسے واویلا مچائے بغیر مشکل کا وقت گزار سکتا ہے یہ ان ہی کی ترکیب ہے۔ کچھ میں آیا در نہ منہ پر ایک دانہ نکل آنے پر میں نے لڑکیوں کو روتے دیکھا ہے۔

آخری دنوں میں جب ان کا وزن لبلبے کے کینمر سے گھٹ رہا تھا وہ عجیب قسم کی بے بسی میں مبتلا تھے۔ مجھے علم تھا

کہ وہ جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کی قوت مدافعت رکھتے ہیں۔ کچھ اور فکر تھی جس کا اظہار وہ کرنا نہ چاہتے تھے۔  
کی پرائیویسی میں دھکم دھکا بغیر دستک دیئے داخل ہونے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔

کبھی کبھی وہ آنکھ کے کونے میں جمع شدہ آنسو سینے کی کوشش کرتے، لیکن اندرونی کرب اتنا تھا کہ  
آتے اور کانوں کی جانب رسنے لگتے۔ ہم نے ان کے سامنے کبھی کینسر کا ذکر نہ کیا تھا لیکن غالباً وہ ہم سب کے  
بھانپ چکے تھے اور بھلے ہی جانتے تھے کہ جس رسولی کا ڈاکٹر بلال نے سرسری ذکر کیا تھا 'Malignant' ہو گا۔  
ہوگی۔

رات کے پچھلے پہر تقریباً ساڑھے تین کے لگ بھگ میں جوس کا گلاس لے کر ان کے پاس بیٹھی تھی۔  
انگلیاں ٹھنڈی بن گئیں۔ میری تسلی کی خاطر وہ مچلے بن کر سو رہے تھے۔

”یہ پی لیں؟“

”کیا؟“ بڑی عمدہ ایکٹنڈ کے ساتھ خاں صاحب نے آنکھیں کھولیں۔

”جوس..... بڑا اچھا ہے۔ مزے دار۔“

”ضرور ہوگا۔“

”ہی نہیں۔“

”تم پی لو..... میرا جی نہیں چاہتا۔“

”Ensure ناؤں؟“

”ناں رہنے دو۔“

ان کی آواز نحیف تھی۔

”سنو تدمیر! ایک بات کرنا تھی تم سے، یہ نہیں تمہیں سمجھ بھی آئے گی کہ نہیں..... میرے دل پر کیا ہے۔“

”آپ کوشش کر دیکھیں شاید.....“

”ویسے تو تم بہت ذہین ہو لیکن یہ تمہاری فیلڈ نہیں۔ عارف دنیا کو ایسی باتوں پر وقت بھی

چاہئے۔“

اس وقت چپ رہتا ہی بہتر تھا ورنہ گفتگو کے بہاؤ میں پھر ڈکا لگ جاتا۔

چند لمحے ٹکھے کی آواز آتی رہی

”جب کئی دن قبض رہے تو آدمی کتنے علاج کرتا ہے۔ تر پھلا، اسپغول..... مجو نہیں استعمال کرتا ہے۔“

آرام نہ آئے تو لالہ Duphalac بھیج دیتا ہے۔ فروٹ سالٹ الکا سلسمز لیتا ہے..... کھانے پینے کو وقت

استعمال کرنے کے بعد باقی پھوک کو جسم اپنے اندر پناہ نہیں دیتا۔ فضلہ رتج کے لیے جسم سٹور ہاؤس بننا نہیں چاہتا۔

صحت کی جس قدر input ضروری ہے ویسے ہی اس کی output کے بغیر آدمی بے چین ہو جاتا ہے۔ سمجھ رہی ہو گی

نہیں کرتے ڈاکٹر لوگ پیٹ انٹریاں صاف کرنے کے لیے، خاص کر آپریشن سے پہلے تو انیا تک بدو بدو

”جی..... لیکن کیا؟“

”ہم سمجھتے نہیں روح میں جو غلاظت جمع ہو جاتی ہے..... وہ وہ وہ.....“ اچانک وہ چپ ہو گئے۔ اُن پر نقاہت

برے اعمال کے بعد تو یہ روح کو دھو دیتی ہے..... نماز بھی تو غلاظت اٹالنے کا طریقہ ہے۔ روزہ صدقات،

”روحانی قبض کا علاج اتنا آسان نہیں قدسیہ بیگم..... برے اعمال کے بعد جو احساسِ جرم انسان پر غالب آتا ہے اسے کام کی چیز ہے..... جی احساسِ جرم کے باعث بسا اوقات ایک ہی جست میں انسان چور سے قلمب بند جاتا ہے۔ تو یہ کہ آنسو روح کی غلاظت دھو ڈالتے ہیں..... لیکن میں بد اعمال کے متعلق نہیں سوچ رہا۔ میں..... میں اس سے فرحت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا جو اتنی آسانی سے اچانک اللہ کے فضل سے مل جاتی ہے۔

میں تو سوچتا رہتا ہوں جو لوگ نیک عمل کرتے رہتے ہیں! جن کی ساری سوچ خدمتِ خلق میں گزرتی ہے! جن کی سرزد ہی نہیں ہوتی۔ ذرا تہہ چاہو تو وہاں بھی اکٹھا ہو جاتا ہوگا..... قبض سے تو وہ نیک لوگ بھی خالی نہ ہوں گے۔“

”ولیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو نیک عمل ہی کر رہا ہے اسے قبض کا کیا خدشہ؟“

وہ ہلکا سا مسکرائے۔ اپنی سنی سی دہنیشیں مسکراہٹ۔

”زندگی جاہد نہیں جان من..... اگر نیک اعمال کرنے والا نیک آدمی ایک ہی سطح پر رہ گیا تو اس کے درجات

کے حصول گے۔ وہ ارتقاء کی منزلیں کیسے طے کرے گا؟ وہ تو قبض کی حالت میں مرجائے گا۔“

یہ بات میرے لیے سمجھنا مشکل تھی کیونکہ میں اندر سے متفق نہ تھی۔

”نیک عمل کرنے والے کے اندر ہولے ہولے تکبر کی غلاظت جمع ہوتی ہے قدسیہ..... نماز روزے کا پابند

کا شیدائی..... اپنے آپ کو بچا بچا کر چلنے والا..... دوسروں کے ساتھ اپنا مقابلہ کر کے احساسِ برتری میں جانے

لگتا ہے ہولے ہولے غلاظت جمع کرنے لگتا ہے۔ اس کی انا میں خود پرستی کے کیڑے چلنے لگتے ہیں۔ اگر نیک بندے

رحمت نہ ہو تو پھر یہ نفس ہی ابلیس کا ساتھی بن جاتا ہے اور تکبر جو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے اور غالباً شرک

سے ہی جنم لیتا ہے وہ اس کے خمیر میں داخل ہو جاتا ہے۔ جیسے سارا کھایا پیا ابو میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ

خوبستائی، من مانی قلب کو سیاہ کرنے لگتا ہے..... احساسِ جرم اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا..... پھر یہ روحانی قبض کیسے

ہو سکتا ہے..... تم نے فرانسس انا طولی کی تھائیس پڑھی ہے؟“

”جی جوانی میں کبھی پڑھی تھی۔“

”بس دعا کرو مجھے اس روحانی جلاب کی ضرورت نہ پڑے۔ میں کسی تھائیس کا محتاج نہ ہو جاؤں؟“

میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ خدا کے لیے اپنے پر رحم کریں..... اپنے آپ کو دوہری تکلیف میں مبتلا نہ

کریں۔ یہ جسمانی کرب کافی جان لیوا ہے۔“

”تم بڑی خوش نصیب ہو قدسیہ! اللہ نے تمہیں سپاٹ راستوں کا مسافر بنایا ہے۔ تم بڑی سادگی اور سادگی سے زندگی بسر کر لیتی ہو..... میرے لیے..... میرے لیے دُعا کرو..... میں نیک ہوں اور نیک اعمال میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔“

”آپ وِرجو (virgo) ہیں ناں..... ہر وِرجو کی عادت ہوتی ہے تفصیل میں جانا..... باریک بینی سے جاننا.....“

چھوٹی تفصیل کو مانجھتے رہنا۔ پلیز تفصیل میں جانا چھوڑو۔“

”بس تم دُعا کرو۔“

”کردی۔“

”ایسے نہیں حاجی امداد اللہ کی دعا پڑھ کر..... سب کچھ اوپر والے کا فضل ہے۔ بد اعمال تو روح میں جہنم جاتے ہیں۔ یہ الوکی پٹھی نیکی بھی فضل کے بغیر کچھ نہیں..... اپنا قد بڑھانے، شیخی مارنے، سچے کبھے لوگوں کو سمجھانے، دکھانے اپنی مثالیں پیش کرنے کے لیے جو نیک اعمال کیے جاتے ہیں وہ بھی انسان کا بھٹہ بھٹا دیتے ہیں۔“

”کردیتے ہیں۔“

”آپ نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر آپ شرمندہ ہوں۔“

”نیک بی بی نیک مرد میں علم، انکساری عاجزی نہیں رہتی۔ وہ خلق سے اپنے آپ کو بہتر سمجھنے لگتا ہے۔“

فرشتہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے پرائیویسی جیسے ہونے لگتے ہیں..... لیکن تم نہیں سمجھو گی..... تمہاری روح مانتے ہیں۔“

”ہے..... تم صرف دُعا کرو۔“

”جی کر دوں گی۔“

”ایسے نہیں حاجی امداد اللہ کی کان فیکو ن پڑھ کر..... پوری توجہ کے ساتھ۔“

”ضرور جی۔“

آج کے تمام قابل ذکر ادیب ساٹھ سے اوپر ہو چکے ہیں اور اس عمر میں پہنچ کر انسان اگر ماضی کی طرف لوٹتا ہے تو اس کے دل میں ایک ایسے مقام پر ہیں جہاں جوانی کا احساس تو رہتا ہے لیکن ولولے، جوش، Motivation کچھ کر گزرتا ہے۔“

نہیں رہتی۔“

آج کا ادب وہ لوگ تخلیق کر رہے ہیں جو زندگی سے disillusion ہو چکے۔ سچ پوچھتے تو فلشن لکھتے ہیں۔“

دلیبری کی فضا میں پلتا ہے۔ افسانے، ناول، خوف اور فکر سے لبریز ہیں۔ جب ادیب ماضی کی طرف لوٹتا ہے تو اس کے دل میں ایک بار کینٹیلی سے نکل جانے کے بعد اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔“

یادیں پچھتاوے کا روپ دھار لیتی ہیں۔ مستقبل کی طرف نگاہ اٹھانے پر فنا یقینی ہے۔ باقی سب کچھ

باید..... راضی برضا ہونا نہیں جاتا۔ رجائیت کو زندگی چاٹ جاتی ہے۔ اس بے یقینی میں ادیب ایسا فلشن لکھنے پر مجبور ہے

میں خوف، مکر اور زیاں کا احساس خیر کی طرح رچا بسا ہے۔“

لیکن اشفاق احمد نے ہمیشہ ایک اُمید کو اپنے ساتھ رکھا۔ وہ بھی ساتھ سے اوپر ہو گئے۔ اُن کے قوائے مضحل  
 کے جسموں ڈاکٹروں، پیروں کی دعاؤں کا آسرا لیا۔ لیکن ضرورت بشری تک اُن کی رجائیت کی جان بچانے والی کشتی  
 نہ تھی۔ وہ اس محبت تھی۔ وہ اس محبت کے ساتھ ہمیشہ Motivated رہے۔ اس تحریک نے انہیں کبھی شیطان کا دوست نہ  
 کیا۔ ہمیشہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کا درس دیا کرتا ہے۔ انہوں نے کبھی ماضی کو Nostalgia کی نگاہ سے نہ  
 دیکھی۔ موت کو فنا کا راستہ نہ سمجھا بلکہ یہ جانا آگے چلیں گے دم لے کر۔

پتہ نہیں اللہ کا نظام کیا ہے؟ ہم اپنے لیلیٰ علم کی ذور میں لگا کر لاکھ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم پر حجاب در  
 ہے۔ کسی کی ایسی دُھند چھائی رہتی ہے کہ آ رہا کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دعائیں کہیں مانگی جاتی ہیں مقبول کہیں اور ہو جاتی  
 ہیں۔ عراق میں مانگی جاتی ہیں افغانستان کا آسمان دعاؤں سے اٹ جاتا ہے لیکن اندھا دُھند وہ امریکہ میں اور  
 کوشش کے گھر پر برس جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اللہ ساری مخلوق کو واحد سمجھتا ہے اور جو فرد واحد کے ساتھ ہیٹ جاتی  
 ہیں۔ ساری انسانیت کا مقدر ہے۔

دعائیں افتخار عارف مانگتا ہے کہ کسی ایسے شخص کا ساتھ ملے جو مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو۔ میں تو اُس  
 محبت بولوں لیکن وہ ہمیشہ سچ کا دامن تھمے رہے۔ ساری وحشتیں جو لکھنے والے کا مقدر ہوا کرتی ہیں اُن کو برداشت  
 کرنا ہوا ہی ہو..... ایسی دعائیں افتخار سے گریاں مجھ تک پوری نمرتا کے ساتھ پوری ہو گئیں۔ خاں صاحب میرے لیے  
 بنے رہے جس پر زندگی کا ہر وار سبہ جانے کی صلاحیت بھی تھی اور حوصلہ بھی۔

پتہ نہیں اشفاق احمد کو زندگی سے بہت پیار تھا یا نہیں۔ وہ تو سب قزح کے سات رنگوں کی طرح تھے۔ میں جانے  
 Periscope تھی کہ مجھ سے گزر کر تمام رنگ یک رنگ ہو جاتے۔ خاں صاحب کے ہوتے ہوئے میں نے کبھی کسی  
 شہتہ دار مددگار کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ کبھی کبھی تو مجازی خدا کے ہوتے ہوئے اصلی خدا بھی یاد نہیں آیا اور شاید  
 حیرت کے باعث مجھ سے یہ نعمت چھین گئی۔

اشفاق احمد میں بغیر قریب ہوئے دوسرے کو قربت کا احساس دلانے کی بڑی خوبی تھی۔ وہ جس کسی کے ساتھ  
 تھے اسی وہم میں مبتلا کر دیتے کہ بس مجھ سے ہی اُن کا رابطہ ہے باقی سب تو اضافی تھے۔ لیکن ہر عمل کا ایک رد عمل  
 ہوتا ہے۔ اُن کی مخلوق نوازی بندہ پروری، نمگساری جو وہ اپنے ملنے والوں سے برتتے تھے اس کا رد عمل اُن کے بچوں  
 سے ہوتا تھا۔

ایک واقعہ یاد آیا۔ بریکلے پر وہ گرام کے تحت خاں صاحب امریکہ گئے۔ ابھی اشیر خاں بمشکل پاؤں پاؤں چلنا  
 تھے اور پہلا لفظ جو اُس نے بولنا سیکھا وہ ”بتی“ تھا۔ جب بھی دروازے پر کوئی دستک دیتا یا اُسے کسی چیز کی تلاش ہوتی  
 ”بتی“ کہتا بھاگتا آتا۔ خاں صاحب کو بچے چھوڑ کر بریکلے جانے کا بزار نچ تھا لیکن انہوں نے کبھی اس بات کا اظہار  
 اشفاق احمد نے اس بھاگتے ”بتی“ کہتے اشیر کو ریکارڈ کر کے اس کا ٹیپ محفوظ کر لیا۔

اشفاق احمد اندر کا موسم بتانے سے قاصر تھے۔ وہ بتی کی طرح چپ چپ گھلتے رہتے۔ غم کو لیمن ڈراپ کی طرح  
 پتہ ہے۔ کڑوی کافی، کرلیے کی بھیجا، ان سب کو اس کے Bitter Sweet ذائقہ کی وجہ سے وہ بہت پسند کرتے تھے۔

پھر ایک اور واقعہ ہو گیا۔

میرے بٹھے بیٹے انیس خاں نے ایک کبوتر کا پر مجھے پکڑا کر کہا..... ”امی! یہ میری طرف سے ابو کو تحفہ ہے۔ خط میں ملنا تھا کہ خاں صاحب نے ٹگری ٹگری پھرنا بند کر دیا۔ رنگ برنگی کلاس جس میں جیکولین کینیڈی بھی شامل تھے۔ کلاس کو خاں صاحب نے ان گنت کہانیاں سنا کر اپنا عاشق کر رکھا تھا، ان سب کو چھوڑ چھاڑو گھر لوٹ آئے۔ شاید ایسے لوٹنے کی لذت سے آشنا تھی۔

خاں صاحب بھی جہاں گئے کیسے ہی گم کیوں نہ ہوئے ہمیشہ لوٹ آئے۔ لیکن اظہار کی کمی نے خاں صاحب کو کبھی باپ کی محبت سے آشنا نہ ہونے دیا۔ لوگوں نے ہمیشہ ان پر ایسا قبضہ جمایا کہ بچوں کو علم نہ ہونے کا کہہ دے اور شفقت میں کتنی حدت ہے۔ جو لوگ کم وقت کے لیے ملتے تھے، جن کو اپنا وزن خاں صاحب پر منتقل کرنا ہوتا ہے، ان کو اپنے Catharsis کے لیے استعمال کرنا ہوتا۔ وہ اتنا وقت ہی نہ چھوڑتے کہ بچے ان کے قریب آسکتے۔ بڑے آدمیوں کا المیہ ہے۔

خاں صاحب کی تپائی پر بیماری کے دنوں میں یہ ورق پڑے رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھی پڑھے پڑھے لیتے تھے۔

## اشفاق احمد

از نور الحسن

اشفاق صاحب بڑی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔ ان کی رنگا رنگ تخلیق کاری نے عجب گل کھلائے۔ چھوٹے سے تھے تو انہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ اسے وہ خود ہی لکھتے، اس کی کاپیاں بناتے اور مکتبہ کے مسلمان جماعت دوستوں میں بانٹ دیتے۔

پاکستان پہنچ کر جب انہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ایم اے اردو کے دوران ہی ان کی ”ایک محبت سوانسے“ آئی۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ روم چلے گئے۔ واپسی پر خاں صاحب نے جلد ہی لکھنا شروع کر دیا جو پورے 39 برس آن ایئر گیا لیکن ان کی تخلیقی قوتیں ”تلقین شاہ“ کی سرحدوں کو پار کر گئیں۔ پہلے خاں صاحب نے ریڈیو پر ڈرامے لکھے پھر جو نئی ٹیلی ویژن 1964ء میں ہماری زندگی کا حصہ

نے اس میڈیا کو اپنالیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بڑی عمدہ کمپیوٹرنگ کی۔ ٹیلی ویژن کے افتتاحی پروگرام کی کمیٹی میں ان ہی کے سر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی موسیقی سے گہری دلچسپی نے ”نکھار“ جیسے پروگرام دیئے۔

”زاویہ“ سے تو آپ کی ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاں صاحب کی مختلف طبقتوں میں اتنی ہی رنگا رنگ ہے جس قدر ان کی شخصیت..... جو پڑھے لکھے افسانے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ تھے کہ خاں صاحب صرف افسانے لکھیں..... اور وہ بھی ”اُجلے پھول“ اور ”ایک محبت سوانسے“ جیسے۔ افسانے“ سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ جنہیں ”تلقین شاہ“ سے عشق تھا وہ انہیں کسی اور روپ میں دیکھنا نہ چاہتے تھے۔

”زاویہ“ ڈورڈور پھیلا اور الیکٹرونک میڈیا ہونے کی وجہ سے اس کی پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر چاہنے والا اپنی پسند کا تابع ہو کر مُصر تھا کہ صرف وہی ٹھیک ہے۔ لیکن آج تین سال گزر جانے کے بعد مجھ پر یہ خیال کہ خاں صاحب سے اُن کے چاہنے والوں کی وابستگی کم نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ قارئین ناظرین کی محبت ہے۔ محبت کا یہ جذبہ ہے جو کسی عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی برائی کی بیشی اونچ نیچ محبت کے سامنے بے معنی ہے۔ محبت کو

کسی نے خدا کا سب سے بڑا روپ کہا جاتا ہے۔

محبت کرنے والا محبوب کی خرابیاں نہیں دیکھ پاتا بلکہ اُن کو اپنی خرابیوں کی طرح قبول کر لیتا ہے۔ ڈیروں پر اسی نظر نظر آتا ہے اور خاں صاحب غالباً اسی محبت کی تلاش میں بایوں کے پاس آنے جانے لگے تھے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر زیادہ مان ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں کسی کو کسی اور کا قد چھوٹا کر کے کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی کلا جگتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ اُن میں یقیناً انسان ہونے کے ناطے خوبی اور خرابی دونوں کے دریا ساتھ ساتھ بہتے

یقیناً اُن میں جب مال اور حب جاہ کی طلب ہوگی لیکن وہ کسی صوفی کی طرح جہانِ نفس میں مبتلا رہتے تھے۔ میں نہیں۔ اُن کی زندگی میں ضروریات کو پختھی جھل کروہ کا نا ضروری نہیں۔ بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانا اہم تھا۔

پچھلے سال 4 ستمبر 2007ء کو برسی کے موقع پر پی ٹی وی والوں نے انٹرویو لیے۔ فرحان مشتاق پر ڈیو سرتھے۔ میں بھی تھے اور افسردہ صورت بھی۔ سارے ہی آپس بھرتے بہ چشم نم سٹوڈیو میں داخل ہوئے۔ فرحان مشتاق نے

کے شروع میں کہا.....

تین مرتبہ ایسے ہوا تھا

میرادل اُن کو دیکھ کے زور سے دھڑکا تھا۔

پہلی مرتبہ اُس وقت تھا جب لاہور ایئر پورٹ پر بونگ 737 کسی وجہ سے بڑے ایپرن کے بجائے جہاز Boy کے ساتھ تھا۔ پرانے ایئر پورٹ پر جہاں حاجی کمپ کی سفید رنگ کی چھوٹی سی عمارت تھی اُس کے بالکل سامنے ایک لمبا کمر تھا۔ اس ٹاور سے نکلنے والی زرد روشنی ہمیشہ مجھے ایک عجیب اُداسی بھرے رومانس سے بھر دیتی ہے۔ اسی ٹاور کے ذرا سے طرف بونگ 737 آ کے رُکا تھا۔ سیزھی والی گاڑی جہاز سے لگ چکی تھی۔ میں جب تک جہاز کے تینوں پہیوں میں سے ایک لگا کر سیزھی تک پہنچا مسافر اترنا شروع ہو چکے تھے۔ پھر اچانک وہ نظر آ گئے۔

میرادل زور سے دھڑکا

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ

جہاز کے دروازے کو چھوڑتے ہوئے بالکل ہولے سے اُن دونوں نے سیزھی پر قدم رکھا۔ میں جو نیچے زمین پر سے صحنہ صحنہ سے ذرا پیچھے مہوت کھڑا تھا دو قدم اور پیچھے ہو گیا۔ اشفاق صاحب نے بانو قدسیہ کی کلائی اس طرح تھامی ہوئی



تھی بالکل پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس نے کس کو سہارا دیا ہوا ہے۔ بانو قد سیدہ آپا نے سفید دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے نیچے اتر رہے تھے۔ زرد روشنی اور جہاز کے نیم تاریک بیک گراؤنڈ میں وہ دونوں اس وقت سے تھے جس طرح کسی سلطنت کا درویش بادشاہ خاتونِ اول کے ساتھ اترتا ہے۔ میرادل چاہا کہ ادھر شہنشاہ بیٹھ جائے۔ اترے ادھر میں پرڈو کول آفیسر کی طرح کڑکتا ہوا سیٹوٹ کروں۔ لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اشفاق صاحب نے ساتھ میرے قریب سے گزر کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں سٹوڈیو میں تھا۔ سنٹرل پرڈکشن یونٹ لاہور کی ڈپٹی مینیجر انجمن بھٹی نے مجھے کہا میرے کمرے میں اشفاق صاحب بیٹھے ہیں۔ انہیں سٹوڈیو میں لے آؤ۔

یہ دوسری مرتبہ تھا کہ میرادل زور سے دھڑکا تھا۔

میں انتہائی خوشی خوشی قدرے اضطرابی حالت میں کمرے میں پہنچا۔ ایک بوڑھا شخص کرسی پر بیٹھا بیٹھا تھا۔ اُس کی نظریں جیسے کسی سوچ میں تھیں۔ میں نے کہا ”سرا ریکارڈنگ کے لیے چلیں؟“ میں نے اشفاق صاحب کے سنگ 45 یا 50 سینڈ کی مسافت طے کی۔ کتنے سوال کتنی کتابیں کتنے الفاظ تھے جو میں پوچھ سکتا تھا۔ اُن کا مزاج بھی نہ پوچھ سکا۔

مجھے پروگرام منیجر طارق احمد صاحب نے بلایا اور ایک چھوٹی سی فہرست ہاتھ میں تھما دی کہ یہ انٹرویو کب

میرادل زور سے دھڑکا

یہ تیسری مرتبہ تھا

فہرست کے سب سے اوپر لکھا تھا۔ بانو آپا

میں نے جو کچھ اس انٹرویو کے دوران کہا حاضر خدمت ہے۔

میں نے خاں صاحب کے ساتھ زندگی کا ایک لمبا وقفہ گزارا۔ اُن کو بہت قریب سے دیکھا۔ فاسٹ کیا۔ بارہا یوں ہوا کہ مجھے اُن کے عمل، سوچ اور رویہ سے اتفاق رائے نہ تھا لیکن ایک بات میں گورنمنٹ کا بھی میں نے اتفاق کیا۔ جب ہمیں اکٹھے ایم اے اُردو کرنے کا اتفاق ہوا۔ خاں صاحب کی نیت ہر مقام پر بے داغ رہتی۔

کسی شخص کو سمجھنے کے لیے تمام تر تجربے، مشاہدات، تخیل، احساس کے باوصف اُس کی سمجھ نہیں آسکتی۔ کی سرچ لائٹ بھی پڑتی ہو تو انسان کے کونے کھدے ایسے رہ جاتے ہیں جن میں کئی خوبیاں اور خرابیاں چھپ جاتی ہیں۔ انسان کا پتھر اور دھات کے زمانے سے اب تک یوں چلتے چلتے آنا غالباً اسی گپت چھپے رازوں کی بدولت ہے۔ ہر مقام پر قلیل رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے اعمال کو تولنے جانچنے کے لیے نیت سے بڑا کوئی Catalyst نہیں۔ کبھی کبھی بد نیتی پر معمول ہوتی ہے اور کبھی کبھی راز بن جیسے لیرے بدی کے سرپر کا میانی کا سہرا لگا دیتے ہیں۔

اشفاق صاحب نے اُردو بورڈ میں سروس کی۔ یہاں کئی مانتوں کو ڈانٹا برا بھلا کہا ہوگا لیکن جتنے جتنے ڈسپلن کے تحت مارے باندھے کیا ہوگا۔ کبھی کسی کی اے سی آ خراب نہ کی ہوگی۔ اُن کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا

کچھوں کی مالی اعانت وہ کرتے رہے لیکن کبھی مجھے بھی نہ بتایا۔

انہوں نے ریڈیو ٹیلی ویژن پر کئی پروگرام کیے۔ یقیناً یہاں بھی آویزش کے سلسلے ہوں گے خاص کر ”تلقین“ کی ریکارڈنگ کے دوران کاسٹ زیر عتاب آتی ہوگی لیکن بعد ازاں اُن ہی کاسٹ کے بندوں کے ساتھ بیٹھ کر کتے پیٹے، خوش گپیاں جاری ہو جائیں۔ اگر اُن کی نیت میں کھوٹ ہوتا تو اُن کے جانے کے بعد اُن کے ساتھ کام کرنے کے لئے جنس اس طرح یاد نہ کرتے جیسے اب کرتے ہیں۔

گھر پر اُن کا رویہ ملازموں کے ساتھ ایسا تھا کہ جو ایک بار آ گیا وہ اُن کی زندگی میں پھر اُنہیں چھوڑ کر نہیں گیا۔ کتے بھی پڑ جاتی۔ سوال جواب کی نوبت کبھی نہ آتی۔ حجام، قصائی، دودھ والا، سہزی والا، غلامین جس طرح یہ لوگ اُنہیں کتے اور روتے ہیں اس کی مثال کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

اور اس کی سبکی وجہ ہے کہ اُن کی نیت آئینے کی طرح صاف تھی اسی لیے وہ تادیر کسی انسان سے ناراض نہیں رہے۔ رشتے ٹوٹ جانے پر حیشیتیں بدل جانے پر اپنا اپنا راستہ اور اپنا اپنا منہ لے کر رخصت ہو جانے پر بھی اُن کی نیت کبھی بدول نہ ہوتی۔ شاید اسی لیے وہ کبھی منافقت کے شکار نہ ہوئے۔ غلطی سرزد ہو جاتی۔ بڑی شرمساری سے اعتراف کیا۔ چھائی کر بیٹھتے تو سر جھکا کر بھیجی ہی مسکراہٹ کے ساتھ خوش ہو جاتے۔ اسی نیت کی بدولت نہ اُن کی تحریر میں کبھی کراہت یا نہ ہی زندگی میں۔

مجھے اُن کے برعکس دیہات سدھار کا اتنا شوق ہے دوسروں کو ٹھیک کرنے کا ایسا لپکا ہے کہ اپنے آپ کو ٹھیک کر کے مارے جہاں کو مشورے دیئے جاتی ہوں۔ مجھے خاں صاحب سے ایک گلہ ہے کہ جہاں انہوں نے مجھے لکھنے کی اتنی تعلیم دی وہاں مجھے بابوں کی یہ تربیت دیتے کہ جہاں نفس کیسے کرتے ہیں؟ اور ہر گرم و سرد میں اپنی نیت کے لیے لاکو سیدھا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟



## لوگ لوگ

### محمد یحییٰ خاں

محمد یحییٰ خاں کالے کپڑوں میں بلوں گلے میں موٹے ٹمنکوں کی مالائیں سجائے، لمبی لمبی زلفوں کے ساتھ چھپائے ایک عجیبہ روزگار شخصیت ہیں۔ ان کے اندر اور باہر واضح طور پر دورا سستے ہیں۔ پتہ نہیں یحییٰ خاں کون سا ہے۔ اگر وہ درویش ہے تو دوسرا ادیب کون ہے جو اس وقت پاکستان کے جملہ ادیبوں میں اتنے منفرد سائل کی حیثیت سے چوٹی پر ہے۔ اس کے ادب کا رجحان منہو کی طرح ایسے لوگوں کو رنعت بخشنا ہے جو سوسائٹی میں عزت کے قابل نہ سمجھے گئے۔ ان کی کہانیاں، مشاہدے سے زیادہ تخیل کی مرہون منت ہیں۔ یحییٰ خاں نے گلی گلی، دیس دیس ہر مسلک کے لوگوں سے دیکھا اور اپنے مشاہدے سے وہ ادب تخلیق کیا جو قاری کے لیے ہو شربا ہے۔

یحییٰ خاں کا بہت پہلے سے اشفاق صاحب سے ملنا ملنا تھا۔ وہ خاں صاحب کے ہیروں پر جھڑپ کرتے اور ان کی برائتوں کی تائید کرتے۔ لیکن خاں صاحب کسی اور سمت کے آدمی تھے۔ وہ پتہ نہیں لگتا کہ کیونکہ میرا خیال ہے سجدہ فقط اللہ کے لیے ہے لیکن خاں صاحب کسی اور سمت کے آدمی تھے۔ وہ پتہ نہیں لگتا کہ گناہی بوجھ بڑے شوق سے اٹھاتے۔

وجدان و حقیقت، سنی سنائی اور دن بیتی یحییٰ خاں کی کہانیاں ہر سمت کی کہانیاں ہیں۔ مجھے سب سے پہلے ان کی کتاب ”پیارنگ کالا“ کی معرفت ہوا۔ یحییٰ خاں نے فرمائش کی کہ میں اس کتاب پر کوئی رواں تبصرہ لکھوں۔ پڑھنے کے بعد میرے پچھلے چھوٹ گئے۔ اے کلاس ادب پر کوئی بی کلاس لکھاری کیسے لکھے اور کیا لکھے۔

اشفاق صاحب کے جانے کے بعد بہت سے لوگ میری دلجوئی کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک اور ان کے بیٹے بھی ہوتے۔ بہت جلد مصیبتوں کے مارے لوگوں نے یہیں ڈرائنگ روم میں یحییٰ خاں کے گھر کی عقیقت بنا لیا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ لڑکیوں کو سر پر دوپٹہ لینے پر مجبور کرتے۔ نئے عہد کی عورت اس پابندی سے حاصل کر چکی تھی۔ وہ لباس کے معاملے میں خود مختار تھی، نہ چھوٹی آستین کی قمیض ہی اسے کاٹتی تھی۔ نہ کپڑے بدل

پنے کا لباس۔

دوسری بات جو میرے لیے ناقابل برداشت تھی وہ میں نے یحییٰ خاں کو بتادی۔ وہ مجھے سجدہ کرتے تھے، اسی نے میں نے انہیں داستان سرائے آنے سے منع کر دیا۔ اب وہ کم کم آتے ہیں۔ پوٹلی کھول کر ملازمین کو ڈھیر سارے پیسے دیتے ہیں۔ مٹھائیوں کے ڈبے بانٹتے ہیں اور راضی برضا چلے جاتے ہیں۔

بابا محمد یحییٰ خاں ولد محمد عمر خاں، سیالکوٹ (موری دروازہ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے آبائی شہر میں چوتھی صحت (ناکمل) تک تعلیم حاصل کی۔ دو شادیاں کیں۔ ایک ناکام اور دوسری کامیاب۔ دو بیٹوں اور چار بیٹیوں کے مالک ہیں۔ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مثلاً من مندر۔ من مسجد۔ شب دیدہ۔ موم کی مورت۔ گل شہو۔ آؤ آہو۔ پیارنگ کالا۔

## مرزا ادیب

مرزا ادیب بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ اشفاق احمد مجھ سے بہت جونیئر ادیب ہے، اس سے کیا ملتا پھروں۔ وہ ہمارے گھر آتے تو ان کے آنے جانے کا پتہ نہ چلتا۔ ایک دوسرے مجھے بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ مرزا ادیب فٹنی پریم چند کی کنیگری کے ادیب ہیں اور ان کو ماڈرن تنقید کی تول بخوبی پرتولا نہیں جاسکتا۔

مرزا خاں صاحب کے جانے کے بعد بھی مرزا جی نے مجھ سے رابطہ رکھا لیکن احترام کے باعث میں اس میں بے سکتھی پیدا نہ کر سکی۔ یہ بھی عجب طور ہے کہ احترام بھی ایک بہت بڑا حجاب بن جاتا ہے اور رابطہ مضبوط نہیں ہونے پاتا اور حرام نہ ہوتو بھی رابطہ کھل کھا کر، دروپدی کی ساڑھی بن جاتا ہے جسے پیشناہر بندے کے بس کا نہیں۔ بس یہاں وہاں ہر نکتہ وزن کی ضرورت رہتی ہے جو رشتے ناظوں میں وقت کے ساتھ ساتھ مضبوطی پیدا کرتا چلا جائے۔ مجھے مرزا ادیب کی نقوش تہ تحریر بہ عنوان ”مٹی کا دیا“ بہت پسند ہے کیونکہ اس میں انہوں نے خود انتہائی دلچسپ اور خوبصورت انداز میں اپنے حالات زندگی بیان کر دیئے ہیں۔

## صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

صوفی تبسم 14 اگست 1899ء کو امرتسر (بھارت) میں پیدا ہوئے جہاں ان کے بزرگ کشمیر سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ والد کا نام صوفی غلام رسول اور والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ تھا۔ صوفی تبسم کا نام غلام مصطفیٰ رکھا گیا۔ صوفی تبسم نے جو عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں گزارا وہ 23 برسوں پر محیط ہے۔ 1931ء سے 1954ء تک وہ اس کالج میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے اور بے انتہا خدمات انجام دیں۔ ایک ڈرائیونگ سوسائٹی بنائی جس کے تحت شیکسپیر کے کئی ڈرامے ترجمہ کر کے

شیخ بھی کروائے۔ ڈرامینک کلب کے تحت شیخ کرائے گئے ڈراموں میں ”ساوان رین داسفہ“ اور ”خطرناک لوگ“ کے طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیکسپیر کے ڈرامے Mid-Summer Night Dream کا پنجابی ترجمہ ”ساوان رین داسفہ“ کے تحت سے کیا۔ Such men are dangerous کا اردو ترجمہ ”خطرناک لوگ“ کے نام سے کر کے صفدر میر اور رفیق بیگ سے ڈائریکشن، دلوائی۔ یہ ڈرامے اس قدر مقبول ہوئے کہ ہر سال شیخ کیے جاتے۔ ایک خصوصیت ان ڈراموں کی یہ بھی تھی کہ صوفی صاحب نے بطور ایکٹریٹ بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

”دلی کی آخری شمع“ کے عنوان سے مشہور تمثیل میں برصغیر کے نامور شعراء کے نام اور کلام کو نئی نئی شکل میں روشناس کرایا گیا۔ یہ وہ بڑا اور کامیاب کارنامہ تھا جس کی یادگار تصاویر آج بھی گورنمنٹ کالج کے ہال میں زینت بنی ہوئی ہیں۔ بلاشبہ گورنمنٹ کالج کا یہ عرصی وادی عروج کا زمانہ تھا۔ یہ دور ڈی جی سوئدھی کا تھا جو پطرس بخاری سے پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ صوفی تبسم نے تعلیم بالغاں کے لیے ایک جریدہ ”دوست“ کے نام سے نکالا جو انہی کی قیادت میں خاصا کامیاب رہا۔

گورنمنٹ کالج میں ادیب فاضل کی شام کی کلاس میں بھی صوفی صاحب نے ہی شروع کرائیں۔ صوفی صاحب نے ریڈیو پاکستان کے مشیر مقرر ہوئے تو انہوں نے ریڈیو کے لیے دن رات تیزی اور مستعدی سے کام کیا۔ وہ ”علامہ شمس الدین عظیمی“ پر ڈراما میں علامہ اقبال کے فارسی کے کلام کا ترجمہ پیش کرتے۔ یہ پروگرام بے حد مقبول تھا اور لوگ خاص طور پر یہ پروگرام صبح آٹھ بجے ریڈیو پر سنا کرتے تھے۔

انہوں نے ریڈیو فیچر اور سکرپٹ بھی لکھے۔ اس کے علاوہ وہ ٹاک لکھا کرتے تھے۔ ان کی فن میں مہارت کے ساتھ ساتھ ظاہر ہے کہ وہ چند لکھنوں میں بڑے بڑے مشکل موضوعات کو کاغذ پر اتارتے اور اگلے چند لکھنوں میں وہ الفاظ کا استعمال کر کے گردش کر رہے ہوتے۔ انہوں نے ریڈیو کے لیے، بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ انہوں نے ”پندرہ روزہ“ پر ”شیم آبا“ سرفہرست ہیں۔ صوفی تبسم کی نظمیں ”نڈرا کی گڑیا سوئی ہوئی ہے“ ”گھنٹی بجاؤ، اس کو جگاؤ“ ”پندرہ روزہ“ ریڈیو پاکستان کی لائبریری کا ایک لازوال سرمایہ ہے۔ ان کی نظموں کو نڈریٹیم، خورشید جیم اور بہت سے فنکاروں نے بچوں کا پروگرام جو ہر اتوار کو نشر ہوتا ہے، صوفی صاحب کی نظموں کا انتظار کرتے۔ ”یہ گاؤں ہمارا یہ گاؤں ہمارا“ ”خوشبو“ نے بہت خوبصورت گایا، جو آج بھی بچے شوق سے سنتے ہیں۔

”پانچ چوہے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار، ایک چوہا باہر رہ گیا بیچھے باقی رہ گئے چار“ یہ نظم بھی بچوں کے پروگرام کے لیے ہی ریکارڈ ہوئی اور ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں موجود ہے۔

صوفی تبسم صاحب کی غزلیں

1- وہ مجھ سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ

2- یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقف اضطراب

3- کیا ہوا جو ستارے چمکتے نہیں

4- داغ دل کے فروزاں کرو دوستو

نذیر بیگم نے بھی صوفی تبسم کے بہت سے پنجابی گیت گائے اور بے حد مقبول ہوئے۔ غلام علی کی وجہ شہرت بھی صاحب کی غزل ہے جو انہوں نے غالب کے فارسی کلام کا ترجمہ کیا تھا۔ آج بھی مقبول ہے۔

”میرے شوق دا نہیں اعتبار تینوں، آ جا وکھ میرا انتظار آ جا“

نسیم بیگم نے صوفی تبسم کی غزل بھی گائی۔

سو بار چمن مہکا، سو بار بہار آئی

دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

پاک بھارت 1965ء کی جنگ کے موقع پر صوفی تبسم کے جو نئے ریڈیو سے نشر ہوئے، وہ پورنی قوم کے

دل کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ جنگی ترانے ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں نہ صرف نمایاں حیثیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری

سجھ بوجھ کا حصہ بھی بن چکے ہیں۔

اے پتر پشاں تے نہیں وکدے

تو لہندی پھریں بزار گڑے

## پچا غلام علی

روم جانے سے پہلے اشفاق صاحب دیال سنگھ کالج میں پڑھاتے تھے۔ سید عابد علی عابد کالج کے پرنسپل تھے۔ کالج میں کم اور محبت سے راہ اگانے پر زیادہ اصرار کرتے تھے۔ بڑی بے تکلفی سے سٹاف روم میں آ کر بیٹھ جاتے۔ کئی مسائل تک زیر بحث آتے۔ طالب علموں کے کردار، ان کی محنت اور جانفشانی کو سمجھنے اور بہتر بنانے کے لیے راستے تلاش کیے جاتے۔

سٹاف روم میں اشفاق صاحب اور ڈاکٹر غلام علی (جو ابھی ڈاکٹر نہیں تھے) کی موجودگی اس میلے کی روح رواں تھی۔ اشفاق صاحب اپنی گفتگو، مزاح آفرینی، دل جل کر کھانے پینے کی روایت سے محبت کا لانا جلائے رکھتے۔ پروفیسر جی بی خاموشی اور ذات کے حوالے سے پوری انجمن تھے۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ اردو کے ادیب پروفیسر صاحب دیال کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ایسا نستعلیق انگریزی لہجہ کم کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

دراز قد پروفیسر غلام علی اپنے طالب علموں کو کالج کے بعد دیر تک پڑھاتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ باغ جناح میں کھینچے کھاس لے کر چلے جاتے اور وہیں طالب علموں کو انگریزی لٹریچر سے متعارف کراتے۔ باغ جناح کی چاٹ خاں صاحب پروفیسر غلام علی سے ہی ملتی تھی۔

خاں صاحب روم سے واپسی پر جب اردو بورڈ میں ملازم تھے تو بھائی غلام علی ان کے پاس بڑی باتقاعدگی سے

آیا کرتے تھے۔ ہم داستانِ سرائے میں منتقل ہو چکے تھے۔ عفت اپنی بیماری کے دوران ہمارے پاس قیام پذیر تھی۔ غلام علی ان کی طبیعت پوچھنے آتے لیکن انہوں نے کبھی اندر آ کر عفت سے طبیعت نہ پوچھی بلکہ باہر سے ہی بیمار ہو کر آتے چلے جاتے۔

ان کی شائستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بابا فضل شاہ کے ڈیرے پر جاتے لیکن کبھی گفتگو یا سوال جواب میں شہاب ہوتے۔ وہ اپنے تذبذب اپنے مسائل اپنے تک محدود رکھتے۔ بس کچھ ہاتھ باندھے سر جھکائے جیسے دعا کے سانس کر کھڑے رہتے۔ جب عفت بہت بیمار ہو کر میوہ ہسپتال پہنچی، Dialysis کے باوجود اس کی صحت مندوش تھی۔ ابھی بھی غلام علی آتے اور نیچے نرسوں اور لوہا جین سے طبیعت پوچھ کر روانہ ہو جاتے۔

عفت ان کی بیمار پرسی کے انداز سے بہت متاثر تھی۔ ہمیشہ مجھ سے کہتی "قدیر! کس قدر Decent ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے لیے کچھ کروں لیکن میں ایک اگریزی کے پروفیسر کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔" پتہ نہیں یہ عفت کی خیر سگالی تھی کہ اس کی دعائیں بھائی غلام علی مکہ میں پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ ان کی اپنی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ گئیں۔

جب خاں صاحب پہلی بار عمرہ کرنے گئے تو بھائی غلام علی نے کٹ بھجوا اور انہیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ جب یونیورسٹی چلے جاتے تو خاں صاحب سیزی اور مٹی کے ساتھ پیچھے جاتے۔ ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ ان کا پتہ ہو گیا۔ خاں صاحب نے کئی عمرے کیے۔

ایک بار جب شہاب صاحب ساتھ تھے۔ صرف اس بار ہم ان کے پاس نہیں ٹھہرے۔ شہاب صاحب کہ حاضری کے دوران کم سے کم انسانی رشتوں میں Involve ہونا چاہیے۔ عموماً کٹ بھی وہی ادا کرتے تھے۔ آخری بار کے جب میں اور خاں صاحب مکہ پہنچے تو غلام علی بھائی Edinburgh میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ جب پہلی مرتبہ میں اور خاں صاحب عمرہ کرنے گئے تو مجھے سیزی کی محبت کا پتہ چلا۔ وہ میرے ساتھ طرح رہتی۔ دور سے اشارے کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیتی۔ ذکیہ کا معمول تھا کہ وہ ہمارے کھانے پکائے جاتی۔ مٹی کبھی ساتھ چلتی کبھی پیچھے رہ جاتی لیکن سیزی نے کبھی ناند نہ کیا۔

مجھے اچھی طرح وہ منظر یاد ہے جب ہم خانہ کعبہ میں موجود تھے۔ یکدم کالی گھاٹا کہیں سے اٹھی۔ ہر طرف ہو گیا۔ لحوں میں موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ خاں صاحب اٹھے اور نیچے حطیم کی طرف چل دیے۔ یہاں خانہ کعبہ سے پانی کے ٹکاس کے لیے ایک بڑا پرنا لہ ہے۔ بارش کا پانی زور و شور سے بہ رہا تھا۔ مجھے اور سیزی کو چھوڑ کر خاں صاحب نیچے کی طرف اترتے جا رہے تھے۔ پھر وہ پرنا لے کی سیدھ میں کھڑے ہو کر اللہ کی رحمت میں خوب نہائے۔ مجھے عفت کے گناہ ان سے جھڑپے ہوں۔ ایسے ہی جب ہندو لوگ گنگا اشنان کے لیے جاتے ہیں، تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ جون ملی ہے اور وہ نوزائیدہ بچے کی طرح پوتر ہو گئے ہیں۔

خاں صاحب لوٹے تو ان کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ براؤن آنکھوں میں ایک چمک اور عفت کی شانیت سی مسکراہٹ تھی۔

”احرام نچوڑ لیں چچا۔“ سیزی نے کہا۔

”نہیں بیٹا..... ایسا پانی کب ملتا ہے، خود ہی سوکھ جائے گا۔“

”پھر گھر چلیں۔“

اب اس کا اصرار بڑھ گیا تو خاں صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے۔

جس بار ہمارے ساتھ شہاب بھائی عمرہ کرنے لگے۔ شہاب صاحب کہنے لگے۔ ”اشفاق! تم اور قدسیہ میرے

ساتھ سفر میں رہو۔ بھائی غلام علی کو اس بار زحمت نہ دو۔“

”لیکن شہاب بہت خرچ ہوگا۔“

”نہیں بھائی میں ڈبل بیڈ والا کمرہ لوں گا۔ میں اور تم ڈبل بیڈ پر سوئیں گے اور قدسیہ کے لیے ایک ایکسٹرا بیڈ لگوا

”

اس عمرہ کے دوران مجھے پتہ چلا کہ شہاب بھائی سونے کا تو بہانہ کرتے تھے۔ پتہ نہیں رات کے کس پہر وہ چپکے

سفر خانہ کعبہ کے لیے روانہ ہو جاتے۔ ہم سے تو فجر کی نماز بھی پکڑی نہ جاتی تھی لیکن جب وہ غالباً اشراق پڑھ کر

سفر خانہ کعبہ کے لیے روانہ ہو جاتے تو کبھی غلطی سے بھی ہماری اس غفلت کی طرف اشارہ نہ کیا۔ کسی شریعتی معلم کی طرح ہمیں احساس نہ دلا یا کہ ہم

کبھی سجادت کھورہے ہیں۔

غالباً شہاب صاحب کا مسلک یہ تھا کہ خود اللہ انسان کو فیصلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے تو پھر انسان کو اس فیصلے

کا صحیح ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اپنی مثال سے اگر بات کسی تک پہنچ سکتی ہے تو خیر و نہ اجتنب ہی بہتر ہے۔

جس بار ہم اپنی ٹکٹ خود خرید کر عمرہ کرنے گئے۔ غالباً یہ ہمارا آخری سفر تھا۔ جدہ ایئر پورٹ پر ہمیں جنگلی (نعیم

اشفاق صاحب کے کزن ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ وہی ہمیں مکہ میں ایک ایسے ہوٹل میں چھوڑ گیا جو خانہ کعبہ سے بہت

نہیں تھا۔

اس بار بھائی غلام علی مکہ میں موجود نہ تھے۔ وہ اپنی پی ایچ۔ ڈی مکمل کرنے کے لیے لندن جا چکے تھے۔ نہ سیزی

کے ساتھ تھی نہ منی کی خاموش شمولیت۔ نہ واپسی پر ذکیہ غلام علی ہی کے کچے کھانے اور اس کی خدمتوں سے حظ اٹھانے کا

سہارا۔ ہوٹل کی دوسری منزل میں ایک کمرہ، غسل خانہ اور چھوٹی سی بیٹھک نما جگہ تھی جو نیچے جانے کا راستہ بھی تھا۔

ہم جب حاضری دے کر واپس لوٹتے تو راستے میں چھوٹا سا بازار ملتا جس میں ایک پاکستانی بی کلاس ہوٹل تھا۔

اسی رات جب ہم عشا کی نماز پڑھ کر خانہ کعبہ سے لوٹے تو اس ہوٹل پر رُکے۔ خاں صاحب نے کچھ سالن مانگا۔

”اور روٹی.....“ خواجہ فروش نے سوال کیا۔

”ایک روٹی.....“ خاں صاحب بے دھیانی سے بولے۔

دکاندار نے میری طرف اشارہ کر کے سوال کیا۔ ”اور اس کے لیے؟“

”ہاں دو روٹیاں۔“

غالباً اس وقت خاں صاحب مکمل طور پر غائب تھے۔ انہیں میرا خیال تک نہ تھا۔



”لو..... اور اس کو بھولنا نہیں۔“

ہم دونوں کھانا لے کر ہوٹل میں پہنچے۔

اسی قیام کے دوران ایک چھوٹا سا واقعہ اور بھی ہوا۔

رات کے وقت تک خاں صاحب صفا اور مردہ کے مقام پر ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر بھاگ کر دے رہے ہوتے اور میں اس کھلے درپے میں شانتی سے بیٹھی خانہ کعبہ کے کالے غلاف کو تنگ رہی کیونکہ میرے کی سنی بی بی ہاجرہ کرپنکی تھیں اور تمام عورتوں کو اس بھاگنے سے چھٹی دلا چکی تھیں۔ مرد ہانپتے کانپتے کچھ بوڑھے Wheel Chair پر بھاگ بھاگ آ جا رہے تھے۔ کچھ انا کے، رے مردوں کے چہروں پر ناخوشگوار احساسات واضح عیاں تھے۔

پھر میں نے دیکھا ایک گورا چٹا نوجوان (جو غالباً لبنان یا جنوبی ترکی کا تھا) نیچے والی قطار سے اٹھا اور ایک کاغذی گلاس اٹھایا اور اس میں زمزم کا پانی انڈیلا۔ زمزم کا یہ پانی اور ایسے گلاس جا بجا خانہ کعبہ میں پڑے ایک وقت تھا کہ یہاں ایک ہی گلاس ہوا کرتا تھا۔ گویا حکم تھا کہ امت محمدی میں کوئی اونچ نیچ، چھوت چھات، تعصب، عنجائش نہیں۔ سب مشابہت اور بزار جان ہیں۔

جب سے مغرب نے مسلمان ممالک میں اپنی ہاتھ پائی کا تصور رائج کر دیا، ہم اسلامی صفات اور طہارت بھولتے جا رہے ہیں اور اسی لیے ہم بھول چکے ہیں کہ اصل صفائی اور طہارت اندرون کی ہوتی ہے۔ بیرون صرف ہے جس سے مراد ایک نظام کی تخلیق ہے جس سے موتیوں کو ایک دھاگے میں پروانے کا کام لیا جاتا ہے۔

میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ایک نوجوان بظاہر پاکستانی نہیں لگتا تھا۔ میری طرف بڑھا۔ اس نے اپنی طرف اٹھایا اور مجھے پیپر گلاس میں زمزم کا پانی بڑی محبت اور احترام سے پیش کیا۔ پانی کا گلاس دے کر وہ غائب ہو گیا۔ میری نگاہوں نے اسے تلاش کیا لیکن وہ کہیں ہوتا تو نظر آتا۔

مجھے آج تک اللہ کی اس رحمت کی سمجھ نہیں آئی۔ کبھی لگتا ہے اس گلاس کی وجہ سے میرے سارے کھل ہوئے۔ کبھی گمان گزرتا ہے کہ یہ گلاس اس بات کا مظہر تھا کہ میرا عمرہ قبول ہو گیا۔ کبھی خوش فہمی ہوتی کہ میرے معاف کر کے مجھے نوزائیدہ بچے کی طرح رحمت کا ہتھمہ دیا گیا۔

جب خاں صاحب لوٹے تو میرے ہاتھ میں گلاس دیکھ کر بولے ”تم سیدہ! یہ گلاس کہاں سے آیا۔ زمزم سے؟“

کافی نیچے پڑے ہیں۔“

میں نے واقعہ بیان کیا۔

”دیکھو اس گلاس کا دھیان رکھنا۔ ایسے واقعات عام طور پر نہیں ہوتے اور یہاں جو بھی پیش آتا ہے اسے لیے شکر گزاری شرط ہے۔ تم اس کے معنی سمجھو نہ سمجھو احترام ضروری ہے۔“

اب میرے لیے یہ واقعہ اور بھی اہمیت اختیار کر گیا۔ واپسی پر ایک مدت میرے پاس یہ یادگاری گلاس

ذکیہ غلام علی لاہور کالج فارویمین میں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ بھائی غلام علی ایڈنبرا میں پی ایچ۔ ڈی مکمل کر رہے تھے۔ دونوں چھاؤنی والے پل سے ذرا سا اتراؤں میں اردو بورڈ کا خوبصورت دفتر تعمیر ہوا تھا۔ اسی سڑک پر کچھ آگے ذکیہ کی خریدلی، لیکن اسے گھر بنانے کا شعور نہ تھا۔ خاں صاحب نے اس کے گھر کا نقشہ اپنی نگرانی میں بنوایا۔ اسی ٹھیکیدار نے پاکستان سرائے اور اردو بورڈ کی عمارتیں بنائی تھیں۔ ذکیہ کا گھر بھی تعمیر کرایا۔ اس گھر کا نام بھی ”ادب سرائے“ رکھا گیا۔ اس کی تعمیر بھی خاں صاحب کی زیر نگرانی ہوئی۔

شاید یہ ان مہمان نواز یوں کا ردعمل تھا جو بھائی غلام علی نے ہر عمر سے کے دوران انہیں دکھائی تھیں یا شاید وہ دوستی کے جزو سمجھتے تھے کہ دوست کے کام آنا ہی سب سے بڑی دوستی ہے۔ بہر کیف اس گھر کی تعمیر کے دوران دونوں نے ذکیہ خاں صاحب کے بہت قریب آگئیں۔

موتی نے ادبی دنیا میں بہت نام کمایا۔ کچھ عرصہ اردو بورڈ میں ڈائریکٹری بھی کی اور اب اپنی بیٹی کے ہمراہ وہ ”ادب سرائے“ میں ہی رہتی ہے۔

نور ہیرہ ہم نعلی کے نام سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اس کی کہانیوں نے باپ کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔ ہیری کے ساتھ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی چلاتی ہے اور وہ بھی ادب سرائے کا ایک لازمی حصہ ہے۔

دونوں دوست ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کی سائنلجی خوبی یہ تھی کہ دونوں ”رول ماڈل“ تھے۔ ان کی بات وضاحت طلب ہے۔ ہمارے پاس ”رول ماڈل“ کے تین تصور موجود ہیں۔ ایک تصور مغرب کی سفید فام نسل سے درآ مد کیا گیا ہے۔ ایک رول ماڈل مشرق میں چین سے مستعار لیا گیا ہے اور تیسرا تصور رول ماڈل نئی نئی نسلوں کا کردہ ہے۔

مغرب کے لوگ صرف کام کو اہمیت دیتے ہیں اور کام کرنے والے کی عزت نفس کا معیار اس کی کام کرنے کی اہلیت کے تناسب سے ہے۔ اس کے بعد سارا معاشرہ بری الذمہ ٹھہرتا ہے۔ چین کا رول ماڈل باقاعدہ معاشرہ کا سندھو ہے۔ تمام یافتہ فرد ہوتا ہے جیسے ماؤزے تنگ کے معیار پر پکھ کر ساری قوم سر پر چڑھ جاتی ہے لیکن اس Workaholic معاشرہ میں اخلاق یا ذاتی خوبیوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ وہ ذاتی زندگی میں جھوٹا، فریبی، دغا باز، کیسی ہی کجی کا مظہر کیوں نہ ہو۔ اس میں احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

نئی نئی نسلوں کا تصور دینا ہے، وہ نرالا ہے۔ یہاں کردار، اخلاق اور دین داری رول ماڈل بننے کے لیے بنی ہوئی ہیں۔ اچھا انسان کامیاب اور کام کرنے والے انسان سے زیادہ تعریف کا مستحق ہے۔ معاشرے کو ان کی مثال سے سیکھنی چاہیے اور آنے والی نسلوں پر اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرنا چاہیے۔

جہاں تک میرا علم ہے خاں صاحب اور ان کے دوست بھائی غلام علی واقعی رول ماڈل تھے۔ ان کی اچھائی کے سوا ان کی محنت چھپی تھی اور محنت بھی وہ اس لیے کر۔ تھے کہ یہی وصف عبودیت ہے اور یہی حکم ہے کہ رزق حلال سے محنت سے کماد۔

## قرۃ العین حیدر

یہ ان دنوں کی بات ہے جب عینی کراچی میں انفرمیشن کی ایک بڑی افر تھی۔ پھر یکدم پتہ چلا کہ کسی ہم سفر نے ”آگ کا دریا“ پڑھ کر یہ رپورٹ حکومت کو دی کہ عینی تو پاکستان دشمن ہے۔ اس کی ساری وفاداریاں ہندوؤں کے ہیں اور ایسا افسر پاکستان کے دو قومی نظریے کو گزند پہنچا سکتا ہے۔ لیجے صاحب قرۃ العین حیدر دلبرداشتہ ہو کر ہندوستان سدھاریں۔ اکھنڈ بھارت کے پجاریوں کو ٹرپ کا پتہ ہاتھ آ گیا۔ دہلی میں ایک چھوٹا سا گھر لے لیا۔ اللہ اللہ خیر سہا۔ یہ وہی دن تھے جب فہمیدہ ریاض بھی پاکستان بدر کر دی گئی تھی۔ اچھی بھلی وطن دوست کا ناس کر دیا۔ ایک گزر گیا۔ پھر خاں صاحب سے ملنے اچانک یہ دونوں آپہنچیں اور اتفاق ملاحظہ ہو دونوں ایک ہی دن ایک ہی وقت سے روز قیامت ہو اور حساب کا وقت آ گیا ہو، ہمارے ہاں آئیں۔ خاں صاحب تو سوائے اپنے کسی کا حساب لینے والے نہیں۔ دونوں سے بڑی محبت سے ملے۔

وہ شام بڑی سلونی مشلوئی تھی۔ خاں صاحب کے ایک طرف عینی اور دوسری جانب فہمیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سے پہلے میں نے قرۃ العین حیدر کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی کچھ محبوب نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔

”اشفاق یہ تمہاری بیوی بھی لکھتی ہے۔“

”آپ کو پتہ نہیں۔ انہوں نے ”راجہ گدھ“ لکھی ہے۔“ فہمیدہ بولی۔

”ارے بھئی میری نظر سے تو نہیں گزری۔“

”کتاب لاکر دو قریب۔“ خاں صاحب نے نرمی سے آرڈر کیا۔

میں بھاگ کر ”راجہ گدھ“ لے آئی اور عاجزی سے عینی کو پیش کی جس طرح مجھے لکھنے والے اپنی کتاب بڑے لکھنے والوں کی خدمت میں حاضر کیا کرتے ہیں۔

عینی نے کتاب دکھ لی۔ کافی دیر کے بعد ایک روز مجھے خاں صاحب نے بتایا۔

”بھئی تم بہت Lucky ہو۔ عینی نے تمہاری کتاب پڑھ بھی لی ہے اور اسے پسند بھی کیا ہے۔ یہ جرت ہے۔“ آگ کا دریا“ لکھنے والی کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ ”راجہ گدھ“ پڑھے۔“

نیلے رنگ کی پھولدار ساڑھی، چہرے پر خوبصورت چشمہ، پیروں پر کیوکس کے پرانے نشان، سر سے بغیر ہیل کے جوتی عینی کا وجود آج بھی بڑی صفائی سے میرے سامنے جھلملاتا ہے۔ عینی اور خاں صاحب فون پر رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو خط بھی لکھتے تھے لیکن میں اس بے تکلفی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

## مفتی جی

مفتی جی کے متعلق میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ ان کے جانے سے کس کا نقصان ہوا.....

.....؟ کہ میرے بچوں کا؟ ہم سب الگ الگ عجب غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ ہم انہیں مہمانوں، رشتہ داروں، گھر  
 کے ساتھ شینئر ضرور کرتے تھے لیکن دعویٰ ملکیت اپنی اندر کی جیب میں صرف اپنے لیے محفوظ رکھتے تھے۔ ہم نے  
 جی جی کو بھی اس کا دعویٰ نہیں سمجھا۔

1947ء میں جب مفتی جی بنالہ شہر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو انہوں نے سب سے پہلے والدین کے رفیق جی  
 سے ملازمت کی۔ اس وقت لوگ اپنے خاندانوں سے چھڑ کر اس کیمپ میں جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ اس  
 کے ہوئے لوگوں کی کھوج، ان کے ٹھکانے اور وہ کھسکھ میں شریک ہونے اور کرنے کے لیے اپنوں کی تلاش تھی۔  
 مفتی جی یہاں پر افسر رابطہ ٹنگ گئے۔ ان کے ہاتھ میں مائیکروفون رہتا۔ وہ پکار پکار کر لوگوں کے نام پتے  
 کرتے رہتے۔ ان کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ خاں صاحب بھی کھرک بھرتی ہو کر واٹن کیمپ جا پہنچے۔ نئے ملک  
 کے عیروں کے ساتھ یہ ایک نیا سفر تھا۔

پرانی یادیں اندر والی جیب میں دل کے ساتھ محفوظ کر کے پٹی کس کے مفتی جی اور خاں صاحب کام کر رہے  
 تھے جی مجھے تو گوردا سپور سے جانتے تھے، جہاں میری خالہ گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں اور مفتی جی اپنی  
 مفتی کو داخل کروانے کے لیے لائے تھے۔ میری ان کی واقفیت سرسری تھی کیونکہ قیام پاکستان کے بعد نارٹن  
 نسل پھل ہو گئیں اور پرانے رابطوں کو مضبوط کرنے کے لیے وقت نہ ملا۔ لیکن اشفاق صاحب سے تو پہلی بار مفتی  
 کیمپ میں ہی ملے۔

مفتی جی چہرہ شناس تو تھے ہی، جوہری کی سی نظر سے پتھر اور جوہر میں حد فاصل قائم کر لیتے۔ کچھ ہی دنوں کے  
 میں جی ادب نوازی کا مفتی جی نے مکمل جائزہ لے لیا۔ انہوں نے خاں صاحب سے کہا..... ”بھائی! کچھ مائیکروفون  
 لگائیں۔“

حیران ہو کر خاں صاحب نے پوچھا۔ ”جی..... کیا؟“

”بھائی کبھی ریڈیو وغیرہ سنتے ہو؟“

”جی میرے پاس اپنا ریڈیو ہے۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔ اناؤنسمنٹ کرو گے؟“

”جی کر لوں گا۔“

یہ وہ پہلی چاٹ یا چسکا تھا جو خاں صاحب کے منہ کو لگا۔ جس الیکٹرانک میڈیا کے آخر میں مفتی جی خلاف  
 میں اس کا پکا بھی مفتی جی نے ہی لگایا۔ ان کا خیال تھا کہ خاں کے ادبی کیریئر کو الیکٹرانک میڈیا کی سستی شہرت کھا گئی۔  
 یا نقصان، ان دنوں نے ایک دوسرے پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ڈرامے کی طرف خاں صاحب مفتی جی کو درغلا  
 گئے لیکن ایک بات جو مفتی میں بڑی قابل ذکر نظر آتی ہے، وہ یہ کہ مفتی جی نے کبھی قلم کاغذ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

لکھنا لکھانا خاں صاحب نے بھی مکمل طور پر منقطع نہیں کیا لیکن ان کی توجہ زیادہ ”تلقین شاہ“ اور ٹیلی  
 کی طرف ہو گئی۔ مفتی جی ڈرامے سے منسلک رہے لیکن ڈھیلے ڈھالے۔ انہوں نے کبھی ہمہ وقت اپنی ساری

تو جہادھر مبذول نہیں کی۔

ان دنوں جب خاں صاحب مزنگ روڈ سے سائیکل پر آیا کرتے تھے، ان دنوں پاکستان میں مفتی جی کی قیام کرشن نگر میں ساندہ روڈ پر تھا۔ ان کے گھر کا نام Lovely Lodge تھا اور میراجی چاہتا تھا کہ وہ جہاں بھی رہے ان کے گھر کا یہی نام ہو۔ 1950ء تک وہ یہیں ساندہ میں قیام پذیر رہے۔ پھر جب پاکستان نے ٹراؤ کھیل میں ایک ٹیسٹ ریڈیوشین کھولا تو مفتی اس کے موڈھی تھے۔ یہ ریڈیوشین بھارت کے پروپیگنڈہ کا جواب در جواب تھا۔ یہاں سے جی، یوسف ظفر اور خاں صاحب سکرپٹ تحریر کرتے جو اسی وقت تاج محمد صاحب، محمد حسین صداکار ہوا کے وقت دیتے۔

1951ء میں مفتی جی پنڈی آ گئے۔ ان کا گھر B-365 میں سینٹ میری کالج کے پاس تھا۔ اس دوران ان کا رابطہ خاں صاحب سے رہا اور میں ان کے دائرہ اثر سے دور رہی۔ پھر 1958ء میں وہ مشہور واقعہ Deputation پر تھے۔ مفتی جی نے ایک اختلاف کی بنا پر اپنے افسر اعلیٰ کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ اس بے جا نتیجے میں انہیں suspend کر دیا گیا مگر شہاب بھائی کی مدد آڑے آئی۔ انہیں کراچی میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں سے نے دو مرتبہ رہائش بدلی۔ پہلے وہ منٹھو پیر کے قریب ناظم آباد میں پاک کالونی میں رہے، پھر بند روڈ پر پلازہ سینٹ کے کرائے کا مکان لے کر آباد ہو گئے۔

اس وقت ان کے پاس آپا اقبال اور ان کے بھائی رفیق بھی رہتے تھے۔ جب مفتی جی کراچی میں تھے تو ہم شہاب بھائی کے مہمان ٹھہرے۔ ہمارے ساتھ بچے اور تبت کے بستر تھے۔ بچے اور بستر ہاتھ آئی لیکن ہم ہم مفتی جی کے پاس پہنچے۔ مفتی جی نے ہمیں بچوں کے بغیر دیکھ کر کہا..... ”وہ بچے کہاں ہیں؟“  
 ”وہ مفتی جی..... وہ سو رہے تھے۔ ان کو ہم عفت کے چارج میں دے کر آئے ہیں۔“  
 ”ہاں بھی جب بڑے آدمی سواگت کرنے کو نہیں تو پھر مفتی کہاں یا دور ہتا ہے؟“  
 ”یہ بات نہیں مفتی جی۔ اسی نے ٹرین کے ٹکٹ بھیجے تھے۔ میں کیا کرتا؟“  
 ”یہ بھی مجھے ہی دھونس دی جا رہی ہے کہ شہاب ہماری دوستی afford کر سکتا ہے اور آپ جیسے ٹھہرے۔“  
 کرایہ نہیں دے سکتا۔“

اتنے میں آپا اقبال آ گئیں اور پوچھنے لگیں۔ ”شکو کھانا کھا لو۔“  
 ”ناں ناناں..... ناں تم وال بھجیا کھلا دوگی۔ وہاں پتہ نہیں کیا ضیافت ان کا انتظار کر رہی ہوگی..... جاتے ہیں ہم کچھ دیر سب سے بیٹھے رہے۔ پھر مجرموں کی طرح اجازت لے کر باہر نکل آئے۔ مفتی جی نے یہ سب تکلیف بھی گوارا نہ کی۔

1964ء میں ہی مفتی جی O.S.D. بنا دیئے گئے۔ یہ بھی شہاب صاحب کے توسط سے ہو سکتا ہے۔ سیلاٹ ٹاؤن میں کمرشل مارکیٹ کے قریب منتقل ہو گئے۔ ایک ہی سال گزرا تھا کہ انہیں حیدری چوک میں منتقل کر دیا گیا اور وہ صدر کے Speech Writer بنا دیئے گئے۔ 1969ء میں وہ ریٹائر ہو گئے اور کئی سخی

شہاب ہو گیا۔

1978ء تک انہوں نے دو گھر اور بدلے۔ یہ دوران کی ملازمتوں کے لیے اہم نہیں ہے بلکہ اس دوستی اور

محبت مندی کا مظہر ہے جو مفتی جی کو شہاب بھائی سے ہو گئی تھی۔ شہاب بھائی اس وقت نائب سمیت اپنی بہن محمودہ اور

سہیلی کے پاس رہتے تھے۔

شہاب کے بہنوئی امین صاحب بہت اچھی سرکاری نوکری پر تھے اور وہ بلوچپل اور ثاقب کو بڑی توجہ سے

دیکھتے تھے۔ یہاں مفتی جی ہر روز دوپان لے کر پہنچتے۔ کبھی یہ پان باہر ہی دے جاتے۔ کبھی شہاب صاحب سے مڈھ

کے ساتھ باقی تو ان کے ہاتھ میں تھما دیتے لیکن انہوں نے کبھی اندر بیٹھ کر شہاب صاحب سے گپ شپ کرنے کی کوشش

نہیں کی۔

امین بھائی ان سے گھل مل گئے۔ 1978ء میں گھر بنایا۔ یہ گھر ایک برساتی تالے کے پہلو میں ہے اور سٹریٹ

پر واقع ہے۔ بقول مفتی جی انہوں نے اس گھر کی تعمیر میں چینی انگی برابر زور نہیں لگایا۔ روزا، اینٹ، بگری سب

سے صاحب کا در دسر۔ بنیادوں سے چھتوں تک ایک ایک سٹیج پر امین بھائی حاضر۔ دروازے گئے۔ پینٹ ہوئے۔ مفتی جی

بھی حاضر۔

غرض یہ کہ یہاں بھی مفتی جی کو ان کے توکل کی جزا ملی۔ شہاب بھائی کی Wishing Well رنگ لائی۔

شہاب بھائی کا ایک یہ بھی فلسفہ تھا کہ اگر آپ کسی شخص کے لیے اچھے واقعات کی فقط آرزو ہی پال لیں تو عجب معجزانہ طریق

پیدا کر دو عا میں بدل جاتی ہے اور جس کے لیے آپ بہتری کی خواہش پالتے ہیں اس کے ساتھ خوشگوار واقعات ہونے

لگتے ہیں۔

میں مفتی جی پر عقیل روٹی اور ابدال بیلا جیسی کتاب تو نہیں لکھ سکتی۔ میں تو فقط یہ بتانا چاہتی ہوں کہ کس طرح

میں نے اسے ساتھ ان کا تعلق بیج سے پھلتا پھولتا ایک تاور درخت میں بدل گیا اور داستان سرائے کے درو دیوار کیسے ان کی محبت

کے شاہد بن گئے۔

داستان سرائے میں مفتی جی کبھی شہاب بھائی کے کمرے میں نہ ٹھہرے۔ یا تو برآمدے میں اپنا بیگ، پان،

تھوک کے لوازمات رکھ کر ایک بازار سجالیتے یا پھر انڈر ڈرائنگ روم میں اس آخری دیوار کے ساتھ چار پائی لگا لیتے جس کے

ساتھ غسل خانہ ہے۔

میں ان سے جھگڑتی ”مفتی جی یہ کیا مذاق ہے۔ آپ پبلک کے لانگے میں کیسے آرام کر سکتے ہیں؟ اندر کمرہ

کلی ہے۔ آپ اس میں رہیں آرام سے۔ جب چاہیں جب دل کرے لکھیں، جب جی چاہے کھانا منگوائیں۔“

وہ تھوڑا سا ہنستے اور پھر دونوں ہاتھ باندھ کر بولتے..... ”نان بھئی ناں میں پلید آدی۔ میرا شہاب کے کمرے

سے کیا لینا دینا۔ مجھے تو اندر جھاتی مار کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔“

میں نے جب پھر کوئی دلیل دینا چاہی تو وہ بولے۔ ”کا کی! میں سلسل الیول کا مریض ہوں۔ پیشاب بغیر نوٹس

کے آجاتا ہے۔ سارے کپڑے بھیگ جاتے ہیں۔ یہ جگہ اچھی ہے۔ غسل خانے کا دروازہ ساتھ ہے۔ کھولا اور اندر۔“

میں پھر بھی مُصر ہوئی تو ان کا جواب آیا۔ ”کاکی! میرے ملنے والوں میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ میں تو سب سے بھی برآمدے کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ ملاقاتی بلا جھجک آ جاتا ہے۔ احمد بشیر، پروین عاطف، مودی، نیلم..... عقیل عقیل ابدال بیلا، اسلام بی بی۔ اب کس کس کو گنواؤں..... میں تیری محبت کو سمجھتا ہوں لیکن اتنا تو سمجھ پاگل کہ تیری محبت کو تکلیف دے گی۔“

میں چونکہ اپنی تکلیف دہ محبت کا کچھ کچھ ادراک رکھتی تھی، اس لیے دلیل کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیا۔ جب مفتی جی آخر آخر میں بہت بیمار ہوئے تو ایک دن خاں صاحب نے مجھ سے لجاجت سے کہا ”تو میری محبت جی بہت بیمار ہیں۔ شفا یاب ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔“

”یہ کون و شوق سے کہہ سکتا ہے؟“

”پیشاب کی تھیلی ساتھ لڑکائے رکھتے ہیں۔ اوپر سے مسلسل کھانسی بھی ہے اگر.....“

وہ چپ ہو گئے۔ پھر کچھ لمحوں بعد بولے..... ”قد سید! جیسا دودھ کا کاڑھا تم مجھے پلایا کرتی تھیں اگر تم مجھے ویسا ہی پلا سکو تو؟“

بات ابھی بھی واضح نہیں تھی۔

”لیکن خاں صاحب! اس کا کاڑھا بنانے میں تو قریباً دو گھنٹے لگتے ہیں۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“

”لیکن آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”میں مفتی جی کو بلا کر یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ اوپر سارا دن تخت پوش پر رہیں گے۔ رات کو کونسل میں انہیں منتقل کر دیا کریں گے۔ میں ایک طرح سے ان سے وعدہ بھی کر چکا ہوں۔“

معاملہ طے ہو گیا۔

مفتی جی آ گئے۔ دودھ میں چھوہارے ڈال کر ہلکی آنچ پر اتنی دیر پکایا جاتا کہ دودھ ایک تہائی رہ جائے۔ اس میں چھوہارے ملا کر دن میں دو تین مرتبہ مفتی جی کو پلایا جاتا۔ حکیم صاحب کے بتائے ہوئے کاڑھے نے مجھ کو پہلے کھانسی کے دورے کم ہوئے۔ آہستہ آہستہ کھانسی، بخار، بلغم سب غائب..... سب سے آخر میں وہ ہلکا ہلکا کھانسی سے ان کی جان تو زور ہاتھا، ختم ہو گیا۔

مفتی جی کے چہرے پر سرفی آ گئی۔ میزھے میزھے ہاتھ پاؤں سیدھے سجاؤ چلنے لگے۔ مفتی جی نے پروگرام بنالیا اور ہم دونوں کے اصرار کے باوجود وہ اسلام آباد چلے گئے۔ مفتی جی جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتے تھے تو اس کے ارادے کو متزلزل کرنا مشکل تھا۔

عقیل روبی اور ابدال بیلا نے مفتی جی پر بہت خوبصورت، انوکھی اور جامع کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے مضمون مندوں نے اپنی محبت کے پھول ان کے چرنوں میں چڑھائے ہیں لیکن عکسی مفتی نے اس محبت میں اور ہی مضمون لکھے ہیں۔ اس کا مضمون پڑھیے اور عکسی کے لگاؤ کا خود ہی اندازہ لگائیے۔

## ممتاز مفتی کی یادیں

### از عکسی مفتی

ہمیں چھوڑ جانے سے چند روز قبل ممتاز مفتی مجھ سے کہنے لگے۔

”یار عکسی! تیرے لوگ ورثہ دار کیہ فائدہ! یار، یاد رکھنا جب میں مرجائوں تو دو شہتایوں والے اور ایک ڈھول

جو ایلینا اور گھر کے باہر خوب شادیا نے بجانا۔ خوشی منانا۔ وعدہ کرو یار۔ ایسا ہی کرو گے۔“

والد سے کیا ہوا وعدہ تو میں نہ بھلا سکا۔

لیکن آج اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہمیں ممتاز مفتی کا سوگ نہیں منانا چاہیے بلکہ انہیں celebrate کرنا

So let us celebrate MUMTAZ MUFTEE

He was a gift to all us from ALLAH

مجھے یہ زعم تھا کہ ممتاز مفتی کے نام و رفاقت کو ذاتی طور پر جانتا پہچانتا ہوں اور پھر ان میں سے بیشتر تو میرے بھی

ساتھ میں ہیں لیکن یہ زعم ان کی وفات پر پاش پاش ہو گیا۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے اُٹ پڑے۔ اچھے

سے عمدہ سیدہ بزرگ دھارن مار مار رہے تھے۔ کچھ چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔

”پاپو پاپو۔ میں یتیم ہو گیا۔“

میں حیرت سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کیوں مکر یتیم ہو گیا؟ میں سوچتا رہا۔

میرا خیال تھا لوگ آئیں گے، مجھے سہارا دیں گے، گلے لگائیں گے۔ دلا سہ دیں گے۔ غم بانٹیں گے۔ الٹا مجھے

سب کا دکھ بانٹنا پڑ گیا۔ اور تو اور وہ مولوی حضرات جنہوں نے ”لبیک“ کے چھپنے پر مفتی جی کے خلاف فتوے جاری

کیے۔ یہ توئی ہے جو بیت المکرم کو ”کالا کوٹھا“ کہتا ہے۔ اس کی یہ جسارت کہ حج کا تسخرا زائے کہ ”کوٹھے والا مجھے آنکھیں

باندھے۔“

ان ہی میں سے ایک مولانا ممتاز مفتی کے قلم کو اسلام کی تلوار سے تشبیہ دینے لگا۔

میں حیرت سے سنتا رہا۔

اسی موقع پر جیب کترے بھی پیچھے نہیں رہے۔ جب کتروں کا ایک پورا گروہ جنازے کے دوران ممتاز مفتی کے

تہوں کو لوٹا رہا۔ بہت سوں کی جیبیں کٹ گئیں۔

ایک صاحب جن کی جیب کٹ چکی تھی، فرمانے لگے: ”کیا مذاق ہے۔ ممتاز مفتی جاتے جاتے بھی ہاتھ دکھا

تے۔“ پاس ہی کھڑا احمد بشیر بولا: ”نہیں صاحب۔ ممتاز مفتی جاتے جاتے سب کو کچھ دے گئے۔ جیب نہیں اپنا دل ٹٹولیں



اور کہیں کہ میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

ممتاز مفتی جیب کتروں کو بھی کچھ دے گئے ہیں۔

ممتاز مفتی کو بچپن سے اپنے گھر کے ماحول سے سخت نفرت تھی۔ جب ان کے والد مفتی محمد حسین نے شادی کر لی تو ممتاز مفتی کی والدہ صغرا بی بی کی حیثیت گھر میں نوکرانی کے برابر رہ گئی۔

اپنے والد کے خلاف شدید غم و غصہ تھا۔

گھر چھوڑ کر چلے گئے۔

کتنے ہی برس، کئی سال بیت گئے۔ والد مفتی محمد حسین نوے برس کو پہنچے لیکن ممتاز مفتی نے ان سے ملے نہ ملے وہ ایسے ہی انگریزوں کی طرح کسی سے روٹھ جاتے تو برسوں بات نہ کرتے۔ بہت غصے والے تھے۔

بڑی بڑی خطائیں معاف کر دیتے لیکن کسی چھوٹی سی بات پر روٹھ جاتے۔

ایف اے اور بی اے میں انگریزی امتحان میں ہمیشہ فیل ہوتے رہے۔ کہتے تھے تعلیم نے میرا کچھ نہیں سیکھا۔ لیکن 1935ء میں بطور انگلش ٹیچر ملازم ہو گئے۔

سکول میں انگریزی پڑھانے لگے۔

Recession کا دور تھا۔ چالیس روپے تنخواہ پائی۔

باپ انسپٹر آف سکولز تھا۔ کسی نے یوں ہی چھیڑ دیا۔ مفتی سفارشی ہے۔ باپ نے کہنوا بھیجا۔ گھر چھوڑ دیا۔

بس اسی دن سکول سے استعفیٰ دے دیا۔ نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ شہر ہی چھوڑ دیا۔

ممتاز مفتی باغی تھے۔ والد، گھر بار، رشتہ دار، عزیز واقارب سب کو چھوڑ چکے تھے۔ کسی رشتہ دار کی عزت نہ کرتے۔

ممتاز مفتی کو ملے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ جس قدر باپ سے نفرت تھی، اسی قدر مجھ سے پیار تھا۔ کہتے تھے مجھ سے تمہارا کوئی تاپا ہے نہ پھوپھا۔ نہ ماما ہے نہ چاچا۔ بس ایک میں ہوں تمہارا ابا۔ میں ہی تمہارا دوست اور میرے سب سے

بھی تمہارے دوست ہیں۔ والد سے نفرت اب پورے معاشرے کو پیٹ میں لے چکی تھی۔

اسی دور میں ممتاز مفتی نے گہما گہمی، چپ اور سمارٹن جیسا ادب تخلیق کیا۔ وہ نفسیاتی افسانے جیسے لکھتے تھے۔

کہانیاں“ بھی کہتے ہیں، دراصل ممتاز مفتی کی معاشرے کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ معاشرے کی گھٹن، رسم و رواج

پابندیاں اور گرامرز بان کی قیود کے خلاف۔ ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقاء کا یہ اہم دور تھا۔

وہ صرف جنسی حوالے سے فرائیڈین نہ تھے بلکہ Hatred father جو فرائیڈ کے فلسفے کا اہم ستون ہے۔

پورا پورا لاگو ہوتا ہے۔

ان کی شخصیت میں تضاد ہی تضاد تھا۔

غصیل اور باغی ہونے کے باوجود ممتاز مفتی شرمیلے تھے، ڈرے ڈرے، سہے سہے، خوف زدہ، اجنبی

کتری کے شکار۔

کبھی کسی بڑے افسر سے نہ ملتے۔

دفتر میں چپڑاسیوں اور کلرکوں کو دوست رکھتے۔ انہیں یاد رکھتے۔ انہیں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔  
افسر سے خوف یا پھر شدید غصہ رکھتے۔

ایک افسر کو گھونسا مارنے پر کئی سال معطل رہے۔

پیشاب کی حاجت ہو تو کبھی Officers' Toilet نہ جاتے۔ Staff Toilet تلاش کرتے ہمیشہ یا باہر کسی  
جگہ میں بیٹھنا گوارا کر لیتے۔

1950ء کے ٹک بھگ ممتاز مفتی میں تبدیلی آ گئی۔ اب وہ ایک مشہور افسانہ نویس تھے اور ریڈیو پاکستان میں  
سکرپٹ رائٹر کام کرتے تھے۔ مختار صدیقی، مسعود قریشی، اشفاق احمد، یوسف ظفر، باقی صدیقی، محمد حسین ان کے ہم عصر  
مست تھے۔

فطرت تو نہ بدلی۔ وہی شدت، وہی غصہ، طبیعت کا تضاد اور احساس پن تو ویسا ہی رہا لیکن رخ بدل گیا۔  
نہ جانے کسی بابے کی دعا تھی یا کسی بزرگ کی نگاہ یا خود قدرت اللہ شہاب کا چمکا رہا۔ یہ تو میں نہیں جانتا لیکن تبدیلی

تھی۔

ممتاز مفتی کی تلاش ذات نے رخ تبدیل کر لیا۔ شخصیت کی صفات تو نہ بدلیں البتہ ارتقاء نے ایک دوسری شکل  
پیدا کر لی۔ ایک نیا راستہ اپنا لیا۔ پھر ممتاز مفتی بابوں اور خانقاہوں کی تلاش میں سرگرواں رہتے۔ عقیدت کی دلدل میں  
تھے چلے گئے۔

لیکن اس سفر میں ہر موڑ پر قدرت اللہ شہاب سے ان کے گہرے مراسم یا خط و کتابت رہی۔ آہستہ آہستہ ممتاز  
مفتی کی شدت مجذوبانہ رنگ اختیار کرتی گئی۔ ممتاز مفتی مجذوب ہو گئے۔

شکر ہے خدا کا کہ پورے پورے مجذوب نہ ہوئے لیکن کسی درجہ ایسے ہی جیسے نارنجی میں کچھ کچھ مالٹے کا ذائقہ  
ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی میں بھی ایک مجذوب تھا۔

اسی دور میں ممتاز مفتی نے ”لبیک“ اور ”الکھ غمری“ جیسا ادب تخلیق کیا۔ خانہ کعبہ کو کال کوٹھایا اللہ کو ٹھے والے  
سے تشبیہ دینا کسی مجذوب کی تحریر تو ہو سکتی ہے، ہوش مند ادیب کی نہیں اور کسی مجذوب ہی کو یہ قبولیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ  
کسی ممتاز خانہ باتیں لکھے اور صاف بچ نکلے۔

آپ اور میں پورے ہوش میں ایسی تحریر نہیں لکھ سکتے۔

پھر ایک دن اچانک قدرت اللہ شہاب چل بے۔ ممتاز مفتی کے خواب ادھورے رہ گئے۔ عقیدت کے وہ تانے  
بانے جو ممتاز مفتی نے قدرت اللہ شہاب کی ذات کے گرد بن رکھے تھے، ٹوٹ گئے۔ بے محل وقوع بے جہت ہو گئے۔ وہ  
بھی کرن، پاکستان کا عروج جس کا ممتاز مفتی کو یقین تھا کہ وہ قدرت اللہ شہاب کی زندگی ہی میں حقیقت بن جائے گی، بکھر  
گر رہ گئی۔ ممتاز مفتی کا مدار چھن گیا۔

قدرت اللہ شہاب کے مرنے کے چند ہی سال بعد ممتاز مفتی کا محبوب بیٹا عکسی مفتی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ عکسی نے  
دوسری شادی کر لی۔ ممتاز مفتی کو دوسری شادی سے سخت چڑھتی۔ اس نے اپنے والد کو کبھی معاف نہ کیا تھا۔ بیٹا دوسری شادی

کرتے ہی گھر چھوڑ گیا تو ممتاز مفتی بالکل تنہا رہ گیا۔ تنہا۔ اس کی نفرت بے معنی ہو کر رہ گئی۔  
اس کی موج در موج محبت اور عقیدت کا نہ کوئی ساحل رہا نہ کنارہ۔

وہ اکیلاتن تہا Old man & the Seal کا طرح چپو مار مار کر اپنی کشتی ٹھیلتا رہا۔ اس میں زندگی کی اُمت۔  
اب بھی باقی تھی۔

آخری سانس تک ممتاز مفتی کی آنکھوں میں چمک تھی۔ قلم میں تلوار جیسی کاٹ تھی۔ وہ علی پور کا ایلچی تھا۔ ہارن  
اس کا شیوہ نہ تھا لیکن اب مفتی دھیمہ پڑ چکا تھا۔ مجذوبیت رنگ بدل کر تقریری میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک بوسیدہ بستر پر پڑ  
رہتا یا پھر رنگین کھڑکیوں والی رلی پر بیٹھ کر کچھ لکھتا رہتا۔ کچھ سوچتا رہتا۔

لوگ یوں ہی کچھ چلے آتے۔ لوگوں کی سیوا اس کا مسلک بن چکا تھا۔ ایک گھنٹے درخت کی طرح اس کا سایہ  
دور دور پھیل چکا تھا لیکن اس کی تلاش ختم نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کی آرزو جوان تھی۔ اس کی جستجو  
چمک تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکنا نہ تھا۔ اس کا سفر جاری تھا۔

”قلم میں رزمگاہ کی آرزو رکھنا

نوے یا سو سال، آخر نوٹ جاتی ہے

گئے مہتمم مفتی جی

ازلی سے تابعدار پھیلی

کہانی رو پڑی ہے۔“

ممتاز مفتی کی زندگی دراصل ایک طویل تلاش ہے۔ ان کی آخری تصنیف کا نام بھی ”تلاش“ ہے۔ 1905ء  
لے کر 1945ء تک جو کچھ ان پر پڑا اس کا نام ”ایلچی“ رکھا۔ یہ پہلا حصہ ممتاز مفتی کی عالم شہادت کی روئیداد ہے۔ ”علی پور کا  
ایلچی“ تلاش ذات کا ناول ہے۔

1950ء سے 1990ء تک کی آپ بیتی کو ”الکھ نگری“ کا نام دیا۔ یہ دوسرا حصہ ممتاز مفتی کا عالم انجیب کا سفر  
ہے۔ ”ہیک“ اور ”الکھ نگری“ دراصل تلاش خدا کی روئیداد ہے۔ دونوں ہی ممتاز مفتی کی تلاش ہیں۔ وہ مشاہدات ہیں  
میں سے ممتاز مفتی گزر اور جن کی بدولت مفتی ”ممتاز“ ہو گیا اور دونوں تصانیف میں بلاشبہ بہت تضاد ہے۔

”علی پور کے ایلچی“ کے دھواں دھارا اندھیرے آنے والی کرن کو مزید چمک بخشیں گے۔ ایلچی کے اندھیرے  
”الکھ نگری“ کے چمکیلے خواب ایک دوسرے سے جس قدر مختلف ہیں، اسی قدر ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقاء کی اہمیت  
ہیں۔ یہ ایک ہی عمل کے دو Aspects ہیں، دورخ ہیں۔

اس عمل کے دوران کئی شخصیات، کردار، روحانی باپ، بزرگ، عامل پروفیسر حتیٰ کہ خود قدرت اللہ شہاب  
میل تو ضرور ہیں منزل نہیں۔ ممتاز مفتی کا سفر یہاں ختم نہیں ہوتا، جاری ہے۔  
ممتاز مفتی کی تلاش جاری ہے۔

ان کی وفات کے بعد ایک لڑکی نے فیصل آباد سے مجھے خط لکھا۔ لکھتی ہیں:

”ممتاز مفتی کبھی مر نہیں سکتے۔ آج بھی وہ اپنی تحریروں کے اندر زندہ ہیں۔ اپنے جذبے کی پوری سچائی کے ساتھ باقی خوبصورت عقیدت کے ساتھ۔ ان کی تلاش بھی ان کی طرح ہی خوبصورت تھی۔ ان کو خدا ملا یا نہیں، یہ تو وہ جانتے ہیں۔ یہ شاید آپ؟ مگر میری تمنا تھی کہ کاش خدا کہیں میرے پاس ہوتا تو میں انہیں دے دیتی۔“

اب سے بہت سال پہلے کی بات ہے جب میں گارڈن کالج میں پروفیسر تھا۔ ایک روز کالج کے چند طالب علم میرے حُرا آئے اور ممتاز مفتی سے کہنے لگے۔ ”اچھا تو آپ عکسی مفتی کے باپ ہیں۔“  
یہ سن کر میرے والد کچھ سوچ میں پڑ گئے۔  
اسی شام اپنے ایک دوست سے کہنے لگے۔

”یار! آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ لوگ ممتاز مفتی کے حوالے سے پہچانیں گے۔“

بس مجھے موقع مل گیا۔ میں نے کہا۔ ”والد صاحب! اب پتہ چلا جو دل کو گئی۔ آخر میرا حوصلہ دیکھیں بچھنے کے جس سے آپ ہی کے نام سے پہچانا جاتا ہوں۔ کالج میں پروفیسر ہوں، شعبہ نفسیات کا سربراہ ہوں، کئی قسم کے پابکھنڈ کرتا ہوں لیکن پھر بھی لوگ یہی کہتے ہیں ممتاز مفتی کا بیٹا۔“

بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا ”سر! پچھلے 38 برس میں نے زندگی آپ کی طرز پر گزاری ہے۔ اب میں اپنے طور پر رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں۔“

ممتاز مفتی نے تھوڑی دیر سوچا اور کہنے لگے۔ ”جاؤ عکسی! اجازت ہے۔“  
اسی دن میرا اور ممتاز مفتی کا راستہ ٹنگ ہو گیا۔ اب میں 52 برس کا ہوں۔ کئی سال گزر چکے ہیں لیکن آج مجھے جس بات پر فخر ہے کہ میں ممتاز مفتی کا بیٹا ہوں۔ ممتاز مفتی ہی میری پہچان ہے۔ ممتاز مفتی ہی میرا ورثہ ہے۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کوئی اعزاز نہیں۔

کچھ تو لوگوں نے مفتی جی کو جانا پہچانا اور پھر آپ تک پہنچایا۔ کچھ حسن اتفاق سے مفتی جی نے عرفان ذات میں مجھ کو اپنا نانا پتہ اور سراغ لگایا۔ اس سلسلے میں مفتی جی نے جو مضمون لکھا، وہ بھی پیش خدمت ہے۔

## ایک ذاتی خاکہ

اس وقت اپنا یہ عالم ہے کہ اعضاء بے رحمی کے محکمے کو آوازیں دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں 86 سال سے ہم دن رات ٹک ٹک کر رہے ہیں، نہ کبھی جمعے کی چھٹی ملی ہے نہ عید شب برات کی۔ اب بس کرو بہت ہولیا، ہم پر ظلم بند کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھا انتظار کر رہا ہوں کہ کب گاڑی آئے اور میں آپ کو نانا کر کے رخصت ہو جاؤں۔ جناب والا! میری تحریر اور شخصیت کے متعلق چند خوش فہمیاں چل نکلی تھیں۔ سو چار رخصت ہونے سے پہلے احوال واقعی قلم بند کر جاؤں۔ حال ہی میں میں نے اپنی تحریر اور شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا جس سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ عنوان ہے چھوٹا۔

ممتاز مفتی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، سیانے کہتے ہیں، دو جگہوں سے دیکھو تو ٹھیک سے نظر آتا۔

دور سے!

بہت قریب سے!

چونکہ میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، اس لیے مضمون سنا نہیں ہے۔

مفتی کو ادیب ہونے پر فخر نہیں ہے بلکہ مہذرت ہے۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ ادیب بنے۔ اتفاق سے ہوا گیا۔ تالی بیچ گئی۔ یوں زندگی بھر لکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اسے اردو زبان نہیں آتی۔ اس کی تحریر کی Roots اردو ادب میں نہیں ہیں۔ اس نے کبھی شعوری طور پر کبھی کے لیے نہیں لکھا۔ اس نے اردو ادب پر کوئی احسان نہیں کیا نہ ادب کی خدمت ہی کی ہے۔ الٹا اہل ادب نے مفتی پر اصرار کیا ہے۔ اسے ادیب کا مرتبہ بخشا، اہمیت عطا کر دی۔ زندگی بے مصرف نہیں رہی۔

اس کے گھر میں کسی کو ادب سے خصوصاً اس کی تحریروں سے دلچسپی نہیں ہے۔ بیٹے میں بڑی صلاحیت تھی مگر اس نے کہا میں خود! میں خود! جیسے جان دار خدائی بچے کہا کرتے ہیں مطلب تھا، میں اپنا راستہ خود تلاش کروں گا۔ ہوئے راستے پر چلنا گوارا نہیں۔ یہ تو بیٹے کا باپ سے تعلق ہے۔ بیوی کہتی ہے، کیوں جھوٹی کہانیاں لکھ کر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔ اب بھی توجہ نہ کرے۔

دوست کہتے ہیں، تجھے توجیح کے زعم میں خود کو سر بازار رسوا کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ نہ نہ نہ ہمیں ہی رکھنا، خبردار ہمارا تذکرہ نہ کرنا۔

مفتی ازلی طور پر اکیلا ہے۔

اکیلے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ جو جان بوجھ کر الٹا ہانگ رہنا پسند کرتے ہیں۔ محفل لگ جائے تو ڈوبتے نہیں تیرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو محفل سے گھبراتے ہیں، کتراتے ہیں۔ لگ جائے تو ڈوب جاتے ہیں۔ مفتی دوسری قسم کے ہیں۔ اگر آپ مفتی کو ایک کمرے میں بند کر دیں جہاں اس کی ضروریات اسے ملتی رہیں تو بے شک چھ مہینے کے بعد دروازہ کھولیں مفتی یوں ہشاش بشاش بیٹھا ہوگا جیسے ابھی ابھی روزگار ٹون کی سیر کر کے آیا ہے۔

دروازہ بچے تو مفتی کا دل ڈوب جاتا ہے۔ کوئی آ گیا، ظاہر ہے جو ڈرتا ہو کہ کوئی آئے گا تو مہمان تو ازلی کیسے کرے گا۔

مفتی نے کسی مہمان کو کبھی ٹھنڈا یا گرم نہیں پوچھا۔ جب مہمان چلا جاتا ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ افوہ ٹھنڈا پوچھا پوچھا ہی نہیں، یاد ہی نہیں رہا۔ انگریزی میں ایک مثال ہے جس کا پنجابی میں ترجمہ یوں ہوگا۔ ”ٹریا نہ جائے تے پئے نہ گوڈیاں دا۔“ لوگ انتظار کرتے ہیں کہ کب مہمان آئے اور وہ کھانا کھائیں۔ مفتی انتظار کرتا ہے کہ کب مہمان پوچھے گا وہ کھانا کھائے۔ مفتی کو غصہ بہت آتا ہے۔ وہ غصہ جو بھوت بنا دیتا ہے، دھول اڑاتا ہے، سدھ بدھ رہنے نہیں دیتا۔

عرصہ دراز ہوا کہ اس نے جان لیا تھا کہ غصہ ایک خنجر ہے جو انسان اپنے ہی دل میں بھونک دیتا ہے۔ دوسرے طرف خود کو مزادینے کا نام ہے، خود کو چٹائی میں ڈال کر بلوہنے کا عمل ہے۔ جان لینے کے باوجود، مان لینے کے باوجود وہ کتے تک خود کو چٹائی میں ڈال کر بلوہنے پر مجبور ہے۔ صاحبو! ہائے کیا چیز بے بسی ہوتی ہے۔ عورت کے متعلق ممتاز مفتی کا یہ بحث مباحثہ جیسے انگریزی میں Love-hate relationship کہتے ہیں۔ مفتی میں ریڈار قسم کا ایک ریسور لگا ہوا ہے۔ جب وجوہ میں کوئی عورت آ جائے تو وہ ٹک ٹک کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر وہ بائگی نار ہو تو ٹھاٹھوں ٹھاٹھوں کرتا ہے۔

مفتی کو ہر راہ چلتی عورت سے عشق ہے۔ بلا لحاظ جسم، خدو خال اور سلیش۔ گورے رنگ پر تو اس کی جان نکلتی ہے۔ محبت یہ ہے کہ اگر خاتون زیادہ ہی قریب آ جائے تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھتا ہے۔ یہ ”لو ہیٹ ریلیشن شپ“ اس کے لیے ہوا کہ بچپن میں جس خاتون سے وہ شدت سے متاثر ہوا وہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔ وہ بڑی حسین اور بارعب خاتون

ممتاز مفتی نے بڑی محبتیں کی ہیں لیکن بڑی دیر کے بعد اسے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ دراصل اسے محبت کرنے سے محبت تھی۔ اس کیفیت سے محبت تھی، محبوب سے نہیں۔ محبوب کی حیثیت تو ضمنی تھی۔

اس کے نزدیک محبوب میں چند اوصاف کا ہونا لازم ہے۔ خدو خال اہم نہیں، رنگ گورا ہو، عمر رسیدہ ہو کہ فیاض جسم بھرا بھرا ہو، سب سے اہم بات یہ ہے کہ محبوب میں ہر جائیت کی واضح دھونس ہو۔

مفتی کسی نیک یا وفا شعار خاتون سے محبت نہیں لگا سکتا۔ آج کل کی لڑکیاں اسے اپیل نہیں کرتیں، کہتا ہے محبت کیسے فن ہے، یہ آج کل کی کھٹی مٹھی لڑکیاں کیا جانیں کہ محبت کیا چیز ہے۔ مفتی کے نزدیک محبت میں متنا کا ہونا ضروری ہے۔ متنا بھرے لگاؤ کے ساتھ ہر جائیت کی دھونس، ہو تو سبحان اللہ۔

اسے طوائف قسم کی عورت سے بڑی دلچسپی ہے کہ طوائف تن کے تقاضے سے آزاد ہو چکی ہوتی ہے۔ صرف من و عنان کی بھوکی ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کہانیوں میں طوائف کا بڑا تذکرہ ہوتا ہے۔

اللہ میاں سے مفتی کے تعلقات ادا لتے بدلتے رہتے ہیں۔ بچپن میں وہ اللہ سے خوفزدہ رہتا ہے۔ سمجھتا رہا تھا کہ اللہ نے ایک بھٹی جلا رکھی ہے اور اس کا من بھاتا شغل یہ ہے کہ لوگوں کو اس بھٹی میں جلائے۔

پڑھ لکھ گیا تو اللہ سے منکر ہو گیا اور مذہب پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ جیسے آج کے ہر پڑھے لکھے کا و طیرہ ہے۔ پھر یہ نہیں ایک بزرگ نے کیا کیا اس کا رخ بدل گیا۔ اسے ڈال ڈال پات پات میں اللہ نظر آنے لگا۔ اسے اللہ سے عمیق عقیدت پیدا ہو گئی۔ اللہ سے یارا نہ لگ گیا۔ پھر اس پر حیرت طاری ہو گئی کہ اللہ اس پر اس قدر مہربان کیوں ہے۔ اللہ سے اللہ پر کرم نوازیاں کیوں کرتا ہے۔ مفتی میں عقیدے کا فقدان ہے۔ عقیدت کی بھرمار ہے۔ قدرت اللہ شہاب کو عمر بھر یہ عقیدت رہی کہ وہ مفتی کی عقیدت کا شکار ہے، اس لیے مظلوم ہے۔

1990ء میں دفعتاً مفتی کی نگاہ سے پردہ ہٹ گیا اور اسے حقیقت کی پہلی جھلک نظر آئی۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اسلام واحد مذہب ہے جو کہتا ہے، دیکھو سمجھو، غور کرو، عقل کو کام میں لاؤ۔ حقیقت پسند بنو۔ علم بذنوب ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اللہ سے منکر تھا، اب عقل نہیں رہی تو اللہ کو ڈھونڈنا پھرتا ہے۔ ممتاز مفتی شدت کا مارا ہوا ہے۔ اس کی شدت کا قوام

کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہے۔

کہتے ہیں ایک عالم حکیم کی دکان پر گیا۔ کہنے لگا آپ کے پاس شیرا ہے۔ حکیم بولا، جناب شیرا تو ہے۔  
گاڑھا نہیں۔

مفتی کی شدت شین والی نہیں ش وئے والی ہے۔ زندگی بھر اس کے دوستوں کو اس کی شدت کے متعلق  
پڑے۔ شہاب نے کہا، مفتی کی دوستی پھوڑے جیسی ہے، جس کی ٹیسوں میں لذت ہے۔ اشفاق احمد بولا نہیں،  
سی سی کرتا رہا۔ احمد بشیر ہسانا اور قہقہے لگا تار با چونکہ وہ خود شدت سے لت پت ہے۔ بانو نے کئی بار کچھ کہنے کے لیے  
کھولا، لیکن ممتاز نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پروین کے لیے شدت کے کولہوں میں اپنا کوئی نئی بات نہ تھی۔  
”مفتی میں صرف شدت ہی نہ تھی، وہ شدت واک و صف سمجھتا رہا، اسی پر ناز کرتا رہا۔“ سمجھتا رہا کہ جس میں شدت  
میں خلوص ہے، ٹھنڈے ٹھنڈے کرداروں سے الہجک رہا۔ اکسی سال کا ہوا تو اس نے پہلی مرتبہ جانا کہ شدت  
عیب ہے اور زندگی ٹھنڈے ٹھنڈے لوگوں کے دم سے ہری بھری ہے۔

مفتی نے اس حقیقت کو جان لینا سچے دل سے مان لیا کہ شدت ایک عیب ہے ایک رکاوٹ ہے لیکن  
اپنا نہ سکا۔ چونکہ شدت اس کی ہڈیوں میں رچی بسی تھی۔

صاحبو! کسی چیز کو جان لینا سچے دل سے مان لینا لیکن عملی طور پر اپنا نہ سکنا یوں ہے جیسے پھانسی پر لٹک کے  
رہے۔ کاش کہ وہ شدت کو وصف ہی سمجھتا رہتا۔

دوستو! سچی بات یہ ہے کہ میں نے ممتاز مفتی جیسا خوش قسمت شخص نہیں دیکھا۔ انہوں! خوش قسمت  
ایک لگی ڈیول ہے۔

اس نے بڑی Rich بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اللہ نے اسے بہت کچھ اور بن مانگے دیا ہے۔  
اللہ نے اسے کئی ایک لعنتوں سے بچائے رکھا۔ مارت سے بچائے رکھا، اقتدار سے بچائے رکھا، عہدے سے بچائے رکھا،  
ذاتی اہمیت کے احساس سے بچائے رکھا۔

نئی ماراں دلی کے بزرگ حاجی رفیع اندین نے 1930ء میں سچ کہا تھا۔ کہنے لگے، جوانی میں وہ  
بدنامی ہوگی، رسوائی ہوگی لیکن بعد میں آپ کو بڑے اچھے لوگ ملیں گے۔ واقعی مفتی کو زندگی میں بڑے اچھے  
ملے۔

اگر آج اللہ میاں ممتاز مفتی کے روبرو آکھڑے ہوں اور کہیں..... ”مانگ کیا مانگتا ہے“ تو سوچ میں  
گا، کیا مانگوں۔ جسے زندگی بھر بن مانگے ملا ہو، وہ بھلا کیا مانگے۔ اب تو وہ تکمیل کی خوشی میں سر مست پلیٹ فارم  
انتظار کر رہا ہے کہ کب گاڑی آئے اور کب وہ آپ کو ”مانا“ کہہ کر رخصت ہو جائے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے ”مردا بریشم“ لکھی تو سچ کے داعی مفتی جی نے اس کتاب کو پڑھ کر  
کا اظہار کیا۔ کہنے لگے ”قدسیہ..... تو نے بڑی سچ سی کتاب لکھی ہے۔“

”کیا مطلب مفتی جی؟“

”تو نے شہاب کی شخصیت، اس کی بڑائی کو بے نقاب کرنے کے بجائے اپنے بچوں کا قصیدہ لکھا ہے۔ بچوں کو Bull کرنے کی کوشش میں لگی رہی ہے۔“

”اس لیے مفتی جی! کہ میں سنی سنائی کا بندہ ہوں۔ میں نے مفتی جی، شہاب بھائی کو خاں صاحب کی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ میں شہاب صاحب کے ناخن کاٹنے والا نائی ہوں جسے عام زبان میں خلیفہ کہتے ہیں۔ بچوں کی واقفیت بھی ان سے زیادہ تھی۔ خاص کر اشیر خاں کی..... اگر.....“

لیکن مفتی جی نے سننے سے انکار کر دیا۔ جو وہ سچ سمجھ بیٹھتے اسی پر اڑے رہتے۔ اب جب وہ دنیا میں نہیں ہیں تو میرا نظریہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ مفتی جی اگر شاعر محبوبہ کی تعریف کے قلابے ملائیں تو حق یہ ہے، بڑا شاعر اور اگر وہی شاعر وطن کی محبت کے گن گائے، نعت یا مرثیہ کہے، ماں کی محبت، اولاد کی فریفتگی میں رطب لہان ہو تو ادب میں کتر جگہ پائے۔ یہ تو ایک طرح سے فرمائید کو درست ثابت کرنے کی کوشش ہوئی۔

اب کیا کروں میرے پاس تو اب صرف وہ خطرہ رہ گیا جو انہوں نے خاں صاحب کے پرنٹ میڈیا سے اکھڑ کر Visual میڈیا میں گھس جانے پر لکھا۔

## داستان گو اور اشفاق احمد

گذشتہ چند ایک سال سے داستان گو نے اودھم مچا رکھا ہے۔ وہ جگہ جگہ جمع لگائے کھڑا ہے۔ ٹی وی پر، ریڈیو پر اور سوشل میڈیا پر۔ ثقافتی اور سماجی ”گٹ ٹو گیدرز“ میں، شہروں میں، قصبوں میں، دیہات میں ان دور افتادہ مقامات پر جہاں ٹرانسٹر کی رسائی ہے۔

عوام ریڈیو پر بڑے اہتمام سے اس کے پروگراموں کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کی پھلجھڑیوں سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اس کی ”ہم اٹنے“ ”بات اٹنی“ پر حیران ہوتے ہیں۔ جوان اثر سے بھیگ جاتے ہیں۔ دانشور کچھ عرصے کے لیے بھول جاتے ہیں کہ ان کا کام محفوظ اور متاثر ہونا نہیں بلکہ بین بیخ نکالنا ہے۔ نقاد گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ کوئی انہیں سکرانے ہوئے دیکھ نہ لے۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ باتوں کے جال بن کر جمع لگانے والا، مجمع میں رنگینی کی رو بنانے والا، ہنسنے ہنسانے والا داستان گو درحقیقت گونگا ہے، ازلی گونگا۔ اس کی شخصیت دکھ اور چپ کے تانے بانے سے بنی ہے۔ اس کی بزم آرائی اور زعفران زاری شخصیت کے دو بنیادی عناصر دکھ اور چپ سے فرار کی سعی پیہم ہے۔ اس فطری تجربہ کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ ایک رد عمل، ایسا رد عمل جس کے تحت پودے کشش ثقل کی زنجیروں کے خلاف احتجاجا پھوٹتے ہیں۔ اُگتے ہیں، بڑھتے ہیں، ابھرتے ہیں۔

داستان گو کی تمام تر زندگی اس عمل اور رد عمل کا ایک پیہم چکر ہے۔ ایک عظیم بھنور جس میں وہ ڈبکیاں کھاتا رہتا ہے۔ ڈوبتا ہے، ابھرتا ہے۔ پھر ڈوب جاتا ہے۔ مجمع صرف اس کے ابھرنے کا تماشا کرتا ہے۔ اس کی مدد کے



چھینٹوں سے شرابور ہوتا ہے۔ اس کے ڈوبنے کی کیفیت کو کوئی نہیں جانتا۔ اس کے جذر سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس نے اپنی زبان سے اس کشمکش کا بھی تذکرہ نہیں کیا جو آرا سا اس کے دل میں چلتا ہے، اس کا اظہار کون کرے۔ خود تو ازلی گونگا ہے۔

اگر آپ اس کی شخصیت کی اس بنیادی حقیقت سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو اس وقت اسے دیکھتے جیسے اکیلے میں بیٹھا ہو۔ جب اسے یہ احساس نہ ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا اسے دیکھے جانے کے امکانات موجود ہیں۔ اسے ذرا بھی شک پڑ گیا تو اس کے اندر کی طوائف ہشیا رہ جانے لگی۔

اشفاق احمد میں ایک بڑی حساس اور دلوں کو مسخر کرنے کی شوقین طوائف موجود ہے جو صرف اس لیے حسن اور رنگینی سے شرابور ہو کر قابل تماشا بن جاتی ہے جب اس میں یہ احساس جاگتا ہے کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔ احساس کے بغیر وہ ایک لاش ہے، ایک خزا ایک لا۔ اس لحاظ سے اشفاق احمد ایک تماشہ بین عورت ہے۔

اسیے میں اس کے چہرے کے خطوط نیچے کی طرف ڈھلک جاتے ہیں۔ پیشانی کی سلوٹس ریگ ریگ کی طرح دکھائی دیتی ہیں جو اس کے دل میں رواں دواں ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرتا ہے۔ چپ دکھ، چپ گھڑی چلتی ہے۔ آنکھیں اندھے کنوئیں بن کر دل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں اور ایک عظیم اکٹا ہٹ اسے طرف سے گھیر لیتی ہے۔

یہ دکھ اور چپ اس میں کسب پیدا ہوئے، کیوں پیدا ہوئے۔ مجھے اس کا علم نہیں لیکن مجھے اس کا علم ہے کہ بچپن، جوانی اور اوجیز عمر میں کوئی ایسا درپچ نہیں کھلتا جس سے دکھ یا چپ اندر داخل ہو سکتے۔ اس کی زندگی میں چپ کا کوئی جواز موجود نہیں۔

وہ کھاتے پیتے گھر میں پیدا ہوا۔ بہت سے بھائی بہنوں کا ایک کے سوا سب سے چھوٹا بھائی ہونے کی پرالیم بچہ بننے کے امکانات سے صاف بچ گیا۔ سب سے چھوٹے بھائی سے کئی سال بڑا ہونے کی وجہ سے باپ کا لاشریک محبت کے مزے لوٹتا رہا جس میں باپ کے علاوہ بڑے بھائی بہن بھی شامل تھے۔

اشفاق کی شخصیت میں دکھ اور چپ کا وجود میرے لیے ایک معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ میں زندگی میں آج تک اشفاق سا کامیاب آدمی نہیں دیکھا۔ اس نے جوانی میں روایت توڑ محبت کی۔ روایت کی دیواریں اس کے ارد گرد حقتہ رنے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ محبت میں کامیاب ہو گیا۔

احتجاجاً وہ گھر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ بے سہارا بے وسیلہ بے مددگار اور ایک ناممکن العمل کاروبار چھوڑ کر رائٹنگ (Script Writing) کی مدد سے گھر کا چولہا جلانے رکھا۔ اس نے اپنے ذوق کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور وہ صرف کامیابی ہی نہیں بلکہ شہرت حاصل کی۔

بے شک اشفاق نے جدوجہد کی، محنت و مشقت کی لیکن آپ جانتے ہیں کہ جدوجہد اور محنت و مشقت کے ضامن نہیں ہوتے۔ جہاں تک اشفاق کا تعلق ہے کامیابی اس کے پیچھے پیچھے یوں چلتی ہے جیسے پالتو کتیا ہو۔ اسی سے مجھے شک پڑتا ہے۔ مجھے گمان ہے کہ اشفاق کے کندھے پر کوئی ہاتھ ہے اور اشفاق کی زندگی اس ہاتھوں کی ہے۔

مسموم ہے۔ اشفاق Para-Psychology کو صرف اس لیے نہیں مانتا کہ وہ اس ہاتھ کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور نہ

میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق کی شخصیت کی بیشتر کمزوریاں اسی کامیابی کی وجہ سے ہیں۔ اس لیے ہیں کہ وہ ناکامی  
تحت نہیں۔ وہ جدوجہد سے ناواقف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اگر کامیابی ہم رکاب ہو جائے تو جدوجہد نہیں رہتی۔ اگر  
تو ہڈی میں دکھ اور چپ نہ ہوتے، بے جد دکھ اور چپ، بے نام دکھ اور چپ۔ اللہ واسطے کے دکھ اور چپ تو اشفاق  
کامیاب طوائف بن کر رہ جاتا جو آنکھیں ملکاٹی ہے۔ دنوں کو لہجاتی ہے۔ نگاہیں خیرہ کر کے دولت کے ڈھیر لگا لیتی  
میں دل کی دھڑکنیں نہ محسوس کرتی ہے نہ پیدا کر سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دکھ اور چپ اشفاق کے لیے قدرت کا ایک عطیہ ہیں جن کی وجہ سے کامیابی کے باوجود اشفاق آج  
ہنکار ہے۔

1947ء میں جب میں اسے پہلی مرتبہ ملا تو بنیادی طور پر وہ یہی کچھ تھا جو آج ہے۔ دکھ اور چپ کے تار و پود  
کا ٹکڑا جس پر یہاں وہاں سنہرے تاگے سے کڑھی ہوئی پھل پتیاں تھیں۔ آج بھی وہی ٹاٹ کا ٹکڑا ہے۔  
پن کچھ اور بڑھ گیا ہے اور سنہری پھول پتیوں میں طوائف کی چمکیلی پسواج کچھ اور نمایاں ہو گئی ہے۔ ٹاٹ  
کا تضاد کچھ اور واضح ہو گیا ہے۔

ان دنوں میں مہاجر کیپ میں مہاجروں کا حوصلہ بندھانے کے لیے مقرر کی حیثیت سے نوکر تھا۔ یہ اور بات  
کے حوصلہ بندھانے کی بجائے میرا اپنا دل ڈوب ڈوب جاتا۔ ایک روز کیپ کے ایک ویران کونے میں جب میں  
ہوئے دم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا تو ایک چٹی سفید، ٹنگٹنگی اور تازگی سے بھرپور کشمیرن میرے روبرو  
کھڑی ہوئی۔

آنکھیں چمکا کر بولی۔ ”آپ ممتاز مفتی ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”جی۔“

کہنے لگی۔ ”ہم نے آپ کی ”آپا“ پڑھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جی بہت اچھا کیا آپ نے۔“

بولی۔ ”میں ساتھ والے کیپ میں ملازم ہوں، کبھی آئیے ادھر۔“

میں نے کہا۔ ”جی اچھا۔“

بولی ”میرا نام اشفاق احمد ہے۔“

اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے سرخ خواب پر سنہرے بیل بوٹے کڑھے ہوں۔ شاید آج بھی ان  
کے نظر میں جو اسے سرسری طور پر جانتے ہیں، اشفاق احمد سرخ خواب پر سنہری پھل بوٹے ہی ہو۔ جیسے وہ پہلی نظر میں  
سہاٹی دیا تھا۔

پھر اشفاق اور میں ملنے لگے۔

جوں جوں وہ مجھ سے قریب ہوتا گیا۔ توں توں کنو اب جو گیاناٹ میں بدلنا گیا لیکن سنہری پھل پتیوں کے  
میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

پھر جلد ہی مجھے اشفاق کے بھید کا پتہ چل گیا۔ اس ایک جسم میں دو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں۔ جو گیاناٹ  
احمد تھا۔ سنہرے پھول بوئے داستان گو تھا۔ مجھے اشفاق احمد سے محبت ہو گئی اور میں داستان گو سے کھلنے لگا۔ اس سے  
کہ داستان گو میں سے طوائف جھانک رہی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ طوائف میری طوائف سے کہیں زیادہ بھڑکی تھی۔  
نفی کر دیتی تھی۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میری دانست میں ہر فنکار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں مستی  
میں اُدھ کھنی کسی میں نمایاں کسی میں تنگی مثلاً ابوالاثر حفیظ میں بالکل تنگی ہے اور طفیل میں بالکل مستور ہے۔ شہاب  
کبھار سب بام آتی ہے اور اشفاق میں گھونگھٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ بہر حال آج بھی اشفاق احمد میرے  
دوست ہے لیکن داستان گو سے مجھے چڑ ہے۔

ان دنوں اشفاق اور میں روزانہ اپن ایئر تھیٹر میں ملا کرتے تھے۔ اوپن ایئر تھیٹر ان دنوں زوہبی کے تھے  
تھا۔ زوہبی ایک ابھرتا ہوا آرٹسٹ تھا، سنا ہے آج کل وہ کراچی کا رہیس ہے۔

زوہبی ایک خوش باش نوجوان تھا۔ کمر تو تھا لیکن بات میں پھلجھڑی تھی۔ زہین تھا لیکن خدو خال ایسے تھے کہ  
منظر عام پر نہیں آتی تھی۔ رنگین تھا لیکن چہرے پر بے نیازی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اتنے ڈھیر کہ جموں کا شہر  
کی سب سے بڑی خصوصیت ایک پراسرار خصوصیت تھی جو غور و خوض کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اور حال  
ایک مستقل چیلنج بنی ہوئی تھی۔

زوہبی کی درمیانہ سی شکل و صورت، عام سی چال ڈھال اور عام سی بات چیت کے باوجود کیا اس شخص نے  
بیگمات سپروگی کے مفرد اور واحد جذبے سے سرشار، دور دور سے اپنے خرچ پر اوپن ایئر تھیٹر میں آتیں اور کسی تھیٹر  
ملاقات کے بغیر دیوتا کی بھینٹ چڑھ کر خوشی خوشی واپس چلی جاتیں اور دیوتا مہاراج یوں نروان زدہ بیٹھ رہتے تھے  
بات ہی نہ ہو۔ جیسے بھینٹ لیہا ان کا پیدا کنسی حق ہو۔

اشفاق کے لیے یہ سب لائٹ ٹھاٹھ تھے۔ داستان گو کے لیے صرف رنگین تفصیلات تھیں جو وہ اپنے تھیٹر  
مہر تار ہتا تھا۔ اشفاق اور داستان گو دونوں کو جنس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں جو اپنے کو جنسیات کا طالب علم سمجھتا  
کتابی مسائل میں بڑی دسترس رکھتا تھا، میرے لیے اوپن ایئر تھیٹر میں ہر نئی بھینٹ کی آمد ایک تھیٹر کی حیثیت  
چونکہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کس اصول کے تحت ہو رہا ہے، اس عمل میں سبب کیا ہے، نتیجہ کیا ہے۔

چنانچہ..... میرے علمی زعم کے منہ پر تھیٹر پڑتا۔ داستان گو میری بے بسی پر بغلیں بجاتا۔ چنانچہ  
پڑتا۔ اشفاق میرے قریب آ بیٹھتا اور اپنا جو گیاناٹ میرے گرد لپیٹ دیتا جیسے حقائق کی دیدہ دلیری کے خلاف  
رہا ہو۔ دیدہ دلیر دیوتا حیرت سے ہماری طرف دیکھتا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ بات کیا ہے۔

پھر ماحول کی گھٹن دور کرنے کے لیے داستان گو میدان عمل میں آ جاتا اور سنہری باتوں کے غبار

تھے۔ جاذب توجہ کلوز آپ۔ دل نشین تفصیلات، نقلیں، Mimics، قصے، کہانیاں، لوک کہتائیں حتیٰ کہ اوپن ایئر تھیٹر سٹیج پر جاتا جس میں قہقہے گونجتے، تالیں بجتیں اور دیوتا بھیٹ کا قصہ پس پشت پڑ جاتا۔

ان دنوں اشفاق احمد ایک لٹریچر جزیئرے میں رہتا تھا، جو رابنسن کروسو کے جزیئرے سے کہیں زیادہ ویران تھا۔ اشفاق احمد کا یہ جزیئرہ ایک وسیع و عریض رستے بستے گھر کی دوسری منزل پر واقع تھا۔ چلی منزل میں میلہ لگا رہتا۔ پلٹے پلٹے، ہنڈول جھولتے۔ شور شرابا گونجتا۔ اوپر منزل میں ہوتی اور عظیم خلا کے تلے دبا ہوا سہا ہوا اشفاق احمد۔

اشفاق احمد کی کشادہ نیم چھتی میں چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کہ کتابوں کے انبار کتنے تھے۔ دل میں ایک بے نام عجز کیوں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے نیم چھتی میں اکیلا اشفاق بیٹھا رہتا تھا۔ کہ وہاں دم گھٹتا تھا، لہذا اس نے وہاں کبھی قدم نہ رکھا تھا۔

اس جزیئرے میں آنے جانے کے بعد میں نے جانا کہ اشفاق صرف چپ اور دکھ ہی نہیں بلکہ وہ ازلی اکیلا ہے۔ وہ بذات خود ایک جزیئرہ ہے جو کسی کشتی کو کنارے لگنے نہیں دیتا۔ جو نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی وحدت کو توڑے۔

سارا سارا دن وہ کتابوں کے انباروں تلے ڈھیروں جو گیٹاٹوں میں لیٹا ہوا پڑا رہتا۔ پتہ نہیں اس بوجھل تنہائی کی کیا طاقت ہے۔ یا جو گیٹاٹ کی وجہ سے یا جو گیٹاٹ کی وجہ سے، اس میں ایک عظیم آسائش بیدار ہو جاتی۔ ایک وحشت سی گمراہی۔ گمراہ سنہرے پھول بوٹوں والا چغہ پہن لیتا۔ چغہ پہننے ہی طوائف جاگتی، چہرے کے زوئے اوپر کو ابھر جاتی۔ پر غمی تبسم آجاتا اور وہ نیم چھتی کی سیرھیاں اتر کر چکیاں بجاتا ہوا لاہور کی بھڑ میں جا داخل ہوتا۔

لاہور میں اشفاق احمد کی زندگی سٹیو سن کے ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ کی طرح نہیں تھی۔ چونکہ اشفاق کی شخصیت میں ایک ایسا عنصر سرے سے مفقود ہے۔ داستان گو طوائف کا شرف مجمع لگانے اور اپنے سنہرے پھول بوٹوں کی بھڑ میں چمکانا، آکھیں چمکانا، قہقہے لگانا۔ خود ناچنا مجمع کو نچلانا۔ لیکن داستان گو کا یہ ورز زیادہ دیر نہیں چلتا تھا۔ اس جزیئرے میں جزیئرہ، وہی ہوتی، وہی جو گیٹاٹ، وہی دکھ، وہی چپ، وہی تنہائی۔

اشفاق کی یہ دو شخصیتی زندگی سٹیو سن کے ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ کی طرح نہیں تھی۔ چونکہ اشفاق کی شخصیت میں ایک ایسا عنصر سرے سے مفقود ہے۔ داستان گو طوائف کا شرف مجمع لگانے اور اپنے سنہرے پھول بوٹوں کی بھڑ میں چمکانا، آکھیں چمکانا، قہقہے لگانا۔ خود ناچنا مجمع کو نچلانا۔ لیکن داستان گو کا یہ ورز زیادہ دیر نہیں چلتا تھا۔ اس جزیئرے میں جزیئرہ، وہی ہوتی، وہی جو گیٹاٹ، وہی دکھ، وہی چپ، وہی تنہائی۔

اشفاق احمد میں چھپے ہوئے دونوں افراد ڈاکٹر جیکل تھے۔ ایک مٹی کی ہنڈیا کے مصداق تھا جس میں دکھ، چپ، گمراہی کے کچھوے رینگ رہے تھے۔ دوسرا نقش و نگار سے سجا ہوا چاندنی کا سرپوش تھا جو ہنڈیا اور کچھووں کو چھپانے کے لیے کمر باندھ کر پیش کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس زمانے میں اشفاق کی زندگی اس عورت کی طرح گزر رہی تھی جو سارا دن ننگے سر ننگے پیراں دھلا منہ اور ہنڈیا کے کچھوے رینگ رہے تھے۔ دوسرا نقش و نگار سے سجا ہوا چاندنی کا سرپوش تھا جو ہنڈیا اور کچھووں کو چھپانے کے لیے کمر باندھ کر پیش کی حیثیت رکھتا تھا۔

جاتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ طوائف لینے دینے اور بکنے بکانے سے بے نیاز تھی۔

پتہ نہیں فنکار کی تخلیق میں قدرت کا تضاد کا آرا کیوں چلاتی ہے۔ بنیادی طور پر اپنا ج بنا کر پھر اسے اپنے  
انگلیخت کیوں دیتی ہے۔ ازلی طور پر گونگا بنا کر پھر اسے باتوں کی پھلجھڑیاں چلانے پر کیوں اکساتی ہے۔ کسی نہ کسی صورت  
کر پھر دکھ کے بادلوں کو ٹکرا کر بجلی کے ققمے کیوں جلاتی ہے۔ پتہ نہیں قدرت ایسا کیوں کرتی ہے مگر وہ یقیناً ایسا کرتی ہے  
اس زمانے میں اس ویران جزیرے میں تنہائی، دکھ اور چپ کے بنیادی رنگوں سے قدرت ایک فنکار کی  
رہی تھی۔

اشفاق احمد درحقیقت اشفاق احمد خاں ہے، وہ ذات کا پٹھان ہے، لیکن اس کی شخصیت میں پٹھان کی کوئی  
نہیں۔ مگن ہے اس کی وجہ تبدیلی آب و ہوا ہو۔ اس کی تنہائی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اس رستے پر  
چاروں طرف سے یوں پٹھانوں میں گھرا ہوا تھا جیسے کوئی شور دریاہمنوں میں گھرا ہوا ہو۔  
اپنی مٹی میں پٹھان چند ایک واضح اور نمایاں خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جو پٹھانیت کی شاہد ہوتی ہے  
آب و ہوا بدل دیے جائیں تو پٹھان میں نئے جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ نئی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ تخلیقی دلوں  
ہیں جو پٹھانیت کی دیگر مثبت خصوصیات کو دبا دیتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے پٹھان ان پٹھانوں کو نہیں مانتے جو تبدیلی  
ہوا کے مرتکب ہوتے ہیں اور انہیں اپنانے سے گریز کرتے ہیں۔

اشفاق احمد وہ پٹھان ہے جسے پٹھان پٹھان نہیں مانتے اور وہ خود بھی اپنی طبعی ناپٹھانیت کو تسلیم کرتے  
تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے یا جانے کیوں اشفاق احمد میں کئی ایک ہفت رنگی عناصر پیدا ہو چکے تھے  
شخصیت میں ایک بھیلرنگی ہوئی ہے۔ ایک جناوہاری سا دھو رکھ رکھاؤ سے سرشار ایک صوفی خودنمائے  
طوائف، چتر کا بنا ہوا ایک دیوتا۔ دوسروں کو نصیحتیں کرنے پر پھبتیاں کہنے والا تلقین شاہ، سن کر جذب کر لینے  
کان۔ ایک صف میں کھڑا ہونے والا محمود، چھوت چھات کا متوالا کشمیری پنڈت۔ مشینوں سے کھیلنے والا ایک  
پُردوں کو ذی روح جاننے والا ایک بدھ بیماری۔ مدہم محبت سے سرشار مگر نہ دھڑکنے والا ایک دل پیسے پیسے  
والا ایک بنیا، لٹیا لٹھا ہانے والا ایک غنی۔ دے کر کبھی نہ بھولنے والی ایک مسمر عورت اور نہ جانے کیا کیا  
صلاحیت نہیں کہ ایک رنگارنگ ہفت رنگی شخصیت کا احاطہ کر سکوں۔

دور حاضر کے جانے پہچانے شخصیت نگار محمد طفیل کی طرح میں الفاظ میں شخصیت کی تعمیر نہیں کر سکتا  
تجزیے کی قبضی سے کاٹ پیٹ کر کے شخصیت کے بنیادی عناصر کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔ محمد طفیل انسانی شخصیت کے  
(Jig Saw) ٹکڑوں کو بڑی محبت بڑے صبر و تحمل سے جوڑتا ہے۔ مجھ میں محمد طفیل سا صبر نہیں، تحمل نہیں۔ مٹھان نہیں  
رنگین بیانی نہیں۔

مجھ میں نہیں آتا کہ محمد طفیل نے آج تک اشفاق احمد کی شخصیت پیش کرنے سے بخل کیوں فرمایا ہے  
منہ بند حاضر رہے لیکن وہ بخیل نہیں۔ شاید اس کی وجہ اشفاق خود ہو جو کسی کشتی کو اپنے کنارے لگنے نہیں دیتا۔ یہ  
وجہ سنہرے پسواج والی طوائف ہو جو چاروں طرف گھوم پھر کر اشفاق احمد کے خلاف پروپیگنڈہ کرتی پھرتی ہے

بیات یقینی ہے کہ مولانا محمد طفیل کا اسلام ابھی خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلا، اس لیے وہ ابھی گھنگھر وکی آواز کے گونجے ہوئے جھبی تو وہ اپنی طوائف کو سات پروں میں ملفوف رکھتے ہیں۔

اشفاق احمد کے والد ایک عظیم شخصیت تھے۔ اتنی عظیم کہ انہوں نے خان منزل کے تمام افراد کو کبڑا بنا رکھا تھا۔ وجود سے گھر میں بالشتیوں کی بھینز لگی ہوئی تھی۔ جب یہ گلیور گھر پر ہوتا تو کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوتی۔ جب وہ سے باہر ہوتا تو گھر میں دھما چوکڑی مچ جاتی لیکن ان کی بیگم اس سوچ میں کھوئی رہتیں کہ عجز و ادب اور احترام کا کون سا کیا ایجاد کیا جائے جس کی مدد سے ظن الہی کو ڈھب پر لایا جاسکے۔

خان منزل میں صرف پتھان خصوصیات کی قدر و منزلت تھی۔ چونکہ اشفاق ان خصوصیات سے محروم تھا، لہذا اس کے لیے وہ سب سے چھوٹا بالشتیا تھا۔ چونکہ ازلی گونگا تھا اس لیے مشکلہ احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ یوں اشفاق احمد کی دیکھی تہوں کی طرح کا ایک طوفان اکٹھا ہوتا رہا۔ اسی عرصہ دراز سے دے ہوئے طوفان کی وجہ سے اشفاق احمد آج بھی کسی گلیور کی شکل میں تیار نہیں۔ وہ کسی غلطی سے کسی پہلو سے اپنے کو بالشتیا سمجھنے یا ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اشفاق احمد کی عظمت کا خود تذکرہ نہیں کرے گا لیکن اس کا جی چاہے گا دوسرا کرے۔ دوسرا کرے تو اشفاق احمد کے چہرے کی چلنی شروع ہو جائے گی۔ چہرے کے زاویے اوپر کو ابھریں گے۔ آنکھوں میں نرمکی مکان کی چمک ظاہر ہوگی۔ سرے فنکار کی عظمت کی بات چھڑ جائے تو وہ اسے کالے گانٹھیں لیکن آپ کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملائے گا۔ اشفاق احمد کی شخصیت کے بنیادی سادھوپن سے مجھے انکار نہیں لیکن اس کی فنکارانہ خاموشی کے گھونگھٹ میں چھپے رہنے کی ایک کچھ زیادہ ہی طوطا چشم ہے۔ ہاں وہ فنکارانہ عجز سے کورا ہے۔

اس جزیرے کی بوجھل تہائی میں اشفاق احمد نے جو اظہار کا پہلا طریقہ آزما یا، وہ مصوری تھا۔ اس کا مصوری کی شکل ہونا غالباً زونبی سے میل ملاپ کی وجہ سے تھا۔

یہ تو میں نے اشفاق کے بنائے ہوئے کئی ایک مکمل اور ادھورے عمل دیکھے تھے لیکن دو عمل مجھے خصوصی طور پر یاد آئے۔ اس لیے کہ وہ دونوں میرے مضمون یعنی جنس سے متعلق تھے۔

اشفاق کے پہلے عمل کا نام دی کال بل (The Call Bell) تھا۔ تصویر میں نسائی جسم کا وہ برقی بٹن دکھایا گیا ہے جس سے محترمہ احترام کے پردے چاک کر کے باہر نکل آتی ہے۔ تصویر کو دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے باہر آنے والی محترمہ حقیقت ایک جن ہو جسے نسائی بوتل میں قید کر رکھا ہو۔ عمل کی عظمت یہ تھی کہ تصویر میں ایک نظر میں محترمہ دکھائی دے دوسری نظر میں جن۔

دوسری تصویر کا کوئی نام نہ تھا۔ ہوتا تو The Phallic Woman ہوتا۔ یہ تصویر بھی عورت ہی کی تھی جو اپنے جسم کی مٹکی علاقہ منظر عام پر کندھوں پر اٹھائے پھرتی تھی اور صرف اٹھائے ہی نہیں پھرتی تھی بلکہ اسے چھلکاتی تھی کی خوبی یہ تھی کہ ایک نگاہ میں وہ جھنجھی نظر آتی تھی اور دوسری نگاہ میں معصومیت میں ملفوف جیسے جانتے نہیں۔

پتہ نہیں اشفاق احمد نے جنس کے موضوع کو عمل نگاری میں کیوں اپنایا اور اگر اپنایا تھا تو اسے کیوں چھوڑ دیا۔ ایک جھنجھی طور پر یقینی ہے کہ اشفاق احمد اور داستان گو دونوں کو جنس سے کوئی لگاؤ نہیں۔ دونوں کو جنس صرف اسی صورت میں

گوارا ہے جب وہ جذبے کے سینڈوچ میں چھپا ہوا ہو۔

میری دانست میں جنس کے اس لحاظ سے مردوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو جذبہ درپچہ کھولنے کے بغیر جنس کے ایوان میں چہل قدمی کے شوقین ہیں۔ دوسرے وہ جن میں جنس کی وجہ سے جذبہ کھل کھل جاتا ہے اور تیسرے وہ جن میں جذبے کی وجہ سے جنس کی کھڑکی نیم وا ہو جاتی ہے۔ اشفاق احمد ازیلی طور پر تیسرے سے تعلق رکھتا ہے۔

ان دنوں اشفاق احمد کی آرزو تھی کہ حسین اور طرح دار لڑکیوں کو باتوں کے جال بن کر اپنی طرف متوجہ کرے کہ وہ اثر سے بھیگ جائیں۔ متوجہ اور متاثر کر لیتا تو پھر گھبراہٹ اور خوف طاری ہو جاتے۔ ”اب کیا ہوگا۔“ ”اب کیا ہوگا“ کے متعلق اس کا ذہن بے خبر نہ تھا لیکن دل تیار نہ تھا، لہذا ”اب کیا ہوگا“ کے خوف سے وہ بھاگ لیتا۔ اٹلے بھاگ لیتا۔

دراصل اشفاق کی خواہش یہ تھی کہ لڑکی اس کی داستانوں کے جال میں پھنسے۔ اثر سے بھیگ جائے۔ اس سے بھیگ جائے کہ اس میں حرکت کی طاقت نہ رہے۔ دور کھڑی رہ کر بات کرے۔ محفوظ فاصلہ قائم رکھے تاکہ ”اب کیا ہوگا“ کا خطرہ پیدا نہ ہو۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ نسائی نفسیت کے مطابق فاصلے محفوظ نہیں ہوتے قرب محفوظ ہوتا ہے، لہذا یہ حفاظت کے لیے آگے بڑھنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اشفاق احمد کے لیے پیچھے ہٹنا محفوظ تھا، لہذا بار بار ہٹتا ہٹتا۔ اٹلے پاؤں بھاگا، ہونکتا ہوا اپنے جزیرے میں پہنچا۔ بارہا اس نے خطرے کے مقام پر باتوں کے جال بننے سے لیکن باتوں کے جال بننے کی عادت اس کی ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی، لہذا بارہا تو یہ ٹوٹی۔ بارہا وہ اٹلے پاؤں ہٹتا ہونکتا ہوا اپنے جزیرے میں پہنچا۔ جب گورنمنٹ کالج کے میدان میں وہ محترمہ منظر ص پر آ گئی۔

وہ محترمہ بڑی چتر کار تھی۔ اس کی آنکھ میں دو دھاری نگاہ تھی۔ اندر سے قدیم تھی، اوپر سے جدید۔ اوڑھ رکھا تھا۔ اندر پرانا مشرقی رنگ تھا اور ڈسٹمبر تھا یعنی دروپدی کے سونے پر گیشیا کا مٹیچڑھا ہوا تھا۔ وہ متاثر کرنے کی بجائے متاثر کی چتر کاری سے واقف تھی اور متاثر ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کی عادت تھی۔ وہ محترمہ ان مشرقی خواتین میں سے جو پیچھے ہٹنے والے کو پہچان لیتی ہیں اور خود پیچھے ہٹ کر اسے پیچھے ندامت سے بچا لیتی ہیں۔

وہ محترمہ اشفاق احمد کی باتوں کے جال میں پھنس گئی۔ تاثر سے بھیگ گئی اور پھر آگے بڑھنے کی بجائے ہٹے۔ اشفاق احمد کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا، وہ اسے پیچھے ہٹتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اب کیا ہوگا کے خوف سے ہٹ کر پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھنے لگا اور آگے۔ اشفاق کے لیے یہ ایک نیا اور انجانا مشاہدہ تھا جس میں آگے بڑھنے لذت موجود تھی لیکن فاصلہ کم ہونے کا ڈر نہ تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ اشفاق احمد نے برش اور رنگ کو کیوں الماری میں بند کر دیا اور ان کی جگہ قلم کو کیوں اپنایا۔ مجھے اس کا حالانکہ عمل معانی اور تکنیک کے لحاظ سے کامیاب تھے۔ اصولی طور پر تو اشفاق کو موسیقار ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کے

سیتارہ بننے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے انسانی کردار کے گونا گوں روپ سے بے پناہ دلچسپی ہے۔ اس لیے خالی آواز زیرو سے بندہ کر سکا۔

قلم اٹھاتے ہی تفصیلات نے اسے چاروں طرف سے آگھیرا۔ وہ تفصیلات جن کے بل بوتے پر داستان گو مجموعہ تحریر و داستان گو نے اپنے تھیلے سے گلوزاپ کے رول کے رول نکال کر باہر رکھ دیئے۔ اشفاق احمد نے ان بھڑکیلی تصویرت کو اپنے میں چھان لیا۔ بے نام دکھ اور چپ کی چاشنی کی وجہ سے ان میں ادبی رنگ پیدا ہو گیا اور اشفاق احمد افسانہ نگار بن گیا۔ اگرچہ اس کا سہرا اس گونگے اکیلے دکھ کے پڑا ہے اشفاق احمد کے سر پر تھا لیکن تفصیلات تو داستان گو کی تھیں، داستان گو نے لپک کر اپنے سر پر لگا لیا۔

اس زمانے میں اشفاق احمد کو کچھ کرنے کا شوق تھا، کر دکھانے کا نہیں۔ آج کل اسے کچھ کرنے کا شوق بھی تھا مگر کبھی چونکہ وہ شو بزنس میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ اس کے باوجود بنیادی طور پر وہ ایک مزدور ہے، وہ کدال چلا سکتا ہے۔ بیج بوسکتا ہے، فصل اگا سکتا ہے۔ اسے یہ تمنا ہے کہ فصل کو دیکھ کر نوگ واہ واہ کہتے کہ کیسے اچھے بوئے ہیں لیکن فصل کھت نہیں سکتا۔ وہ اپنے فن کی گڈ ویل (Good Will) پیدا کرنے کا متمنی ہے لیکن اس گڈ ویل کو کیش کرانے کا اہل نہیں۔

ادبی دنیا میں ابھی مقام پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ اشفاق احمد کو زیادتی مصائب نے آگھیرا۔ ان مصائب کی تمام تر یہ ایک فرائی ڈے تھی۔ جزیرے کے رہنسن کر دوسو نے اس فرائی ڈے کو اپنا لیا۔ اس کا یہ فعل اس ویران اور تہائی زدہ جزیرے کا اپمان تھا، لہذا جزیرے نے اشفاق احمد کو اگل دیا اور وہ دنیاوی مصائب کے طوفان زدہ پانیوں میں ڈبکیاں کھانے لگا۔

اب رہنسن کر دوسو اور فرائی ڈے کو کسی چھت تلے سر چھپانا تھا، چولہا جلانے کا اہتمام کرنا تھا۔ دو وقت کی روٹی کھانا کرنا تھا، لہذا اشفاق احمد سکرپٹ رائٹر بن گیا۔ خوش قسمتی سے یہ فرائی ڈے وہ محترم تھی جو پیچھے بننے والے کو آگے بڑھنے کی حق دے سکتی تھی جو بہتر نصف کا بوجھ بننے کے بجائے شوہر کا ساتھ دے سکتی تھی، لہذا دونوں میاں بیوی نے اپنے اپنے کاموں پر اٹکائے، ہاتھوں میں کاغذ کی سلپیں تھامیں اور لاہور کے گلی بازار میں پھیری لگانے لگے۔ چلو بھئی کوئی سکرپٹ لکھو۔ چلو بھئی کوئی سکرپٹ لکھو۔

عرصہ دراز تک اشفاق احمد کے گھر میں تمام حساب کتاب سکرپٹوں کا ہوتا رہا۔ گرا یہ مکان چار سکرپٹ۔ چھٹی خانے کا خرچ آٹھ سکرپٹ، لین دین ایک سکرپٹ، علاج معالجہ آدھا سکرپٹ۔ آج بھی اشفاق کی بیگم سے پوچھو کہ یہ ساڑھی کتنے میں لی تھی تو وہ جواب دے گی، اچھی طرح سے یاد نہیں شاید ایک سکرپٹ لگا تھا یا ڈیڑھ۔

بانو قدسیہ کی آمد کے بعد اشفاق احمد کے گھر میں دکھ کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ دنیاوی دکھ نہ تھے چونکہ اشفاق احمد میاں پر کامیابی حاصل کیے جا رہا تھا۔ یہ دکھ ازدواجی بھی نہیں تھے۔ چونکہ اشفاق کو بانو سے محبت تھی اور بانو صرف اشفاق کے لیے جیتی تھی۔ دکھ کے ان ڈھیروں کی وجہ صرف یہ تھی کہ بانو اشفاق کے دکھ کو بانٹنے پر مصر تھی لیکن یہ نقطہ وضاحت طلب ہے اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ایک لحاظ سے بانو کا اشفاق سے تعلق کچھ ایسا ہے جیسے حبیب کا تعلق اپنے بڑے بھائی سے ہے۔



میرے دوست قدرت اللہ شہاب جو دکھتے نہیں لیکن دیکھتے ہیں۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہیں۔ میں نے کہا، وہ کیسے؟ بولے انہوں نے میرے تحفظ کا ایک انوکھا انتظام کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا؟ بولے میرے حصے کے سارے دکھ میرے چھوٹے بھائی حبیب کو منتقل کر دیئے جاتے ہیں اور حبیب کی ساری خوشی مجھے منتقل کر دی جاتی ہے۔ میں نے کہا، مطلب کیا ہوا؟ کہنے لگا کتنا مجھ کو چھتا ہے۔ درد حبیب کو ہوتا ہے۔ قہقہہ حبیب ہے، خوشی مجھے منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کی صرف باچھیں دکھنے لگتی ہیں۔ میں نے کہا ج، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ بولے جی ہاں ہے۔ ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، میں نہیں مانتا۔

کچھ عرصہ بعد قدرت اللہ شہاب کی آسامی کے متعلق راولپنڈی میں شدید گزبڑ ہوئی۔ حبیب کراچی گیا اسے اس گزبڑ کا علم نہ تھا۔ شام کو حبیب کا فون آیا۔ کہنے لگا وہاں کوئی گزبڑ تو نہیں۔ میں نے کہا بالکل نہیں۔ بولا میرا دل ہے کہ ہے۔ میں نے کہا، تیرا دل تو دیوانہ ہے۔ بولا وہ تو ہے لیکن بکار خویش، شیر ہے۔ میں نے کہا فضول باتیں نہ کرو پنڈی آ جاؤں؟ میں نے کہا، ضرورت بھی ہو۔ بولا تمہیں یقین ہے کوئی گزبڑ نہیں۔ میں نے کہا بالکل۔ اگر میری بات یقین نہ ہو تو شہاب سے پوچھ لو۔ شہاب نے فون پر آ کر کہا، یہاں بالکل خیریت ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سے سو جاؤ۔

اگلے روز صبح سویرے حبیب ٹائٹ کوچ سے پنڈی آ پہنچا۔ کہنے لگا تمہاری تسلیوں کے باوجود مجھے چھتر چھتر تھا۔ دل کہتا تھا ضرور یہاں گزبڑ ہے اور قدرت تکلیف میں ہے۔ اس لیے میں کرایہ ادھار لے کر چلا آیا۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کتنا کسی کو چھپے اور درد کسی اور کو ہو۔ اگر کتنا اشفاق کو صرف چھتا اور دکھ صرف بانو کو ہوتا، اشفاق کو نہیں یا دکھ اشفاق کو ہوتا اور بانو اسے پاتا۔ اک بات ہوتی لیکن اشفاق کا دکھ کانٹوں سے بے نیاز ہے۔ اسے اس بات پر دکھ ہے کہ اسے کوئی دکھ نہیں۔ اس کا دل بے مقصد ہے، ازلی ہے، ازلی دکھ کو کوئی بانٹ نہیں سکتا۔ وہ ایک کنوئیں کی طرح ہے۔ بانو چاہے ڈول بانٹ لیتی چلی جائے کنواں جوں کا توں بھرا کا بھرا رہے گا۔ بانو اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ دکھ بانٹنے کے لیے وہ ڈول بانٹ لیتی رہتی ہے۔ اشفاق اپنی اصلیت کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس کا کنواں بھرا کا بھرا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گھر میں بے مقصد بے معنی دکھ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بے معنی ہو تو دکھ کی دھارا اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ کئی ایک برس اشفاق اور بانو نون کے وقت لاہور کے بازاروں میں سکرپٹ لکھوا لو کی پھیری لگاتے۔ رات کو قلم کے پھاؤڑے چلاتے رہے۔ آج وہ پھیری نہیں لگاتے لیکن قلم کا پھاؤڑا پہلے کی نسبت کہیں زیادہ چلاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ان کے گھر چلے جاؤ تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ نشیوں کا گھر ہے۔ وہ تو فارغ البال میزبانوں کا گھر ہے۔ یہ آج کی بات نہیں اس زمانے میں بھی وہ فارغ البال میزبانوں کا گھر لگتا تھا جب چولہا جلانے رکھنے کا سہارا پیش تھا۔ دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ اشفاق اور بانو دونوں کے سکرپٹوں سے کبھی مشقت کے پسینے کی بو نہیں آتی۔ اسی زمانے میں داستان گو کو شرات سوچیں۔ اس نے اشفاق احمد میں چھپے ہوئے اس ٹھکنے بالشتیے کو کھینچا جسے اشفاق کے بچپن میں کسی گلیور نے تخلیق کیا تھا اور جو جذبہ انتقام سے اندر ہی اندر اب تک سلگ رہا تھا۔

دراصل اشفاق کو غصہ نہیں آتا۔ وہ بھڑک کر جلنے کی لذت سے محروم ہے۔ وہ چڑتا ہے، بل کھاتا ہے، سلگتا ہے۔ سنگن کا دوسرے کی ناک میں دھواں دیتا رہتا ہے۔ آپ کوئی بات کہہ دیں تو وہ چپ ہو جائے گا، جواب نہیں دے گا۔ اس کے اندر چڑچڑانے بھنتے رہیں گے۔ کئی بار یہ چڑاس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ اس کا گھر بھٹیاریان کی کڑھائی بن کر رہتا ہے۔

ہاں تو داستان گونے اس ٹھگنے کی چڑکو جگا دیا۔ اشفاق کے روبرو ایک گلیور آکھڑا ہوا۔ ایک ایسا گلیور جو دوسروں کے لیے گلیور کرنے کا متوالا تھا۔ اشفاق نے قلم سنبھالا اور دوسروں کو تلقین کرنے والوں کا بھانڈا پھوڑنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تلقین شاہ صاحب عالم وجود میں آ گئے۔

تلقین شاہ ایک عظیم کردار ہے، ایک روایتی گلیور۔ لوگوں نے تلقین شاہ کو سنا تو بھو بھوکے رہ گئے۔ ہر کسی کے دل کی تپسیوں سے چھپے ہوئے ہاشیے نے سر نکالا اور لوگوں کو تلقین کرنے والے اس گلیور پر تالیاں بجانے لگا جس نے اسے متاثر کیا تھا۔ ہم سب میں ایک نہ ایک ہاشیتیا موجود ہے جس کا وجود کسی ناسی تلقین شاہ کا مرہون منت ہے۔

تلقین شاہ کی آمد پر بہت سے بھرے ہوئے پھوڑے پھوٹ گئے۔ دلوں میں تپنے ہوئے تپ و تاب ڈھیلے پڑ گئے۔ دے ہوئے غصے تسمخر کی صورت میں نکلنے لگے۔ انتقام کے جذبات ترس میں بدل گئے۔ پند و نصیحت کا بھانڈا چورا ہے۔ پھوٹ گیا۔ تلقین شاہ ایک عظیم کردار ہی نہیں۔ وہ ایک سائیکل ایٹریسٹ (Psychiatrist) بھی ہے۔ ایک عظیم ڈاکٹر جس نے کھڑوں کو سیدھا کر دیا۔ ہاشیتوں کو قد و قامت عطا کیے، لوگوں کو زبان بخشی۔ دلوں میں پڑی ہوئی گرہوں کو کھول دیا۔ ہم سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے بتوں کو توڑ دیا۔

لوگوں نے فرط محبت سے اس بت شکن کو آنکھوں پر بٹھالیا اور اشفاق احمد بکا بکا رہ گیا۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ کہ عوام آنکھوں پر بٹھالیں تو آسمان کے تارے قدموں میں آگرتے ہیں۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ شہرت کا مفہوم کیا ہے۔

ریڈیو کے پروگرام میں ایک رات تلقین شاہ نے ہدایت اللہ سے کہا کہ وہ کہیں سے مالٹوں کے چھلکے اکٹھے کر کے صاحب کے مکان کے دروازے پر ڈھیر کر دے تاکہ محلے والے سمجھیں کہ شاہ صاحب کے گھر میں پھل اس کثرت سے کھائے جاتے ہیں تاکہ محلے میں ان کی ساکھ پیدا ہو۔

اگلی صبح اشفاق احمد کے مکان کے صدر دروازے پر مالٹے کے چھلکوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اشفاق کے شیدائیوں نے رات کے اندھیرے میں مالٹے کے اتنے سارے چھلکے کہاں کہاں سے چن کر اکٹھے کیے تھے۔

اشفاق احمد کے مالک مکان نے جان بوجھ کر وائٹ ٹیکس ادا نہ کیا تاکہ ٹل کٹ جائے اور اشفاق احمد مکان خالی کر دے تاکہ مکان زیادہ کرائے پر لگ سکے۔ ٹل کاٹنے کے لیے دولائن مین آگئے۔ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ میاں جلد پتہ چلی سے کام نہ لو۔ کچھ مہلت دو لیکن وہ نہ مانے۔ جب دلیل سے کام نہ چلا تو ہم نے ان کی منتیں کیں۔ پھر بھی وہ نہ مانے۔ اس اثنا میں اشفاق آ گیا۔ اس نے صورت حالات کا جائزہ لیا اور معاملہ بھانپ لیا۔ پھر وہ لائن مینوں سے تلقین شاہی زبان میں بولا۔ ہاں کاٹ دو۔ اس ٹل کو فوراً کاٹ دو۔ جو نہ کاٹا گیا تو یہ خدشہ لگا رہے گا کہ کسی روز ہم چلو بھر پانی میں ڈوب

میں۔ شاہ کی آواز سن کر لائن مینوں کے ہاتھ رک گئے۔ بولے شاہ جی..... آپ؟ تلقین شاہ بولا، ہاں ہاں مجھے یہ سب ہی تو ہے۔ لائن مینوں نے جھک کر تلقین شاہ کو فرشی سلام کیا اور کہنے لگے، شاہ جی معاف کرنا ہمیں پتہ نہ تھا۔ چاہے سب سے پہلے واٹر ٹیکس ادا نہ ہو، پر شاہ جی کائل نہیں کئے گا، کبھی نہیں۔

ٹیکس والوں نے اشفاق کو دفتر میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ٹیکس کم ادا کیا گیا ہے۔ حساب کتاب پیش کیا جائے۔ دفتر میں حاضر ہو کر اشفاق نے دیا رگڑا۔ تلقین شاہ حاضر ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حساب دیکھانے اور نیا ٹیکس ادا کرنے کے بجائے ادا شدہ ٹیکس میں چھوٹ کے فارم بھر کر اشفاق گھر آ گیا۔

تلقین شاہ کی آمد نے اشفاق احمد کی زندگی کو سوتے جاگتے کا قصہ بنا دیا۔ اشفاق احمد، ابوالحسن تھا۔ تلقین شاہ کی والدہ ابھی تھی۔ ابوالحسن کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ ظل الہی کو دیکھ کر لوگ ادب، احترام اور محبت سے سر جھکا لیتے تھے۔

پہلے جس اشفاق احمد کو بہت غصہ آتا تھا۔ بھٹیاری کی کڑاہی میں چیز ڈالنے بھٹتے۔ وہ کہتا یا روایہ کہ گروہی ہے۔ تلقین شاہ کو تخلیق کرنے والے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ تلقین شاہ پیش کرنے والے آرٹسٹ پر لوگ جانے نہیں ہیں۔ وہ تو شکر ہے تلقین شاہ کا پارٹ ادا کرنے والا آرٹسٹ خود اشفاق احمد تھا اور نہ کوئی اور ہوتا تو یا تو اشفاق احمد گلا گھونٹ دیتا اور یا آپ خود کشی کر لیتا۔

اپنی تخلیق میں وہ کسی دوسرے فرد کو کریڈٹ کا حصہ دار ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ تمام چیزیں لکھنے والے کا حصہ ہے۔ آپ اس سے کہیں یا رہتہ ہمارے فلاں ٹی وی کھیل میں فلاح شخص نے بہت عمدہ رول کھایا۔ اسے ناگوار مڑے گی۔ فوراً جواب دے گا، ہاں یا راجھا خاصا کام کیا۔ بڑی ڈھونڈ کے بعد یہ لڑکا تلاش کیا تھا۔ آ یا تو بالکل ہی کچا نکلا۔ اس پر بڑی محنت کرنی پڑی، خیر بھا گیا۔

کریڈٹ بانٹنے میں اشفاق احمد ایک بنیا ہے۔ ایسا بنیا جو لیتے وقت دہا اور دوپاچ گنتا ہے اور دیتے وقت دو تین لیکن نہیں یہ مثال ٹھیک نہیں ٹھنکتی چونکہ یہ بنیادینے کا سرے سے قائل ہی نہیں۔

تلقین شاہ کی تخلیق میں اشفاق احمد کا کمال یہ ہے کہ اس نے کبھی اس پند و نصیحت کے جال بننے والے شیدا کی پر پھبتی نہیں کسی۔ اسے من نہ کر دم شاہد رکنند کا طعنہ نہیں دیا۔ دوسروں کو کبڑا بنانے کی سعی پیہم پر کبھی غصے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ الٹا وہ شاہ صاحب کی عظمت کو اجاگر کرتا رہتا ہے اور اس حد تک اجاگر کرتا رہتا ہے کہ شاہ صاحب کا ہاتھیں منظر عام پر آ جاتا ہے۔ یہی اشفاق احمد کے فن کا کمال ہے۔

تلقین شاہ میں اشفاق احمد نے اپنے بچپن کا کردار بھی پیش کیا ہے۔ جب وہ حقیقی شاہ صاحب کے حوالے سے ہدایت اللہ تھا۔

بنیادی طور پر اشفاق احمد آج بھی وہی ہدایت اللہ ہے۔ اگر وہ بظاہر ایسا نہیں دکھتا تو اس کی وجہ صرف اس کی شہرت کی وہ شہ نشین ہے جس پر وہ آلتی پالتی مارے داستان گو بن کر بیٹھا رہتا ہے۔

اشفاق احمد میں تحمل ہے، رواداری ہے، عجز ہے، مٹھاس ہے اور مدہم محبت کا بے پناہ 'نگ' ہے جس میں میں گرامنٹس کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ایسا محبت کرنے والا غیر تلقین شاہی باپ ہے کہ اس کے تینوں بیٹے بھی محبت کرنے والے ہیں۔

کے من گئے ہیں۔ وہ ایک پیارا دوست ہے۔ بظاہر نرم لیکن بڑا سخت گیر افسر ہے۔ ایسا جی حضور یہ ماتحت ہے جو کام اپنی طبیعت سے کرتا ہے لیکن اپنی مسلسل جی حضوری سے افسر کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے کہ کام اس کی مرضی کے عین مطابق کیا جا رہا ہے۔

اشفاق احمد ایک آئیڈیل خاوند ہے۔ اس کے باوجود اگر بانو کو اس سے کوئی شکایت ہے تو یہ بانو کا اپنا قصور ہے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری خود بانو پر عائد ہوتی ہے۔ بانو کا قصور یہ ہے کہ وہ خالی بیوی ہی نہیں بلکہ ایک فنکار بھی ہے اور فنکار ہی نہیں بلکہ ایک بڑی فنکار ہے۔ داستان گو کسی بڑے فن کار کو لقمہ دینے کا عادی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس فنکار نے آج تک ادبی ریڈیا یا ٹی وی کے انٹرویوؤں کے علاوہ بانو کو بحیثیت فنکار کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اگر آپ بانو کی فنکاری کے متعلق اشفاق سے بات کریں تو یقیناً وہ کہے گا ہاں اچھا لکھتی ہے لیکن یار بڑی مغز ماری کے بعد اسے اس مقام پر پہنچانے میں پھر بھی اتنی ناشکر گزار ہے کہ میرے فقرے تک چرائتی ہے۔

اشفاق کی بیوی ہونے کی حیثیت سے بانو میں دو بڑے عیب ہیں۔ ایک تو وہ بڑی فنکار ہے اور دوسرے وہ محبت سے ہے اور اس کی محبت کا شیر اتنا گاڑھا ہے کہ اشفاق ہر وقت یوں بیٹھ رہتا ہے جیسے کوئی بھینس راب کے چھپڑ میں پھنسی ہو۔

اشفاق کو اپنے رنگ میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھیے جب وہ کچھا بنیان پہنے دھوپ میں بیٹھا کچھ کھا پی رہا ہو۔ اس وقت اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں تو پڑے دیکھیں۔ اس وقت کا کچھ کھینچنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس وقت یوں لگتا ہے جیسے مینڈک جو ہڑ میں آ پہنچا ہو۔ اس وقت بانو بھی قابل دیکھنی ہے۔ اس کی خوشی سینے نہیں سمٹتی۔ یوں لگتا ہے کہ ایک طرف ڈالڈا ہی ڈالڈا ہوتا ہے اور دوسری طرف مٹا ہی مٹا۔

اشفاق احمد بلا کا خوش خور ہے۔ صرف اچھی چیز کھاتا ہے لیکن چیز اچھی ہو تو بہت کھاتا ہے اور اس اشتیاق سے کھاتا ہے کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ پٹھان ہے۔

اشفاق احمد کو مشینوں سے محبت ہے۔ وہ انہیں ذی روح سمجھتا ہے اور مہاتما بدھ کی طرح ان کا احترام کرتا ہے۔ گھر کو دیکھ کر وہ ہمیشہ احتجاجاً چیختا چلاتا ہے۔ ”ظالمو تم اس ننھی سی جان کا خیال نہیں رکھتے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ایک چھوٹا ننھی اپنی نازک سی جان کے بل بوتے پر لوہے کے اتنے بڑے کھڑکھڑے کو دھکیل کر چلاتا ہے۔ اس ننھی جان کا کچھ خیال رکھا کرو۔“ اشفاق کے گھر میں طرح طرح کی مشینیں اور قسم قسم کے گچٹ پڑے ہیں۔ چاہے اس کی جیب میں تھپے کے لیے نہ ہو۔ پھر بھی کباڑیے کی دکان پر نیا گچٹ دیکھ کر وہ اسے خریدے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ چاہے اس کے لیے اسے ہاتھ کی رہن رکھنی پڑے۔

گھر میں اشفاق احمد کی سب چیزیں کھلی پڑی رہتی ہیں جنہیں بچے آزادانہ استعمال کر سکتے ہیں۔ ماسوا اس کی مشینوں اور گچٹوں کو ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ فارغ وقت میں اشفاق احمد ان مشینوں کو باہر نکالتا ہے۔ بڑے پیار سے صاف کرتا ہے۔ تیل لگاتا ہے۔ گریس لگاتا ہے یعنی در پردہ اپنے ان کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ کھیلنے کے بعد وہ مقفل کر

دی جاتی ہیں۔ آپ اشفاق سے اس کی موٹر مانگیں۔ وہ آپ کا شو فر بن جانا گوارا کرے گا لیکن اپنی موٹر آپ سے نہیں دے گا۔

آج بھی اتنی شہرت کا مالک ہونے کے باوجود اتنی جان پہچان کے باوجود اتنے میل ملاپ کے باوجود احمد اندر سے رابنس کر سوسہے جو کئی ایک برس پہلے خان منزل کی بالائی نیم چھتی میں رہا کرتا ہے۔ اشفاق احمد اینٹی سوشل نہیں مگر وہ سوشل بھی نہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگوں سے ملنے سے بچکچاتا ہے۔ بیٹھا وہ یوں نروان زوہ ہے جیسے دلدل کے کنارے دھوپ میں گر چھ پڑا ہو۔ اس وقت اگر ملازم آ کر کے صاحب بننے آئے ہیں تو پیشانی پر تلوار سی تیوری پڑ جاتی ہے۔ باہر ڈرائنگ روم میں جانا پڑ جائے تو اس کا چہرہ کہتا ہے ”مارے گئے۔“ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایک خون معاف ہو تو وہ فلاں صاحب کو جیتا نہ چھوڑے۔ یہ ہے کہ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ایسے بڑے اخلاق سے ملنے کا جیسے صبح سے انہی کے انتظار میں بیٹھا ہوا اور پھر پھر کے بعد ڈرائنگ روم سے ہنسنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ تمہیے گونجیں گے لیکن یقین جانیے یہ شور اور ہنگامہ پھرنے کیسا کے مصداق ہوگا۔

اشفاق احمد کی سب سے بڑی عشرت یہ ہے کہ وہ کچھا اور بنیان میں اکیلا پڑا رہے۔ یوں پڑا رہے کہ دلدل میں پڑا رہتا ہے۔ سوشل زندگی سے اجتناب کی وجہ سے وہ آج تک اپنا میج نہیں بنا سکا۔ اس میں اس کی اہلیت نہیں مگر حسرت ضرور ہے۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا ہے مفتی جی بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ وہ زندگی بسر کروں گا اور اپنا میج بناؤں گا۔ نہیں نہیں مذاق نہیں کر رہا۔ قد سید اور میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے ایک سید روز شام کو سوشل وزٹ کیا کریں گے۔ آج ان کے ہاں کل ان کے ہاں اور پھر اس تمہید کے بعد ہم ڈریس اپ باہر نان میں کرسیاں ڈال کر سوشل وزٹر کا انتظار کیا کریں گے۔ ہر مہینے چار ایک دعوتیں دیا کریں گے۔ کبھی گھر میں۔ میں آج کل سوشل آداب پر ایک کتاب پڑھ رہا ہوں۔ قد سید انفریشنل کھانے پکانا سیکھ رہی ہے۔ ایک بار اشفاق نے اپنے اس سوشل پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ تین دن سوشل اشفاق شام کے وقت سوشل وزٹ کرتے، پھر پتہ نہیں کیا ہوا جو تھے روز وہ اپنے صحن میں حسب دستور مگر چھوٹی تھا اور سامنے بانو متا کے ڈھیر لگائے بیٹھی تھی۔

میں نے سوچا وہ تمہارا سوشل پروگرام کیا ہوا۔ کہنے لگے جو سکھ چھو کے چوبارے میں ہے، نہ بیٹھی تھی میں ہے۔

سوشل اور ادبی میج پیدا نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اشفاق احمد اذلی طور پر ایک کامی ہے۔ یہ ہے جسے مزدوری کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو وہ مزدوری کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بنانا ایک الگ فن ہے جسے فنون لطیفہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک جدید فن ہے جو حال ہی میں ایجاد کیا گیا ہے۔ خاصا رائج ہوتا جا رہا ہے۔ اس فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کام کریں یا نہ کریں۔ نہ کریں تو بہتر ہے فنکار کہلائیں گے۔ چاروں طرف آپ کے نام کا ڈنکا بجے۔ جس جگہ بیٹھیں وہ نشست صدر بن جائے۔

اشفاق اور بانو کے اس طبعی غیر سوشل رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ اتنا کام کرنے کے باوجود کسی سرکاری یا نیم سرکاری ملازمت پر پروگرام یا مجوزہ تحریک یا تنظیم میں کبھی ان کا نام نظر نہیں آئے گا۔ چونکہ ان کا کوئی امیج نہیں، ندان میں امیج بنانے کی سہولت ہی ہے۔

اشفاق احمد کا گھر میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے اشفاق کے گھر سے محبت ہے۔ مجھے اس دکھی گھرانے کی ہر چیز سے محبت ہے جو اس خوب صورت وسیع و عریض مکان میں یوں پڑا رہتا ہے جیسے وہ مشرقی پاکستان کا ایک عورتانہ لڑوہ علاقہ ہو۔ مجھے اس فرائی ڈے سے محبت ہے جسے وہ دنیا میں اشفاق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جو بروقت یا تو گھر چھوڑ پھرتے ہیں یا تو گھر سے تازہ و کوٹ چڑھ جاتے رہتے ہیں یا مٹا کے ڈھیر لگانے میں کھوئی رہتی ہے۔ مجھے ان تین چیزوں سے محبت ہے جو گھر کی عورتوں کے سائے تلے پرورش پانے کی لذت سے محروم ہیں۔ اشفاق احمد کے گھر کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ گذشتہ کئی سالوں سے اشفاق کا گھر میری واحد پناہ گاہ ہے جیسے بھنگ پینے والے کے لیے فقیر کا تکیہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چاروں طرف اشفاق ہی اشفاق ہوتا ہے۔ داستان گو کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اگرچہ داستان گو نے اشفاق کے گھر پر داستان سرائے کی تختی لگا رکھی ہے لیکن داستان گو ڈرائنگ روم سے ورے نہیں آسکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق کے گھر کا نام داستان سرائے نہیں بلکہ نشی خانہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ گھر دو منشیوں کی کامیاب جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ گھر قرض پر بنا ہے اور اس قرض کو صرف سکرپٹوں کی مدد سے اتارا جاسکتا ہے اور اسے ادا کرنے کے لیے دونوں منشیوں کی دولت قلم کا پھانڈا چلانے میں مصروف رہتے ہیں۔

میں داستان گو کی قابلیت کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں اس کی تخلیقی قوتوں کو مانتا ہوں۔ میں اس کے سنہرے پھول پتوں کی سجاوٹ کو پسند کرتا ہوں۔ میں اس کے مجمع لگانے کی عادت کو زیادہ ناپسند نہیں کرتا لیکن میں ایک دانشور ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر مونچھ مروڑے۔

## عبدالرحمن چغتائی

عبدالرحمن چغتائی سے تعارف ہمیں باب بیہز کی زبانی ہوا۔ وہ عموماً ان کا ذکر کرتا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہر مغربی آدمی کی طرح نئے کپڑے، موسم اور شہر میں گھومتا پھرتا خیر کا شکار ہے۔

ایک دن اس کی اصرار بھری گفتگو کے دوران خال صاحب نے پوچھا۔

”بھئی چغتائی..... چغتائی۔ وہ ہے کون؟“

”اشفاق صاحب..... جس کشمیری بابے کے پاس میں جاتا ہوں، ان کے پڑوس میں ہی عبدالرحمن چغتائی رہتے ہیں۔ اوپر سٹوڈیو ہے، ہر طرف پن ڈرائنگلو بکھری ہوئی ہیں۔ اس کے گھوڑے اور عورت کے سہل نے تو مجھے حیران

کر دیا ہے۔ آپ کبھی موہنی روڈ نہیں گئے ان کا سٹوڈیو دیکھنے؟“

”تو کیا وہ رنگوں کا استعمال نہیں کرتا؟“

”کرتا ہے کرتا ہے..... لیکن پھر رنگ بھی خود ہی بناتا ہے۔ بنے بنائے رنگ اسے پسند نہیں آتے۔“  
 ”کمال ہے۔“

”کیا آپ میوزیم نہیں گئے۔ وہاں تو آپ نے ان کا کام دیکھا ہی ہوگا؟“

اب اسے کون بتائے، اپنے وطن میں کون میوزیم دیکھتا ہے۔ کس کو فکر ہوتی ہے کہ قومی ورثے کی تحفظ کرے۔ کس آدمی کے پاس اتنی فرصت ہوتی ہے کہ وہ پرانی عمارتوں کے قصے ہسٹری، اہمیت جتا کر بچوں کو قومی احساس دلانے۔ یہ سارے کام زندہ تو ہیں کرتی ہیں، جن کے لیے روزی کمانا، ہمدقت مصروفیت نہیں، جو اپنے مستقبل سے غافل نہیں ہوتے۔

بہر کیف میں نے تو پروانہ کی لیکن خاں صاحب پت نہیں چغتائی صاحب کے سنوڈیو میں کتنی بار گئے اور کئی بار متاثر ہو کر آئے۔ ایک روز میں باورچی خانے میں رعب ڈالنے میں مصروف تھی کہ مجھے آ کر کہنے لگے۔  
 ”جیوٹی یہ سب سنبھال لے گی۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“

سارے راستے انہوں نے مجھے ایک بار بھی نہ بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ دوسری منزل پر چغتائی صاحب کا سنوڈیو تمام تخلیق کاروں کی طرح بے ترتیب تھا لیکن جسے میں بے ترتیبی سے ہی سمجھتی تھی اسی میں چغتائی صاحب کی ترتیب پوشیدہ تھی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ابھی چند تصویریں دیکھ پائے تھے کہ بڑی خوشبودار گلانی گلانی کشمیری چائے آ گئی۔  
 چند تصویریں چغتائی صاحب نے علیحدہ رکھ لیں۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو وہ تصاویر مجھے دے دئے۔  
 چغتائی صاحب بولے۔

”بھابھی صاحب! یہ آپ کے لیے ہیں۔ میرا ناچیز حقیر تحفہ قبول کیجیے۔“

میں ہکا بکا تصویریں اٹھانے لگی تو ”ناں نائن“ کر کے انہوں نے روک دیا اور چھوٹے سے کہا کہ وہ بڑے بڑے کار میں تصویریں رکھ دے۔ اس کے بعد میں تو تصویروں سمیت چغتائی صاحب کو بھول گئی لیکن انہوں نے مجھے بڑے بڑے محبت بھرے خط ”بھابھی صاحب“ کے القاب سے شروع کر کے لکھے۔

یہ میں اس لیے بیان کر رہی ہوں کہ عبدالرحمن چغتائی کے ساتھ اس تعلق سے قائدہ اٹھاؤں اور اتنے بڑے کریڈٹ کارڈ آپ کو دکھا کر آپ سے عزت کی پونجی وصول کروں۔

چغتائی صاحب کے جانے کے بعد یکدم کہیں سے عبدالرحیم چغتائی منظر پر آدھمکے۔ انہوں نے ایک سے ایک ملاقات تو خاں صاحب سے تکلفاً کی، پھر تصویروں کے لیے اصرار شروع کر دیا۔

”اگر آپ کے پاس ان کے کچھ ذاتی خط ہوں تو وہ بھی دے دیجیے۔ میوزیم میں ان کی ضرورت ہوگی۔“

دو تین تصویریں شاید ہمارے پاس کہیں ادھر ادھر پڑی رہ گئیں لیکن زیادہ تصویروں اور خط چغتائی کے

ملکیت سمجھ کر واپس لے گئے۔ شاید ہر بڑے آدمی کے بعد یوں ہی اُس کی ذات کو سمیٹا جاتا ہے۔

## انشاجی

خاں صاحب نے اپنے مضمون ”رینی ڈے“ میں لکھا ہے کہ شہاب بھائی کی ایک گپت پاپ لائن ایسی تھی جس پر لوگوں کی خفیہ مدد کر کے اپنی عاقبت سنوارا کرتے تھے۔ وہ کسی بڑھی ماٹی کی طرح اپنی جیب کی پولٹیاں چوری چوری نکالتے اور کسی پر اپنا راز افشاں کرتے۔

ہم جب سن آباد میں تھے اور ”داستان گو“ ایک مہنگی عیاشی تھی، انہوں نے خاں صاحب کو ساتھ لیا اور کراچی کی سڑکوں کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ اس طرح اشتہار مانگتے پھرنا اُن کی شہرت کو بڑھانے کا سہارا ہے۔ جب اشتہار ملنے میں ناکامی ہوئی تو شہاب صاحب نے خاں صاحب کے لیے نوکری کا بندوبست کیا اور انہیں اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر بنا دیا۔

شہاب صاحب کی دوسری نیکی جو ہمارے دیکھنے میں آئی، وہ انشاجی کو نوکری میں ایڈجسٹ کرنے میں مشغول تھے۔ یہی انشاجی تھے جنہوں نے ہمارے لیے بڑا خوبصورت یہ مصرعہ چھوڑا

”انشاجی اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا“

اس مصرعے سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ انشاجی کہیں اداسی، ناامیدی یا فکر مندی کا شکار تھے۔ میں نے انہیں جب دیکھا ان کے چہرے پر بے بسی ہی دکھی۔ شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں مہمان ٹھہرنے سے کتراتے تھے لیکن کتنی بے بسی اس کمرے میں ٹھہرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ وہ جب بھی آتے کمرے سے باورچی خانے تک چکر بھرنے لگاتے رہتے۔

”کیا پکا یا ہے بانو؟“

”جی سرسوں کا ساگ، مکی کی روٹی اور تازہ مکھن۔“

دوسرے چکر تک انہیں Menu بھول جاتا اور وہ پھر پوچھتے۔ اگلے دن پھر وہی سوال۔

”اور آج۔“

”آج تو گا جرا لو کی بھیجا ہے۔“

”بہت اچھے.....“ وہ انفرمیشن لے کر لوٹ جاتے۔

انہوں نے کبھی کسی کھانے کی از خود فرمائش نہ کی۔

ہم عہد رفتہ کے لوگ ہیں۔ ہماری طرز معاشرت، اقدار اور ذاتی تجربات سے اخذ کی ہوئی دانش آج کے دور میں لاگو نہیں ہوتی لیکن آج کی نوجوان نسل دور دراز کے بھولے بھٹکے معاشروں کا مطالعہ انٹرنیٹ پر کرنے کی عادی ہے۔ غربت کے جنگلوں میں بسنے والوں کی بود و باش، میکسیکو، کیوبا اور Inca کے رسم و رواج پر معلومات حاصل کرنا ان کی بابی ہے۔ اسی تجسس پر تکیہ کر کے اس نئی پود سے مخاطب ہونے کی جسارت کر رہی ہوں۔

لبے تجربے سے میں نے یہ بات اخذ کی ہے کہ جس شخص نے مثبت شیشوں کی عینک اپنے چہرے پر سجائی اس کا:



رویہ، سوچ اور عمل مثبت ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہے بیاباں سے گزرے، چاہے خارزار سے، ناداری، مفلسی پر بھی  
 رہے یا بے وفا کی اور بے توجہی کے تھپڑے کھائے۔ اس کے چہرے پر بشارت اور دل میں طمانیت رہتی ہے۔  
 جس شخص کے چہرے پر منفی شیشوں کی دھندلی عینک چڑھی رہے اس کا رویہ، سوچ اور عمل ہمیشہ منفی رہتے ہیں۔  
 بھلے ہی محلوں میں رہے، کونٹیوں کے مالک ہو، لمبی کاروں سے اترنے بیٹھنے والا ہو۔ اسے بے اطمینانی، مایوسی  
 نہیں چھوڑتے۔

شہاب صاحب اور ان کے قریبی دوستوں میں ابن انشا واحد ایسے شخص تھے جن کے چہرے پر سے یہ  
 نہیں اتری۔ یہ نہیں کہ ان کی زندگی انسان تھی لیکن ان کے مثبت رویے، سوچ اور فکرنے انہیں کبھی ناامیدی کے  
 کیا۔ ہمیشہ شانت، مسرور اور پرانے نظر آتے۔  
 یہ اسلزام آواز کا واقعہ ہے۔

شہاب صاحب اپنی بہن محمودہ اور ان کے میاں امین بھائی کے گھر میں رہتے تھے۔ عفت کے چاہنے  
 ثاقب کی تمبائی کا خیال کرتے ہوئے انہوں نے یہیں بسرام کر لیا تھا، تاکہ ثاقب تمبائی کا شکار نہ ہو اور بھرے گھر  
 بڑھے۔

شہاب صاحب، مفتی جی، اشفاق صاحب ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ ابن انشا کرسی کھینچ کر ٹیلی وژن کے  
 بیٹھے تھے۔ میں اور محمودہ جی اضافی Also Rau قسم کے تماشائی سب خاں صاحب کا ڈرامہ چانگڑہ دیکھ رہے  
 انشا کچھ پریشان تھے۔ محمودہ جی بار بار دوپٹے سے منہ پونچھ رہی تھیں۔ جب ڈرامہ آخری چند سینوں پر پہنچا تو  
 جی اٹھ کھڑے ہوئے اور گھبرا کر بولے۔ ”یہ اشفاق بہت ظالم آدمی ہے۔ اس نے بچہ مار دینا ہے۔ میں چلا  
 میں جب ڈرامہ ختم ہو جائے گا تو آ جاؤں گا۔“

محمودہ جی بولیں۔ ”بخارا تر گیا۔“ انہیں انشا جی لال لوبیا کھا گئیں۔ آپ کا پسندیدہ کھانا۔“  
 انشا جی نے سکھ کا سانس یہ اور خاں صاحب کا شکر یہ ادا کیا۔  
 ایک مرتبہ ہم کراچی گئے۔ ہم انشا جی کے دفتر میں ان سے ملنے گئے۔ وہ گھومنے والی کرسی پر بیٹھے  
 والی سیدھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کراچی کے متعلق سرسری گپ شپ ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد خاں صاحب نے  
 کہا۔ ”انشا جی! دو سو روپے دے دو۔۔۔ درکار ہیں۔“

مجھے کبھی علم نہ ہوتا کہ خاں صاحب کے بنوے میں کتنے پیسے ہیں۔ اس لیے مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ حق  
 سے پہلے انہوں نے خاطر خواہ انتظام کیوں نہ کیا؟ انشا جی نے خاں صاحب کی بات کا رتی بھر نوٹس نہ لیا اور۔۔۔ عمر  
 لے کر منگھو پیر تک ہر رنگ کی بات جاری رہی۔ مجھے ان کی بے پرواہی پر ذرا سا ملال ہوا۔ پھر چانک انہوں نے  
 رازداری سے اپنا دراز کھولا۔ کچھ ہلکا سا تلاش کیا اور بڑی ہی رازداری سے ایک لفافہ خاں صاحب کو پکڑا دیا۔

اس لفافے پر لکھا تھا ”More?“  
 انشا جی کا یہی طریقہ تھا، وہ مانگنے والے کو رازداری سے عطا کرتے، اسے مانگنے کی خجالت سے چھٹکاتے

یہ جو مانگا جاتا اس سے سوا دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ مانگنے والا عموماً ضرورت سے کم مانگتا ہے۔ ایک مرتبہ انشا جی ہمارے گھر پر مقیم تھے کہ ایک سالہ آئی۔ اس نے ہزار روپے مانگے۔ انشا جی نے اسے دو ہزار پکڑا دیئے۔ خاں صاحب بولے۔

”یہ انشا اس نے ہزار مانگا تھا، تم نے دو ہزار کیوں دیئے؟“

کہنے لگے ”خود ہی تو کہا کرتا ہے کہ دھرم پورے والے بابا سائیں فضل شاہ کا فرمان ہے دل کھول کر دو..... تم

نے دتے میں سے ہی دینا ہے، کون سا پلے سے جاتا ہے۔“

میں بھی ”دتے میں سے دین“ کا فلسفہ سنتی رہی تھی لیکن انشا جی کی طرح عمل تک نہ پہنچ پائی تھی۔

آخری مرتبہ جب وہ ہمارے پاس لندن جانے سے پہلے آئے تو ان کا چہرہ سبزی مائل زرد تھا۔ وہ بڑی تکلیف

میں تھے لیکن ہمیشہ کی طرح چہرے پر طمانیت اور سکون تھا۔

ویسے تو شہاب صاحب، مفتی جی اور خاں صاحب کی عینکوں کے شیشے بھی مثبت تھے لیکن کبھی کبھی وہ یہ عینکیں

بیر کر مابعد اور نامعادم بنی تلاش میں چل نکلتے تھے۔ انشا جی کو کبھی تلاش نے تنگ نہیں کیا..... کیونکہ انہوں نے کبھی اپنی مثبت

تیشوں کی عینک اتاری ہی نہیں۔ کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوئے۔ پھر وہ اور کیا تلاش کرتے؟

ان کا زرد رنگ اور پیلے ہاتھ دیکھ کر میں نے خاں صاحب سے پوچھا۔

”انشا جی کو کیا ہوا ہے؟“

”کیا ہوا۔ بہ انشا کو؟“

”پہلے دیکھتے نہیں ان کا رنگ ہلکی سا ہے۔ بیمار ہیں کیا؟“

مجھے اب معلوم ہوا کہ انشا جی کینسر کے مریض تھے۔ غالباً خاں صاحب کو اس وقت صحیح حالت معلوم تھی لیکن خاں

صاحب کی ستر پوشی کے مختلف اصول تھے۔ وہ کسی شخص کی ناواری، بیاری، ذلت اور بیکاری کو اپنے تک محدود رکھتے۔ ان کا

تہذیبیہ خیال تھا کہ لوگ ایسے حالات جان کر محض گفتگو کا موضوع بنا دیتے ہیں اور اسے غیبت کی ایک گھناؤنی شکل عطا کر

دیتے ہیں۔ اس لیے ایسی انفرمیشن کو افواہ کی شکل نہیں دینی چاہیے بلکہ اوپر والے ستر پوش کی طرح چشم پوشی کرنے میں ہی

بہتری ہے۔

شہاب بھائی نے انشا جی کے لیے لندن میں نوکری کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہاں وہ ایک بڑے میوزیم (انڈیا

آفس لائبریری) کے کرتا دھرتا تھے۔ اس میوزیم میں پاکستان کی نادر کتابیں، اہم ادیبوں کا کام اور سیاسی لیڈروں اور

عالموں کے لکچر Heritage کا خزانہ جمع تھا۔ انشا جی اپنی مثبت عینکیں لگائے اپنے کام میں مگن تھے۔

آخری بار ہم انشا جی کے پاس لندن پہنچے۔

انہوں نے ہمیں لائبریری میں مدعو کیا۔ کچھ انگریزی اور پاکستانی سکالر وہاں جمع تھے۔ خاں صاحب نے ہمیشہ

کی طرح اپنے مسلک کے عین مطابق دو قومی نظریہ پر تقریر کی اور پاکستانی لکچر کا تشخص بھارت کے رسم و رواج سے مختلف

ست میں دکھا کر پیش کیا۔ انشا جی بہت خوش ہوئے اور بعد میں بولے۔ ”یار تو ادیب کی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ یہ نیا ملک

ہے۔ اس کی Ideology کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ کاش! ہم سب شاعری میں علامہ اقبال کا پرچم اٹھا کر چلیں۔“

”ہاں وہ تو ہے لیکن سب ادیبوں میں وہ ایچ اور جنیوس نہیں ہے۔“

انشاجی نے ہر امید لہجے میں کہا۔ ”یار تو ذہین آدمی ہے۔ کچھ اس سلسلے میں ہمت کرناں۔ کوئی تحریک نہ کرے۔ کوئی سنگت تشکیل دے ناں۔ یہ تنکے تنکے بکھرا جھاڑوا کٹھا کرناں۔“

”کروں تو..... لیکن وہ سمجھیں گے اشفاق چودھراہٹ چاہتا ہے۔ لیڈری کا شوق ہے اسے۔ میری برادری تو میری نہیں مانے گی کبھی بھی۔“

”لے لے ناں یہ الزام، پھر کیا ہوا۔ جب تیری نیت صاف ہے تو پھر الزام کی فکر کیسی؟“

”بھائی انشاجی! ادیبوں کا بڑا مسئلہ اُن کی اتا ہے۔ ان کی کمر میں لاسے کی لٹھ پڑی ہے۔ وہ کب جھکا سکے کسی کے آگے؟“

جب انشاجی باقیں کر رہے تھے تو میں نے نوٹس لیا کہ اُن کے ہاتھ، خاص کر اندر کی ہتھیلی انڈے کی نسیب کی طرح پیلی تھی۔ پھر انہوں نے آنکھیں ادھر ادھر گھما سیں تو آنکھوں کی سفیدی حیرت انگیز حد تک بے رنگ نظر آئی۔ میں ہنسی میں نے خاں صاحب سے ایک بار پھر اپنی تشویش کا ذکر کیا۔

”انشاجی کی طبیعت تو مجھے ٹھیک نہیں لگتی خاں صاحب۔“

”تمہیں تو ہر وقت ایسے ہی وہم ہو جاتے ہیں۔ نٹو جیسا دندناتا پھرتا ہے۔ واہ کیا کام ہے کیا خزانہ کتابوں کا کرا لیا۔ پتہ نہیں ہم اس خزانے سے کچھ اٹھا سکیں گے یا نہیں لیکن یہاں کے سکالر اس کا مطالعہ کر کے کوئی بڑی کتاب پاکستان پر کریں گے۔“

”لیکن جی ان کی صحت۔“

”تم پیلے ہاتھوں کا مرثیہ گارہی ہو۔ یہ میرے ہاتھ دیکھو۔“

خاں صاحب کے سفید رنگ کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیلے مسطر کی طرح پیلے ہو رہے تھے۔

میں نے ابھی تک ان کے ہاتھوں کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کام کی زیادتی اور بوجھ کے باعث وہ یوں زردی مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ میری بے فکری کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ میں نے اپنے بیمار تو بھانپ لی لیکن مجھے لحظہ بھر کے لیے شبہ نہ ہوا کہ خاں صاحب بھی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انشاجی کراچی لوٹ آئے۔ ڈاکٹروں نے ان کا اصلی مرض تشخیص کر لیا تھا۔ انشاجی تو ہمارے پاس نہ آئے لیکن ان کا رابطہ اور بھی باقاعدہ ہو گیا۔ انہیں فکرتھی کہ ان کی کتابوں کی اشاعت ان کے بھروسے کرے گا۔ وہ کسی پبلشر سے معاہدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر گھر کا بھی مسئلہ تھا۔

ان مسائل کو سلجھانے میں خاں صاحب ان کے ساتھ ساتھ رہے لیکن وہ زیادہ فکریں ساتھ ہی لے گئے۔ ایک شریف انفس، شرمیلا اور غیرت مند ادیب کا انجام آپہنچا۔ اوپر والا کیوں چاہتا ہے، کب چاہتا ہے اور کیسے چاہتا ہے اس کا بھید کبھی کسی انسان کو کھلی طور پر نہیں ہو سکا۔ انسان کا علم ہمیشہ سے قلیل ہی رہا ہے اور رہے گا۔ جتنا برتن اتنی پانی برتن میں موسلا دھار بارش ساری تو سامنیں سکتی البتہ مقدور بھر پانی ضرور اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔

انشاجی کے کوچ کرنے کے بعد سمجھ آئی۔

”انشاجی چلو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا“

ہوسکتا ہے ان کا دل کبھی بھی اطمینان یا خوشی سے ہمکنار نہ رہا ہو لیکن ان کی مثبت عینکوں نے ان کے چہرے پر

کبھی بے اطمینانی کا منظر پیش نہیں کیا۔

## انتظار حسین

یہ A.R.Y. فنکشن کا ڈر ہے۔ مجھے اس فنکشن پر دس لاکھ کا انعام ملا تھا اور اسی قدر رقم انتظار حسین صاحب کو

ملی تھی۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں رہ رہے تھے۔ ایک روز میں اور خاں صاحب باہر نکلے تو انتظار صاحب بھی باہر ہی آ رہے

تھے۔ میں نے ہمیشہ کی طرح بلا سوچے سمجھے عالیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس درجے بیمار ہے۔ جب ہم باہر

رغ میں نکلے تو انتظار بھائی نے مجھے کہا ”شکریہ! یوں پبلک میں اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لانا مجھے کچھ میوہ سا لگا لیکن آپ

تو بہت مہربانی کی جو عالیہ کو سنبھال لیا۔“

انہوں نے میرے کردار کی تعریف ضرور کی لیکن میری تسلی نہ ہوئی کیونکہ انہوں نے میرے ادبی کام کے

مخمس ایک لفظ نہ کہا۔ جب عالیہ دنیا سے رخصت ہوئی تو بڑی مروت سے ہمیں اس کے متعلق اطلاع دینے خود

مخبر لائے۔

”کل قبرستان میں ہی اس کے قتل ہیں۔ چند لوگوں کو اطلاع دی ہے، آپ دونوں ضرور آئیے۔“ ہم دونوں

قبرستان پہنچے۔ چند لوگ موجود تھے۔ تازہ قبر پر تھوڑے سے پھول چڑھائے۔ ایک اچھی روح کو رخصت کیا اور سوچتے

گئے کہ انتظار بھائی بھی کتنے بڑے آدمی ہیں۔ ان کے گھر میں اللہ نے بچے کا چراغ نہ جلایا لیکن وہ نہ اللہ کے شاکی ہوئے

بلکہ کونچے کی خاطر چھوڑ کر دوسری شادی کے مرتکب ہوئے۔

انتظار حسین، خاں صاحب کے داؤ جی کو ان کے ادب کی معراج سمجھتے تھے۔ اس کے بعد کا جواب خاں

صاحب نے پیش کیا، اس کے وہ قائل نہ تھے۔ میں انتظار حسین کو ایک بڑا لکھاری سمجھتی ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ میرا ان کا

تک ایک نہیں۔ میرا خیال ہے کہ انتظار حسین پاکستان کی نعمت ملنے کے بعد بھی Nostalgia کی کہانیاں لکھ رہے

ہیں۔ جو لوگ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں پتھر کے بن جاتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے منکر ہونے کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہ نہ تجھے میں انتظار حسین کی تخلیقی ہنرمندی، ان کی زبان و بیان کی شاخواں نہیں۔ مشکل صرف اتنی ہے کہ میں

تو تک نظر ہوں۔ مجھ میں واقعی وسعت قلب کی کمی ہے جو انسان کو لبرل ہونا سکھاتی ہے۔

انتظار بھائی اب بھی میری دلجوئی کے لیے آتے رہتے ہیں۔ خاموشی سے میرے زخم پر پھابار کھتے ہیں۔ ذریعہ

تھوڑا سا کھاپی لیتے ہیں لیکن آج تک ہم دونوں میں تخلیقی عمل پر کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

بھٹو

لوگوں میں جو نیک نیتی پیدا ہوتی ہے، اسی کے طفیل خاں صاحب سے سکھ برادری کے کچھ لوگ ملنے آتے تھے۔ یہ لوگ ہجرت کرنے والے تھے اور خاں صاحب ان کا مان آدراسی طرح کرتے تھے گویا انصار کی نقل کر رہے ہوں۔ جب تک خاں صاحب زندہ رہے، میری ان سے ملاقات نہ تھی۔

میرا خیال تھا کہ یہ سکھ حضرات (I.S.O) کے رکن تھے۔ ان میں ایک لمبے ترنگے لمبی داڑھی والے مرد صاحب سرغٹ تھے۔ خاں صاحب انہیں "بھٹو" کہہ کر جانتے تھے۔ ان کا ذرا نیور بڑی ہی پیاری شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اندر تو تھکے لیکن سرور حضرات اسے اپنے جتنے کا حصہ سمجھتے تھے۔

خاں صاحب کا بچپن، بوغٹ کا زمانہ منسٹر میں گنا۔ یہ سکھوں کی بستی تھی۔ یہاں کے رسم و رواج انہنا ہینڈ سٹاپ سب میں سکھی پنتھ کی جھلک تھی۔ گوبابا جی ایسے میل جول پر "بھون بھون" کرتے لیکن روک نہ سکتے تھے۔ کچھ عرصہ سکھوں میں رہتے ہوئے جب بابا جی کا خوف کم ہوا تو ان کی ڈپنٹری پر سکھ سردار بڑی بے تکلفی سے آنے لگے۔ اس علاقے میں سکھ زمینیں سکھوں کی تھیں۔ ان بڑے سرداروں کی گھر والیاں سروں پر احیاط سے دوپٹہ اور ہتھیں اور مردوں سے پوجا کرتی تھیں۔ بابا فرید الدین گنج شکر کے دوپٹے کی زینت تھے۔ اس لیے سکھوں کے دل میں درگاہوں کا بڑا احترام تھا۔

خاں صاحب اپنی پرورش میں سے سکھوں کے کچھ کو منہانہ کر سکتے تھے۔ جب بھی سردار بہاں آ جانتے تھے ان کی پنجابی سننے والی ہوتی۔ اندر آ کر خاں صاحب کہتے "قد سید! کھانے میں گوشت نہ ہو، صرف چھلی رکھ سکتی ہو۔" کبھی کبھی امریکہ میں رہنے والے ڈاکٹر پرث پال بھی خاں صاحب سے ملنے آتے۔ دبلے پتلے اور تھکے

داڑھی والے شائستہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں مغربی Manner اور مشرقی حیہ ہوتی۔ وہ کبھی عورتوں کی طرف آنکھ نہ اٹھاتا دیکھتے۔ ان کی گھر والی بھی ڈاکٹر تھیں۔ وہ ایک مدت سے وہیں آباد تھے لیکن اب ان دونوں نے ڈاکٹری کا پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ کاشتکاری کا آبائی پیشہ اختیار کر کے زمینیں خریدی تھیں جس پر بادام کاشت کرتے تھے۔ جب بھی ساتھ آتے تھے ساتھ خاں صاحب کے لیے بازاروں کا تحفہ ضرور ہوتا۔

امر کی باداموں میں یہ خاصیت تھی کہ ان میں سے ایک بھی کڑوا نہ نکلتا۔ خاں صاحب کے جانتے کے انہوں نے چھلی روایت قائم رکھی۔ میرے لیے بادام ضرور لاتے۔

جب خاں صاحب نے اردو بورڈ چھوڑا تو انہوں نے بھٹو سے کہا..... "اب سرکاری گاڑی کے لئے بھٹو پرانی گاڑیوں کا کاروبار بھی کرتے ہو۔ ایک پرانی سوزو کی مجھے کہیں سے لا کر دو لیکن ایک شرط ہے، گاڑی زیادہ پرانی نہ ہو۔ کچھ ہی دن نہیں گزرے تھے کہ بھٹو ایک گہرے سبز رنگ کی فوکسی لے آئے جو شاید آٹھ دس ہزار سے زیادہ

اب بھٹو نے اس کی قیمت وصول کرنے سے انکار کیا۔ خاں صاحب نے گاڑی نہ رکھنے پر اصرار کیا۔ بڑی مشتعل ہوئے۔ اس کی قیمت وصول کی جو غالباً ایک لاکھ چالیس ہزار تھی۔ ان قیمتوں کو پیش نظر رکھیں تو Inflation کی رفتار

آنے لگتی ہے۔

اننگلی ساتھیوں کے ساتھ عموماً ریاض محمود ایک لازمی جزو بن جاتے۔ وہ بڑے خاموش تماشاگاہی تھے۔ بولتے کم بولتے زیادہ تھے۔ بھھو کی گھر والی اور ان کے تین بچے لندن میں رہتے تھے۔ جب بھی وہ بچوں کو چھٹیوں میں بھھو سے ملنے آتی، بڑی گہما گہمی ہوتی۔ بانو باجی اور ریاض محمود ان کی دعوتیں کرتے۔ ہمارے ہاں بھی ایک دو مرتبہ اکٹھے ہونے کا موقع ملتا ہے۔

پھر ہولے ہولے بھھو بھی ہماری دعوت کرنے لگے۔ خاں صاحب کے آخری ایام میں بھھو کی گھر والی نے ایک بھاری بھاری تکلف دعوت کی۔ میز پر رنگ رنگ کی مہزیاں، دالیں تو تھیں ہی لیکن مرغ اور گوشت کے بھی سالن موجود تھے۔ ان کی میزبانی کا طریقہ تھا کہ انہوں نے بازار سے گوشت اور مرغی منگوا کر دعوت کو مہمان کے حوالے سے سجایا تھا۔ یہ ملاقات گفتگو کے اعتبار سے بڑی اہم تھی۔ کھانے کے بعد جب چائے کا دور چلا تو گفتگو نے بڑا پلٹا کھایا۔ بھھو بولے: "خاں صاحب اسکھوں نے قیام پاکستان کے وقت بڑا ظلم کیا۔ جتھوں پر حملے کیے۔ ٹرینوں کو ٹھکرائی۔ ہندوؤں میں اتنی جان نہیں تھی کہ مسلمانوں کو چھیڑ سکتے لیکن ہمیں ماسٹر تار سنگھ نے پھنسا دیا۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ جب ہندو کو ضرورت پڑتی ہے، وہ دوست بن جاتا ہے۔ وعدے کرتا ہے اور جب حالات سازگار ہوتے ہیں تو اس سے مکر جاتا ہے۔"

"جان دے سکھا جان دے تجھے کیا بھول گیا کہ جب جہانگیر کے عہد میں بابا تاج بہادر کو چاکر دربار میں لائے تو جہانگیر تخت سے اتر کر اسے ملا اور حکم دیا کہ گورد بہادر کو عزت کے ساتھ امرتسر لوٹا دیا جائے لیکن جہانگیر کے برہمن وزیر نے گورد بہادر کا سر کاٹ کر امرتسر بھیجا۔"

"بھھو نے لمبی آؤ بھری اور گویا ہوا..... "ایک ظلم دوسرے ظلم کی وجہ بن جائے۔ خاں صاحب یہ تو کور لوگوں کی بات ہے۔"

خاں صاحب نے سر ہلا کر آہستہ آہستہ کہا: "بھائی میرے سو بنا۔ جب پشاور میں تحریک چلی تو سکھوں کا قلعہ پشاور کا دبدبہ سارے پشاور میں تھا۔ سید اسماعیل شہید نے اس قدر زبردست جنگ کی کہ سکھوں کا قلعہ سکھوں کے لیے تباہی کا باعث بن گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں سکھ کھیت رہے۔ پھر جنگجو قوتوں میں تو ایسی آڑناٹوں سے گزرتی ہیں۔" اب بھی بھھو قائل نہ ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر غم کی گہری لکیر تھی۔

"سنو بھائی میری بات سنو۔ سکھ اور مسلمان تو ام بھائی ہیں۔ برصغیر میں یہ دونوں اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کی خرابی یہ ہے کہ دونوں مارشل ریس ہونے کے باعث تیز مزاج ہیں۔ سارا دن یہ جڑواں بھائی لڑتے ہیں۔ بول لگتا ہے کہ ایک دوسرے کی جان لیے بغیر نہ رہیں گے لیکن جب رات پڑتی ہے بھائی ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہیں۔ اکیلے کسی کو بھی نیند نہیں آتی۔ بستر پر جب تک ایک دوسرے کی ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسا کر، بانہوں میں ایک دوسرے کو قید نہ کر لیں سو کوئی بھی نہیں سکتا۔ یار بھھو! بھول جان سٹھی باتوں کو..... اس محبت پر توجہ رکھ جو اندر ہی اندر Undercurrent کی طرح ان میں چلتی ہے۔"

خاموشی سے سننے والے ریاض محمود نے ان باتوں اور اپنے ذاتی مطالعے سے اتنا اثاثہ جمع کر لیا کہ ریڈیو

پاکستان سے ”پنجابی دربار“ چلا رہے ہیں اور اسی سلسلے میں انہیں Pride of Performance بھی مل چکا ہے۔  
 خاں صاحب کے جانے کے بعد بھی بھٹو میرے پاس آتے رہے، ہر بار ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ میرے  
 معاونت کریں لیکن مجھے علم ہے کہ میں اتنی بُری نہیں کہ ہاتھ میں کاسہ پکڑ سکوں۔ مجھے مانگنے سے بھی ڈر لگتا ہے  
 سے بھی۔ خاں صاحب کے خیالات سیکھی بھائی چارے کے متعلق کیا ہیں، یہ ان کی تحریر سے دیکھیے۔

## وسریاں یادواں

ساڈے پنڈ دا تیلی چا چا حشمت بڑا نیک تے اماندار بنداسی۔ جدوں وی تارے میرے، تو ریکھے  
 یا سروں دا تیل پیڑناؤ وہناں نوں دھیان نال گوو کر کے اڈواڈ پھیاں وچ پانائے او سے حساب نال من تو لے  
 لینے۔ اوہنے کدے نخل لھن نوں خالھن کر کے رول نہیں سی ماریا تے ناں ای ٹولن لگے، دھڑا کرن لگے، کھدے  
 نوں ٹھونگا ماریا سی۔

چا چا حشمت ہورتے چارے بیوں ٹھیک ٹھاک سی پر قبیل دار ہون پاروں اوکھا ای رہنداسی۔ اک  
 گھر والی، جھی بچے اک بڑی ماں اتوں امانداری، بس مرکھپ کے ای ویلا ٹپاندا سی نہ کدے ہوکا بھر کے کسے نوں  
 نہ کے دی شکایت کیتی نہ اپنے ہارے کدے رب نوں کوئی رائے دتی، ہیر بہت سوہنی پڑھدا تے کوڈی بہت  
 سہاگا چکن وچ دی پنڈ وچ دو بے نمبر تے سی۔

اک واری مور کہ بخار چڑھیا۔ چاچی پہلاں اوہنوں حکیم صاحب دی دوا پاندا دی رتی پھیر درشن  
 چاٹ جی بنا کے دتی۔ پر چاچے دے بخار دا چکر اونویں ای نوں ریائے او سے طراں گھسن گھیری پاندا گیا۔  
 ضلع دے وڈے ہسپتال لجان دارادہ کر کے گڈے تے پایا تے انگ ساک ادھر راہ وچوں ای موڑ لیاے جو چاچا  
 اپڑیا، مسافری وچ ای گزر گیا تے اوہدے ایانیاں دے سرتے ہتھر رکھن آلا کوئی نہ ریئا۔

مولوی صاحب نے ساڈی ہستی دے سارے مسلمان گھراں وچ آپ جا کے اطلاع دتی جی پر  
 تلی دا تيجا اے سارے بھرا مسیت وچ کٹھے ہون تے جان والے لئی دعا کرن تے اوہدی روح نوں ثواب  
 بنداسی۔ ہر ایک دی اوہنے خدمت کیتی اے سنانوں وی چاہی والے کہ اسیں وی دعا بخش کے اوہدیاں مہربانیاں  
 بدلہ لائیے۔

میرا کھیال اے جی چاچے حشمت دے تیجے تے اسیں کوئی بچی حبیہ بندے مسیت وچ ہونوں  
 بندے ساڈی پتی توں باہر دے وی سی جیزے چاچے حشمت تیلی نوں کلام بخشن آئے سی تے اک پاسے بیٹھے  
 شریف پڑھ رئے سی..... گنگاں، تسمیاں، مکالین مگروں مولوی صاحب نے دعا منگائی تے اسیں جتیاں پائے  
 مسیتوں باہر نکلے تو ہونے لگے بھائی جسا سنگھ دا چھوٹا کا کا، پرانی پتھر وچ لے کے اپنے گڈے اگے بلداں نوں  
 تھوڑا کچا جیا ہو کے تے نوں پا کے میرے اباجی نوں کہن لگا، تایاجی! باپو نے آپ آنا سی پر اوہنوں تاپ چڑھیا

تھوڑا سا جھٹکا جیبا ہے۔ میرے ہتھ اوٹھیں سینھیا بھجیا اے بنی مسیتے جا کے ساریاں نوں دس دس میں وی دعائے اپڑنا  
تیرے کنبے ہتھوں رہ گیا ایں۔ بڑا چاراماریا پر میرے کولوں ٹریا نہیں گیا۔ ہن بلیر سیاں دے ہتھ بائی حشمت لئی دعا بھیج رہا  
ہے، مینوں اپنے نال شامل شریک ای سمجھنا۔

بلیر سیاں نے گڈے توں ترپال لاہ کے آکھیا ”باپو نے تیجے لئی آہ دعا بھیجی اے تے نالے سنیہا دتا اے بنی  
جس ٹکڑا ہو گیا چاچے حشمت دے چالیے تے پھیر وی دعا بھجوان واپر بندھ کراں گا۔  
گڈے وچ دو بوریاں کنک سی، اک مائی چولاں دی، ویہہ پٹی سیر شکر سی تے اک پپا گھنٹیو دا، دورر جیاں،  
کسٹمان چھینٹ دا۔

کاکے بلیر سیاں نے اک واری پھیر کچے جے ہو کے آکھیا۔ ”اوجی باپو کہندا اسی بنی اپڑناں میں آج وی جانا  
تیرے کولوں چنگلی طراں ٹریا نہیں جاند، پیر چھوٹے جے تین ڈیہہ پئے سن۔“

## بایئیکل

انج مساب کر یے تے بنی ساں سپے ویں کھان ایں پر جے سن دی تپوئی کھول کے ورتے پھو لیے تے کھل وی  
کھل وی اے۔ اوی دھپاں، اوی پیل رشنائی، اوی بوتائے لاہ سیاں دانو ہری تے اوی اودھیدا پریت سماں یوتا  
جیو جھائی ٹی بابونل شرڈا کے گڈی تو پھے اگلا ٹیشن لگھ جائے۔ جیو جی گل میرے ابا نے کھیں سی بنی ہندی اوہ اسیں تائے  
توں دس کے پوری کروا لینی، جیو جی شے میری ماں نے لیان توں انکاری ہو جانا اوہ اسیں تائی نوں دس کے پکوالینی۔ چھنے  
بھر کے گھر لے آنے آپ دی کھانی تے گھر دیاں نوں دی کھوانی۔ میری ماں نے کہنا ”بی بی تو منڈیاں نوں دگاڑو کیں گی۔  
ہو گے ای کسے دے آکھے نہیں گڈے توں ایناں نوں ہور وگاڑو دینا ایں۔“

تائی کر پونے ہس کے کہنا۔ ”بھابھی توں چتاناہ کریا کر، تے بہتے وہماں وچ نہ پیا کر۔ ایناں دے آہی تاں  
کھان چین دے تے مو جاں مارن دے سے ایں۔ پھیر ایناں نے جو لے پٹھاں سردے کے دیلا کڈھنا اے۔ اودوں  
ہیں نے کدھر آ کے کہنا اے تائی ساگ پکا دے، تائی کڑاں بنا دے، تائی پوڑے تل دے، ایناں نوں ٹھکلیا نہ کر، جو آنکھن  
سمن لیا کر، اپنے اپنے کھارتے ہو گئے تے فیر ایناں نے کتھے ملنا اے۔

میں دسویں دا امتحان دتا تے اپنے ابا کول اوہناں دی ڈپنٹری تے آ کے کہیا ”بابا مینوں بایئیکل لے دے  
کھن میں ہڈا ہو گیا ایں۔“ تاپا لاہ سیاں کول ای اک موڑھے تے بیٹھا، کھنڈے جے چاقونال پیراں دے نوں بہ پیا کٹ دا  
سی۔ ہتھ روک کے کہن لگا۔ ”اوائے ملا، بایئیکل نوں پھائے دینا ایں۔ بابے نوں آکھ گھوڑا لے کے دے دے۔ سواری  
کریں تے سانوں وی سوہنا لگیں تے سارے جگ نوں وی بھانویں، سیکل وی کوئی سواری اے۔ دفع کر، مار کاٹھ،  
میرے نالوں تے بند اپیدل ای چنگا۔“

میں کہیا ”تاپا مینوں بایئیکل ای چنگلی گڈی اے تے میں بایئیکل ای لینی اے۔“  
میرے ابا نے پکا جیام نہ کر کے آکھیا۔ ”بی اے وچ داخلہ لویں گاتے سائیکل ملے گی ایدوں پہلاں نہیں۔



تیرے وہڈے بھرانوں وی بی اے وچ لے کے دتی سی تے تینوں وی او دوں ای ملے گی۔" میں کش بولے بغیر جواب دے تے  
 بناں روں باکا جیا ہو کے ڈپسری باہر آ گیا۔ تے ماں کول آ کے اچی اچی روں لگ گیا۔

اگلے دن میں سویرے سویرے اپنے ہرن دے سنگاں نوں تیل لارہیاسی جو مینوں گلی دی نکر تے تاپا لہ بھ سیکھ  
 آؤندا سی۔ اوہ کچ کبا کباتے ٹیڈھا ٹیڈھا مزدا پیاسی تے اوہنوں سمجھ نہیں آؤندی سی بنی کہے ہو کے ٹراں کہ جے پاسے  
 ہو کے پینڈا کران۔ کش گابرجیاسی۔ اوہدھے ہتھ وچ اک نوں سیکل سی جیدھے ڈنڈیاں تے کھا کی کاغت وھلیے سیکھ  
 سی۔ تاپا اوہنوں کد سے ہنڈل تو پھڑکے کچھ اسی کدے گدی تو پھڑکے دھند اسی۔ سیکل ٹیڈھی ہو ہو جاندی سے تے  
 چوڑے داہوئی جندا سی۔ میں بھج کے، اگے ودھ کے اک ہتھ ہنڈل نوں پالیا تے دوہتی بانہہ وھلیے کے تائے نوں  
 لئی۔ اوہنے میرے سرتے دھپامار کے کہیا: "لے پھڑا یوں، روں نہ لگ جیا کراڈی مچھتی تے مرا بھرانوں تک نہ  
 کرتوں ساریاں چوں نہ کچھ بلایاں۔"

پھیر پتہ نہیں کی ہو گیا۔ کس نے منتر بڑھیا تے کس نے جادو کر دتا۔ تاپا ساتھوں تے اسیں تائے توں دوہ  
 ساڑھے سنہرے وچ کوئی ہو آ کے پھس گیا۔ کسے نے ساڑھے اتھاروی ڈور توڑ کے سانوں اک دوہے توں پرا کر دتا۔  
 اسیں ایڈھرا آئے ایں اور ایسا ویلا سی جدوں تائے تے تائی ہندے ہوئے وی اسیں اک دوہے توں مل نہیں سکے۔  
 دی گنڈھ مہری سیکل وہ او تھے ای رہ گئی۔ جیڑھی نہ میرے کول رتی نہ میرے تائے دے گھر گئی۔ کوئی ہو رای اوہنوں  
 لکیا۔ کوئی تچا ای سانوں دوواں نوں لٹ کے لیے گیا..... سانوں پتہ نہیں چلن دتا تے اسیں دونوں لٹے گئے نہ

## احمد ندیم قاسمی

قاسمی صاحب سے دور دور کی ملاقات رہتی تھی۔ عموماً وہ منصورہ کی تحویل میں ہوا کرتے اور ان تک رسائی  
 کے طفیل ہوتی۔ وہ بھی ان کی حفاظت کسی زس کی سی مستعدی سے کرتی۔ نہ اسے اپنی فکر ہوتی نہ اپنے گھر والوں کی  
 ہوتا تو دنیاں پلا دیتی۔ کبھی کبھی کٹاٹی پکڑ کر نبض جانچ لیتی، منصورہ میں ایک شکر گزار روح ہے۔

جس طرح قاسمی صاحب نے ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کی زندگیاں بنائیں، ویسے ہی وہ منصورہ کو  
 سے منسلک کر کے اس کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں لگے تھے۔ خاں صاحب اور میں بڑے شوق سے اس محفل میں  
 پھر مشکور حسین یاد نے ہمیں شام کے کھانے پر بلایا۔ یہ ادیبوں کا کٹھ تھا۔ کھانا Caterers سے آیا تھا۔  
 کے بعد سب فرشی نشست میں بیٹھ گئے۔ سب ادیبوں کی خواہش تھی کہ قاسمی صاحب اور دوسرے موجود حضرات  
 سنائیں۔ پھر قاسمی صاحب کچھ اٹھتے بیٹھتے میرے پاس پہنچے۔

"قد سیر میرے کچھ کام آؤ گی۔"

ہم دونوں کچھ حیران سے ہو گئے۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں، اس کی کیا مجال کہ انکار کرے۔" خاں صاحب تپاک سے بولے۔

”وہ دیکھتی ہو..... شہزاد احمد کے دائیں ہاتھ۔“

”جی ایک لڑکی ہے۔“

”بھائی لڑکی نہیں میری بیٹی ہے ناہید قاسمی۔ میں اس کا گنہگار ہوں۔ سب کے لیے مجھے وقت ملا لیکن میں اس کی سزا جیتوں کو ابھار نہیں سکا۔ اچھی بھلی شاعرہ ہے لیکن میں اسے مشاعروں میں ساتھ نہیں لے جا سکا۔ اب بھی مشکور اسے جیتے رہنے لے آیا ہے ورنہ میں تو شاید اسے کبھی ساتھ نہ لاتا۔“

”شاعری کے علاوہ کیا کرتی ہے ناہید؟“

”پی ایچ۔ ڈی کر رہی ہے۔“

اس کے بعد میں نے ناہید کے قریب ہونے کی کوشش ضرور کی لیکن ایسے کام جس تو اترا اور پیہم گمن کے ساتھ کیے جاتے ہیں، مجھ میں اس کی اہلیت نہ تھی۔ لوگوں کو ان کی من چاہی منزلوں تک پہنچانے کا فن قاسمی صاحب اور خاں صاحب تو جانتے تھے۔ نقل و ادراصل کی طرح نہیں چل سکتی۔

”فنون“ اور منصورہ کی وساطت سے مجھے قاسمی صاحب ملتے رہے۔ پھر خاں صاحب کے جانے کے بعد تیسرے دن ہمارے گھر پر بہت سے رشتہ داروں اور اادیبوں کی بھیڑ تھی۔ سب چپ چپ کھوئے کھوئے سے تھے جیسے راستہ بھن گئے ہوں یا رہ گم ہو گیا ہو جو انہیں راستہ دکھائے۔

مولوی صاحب اور ان کے شاگرد اونچے اونچے پارے پڑھنے میں مشغول تھے۔ گفتگو اول تو تھی ہی نہیں اور پھر قاسمی بھی تو کھسر پھسر کے انداز میں.... پھر کسی نے مجھے پیغام دیا ”آپ کو قاسمی صاحب بلا رہے ہیں۔“

قاسمی صاحب کے ساتھ والی کرسی خالی تھی۔ میں چپ چاپ اس پر بیٹھ گئی۔ چند منٹ قاسمی صاحب کچھ نہ بولے۔ پھر گویا ہوئے۔

”تدسیر! مجھے تمہارے شوہر کا بڑا سہارا تھا۔ آج میرا بازو ٹوٹ گیا۔ میں اور کیا کہوں جس کا بازو جاتا رہے، وہ کیسے بے سہارا ہو جاتا ہے۔“

دونوں جانب خاموشی طاری ہو گئی۔

پتہ نہیں اس دارالفنا میں انسان کیسے کیسے سیکھتا ہے، کبھی گنوا کر کبھی لٹا کر کبھی حاصل کر کے..... اور جانیے یہ سیکھا ہونے سے یاد بھی رہتا ہے کہ نہیں؟

## احمد بشیر

ممتاز مفتی ہماری زندگی میں بہت سے لوگ لے کر آئے۔ ان میں سے ایک احمد بشیر بھی تھے۔ گھنگریا لے بال، سولہ رنگ، بھرا بھرا سا جسم، ان کا رشتہ خاں صاحب سے رشک اور حسد سے ملا جلا تھا۔ وہ خود جس ہر دل عزیز کے متمنی تھے، وہ خاں صاحب کے گھر کی لونڈی تھی۔ بھائی احمد بشیر اس طرح الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ نہیں تھے اور شہرت اب

ایکسٹرانک میڈیا کی مرہون منت ہو چکی تھی۔

لیکن اللہ میاں ہر مقام پر تلافی کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ جب تا دیر کوئی شخص اندر ہی اندر کسی خواہش پر مڑتا ہے، اس کے لیے مارجا تا ہے۔ اس کے پورے ہونے کی آرزو، اس کے اندر دم نہیں توڑتی تو اشک شوقی کے طور پر کسی سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

احمد بشیر کے چار بچے تھے جو ابھی پروان پڑھ رہے تھے اور ان کی شخصیتیں ابھی نکھری نہ تھیں۔ ان چار بچوں میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹا امریکہ چلا گیا اور وہیں سیشن ہو گیا، لیکن بیٹیوں نے احمد بشیر کے نام کو روشن کرنے کا بیڑا اٹھ لیا۔ سب سے بڑی نیلم احمد بشیر دنیائے ادب سے وابستہ ہو گئی، لیکن ناروے سے پہلے وہ امریکہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی۔ انسوس خد متیں کرنے، ہاتھ پاؤں جوڑنے کے باوجود اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔ اس کے بچے وہیں باپ کے پاس رو گئے اور نیلم خالی ہاتھ پاکستان آ گئی۔ احمد بشیر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نیلم نے اب دنیائے ادب میں اپنا مقام تلاش کر لیا ہے اور بھائی احمد بشیر کی تلافی ہو گئی۔

دوسری بیٹی بشری نے ایکسٹرانک میڈیا پر دھاوا بون دیا اور وہ مارا ماری کی کہہ بڑے بڑے نام ہانڈ پڑ گئے۔ پروڈیوسر اقبال انصاری کو تو اس شہرت کا تھوڑا فائدہ ہوا لیکن احمد بشیر کی شان دو بالا ہو گئی۔ اس سے چھوٹی بہن کی شادی ایک کزن سے ہوئی لیکن ازدواجی زندگی قسمت میں نہ تھی۔ باپ کے پاس ٹوٹ آئی اور اب ٹیلی ویژن سے وابستہ ہے۔ پروڈیوسر کا کام کرتی ہے۔ ایک اور بہن سنبل بھی ٹیلی ویژن پر لگاتی ہے اور ان دنوں بچوں کے پروگرام ”وک“ میں شرکت کرتی ہے۔

اصل میں احمد بشیر بھائی کی جان ان کی بیگم مودی میں ہے۔ انہوں نے جب ”نیلا پریت“ فلم بنائی تو اس کے لیے شہاب صاحب سے چار لاکھ روپیہ لیا۔ شہاب صاحب پیر دیتے وقت تو ذرا بھی متذبذب نہ ہوئے لیکن ایک دن ان کے سرسری انداز میں انہوں نے خاں صاحب سے کہا۔ ”یار یہ ”نیلا پریت“ مجھے چلتی نظر نہیں آتی۔ اس کا موضوع بھی عجیب ہے۔“

احمد بشیر کو مودی سے بہتر کوئی سنگر نظر نہ آئی اور مودی بیگم نے کسی پروفیشنل عورت کی طرح یہ گانے گائے۔ گانے تو فلاپ نہ ہوئے اور کئی بار ایکسٹرانک میڈیا پر سنے گئے لیکن یہ فلم دو روز دیکھیں بھی کامیابی سے ہسکنا نہ ہوئی۔

## آذر زوبی

آذر زوبی سے خاں صاحب کی دوستی میری شادی سے بہت پہلے کی تھی۔ وہ ان کے ان محدودے چھوڑنے میں سے تھے جو اٹلی جانے سے پہلے خاں صاحب کے پاس 1- مزنگ روڈ آیا کرتے تھے۔ فرش پر خاں صاحب کے ساتھ سوتے۔ اماں جی کھانا بھجواتیں تو صبر شکر سے کھا لیتے۔

زوبی بھائی میں مصور کی ازلی بیگلی تھی۔ وہ اپنے راستے کا تعین چاہتے تھے لیکن یہ تعین کسی استقامت کے ساتھ

تھے کے اندر نہیں ہوتا تھا۔ جن دنوں خاں صاحب تراڑ تھیں میں ایک ٹرک میں ریڈیو پاکستان کے پروگرام کر رہے تھے، دن دنوں زوہبی صاحب نے اوپن ایئر تھیٹر میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ اس وقت اوپن ایئر تھیٹر میں سٹیج کے پیچھے تین کمرے اور غسل خانہ ایک سیٹ کے طور پر موجود تھے۔ ان ہی میں زوہبی صاحب نے بیہرا کر لیا اور وہ اپنا ایزل برش پینٹ لگا کر تصویریں بنانے لگے۔

وہ غالباً تجریدی آرٹ کے پہلے مصور تھے۔ ان کی معروف پن ڈرائنگ میں آپ کو ایک مرد کی آنکھ رکھنے والا گھوڑا اور ایک نیم خوابیدہ حسینہ کا سہیل نظر آتا ہے۔ یہاں زوہبی صاحب سے ملنے ادب دوست، آرٹسٹ آنے لگے۔ پتہ نہیں لارنس گارڈن میں کچھ ایسی کشش ہے کہ پیاز کی اثر ہے، شاید اوپن ایئر تھیٹر میں رومانیت کی روچتی ہے کہ کافور کے چھتار کے درخت کا اثر... شاید باقاعدگی کے ارد گرد ایسی Frequency موجود ہے کہ انساں کشاں کشاں اُدھر کھینچا چلا جاتا ہے۔

اس جگہ آرٹ تو کم ہے لیکن ادیبوں کی ایک منڈی تیار ہو گئی۔ ممتاز مفتی، یوسف ظفر مع اشفاق احمد صاحب۔ جب بھی آتے گنگو کا زعفران چل اُٹھتا۔ کبھی کبھی جمیلہ ہاشمی اور قرۃ العین حیدر بھی جا نکلتیں۔ نیشنل ٹار عزیز باقاعدگی سے آنے لگیں۔ ٹار میں ایک بڑی اویہ کے جراثیم موجود تھے۔ وہ سب کی توجہ سمیٹ لیتیں۔

اشفاق احمد اور ٹار میں خصوصی تعلق پیدا ہو گیا کیونکہ دونوں پٹھان تھے اور اظہار کے بغیر محبت کا اظہار کرنا جانتے تھے۔ اس تعلق کی پاسبانی بھی تکڑ کرتی ہیں۔

جب 24۔ ایس کینال پارک میں خاں صاحب آنے لگے تو ایک دن وہ آڈیو کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ کلا پھانک کھول کر اندر آئے تو میں کیکر کے درخت تلے بیٹھی تھی۔

”یہ میرا دوست آڈیو ہے۔ میں اسے تمہیں ملانے لایا ہوں۔ افسوس اپنے آنے کی تمہیں پہلے سے اطلاع نہ دے سکا۔“

ٹرنٹ میں نے لاگو کو بازار بھینجا اور دہلی، برقی اور نمک پارے منگوائیے۔ سارا وقت دونوں دوست اپنی باتیں کرتے رہے اور زوہبی صاحب نے بھی مجھ سے کوئی سوال جواب نہ کیے۔

1950ء میں ابھی ہمارے امتحان نہ ہو پائے تھے کہ زوہبی بھائی روم چلے گئے۔ وہاں Radio Italiana کے اردو پروگرام لکھتے۔ ان کو براڈ کاسٹ کرتے اور خطوں کے جواب دیتے۔ اطالیانہ کے کرتادھرتا ان سے خوش تھے۔ صرف مشکل یہ تھی کہ زوہبی بھائی کا کنٹریکٹ فقط دو سال کا تھا اور شرائط کے مطابق اس معاہدہ میں توسیع ممکن نہ تھی۔

زوہبی بھائی نے خاں صاحب کو لکھا کہ تمہارے لیے یہ گولڈن چانس ہے۔ تم یہ پروگرام بہ سہولت کر سکتے ہو۔ پھر تمہارے پاس ایم اے کی ڈگری بھی ہے۔ تم ISMEO میں اردو پڑھا سکو گے۔ ابھی ابھی یہاں اطالوی طالب علموں کو اردو پڑھانے کا سیکشن کھلا ہے۔ یہاں موقع ہے، فائدہ اٹھاؤ۔ میرا گھر 16-Catore موجود ہے۔ تم کو وہ مل جائے گا۔

خاں صاحب بھی چھوٹے چھوٹے سفروں سے چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے اکتا چکے تھے۔ انہوں نے اسے امداد وغیرہ سمجھا اور لمبی اذاری کے لیے تیار ہو گئے۔ جوائن کرنے سے پہلے جب وہ کراچی پہنچے تو زوہبی واپس آ چکے تھے۔

آخری مرتبہ جولمباخط مجھے خاں صاحب نے ساحل سمندر سے لکھا، زوہبی صاحب کے گھر سے لکھا۔

بہت سال بعد زوہبی صاحب واپس آ گئے اور انہوں نے ایک آرٹ سکول کراچی میں بنا لیا۔ اس میں دو طب علموں کو آرٹ کے رموز سکھایا کرتے۔ ان کی گھریلو سیاق و سباق میں بیوی کراچی جانے کے خواب دیکھتی رہی لیکن آرٹ سکول میں ایک طالب علم صغریٰ بی بی پہلے ان کی منظوری نظر بنی، پھر بیوی ہو گئیں۔ صغریٰ مجھے اور خاں صاحب کو ملنے آتی رہتی تھی۔ ہم بھی ایک بار زوہبی بھائی کے School of Decor میں گئے۔ خاں صاحب چیف۔ گیٹ اور تقریب انعامات تسلیم کرنے کی تھی۔

لیکن کسی کو کیا پتہ کہ مستقبل ہمارے لیے کیا چھپائے رکھتا ہے۔ صغریٰ کی کچھ ان بن زوہبی بھائی کے ساتھ رہنے لگی۔ زوہبی بھائی گھر چھوڑ کر سکول میں منتقل ہو گئے۔ صغریٰ گھر میں اکیلی رہنے لگی۔ نضائے کار ایک دن صغریٰ اپنے گھر کے فرش پر مردہ پائی گئی۔ آنا نانا اس کے گھر والوں نے پولیس کا درخت کھنڈیا۔ پتہ چلا کہ موت صغریٰ نے تھی بلکہ اسے ہاتھوں کے نیچے میں کس کر کسی نے گلا گھونٹ دیا تھا۔

الزام زوہبی صاحب کے سر تھوپ دیا گیا۔ زوہبی صاحب اپنی بے گناہی ثابت کرنے والے نہ تھے، خاصیت رہے اور دھر لیے گئے۔ خاموشی سے جیل بھگتی۔ معتبہ ٹھہرے۔ خاں صاحب جب تک حیات رہے، زوہبی صاحب ہمارے پاس آتے رہے۔ اب وہ قصور بھی جانے لگے تھے لیکن دونوں نے صغریٰ بھائی کا نام کبھی نہیں لیا۔ سکول آف آرٹ زوہبی صاحب کے جیل جانے پر بند ہو گیا۔ واپسی پر ان کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا۔ وہ قرآنی تعلیمات، نظریہ پاکستان اور اقبال کے نظریات سے متاثر ہو کر تصویریں بنانے لگے۔

زوہبی انتقال کر چکے ہیں۔ اس کا ذکر ضروری ہے۔

اقبال کی Interpretation جس طرح آذر زوہبی صاحب نے کی ہے، اس کی نقل کرنا ہر کسی کے بس نہیں۔ اب وہ جس مقام پر پہنچ چکے ہیں، اس کا حوالہ ساتھ منوف ڈاکٹر محمود الرحمن کے مضمون سے کیجیے۔

## اقبال..... آذر زوہبی کی نظر میں

ڈاکٹر محمود الرحمن

28 اگست 1922ء کو پنجاب کے مردم خیز قصبہ قصور کے ایک غریب گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام عنایت اللہ رکھا۔ کھیتی باڑی کرنے والوں کے ماحول میں یہ واحد بچہ تھا جو نہ کدال پکڑتا نہ کھری ہاتھ میں جینت وہ تو بس لکڑی کے کونسلے یا سفید کھریا مٹی سے دیواروں پر لکیریں بناتا رہتا۔ ماں باپ، رشتہ دار اور محلے والے اس کی حرکتوں سے نالاں رہے مگر عنایت اللہ اپنے کام میں مگن تھا۔ کسی طرح اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور گھر سے بھاگ کر لاہور آ گیا تاکہ ڈرائنگ اور پینٹنگ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکے۔

نیشنل کالج آف آرٹس کے پرنسپل سے ملاقات کے لیے وہ تین دن تک چکر لگا تا رہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر چوتھے روز زبردستی پرنسپل کے کمرے میں گھس گیا۔ پرنسپل گپتانے میلے کھیلے شلوار کرتے میں ایک دیہاتی لڑکے کو دیکھتا

مے سے سرخ ہو گیا اور چیز اسی کو بلا کر کہنے لگا۔

"Throw this boy out."

قبل اس کے کہ کان پکڑ کر کمرے سے نکالا جاتا، عنایت اللہ نے جھٹ بگل میں دہلی اپنی تصویریں میز پر پھیلا دیں۔ پرنسپل گپتا نے انہیں دیکھا اور ایک دم نرم پڑ گیا۔ کہنے لگا کہ دو روپے نکالو اور یہ فارم بھردو۔ عنایت نے دس آنے نکال کر میز پر رکھ دیئے اور یہ کہا:

"سرمجی! بس یہی ہے۔ قصور سے ایک روپیہ لے کر چلا تھا۔ چھ آنے کرائے اور کھانے پینے میں خرچ ہو گئے۔" ہندو پرنسپل گپتا نے اپنی جیب سے دو روپے ادا کر دیئے۔ داخلے کے لیے امتحان ہوا۔ قصور کا یہ الہزہ بیہاتی لڑکا پاس ہو گیا اور اسے داخلہ مل گیا۔ 1943ء میں اس نے آرٹ میں ڈپلومہ حاصل کر لیا۔ بعد ازاں مصوری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے نئی دہلی کے دارالحکومت روم پیچھا اور 1954ء تک وہاں قیام کیا۔ پھر اس کو پرلگ گئے اور وہ بین الاقوامی شہرت یافتہ آرٹسٹ کے طور پر پہچانے جانے لگا۔ اس قصوری لڑکے عنایت کو اس کے جگر ملی دوست مشہور افسانہ نگار اشفاق احمد نے آذر تہذیب کا بانگسا نام دیا اور وہ اسی نام سے تمام دنیا میں مشہور و معروف ہوا۔

کلام اقبال کی ترجمین کرنے والے مسوروں میں قصور کے یہ آرٹسٹ آذر زوہلی بھی شامل ہیں۔ ان کا اپنا رنگ بھر نشان ہے۔ وہ محض مصور، خطاط اور مجسمہ سازی ہی نہیں، ادب آشنا بھی ہیں۔ شعر و نغمہ کی ماہیت پر انہیں جو عبور حاصل ہے اس کی نمایاں مثال "شعور" جیسا ان کا منفرد رسالہ ہے کہ جب نکلا تو اردو اس طبقے کی آنکھوں کو خیرہ کر گیا اور جب بند ہو تو نیا نئے ادب سونی ہوئی۔

ادب شناسی کا یہی فطری جذبہ تھا جس نے کلام اقبال کی آفاقیت کا احساس دل آذر میں جاگزیں کیا۔ انہوں نے اپنے انفرادی رنگ میں شاعر مشرق کے افکار کی تشریح کی ہے۔ ان کے بنائے ہوئے خاکے منفرد انداز سے مفکر پاکستان کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ زوہلی کے خطوط میں بڑی ہمہ گیری، بڑا تنوع اور بڑی پہنائی ہے۔ ان کی ہر تصویر اقبال کے فکر و فن اور انداز و اسلوب کی غماز ہے۔

آذر زوہلی نے کلام اقبال کی پہنائی میں غوطہ زن ہو کر معنی و مفہوم کے جو موتی نکالے اور انہیں جس فنکارانہ چابک دستی سے خطوط اور دائرے میں پرویا ہے، وہ ان کے عظیم مصور ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی نمایاں مثال علامہ کی شہرہ آفاق نظم "شکوہ" کی ترجمین ہے۔

جیسا کہ اقبالیات کے قاری کو علم ہے، نظم "شکوہ" اردو شاعری میں انفرادی مقام کی حامل ہے۔ اس میں خدا سے خطاب کا ایک نیا اور نیا نیا انداز ہے۔ اس میں حمد و ثنا کی مشرقی روایت سے انحراف کر کے ایسا طرز تکلم اختیار کیا گیا ہے جس میں گنج گرج ہے، زور ہے، توانائی ہے، بے باکی ہے، انا ہے، احساس خودداری ہے، بندے کی شناخت ہے، جذبہ تشخیص کا اظہار ہے، رنج و ملال کی ترجمانی ہے، شکوہ و شکایت ہے اور نظر انداز کیے جانے کا صدمہ و غم ہے۔ یہ وہ تاریخی قومیت کی نظم ہے جو علامہ نے اپریل 1909ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں سنائی تھی۔ اسلامیہ کالج، لاہور کے ریواڑ ہال میں موجود سارا مجمع اقبال کی سحر انگیز آواز اور کلام کی اثر آفرینی سے سراپا مسحور تھا۔ جب ستمبر

1924ء میں ”بانگِ درا“ شائع ہوئی تو نظم ”شکوہ“ پورے برصغیر کے مسلمانوں کی آواز بن گئی۔ اس لیے کہ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

”اس میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا گلہ خدا سے کیا گیا ہے، اس میں الہام ربانی کی شان نظر آتی ہے۔“

ایسی الہامی نظم کے مفہوم کو موئے قلم سے ظاہر کرنا آرزوئی کے کمال کی دلیل ہے۔ ان کی وسیع النظری اور فنکارانہ صلاحیت نے ہر بند کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر تصویر اپنی آواز کا جادو جگ رہی ہے۔ مثلاً نظم کا پہلا بند ہے۔

کیوں تریاں سکار ہوں، سو فراموش رہوں  
 فکر فردا نہ کروں، جو غم دوش رہوں  
 نانے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں  
 ہمو! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں  
 جرات آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو  
 شکوہ اللہ سے خاتمِ بدہن ہے مجھ کو

مفہوم یہ ہے کہ میں کب تک خاموش بیٹھا اپنی بربادی کا تماشا دکھوں۔ کب تک اپنے حسین مستقبل سے غافل رہوں۔ جب مجھے قوتِ گویائی حاصل ہے تو کیوں نہ اللہ سے شکوہ کروں اور وہ غم سناں۔

مذکورہ بند اور اس کے معنی و مطلب کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم آرزوئی کے بنائے ہوئے اسٹیج کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چھ اشعار میں پنہاں اقبال کے جذبات، تفکرات، مشاہدات اور خیالاتِ زوئی کے نقش ہیں اس طرح حلول کر گئے ہیں کہ ہر خط، ہر لکیر اور ہر دائرہ نغمہ و نغمے کی اثر آفرینی، عورت کے پس منظر میں تیر چھ اور درندہ صفت دنیا کا ہیولا۔ یہ سب کچھ وہی عنصر ظاہر کر رہا ہے جو اقبال کے ذہن میں جاگزیں ہے۔ زوئی نے خدا کے سہارے اسی عنصر کو زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

غرض ”شکوہ“ پر مبنی ہر اسٹیجِ زوئی کی ذہنی پائیدگی، تاریخی شعور، سخنِ فصیح، وسیع النظری اور ذکاوت کا پیکار ہے۔ ان کی اس کوشش نے اقبال شناسی کے فن کو فروغ دیا ہے اور عوامِ انسان کو شاعرِ مشرق کے آفاقی کلام سے قریب کر کے دیا ہے۔ بیانِ کلا و براہِ پرزاقیائیت پر اور اسرارِ تارخ پر بہت بڑا احسان ہے۔

## الطاف فاطمہ

پتہ نہیں الطاف فاطمہ خاں صاحب کو کب کا جانی تھی۔ غالباً جب وہ اسلامیہ کالج میں اسٹنٹ پروفیسر تھی تب سے خاں صاحب سے ملنا ملنا ٹھہرا۔

الطاف فاطمہ کالج کے سامنے مین سڑک سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی کوٹھی میں رہتی تھی۔ پتہ نہیں نشاطِ قلم

تو تمہیں تمہی کہ کہیں اس کا گھر بھی پاس ہی تھا۔ دونوں بہنیں لکھتی تھیں، لیکن الطاف فاطمہ کی کلا ہولے ہولے جگ رہی۔ پھر خاں صاحب الطاف فاطمہ سے بہت متاثر تھے کیونکہ ایک تو اس کا گھر علمی، ادبی، مذہبی روایات کا حامل تھا۔ پھر حسین اس کے سگے ماموں تھے۔ یہ ہمارے لیے ایک بہت بڑی ادبی شناخت تھی کیونکہ رفیق حسین کی کتاب ”گوری“ کے افسانے ہم بار بار پڑھتے تھے۔

الطاف فاطمہ کبھی کبھی پیدل ”داستان گو“ کے دفتر میں آ جاتی، کبھی نشاط ان کے ہمراہ ہوتی۔ یہ ملاقاتیں ادبی گفتگو کی ہوا کرتیں۔ ”داستان گو“ میں اس کی دو تین کہانیاں بھی چھپی تھیں۔ مجھے ان مہاجرین سے گہری ہمدردی ہے، جو اس امید پر آئے تھے کہ ہم سب ایک ہیں اور مسلمان کی اصل شناخت اسلام ہے، لیکن یہاں پہنچ کر سب کو اپنی پریم و رواج، زبان، نثر کا خوف چٹ گیا اور اسی خوف نے بھانت بھانت کے اختلافات کو جنم دیا۔ پتہ نہیں، الطاف فاطمہ کہاں کھو گئیں۔ اس کا شائستہ لب و لہجہ، نشست و برخاست کبھی یاد آتا ہے تو جی چاہتا ہے کسی رات میں اچانک اسے میرے گھر کا راستہ مل جائے۔

## محسن احسان + شفقت

محسن احسان اور شفقت اسلام آباد میں رہتے تھے۔ میں اس جوڑے کا تصور علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتی۔ جب کبھی بورڈ آف ایجوکیشن سے ضرور ملتے اور ہم جب اسلام آباد پہنچتے تو ان کو ضرور خبر کر دیتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ایک روز ہم ایو بیہ پارک دیکھنے گئے۔ خاں صاحب اور محسن احسان مزے سے ایک بیچ پر بیٹھے اور ادبی گفتگو کرتے رہے لیکن میں اور شفقت اندر گھومنے پھرنے چلی گئیں۔ اس روز شفقت میری چھوٹی بہنوں کی طرح اپنے چھوٹے چھوٹے بے ضرر رازوں کو بے نقاب کرنے پر تھی۔ شفقت سے ملنا بڑی پرائیویٹ ملاقات تھی۔ ہم خوب ہنسے، لڑکیوں کی طرح شرمائے لگائے..... اس ملاقات کا اثر بھی تک زائل نہیں ہوا۔ اسی لیے آپ کو وہ تصویریں دکھانا چاہتی ہوں جو میرے لیے اعزاز کا باعث ہیں۔

## ڈاکٹر انور سجاد

ڈاکٹر انور سجاد ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر طرح فٹ آتے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا کی طرف نظر ڈالیں تو وہ محضوں میں بھی قابل ذکر، لکھنے والوں کی فہرست دیکھیں تو بھی سرفہرست۔ ان کی کام کی رفتار کچھ ایسی تخلیقی قوتوں کی نشانی سے بھری ہے کہ دو بیویوں کے باوجود ان کی رفتار سست نہیں پڑی۔

پہلی بیوی کے ساتھ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے جو کچھ بھی تنازع تھا، اسے انور کے بہت قریبی جان کاروں کے ساتھ دیکھنی نہیں جانتا۔ فنکاروں کی ایک مشکل عام آدمیوں سے ذرا مختلف ہے۔ جب الیکٹرونک فنکار کے ساتھ بار بار عشقیہ



ڈائلاگ بولنے کی سچائی میں دور تک دھنس جاتا ہے تو اس کا باہر کا حال اندر کی کیفیت سے مل جاتا ہے۔ یہاں تو مجھے نبھانے کے وعدے ہو جاتے ہیں اور ہیرا اور ہیروئن کو علم تک نہیں ہو پاتا۔ جب زیب اور انور سجاد دیر تک اور دور تک کھیل میں اتر گئے تو شادی ناگزیر تھی۔

اب انور کی بیچیاں بڑی بڑی ہیں۔ وہ کبھی کبھی انہیں مجھ سے ملانے آتا ہے۔ ”جیوسوپر“ کا سنبھالنے والا ہے۔ میڈیا سے اتنی پرانی وابستگی نے اس میں اس شعبے سے متعلقہ لوگوں سے خاص رابطے قائم کرنے کا سلیقہ دے رکھا ہے۔

## انور خاور

”جیوسوپر“ کا ایک دفتر لاہور میں ہے جسے انور خاور سنبھالتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب انور خاور غنڈھ شاعر کی حیثیت میں ہزارے گھر آیا کرتے تھے۔ میں اس کی شاعری کو کبھی بھی محترم نہ سمجھتا تھا اور آج بھی اس کے اشعار مجھے متاثر کرتے ہیں۔ اس کے تخلیقی عمل کی اسے ویسی شہرت نہ ملی جس کے ساتھ دارتھا لیکن یہی مشکل ہے یہاں شہرت آپ کے کام اور محنت کے حوالے سے نہیں ملتی بلکہ اوپر والے کی مرضی ہے جس قدر وہ چاہے جس قدر وہ توفیق عطا فرمائے، عطا ہو جاتی ہے لیکن انور شاید اس کی قابلیت کا میری طرح قائل ہے۔ لاہور کی براچی اس نے انور خاور کے سپرد کر دی ہے۔

دونوں طرف کا کام آرام بخشی سے چل رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اڑچنیوں، خرابیوں، ناکاکیوں، دونوں طرف سے سرزد ہوتی ہوں گی لیکن یہ تو ہر کام کے اندر ہمیشہ نہیں ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے کام آگے بڑھتا ہے۔ مجھے انور خاور سے چھوٹے بھائیوں کا سا پیار ہے۔ میں اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو اسی طرح سہہ کرتا ہوں جس طرح میں اپنی بڑی بڑی غلطیوں کو درگزر کرتا ہوں۔ اس نے میرے کئی ڈراموں میں معرکے کا رول ادا کیا ہے اور میرا خیال ہے اسی کی وجہ سے یہ ڈرامے مقبول بھی ہوئے ہیں۔

## واجدہ تبسم

ہم 121۔ سی میں آچکے تھے جب خاں صاحب اور واجدہ تبسم کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ چل چکا تھا۔ دن وہ کھانے کی میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان دھرے چپ چپ بیٹھے کبھی کبھی دو سطریں لکھ لیتے، پھر رک جاتے۔ جھاڑوں سے گریاں صاف کرنے میں مشغول تھی۔ میں نے بھی رک کر پوچھا..... ”خاں جی مسئلہ کیا ہے؟“

”مسئلہ تو کچھ نہیں، بس خط لکھ رہا تھا۔“

”اچھا..... کسے؟“

”واجدہ تبسم کو۔ بہت بڑی افسانہ نویس ہے۔“

میں اس نام سے قطعی ناواقف تھی۔

”کبھی وقت ملے تو اس کے افسانے پڑھو۔“

مجھے واجدہ تبسم کو جاننے، پڑھنے اور اپنی رائے قائم کرنے میں بہت وقت لگا۔ وہ حیدرآباد میں رہتی تھی اور  
میں تک رسائی کا ذریعہ تھے۔ خط بھی لکھے اور جب وہ ہندوستانی لکھنے والوں کے ساتھ پاکستان آئی تو وہ بڑی  
تجربہ کار تھیں۔ آپ واجدہ کی کہانی خود اس کی زبانی سننے کے لیے اُس کی تحریر بعنوان ”میری کہانی“ کا  
مطلبہ کیجئے۔

## پروین عاطف

پروین عاطف کو آج اردو داں طبقہ بہت بڑی لکھاری کے طور پر جانتا ہے۔ احمد بشیر، ان کی بیٹی نلیم احمد بشیر نے  
میں اپنا مقام بنا رکھا ہے۔ احمد بشیر کا گھرانہ تھلے نیو نیگیوں کا حامل ہے۔ نلیم کی دونوں بہنوں نے ٹیلی ویژن پر دعوم  
کے لیے۔ بشری انصاری کا میدان کومین ہے اور دوسروں کی نقل اتارنے میں اپنا کٹاٹی نہیں رکھتی لیکن میں اس وقت  
میں صبح صبح پر احمد بشیر کی چھوٹی بہن پروین عاطف کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مفتی جی داستان سرائے کا حصہ بنے اور ان کا پٹنگ ڈرائنگ روم میں لگایا جاتا  
یہاں مفتی جی سے ملنے لوگ چلے آتے تھے۔ مجھے عموماً آنے والوں کی خبر نہ ہوتی۔ پھر اچانک ایک دن مجھے مفتی  
کا پتہ پڑا۔

”قد سید ایک ری خبر ہے۔“

”مفتی جی! کبھی اچھی خبر بھی دے دیا کریں۔ بری خبروں کے لیے تو سارا شہر بھرا ہے۔“

”کیا کیا جائے اس وقت تو یہی حاضر حال ہے۔ تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔ یہ ضروری ہے۔“

مفتی جی نے مجھے بتایا کہ پروین عاطف نے کچھ زہر وغیرہ پھاٹک لیا ہے اور اس وقت ہسپتال میں داخل ہے۔  
یہ سب سچ ہے کہ پروین عاطف کے شوہر بریگیڈیئر عاطف نے ایک من چاہی عورت سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور پروین عاطف کی  
حیثیت کے عوض اسے ٹھکرا کر علیحدہ ہو گئے ہیں۔

بریگیڈیئر عاطف ہاکی کے کرتا دھرتا اور چیف تھے۔ ہر بڑے آدمی کی طرح ان کا زیادہ وقت ہاکی کے ساتھ  
تھا۔ وہ گھریلو تعلق درست نہ رکھ سکتے تھے۔ یہ نہیں کہ انہوں نے کوشش نہیں کی۔ انہوں نے پروین عاطف کو ساتھ  
لے کر ان چڑھانے کے لیے پہلی بار پروین عاطف کو عورتوں کی ہاکی ٹیم کا چیف بنایا لیکن اس توجہ کے باوجود وہ ایک  
سچے کی تازگی کا شکار ہو گئے۔

میں ایک بات سوچتی ہوں کہ محبت ایک ایسا وصف ہے کہ اگر اس کی خوبی کو فقط اس کی خاطر نہ اپنایا جائے اور اس  
کا خیال نہ ہو کہ مجھے جو محبت کرنے کا شرف عطا ہوا ہے وہ بذات خود میرے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے تو بڑے مسئلے

اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ محبت کے بدلے محبت کی توقع سے پروین عاطف کی طرح خود کش ہونے کی مشکل پر دیکھتی ہے۔ پروین عاطف اپنے شوہر کی پرستار اس کے قدموں میں زندگی بسر کرتی آئی ہے۔ عاطف اس کے لیے پانی، گرمی سردی کے بچاؤ کی صورت تھا لیکن اندر ہی اندر کہیں وہ اس توقع پر بھی جی رہی تھی کہ اس آرتی کے ایسے مورتی بھی اسے کچھ عطا کرے گی۔

جب مجھے مفتی جی نے پروین کے متعلق اطلاع دی کہ وہ ہسپتال میں ہے تو میں گویا اسی موقع کی تلاش میں فوراً پروین کی ملک کو پہنچی۔ مجھے اپنے آپ کو اچھا اور بہتر ثابت کرنے کے لیے ایک موقع دستیاب ہوا۔ میں نے پروین کے لیے مفتی جی ثابت آدمی تھے۔ انہوں نے پروین کو لکھنے پر راضی کیا اور ہر مذاقات پر "لکھی لکھی لکھ" کی رٹ لگا دی۔ مجھے ہرگز اس کے لکھنے لکھنے سے غرض نہ تھی۔ میں اسے اپنا بھائی بچہ بنا کر ساتھ رکھتی۔ اس کے زخمی ہونے کی رکھنے کی کوشش کرتی۔ اسے ہرگز نہ بھولنے دیتی۔ نہ خود بھولتی کہ اس کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی۔ پروین کو میری چھوٹی عادت ہو چکی کہ وہ ہر صورت مجھ تک پہنچتے۔

ایک دن کیا دیکھتی ہوں کہ آیدہ دودھ والے ریڑھے پر پروین عاطف سوار ہے۔ ریڑھا ہمارے گھر کے رکا۔ پروین اندر آئی۔ حسن اتفاق سے میں باہر کھڑی تھی ورنہ وہ مجھے کبھی نہ بتاتی۔

"ریڑھے پر..... کیسے کیوں؟"

وہ ہمیشہ کی طرح لچبخت سے بولی..... "گلبہرگ تک تو رکشہ پر آئی تھی بانو جی، لیکن آج رکشہ نہیں ہے۔ کوئی ادھر آنے کو مائل نہ ہوتا تھا۔ میں بڑی دیر کھڑی رہی۔ پھر یہ جون جوگا، یہ بھے والا مل گیا۔ یہ ادھر آ گیا۔ آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ آ گئی۔"

"لیکن پروین اگر کوئی دیکھ لیتا..... تو۔"

"تو پھر کیا بانو جی۔ کہہ لے اسے جو کہنا ہے۔"

میں اس کی جرأت پر حیران ہوئی۔ شاید میں ایسا قدم کسی کی خاطر نہ اٹھ سکتی۔ لیکن سے میرے دل کے لیے جذبہ ترم کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت کے آگے ایک کمتری کا احساس بن کر بھی ابھرا۔ محبت میں اپنی تحفظ کی نہ پروا کرنے والا احمد بشیر کا سارا گھرانہ ایک ماہ ہے۔ یہ لوگ رتی بھر محتاط نہیں۔ شیشہ توڑ بھی ہیں۔ محبت سے اپنا آپ جوڑنے میں کبھی ماہر ہیں اور اسی محبت کا پتھر مار کر اپنے آپ کو رچی کرچی بھی کر دیے ہیں۔ پروین اور میری دوستی میں اس کے بچے بہت معاون ثابت ہوئے۔ بچے ایک ایسی تھکڑی ہیں جو ہر لمحہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ظل عاطف ایک نعم البدل جو عاطف کی جگہ قدرت نے پروین کو عطا کیا ہے۔ اس نے اس کی تعلیم لندن سے حاصل کی اور پاکستان لوٹا لیکن پی آر کی کمی کے باعث وہ ایبٹ آباد چلا گیا جہاں اس نے ایک میڈیم سکول کھول لیا۔ اس کی خوبصورت بیوی فریحہ قدم قدم اس کے ساتھ چلتی ہے۔ ایک مرتبہ خاں صاحب اور محمد آباد اس کے سالانہ فنکشن پر بھی گئے اور یہاں ہی فریحہ نے ہمارے دل جیت لیے۔

کچھ عرصہ بعد سکول بند ہو گیا اور ظل عاطف ماڈل ٹاؤن میں لاکالج کا پرنسپل بن گیا۔ یہاں فریحہ

جائے جاتے تھے۔ پروین ظل، فریحہ اور ان کے بچوں میں کھو گئی۔ ظل عاطف کی کوشش کے باوجود وہ اس کالج کا پرنسپل بن گیا اور اب وہ فیصل آباد شفٹ کر گیا ہے جہاں پروین عاطف اس کے ساتھ رہتی ہے۔ نیا شہر نئی زندگی..... لیکن اب پروین کی کتابیں پڑھتی ہوں۔ اس کا انداز بیان، مشاہدہ، تخیل انمول ہے۔ کاش! کسی دن وہ ہمت اور استقامت سے کہ ایک ناول بھی لکھ ڈالے۔ اپنے حالات زندگی کتاب میں منتقل کر دے۔ کسی سفر نامے میں رکنے اور قیام کرنے کی بات اور غم بھی بے نقاب کرے۔

شکوہ عاطف پروین کا دوسرا سپوت ہے۔ باپ کی طرح، بھائی کی مانند اونچا لمبا خوبصورت و چہرہ نوجوان ہے۔ پروین سے علیحدہ ایک شناخت ہمارے گھر میں قائم کرنی ہے کیونکہ وہ بڑی جاندار نظمیں لکھتا ہے۔ پہلے وہ انیق قریب ہوا پھر میرے دل میں جگہ بنا لی۔ آرٹس کونسل میں ایک فنکشن ہوا جس میں انگریزی نظموں کا مظاہرہ کیا گیا۔ صف، انیق احمد خاں نے اپنی اپنی نظمیں پیش کیں اور یہ نظمیں بہت سرائی گئیں۔

اب شکوہ امریکہ میں ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ مل کر رہنمائی کرتا ہے اور بیوی مریم بینک میں ملازم ہے۔ اس کے دل پر ایک کاری زخم یہ بھی لگا ہے کہ شکوہ عاطف نے والدہ سے رابطہ توڑ رکھا ہے۔ مجھے تو خط لکھ سکتا ہے لیکن اس کی تک نہیں کر سکتا۔ یہی زندگی ہے اور یہی اس کے رنگ ہیں۔

ڈاکٹر گل عاطف میرے لیے ایک تھہ ہے جو پروین عاطف نے مجھے دیا ہے۔ گل نے ثاقب شہاب کے ساتھ شہنشاہی کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ وہ ایک کامیاب زندگی کے تمام کوائف سے آراستہ ہے لیکن ماں باپ کی علیحدگی نے اسے بے پارہ کر دیا ہے۔ وہ نہ جانے کن کن عارضوں سے گزرتی ہے اور کیسی بھاگی بھاگی میرے پاس آتی ہے۔ اخیر احمد کی یہی ہے اور اسی کوشش سے بالآخر اس نے آب پارہ میں اپنا کینٹاک کھول لیا ہے۔

لیکن تو نے گھروں کے بچے جذباتی طور پر بہت ثابت و سالم شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ ماں باپ کو ایک گھر، ایک شخص سے وابستہ سمجھنے والوں کو زندگی سمجھنے میں ایک خاص قسم کی سہولت میسر آ جاتی ہے۔ یہ صدری نسخہ گل جیسے بچوں کے پاس نہیں ہوتا۔ شان عاطف میں بھی خود اعتمادی کی کمی باقی بچوں سے کم نہیں۔ وہ گلبرگ میں اپنے شوہر کے ہمراہ اسی بے اعتمادی سے رہتی ہے۔ وہ بھی پروین کی طرح میرے پاس آتی رہتی ہے اور میں اسے چنگلی بھر دے اور وادیا کرتی ہوں۔

پروین کا بھلا ہوا اس نے مجھے اپنے بچوں سے ملا کر مجھ پر بڑا کرم کیا۔ میرے گھر میں محبت کے پردانے بیچھے۔ احمد بشیر کا ذکر بھی یہاں بے جا نہ ہوگا۔ نایم امریکہ کو چھوڑ کر پاکستان آ رہی ہے۔ اس کے شوہر نے اس کے بچے کو بچھڑا لیا ہے اور نئی بیوی کے ہمراہ آنند کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

نایم کے پاس اب اپنی ذات کی جھاڑ پونچھ باقی رہ گئی ہے اور سبحان اللہ نایم ٹھوٹک کر وہ ادب کے میدان میں آ رہی ہے۔ اس نے امریکہ، اس کی تہذیبی ثقافتی زندگی پر حیران کن کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ گھٹنوں میں سر خود تری کا شکار بھی ہو سکتی ہے لیکن اس نے پروین کی مثال سے کچھ سیکھا۔

سلامت رہو پروین اور سلامت رہے احمد بشیر کا گھر اند!

## سلیم اختر، وزیر آغا، انور سدید

میں طبعاً ڈرپوک ہوں۔ خوف میری شخصیت کا بنیادی وصف ہے۔ اس لیے مجھے تنقید نگاروں سے بے حد ڈر ہے۔ جس تحریر کو ہم بیہر امن طوطا سمجھ کر سنبھالتے رہتے ہیں، تنقید نگاروں کے ہاتھوں ان کے پر جڑ سے اکھڑنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ مجھ پر تنقید نگاروں نے ہمیشہ مہربانی کی۔ مجھ سے محبت اور میرے کام کو پس پشت رکھا۔ ابھی ”راجہ گدھ“ مسودے کی شکل میں ہی تھا کہ سراج منیر مجھ سے مسودہ لے کر چلے گئے اور جب ان کی رونمائی فیض صاحب کی صدارت میں ہوئی تو سب سے لپٹا مضمون، حوصلہ افزا مضمون اسی نے لکھا تھا۔

ڈاکٹر سلیم اختر، خاں صاحب کے ہوتے ہوئے بھی اور ان کے بعد بھی مجھ سے بڑی محبت سے ملے ہیں۔ ہمارے گھر میں کوئی چھوٹی موٹی تقریب ادیبوں کی ہو، وہ ضرور موجود ہوتے ہیں۔ میری طبیعت کا پتہ لگتا ہے۔ میری بیماری کا سن کو ملول ہوتے ہیں۔ اب تو ان کی تخلیقی پروازیں بھی خوب تیزی پکڑ گئی ہیں لیکن ان کی سوانح بدلی۔ نداس کا ماڈل نداس کی رفتار ہی اور یہی بات ان کی وفاداری میں ہے۔ زندہ باد سلیم اختر!

وزیر آغا بڑے مشفق ہیں۔ ذرا مشکل پسند ہیں۔ اپنی نظموں اور نثر میں مشکل پسندی کی روایات لکھتے ہیں لیکن سائل کی مشکل پسندی کے باوجود طبیعت بڑی آسانیاں عطا کرنے والی ہے۔ ایسا تضاد بڑا خوش آئند ہے۔ کرے تا دیر یہی فضا قائم رہے۔

انور سدید سے میری ملاقات کم کم ہوتی ہے لیکن ان کی مختصر ملاقاتیں بڑی جان بخش ہوتی ہیں۔ ان کی ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ ہم دونوں 1928ء میں پیدا ہوئے۔ ہم دونوں کا برج ”توس“ ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان کے اثرات ہم دونوں پر ایک سے مرتب ہوتے ہیں۔

## بشری رحمن

عبدالرحمن میاں ان دنوں سے ہمارے ساتھ ہیں جب ہم موزوں پر بیٹھا کرتے۔ لمبے شور سے روٹیاں جو لمبے کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ رحمن میاں لکھنے کے شوقین اور ان کی کہانی ”دیرانے کا پھول“ گو، میں چھپی تھی۔ وہ تین حصوں میں بنا ہوا تھا۔ برنس، افسانہ نویس اور اپنی محبوبہ ثریا، جو اسے دودھ والوں کے پستان سوار ہو کر ملتان روڈ سے 121۔ سی ماڈل ٹاؤن ملنے آیا کرتی تھی۔ ثریا کا جذبہ دیکھ کر میں حیران رہ جاتی۔ ان تینوں چلتی تھی نہ رکشہ نیکی ملتا تھا۔ پھر ثریا کسی نرم دل گوالے کے ریڑھے کو روکتی۔ ریڑھے پر سوار ہو کر داستان سرائے چلتی تھی۔ عبدالرحمن میاں شاید شروع سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس نے ثریا کے جذبوں کا ٹیسٹ کیا۔ کافی دیر تک اس کے پرچے لیے۔ شادی میں ہم دونوں کو شریک ہونے کی دعوت نہ لی جس کا بچوں کا بہت افسوس تھا۔ رحمن میاں جو ہمیشہ ہمارے پاس رہا کرتا تھا، یکدم ثریا کے ساتھ غائب ہو گیا۔ آدمی تو مچھلا تھا۔

کچھ اچھے کی بات نہ تھی۔ پھر خبر ملی کہ رحمن میاں نے ثریا کو طلاق دے دی ہے اور بہاولپور میں ایک بشری سے شادی کر ہے۔ بشری ایک بہو کی حیثیت سے داستان سرائے میں آئی۔ اس کے طور طریقے دو لہنوں جیسے نہ تھے۔ جلد ہی پتہ چلا کہ اس میں ادب قدر مشترک ہے اور بشری رحمن کی تحریر سے متاثر ہو کر اس کی شریک حیات بنی۔

جس گھر میں عکسی مفتی نے لوگ ورثے کا دفتر بنایا تھا، جب عکسی اسلام آباد چلا گیا اور یہ گھر جو ہمارے بالکل قریب ہے، خالی رہ گیا تو رحمن اور بشری اس میں رہنے لگے۔ رحمن پہلے بھی تنہائی پسند اور Anti-social تھا۔ اب بشری کے ساتھ اس کی شخصیت کے سامنے اس نے گھر کے ایک کمرے میں اپنے آپ کو منتقل کر لیا۔ شاید بشری کو بھی دنوں دن اس کی تنہائی ہوئی تھی۔

ایک Introvert دوسرا Extrovert۔ وہ تین بیٹوں کے ماں باپ تو بن گئے لیکن اصلی حیوان ساتھی نہ بن سکے۔ رحمن نے داستان سرائے آنا چھوڑ دیا اور باوجود یکہ اس کا گھر ایک چوراہے سے دور نہ تھا، ہمیں بھی توفیق نہ ہوئی کہ اس سے ملنے جاتے۔

اب وہ لکھنا لکھنا بھول چکا ہے۔ اس کی بزنس پھیل گئی اور اس نے اپنے بیٹوں کو قازقستان میں بزنس بھول دیا۔ وہ وہاں تیل نکالنے کی مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ رحمن بنیادی طور پر انجینئر تھا اور وہ بھی ڈیپ انجینئر اسے اپنی اصلی فیڈلٹی دینا چاہیے؟

بشری کی ازائیں اپنے طور پر بہت اونچی ہیں۔ وہ اپنی کتابوں کی وجہ سے اردو ادب میں مقام پیدا کر چکی ہے۔ وہ جانے آگے کیا ہو؟ بشری بزنس کرنے لگے اور رحمن ویرانے میں پھول اگانے نکل پڑے۔

## منیر نیازی + احمد فراز

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم 479۔ این میں نئے نئے آئے تھے۔ غریبی سے نجات اور اس کے ساتھ ہی فراغت اور امید روز افزوں تھی۔ دماغ اپنی برتری پر نازاں بھی تھا اور مغرور بھی۔ یہ وہ عہد تھا جب ”داستان گو“ ہماری ساری توجہ کا مرکز تھا۔ ”داستان گو“ سے ہمیں بڑی امید بھی وابستہ تھی۔ ہم اس کی بچوں کی طرح پرورش کر رہے تھے۔

ان دنوں میرے گھر میں منیر نیازی کا پھیرا ٹوڑا رہتا۔ منیر نیازی کی نظم ”ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں“ ”داستان گو“ میں لکھی اور ہولے ہولے ان کی نظمیں ”داستان گو“ کی زینت بننے لگیں۔ منیر نیازی میں دو خوبیاں ان دنوں خوب واضح تھیں۔ وہ پشاور کی پٹھانوں کی طرح بہت خوبصورت تھے اور اپنے متعلق اتنے ہی گونگے تھے جس قدر اشفاق احمد..... ان کے ساتھ ملاقاتیں رہنے لگیں کیونکہ وہ ”داستان گو“ میں لکھنے کے متمنی تھے اور ہماری اتھارٹی کو مانتے تھے۔ ان کے متعلق ہمیں کئی چیزیں یاد تھیں۔ پہلے مشرقی پنجاب میں ضلع ہوشیار پور میں رہتے تھے جہاں سے کوہ شوالک کی طرف ہجرت ہوئی تھی۔ انھیں کبھی دھند میں کبھی نیلے آسمان میں نکھری نکھری صاف نظر آتی تھیں۔ منیر نیازی تب بھی کہا کرتے تھے کہ انہیں ان

پہاڑوں میں جذب رہنے کی وجہ سے شاعری ورثے میں ملی۔

خاں صاحب ”یو ایس آئی ایس“ کے دفتر بھی باقاعدگی سے جاتے تھے۔ مجھے ”داستان گو“ رسالے کی عین ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ایک روز منیر بھائی کے ساتھ ایک شرمیلا نوجوان بھی آ گیا۔ کھوج لگانے پر پتہ چلا کہ وہ پٹھان زادہ ہے۔ شاعر بھی ہے اور قبول صورت بھی..... تب فراز احمد Legend تھا نہ اس کی حیثیت دیو مالائی تھی۔ بہت زیادہ نہ تھی بلکہ یوں سمجھئے چپ غالب تھی۔

ملاقات کراتے ہوئے منیر بھائی بولے۔

”یہ احمد فراز ہے۔ بڑا اچھا شاعر ہے۔ اس کی کچھ نظمیں اگر ”داستان گو“ میں چھپ جائیں تو تمہاری مہربانی میں کچھ بچکپائی تو منیر بھائی بولے..... ”قد سید یعقین کرو اپنے وقت پر یہ بہت بڑا شاعر ہوگا۔ پھر تم افسوس“

گی۔“

میرے لیے یہ اعزاز بہت ہے کہ ان دونوں کو اول اول چھاپنے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ یہاں سے تین غیرت مند پٹھانوں کی گپت کہانی شروع ہوتی ہے۔ منیر نیازی جس نے اپنی شاعری سے باذوق قارئین کی دنیا میں طوفان برپا کر دیا۔ احمد فراز جو منیر نیازی سے ہرگز کسی صورت بھی کمتر نہ تھے۔

اور اشفاق احمد جن کا تخلیقی سفر مختلف چکر کاٹتا ہوا خلق سے وابستگی پر منتج ہوا اور بڑی شہرت کو پہنچا۔ میں زیادہ کچھ تحریر نہیں کر سکتی۔ منیر نیازی 2007ء اور احمد فراز 2008ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

## مسعود کھدر پوش

قدرت اللہ شہاب زیادہ مجلسی آدمی نہ تھے۔ مفتی جی اور خاں صاحب کے علاوہ جب کبھی لاہور آتے تو مسعود کھدر پوش سے ضرور ملتے۔ شملہ پہاڑی کے قریب جب کبھی دہ آفسرز میس میں ٹھہرتے تو مسعود کھدر پوش کو حشر مہلت لیتے۔ آپ جانتے ہیں وہ اشرافیئے و اپنا ڈرائیور بناتے اور یہ بات ہم سب کے لیے سعادت کا باعث ہوتی۔ لاہور کے ایک بڑا گھن درخت تھا۔ اس کے نیچے شہاب صاحب اور اشرافیئے پھلیاں اور مالٹے کھاتے تھے۔ پھر مسعود کھدر پوش بھی بلا لیتے اور یہیں ملتے۔

کبھی کبھی وہ داستان سرائے میں بھی مسعود کھدر پوش کے ساتھ بیٹھے نظر آتے۔ ان ملاقاتوں میں خاں صاحب کم کم نظر آتے کیونکہ یہ اردو بورڈ کا وقت تھا۔ عین ممکن ہے مسعود کھدر پوش اردو بورڈ میں جا کر خاں صاحب کو دیکھیں آپس میں نظریاتی اختلافات پر گفتگو ہوتی۔

مسعود کھدر پوش اس بات کے حامی تھے کہ ہمیں ابھی برآمد درآمد کے کیمبیروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ پاکستان نیا ملک ہے۔ اس کی اقدار کی جڑیں مضبوط نہیں۔ جب بیرونی تجارتی وفد پاکستان آئیں گے تو صرف یہ

تجسس ہوگا۔ رسم و رواج، زبان، کلچر کی قسم کی نئی چیزیں چکا چوند پیدا کرنے کے لیے ہمراہ ہوں گی۔

وہ اس خیال کے داعی تھے کہ ابھی جو کچھ مقامی طور پر بن رہا ہے، اسے ہی استعمال میں لائیں۔ اگر ہم کھدر بنا رہے ہیں تو کھدر ہی سب کا پہناوا ہونا چاہیے۔ اس سے کچھ فائدے ضرور ہوں گے۔ ایک تو سوسائٹی فیشن اور بناوٹ سے متعلق ہے۔ دوسرے طبقاتی فرق مٹانے میں یہ پالیسی معاون ثابت ہوگی اور تیسرے سب سے بڑا فائدہ وقت کی بچت کا ہے۔ اب اس وقت کو بچا کر ملکی تعمیر کے مثبت کاموں میں صرف کریں گے۔

اب ان کے خواب اور تحریک کس حد تک سوسائٹی پر اثر انداز ہوئی، اس کا اندازہ آپ لوگ مجھ سے بہتر کر سکتے

## خواجہ جی

وائس آف امریکہ پروگرام کی وساطت سے دو ایسے ”بیرامن طوطے“ خاں صاحب کو مل گئے جنہوں نے بہت سارے آپ کو خاں صاحب کی زندگی میں گوندھ لیا۔

سلیم خواجہ برکے کے پروگرام کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے خاں صاحب کی فلم ”دھوپ سائے“ ریکارڈ کی۔ اس کی توجہ سے ہر سین کے ریکارڈ کرنے سے پہلے ڈائیاگ (Monitor) کرتے۔ لیول جاتے۔ انیس کو طبعاً سمجھنا کالپکا ہے۔ وہ خواجہ جی کے پاس گھسارہتا۔ یہاں سے ہی اس نے ریکارڈنگ کا اولین سلیقہ سیکھا۔

چلتے چلتے ہوتے ہوتے کئی مشکلات اپنے آپ پر سہہ کر خواجہ جی گہرے ڈپریشن کا شکار ہو گئے۔ ناز و نعم میں بے خواجہ جی، مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنی اس شناخت کو عام زندگی میں استعمال نہ کیا۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد خواجہ جی نے زندگی کے الٹ پھیر کے ہاتھوں اپنا موروثی گھر بیچ کر عسکری کالج میں ایک فلیٹ خرید لیا۔ وہ مجھے ملنے آئے تو ان کی ڈاکٹر بیوی ناہید ساتھ تھیں۔

”یہ بہت اداس اور پریشان رہتے ہیں بھابھی! خاں صاحب بھی نہیں جن کے پاس آ کر کچھ دل ہلکا کریں۔ کسی بات کسی سے کرتے نہیں۔ آپ ہی انہیں سمجھائیں۔“

میرے پاس وقت ہوتا تو میں سمجھاتی۔ ویسے بھی میں نے رکنا، ٹھہرنا اور سوچنا تو سیکھا ہی نہیں۔ پتہ مجھے اس وقت لگا جب خواجہ جی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میری سردمہری کے پیش نظر نہ انہوں نے مجھے جنازے کی اطلاع دی نہ پیکسوں یا سوگم پر بلایا۔ میں نے کبھی احسان کا بدلہ احسان سے نہیں چکایا۔ جب مشکل پڑی مدد کی، ضرورت ہوئی تو فوراً سہارا بجا کر بلالیا۔ وقت نکل گیا مصیبت ٹل گئی پھر نہ وقت تھا نہ فرصت۔

لیکن خواجہ جی شریف روح ہیں۔ مجھے یقین ہے انہوں نے میری غفلتوں کو معاف کر دیا ہوگا۔ مجھے لگتا ہے، وہ اب مجھ پکڑ کر اب بھی کہہ رہے ہیں۔ ”آپ میری بیوی کے انتقال پر بھی رسماً جانیں سکیں۔ آپ کے کام بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملنا ملنا وسیع ہے۔ لیکن آپ کی نیت اچھی ہے۔“



اپنے طور پر یہ معافی نامہ حاصل کر کے نہ تو اب کبھی مجھے احساسِ جرم ہوا نہ کسی پچھتاوے کی  
 احساس..... میں نے رفتہ رفتہ اپنی کمزوریوں کے ساتھ جینا سیکھ لیا ہے۔ مشفق خواجہ ساری زندگی ہمارے کلمے  
 پڑھنے سے متاثر نہ ہو سکے۔ اب جب وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو ان کے لیے بھی یہی احساسِ دل میں جا  
 ہے کہ وہ بھی خواجہ جی کے بھائی تھے۔ انہیں بھی تو صرف محبت درکار ہوگی جو جو جو ہم دونوں ادا نہ کر سکے۔ یہ قرعہ  
 بھی واجب الادا ہے۔

## احمد علی

بھائی احمد علی اونچے لمبے پنجان آدمی۔ ان سے بھی واکس آف امریکہ کے دوران ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر  
 ملاتے رہے۔ جب ہم داستانِ سرائے میں آگئے تو بھائی احمد علی نے سب سے پہلے سچ کہا بھنا کر ہم سب کو کھلائے  
 پیالے کے پنجان اردو بولتے تھے اور ساری ترکیب بھی اردو میں سکھاتے تھے۔  
 کبابوں کی انگریزی، قیر، مسالہ، کبابوں میں پڑنے والی بالائی، نان اپنے ساتھ لاتے۔ کھانے والوں سے  
 ریاض محمود، خاں صاحب اور جو بھی مہمان حاضر ہوتے سب چسکے لے لے کر کھاتے رہتے۔  
 پورے کبابیے، کبھی بجلی کا پلکھا ٹھیک کرتے، کبھی سلاخیں لٹاتے پلاتے، کبھی ویسے ہی شور مچاتے کبھی  
 صاحب کے جانے کے بعد ان کی کباب پارٹیاں اور گھما گھمی ختم ہو گئی۔ اب وہ مجھے ہٹے ضرور آتے ہیں لیکن اس  
 ملاقات میں تو اترا نہ رہا۔ پھر انہوں نے لاہور کالج کے سامنے APWA کا سامان رکھ کر Sale Point بنا لیا اور پکے  
 ساخت کردہ چیزیں بیچنے لگے۔  
 مشقت بڑھ گئی۔ کام برکت کا بھی باعث ہوتا ہے لیکن جب یہ تعلقات کا وقت بھی ہڑپ کرنے لگے تو اس کے  
 منفی اثرات واضح ہو جاتے ہیں۔ ہر Workaholic کو اس مقام پر ٹھہر کر سوچنا چاہیے کہ انسان کے کردار کی بہت  
 خوبی توازن ہے۔ جو کام بھی توازن سے نکل کر شدت اختیار کرتا ہے، اس سے چاہے وہ نیکی ہی کیوں نہ ہو، نقصان کا  
 زیادہ ہے۔

## ذوالفقار احمد تابش

خاں صاحب کا تعلق تابش سے اردو سائنس بورڈ سے شروع ہوا۔ تابش اردو بورڈ میں حنیف رامے اور محمد  
 چغتائی کے ساتھ ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے۔ گھنگھر یا لے بال، درمیانہ قد، ناک پر نینک اور چہرے پر ملاحت  
 رہتی تھی۔ تابش عجیب طور روحانیت اور عقیدت میں توازن رکھنے کے قائل تھا۔ اسی لیے اس کی کبھی خاں صاحب سے  
 نہ ہوئی۔ اپنے خیالات میں پختہ ہونے کے باوجود کبھی مناظرے کی نوبت نہ آئی۔

جب خاں صاحب ریٹائر ہوئے اور ہم 121- سی میں آگئے تو تابش ان سے ملنے آتے رہتے تھے۔ یہ عقیدت و محبت کے رشتے تھے۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ کبھی تابش کو جاننے کا مجھے بھی موقع ملے گا۔

لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد تابش اچانک پرسنل زندگی سمیت میرے قریب ہو گیا۔ وہ اور مریم کو پاس آجاتے، باتیں کرتے، اپنی زندگی کے بکھیڑے بیان کرتے۔ زندگی میں جو تبدیلی اچانک آگئی تھی اس سے متاثر ہونے کے متعلق اپنی تشویش ظاہر کرتے۔ بچے چھوٹے تھے۔ ریٹائر ہونے پر پیسوں کی قلت تھی۔ کام کہیں ملتا نہ تھا۔ بیٹے بہت مول اور پریشان رہتا تھا۔

اب کچھ عرصہ ہوا تابش میرے پاس کم ہی آتے ہیں۔ مجھ سے نہ ان کو صحبت ملتی ہے نہ اعانت۔ جو چشمہ خشک ہو گیا ہے اس پر ہولے ہولے لوگ پانی بھرنے نہیں آتے۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد میرے ماتھے پر تیوری، زبان میں روئیے میں روکھا پین آ گیا ہے۔ لوگ مجھ سے خوفزدہ ہو کر پچھڑتے جا رہے ہیں۔

یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے۔ جو آدمی کبڑا ہو، وزن اٹھا کر کاٹتا ہو، اس پر وزن کیا لانا؟

### اصغر ندیم سید

ملتان ایک زرخیز خطہ ہے۔ ہر اعتبار سے یہاں روئیدگی کی ریت زیادہ ہے اور اس نے پاکستان کو زرعی طور پر ترقی دینے میں لوگوں کے اعتبار سے بڑا اعتباری بنایا ہے لیکن لاہور شہر میں ایک بڑے شہر کا ٹکڑا اپنے سوائے کسی کو ماننے پر مشکل ہے۔ یہ نامند ہوتا ہے۔

ایک شخص جو ملتان سے آتا تھا اور خاموشی سے خاں صاحب کے درشن کر کے چلا جاتا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ یہی دکھا۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا۔

”خاں صاحب! یہ اونچا لمبا، مسکراتے چہرے والا کون ہے جو اتنے حلم اور انکساری سے ملنے آتا ہے؟“

”ہے ایک۔“

”پھر بھی؟“

”ہے ایک اصغر ندیم سید۔“

ہولے ہولے مجھے پتہ چلا کہ اصغر ندیم سید نے ملتان میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن کے لیے کچھ ڈرامے لکھے رکھے تھے۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح ٹیلی ویژن سٹیشن کا دروازہ اس پر کھل جائے اور وہ میڈیا میں اپنا مقام خود بنائے۔ خاں صاحب کے اپنے ساتھ لے گئے۔

اور یوں ٹیلی ویژن سٹیشن کو ایک بہت بڑا ڈرامہ نگار مل گیا جو راستہ دکھانے والوں سے بھی ہنرمندی میں آگے

## اجمل نیازی

اجمل نیازی ایک معروف شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ قومی لباس سب سے تمیز اور جیکٹ پہنتے ہیں۔ ان کے سر پر ایک خاص قسم کا پٹکہ یا چادر قبائلی علاقوں کی یاد دلاتی ہے۔ شاید اس طرح کوئی چادر سر پر باندھے تو مستحکم خیز لگے لیکن اجمل کی خوبصورتی سے اس میں بھی ایک طرحداری پیدا ہو جاتی ہے۔

اجمل نیازی میں منیر نیازی کی طرح اپنے نیازی ہونے پر بہت فخر ہے۔ وہ ہر چیز بھول سکتے ہیں۔ یہ فخر بھولتے کہ وہ نیازی ہیں اور ان کی اصل شناخت اس کے منبع کی طرف اشارہ کرتی ہے، جہاں سے دریا پھوٹا تھا۔ شاید انہوں نے اجمل نیازی کو پینٹ تمیز پہنے دیکھا ہو۔ وہ بڑی سے بڑی محفل میں اونچے سے اونچے مقام پر، امریکی، یورپی، انگریز مندوبین کے درمیان بھی اپنی قومی اور قبیلے کی شناخت قائم رکھتے ہیں۔ یہ کوئی کبھی فیس کی چال نہیں چلتا اور شاید انہوں نے اپنی نظر میں اور دوسروں کے ہاتھوں عزت نفس پر حملہ نہیں ہونے دیتا۔

بڑے سال ادھر کی بات ہے کہ ایک روز اجمل ہمارے گھر آئے۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ اس کی گھر والی اس کے ساتھ تھیں۔ ماحول گھریلو تھا جس میں ادب، سیاست اور اقدار کی باتیں سرے سے غائب تھیں۔ غیر رسمی ملاقات کے بعد یہ تینوں رخصت ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد اجمل نیازی اکیلا آیا۔ وہ کچھ پریشان تھا، لیکن شرمیلے پن کے باعث اصلی پریشان نہ طرف نہیں آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے اجمل۔ تم آج خلاف توقع گول مول باتیں کر رہے ہو؟ نہ ٹھیک سے سنتے ہو نہ صحیح جواب دیتے ہو۔“

”اچھا ہے بانو آپ نے پوچھ لیا ورنہ شاید میں بتائے بغیر ہی چلا جاتا۔“

ایسا موقع ہاتھ آئے تو میں دن آپ ہو کر شیر ہو جاتی ہوں۔

”ہاں ہاں بتاؤ بلا تکلف بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“

”میرے ساتھ تقدیس آئی تھی نا۔“

شرمانی لجائی سفیدی گھٹڑی۔

”اچھا اچھا تمہاری بیٹی۔“

”جی جی..... اسے ہارٹ پرابلم ہے۔ مجھے اس کا آپریشن کرانا ہے۔“ اجمل بولا۔

میں حیران رہ گئی۔ میں سمجھتی تھی ہارٹ پرابلم بوڑھوں کی جاگیر ہے اور ایسے پھول سے بچوں کو تو بس زکا کھ سکتے

ملیر یا بخاری ہوا کرتا ہے۔

”گھبراؤ نہیں، ٹھیک ہو جائے گی۔“

اب مزید گھبرا کر اجمل بولے۔ ”وہ جی میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر جو اس کا آپریشن کرتے۔ میں P.I.C. دیکھتا

سین وہ مل نہیں سکے۔ مصروف ڈاکٹر ہیں۔ ان تک رسائی مشکل ہے۔“

”بھائی! خاں صاحب کا بھانجا ہے جو اد۔ میں اسے فوراً کہہ دوں گی۔ تقدیریں چنگی بھلی ہنسی کٹی ہو جائے گی۔ تم مگر روبرو اللہ پر بھروسہ کرو۔“

اپنے آپ کو اوپر اٹھانے اور بڑا سمجھنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ میں نے جو اد سے بات کی۔ معاملہ طے پا گیا۔ تقریباً واقعی ہنسی کٹی ہو کر گھر چلی گئی اور اجمل ہمارے اور قریب آ گیا۔ اس بعد کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اجمل نیازی پہلے تو شاید مجھ سے اس لیے عزت کرتا تھا کہ میں خاں صاحب کی بیوہ تھی لیکن اب مجھے اس کی عقیدت حاصل ہو گئی۔

ایک فون

ایک سفارش

اور اتنا بڑا صلہ

یہ زندگی کچھ کم حیرت انگیز تو نہیں۔



## ایک گھر کے دو راستے

### اجمل نیازی

یہ کم کم ہوا ہے کہ میاں بیوی دونوں کسی میدان میں نامور ہوئے ہوں اور انہوں نے اپنا اپنا مقام بنایا ہو۔ ایک دوسرے کے لیے مثال بن گئے ہوں۔ ایک دوسرے کی مثال بن گئے ہوں بلکہ مثال اور ڈھال بن گئے ہوں۔ مثال بانو تھیں کہ سر پر اور ڈھال اشفاق احمد کے ہاتھ میں۔ یہ تو ہوا کہ خاوند یا بیوی کی وجہ سے دوسرے کو ملازمت مل گئی اور ترقی کے سبب نفع و خفے بن گئے۔ یہ بھی ہوا کہ دو لکھنے والوں نے شادی کر لی مگر آگے چل کر راستے بدل گئے۔ کوئی ایک بہت پیچھے رہ گیا یا آگے نکل گیا۔ بیویوں میں تو اکثر لکھن چھوڑ گئیں۔ کچھ نے اپنے شوہروں کو چھوڑ دیا۔ چند ایک نے بے چاروں کو کہیں کا بھیجا۔ بہت کم ایسے جوڑے تھے جو ایک دوسرے سے جڑے رہے۔ ایک دوسرے کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے بھی ہیں۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ ایک سدا بہار مثالی جوڑا ہے۔ سنا ہے یہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ بھارت میں ایک ٹیڈیل بیوی سے مل کر میں نے کہا تمہارے لیے جتنی کال فکس قدر شاندار ہے۔ ”رب نے کرایا سا ڈا پنتاں تے میل“۔ جتن زمین پر ہوتے ہیں۔ اب تو بہت کم رہ گئے ہیں۔ ہر کہیں واٹر ورکس اسکیمس پہنچ گئی ہیں۔ جب بہت سوچنے والے کی اسکیمس شروع ہوتی ہیں تو محسوس کرنے والوں کی اقلیمیں برباد ہو جاتی ہیں۔ ترقی یافتگی میں وارفتگی اندر رہتی ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا نظریہ فن اسی لہر کے گرد گھومتا ہے۔

مغرب میں از دو اجی زندگی کا جو حشر ہوا، وہ ہم اپنے ہاں برپا کر لینے کے لیے بے چین ہوئے جا رہے ہیں۔ میاں بیوی اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ گھروں میں طبلہ بجاتا ہے یا طبل بجاتا ہے۔ مغربی موسیقی کی کیفیت ہنگامے میں تبدیل بنتی جا رہی ہے۔ اب ان گھروں میں مار پیٹ کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔ مغرب میں شوہر اپنی بیویوں کو اکثر

زد و کوب کرتے ہیں۔ مشرق میں کبھی پہلے یہ وارداتیں عام تھیں۔ جو کام چھوڑ دیتے ہیں وہ شروع کر دیتے ہیں۔ جو کام کے ہاں رک جاتے ہیں ہم انہیں نئے سرے سے اپنالیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی پیروی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ میں آزادی نسواں کی مکمل حمایت کرتا ہوں مگر اس سے پہلے آزادی انسان کا مطالبہ کرتا ہوں۔

یہ سب باتیں مجھے الجھار ہی ہیں اور میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے لیے ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ ان دنوں پر علیحدہ علیحدہ تحریریں بھی لکھی گئی ہیں مگر یہاں یہ احساس میرے لیے بڑی انوکھی مسرت کا باعث ہے کہ دو آدمیوں کے لیے ایک مضمون بھی لکھا جاسکتا ہے۔ عورت اور مرد مل کر جو اکائی بنتی ہے، اسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ مقابلے کے جنون سے ہم سے یہ لطف بھی چھین لیا ہے۔ جب عورت اور مرد اپنے مقام کو جان بیٹے ہیں تو صاحب مقام بن جاتے ہیں۔ قدیم چینی فلسفہ تاؤ مت (تائو ازم) کے حوالے سے ایک دائرہ دو قوسوں سے بنتا ہے۔ ایک فاعلی اور دوسری انفعالی بنتا ہے۔ دونوں کی وحدت اور یکنائی سے دائرہ وجود میں آتا ہے۔ دائرہ چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔ قوسیں دو ہی رہتی ہیں۔ فاعلی قوس میں ایک نقطہ فاعلی قوس کا کہیں ہوتا ہے۔ یہی حالت دوسری طرف ہوتی ہے۔ ایک بڑا دائرہ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے بنایا ہے۔ اشفاق احمد میں بانو قدسیہ، بانو قدسیہ میں اشفاق احمد رہتا ہے۔ ممتاز مفتی نے ”اوکھے لوگ“ میں دوں کا الگ الگ خاکہ لکھا ہے۔ شاید ایک خاکہ دوبارہ لکھ دیا ہے۔ بانو کے خاکے میں اشفاق، اشفاق کے خاکے میں بانو کا ذکر زیادہ ہے۔ بڑی تحریر ہے۔ یہ اوکھے لوگ بڑے سوکھے لوگ ہیں۔ وہ دونوں مختلف ہستیاں ہیں مگر ایک زندگی انہیں نے بسر کی ہے۔ ایک دوسرے کی زندگی بسر کی ہے۔ اس زندگی کا عنوان اشفاق احمد ہے اور خلاصہ بانو قدسیہ ہے۔ اشفاق احمد مزاجاً کامل آدمی ہیں۔ جی رہے ہیں جیسے لیٹے ہوئے دھوپ سینک رہے ہیں۔ انہیں تب خبر ہوتی ہے کہ دھوپ لگ رہی تھی جب بانو سورج اور ان کے درمیان آکھڑی ہوتی ہے۔ بانو کی پٹری بھی ان کے لیے سبک کو مزیدار بنا دیتی ہے۔ یہ ایک جی از دو جی زندگی کا منظر ہے۔ اسے بانو نے منظر نامہ بنا دیا ہے۔

ادب میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا مرتبہ انیس بیس کا ہے۔ بانو کہتی ہیں کہ میں اشفاق احمد ہیں۔ بہت کچھ کرائتیس بنتے ہیں۔ دونوں نے فن و ادب کا کوئی میڈیا چھوڑا نہیں۔ ڈرامہ، افسانہ، ناول، سکرپٹ، سفر نامہ، نظم، نثر، سوانح بہت کام۔ اب وہ الگ سے بھی کوئی کام کرتے ہیں تو لگتا نہیں۔ وہ اپنی یگانگتوں کو ظاہر ہونے سے بچاتے رہتے ہیں۔ وہ دونوں کو پانا مشکل ہے۔ الگ الگ کر کے بھی سمجھنا مشکل ہے۔ وہ دونوں مس انڈر سٹنڈ مخلوق ہیں۔ ان پر نگاہ غلط ہوتی ہے۔ ڈال کر دیکھ لیجیے۔ سارے اندازے غلط ہو جائیں گے۔ ان سے بہتر اور کتر آدمی ہوں گے مگر ان کے جیسا اور کوئی نہیں ہے۔ ان دونوں کے اندر ایک ایک شاعر بھی ہے۔ ابھی انہوں نے نجانے کیا کیا چھپایا ہوا ہے۔ جو کچھ مل کر چھپا رکھا ہے۔ نے، کسی کو نہیں مل سکتا۔

بانو پُر اسرار لگتی ہیں۔ اشفاق صاحب اسرار لگتے ہیں۔ دونوں صوفی ہیں۔ ملاحتی صوفی۔ دونوں کا شہساز ہے۔ رد عمل ایک سا۔ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ رد عمل چھپایا جاسکتا ہے۔ ایک بے نام سانچہ ان کے درمیان قائم ہے۔ دوسرے کو مانتے ہیں، جانتے نہیں۔ جانا ضروری نہیں۔ یہی ایمان بالغیب ہے۔ ظاہر مختلف باطن مشترک۔ ایک بے نام ہے ان کے پاس جس میں سے بیک وقت اپنی پسند کی غذا نکال لیتے ہیں۔

دونوں اپنے وقت کے مصلوب کردار ہیں۔ بانو اشفاق کی صلیب پر لٹک گئی ہے۔ انہیں تو یہ صلیب دکھائی بھی گئی۔ ”راجہ گدھ“ کو چھوڑ کر تقریباً تمام تخلیقات میں بانو کا انداز ”تیرے سامنے بیٹھ کے روناتے دکھتینوں نہیں دسنا“ ہے۔ وہ روتی ہے اور سامنے بھی نہیں بیٹھتی۔ ایسے میں اپنے آپ سے بھی دور کہیں ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی مشکلوں کا جس جتن چلنے دیا اشفاق احمد کو۔ اپنے آپ کو محدود کر کے لامحدود ہونے کی کوشش کی ہے مگر لگتا ہے کہ یہ حدود اس دائرے سے جھک جاتیں جو اشفاق احمد کے گرد بن گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک گھریلو عورت عظیم ادیبہ بن گئی ہے۔ بانو کو بڑی عزت ہے۔ انہوں نے سر کی چادر کو کاغذ بنایا اور چادر یواری میں شش جہات تلاش کر لیا ہے۔ وہ سامنے سے بہت مست ہیں مگر بے اندر بہت ایکٹو ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ظہور اور اخفا میں فرق مٹ جائے۔ اشفاق احمد نے نئے علام کو اپنے اندر گم کر لیا ہے۔ اس گمشدگی کو پینڈہ اور ان پڑھ بابو کی کٹیاؤں میں ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ دانش جب تکمیل اور تازگی کی طرف ترقی ہے تو لوگ دانش میں جمع ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ لاعلمی کی بھی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی؟

میں نے کہا ”معلوم نہیں۔“

وہ اور خوش ہوئے۔

اصل بات معلوم سے نامعلوم، نامعلوم سے معلوم کی طرف سفر کے دوران بنتی ہے۔ ہونی ہو کے رہتی ہے اور یہ ہونی میں موجود ہوتی ہے۔ اشفاق احمد لوگوں کو حیران کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے اس ہنر سے حیران ہیں۔

ایک بات میں اشفاق احمد کو بانو پر برتری حاصل ہے۔ بانو ان کی ہر طرح کی برتری کو دل سے مانتی ہے۔ اشفاق احمد کو اس صورتحال نے خاصا سازگار کیا ہے۔ اشفاق احمد گفتگو کے بادشاہ ہیں۔ موقع کے مطابق ان جیسی بات کے ساتھ کم کسی کو ملا ہوگا۔ اس ضمن میں بھی ان کی ”ملکہ“ کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ بانو ان کے سامنے بولتی نہیں۔ بولتی ہے جیسے تھکے بارے گھر آئے ہوئے کے لیے دروازہ کھولتی ہیں۔ پھر ان کی خدمت کی فراوانیاں سارے ماحول میں پھیل جاتی ہیں۔

اشفاق احمد تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اپنے زمانے میں کھڑے اشفاق احمد جو باتیں کر رہے ہیں، کوئی نہیں کر سکتا یا کرنا چاہتا نہیں۔ وہ ان چیزوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور اس وقت کرتے ہیں جب ان کی حمایت ہر لمحہ ہوتا ہے۔ سائنسی ترقی کے خلاف، ترقی کے خلاف، علم کے خلاف، کتاب کے خلاف، سب سے پہلے یہاں ان کی کیسٹ کے ذریعے مطالعے کی بات چھیڑی۔ اس وقت سب سے زیادہ ان کی مخالفت انتظار حسین نے کی۔ اس طرح کی پہلی کیسٹ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیر اہتمام سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے تیار کی گئی۔ کتاب ”شہر اور اس کا ارد درجہ“ انتظار حسین نے کیا۔

یہ اتفاق ہے۔ ایسے اتفاقات اشفاق احمد کی زندگی میں بہت ہیں۔ ان کی فراست کی فطرت نے کئی بار حمایت کی۔ بانو جی نے ہمیشہ اشفاق احمد سے اتفاق ہی کیا ہے۔ اس لیے گھر سے باہر اشفاق احمد بہت اختلافی گفتگو سن کر بھی

طیش میں نہیں آتے۔ جب راو پلنڈی میں ایک تقریب کے دوران نوجوانوں نے اپنے جملوں کو حملوں کے برابر کر دیا۔ اشفاق احمد نے سٹیج پر آ کر سیدھے سیدھے اعتراف سے بات شروع کی اور وہ ساری باتیں جو نوجوانوں کے اعتراضات سے بھری ہوئی تھیں، خود انہی کے کندھوں پر رکھ دیں اور وہ خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے یہ گٹھڑیاں اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ایسے واقعے اشفاق احمد کی زندگی میں کافی ہیں۔ ریڈیو پاکستان پر جب تلقین شاہ کا پیکر پہن کر آتے کرتے ہیں تو بھی ہمیں برے نہیں لگتے۔ یہی باتیں کوئی اور کرے تو ہم اس سے لڑ پڑیں۔ ہر شخص کے اندر ایک گھمبیر ہوتا ہے۔ ہم اسے چھپاتے رہتے ہیں۔ سامنے آنے پر منافق کے دشمن بن جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد نے ہندے کے اندر سے نکال کر اس ہندے کو سامنے لا کر اکیا ہے۔ ہم زاد بھی ہوتا ہے جو گھمبیر تغیر نہیں ہوتا ہر کسی کا۔ اشفاق احمد نے اپنا ہم زاد تغیر کر لیا ہے۔ ہم تو اپنے ہم زاد کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ بلیک ہوئے رہتے ہیں اس سے۔ اشفاق احمد کی مدد سے ہم بلیک میل ہونے سے تونج سکتے ہیں۔

یہ نہیں کہ اشفاق احمد کو غصہ نہیں آتا۔ اگر کسی آدمی کے برعکس کا جواب محبت بھرے رویے سے دیا جائے تو وہ انگیز حد تک سوتیلی سرشت لبو میں جاگ اٹھتی ہے ورنہ اشفاق احمد بھی خاں ہیں۔ پٹھان کا رویہ گھروں میں بھی حاکی ہے اور بلا شرکت غیرے ہوتا ہے۔ حاکم کو تسلیم کرنے والی بڑی ہستی عورت ہے۔ مقابلہ تو حاکم کو ظالم بناتا ہے۔ مغرب سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ وہاں عورت مرد کے برابر آ کر بھی مظلوم بنی پھرتی ہے۔

یہ بحث میرا موضوع نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عورتوں اور لڑکیوں کو بانوجی سے مننا چاہیے۔ پٹھانوں کے اندر ایک مکمل عورت کی روح سراپت کر جائے۔ وہ اشفاق احمد کو بہت بڑا سمجھتی ہیں۔ اپنا مرشد کہتی ہیں:

”بانو کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک پٹھان مرد کو ایک بہت بڑا انسان بنانے پر اپنا آپ نچھا اور کہہ دیا۔ بڑا انسان تو اشفاق احمد کے اندر تھا۔ دنیا میں بہت لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر ہوتا ہے بڑا آدمی۔ باہر کا رستہ مشکل سے ملتا ہے۔ دروازہ ملتا ہے تو کھتا نہیں۔ عورت دیواروں میں بھی دروازہ کرنا جانتی ہے۔

میرے نانا مظفر خاں بڑے سخت گیر پٹھان تھے۔ انہوں نے بھی ایب اعوان لڑکی سے محبت کی۔ پٹھانوں کو کر کے آئے اور شادی کرنی۔ محبوبہ تو مغویہ ہوتی ہی ہے۔ کسی کو اغوا کیا نہیں جاسکتا۔ یہ ڈاکہ ہوتا ہے۔ عورت کو ہے۔ اسی لمحے میں جب محبت کی کرن اس کا لباس بن جاتی ہے۔ یہ حقوق منکوحہ جو جائے تو اس کی حقیقت بالکل ہے۔ بابا مظفر خاں نے بظاہر کوئی حسن سلوک نہ کیا نانی اماں سے مگر کبھی نانی کے لبوں پر حرف شکایت نہ چکا۔ ان کی محبت اس وقت کھلی جب وہ مر گئیں۔ نانا کی شخصیت کا جلال ایک ملال میں بھیگ گیا۔

ایک دن وہ دیوار کے سائے میں اداس کھڑے تھے۔ میں نے ان سے حال احوال پوچھا تو انہوں نے بتا دیا:

”بیٹا! میں یتیم ہو گیا ہوں۔“

زوجہ، زوجہ محترمہ بلکہ زوجہ والدہ ماجدہ کے رتبے پر جا پہنچی۔ محمد حسن عسکری نے کہیں ایک تمثیلی بیان کی ہے کہ مرد بھول بھلیوں میں رازوں کے سراغ میں داخل ہوتے ہیں۔ عورت ہاتھ میں اون کا ایک گولالے کر ایک سرا سے پکڑا دیتی ہے۔ کہیں سے کہاں تک گھومنے بھٹکنے کے بعد نہیں۔

ہوتا۔ اسے پیچھے کارستہ نہیں بھولتا۔ اُون کے دھاگے کی رہبری میں واپس آ جاتا ہے۔ اپنی عورت کے پاس جو اُون کا گولہ لیے اس کی منتظر ہوتی ہے۔ کارہائے نمایاں مرد کے ہیں۔ عورت بظاہر بے عملی کی تصویر ہے۔ عورت کا یہ عمل بے کار نہ ہوتا ہوئی واپسی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اسے بھٹکنے نہ دینے کا رستہ ہے وہ۔

اشفاق احمد کی بھیدوں کی خاطر زندگی کی میزھی میزھی راہوں پر تھک ہار کر اپنا سفر کھو بیٹھتا مگر بانوان کے لیے مودعت کی نشانی ہر وقت فراہم رکھتی ہے۔ وہ کہیں چلے جائیں انہیں خبر ہوتی ہے کہ آغاز میں بانو ہوگی۔ اس امید نے جس انجام سے بچائے رکھا ہے۔

ایسی کئی تمثیلیں دھرتی کے دل میں دھڑک رہی ہیں۔ عورت اور دھرتی ایک حقیقت کے دو روپ ہیں۔ دھرتی اپنے سینے پر چلنے والوں کو صرف قتل کا تھنہ ہی نہیں دیتی، طاقت کا توازن بھی دیتی ہے۔

دھرتی کا سینہ تخلیق کا منبع ہے۔ دھرتی کسی سے روٹھتی نہیں۔ کسی کو روٹھنے دیتی بھی نہیں۔ ہم اسی کی کوکھ سے نکلے ہیں اور پھر اسی کی کوکھ میں کہیں اور نکل جاتے ہیں۔ وہ اپنوں کو سفر پر جانے دیتی ہے اور مراجعت کی طلب ان کے دل میں نمودار رکھتی ہے۔

جوگی اتر پہاڑوں آیا، نی چرنے دی گھوک سُن کے  
مجھے لگتا ہے کہ چاند پر بھی بانو جی ہی بیٹھی چرخہ کاتی ہیں اور اشفاق احمد سورج کو تسخیر کرنے نکلے ہوئے ہیں۔  
سبح کو تسخیر کرنے کا مطلب اسے چاند بنانا ہو۔ بانو منتظر رہتی ہیں۔ دھاگے کا گولہ ہاتھ میں ہے اور چرنے کی گھوکر  
چرنے کی گھوکر آج بھی ان کے دل میں گونجتی ہے۔

## قاضی جاوید

قاضی جاوید نے مجھے اصل میں اکادمی ادبیات اور افتخار عارف سے متعارف کرایا۔ وہ اکادمی ادبیات کی لاہور شاخ کا ڈائریکٹر ہے۔ ادیبوں سے اس رسالے کے لیے ان کی نگارشات مانگتا، ان کے بائیو ڈیٹا، ایڈریس اور فون نمبر جمع کرتا اور وقت بے وقت خیر سگالی کی ملاقاتیں اس کے ذمے ہیں۔ ٹیلی فون پر تو اس سے رابطہ تھا ہی لیکن اچانک اس سے ہمت بھی باق عدگی سے ہونے لگی۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جب اشیر بیٹے نے میرا چارج سنبھال لیا تو اس کی ڈیوٹی بڑھ گئی۔ اس نے میں سے کچھ اظہار نہ کیا اور چپ چاپ اپنا بستر میرے پلنگ کے ساتھ جوڑ کر رات کو میری نگرانی کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے حسمہ دیا کہ میری بیماریوں کے پیش نظر میرے لیے سیر بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے شام کو سیر کرانا ممکن نہ تھا کیونکہ وہ سیر سے شام گئے، گھر آیا کرتا تھا۔

اس لیے ہم دونوں صبح سات بجے جو گر پہن کر چاک و چوبند نواز شریف پارک جاتے۔ یہ جو گر میرے لیے اشیر کے پہلی مرتبہ مجھے خود پہنائے کیونکہ مجھے تم سے باندھنا نہیں آتا تھا۔ پہلی مرتبہ جو گر پہن کر سیر کا تجربہ بالکل نیا تھا اور ایک



طرح سے یہ معیار زندگی بہتر کرنے کی تمہید بھی تھی۔

پارک کے اندر جانے کے صرف دس روپے فی کس لگتے تھے۔ اندر سیر کرنے کے دو راستے تھے۔ ایک تو پارک کے اندر کا راستہ تھا جس پر عام سیر کرنے والے خراماں خراماں جاتے اور دوسرا جو گنگ کرنے والوں کے لیے پارک کے آخر میں گولائی میں چلتا۔ پورے ڈھائی کلومیٹر کی مسافت تھی۔ شروع میں تو اشر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے عام اندر والے راستے پر گھبر کر سیر کراتے رہے۔ پھر جب میں رواں ہو گئی تو انہوں نے جو گنگ شروع کر دی۔ ۱۰۰ جو گنگ ٹریک پر فٹل جاتے تھے۔ اندر والے راستے پر رواں ہو جاتی۔

آخر میں باہر والے احاطے میں ایک بیچ پر جو بھی پہلے پہنچتا، بیٹھ کر دوسرے کا انتظار کرتا۔ اسی سیر کے دوران مجھے ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر، نئے کھینے والے ادیب اور ایکٹر بھی ملا کرتے۔ یہ سب میری ملاقات قاضی جاوید اور مستنصر حسین تارڑ سے ہوئی۔ ایک درمیانے قد اور درمیانے جسم کا شخص دور کرسیوں پر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ بھاگ کر سیروانی سڑک پر آ گیا۔ ہم نے خوشدلی سے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ پھر وہ دور کرسیوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے اشر سے پوچھا۔

”بھائی یہ کون تھا؟“

”پتہ نہیں امی کوئی ابوکا جانتے والا ہی ہوگا۔“

کچھ ملاقاتوں میں باتوں ہی باتوں میں پتہ چلا کہ محترم قاضی جاوید ہیں۔ اس کے بعد یہ رابطہ مستقل ہو گیا۔ ایک روز ہم سیر کر کے باہر لوٹ رہے تھے تو ہم نے دیکھا جاوید پیدل جا رہے ہیں۔ اشر بھاگ کر پاس پہنچا۔

”آپ کس طرح جائیں گے؟“

”بس نے لوں گا۔“

”نیکن آپ ہمارے ساتھ چلیے نا۔ ابو کی گاڑی ہے۔“

پھر ہم انہیں گھر پہنچانے گئے۔ جب ہم انہیں گھر اتار کر واپس آئے تو اشر بولے۔

”امی! یہ بہت دیا نندار شخص ہے۔ اس دور میں جب فنائس پر گاڑیاں مل رہی ہیں، سیکنڈ ہینڈ کاروں سے شہر

پڑا ہے۔ یہ اپنی سفید پوشی بھائے چلے جا رہے ہیں۔“

پھر سیر چھوٹ گئی۔ مجھ میں سیر کی ہمت نہ رہی۔

لیکن قاضی جاوید سے رابطہ قائم رہا۔ اس سے ادیبوں کے فون نمبر ایڈریس تو ملتے ہی تھے لیکن انہیں

جاننے میں بھی وہ بہت معاون ثابت ہوئے۔

محمد طفیل + جاوید طفیل

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ”نقوش“ رسالہ نہ تو اترے سے چھپتا تھا نہ اسے پڑھنے والا ایسی لگن سے پڑھتا

تک ایک سنجیدہ قاری کو بڑی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ دو غزل اور غزل کی معرفت نظم تک پہنچنے کا عہد تھا لیکن تب بھی طفیل صاحب ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ شیشوں والی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر خاں صاحب سے باتیں کرتے اور چلے جاتے۔ وہ گزراؤں اور خاں صاحب کو کساتے کہ ”داستان گو“ ایک بار پھر شروع کیجیے۔ اب نئے رسالوں کی مانگ ہے۔

خاں صاحب کہتے ”تمہیں داستان گو پسند ہے؟“

”جی، بہت۔“

”اس میں کیا بات اچھی لگتی ہے طفیل؟“

سوچ میں پڑ کر طفیل کہتے ”اس کا انوکھا پن، اس میں کئی ایسے مضمون ہوتے ہیں جو کسی اور رسالے میں نہیں ملتے۔ مثلاً جانوروں کے متعلق۔“

”اچھا طفیل ایک کام کرو۔ تم اس رسالے کو چھاپ لو۔ میری پوری اجازت ہے۔ کہو گے تو تحریری اجازت نامہ لکھ دوں گا۔“

”ناں خاں جی ناں۔ میں ”نقوش“ کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ”داستان گو“ کیسے چلاؤں گا... یہ کام تو آپ ہی کو چاہیے۔“

خاں صاحب چلے گئے۔ طفیل رخصت ہو گئے لیکن جاوید طفیل نے اب بھی والد کی روایت جاری رکھی۔ وہ مجھے بتاتے ہیں۔ عمو مان کے ساتھ ”نقوش“ کا تحفہ ہوتا ہے۔ پھر میری خیر خیریت پوچھتے ہیں۔ کہانی کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ حقیقت سے رخصت چاہتے ہیں۔

ایسے ہی چاہنے والے قلم میں روشنائی بھر کر قلم و کاغذ نکالنے پر اکسایا کرتے ہیں۔

محمد طفیل کا انتقال 5 جولائی 1986ء کو ہوا۔

## پنپسی سدھوا

پنپسی سدھوا میرے لیے شروع میں ایک نام تھا۔ ایک چھوٹا سا بادل جو افق پر کہیں معلق تھا۔ پھر بولے بولے بادل میں منتقل ہوا۔ دیکھتے دیکھتے یہ گھٹا ٹوپ بادل بن گیا جو ابھی برساکہ برسا اور پھر اس نے سارے لاہور کو بھی تان لیا۔ سورج کو بھی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ پنپسی سدھوا بھی آئیوری مرچنٹ کی طرح اپنے کام سے پہچانی جاتی تھی کہ Beloved City کے سرورق پر کتاب کا نام چھوٹا رہ گیا اور پنپسی سدھوا کا نام کتاب کی ضمانت بن گیا۔

لیکن شروع میں پنپسی صرف ایک غیر معروف نام تھا جو کبھی کبھی خاں صاحب استعمال کیا کرتے۔ ایک دن وہ مجھے بتائے کہ The Crow Eaters لے کر آئے اور کہنے لگے، یہ کتاب پڑھو۔ پارسی کیونٹی پر اس سے بہتر کوئی ادب نہیں ہے۔ کتاب غلام علی اینڈ سنز کی چھپی ہوئی تھی، کاغذ معمولی تھا اور ابھی اس کا سرورق بھی غالباً نہ چھپا تھا۔ میں نے بڑی بدمعاشی سے شروع کی لیکن جلد ہی میں نے اسے پوری توجہ، انہماک اور جی جان سے پڑھنا شروع

کر دیا۔ اسی طرح جب "آتش رفته" "داستان گو" میں چھپنے کے لیے آئی تھی، یہ کتاب مجھے حیران کر گئی تھی۔

یہ تب کا واقعہ ہے جب خاں صاحب اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر تھے۔ ہم من آباد سے نقل مکانی کر کے ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان دنوں اردو بورڈ کا دفتر گلبرگ میں مین مارکیٹ سے ملحق اور مین سڑک سے متصل تھا۔ اس کی مالکہ بانی جی مسز بھنڈارا تھیں۔ خاں صاحب جلد ہی بانی جی کے چہیتے بن گئے اور ان ہی کی وساطت سے ہم پتھی سدھوا کے نام سے متعارف ہوئے۔ پھر وہ چار ملاقاتوں کے بعد خاں صاحب نے پتھی کو اس بات پر اکسایا کہ وہ لکھ کر دیا کہ کتاب کو مغرب میں کسی معروف ادارے سے چھپنا چاہیے جو اسے مغربی دنیا سے متعارف کرائے۔ جب خاں صاحب پتھی کو اکساتے تو بانی جی عموماً اذیت کے لہجے میں کہتیں "اوہ اشفاق بابا تو کا بے کواس کو غلط راستے پر ڈالتا ہے۔ چار کہانیاں میرے تیرے سے کن کر کھئی ہیں تو اس کو اتنا Importance نہ دے۔"

لیکن خاں صاحب اشتعال دلاتے رہے، ان کا خیال تھا کہ یہ کتاب ضرور تہلکہ ساز ہوگی۔ City جس پر پی زیادے کے نام منسوب ہے، اس کی سالگرہ تھی۔ ان دنوں بانی جی مسز بھنڈارا حسین روڈ والی کوچی میں تھیں۔ ہم دونوں پتھی کی بیٹی پر پی زیادے کی سالگرہ والے دن بروقت پہنچے۔ قیام پاکستان سے پہلے کی پرانی تعمیر شدہ کوچی میں سالگرہ کا سا دوسرا اجتہا تھا۔ مہمان کشی اور کوئی نظم طرازی، کسی قسم کا Show off معیار زندگی کا رعب نہ تھا، جاہ و جلال نہ تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ یہ لوگ اس قدر امیر ہیں کہ قیام پاکستان بننے کے بعد جب پہلی بار بجٹ میں خسارہ ہوا تو انہیں بھنڈارا نے وزیر خزانہ کو قرض دیا اور ایک طرح سے آئی ایم ایف کا کردار ادا کیا۔

چائے جاری تھی جب باہر کسی آنس کریم والے نے اونچی آواز میں آواز دہرایا۔ پر پی زیادے بانی جی کے پاس آئے اور بولی "مجھے دس روپے دے دو۔"

پتھی نے اشارے سے منع کیا لیکن پر پی زیادے نہیں۔ پھر دس روپے مانگے۔

بانی جی نے پیار سے پوچھا "دس روپے کا بے کواس چاہیے؟"

"آنس کریم کھانی ہے۔"

خاں صاحب بانی جی کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوراً دس روپے کا نوٹ پر پی زیادے کو دینا چاہا لیکن بانی جی روک دیا۔ پھر بانی جی نے کمال پیار سے پر پی زیادے سے کہا۔ "تم کوکل آنس کریم ملے گا۔ جب ہمارا پر پی زیادے سکول سے آئے گا تو آنس کریم فرنیچ میں ہوگا۔" یہ اس گھرانے کی تربیت تھی جو فضول خرچی نہیں سکھاتے تھے۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ کیوں پتھی کی شخصیت، اس کی گفتگو، اس کے انداز تحریر میں نہ مبالغہ، نہ نمائش پہلے۔

زبان تھی، نہ زیبائشی انداز..... بہت برسوں بعد 'Side' Ice Candyman Cometh, Crow Eaters تینوں کتابیں باہر چھپ چکی تھیں۔ پتھی امریکہ میں Creative Writing بطور مضمون کے پڑھا رہی تھی۔ ایک بار جب پتھی لاہور آئی اور خاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو اسے دکھ تھا کہ فارن میڈیا ابھی بھی پاکستان کو نہیں دیتا جو اسے دینا چاہیے۔ خاں صاحب اور پتھی دونوں اپنے محبوب موضوع پر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پاکستان نہیں دیتا تھا۔ دونوں جی جان سے اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اب "محبوب شہر" (Beloved City)

کمر کے پتھی نے پاکستان سے اپنی محبت کا ایک تین ثبوت پیش کر دیا ہے۔

لاہور داتا کی نگری ہے۔ یہ ایک خوبصورت نہر سے آراستہ ہے۔ مغلیہ عمارتوں سے سجا ہوا، تعلیمی اداروں کی بستی ہے۔ میلے ٹھیلوں کی آوازوں سے گونجتا رہتا ہے۔ باغوں اور بہاروں والا ہے۔ کلچرل سٹی ہے۔ ادیبوں، شاعروں، مصیبتکاروں، فنکاروں کی بستی ہے۔ کھانے پینے کے رسیالوگوں نے اس کی فوڈ سٹریٹس جاندار کر رکھی ہیں۔ پتنگ بازوں نے اس کے آسمان رنگین کر رکھے ہیں۔

یہی لاہور یونیس ادیب کی قلم سے ہو کر رہا ہے۔ ”تحقیقاتِ پستی“ کا حصہ بن گیا ہے، لیکن یہ بات مجھے اچنبھے میں ڈالتی ہے کہ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی پتھی اسے بھولی نہیں جبکہ اس کے کئی شہریوں کو اس کی شناخت بھی یاد نہیں۔ یہی اس کا محبوب شہر بھی ہے اور اس کی کتاب دیکھ کر لگتا ہے جیسے کہہ رہی ہو جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ وطن کی یادیں زندہ رکھنے والی پتھی سدھوا سلامت رہو، خوش رہو۔ لاہور کے عاشقوں کی طرف سے شہریہ..... سلام اور دعائیں۔

### میں تو بھنڈارا

بائی جی نے ہمیں دو بڑے خوبصورت تعلق عطا کیے، پتھی سدھوا اور میں تو بھنڈارا۔ میں تو، خاں صاحب کو کبھی کبھی بھنڈارے آتے تھے لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔

جب میرے بیٹے اشیر احمد خاں نے ”بونا سیر ایڈورٹائزنگ کمپنی“ بند کر دی تو بیکاری، گھٹو پن کا بھوت سر پر حملہ لگا۔ اللہ بے عزتی اور ذلت سے کسی کو آشنا نہ کرے۔ قرض، بیکاری، گھریلو ناچاقی عموماً ایسی ذلت کا ضامن بن جاتی ہیں۔ انسان کی عزت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ دوسرے مشوروں کی آرز میں احسان جتاتے ہوئے اور آپ کے نقائصِ محبت سے بیان کرتے کرتے ذلت کا گھونسا مار جاتے ہیں۔ اشیر پر بھی کچھ ایسا ہی وقت تھا۔

بچھنے عہد حکومت میں چند اس وقت منسرتھے۔ میں ان سے پہلے چند اور صاحب ثروت و حیثیت لوگوں کو نوکری کے لیے کہہ چکی تھی لیکن بے سود۔ پھر میں نے میں تو بھنڈارا سے کہا تو انہوں نے بڑی جلدی اشیر کو Islamic Bank میں نوکری دلوا دی۔

جب بائی جی حیات تھیں، تب کی بات ہے جو نبی انہیں پتہ چلتا کہ کوئی پاری گھرانہ مالی مشکلات میں مبتلا ہے وہ ایک سیل تیار کرتیں۔ سب گھروں میں اطلاع دی جاتی کہ وہ اپنے پرانے کپڑے، جوتے جو سامان استعمال میں نہیں، بائی جی کے گھر عنایت کر دیں۔ اب اس بیکار سامان کو ڈبوں میں پیک کیا جاتا۔ بائی جی بڑے خوبصورت ڈبے اپنے ہاتھ سے پیر کرتیں۔ ان پر گفٹ پیپر چڑھاتیں۔ پھر ان میں سامان کو قریب سے لگاتیں۔ سیل ہوتی۔ سامان ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ یہ جو رقم جمع ہوتی وہ اسی ضرورت مند خاندان کو رات کے اندھیرے میں پہنچادی جاتی۔

میں تو بھنڈارا سے مل کر بھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ خوبی ان میں اور بائی جی میں ساںجھی تھی۔ عموماً ہر اقلیت

کے پاس بھی اخلاق کی برتری اسے اکثریت کے مقابلے میں سر بلند کرتی ہے۔ کسی اور خوبی اور وصف سے اکثریت کو ہنس مانتی۔ اللہ مینو بھنڈارا کو سلامت رکھے اور رفاہی کاموں کی اور توفیق دے۔ آمین

## افضل توصیف

”کڑوا سچ“ کالم لکھنے والی افضل توصیف ایک ایسی ڈرپوک روت ہے جو سچ بول کر بوت کر کی طرح آنکھیں بند کر لیتی ہے اور دل میں سوچتی رہتی ہے کہ کہیں اس سچ کی مجھے اور میرے گھر والوں کو بھاری قیمت ادا نہ کرنا پڑے۔ ”سچ تو ادب“ کے حوالے سے اس نے بڑا نام کمایا ہے۔ اسے ملکی اندوہناک حالات، سیاست کی اونچ نیچ، معاشرتی خرابیوں کا ٹھیکھا سم ہے۔ وہ ان سب کے لیے کچھ عمل بھی کرنا چاہتی ہے اور جب عمل کے میدان میں اترنے کے لیے اپنے وسائل تم پاتی ہے تو قوم اٹھا کر کم و ز کم احتجاج اور جہاد شروع کر دیتی ہے۔

ایک لمبا عرصہ وہ میرے پاس آتی رہی۔ اس کے اپنے گھریلو حالات بھی ناسازگار تھے۔ اس لیے وہ صاحب کے چلے جانے کے بعد میری مجبور یوں کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔ کھنکھانے سے ہم دونوں وابستہ تھیں۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہم دونوں نے کبھی حسد کی پلٹ محسوس نہیں کی اور سچ اور کھلے دل سے ایک دوسرے کے فن کی دانست۔ افضل توصیف زیادہ ترقی کی خواہاں بھی نہیں۔ جب سرکاری دوروں پر اویسب بھی نمک برابر ساتھ جاتے تھے۔ افضل نے کبھی کسی سے سفارش کی نہ اس خواہش ہی کا اظہار کیا کہ وہ بھی اور کچھ نہیں تو دوسرے ممالک کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ اس دور میں ایسے ملکی حالات میں اتنا سیدھا راستہ پکڑنا اور استقامت سے اس پر چلتے رہنا بڑی ہمت کا کام ہے۔

آفرین افضل توصیف آفرین

## مستنصر حسین تارڑ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب ہم سے رخصت ہو چکے تھے۔ انیس اپنا گھر راینونڈ میں بنا کر آئے تھے۔ اتنی امریکہ میں تھا۔ اشیر اظہار کے معاملے میں باپ کی مانند ہے۔ زبانی کلامی تشفی نہیں دے سکتا لیکن پھر محسوس کیا کہ مجھے گھر سے نکلنے کی ضرورت ہے۔

وہ بینک جانے سے پہلے مجھے نواز شریف پارک میں لے جاتا۔ کار کا کرایہ ادا کر کے انٹری فیس دے دیتا۔ دونوں باغ کے وسط میں ہوتے ہوئے دائرے کی شکل میں چلتے رہتے۔ اسی سیر کے دوران ایک دن میں نے شخص بھاگ بھاگ ہماری طرف آیا۔

”میں مستنصر حسین تارڑ ہوں آپا۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

”جی میں جانتی ہوں۔“

وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

قریباً سال بھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب میرے بچھے، پروڈیوسرز، تفریحی ملنے والوں کی تعداد بڑھ گئی تو اشیر کے لیے بے ساتھ چلنا مشکل ہو گیا۔ اب وہ باہر کے جوگنگ ٹریک پر اکیلا نکل جاتا اور مجھے اپنا پینڈا اکیلا کرنے دیتا۔ ہم میں سے جو بھی پہلے آ جاتا، وہ باہر والی بیخ پر آ کر انتظار کرتا۔

مستنصران یادوں میں سرفہرست ہے۔ میں اس سے پہلے اس کے سفر نامے اور ”بہاؤ“ جیسے خوبصورت ناول سے آشنا تھی۔ یہ ناول مجھے حیران کر گیا۔ ایک نئی زبان، کچھ اور بہتی ہوئی آبادی کی خوبناک داستان کسی اور ادیب کے لکھے نہ بات نہیں۔ پاکستان میں کسی ایسے ناول سے شناسا نہیں تھی جو تخیل کے زور پر اس پرانی تہذیب میں روح پھونکے۔ وہ زبان بھی اختراع کرے جو غالباً اس عہد میں بولی جاتی تھی۔

مستنصر خیال کے پیچھے بھاگنے والا ادیب ہے۔ وہ خیال کے گولے کے پیچھے بھاگتا بھاگتا ایسے راستوں پر، جہاں سے ہو کر رہتا ہے جن کے متعلق ہم اپنے تصور میں کبھی رنگ نہیں بھر سکتے۔ سفر نامے اس کی بے چین روح کی پیداوار تھے۔ ان میں وہ شیخیاں نہیں داتا، گدگدی نہیں کرتا، کسی حسینہ کا سبار نہیں لیتا۔ اسے ”ماچوین“ بننے کا کوئی شوق نہیں۔ پھر بھی پڑھنے والا اس کی کتاب چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اس کا سفر سحر سے کم نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مستنصر خیال سے حقیقت کی طرف توجہ داتا ہے۔ اس کی ترغیب خواب سے شروع ہوتی ہے اور پھر پہاڑوں میں ریگستانوں میں پہنچا دیتا ہے جو مکمل حقیقت ہے۔ راستے، راستے میں ملنے والے مناظر ہر چیز چھوٹی، دکھنی اور احساسات کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔

مستنصر کا نام ہی بلا نام مشکل نہیں، اس کے سفر نامے اور سٹائل، اس کے نام کی طرح ناقابل تقلید ہیں۔ سیر بالکل بند ہو گئی۔

لیکن یہاں کی بلا قاتیں گھر میں منتقل ہو گئیں۔ مستنصر اپنی بیگم کے ساتھ کبھی کبھی اور عموماً اکیلے ہی مجھے ملنے آتے رہے اور یوں اس گلدستے میں اضافہ ہوا جو داستان سرائے کے کمرہ نمبر ۱۰۱۰ میں سجا رہا ہے۔

باقی آپ نیلی ویرن پران سے کافی واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ایک انوکھا پروگرام کرتے ہیں جو شادی کے بعد تین قسم کا ہے، جس میں شادی کے آرزو مند مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیوں کو باہمی رابطے کی صورت دکھاتے ہیں۔ اس ثواب کے کام میں وہ میرج بیورو کا کام کرتے ہیں لیکن تعجب یہ ہے کہ چارج کچھ نہیں کرتے۔ یہ پھر مستنصر کے خیال کی مہربانی ہے۔ اس کا یقین ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے اور اس طرح پیسہ وصول کر کے انسان بڑے اجر سے محروم ہو جاتا ہے۔

کشور ناہید

کشور ناہید کو اپنی زندگی کے سفر کو سیدھا کرنے میں بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ اسی مشقت بھری زندگی میں کسی

مقام پر وہ بہادر عورت بن گئی۔ اب اس کا ذاتی غم، ناکامی اور ”وا حسرتا“ قسم کی مایوسی نے عمومی رنگ بنا لیا۔ وہ اپنے غم کا لبادہ اتار کر کالا لباس پہن کر عورت کی مظلومیت کی داعی بن گئی۔ اس کا خیال، اس کی تحریکوں میں ابھرنے لگا۔ وہ ایک سے کو بھی یہ سننے کو تیار نہ تھی کہ ”کاغذی ہے پیر بن ہر پیکر تصویر کا“۔ وہ یہ ماننے کو راضی نہیں کہ مرد کی زندگی جو عورت اور بچے کی کفالت کا بوجھ اٹھاتی ہے، اسے بیرون گھر کچھ ذلتوں کا سامنا رہتا ہوگا۔ افسروں کی زیادتی، ماتحتوں کے موڈ، کامن اڑچن، مرد کی عزت نفس پر پے در پے حملے کرتی ہیں۔

اب کشور عورتوں کو اس بات پر اکتا سکتی ہے۔ اٹھو اور میری دنیا کی عورتوں کو جگا دو۔ وہ بھی باہر نکلیں اور اپنے حصے کا رزق کمائیں۔ گھر کی پرورش، بچوں کی رہنمائی، شوہر کی دلجوئی کو خدا حافظ کہیں۔ بیسویں صدی عورت کی آزادی کا علمبردار ہے۔ اب شادی وہی تھپیڑے کھائے گی جو مغرب کے معاشرے میں اس کا نصیب ہے۔ شادی کا مستقبل، مشرق میں بھی مشکوک ہو چکا ہے۔ اب یہاں بھی خاندانی نظام مشکوک ہے اور بچے جو ہر نس کا مستقبل ہیں، ماں باپ کی طرف دیکھتے رہ گئے ہیں اور پوچھتے ہیں آخر وہ کس کی اولاد ہیں۔ انہیں اتنا ذوارت کیوں چھوڑ دیا گیا؟

لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب کشور لمبی اڑانوں پر نہیں نکلتی تھی۔ وہ خاں صاحب کی چیتنی تھی اور ”کھنڈ“ پروگرام کے ہر Episode میں ان کے ساتھ بیٹھتی تھی۔ اس کے چہرے پر قدرتی حیا اور مٹی کا سادب چھایا ہوتا لیکن یوسف کامران اللہ کو پیارا ہو گیا۔ چادر اور چادر یواری کا تصور ختم ہو گیا۔ اب کشور عورت سے انسان بن گئی۔ اس کے گھر میں شام کو رنگ رلیوں کی محفل ہوتی اور کشور آزادی پسند لوگوں کی میزبانی کرتی۔

کشور دل کی اچھی لیکن زبان کی آری چلانے سے باز نہیں آتی۔ دعا ہے کہ اسے اپنے رویے میں ”توازن“ کی خوبی مل جائے۔ وہ اپنے بچوں، ملاقاتیوں اور رشتہ داروں کے لیے مثبت رویہ، سوچ اور عمل رکھے۔ اس سے خود اپنے ذات کو بہت سکون اور اطمینان ملے گا اور وہ اللہ کے شکر گزاروں میں شامل ہو جائے گی۔ یہ نسخہ بھی آزما دیکھیں یہ مسئلہ کشور..... ایک مطمئن ماں سے بڑی دراشت اولاد کے لیے کچھ نہیں.....

## افتخار عارف

افتخار عارف اپنی عینک کو اس طور استعمال کرتے ہیں، جیسے چونچل لڑکیاں اپنے دوپٹے کو اداؤں میں لپیٹتے ہیں۔ افتخار عینک چہرے سے کم کم اتارتے ہیں لیکن اپنی انکشت شہادت سے کبھی انگوٹھے سے اسے ناک پر جھکتے ہیں۔ ہجرت کر کے جو لوگ بھی پاکستان میں آئے ہیں، ان کی مشکلات مقامی لوگوں کی سمجھ میں پورے طور پر نہیں آتی۔ زبان، رسم و رواج، رہن سہن میں تو واضح طور پر فرق ہوتے ہی ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ Acceptance ہے۔ مہاجر بہت زیادہ خوشدلی سے آگے بڑھ کر آپ سے دوستی کرنا چاہے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔ اس پر مہاجر کا لیبیل لگ جاتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں توازن قائم رکھنا اور اصلی میرٹ کی وساطت سے مقام پیدا کرنا کاردار ہے۔

مجھے اردو ادب میں مقام پیدا کرنا خاصی کٹھن منزل ہوتی اگر اس کے پاس شاعری کا ہتھیار نہ ہوتا۔ اس کی شاعری میں وہ سادگی، نیکیا پن اور دل میں اتر جانے والی خاصیت ہے جو اس کی آدھی لڑائی لڑتی ہے۔ جو لوگ بظاہر افتخار کے قائل نظر نہیں بھی آتے، وہ بھی اس کے اشعار کی تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے۔

میں افتخار سے خاں صاحب کے جانے کے بعد ملی۔ خراج تحسین کا پروگرام تھا۔ وہ میرے سامنے والی قطار میں بیٹھا تھا۔ دو تین بار اٹھ کر آیا اور لفظی اظہار کے بغیر اظہار ہمدردی کر گیا۔ خاں صاحب سے اس طرح پیار کرنے والوں کی قسمت میں افتخار ایک قابل ذکر شخصیت ہے۔ اب باقاعدگی سے ”ادبیات“ ملتا ہے۔ انساٹوں کے لیے اظہار اور عقیدت کو چھپ کر نہیں اعلانیہ پیش کر دیتا ہے۔

شکریہ اور پھر شکریہ.....

## امجد اسلام امجد + عطاء الحق قاسمی

امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی ایسے جڑواں ادیب ہیں جن کا تصور عیدہ کرنا میرے لیے مشکل ہے۔

خاں صاحب کی ان دونوں سے محبت مجھے تھوڑا سا حسد عطا کیا کرتی تھی۔

امجد جب بھی کوئی نئی نظم یا غزل لکھتا فوراً داستان سزائے پہنچا کرتا۔ عطاء آتا تو اپنے کالم، نظمیں ساتھ ضرور لاتا۔ ایک روز جب عطاء گھر پہنچا تو دو پہر کے کھانے کا وقت تھا۔ خاں صاحب نے مجھے کھانا لانے کے لیے کہا۔ اس روز سرسوں کا ساگ پکا تھا اور میں سخی کی روٹی بنا رہی تھی۔ تازہ مکھن اور روٹی لے کر میں اندر پہنچی تو عطاء نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

”یہ روٹی آپ نے پکائی ہے یا تو آپ؟“

”بالکل کوئی شک ہو تو اندر آ کر دیکھ لو۔“

اس نے حیران ہو کر سردائیں بانیں ہلایا۔ ”پڑھی لکھی عورت اور اس قدر مہارت! تعجب، حیرانی!“

تعریف نشانے پر گئی۔ میرے دل میں عطاء نے گھر کر لیا۔ ان دنوں ”معاصر“ رسالے کے دنوں کرتا دھرتا امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی رسالے سے قریب قریب ریٹائرڈ ہی ہو چکے تھے اور عطاء کا بیٹا عمر قاسمی ادارت کی ذمہ داری سنبھالتا تھا۔ شاید عطاء نے گھر پر میری تعریف کی ہو کیونکہ اسی واقعے کے بعد عمر نے ”راجہ گدھ“ پر ایک سیر حاصل سمنون لکھا اور مجھے اپنے احسان کے Lasso میں گھیر لیا۔

خاں صاحب بابوں کی طرح سمجھتے تھے کہ دسترخوان دوستی اور اظہار یگانگت کے لیے ایک آزما یا ہوانسخہ ہے۔ یہ مرتبہ جب امجد اسلام امجد اپنی بیوی فردوس کے ہمراہ آئے تو فردوس کچھ پکوان پکا کر لائی لیکن انڈے اور ک کی ڈش نے میلہ ٹوٹ لیا۔

”بھئی اور ک انڈے قدسیہ کو پکانا سکھا دو فردوس۔“



فردوس نے بڑی لگن اور محنت سے مجھے ترکیب سمجھائی لیکن وہ لطف پیدا نہ ہو سکا جو فردوس کے پکیارے میں تھا۔ غالباً یہی ہاتھ کا فرق ہے جو کسی ہوٹل کی مشہوری کا باعث بن جاتا ہے۔

امجد ہمیں ایک مرتبہ اصرار کے ساتھ چائیز کھانا کھلانے لے گیا۔ جس محبت سے اس نے کھانے کا آرڈر کیا۔ کھانا بھلائے نہیں بھولتا۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد وہ باقاعدگی کے ساتھ میری خیریت معلوم کرنے آیا کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے لگتا ہے جیسے وہ میری ساری تنہائی کو کسی طرح اپنے اندر جذب کر کے لے جانا چاہتا ہے۔ جاتے وقت اس کے کندھے کچھ ایسے سٹکڑے ہوئے خیدہ ہو جاتے ہیں جیسے وہ اپنے مشن میں ٹھن ہو گیا ہو۔

بیشتر ادیبوں کی طرح عطاء اور امجد نے روزی کمانے کے نیے بڑے پاپڑ بیٹے ہیں۔ ایم اے او کالج میں پڑھایا۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کی۔ ان دنوں امجد اسلام امجد Children Complex کا ڈائریکٹر جنرل ہے۔ اتنی مصروف زندگی میں وہ پتہ نہیں میرے نیے کیسے وقت نکال لیتا ہے۔

عطاء الحق قاضی اپنی بیگم کو بھی دو تین بار میرے پاس لائے ہیں۔ خاموش خاموش، پروفیسری کم گو بھی ہیں۔ عطاء میں گم بھی ہیں۔ اس جوڑی کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کے سہارے جینے کا فن سیکھ لیا ہے اور ان کو اب گھر سے باہر راہوں کی ضرورت نہیں۔

”معاصر“ رسالے کے نیے امجد اور عطاء نے بڑی محنت کی۔ رسالہ مستقل مزاجی اور استقامت کے بغیر لکھنا مشکل ہے اور ان دونوں کی سائنسی کوشش سے یہ رسالہ اردو کے رسالوں میں ”سرکڈ واں“ نظر آتا ہے۔

## سیمما پیروز، یاسمین حمید، رخشندہ نوید

یہ تینوں نہ تو دوست ہیں اور نہ غالباً ایک دوسرے کو جانتی ہی ہیں لیکن میرے ذہن کی سکرین پر یہ تینوں عموماً ڈزائو (Desolve) کر کے کبھی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور کبھی ایک کے بعد دوسرے ٹھپے کی طرح رنگوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔

سیمما پیروز عموماً جب مجھ سے ملنے آتی تو قاضی پیروز بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ قاضی بھی اچھی بھلی کہانیوں سمجھتے تھے لیکن شاید سیمما کے پیڑ و بکس کے آگے ان کا دیا نہ چل سکا یا پھر روزی کمانے اور گھر بلو اخراجات پورے کرنے کی جگہ نے انہیں اس فیلڈ میں دور تک چلنے نہ دیا۔

آج مسابقت کے عہد میں ویسے بھی اچھے بھلے ادیب یونہی روندے جاتے ہیں اور کچھ بانصیب ادیبوں نے کندھوں پر سوار بالا ہی بالا ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، جن کی اُن کو بھی امید نہیں ہوتی۔ سیمما کے نصیب یا دورے۔ کافی فاصلہ طے کر گئی۔ میرا خیال ہے جہاں تک اس کی رسائی ہو سکتی تھی، وہاں تک وہ پہنچ نہ پائی۔ پتہ نہیں پی آر کی کونہ۔ محنت کی۔ بہر کیف ترقی کا سفر ایسا ہے کہ اس کے لیے حتمی طور پر کچھ بھی کہا نہیں جاسکتا۔

یاسمین میرے پاس آئی تو وہ مجھے نہ تو استانی لگی نہ شاعرہ۔ میرا خیال ہوا کہ وہ ٹی وی سے وابستہ ہے اور کئی

کے سلسلہ میں آئی ہے لیکن جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو بھید کھلا کہ موصوفہ ایک بڑی حساس شاعرہ ہیں اور ان کا پروفیشن  
تصویر و تدریس سے ہے۔ یا سبین مجھے ملنے آتی رہیں لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد اسے زندگی کی مصروفیت نے  
بھج کر لیا۔

رخشندہ نوید جب پہلی مرتبہ مجھے ملیں تو ان کے ہاتھ میں اپنی شاعری کا مسودہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے فرمائش کی  
کہ میں اس پر دو بیاچ لکھ دوں۔

”تم غلطی پر ہو رخشندہ۔ تمہارا مطلب یہ ہوگا کہ خاں صاحب تمہارے لیے پیش لفظ رقم کریں۔“

”نہیں بانو آپا، آپ ہی لکھ کر دیجیے۔ وہ پتہ نہیں کتنی دیر لگا دیں گے۔“

مجھے اس کے چہرے پر ایسی حیا نظر آئی جس نے مجھے بڑا متاثر کیا اور میں نے مسودہ اس سے پکڑ لیا۔

ابھی خاں صاحب حیات تھے۔ ایک دن میں نے ٹیلی ویژن لگایا تو سکرین پر سرفراز شاہ صاحب نظر آئے۔

رخشندہ نوید ان کا انٹرویو لے رہی تھی۔ شاہ صاحب کچھ روحانی بصیرت کے حوالے سے لوگوں کے مسائل اور ان کے حل  
پیش کر رہے تھے۔ ابھی ٹیلی ویژن پر ایسے پروگرام کم ہوتے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا غالباً پہلا پروگرام تھا جو زاویے کے شانہ  
بے شانہ چلتا رہا۔ پھر شاہ جی لندن چلے گئے اور یہ پروگرام سکرین سے مع رخشندہ نوید غائب ہو گیا۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ  
موصوفہ کہاں ہوتی ہیں۔ ان کی نظمیں، غزلیں میں شوق سے رسالوں میں پڑھتی ہوں۔ کچھ پرانے تعلق کی بنا پر۔ کچھ اس کی  
تصویر میں اپنی ہی سلگا ہٹ ہے جس کی تپش آسانی سے آپ تک پہنچ جاتی ہے۔  
زندگی کا شکر یہ جس نے مجھے ایسی محبت کرنے والی روئیں ملا دیں۔

## احمد عقیل روبی

میرا خیال ہے کہ ہر پچیس تیس سال کے بعد ہر ملک کے مشاہیر بدل جاتے ہیں۔ جوں جوں نئی ایجادات فروغ  
پاتی ہیں۔ معاشرہ غیر محسوس طریقے سے نئے رسم و رواج، لباس کی تراش خراش، زبان میں نئے الفاظ کی نمو، معیار زندگی  
میں نئے انداز اختیار کر لیتا ہے۔ زبان جو ادیب کا ہتھیار ہے، اس میں بھی نئے الفاظ کی پیوری لگ جاتی ہے۔ انگریزی تو  
عمری زبان میں داخل ہوئی رہی ہے لیکن اردو بھی اب انگریزی میں لکھے جانے پر مُصر ہے۔ اسے فیشن کہہ لیجیے کہ وقت کی  
ضرورت کہ زبان پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے۔

اب آپ کو جگہ جگہ Bill Boards پر ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں ایسے اردو الفاظ کثرت سے نظر آئیں  
گے جو انگریزی میں اردو کو رواج دے رہے ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی دنیا ایک گلوبل ویلج بننے پر مُصر ہے۔  
صرف ایک مشکل ہے کہ ابھی جس کی لائحہ عمل اس کی بھینس جیسی قدر نہیں بدلی۔ معاشرے میں انصاف کی بنیادی اہمیت کا  
سماجی معاشروں کو نہ احساس ہے نہ وہ اس معاملے میں کوئی ذمہ داری ہی محسوس کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ہم سب الفاظ کے استعمال میں فراخ دل ہو رہے ہیں، لیکن عقیل روبی ایک نئی سمت سے اس تبدیلی

میں داخل ہوا ہے۔ عقیل روہی ٹریک Mythology میں سر تا پا کھویا ہوا ہے۔ اس نے ہندو دیوتاؤں کی طرف کم کم توجہ دی ہے۔ وہ Odepius, Trojan Wars اور ٹرائے کے شہرہ آفاق حسن کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

میں ترجموں کی بات نہیں کر سکتی۔ ورلڈ کلاسیک کا ترجمہ ایک بہت خوش آئند عمل ہے لیکن عقیل روہی نے صرف ترجمے کا سہارا نہیں لیا۔ ہمارے ادب و گریک دیوتاؤں سے رنگ برنگی روایات دکھانے کی کوشش کی ہے۔

عقیل روہی ہمارے گھر میں ممتاز مفتی کی وجہ سے آتے تھے۔ مفتی جی جب بھی لاہور آتے، اپنا میلہ ساتھ لاتے۔ خاں صاحب سے بھی ان آنے والوں کی ملاقات ہو جاتی۔ پھر کچھ لوگ مفتی جی کو نہ چھوڑتے اور کچھ ان سے چھڑ جاتے۔ خاں صاحب کے ارادت مند بن جاتے اور مفتی جی کو لگ جاتے لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک مفتی جی حیدرآباد رہے، عقیل ان ہی کے حلقہ ارادات میں داخل رہے اور خاں صاحب کو بھی دوسرے درجے کی توجہ دی۔ اس بات کا اظہار میں نے یوں لکھا کہ عقیل روہی نے مفتی جی پر ”علی پور کا مفتی“ تحریر کی لیکن انہیں کبھی خاں صاحب پر ایسی کوئی کتاب لکھنے کا خیال نہ آیا۔

ابدان چلا اور عقیل روہی مفتی جی کے ایسے عاشق زار ہیں جنہوں نے اپنی محبت میں دوئی کا زہر نہیں ملا یا۔ عقیل اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں تنقید نگار نہیں ادیب ہیں اور وہ جب بھی لکھتے ہیں ان پر جذبات جاوی ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی چیز پر معرض تبصرہ نہیں کر سکتے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد عقیل روہی نے بڑی مروت سے مجھے ملنا شروع کر دیا۔ خاں صاحب کو یہ سب چاہنے والوں کی محبت سے میری زندگی کا خزانہ کر رہے تھے۔

ایک روز شام کے وقت عقیل روہی آیا۔ پتہ نہیں ہمارے ڈرائنگ روم کا مشرق کی جانب شیٹے کی لمبی کھڑکی سے کیا تعلق ہے کہ عموماً یہاں ہی پچھ ایسے بھید کھل جاتے ہیں جو ہماری شعوری سوچ کا حصہ نہیں ہوتا اور یہ بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ ایسے واقعے عموماً عصر اور مغرب کے درمیان کیوں ہوتے ہیں۔

جس روز شام کو عقیل آیا۔ کہیں مغرب کا وقت قریب تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور وقت کا تعین نہ ہو سکتا تھا۔

”آپاجی..... باہر لان میں دیکھیے۔“

میں نے باہر نگاہ دوڑائی۔

”کیا آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ اس وقت چاند نکلنے والا ہے کہ سورج طلوع ہونے کا عمل ہے۔“

”لو اس کا اندازہ لگانا تو آسان ہے۔ ابھی میں نے عصر پڑھی ہے۔ اب تو غروب آفتاب کا وقت ہے۔“

بادلوں کی وجہ سے سرفی نظر نہیں آ رہی۔“

”نہیں نہیں بانو! آپ تو تجربے سے بات کر رہی ہیں۔ بھلا اگر کسی دوسرے ملک کے اجنبی کو آنکھوں سے دیکھتے

باندھ کر ملکہ سب کی طرح یہاں لے آیا جائے تو کیا وہ بتا سکے گا کہ سورج نکلنے والا ہے کہ ماہِ منیر۔“

”ہاں پھر تو مشکل ہے۔“

”میں کافی دیر سے ارضی و سماوی نباتات و جمادات، بہتے پانی، اونچے پہاڑ دیکھ رہا ہوں۔ بادلوں نے میرے

میں گم کر دیئے ہیں۔ بانو آ پاجورا مذہب کی جھولی میں چھپے ہیں ان کا مقابلہ تو کوئی دیوانا نہیں کر سکتی، آخر فلسفی اور دیوانائی ہیرو بھی تو زندگی کے معنی تلاش کرتے ہیں، لیکن جو معنی مذہب عیاں کرتا ہے اور ڈھانپ بھی رکھتا ہے اس سے بڑے اسرار، راز اور کہاں ہوں گے۔“

کچھ عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ عقیل روبی نے جو کچھ گریک Mythology سے حاصل کرنا تھا، غالباً کر لیا اور چھ ماہوں کے سفر چھوڑ کر بڑی شاہراہ پر گامزن ہو گئے۔ اس کی شہادت یوں ملی کہ ایک روز وہ آیا تو اس کے ساتھ ”سورۃ بقرہ“ کا منظوم ترجمہ تھا۔

اصرار سے بولا۔ ”بانو آ پاجورا! اسے پڑھ کر ضرور بتائیے کہ ترجمہ کیسا ہوا؟“

میں اسے یہ بتاتی کہ ترجمہ کیسا تھا۔ نہ مجھے مذہب کی سمجھ تھی نہ شاعری کی نہ ترجمے ہی کی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے کہ ایک روز عقیل ملنے آئے تو میں نے اپنے کچھ شکوک کا اظہار کیا۔

”عقیل... نماز کے کچھ حصے میری سمجھ میں نہیں آتے۔“

”آپ سمجھ کے کیا ہیں گی۔ ساری نماز حمد و ثنا ہے اور انسان کی عاجزی اور اللہ سے مدد مانگنے کے لیے پڑھی جاتی

ہے۔ یقیناً جانیے بانو آ پاجورا! اللہ کو ہماری تعریف سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ضرور ہے کہ میرے لیے نماز پڑھو لیکن وہ

یہ تو اس نماز کا محتاج نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ ہم پانچ وقت اس کی مدد کے طالب رہیں اور ارض و سما کے ان لوگوں

میں شامل رہیں جو اسی سے مانگتے ہیں۔ یہ نماز ہماری روح کو وضو کی طرح دھوتی ہے۔ اس کا فائدہ صرف ہمیں ہے۔“

میں عقیل روبی کی تبدیلیاں دیکھ کر حیران ہوں۔ ویسے تو ہر انسان تک رسائی مشکل ہے لیکن ایسا انسان جو

بصیح طور پر اتنی کروٹیں لے اس کا کیا پڑتا لگا نہیں۔

## محمد یونس بٹ

آپ لوگ محمد یونس بٹ کو ایک مختلف زاویے سے دیکھتے ہیں۔ آج کے سٹ کام کے عہد میں جب آدمی کے بیڑے سخت، آنکھیں تپتی ہوئی اور زبان لکنت کے آس پاس رہتی ہے۔ یہ ساری ٹینشن، ہلکے پھلکے مزاج سے دور کرنے کی کوشش میں محمد یونس بٹ ہی کامیاب ہے۔ وہ جملے انسانے اور اس میں نئے معنی اور روح پھونکنے میں لاجواب ہے۔

لیکن میں محمد یونس بٹ کو اپنے محسن کے طور پر جانتی ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب 1985ء میں مجھے بلڈ کیسٹرنے گھیر لیا تھا۔ میں یونس کو نہیں جانتی تھی۔ وہ بھی خاں صاحب سے ملنے ڈرائنگ روم کی حد تک آیا کرتا تھا۔ غالباً وہ ہمیشہ سے ایک ہمدرد دل کا مالک ہے۔ جب میں ہسپتال میں داخل ہوئی تو پتہ چلا کہ مجھے خون کی شدید ضرورت ہے۔ سارا

خون کی بوتل لگتی اور بلڈ کاؤنٹ کو بارہ تک لایا جاتا۔ پھر بیماری حملہ آور ہوتی اور میرا بلڈ کاؤنٹ گر کر چھ تک ہو جاتا۔

ہسپتال میں سب سے پہلا Donor اشتیاق کا بیٹا صائل پہنچا۔ اس نوجوان نے مجھ سے کہیں پہلے میرا بلڈ

گروپ اپنے لہو سے میچ کر کر بی پوزیٹیو ہوئی بوتل جمع بھی کرادی تھی۔

دوسرا شخص جو ہسپتال میں موجود تھا۔ وہ یہی نوجوان یونس بٹ تھا۔ جس وقت میرے بازو میں صائل کے خون کا قطرہ قطرہ جا رہا تھا، یہ بڑی لجاجت سے داخل ہوا۔

”آؤ بھئی آؤ تم کہاں؟“

وہ بلا جھجک بولا..... ”ڈاکٹر جی کے پاس گیا تھا خاں صاحب۔ میرا خون بھی بی پوزیٹو ہے۔ میں خون دینا چاہتا ہوں لیکن ڈاکٹر جی کہتے ہیں آپ کی اجازت کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔“

”اویار یونس! بیٹھو بیٹھو تم کس مصیبت میں پڑ گئے ہو۔ لہو کی کمی ہو جائے گی خواہ مخواہ۔ جانے دو۔“

”جی نہیں۔ اشفاق صاحب! مجھے خون دینے دیں۔ میں سٹی مار سکوں گا کہ ہا نو قدسیہ ”راجہ گدھ“ کی مصنفہ کی رگوں میں میرا لہو دوڑنا پھرتا ہے۔ آپ مجھے اس اعزاز سے کیوں محروم کرتے ہیں؟“

اس کی خواہش میں کچھ ایسی سچائی اور طلب تھی کہ خاں صاحب انکار نہ کر پائے اور یونس کا لہو میری رگوں میں دوڑنے پھرنے لگا۔

باقی دعا ہے کہ اللہ اسے اپنی آرزوؤں میں کامیاب کرے اور لوگ تادیرا سے یاد رکھیں۔ عموماً مزاج نگار لوگ سوڈے کی بوتل کی مش ہوتے ہیں۔ جو نبی کسی کی ٹینشن رفع ہو جاتی ہے، گیس نکل جاتی ہے۔ مزاج نگار بھی بھول جاتا ہے۔ مسکراہٹ اور آنسو میں یہی فرق ہے۔ ایک آنسو بھی یاد میں تادیرا باقی رہتا ہے اور گھنٹہ بھر ہنسانے والا لہو میں بہنے جاتا ہے۔

## ایکٹروں کی دنیا

اللہ نے کچھ بیکار پیدا نہیں کیا۔ لطافت اور کثافت اپنے مقام پر ہوں تو فائدہ اور راحت پہنچاتے ہیں۔ بے وقت اور غلط مقام پر ان کے نتائج نہیں نکلتے۔ ایسے ہی وفاداری بے وفائی دونوں اپنے مقام پر خوب ہیں۔ کبھی کبھی کہ گھنا چھتار درخت ایک مدت ایک ہی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کی وفاداری آپ کے سامنے ہے۔ پرندے گھومتے بنانے، مسافر آرام کرنے، لڑکیاں جھولنے ڈالنے کے لیے ایسا ہی سایہ دار شجر تلاش کرتی ہیں۔

بہار کے دنوں میں کھلنے والے خوشبودار پھول دو روزہ مہمان بڑی بے وفائی کے مرتکب ہوتے ہیں، لکھنؤ کے بغیر زندگی کا گلزار رنگ و بو سے آشنا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایکٹروں کی میڈیا سے وابستہ فنکاروں کی بے وفائی ہے۔ پرنٹ میڈیا میں ان کے سلیکنڈل ان کی بے وفائیاں چسکے لے لے کر بیان کی جاتی ہیں۔ مارلین منرو، ہیریٹا ہو، سب اپنے اپنے مقام پر اپنی جان پر کھیل کر آپ کی بے رنگ و بو زندگی میں رنگینیاں کے کرآتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی شہرت کا گلاب کتنی دیر کھلے گا اور کس وقت کوئی نیا چہرہ انہیں پچھاڑ کر گمنامی کے کنوئیں میں پھینک دے گا۔

ہم فقط ان کو دل لگی کا درجہ دیتے ہیں۔ عارضی وقت کئی کا ذریعہ سمجھتے اور اپنے اخلاق اور کردار کو ان سے بچتے سمجھ کر ایک قسم کے احساس برتری میں چلے جاتے ہیں لیکن 1970ء کے لگ بھگ نہ معاشرہ اتنا بے رحم تھا نہ ناظرین اتنے

خود غرض۔ نیلی ویرن کی نئی کھپ سر اٹھا رہی تھی۔ جب خاں صاحب نے ”ایک محبت سو ڈرائے“ شروع کیے تو کئی من سوہنے چہرے اور بڑے آرٹسٹ ان کے قریب آ گئے۔

حبیب، فردوس، جمال، قوی، عابد علی، خیام، انضال، آفتاب احمد سب نہ صرف بڑے نام تھے۔ بڑے لوگ بھی تھے۔

عظمیٰ گیلانی، روحی بانو، خورشید شاہد، منور توفیق اسی عہد کی یادگار ہیں۔

ایکسٹرونک میڈیا ابھی پوجا پاٹ جیسی متبرک چیز تھی۔

اس میڈیا کو ابھی شارٹ ہونے میں دیر تھی۔ ہم لوگ 75۔ جی میں رہتے تھے۔ پتہ نہیں خاں صاحب کو کیا سوچ

کر ”دھوپ سائے“ فلم بنانے کی سوجھی۔ اس کا پونٹ خود ایک معرکے کی چیز تھا۔ فلم کی ریکارڈنگ خواجہ جی نے کی۔

فونو گرافر فلمی دنیا سے وابستہ تھے لیکن کسی نے بھی خاں صاحب سے ایک پیسے کی ڈیمانڈ نہ کی۔ گانے منیر نیازی نے لکھے اور

اس کی دھنیں طفیل نیازی نے کمپوز کیں۔ منیر بھائی کی ایک نعتیہ نظم آج بھی بہت شہرت کی حامل ہے جس کا کھڑا تھا

شام شہر ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو

یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

سیت کے طور پر ایک پرانی کٹڑی کو معمولی سے کرائے پر لیا گیا۔ خاں صاحب دفتر سے گھر آتے۔ پھر مجھے اور

بچوں کو کار میں لوڈ کرتے اور کٹڑی پہنچتے۔ میں حیران تھی کہ وہ ہمیں کیوں ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک روز خود ہی کہنے

لگے۔

”کبھی کبھی اردو بورڈ میں کام زیادہ ہوتا ہے۔ شوٹنگ رک نہیں سکتی۔ میری جگہ تم ڈائریکٹ کر لیا کرو۔“

”دھوپ سائے“ کی مختصر کہانی یہ تھی کہ کٹڑی میں سوسائٹی کے راندہ درگاہ لوگ رہتے تھے۔ ان میں ایک

طوائف اور ایک شرابی تھا۔ نائب طوائف (منور توفیق) بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتی تھی۔ اسی کٹڑی میں ایک بدکار

دو نمبری مصنی دو انیاں بیچنے والے (آفتاب) کا دفتر تھا۔

بچوں کی نفرتی جب پوری نہ ہوئی تو میرے تینوں بچے اور ان کے دوست عدنان قدری سے سختی پوری کر لی جاتی۔

جس روز منور بچوں کے ساتھ ایک بھاری درخت کے تلے ایک تھڑے پر بیٹھی تھی، شرابی (قوی) گارہا تھا۔ ”شام شہر ہول“

سارا ہنگامہ ہوا۔ مصنی ادویات بنانے والے (آفتاب) نے طوائف کی بے عزتی کی اور شرابی (قوی) طوائف کو لے کر

رخصت ہو گیا۔ یہاں ایک معرکے کا جملہ تھا جب قوی کہتا ہے:

”چل آ پا زہرہ۔ ہم اس کٹڑی میں رہنے کے قابل نہیں ہیں۔“

خاں صاحب کی جملہ تحریروں میں ایک بات انتخاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ وہ بار بار پاکستانی معاشرے کو

Warn کرتے تھے کہ دوسروں سے نفرت پاکستانی معاشرے کو کھوکھلا کر کے اسے طبقوں میں بانٹ دے گی۔ پھر اس میں

تجکیتی اور قومی مفاد کی پیروی لگانا مشکل ہوگی۔ جیواور جینے دو کے فارمولے پر عمل کر کے ہی بھانت بھانت کے لوگ اکٹھے رہ

سکتے ہیں اور ایک منزل کے راہی بن سکتے ہیں۔

اسی فلم میں ایک بد نصیب لڑکی کے منہ سے خاں صاحب نے ایک ایسا جملہ کہلوایا جو بعد میں کئی مقامات پر انہوں نے خاص طور پر استعمال کیا۔ یہ بد نصیب لڑکی جو شرابی سے محبت کرتی ہے، تندور چلاتی ہے اور آرزو رکھتی ہے کہ شرابی شراب پینا چھوڑ دے۔ جب شرابی کنزوی سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہتی ہے۔

”پہلے میں کہتی تھی کہ وہ پینا چھوڑ دے۔ اب میں کہتی ہوں وہ چاہے پیتا رہے لیکن یہیں رہے۔“

کچھ دیر بعد اپنے آپ کو سمجھانے کے انداز میں دلہا مدیتی ہوئی کہتی ہے:

”جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن اپنی محبت یہیں کیسے چھوڑ جاتے ہیں۔“

یہ جملہ اب مجھ پر صادق آتا ہے۔ خاں صاحب تو چلے گئے لیکن اپنی محبت یہیں کہیں آپ لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئے ہیں جس کی بدولت زندگی قابل برداشت ہے۔

یہاں سے قوی، خاں صاحب کا ہم سفر بن گیا۔ قوی اور اس کی اہلیہ ناسید ابھی تک مجھے بڑی محبت سے دیکھ رہے ہیں اور ان کی محبت کا مجھے بڑا سہارا ہے۔ قوی چونکہ پٹھان آدمی ہے اس لیے اس کی غیرت و فاداری کی بنیاد میں آئی۔ ابھی تک اس کی نیر زمیندی میں کمی نہیں آئی۔

”دھوپ سائے“ سینما گھر میں ایک ہفتہ بھی نہ چلی، لیکن خاں صاحب اور میرے درمیان کبھی کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے مایوسی کی بات آتی ہو۔ خاں صاحب زندگی گزارنے کا طریقہ، سلیقہ اور وطیرہ جانتے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ شکست آخری حرف نہیں۔ خم ٹھونک کر یا علی کا نعرہ لگا کر چیلنج قبول کرنے سے زندگی کی بازی جیتی جاسکتی ہے۔

خاں صاحب کی زیادہ توجہ جب فلم کے تجربے کے بعد ٹیلی ویژن ڈرامے کی طرف مبذول ہو گئی تو ”ایک محبت سو ڈرامے“ سے کھیل گرم ہوا۔ خاں صاحب پروڈکشن میں تو شامل نہ ہوئے لیکن ڈرامے کی ریڈنگ ضرور کراتے۔ ڈرامے کی کاسٹ ان کے گرد سکرپٹ ہاتھ میں لیے ریہرسل کرتی۔ وہ لب و لہجہ اور تلفظ ٹھیک کراتے۔ خود پڑھ کر سمجھاتے کہ Stress اور Pause کیا معنی رکھتے ہیں۔ جس طرح مکالموں کی ادائیگی میں وقف کی اہمیت ہے۔ کس مقام پر کس چیز پر توقف کرنا اہم ہے، ایسے ہی خاں صاحب اپنی کاسٹ کو کئے، تیز بولنے اور آواز گرا کر یا بند کرنے کے مقامات سمجھاتے۔ یہ ریڈنگ ایکٹروں میں لگانگت اور مفاہمت کی ایسی فضا قائم کر دیتی کہ مسابقت کی جگہ پر معاونت سے کام ہولت سے جاتا۔

پھر میں نے خاں صاحب کی نقل میں کھیل لکھنے شروع کر دیے۔ میرا ڈرامے سے لگاؤ اس وقت سے تھا جب میں انارکلی ڈرامہ مشکل سے پڑھ سکتی تھی۔ اس ڈرامے سے میرا قلبی لگاؤ 60۔ فیروز پور روڈ پر زندہ تعبیر بن چکا تھا۔ اب اتنا بڑا چانس ملا تو میں نے ٹی وی اور ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنا شروع کیے۔ ”دھوپ جلی“ اور ”خانہ بدوش“ لکھ کر مجھے جی گیلائی، عابد علی اور حبیب کی شعبہ بازی دیکھنے کا علم ہوا۔ تب ایکٹریاں نہیں بدلتے تھے۔ اپنے اندر ایک نئے کردار دیکھ کر اس کی طرح سوچنے، عمل کرنے اور اٹھنے بیٹھنے پر ترجیح دیتے تھے۔

میرے ڈرامے ”زرد گلاب“ میں روجی بانو اور عابد علی کے کام کو ابھی بھی لوگ سراہتے ہیں۔ ”رات کے سسے“ فردوس جمال نے جو معرکہ سر کیا اسے لوگ نہیں بھولے۔ اس کے علاوہ قوی خاں، بندیا، راحت کاظمی، ثروت حقیق، نسیم

ساحرہ کاظمی، طلعت حسین، سکندر شاہین ایک پوری کھیپ ایکٹروں کی ایسی ہے جس کے ناموں سے بھی آج کی پودت ختم نہیں۔

خاں صاحب نے تو ٹیلی ویژن کے لیے اتنے فنکاروں کو روشناس کیا اور خود ان کے ٹیلنٹ سے متاثر ہوئے کہ اس کتاب میں ان سب کا محاسبہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کے لیے تو کسی ایسے ٹی وی کے نامہ نگار کو زحمت کرنا پڑے گی جو ٹیلی ویژن کی تاریخ مرتب کر رہا ہو۔ یہاں تو ”ایک محبت سو ڈرامے“ ”تو تا کہانی“ ”اور ڈرامے“ ”من چلے کا سودا“ کو بھی طائرانہ نظر سے دکھایا نہیں جاسکتا۔ آخر برسوں کا سفر چند صفحاتوں میں کیونکر قید کیا جاسکتا ہے۔

## حنابا بر علی

داستان سرائے کے کالے پھانک پران دنوں نہ رات کو تالا لگتا تھا نہ دن ہی کو کبھی اسے مقفل کیا جاتا۔ لوگ ٹھونک ٹوک اندر چلے آتے اور ہم دونوں اپنی نویافت شخصی شہنی کے تحت انہیں بڑی خندہ پیشانی سے ملتے۔ اس وہم کا یہ نام تھا کہ ہم اپنے اندر بھی اسی طرح کے گھیرے میں تھے کہ ہم کس قدر ٹیک، اچھے اور مددگار قسم کے بندے ہیں۔

ایک دن ہمارے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ میں اس وقت جھاڑن ہاتھ میں لے کر صوفے جھاڑنے میں مصروف تھی۔ ایک لڑکی داخل ہوئی۔ اس نے بھڑکتے سرخ رنگ کی پینٹ اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ نہ سر پر سکارف تھا نہ گلے میں دوپٹہ۔ ایسی شعلہ رو لڑکیاں تب شاذ ہی ملتی تھیں۔ میں نے اسے صوفے پر بٹھایا اور آنے کی وجہ تسمیہ پوچھی۔

حنابا بر علی نے کہا..... ”Ann Arbor میں پڑھتی ہوں۔“

”وہ کہاں ہے بھئی؟“

”امریکہ کی ایک ریاست Seattle ہے۔ اس میں یہ کالج ہے۔ آپ کو شاید علم نہ ہو لیکن اس کالج میں

Co-education نہیں ہے۔“

”اور تم کیا پڑھ رہی ہو؟“

”میں انگریزی میں ایم اے کر رہی ہوں۔“

اس نے میرے سامنے دھرے میز پر ایک کہانی رکھ دی۔ اس کہانی کا نام The Heed Seekers تھا۔

”یہ میرے Thesis کا حصہ ہے۔ میں نے آپ کی کہانی ”توجہ کی طالب“ پڑھی۔ اس کا ترجمہ کیا۔ میرے

پروازرنے اسے approve کر دیا ہے لیکن جب تک آپ تصدیق نہ کریں گی، یہ آگے بھیجی نہیں جاسکتی۔“

گرمیوں کے دن، جولائی کا مہینہ، یہ اس رابطے کا آغاز تھا جو سیدھی لائن بن کر ہمیں یہاں تک لے آیا ہے۔

اس پینٹ شرٹ میں ملبوس لڑکی میں عجب قسم کی انکساری اور عاجزی تھی۔ وہ جب اس کا جی چاہتا منہ اٹھا کر میرے

چہرے آ جاتی۔ تب مجھے اس کی فیملی بیک گراؤنڈ کا کچھ علم نہ تھا۔ نہ چھان بین ہی کی عادت میں مبتلا تھی۔ میں نے اس سے کبھی

نہ پوچھا کہ وہ کس علاقے میں رہتی ہے۔ اس کا حسب نسب کیا ہے اور اسے مجھ میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ گھر کا فروہی بن گئی۔



حنابا برعلی میں ایک خوبی اور بھی انکساری کے علاوہ تھی۔ وہ بہت Helpful تھی۔ کبھی صوفی پر چڑھ کر بولتا۔ بیٹھتی کہ اس کی دیکھ بھال اور خدمت کا بوجھ میزبان پر پڑ جائے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوتی وہ فوراً یہ کام میرے ہاتھوں سے لے لیتی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ایک روز میں فرش پر ناکی پھیر رہی تھی۔ اس نے فوراً گیلی ناکی میرے ہاتھ سے لے لی اور فرش کو آئینہ کر دیا۔

پھر وہ صبح آنے لگی۔ انیس اس وقت یونیورسٹی میں ایم بی اے کر رہا تھا۔ میں اس کا ناشتہ بنانے میں مشغول ہو کر تھی۔ حنا کے آنے پر وہ فوراً اندر سے میرے ہاتھ سے لیتی اور ایسا آملیٹ تیار کرتی کہ ہم سب حیران رہ جاتے۔ پھر بسا اوقات وہ دوپہر کے وقت حیوانی بھن کر اچھی اچھی ترکیبوں سے نئے نئے کھانے پکا کر دکھاتی تھی۔ سب اس طرح وہ کھانے کھاتے گویا کسی ریستوران میں بیٹھے ہوں۔ آج تک اس کے گھر سے کچے ہوئے دی ہی نہیں بگھارے بیٹھن اور ان گت موٹا تھیں آتی رہتی ہیں۔ میں انہیں کبھی نقل کرنے کی کوشش نہیں کرتی کیونکہ مجھے علم ہے کہ ہلکے جاری ہے، کبھی لوڈ شیڈنگ نہیں ہوتی۔

کہانی سے میں تو مطمئن تھی لیکن وہ بھی توجہ سے مطمئن نہ ہونی۔ اسی سلسلے میں اس نے یہ ترجمہ انیق لکھا۔ دکھایا۔ منظور قادر پھر باقاعدگی سے افسانہ دیکھنے آتے رہے۔ وہ چونکہ سکا راوی تھے، اس لیے انہوں نے کئی جگہ ترجمے کو دکھاڑ پھینچا دیا۔ دوستی کے مراحل سے گزرتے بالآخر مجھے علم ہوا کہ حنابا برعلی، سیدبا برعلی کی بیٹی ہے۔ میں بہت مدت بعد جیکب کی فیکٹری کا بیرونی حصہ اور اس کے سامنے لگے ہوئے ان گنت ٹرک دیکھے جن پر Castle Rose Petal اور پیکیجنگ کی دیگر مصنوعات مارکیٹ کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ اندر جانے کا اتفاق مجھے صرف ایک بار ملا۔ خال صاحب اور میں با برعلی صاحب کے پاس انیس خال کی نوکری کے سلسلے میں گئے۔

حنابا سے بہت پہلے مجھ سے منو بیگم اور واجد مل چکے تھے۔ منو کا اصل نام ساڑھ تھا لیکن مجھے اس پیارنی سی منو کا اصلی نام معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ پتہ نہیں واجد کب اور کہاں ملے لیکن رفتہ رفتہ وہ باقاعدگی سے ہلاکتوں سے آنے لگے۔

منو عموماً اس کا لے کر تھڑے پر بیٹھ جاتی جو اوپر خال صاحب کی لائبریری کی طرف جاتا تھا۔ واجد خال صاحب کے ساتھ عموماً باورچی خانے میں بیٹھتا۔ یہ باورچی خانہ نہ جانے کیوں ہمیشہ ہمارے ڈرائنگ روم کا رول ادا کرتا رہا ہے۔ ایک روز وہ اپنے ساتھ ایک لوبے کی کڑا ہی مرغی اور کچھ مسالے لے کر آ گیا اور کہنے لگا کہ آج میں آپ کے لیے کڑا ہی پکاؤں گا۔ برگر اور پیزا (Pizza) تو دور کی بات ہے ابھی کڑا ہی، تکے اور توڑے کی ٹکیاں چاہیں مجھ سے کلاس میں عام نہ ہوئی تھیں۔ اب کڑا ہی تیار ہوئی۔ نان منگوائے گئے۔ ضیافت کا سماں بن گیا۔

بہت بعد میں جب حنابا برعلی مستقل طور پر ہمارے گھر آنے جلنے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ منو بیگم اور واجد مل کے دراصل حنا کے رشتہ دار ہیں اور وہ بھی بہت قریبی یعنی سیدبا برعلی کے بھائی کی اولاد۔

حنابا سے ملنے ملانے کے سلسلے میں میری ملاقاتیں پروین با برعلی سے ہونے لگیں۔ حنا کی والدہ پروین نے مجھے اپنے حسن سے اپنی فراخی اور وسعت قلب سے ہمیشہ disarm کیا۔ وہ بغیر کسی جھجک یا حجاب کے مجھے اپنا ازلی دوست

کئے گئیں۔ پرائیویٹ خطوط، واقعات، دوستوں کی باتیں، رشتہ داروں کا زانچہ ان ہی سے پتہ چلا۔

حنا کے دادا امرا تب علی شاہ تھے جو ایک بڑے ہی سیلف میڈ آدمی تھے۔ انہوں نے سائیکلوں سے اپنا سفر شروع کر کے پیکر کی بنیاد رکھی تھی۔ ان ہی کی رواداری اور عاجزی کے جرثومے (Genes) ابھی تک خاندان میں چلے آ رہے ہیں۔ شالیمار ہسپتال جو غریب لوگوں کا مفت علاج کرتا ہے اور با بر علی ٹرسٹ جو نادار لوگوں کی داری میں ثانی نہیں، اس کا ہاکی یا وزندہ کرتے ہیں جو جاتے وقت اپنی وراثت میں انہیں شامل کر گئے لیکن میں نے کبھی حنا کے لبوں سے نہ تو دادا کا نگرستانہ ان مخیر اداروں ہی کا۔ وہ تو عجب طور پر ادب سے وابستہ تھی اور ادیبوں کی پوجا میں مصروف رہتی تھی۔

مجھ سے بھی زیادہ اس کی وابستگی فیض صاحب سے رہی۔ فیض صاحب نے تو بڑی جانکاری سے فیض صاحب کے فیض کو اپنی ذات میں چار پانچ نڈگانے کے لیے استعمال کر لیا لیکن حنا قدرے احمق ہے۔ اس نے میرے سوائے شاید کسی تعلق خاطر کا ذکر نہ کیا جو اسے فیض صاحب سے تھا۔

وہ جب امریکہ میں رہتی تھی۔ فیض کچھ دیر کے لیے اس کے پاس ٹھہرے تھے۔ وہ زبانی اسے اپنی نظمیں پڑھتے۔ اس کے پکائے ہوئے کھانے نوشن جاں فرماتے۔ اس کی اردو کی نظمیں سنتے۔ غرض یہ کہ یہ تعلق ایک عرصہ تک قائم رہا لیکن حنا اس تعلق سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی۔

چلتے چلاتے اور ہوتے ہواتے وہ وقت آ گیا جب پروین کو بیٹی کی گھر بسائی کی فکر صبح و شام ستانے لگی۔ حنا ہر معاملے میں سعادت مند تھی، لیکن شادی کے معاملے میں وہ الف ہو جاتی اور کسی رشتے پر رضامند نہ ہوتی۔ پروین اسے بیروں میں بلکہ بہت قریبی رشتہ داروں میں بیاہنا چاہتی تھی۔ حنا مغربی تعلیم کے زیر اثر ان باتوں کو فروغی اور غیر ضروری سمجھتی تھی۔ بیٹی کو منانے کا مرحلہ کافی سنجیدہ شکل اختیار کر چکا تھا۔ ایک روز پروین با بر علی بھاگم بھاگ میرے پاس آئیں۔

”بانو آ پا۔ میرے ساتھ گھر چلیے۔“

”کیا معنی؟ کیوں؟“

”بس جی Now or never۔“

میں نے پروین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نشی آ میز لہجے میں پوچھا۔ ”لیکن ہوا کیا ہے؟“

”آج مجھے فیصل امام کا رشتہ آیا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ، شائستہ اور بہت محنتی آدمی ہے۔ پہلے تو حنا انکار کرتی رہی۔ پھر

بتول لے کر کمرے میں چلی گئی۔ میں کھٹکھٹاتی رہی اور ادھر سے کوئی جواب نہیں آتا؟“

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”اس سے اچھا نہیں سکتا بانو آ پا..... لیکن..... وہ کسی لمحے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھ سکتی ہے۔ ابھی چلیں ابھی۔“

ہم دونوں اسی وقت تیز رفتار گاڑی میں گھر پہنچے۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہ آیا۔

میں ذرا سی خوفزدہ ہو گئی۔ ”حنا! میری بات سنو۔ دروازہ مت کھولنا لیکن بات سن لو۔“

مجھے لگا جیسے وہ دروازے کے پاس لگی متوجہ ہے۔

”سنو تم میرے گھر رات دن دو پہر جب بھی آتی ہو میرے دروازے تم پر کبھی بند نہیں ہوئے۔ میں نے سنا تمہیں اپنی ادبی اولاد سمجھا ہے۔ اگر آج تم نے میرے لیے دروازہ نہ کھولا تو شاید داستان سرائے کے دروازے تم پر بندھ جائیں ہمیشہ کے لیے۔“

میں نے پروین کو اشارہ کیا کہ وہ غائب ہو جائیں۔

”آپ کے ساتھ کون ہے؟“

”کوئی نہیں، دروازہ کھولو پلیز۔“

چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ حنا نے دائیں بائیں جھانکا اور پھر مجھے اندر بلا کر دروازہ منقل کیا۔ پستول کھنسنے والی میز پر پڑی تھی۔

”مجھے کہیں بٹھاؤ گی کہ کھڑے رہنے کا حکم ہے۔“

اس نے جہدی سے ڈیسک کی کرسی باہر نکال دی۔ اب میرے تختے کا نمبٹ تھا۔

”مجھے بتاؤ، کیا تم کس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“

”کوئی خاص چوائس تو نہیں لیکن میں اپنی ماں کی بات ماننا نہیں چاہتی۔“

”یعنی تمہیں فیصل پر اعتراض نہیں۔ اپنی ماں کے انگوٹھے پر غصہ ہے جو تمہیں دہرا ہے۔“

”میری ماں ایسی ہی ہے بانو آپ۔“

”سنو حنا! میں نے آج تک تم سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ تم مجھے اپنی Foster Mother بھی کہتی تھی۔“

ایک فیصلہ میری فرمائش پر کر سکتی ہو؟“

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

”تم فیصل سے شادی کر لو۔ وہ تعلیم یافتہ، شریف الطبع، اچھے کردار کا مالک ہے۔ اگر کہیں باہر شادی کرنا چاہو تو اس سے رابطہ کرنا ہوگا۔ شاید وہ تمہاری سگریٹوں کا بوجھ بھی برداشت نہ کر سکیں۔ میری خاطر حنا۔“

لیے یہ سب میرے سر ہاندھ دو..... کچھ تو میں پروین کو کبھی تختے میں دسے سکوں!“

حنا کی شادی بخیر وعافیت فیصل امام سے ہو گئی۔

فیصل نے شادی کے بعد خانہ خواں میں مبارک ڈیری کھولی اور مبارک دودھ کو مارکیٹ کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد

اس نے خانہ خواں کو نوٹ میں پڑھانے کی کوشش کی۔ حنا خانہ خواں چلی گئی اور بڑے سادہ سے گھر میں نہایت معمولی فرنیچر کے ساتھ متاہل زندگی شروع کی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ان دو کمروں کے گھر میں اس کے پاس صوفے تک نہ تھے۔ حنا نے خالی کھوکھے بچھا کر ان کو تکیوں سے سجایا اور کوئی پردہ لگا دیا۔

لیکن فیصل بنیادی طور پر زمینوں اور سیاست سے وابستہ تھا۔ اس کا دل بزنس کی دلدل میں کبھی نہ چھسے۔

دونوں لاہور آ گئے۔ فیصل امام نے کچھ عرصہ اپنے سر کے کالج Lums میں بھی پڑھانے کی کوشش کی لیکن دل یہاں سے نہیں ہٹا۔ پروین نے حنا کو ایک بہت خوبصورت عالی شان بنگلہ بناوا دیا۔ فیصل نے لاہور کی بے جان گہما گہمی کا حصہ بننے سے

پوشش کی لیکن بے سود۔

وہ اپنے گاؤں میں لوٹ گیا جہاں اس کے پیارے مزارعے، مراٹی، مٹھی چانی کرنے والے ماشیے، کئی تمدوروں پر روٹیاں پکانے والیاں، اندر باہر آنے جانے والوں کا ایک میلہ تھا۔ وہ ایک طرح سے حنا کا رنگ ہر بند بن گیا۔ آیا چند دن رہا اور پھر واپس جہانیاں۔ دونوں نے اس وضع کی شادی سے برضا و رغبت گھومتے کر لیا۔

یوں سمجھیے کہ ہر خوبی مکمل طور پر خوبی نہیں ہوتی۔ اس میں کہیں نہ کہیں سے خرابی ضرور آتی ہے اور ہر خرابی میں یہ صفت ضرور ہوتا ہے کہ کہیں اسی کے اندر سے فلاح اور بہتری کے لیے راستہ جاتا ہے۔ حنا کے چمکے میں نوکری کر لی۔ اب صرف رہنے لگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے نظمیں لکھنے کا وقت بھی زیادہ ملنے لگا۔

فیصل امام کے بڑے بھائی فخر امام اور عابد حسین بڑے فعال سیاستدان ہیں اور عابد جسے ”چندی“ کہتے ہیں، نہ صرف چاند صورت ہے لیکن حنا کی طرح کچھ اندر سے بھولی اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والی ہے۔ اس سے دو چار مرتبہ ملی ہوں اور مجھے تعجب رہا ہے کہ سیاست تو ترقی پذیر مالک میں خزانہ لوگوں کا پروفیشن ہے، پھر عابد یہاں کہاں؟

فخر امام اور عابد کی انتہائی کوشش رہی ہے کہ فیصل ہمہ وقت سیاستدان بن جائے لیکن وہ ابھی زمینوں اور سیاست میں بنا ہوا ہے لیکن حنا کو عجیب طرح سے سکون کا خزانہ مل گیا ہے۔

انسان کو غم تنہائی بہت کچھ عطا کرتا ہے۔ کچھ لوگ اس غم کو اپنے لیے سونا بنا لیتے ہیں۔ کچھ اس آشوب آگہی کو صواب کے حوالے کر کے وقت کو رانیں گزاردیتے ہیں۔ حنا ہولے ہولے اس طرف لوٹنے میں مصروف ہو گئی ہے جو اب کو سکون اور اطمینان دیتا ہے۔ ذکر فکر کی دولت سے مالا مال ہو کر اس کی سوچ بکسیر بدل گئی۔ پہلے چہرے پر ملامت کے برسات تھے، ہولے ہولے ان کی جگہ عجب قسم کی روحانی طراوت نظر آنے لگی۔ نظموں کا رخ بھی بکسیر بدل گیا۔ اسے نہ بھنے والوں کی اکثریت ڈرا سکتی تھی نہ اس بات کی پرواہی تھی کہ پڑھنے والا اس کی نظموں کو پڑھ کر دل سے لگاتا ہے کہ اس میں سچ دیتا ہے۔

اس کے میل جول میں بھی فرق آنے لگا۔ وہ بیکن ہاؤس کی ایسے انجم سے رابطہ بڑھانے لگی جو مغرب میں جا کر آئے اور رسول ﷺ کی تعلیمات کے سپوزیم کر رہی تھی۔ یہاں بھی جب وہ ہوتی تو گپ شپ اور فیصلت سے پرہیز کرتی اور سنی بندی بن کر زندگی بسر کرتی۔

اب یہاں پہنچ کر ایک اور فیصلہ حنا کو کرنا پڑا۔ اس نے جیہاں کے پیچھے بھاگنا، ان کی تجویز میں ماننا یکدم ختم کر دیا اور اپنی کتابیں چھپانے کا عزم کر لیا۔ اب پیکیجز سے اس کی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آ رہی ہیں۔ وہ اپنا اردو کلام بھی چھپانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی ان نظموں پر اسلم کو لسری نظر ثانی کر چکے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اردو قاری ان نظموں کو پتہ کریں گے۔

## محترمہ نصرت بی بی

خاں صاحب کے عقیدت مندوں میں محمد یحییٰ خاں کے بعد نصرت بی بی کا نمبر آتا ہے۔

کچھ لوگ ہمت اور وقار کے ساتھ زندگی سے نبرد آزما ہونے کا طریقہ سلیقہ جانتے ہیں۔ وہ زندگی میں کبھی ہار نہیں مانتے۔ ایسا ہی گھر انہ نصرت بی بی کا ہے لیکن شروع میں میرا یہ خیال نہ تھا۔ ان دنوں میں اس گھرانے سے واقف نہ تھی۔

ایک درمیانی عمر کی خاتون سر پر سفید دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے ڈرائنگ روم میں بیٹھی نظر آتی۔ وہ پیر خانے کے آداب سے بخوبی واقف تھی۔ خاں صاحب کو دل سے اس نے بابا جی سمجھ لیا تھا۔ خاں صاحب ہمیشہ صوفی پر ہوتے تھے نصرت فرسٹ پران کے قدموں میں ڈھیر سی ہوئی لگتی۔ کبھی خاں صاحب کے پاؤں دبا رہی ہوتی۔ کبھی ہاتھ چومتی نظر آتی۔ کبھی آنکھوں سے ان ہاتھوں کو مس کرتی۔ مجھے یہ منظر کبھی سکھ نہ پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ خاں صاحب یوں اپنی آنکھوں کو کرشک اور تکبر کے مرتکب ہوتے ہیں اور پوجا کرنے والے کی انا کو مجروح کرتے ہیں۔ تب مجھے نہ استاد کے مقام کا تصور تھا جو آپ کو جہالت سے نکالتا ہے نہ ڈیروں کی تربیت ہی کی خبر تھی۔

شاید خاں صاحب سمجھتے تھے کہ تصوف محض اللہ کے حضور عاجزی اور انکساری کا درس سکھانے کا کتب خانہ ہے۔ لوگ مرشد کے حضور اپنا آپ عاجزی اور انکساری سے پیش کر کے ماننے والوں میں داخل ہو جاتے ہیں ان کے سامنے کے سامنے اپنا وجود پیش کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی اور اس طرح وہ شرک اور تکبر جیسے ناقابل معافی گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

انسان فرد کے طور پر آزادی کا خواہاں ہے لیکن گروہی اعتبار سے نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گروہ کی تشکیل کے طور پر ہوتی ہے کہ لوگ معاشرے میں رہ کر وہی رنگ پکڑتے ہیں جو وہ دوسروں میں دیکھتے ہیں۔ ڈیروں کی تعلیم کا یہی اہم ہے کہ یہاں ماننے والوں کی خصوصی تربیت کی جاتی ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد مجھے علم ہوا کہ دید اور شنید میں بڑا نقص تھا۔ نصرت عقیدت کے جس مقام پر تھی، وہاں کوئی مسئلہ نہ تھا۔ نصرت بیگم اپنے خاندان کی بھلائی چاہتی تھی اور اسی لیے وہ دعا کے سلسلے میں محتاج تھی۔

کچھ عرصہ بعد جب نصرت بی بی ریٹائرڈ ہوئیں تو خاں صاحب نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس رقم سے گھر خریدیں اور بچوں کو اس پیسے کا علم نہ ہونے دیں کیونکہ بچے اپنی ضرورتوں کا اتنا جال پھیلا دیتے ہیں کہ والدین مجبور ہو جاتے ہیں۔ نصرت کے شوہر نے غالباً ساری عمر کچھ اس کی خاطر خواہ کفالت نہ کی تھی۔ وہ اس سلسلے میں مطمئن نہ تھی۔ اس لیے جب ریٹائر ہوئیں تو انہوں نے بڑی عقلمندی سے خاں صاحب کے مشورے کے مطابق ایک گھر خرید لیا جس میں اپنے بچے بسالیے۔ بی بی نصرت کے سارے بچے ذہین اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایسے گھرانے میں جہاں ذہانت کی صورت میں اچھا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا بڑا اہم ہوتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ چودہ پندرہ لاکھ روپیہ ان ہی الللوں تلووں میں از روئے نصرت بی بی کو خاں صاحب کے مشورے پر چل کر اچھا راستہ مل گیا اور وہ گھونسلے میں اپنے چنگی پوٹوں کے ساتھ

کرتی۔

ہولے ہولے نصرت بیگم کے بچے بھی گھر آنے لگے۔ سب سے بڑی بیٹی رابعہ بے حد ذہین اور شدھ آرٹسٹ تھی۔ N.C.A. میں پڑھ بھی رہی تھی اور پارٹ ٹائم کچھ ٹیچنگ بھی کر رہی تھی۔ جب اشیر خاں نے اپنی ایجنسی Advertising بونا سیرا شروع کی تو اس کے سارے سیٹ رابعہ ہی کے ڈیزائن کیے ہوئے تھے اور دیکھنے والے اس کی اور فن کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے خاں صاحب کے دعائیہ سلوگن ”اللہ آپ کو آسانیاں عطا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے“ اس دعا کی اسے بہت خوبصورت تصویر بنا کر دیں تاکہ وہی جو دیوار صوفے کے پشت پر تھی۔

رابعہ کا شو ہر انجینئر تو اور خانیوال میں رہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ رابعہ خانیوال میں اپنے سسرال میں رہے۔ یہ جانتی تھی کہ لاہور میں اس کو ترقی کے مقامات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اشرف نے زیادہ اصرار نہ کیا اور رابعہ کو نصرت بی بی نے ترمیمی لین میں مکان خرید دیا۔ اب رابعہ ہفتہ یا اتوار ملتان چلی جاتی۔ اب رابعہ لندن میں پی ایچ ڈی کرنے کا سوچ رہی ہے۔ اللہ بہتر کرے۔ اس کی تصویر اب بھی دیوار کی زینت ہے۔ سامنے بیٹھنے والا تو چلا گیا لیکن تصویر ان کی یاد دلاتی ہے۔

نصرت بی بی کی منگھلی بیٹی عائشہ سے جب میں ملی، اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ اس کا شو ہر ٹھیک ٹھاک حیدرآباد میں رہتا تھا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ عائشہ حیدرآباد چل کر بے لیکن ترقی کرنے میں اپنی آزادی کی جو چنگاری سلگتی ہے وہ اسے پابندیوں میں رہنے کا راستہ نہیں دکھاتی۔ بہت منت سماجت کر کے حیدرآباد بھیجا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ اپنے میاں سمیت لاہور آگئی اور ماں کے ساتھ رہنے لگی لیکن اس کے میاں کو کچھ ترقی کے مسائل تھے۔ وہ پھر حیدرآباد چلا گیا اور عائشہ واپس میاں کے پاس رہنے لگی۔

خیر گاڑی چلتی ہی رہتی ہے۔ اونچ نیچ زندگی کے رنگ ہیں۔ اپنی اپنی عقل، فیصلے اور تجویز کے مطابق ہر انسان کے حل تلاش کرتا ہے اور اسی لیے زندگی کی رنگارنگی میں فرق آتا ہے۔ اللہ کا ارتقائی نظام چلتا رہتا ہے۔

تیسری بیٹی سائرہ مظلوم ہے لیکن مظلوم ہوتے ہوئے بھی وہ ہار ماننے والی نہیں۔ پہلے تو سائرہ نے اپنے آپ کو بچوں کے لیے وقف کر دیا لیکن اس کے لیے اس قدر ایثار بوجھ بننے لگا۔ آخر اسے اپنے مستقبل کے لیے بھی کچھ سچا تھا۔ سائرہ تھوڑی سی موٹی ہے اور اسی موٹاپے کو کم کرنے کے لیے وہ اچھرے سے ماڈل ٹاؤن آتی ہے اور وہاں سے تھمیرے پاس آ جاتی ہے۔ اس کی شادی ابھی سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ بھی دعا برکت کے لیے یہاں آتی رہتی ہے۔ اسے بتائیں کہ تیر بہدف دعائیں کرنے والا تو کبھی کارخصت ہو گیا۔

نصرت کے دو بیٹے لندن میں ہیں اور دونوں چھوٹے بھی لندن اڑ جانے کے لیے ”بھرن بھسن“ بیٹھے ہیں۔ سب سے سست ان کی زندگی دیکھ کر ضرور حاصل ہوتا ہے کہ زندگی سے ہارتا وہی ہے جو اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ وہی حیات جاتے ہیں، جو خود اعتمادی اور خوشی سے چلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ واہ نصرت بی بی واہ!

## چہار درویش

داستان سرائے کے لان میں اُگے ہوئے سندری کے درخت پر بھانت بھانت کے پرندے آ کر بیٹھتے۔ کبھی گھونسلے بناتے اور اپنی اپنی مقررہ رُت میں چلے جاتے۔ گو مفتی جی مجھ سے ہمیشہ ناراض ہوتے تھے کہ تم اشترن۔ چھتھنا درخت کہہ کر اس کو بہت زیادہ مان دیتی ہو لیکن یقین جانے کہ وہ واقعی ایک ایسا شاخوں بھرا درخت تھے جن پر پرندے آ کر بیٹھتے، اپنے اپنے حصے کی برکتوں کا چوگا کھاتے اور اڑ جاتے۔ کبھی کبھی ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہوتی۔ پھر کبھی کبھی والے پاہم دوست بن جاتے اور آج ان کے جانے کے بعد بھی ان کا دوستانہ نہیں ٹوٹا۔

مجھے معلوم نہیں کہ چہار درویش علیحدہ علیحدہ اشفاق صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے کہ پہلے سے ان کا دوست تھا۔ میں اس طرح کی کنسولیاں لینے کی عادی نہ تھی۔ گھر کے مددگار لوگوں سے پتہ چتا کہ چاروں جوان خاں صاحب پاس اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔

ایک روز خاں صاحب اندر آئے کہنے لگے۔ ”قدیر! اندر کھانا نہ بھجوانا۔ میں درویشوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔“

میں نے سوچا لمبی لمبی سفید داڑھیوں والے سروں پر ہیر ٹوپیاں پھنسائے، ٹخنوں سے اونچے چوٹے پہنے۔ ایک مدت تک میں اسی مغالطے میں رہی، لیکن ان کا عمل بابوں جیسا ہی تھا لیکن حلیہ یہ نہ تھا۔

وہ چاروں جب بھی آتے خاں صاحب کو ساتھ لے کر باہر کسی طعام گاہ میں چلے جاتے۔ سرور کی گلی اندرون شہر کے کہاب تک، نسبت روڈ کی لگا ٹک چائیں اور کھیر، حلوے، وہی بھلے ان کے علاوہ..... تب ابھی نوے سو سے کاروان نہ ہوا تھا اور نہ میرا خیال ہے یہ لوگ اسے باقاعدگی سے نوازتے۔

یہ چاروں درویش تعلیم یافتہ تربیت شدہ مڈل کلاس کے لوگ تھے۔ ان کی جیبوں میں دولت نہا چھٹی تھی۔ انہیں کھانے کھلانے کا شوق تھا اور غالباً وہ خاں صاحب کو مسکین جان کر ان کی ادائے عاجزی و انکساری کے پیش نظر کھانے باہر مدعو کرتے رہتے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جیسے ان کے پینک اکاؤنٹ مجھے اچانک ملے ویسے ہی یہ عقیدت کا نشانہ میسر آ گیا۔ چہار درویش مجھ سے چھتھنا درخت کی باتیں کرتے۔ داستان سرائے کی خاموشی، اداسی اور بندہ نوازئی کا ذکر کرتے تو دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو جاتا۔

خاں صاحب کے وصال کے بعد میں ان سے پہلی بار ملی تو مجھے حیرت ہوئی نہ کسی کے لمبی داڑھی تھی نہ۔ اور نہ لمبا چوٹہ ہی..... وہ چاروں پروفیسروں کی طرح پینٹ شرٹ پہنتے تھے اور بڑی شستہ زبان بولتے تھے۔ ان کے سردار قدوسی صاحب ہیں۔ میری ایک ہی شرط ہوا کرتی ہے کہ پہلے قدوسی صاحب قدم دھریں اور پھر ان کے درویش۔

میں ان کے ساتھ خاں صاحب کی طرح باہر تو نہیں جاسکتی لیکن وہ اپنی روایت قائم رکھتے ہیں۔ کبھی سمجھ

سب سے کبھی بکٹ کبھی دوسری نعمتیں ان کے ہمراہ ہوتی ہیں۔ میں لاکھ منع کرتی ہوں کہ آپ خاں صاحب کے دھوکے میں مجھے آسمان پر نہ چڑھائیں لیکن وہ پتنگ اڑانے کے شوقین ہیں۔ اڑائے چلے جاتے ہیں۔ وہ پوجا کرنے والے لوگ ہیں۔ انہیں آرتی اتارنے کے لیے بت درکار ہے۔ مجھے ”ماں جی ماں جی“ کہہ کر مرتبے رہتے ہیں۔ برآمدے میں جوتے اتار، دست بستہ میرے سامنے بیٹھتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ عارف دنیا سے لڑکھنڈت ایک خیال خام ہے۔ حسن ظن بھی یہاں کچھ کام نہیں آتا!

## ارشاد مسعود قدوسی

میں (ارشاد مسعود قدوسی) 25 اکتوبر 1959ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اور گریجویٹیشن گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن میں داخلہ لیا اور 1983ء میں بی۔ اے (مارکیٹنگ) کیا۔

فیصل آباد اور لاہور کی مختلف پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازمت اختیار کی جو تا حال جاری ہے۔ اس دوران اپنے ملک پاکستان کے دوسرے شہروں پشاور، اسلام آباد، راولپنڈی، گجرات، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ساہیوال، ملتان، بہاولپور، حیدرآباد اور کراچی میں رہنے کا موقع ملا اور ایک انکیسپورٹ مارکیٹنگ کے سلسلے میں بیرون ملک سنگاپور، کوریا، ہانگ کانگ اور چین کا سفر کرنے کا موقع بھی ملتا رہتا ہے۔ (اللہ کا کرم ہی ہے جس نے مجھے سود کی تعلیم حاصل کرنے اور سودی نظام چھوڑنے سے بچائے رکھا۔)

شادی 1988ء میں ہوئی۔ اللہ کے کرم سے تین بیٹے (انس مسعود، معزز مسعود، طہ مسعود) ہوئے۔ انس مسعود اے لیول کر رہا ہے۔ معزز مسعود ایس ای کر رہا ہے اور طہ مسعود حفظ قرآن کے بعد ساتویں کلاس میں ہے۔ ایک اور کرم کہ پچیس سال میری شریک حیات نے عالمہ کا کورس مکمل اور امتحان پاس کر لیا ہے۔

متوسط سے بھی کم درجے کے گھرانے سے پیدل لاہور آنے والے کے پاس اب اپنا گھر اور کار بھی ہے۔ اللہ نے اسی لاہور میں بابا اشفاق، ماں جی بانو قدسیہ اور بابا عرفان الحق ملائے تاکہ عاقبت بھی سنور جائے اور اس نیکراں ذات پر حق تعالیٰ کے کرم ہی کرم جاری ہیں اور میریاں موجاں ای موجاں۔

## محمد عامر (ڈاکٹر)

میں (محمد عامر) لاہور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم فیصل آباد سے حاصل کی۔ والد مکرم ڈاکٹر محمد ریاض حسین زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ جنوری 1976ء کو ہمراہ فیملی (والدہ چھوٹی ہمشیرہ اور بھائی) اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ میں بسلسلہ تعلیم میٹرک میں لاہور آ گیا۔ F.Sc. لاہور سے کی۔



گرجوی ایشن (B.Sc.) گورنمنٹ کالج فیصل آباد۔ ماسٹر (M.Sc.) زکریا یونیورسٹی ملتان سے کی۔ بعد ازاں ماسٹر ڈگری فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے گریڈ 17 (Class One Officer) سے ملازمت؛ آغاز کیا۔ تاحال دوران ملازمت لاہور، ملتان، اسلام آباد پوسٹنگ رہی۔ اس دوران کچھ عرصہ جاپان بھی قیام رہا، جہاں سے اعلیٰ تعلیمی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

2 دسمبر 1993ء لاہور میں شادی ہوئی۔ بیوی راحیلہ عامر مقامی ہسپتال میں ڈاکٹری (M.B.B.S.) کی ملازمت کرتی ہیں۔ ایک بیٹی انعام عائشہ Convent School میں ساتویں جماعت کی طالبہ ہے۔

ڈاکٹر جہانگیر تمیمی (پنجاب یونیورسٹی) نے باباجی اشفاق صاحب کے پاس بھیجا۔ میری بے چینی کو سکون دے آ گیا۔ طبیعت ٹھہر گئی اور زندگی بسر کرنے کا ایک نیا رخ متعارف ہوا۔ میں باباجی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے شخص کو گنہگار اور ادنیٰ حیثیت والے کو اپنے پاس جگہ دی اور بے پناہ شفقت سے نوازا۔

”ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔“

”جس نے بندے کا شکر ادا نہیں کیا اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا۔“

(اشفاقیت)

## عاصم بخاری

نام: عاصم نذیر بخاری

تاریخ پیدائش: یکم مئی 1959ء

آبائی گاؤں: امیر پور سادات ضلع لودھراں

پیشہ: کاروبار

تعلیم: M.B.A.

شادی شدہ: تین بیٹے (سید غیور احمد۔ سید فرقان احمد۔ سید مداح احمد) ایک بیٹی (سیدہ فاطمہ زہرا)

بڑا بیٹا NUST میں انجینئرنگ کر رہا ہے۔ ایک F.Sc. میں ہے اور دوسرا میٹرک میں۔ بیٹی تیسری کلاس میں ہے۔

ہے۔

بابا کے ساتھ تعلق بہت ہی پرانا۔ سب سے پہلے میں نے انہیں جب میں شاید میٹرک کر رہا تھا، یاد رکھو اور انہوں نے جواب دیا جو کہ آج تک محفوظ ہے اور پھر یہ تعلق آخری وقت تک قائم رہا اور آج تک یہ تعلق قائم ہے۔ زندگی کے سفر میں تمام تر مطلوب رہنمائی، آج بھی اسی طرح میسر ہے جس طرح ان کی حیات میسر تھی۔

## پروفیسر محمد اعجاز چوہدری

میں نے 1989ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اکنامکس سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور اس وقت لاہور کے ایک کالج میں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں اور اب پی ایچ ڈی اکنامکس کے سلسلہ میں تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف ہوں۔

جون 2005ء میں ایک روحانی شخصیت کے حکم سے شادی کے بندھن میں بندھ گیا۔ عالیہ بھی ایک مقامی کالج میں اسلامیات کی ٹیچر ہیں۔ نومبر 2006ء میں اللہ کے فضل سے ایک بیٹا عطا ہوا جس کا نام محمد علی ہے۔

بچپن ہی سے مجھے روحانی شخصیات کا قرب حاصل رہا۔ یہی طبعی رجحان اشفاق صاحب تک لے آیا۔ ان کی مفلووں میں زیر تربیت رہا جس کے سحر سے اب نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ خاں صاحب کی تربیت، محبت، شفقت ان کی کسی بھی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتی۔

میں نے خاں صاحب کو ”زاویہ“ میں جس زاویہ سے دیکھا وہ مجھے ادبی شخصیت سے زیادہ روحانی طور پر قد آور نظر آئے۔ قاری ان کو ادب میں تلاش کرتا ہے اور میں انہیں روحانیت کے مراتب طے کرتے دیکھتا ہوں۔ دین کو سہل سدا میں پیش کرتے اور عملی زندگیوں میں اس کو لاگو کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

خاں صاحب کی ہمہ جہت شخصیت، محبت، مساوات، ہمدردی، ایثار اور آسانی کا جو عملی درس دیتی ہے، اس کا حساس شدت سے پیدا ہوتا ہے کہ ایسی نابزد روزگار شخصیت بظاہر تو ہم میں نہیں ہے مگر اس کی گفتگو ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ خاں صاحب کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ ہر کوئی خواص ہوں یا عوام ان کو اپنا محسوس کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ پیارا اسی سے کرتے ہیں جو ان کے سامنے ہوتا ہے۔

## ڈاکٹر محمد مسعود قریشی

ریاض محمود کہتے ہیں کہ خاں صاحب جانتے تھے کہ انہیں جگر کا کینسر ہے، اسی لیے ڈاکٹر تاج نے جب فاطمہ میموریل ہسپتال میں ان کا آپریشن کیا تو کچھ کیے بغیر واپس ٹانگے لگا دیئے، لیکن خاں صاحب تشویش پھیلانے سے گریز کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی نہ بتایا کہ انہیں جگر کا کینسر ہے، جو ناقابل علاج ہے۔

لیکن ابھی جب آپریشن تک نوبت نہیں آئی تھی، وہ ہومیو پیتھک علاج کرتے تھے اور بڑے پُر امید، مثبت رویے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میں ڈاکٹر صاحب اپنی جادو کی پڑیاں لے کر آیا کرتے۔ ان کا کالج علامہ اقبال روڈ کے قریب محمد نگر میں تھا اور خاں صاحب ان سے ملنے ان کے کالج جایا کرتے تھے۔

ایک بار ڈاکٹر مسعود کے کالج میں بڑے دھڑلے کا فنکشن ہوا جس میں خاں صاحب نے صدارت کی اور مجھ پر شافی مہربانی کے تحت مجھ سے ان طلباء کو ڈگریاں دلوائیں جو 2000ء میں چار سالہ کورس کے بعد پاس ہوئے تھے۔

اب 2007ء ہے۔ خاں صاحب رخصت ہو چکے ہیں، لیکن ڈاکٹر مسعود نے اس گھر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان

کے پوتے ڈاکٹر حامد الیاس مسعود باقاعدگی سے میرا علاج کرتے ہیں۔ میں نے آزمایا ہے کہ جن پر اللہ مہربان ہو۔ خلق کو بھی مکمل مہربانی کے روپ میں بھیج دیتا ہے۔  
شاید آپ مجھ سے مختلف رائے رکھتے ہوں۔

## ڈاکٹر طیب (سروسز ہسپتال)

ہر کام کا آغاز ہمیشہ خاں صاحب کرتے تھے اور پھر اپنے تجربے کو کسی Osmosis کے طریقہ سے مجھ تک منتقل کر دیتے تھے۔ 2000ء کے آغاز میں خاں صاحب بار بار آنکھیں مٹنے لگتے۔ کبھی نینک اتار کر ایک طرف دھردیے سے پڑھنا لکھنا موقوف کر دیتے۔ انہوں نے کبھی اپنی تکلیف کی تشہیر تو کی ہی نہیں تھی۔ ایک روز میں نے پوچھا۔  
”بیوں خاں صاحب! آنکھ میں کچھ تکلیف ہے کیا؟“  
”ہاں قدسیہ! بائیں آنکھ سے دھندلا دھندلا نظر آتا ہے۔“  
”گھر بیٹھے بیٹھے کیسے پتہ چھے گا کہ آنکھ کو کیا ہے؟“  
”ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اتنی خوش فہمی بھی ٹھیک نہیں۔ کل آپ میرے ساتھ سروسز ہسپتال جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔  
”اوجھائی مس تو ابلی..... یہ تیرا کیا سسٹم ہے۔ ادھر کا تا ادھر لے دوڑے۔“ وہ بولے۔  
”بس جی میں تو ایسی ہی ہوں۔ خوشی Play خوشی Play“

دوسری صبح قریب دس بجے ہم سروسز ہسپتال پہنچے۔ سکندر جیسا وفادار ڈرائیور ساتھ تھا۔ وہ انکوٹری سے پوچھ کر تو پتہ چلا کہ آئی ڈی پارٹمنٹ تیسری منزل پر ہے اور اس کے انچارج ڈاکٹر طیب ہیں۔  
ہم دونوں تھو تھو کر کے اوپر پہنچے۔ تیسری منزل پر ڈاکٹر طیب موجود تھے۔  
صاحب رنگت، درمیان قد اور جسیم، دلنشین مسکراہٹ۔ خاں صاحب کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”زہے نصیب، زہے نصیب آئیے۔“  
ان کا جو نیر ڈاکٹر ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب نے کسی جو نیر کو خاں صاحب کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور خود ٹیسٹ لیا۔

”خاں صاحب! بائیں آنکھ فوراً توجہ چاہتی ہے۔ اگر ذرا بھی غفلت کی گئی تو بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔“  
”آپ کا کوئی کینک گلیبرگ میں بھی ہے؟“ خاں صاحب نے کہا۔

”نان ناں! اشفاق صاحب آپ نے وہاں نہیں آنا۔ وہاں کے ڈاکٹر طیب کمرشل ہیں۔ وہ ایویں کچھ گڑبڑ کریں۔“

گئے۔ یہیں ہسپتال میں آئیے۔ پھر سچی بات تو یہ ہے کہ سروسز کا Latest Equipment ہے۔ اس میں Risk کم ہے۔  
دوسرے دن ہم پھر ہسپتال گئے۔ اس آپریشن کے دوران انہیں بیٹا سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہنا پڑا۔

کامیاب ہو گیا اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے انتہائی مشکور لوگ بنے۔ کچھ دن خاں صاحب نے کالی اندھیریاں آنکھوں پر  
باندھے رکھیں۔ پھر نئی عینک لگی۔ ان کی طبیعت کا پوچھنے ڈاکٹر صاحب گھر آتے رہے۔  
لیکن ڈاکٹر طیب کی اصلی مروت خاں صاحب کے جانے کے بعد کھلی۔

آپ کو میں کئی بار بتا چکی ہوں کہ مجھے خاں صاحب کی نقل کی عادت تھی۔ جو کچھ وہ کرتے مجھ پر لازم ہو جاتا کہ میں  
بھی کروں۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد میری دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔ میں نے دونوں بچوں کو نہ بتایا اور چوری  
چھپی سروسر ہسپتال پہنچی۔ وہی تیسری منزل پر تیسرا کمرہ۔ مجھ سے دیکھ کر ایک جونیئر ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنا چاہا لیکن اچانک کہیں  
سے ڈاکٹر طیب آ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے جونیئر ڈاکٹر منع کر دیا اور خود معائنہ کرنے مشین کے پیچھے گئے۔  
”آپا کیا کیا جائے کہ آنکھیں تو دونوں خراب ہیں لیکن آپریشن باری باری ہوگا۔ لکھنے والے کی نظر کام نہ کرے  
یہ تو واقعی ظلم ہے لیکن یہی زندگی ہے۔ اس کی کوئی منطق نہیں نہ کسی کو اس کی کل ہی سمجھ سکتا ہے۔ آپ بروقت پہنچ  
جائیے گا۔ میں جو کچھ کر سکوں گا ضرور کروں گا۔“

مقررہ وقت پر انیس اور اشیر میرے ساتھ گئے۔ سب کو سفید کوٹ پہنا دیئے گئے۔ ماسک لگائے گئے۔ مجھے  
مریض کے بستر پر نٹا دیا گیا اور ڈاکٹر طیب نے بڑی پریت سے کامیاب آپریشن کر دیا۔ کارنیا کا لنز بدل دیا گیا۔ مجھ پر  
دواؤں کے علاوہ کوئی بو جھنڈ تھا۔ ان کا خرچہ بھی نہ جانے کس بیٹے نے دیا، مجھے علم نہیں۔

بس کیا کیا جائے۔ زندگی کے جھمبوں نے مجھے فرصت نہ دی کہ میں دوسری آنکھ کا آپریشن کرواؤں۔ مجھے مجبور کرنے  
کے لیے دونوں بینوں نے ایک روز اصرار کیا کہ اب بہت دیر ہو گئی۔ آپ پلیز ہمت کر کے دوسری آنکھ کا آپریشن کروالیں۔ ہو سکتا  
ہے تاخیر سے کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔ ایسا چونکہ امریکہ میں تھے، اس لیے وہ فون پر بڑی لجاجت سے مناتے رہے۔

میں ان کی خوشی کی خاطر سروسر گئی۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر طیب ایک عرصہ سے چھٹی پر ہیں۔ ان کے کلینک پہنچی تو  
کلینک پر تالہ پڑا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہو گئی کہ شاید ڈاکٹر صاحب بیمار ہیں اراسی لیے چھٹی پر ہیں۔  
گھر ڈھونڈ کر پہنچی تو گھر پر بھی تالہ پڑا تھا۔ ایک مظلوک الحال چوکیدار باہر بیٹھا تھا۔  
”بھائی ڈاکٹر صاحب جہاں ہیں؟“

”وہ تو بی بی جی دوستی چلے گئے۔ یہاں تو نہیں آئے دو مہینے سے۔“

چلیے دوہنی والوں کی قسمت کھلی۔

اب 2007ء ہے۔ دوسری آنکھ کا آپریشن ابھی نہیں ہوا۔ سوچتی ہوں کہ آپریشن کراؤں یا یونہی چھوڑ دوں۔

شہید حسن خاتمہ قریب ہو۔

## ڈاکٹر شاہد محمود

ڈاکٹر راشد لطیف کے ہسپتال میں ایک میرے محسن ڈاکٹر شاہد محمود بھی ہیں۔ میں شوگر کے ٹیسٹ لے کر ہسپتال

پہنچی تو مجھے ڈاکٹر راشد لطیف نے شاہد محمود صاحب کی طرف ریفر کر دیا۔

میں ہسپتال سے ذرا پیچھے فرٹیلیٹی کے سیکشن سے پہلے جہاں کاریں پارک ہوتی ہیں، ڈاکٹر شاہد محمود کا دفتر ہے۔ کچھ میٹر حیاں اوپر چڑھ کر بائیں ہاتھ ایک بڑا سا وینٹنگ روم ہے۔ میں یہاں پہنچی تو ایک نوجوان ڈاکٹر مجھے وینٹنگ روم میں لے گیا۔ ابھی چند منٹ نہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب خود آئے اور آ پا پا کہہ کر مجھے اپنے آفس میں لے گئے۔ اس آفس کے دو حصے ہیں۔ سامنے وہ حصہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب مریض سے ملتے ہیں۔ دیوار پر ان کی ڈگریاں لٹکی ہوئی ہیں۔ پیچھے ان کا معائنہ کرنے والا چھوٹا سا کمرہ ہے، جس میں بلڈ پریشر جاننے اور دیکھنے کے لیے مریض کے لیے ایک اونچا سر بیڈ ہے۔

میرا ہاتھ پکڑ کر جب وہ اپنے آفس میں پہنچے تو یہاں دو تین مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے ڈاکٹر صاحب نے بڑی بلجاست سے کہا۔ ”معاف کیجیے میرا اصول ہے کہ میں مریض کو باری باری دیکھتا ہوں لیکن اب مجبوری ہے، جگت آگئی ہیں۔“

اس کے بعد وہ مجھے اندر والے کمرے میں لے گئے۔ مریض کا بیڈ اونچا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر چڑھایا۔ نرس کو اشارے سے منع کیا اور خود میرا بلڈ پریشر لیا۔

اب میرا معمول ہے۔ میں دوسرے دوسرے ماہ ان کو ملتی ہوں۔ ان کی مریت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

## ڈاکٹر احمد خاں

یہ بات کچھ کشف سے تعلق رکھتی ہے اور کچھ ہومیوپیتھک علاج سے۔ جس وقت میری والدہ ملتان میں تھیں آف سکلوز تھیں، ان دنوں وہاں ڈاکٹر احمد خاں بھی ہوتے تھے۔ جب مجھے ٹائیفائیڈ بخار چڑھا تو ڈاکٹر صاحب میرا علاج ہومیوپیتھک قطروں سے کیا کرتے تھے۔

پھر نومبر 121ء میں آگئے۔ ہمیں پرانے محسن مددگار مجبول گئے۔ ایک روز صبح سویرے کھنٹی بجی۔ برآمدے کے پاس نیچے ڈاکٹر احمد خاں کھڑے تھے۔ میں بکا بکا رو گئی۔

”آپ..... آپ یہاں ڈاکٹر صاحب!“

”بھائی یہ بتاؤ گھر میں کون بیمار ہے؟“

”آپ کو کیسے پتہ چلا؟“

”رات مجھے خواب میں آ پاذا کرہ نے بتایا کہ میرے گھر جائیے وہاں کوئی بہت بیمار ہے۔“

”اندر تو آئیے۔“

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مریض چھوڑ کر آیا ہوں۔“

”میں ڈاکٹر ہوں۔ شاید کچھ میں مدد کر سکوں۔“

”ضرور آ جائیے۔“

وہ اپنا ڈاکٹری بیگ اٹھائے برآمدے میں چلنے لگے۔

”میرا ایک اور بھی تعارف ہے۔“

”جی فرمائیے۔“

”آپ کے مرزا عبدالرزاق کا میں بھتیجا ہوں۔“

لیجے خیال حقیقت میں بدن گیا۔ ڈاکٹر عاطف سے اب ملنا کسی تکلف کا حامل نہ تھا۔ میں انہیں کسی فارمیسی کے

بغیر خاں صاحب کے بیڈروم میں لے گئی۔

خاں صاحب، عاطف کو دیکھ کر نبال ہو گئے۔

”قد سید! عاطف کو تہوہ پلاؤ۔ یہ گھر اندھ تو کھانے پینے کا شوقین ہے۔“

لیجے پہلی ہی ملاقات میں عطف اور خاں صاحب کی دوستی ہو گئی۔ پتہ چلا وہ پروفیشنل آدمی ضرور ہیں۔

دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ شریعت کے پابند اور روحانیت کے قائل بھی ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد پتہ چلا کہ عاطف کی بیگم صاحبہ بھی ڈاکٹر ہیں اور اندرون شہر کسی کلینک پر کام کرتی ہیں۔

یہ انفریشن تازہ تھی کہ مجھے علم ہوا کہ بیگم عاطف مرزا نے کرشن گمر کا کلینک چھوڑ دیا ہے اور فرحت ہاشمی کی بیروکار بھی ہیں۔

حجاب اوڑھ لیا اور اب وہ ایک ایسا مکتب چلاتی ہیں جس میں گھریلو پردہ دار عورتوں کو فرحت ہاشمی کی تعلیم عنایت کرتی ہیں۔

زندگی عجب طور پر چلتی ہے۔ جو شخص ہر وقت خاں صاحب کے پاس آجاتا تھا اور میری تشفی کا باعث بنتا تھا۔

7 ستمبر کو جب خاں صاحب اس دنیا سے جانے والے تھے، میں نے قریباً آٹھ بجے صبح عاطف کو فون کیا۔

”عاطف..... ڈاکٹر صاحب! خاں صاحب کی طبیعت ذرا زیادہ خراب ہے۔ آپ پلیز آ جائیں۔ مجھے کچھ

آ رہی، میں کیا کروں؟“

”میں ضرور آ جاتا لیکن میں تو ایئر پورٹ جا رہا ہوں اور بالکل ایئر پورٹ سے قریب ہوں۔“

خاں صاحب کے جانے کے بعد میں ان کی بیگم سے ملی۔ جس طرح کی عورت ان کے ساتھ تھی ویسی ہی تھی۔

جب عاطف مرزا کے والد فوت ہوئے۔ ان کے قتل کی اطلاع ملی۔ میں ان کے گھر گئی۔ میں نے ان کو

نئے روپ میں دیکھا۔ وہ بڑی اعجازی اور انکساری کے ساتھ شرعی انداز میں مہمانوں کی دیکھ بھال کرنے میں مشغول تھی۔

اب میری بیماری کا دور دورہ ہے۔ ڈاکٹر عاطف مرزا بڑے تواتر کے ساتھ اسی پرانے انداز میں بیگم صاحبہ

آتے ہیں۔ جہاں بٹھاؤ بیٹھ جاتے ہیں۔ میرے نسخے دیکھ کر دواؤں میں اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔ دو تین مرتبہ دوا

ساتھ لائے ہیں، لیکن عاطف مرزا ان لوگوں میں سے نہیں جو واقفیت کو بے تکلفی کا بہانہ بنا لیں۔ بہت جی چاہتا ہے

ان کے لیے کچھ مثبت کروں لیکن انسان اپنی خواہش کو ہمیشہ پورا بھی تو نہیں کر پاتا۔

## ڈاکٹر اکرم زبیر

کچھ لوگ خوش نصیب ایسے ہیں جو بیمار پڑتے ہیں تو ڈاکٹر آگے بڑھ کر مسیحا کا روپ دھار لیتے ہیں اور کچھ نصیب ڈاکٹروں کو چنگل سمجھتے ہیں۔ کچھ کو غلط Anesthesia کا ٹیکہ لگ جاتا ہے اور مریض آپریشن تھیٹر میں ہی دم توڑ رہے ہیں۔ کبھی غلط آپریشن، کبھی پیرامیڈیکل سٹاف کی غفلت..... یہ سب یقیناً ہم سب کے ساتھ ہے۔ کچھ ڈاکٹروں پر ختم کرتے ہیں۔ انہیں رسوا کرنے میں وقت گزارتے ہیں۔

کچھ حضرات کو ڈاکٹر ملتے ہی گھر والے بھی بھول بھال جاتے ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ تو امیر غریب کا پتھر بھی ہے۔ سوسائٹی کے وی آئی پی کو اور طرح کا رویہ ملتا ہے اور کچھ بے نوا روتے پٹیتے ہسپتالوں سے رخصت ہوتے ہیں اور بسا بہت قرض کی لعنت میں بھی پھنس جاتے ہیں، لیکن اس ساری اونچ نیچ میں ایک فیکٹر غریبی بھی ہے۔ جہاں امداد نہیں اور تھکنے کی رحمت آپہنچتی ہے وہاں سارا تفرقہ منٹ جاتا ہے اور کسی کسی بے نوا کو وی آئی پی کا سلوک مل جاتا ہے اور کسی مرتبہ ہمارے وی آئی پی ہسپتال ہی بدستارہ جاتا ہے۔ کبھی لندن، کبھی امریکہ، کبھی یورپ۔

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے رنگ رنگ کی بیماری نے گھیرا لیکن مجھ پر ڈاکٹر صاحبان ہمیشہ مہربان رہے۔ جب میں بلڈ کیمنر کے مرض میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال پہنچی تو ہماری کسی سے میو ہسپتال میں جان پہچان نہ تھی۔ مجھے ہر روز ایک بوتل خون کی لگتی تھی لیکن دوسری صبح بلڈ کاؤنٹ پھر گر کر خطرے کی گھنٹی بجانے لگتا تھا۔

ان دنوں صبح عین نو بجے ڈاکٹر اکرم زبیر ہولے سے میرا دروازہ کھٹکھٹاتے اور چپ چاپ پلنگ کے ساتھ گئی کرتی پر بیٹھ جاتے۔ عموماً دن کے وقت اشیر خاں یا انیق میرے پاس ہوتے۔ رات کو خاں صاحب خود میرے پاس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زبیر ہارٹ پیسٹلسٹ تھے۔ ان کا کیمنر سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ان کی باقاعدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب مشتاق یوسفی صاحب کی مہربانی سے یہ ملے ہوا کہ ہم لندن چلے جائیں گے اور میں گھر آگئی تو ڈاکٹر زبیر میری طبیعت کا پوچھنے داستان سرانے آتے رہے اور جب خاں صاحب دل کے مریض ہو گئے تو ہم ڈاکٹر زبیر کے کلینک پر باقاعدگی سے جاتے۔ ڈاکٹر زبیر کو اطلاع ملتی تو وہ فوراً ہمیں اپنے آفس میں بلاتے، بڑی توجہ سے خاں صاحب کو چیک کرتے اور سسٹر سے کہتے ”ان کا ای سی جی میں خود کروں گا۔“

ڈاکٹر اکرم زبیر اتنے چپ چاپ آدمی تھے کہ شبہ ہوتا کہ گوگے ہیں۔ پر ان کے چہرے کی ملامت بتاتی رہتی کہ وہ پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔ پھر نہ جانے کیسے ان کی بیگم میری گرویدہ ہو گئی۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد وہ بڑی محبت سے مجھے ملنے آتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو مجھے حیران کرنے کو کافی تھے لیکن ان کی بیگم کی محبت نے تو واقعی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے۔

## ڈاکٹر جاوید شیخ

مجھے معلوم نہیں ڈاکٹر جاوید شیخ کب خاں صاحب سے ملے، کب ان سے متعارف ہوئے اور ان دنوں کے

مابین محبت کا کیا رشتہ تھا لیکن جب میں بلڈ کیمنر کے مرض میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال پہنچی تو خاں صاحب کو مشاق احمد یوسفی نے فون کر کے کہا "اشفاق صاحب میں B.C.C.I. بینک کی طرف سے بول رہا ہوں۔ یہاں کے چیئر مین برنی صاحب آپ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ بانو قدسیہ کو اپنی ملکیت نہ سمجھیں۔ وہ قومی سرمایہ ہیں۔ ہم یہاں لندن میں ان کا علاج نہ کریں۔ ہسپتال میں کرائیں گے۔ یہاں ڈاکٹر شارپ ایک بہت ماہر ڈاکٹر ہیں۔ وہ ہی ان کے بلڈسٹ لیں گے۔ آپ میو ہسپتال کی رپورٹ ساتھ لے کر آئیں۔ آپ کو نہ قیام نہ طعام کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

یہ تو ایک دوسری کہانی ہے لیکن سفر سے پہلے پڑاؤ پر لندن ایئر پورٹ پر ہمیں جو شخص دوسری مرتبہ ملے وہ جاوید تھے۔ پہلی بار تو ہم یوسفی صاحب کے مہمان تھے لیکن اس دوسری بار ہمارے میزبان ڈاکٹر صاحب نکلے۔ وہ اپنی بیٹی مرسیڈیز لے کر موجود تھے۔ ہم ان کے ساتھ گھر پہنچے۔ لندن کی بھیڑ بھار سے دور ڈاکٹر جاوید کا گھر تھا۔ باغوں سے گھر خاموشی کی ردا اوڑھے۔ انہوں نے ہمیں اوپر والی منزلی میں کمرہ دیا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا سٹنگ روم بھی تھا۔

ان کی دوسری بیگم حسینہ قریب ہی کاؤنٹی کے ہسپتال میں کام کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی چھ سالہ بیٹی فاطمہ پر موجود ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب لندن کے کسی ہسپتال میں کام کرتے تھے۔ ان دنوں کا معمول تھا کہ باری باری ایک جگہ پر فاطمہ کے پاس رہتا اور ایک بندہ ہسپتال میں مریضوں کو دیکھتا لیکن جونہی ہم گھر کا فرد بنے فاطمہ نے ہمیں دادا دینا شروع کر دیا۔ ہم بھی اس میں خوب مصروف رہے اور نئی جگہ کی اجنبیت ہمیں محسوس نہ ہوتی۔ ہسپتال کے چکر بھی دینا شروع دیتے۔ ڈاکٹر شارپ کے پاس بھی وہی ڈیوٹی دیتے۔ اتنی اپنائیت سے انہوں نے ہماری دعوت کی جس میں لندن کے ادیبوں کو اکٹھا کیا۔ اگر ڈاکٹر جاوید نہ ہوتے تو یہ ملاقات ممکن نہ ہوتی۔

اب 2007ء میں جب وہ مجھے منے آئے تو فاطمہ کو دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اتنا وقت کتنی جلدی گزری تھی۔ عجیب رابطہ تھا کہ اس پر اجنبیت کی ذرہ نہ چھوڑا تھا۔

## ڈاکٹر راشد لطیف

جب میں لندن سے واپس لوٹی اور ڈاکٹر شارپ نے یہ طے کر دیا کہ مجھے بلڈ لوکیمیہ ہے اور لاہور کے ڈاکٹر کی تشخیص درست ہے تو معلوم نہیں کیسے ڈاکٹر راشد لطیف کو پتہ چل گیا۔ وہ خاں صاحب کو بہت پہلے سے جانتے تھے۔ مجھے از خود ملے اور گفتیش کی کہ بلڈ کیمنر کسی طور پر لہو سے نکلنے والی بیماری نہیں اور میں فوراً راشد لطیف ہسپتال پہنچوں۔ یہاں جب ہم دونوں پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں نے ٹیسٹ لیے اور پتہ چلا کہ کیمنر چوری چوری Leis tacleoy میں جا بیٹھا ہے۔ اب Leis tacleoy کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

مقررہ وقت پر خاں صاحب، ٹویلد اور میں راشد ہسپتال پہنچے۔ مجھے تیار کر کے جب اندر لے گئے تو ڈاکٹر صاحب ماسک اور کوٹ پہنا کر ساتھ لے گئے۔ اتنے بڑے آپریشن کا ڈاکٹر صاحب کم از کم ڈیڑھ لاکھ وصول کیا کرتے تھے۔ خاں صاحب سے انہوں نے ایک پائی بھی نہ لی۔



اس کے بعد ابھی پانچ چھ دن گزرے تھے کہ صبح دس بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ میں شفا کی آرزو کے ساتھ شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ میرا حال چال پوچھا۔ حوصلہ دیا اور ہمت بڑھائی۔ میں نے کہا..... ”ڈاکٹر صاحب آپ نے بہت سچل کی۔ اتنی مصروفیت کے باوجود چلے آئے۔“ آہستہ سے بولے..... ”آپ کہہ کر تو آنا ہی پڑتا ہے۔ کیا کریں مجبوری ہے۔“

راشد لطیف ہسپتال کے بائیس ہاتھ فریٹیٹی سنٹر ہے اور اس کے عقب میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ ہے۔ ابھی تو وہ دن نہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی اہلیہ طلعت کو لے کر میری طبیعت کا پوچھنے آ گئے۔ اب تک ان کی مروت کا یہ حال ہے کہ میں اگر کبھی ہسپتال جا پہنچوں تو وہ بہ نفس نفیس مجھ تک آ پہنچتے ہیں۔ کسی کے علاج کی سفارش کر دوں تو وہ بغیر پھارج لیے اس کا علاج بھی کر دیتے ہیں۔ اب بتائیے اس مادی عہد میں ایسی مروت کی کس کو فرصت یا ضرورت ہے۔

دراز قد، ذہین چہرہ، مضبوط کاٹھی، پر اعتماد رویہ اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر اپنے پروفیشن میں ہی بے مثال نہیں، ساتھ ساتھ بیمار لوگوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔

## منی، ثنیہ، علی، ہاروی

اب مجھے ٹھیک طور سے یاد نہیں آ رہا کہ منی ہماری زندگی کا حصہ کیونکر بنی۔ ہر ادھوری انفرمیشن چونکہ مجھے یا تو خود سنتے کرنا پڑتی تھی یا خاں صاحب کے اکاؤنٹوں اور ریکارڈس سے مل جاتی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ خاں صاحب کچھ میرے زادیوں کے ایک گروپ کا بڑا فعال حصہ بن چکے ہیں۔ یہ خواتین اللہ کی رحمتوں برکتوں سے کثیر رزق پر دسترس رکھتی تھیں۔ ان کے شوہر اس قدر مصروف تھے کہ ان کے پاس خواتین کی مجلس زندگی کے لیے قطعی وقت نہ تھا۔

ان چھ سات خواتین سے منی نے خاں صاحب کو متعارف کرایا۔ جس طرح امیر لوگ قوالوں کو بلا کر یا موسیقار کو گھر مدعو کر کے اپنی محفل سجاتے تھے اس طرح کبھی کبھار کسی ایسے مقرر کو بھی ذاتیہ بدلنے کے لیے بلا لیا جاتا جو انہیں دین، روحانیت اور صوفی ازم کی باتوں سے محظوظ کرتے۔ ابھی ایسی محفلوں کا رواج عام نہ تھا۔ ابھی یہ وی دی آئی پی کی دل لگی تھی۔ پھر ہولے ہولے معمول کے مطابق یہ فیشن بھی اوپر والے طبقے سے سرایت کرتا ڈل کلاس میں پہنچا اور غریب طبقہ تو پہلے ہی مزاروں، خانقاہوں، سجادہ نشینوں، ڈیروں پر حاضری دینے کے عادی تھے اور ان کی اس عقیدت کو امراء جہالت سے تعبیر کرتے تھے۔

غالباً منی اس گروہ میں خاں صاحب سے پہلے داخل ہوئی۔ وہ ان دنوں باغ جناح کے سامنے کسی بلڈنگ میں رہتی تھی۔ نسیم کے شوہر سعود یہ ایئر لائنز میں اپریٹر کے چیف تھے۔ اسی پوزیشن کے دھکے سے نسیم بانو کا ہر دروازہ کھل جاتا تھا۔ منی کے شوہر فضل زیادہ وقت جدہ میں رہتے تھے جہاں وہ سعود یہ ایئر لائنز کے Marketing & Agreements کے ڈائریکٹر تھے اور وہاں بڑی تنہی اور توجہ سے کام کرنا پڑتا۔

ان دعوتوں کا معمول تھا کہ پُر تکلف کھانے کے بعد خاں صاحب اس اندر سجا میں پیر بادشاہ بن کر بیٹھ جاتے۔

پہلے تھوڑا سا لکچر خاں صاحب اپنی مرضی کے مطابق سامعین کی نذر کرتے پھر سوال جواب شروع ہو جاتے۔ اس کے بعد چائے کا ذور چلتا۔ دنیا داری کی باتیں ہوتیں۔ مزاج کی چاشنی چلتی۔ میں ان مظلوموں میں کبھی شریک نہ ہوتی۔

ایک روز خاں صاحب میرے پاس یہ کہنے آئے ”کچھ وقت ہو تو میری بات سن لو۔“

میں کام کاج چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہوئی ”جی؟“

”بات یہ ہے کہ کل دوپہر کے کھانے پر کچھ مہمان خواتین آئیں گی۔ وہ بہت اعلیٰ کھانوں کی عادی ہیں جسے

انہیں ڈیروں پر کھانے کا کوئی تجربہ نہیں۔ ہمارا داستان سرائے ماں آدر میں تو آٹھ نہیں، صرف ہمارے کھانے بہت سادہ ہیں۔“

”جی تو میں بازار سے فیے کے نان، نکلے مٹکوں لوں گی۔“

”ناں بھائی نان! ایسا ظلم نہ کرنا۔ وہ بازاری چیزیں نہیں کھتیں۔ ان کے گلے خراب ہو جاتے ہیں۔ انہیں

فوڈ پوائزنگ ہو جاتی ہے۔“

”تو پھر تو..... جی..... مشکل ہے۔ میں تو سادہ سادہ کھانے جانتی ہوں۔“

”بس چلاؤ! آلو کا شوربہ ذرا لیں، لیکن ایک شرط ہے۔“

”جی وہ کیا؟“

”تم کھانا خود پکاؤ گی..... جیونی بہن صرف پرانے بنائے گی۔“

جیونی بہن جو مجھ سے بہتر پکاتی تھی اور پکاتی ہے لیکن خاں صاحب کے ٹیبلے کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

ان خواتین کا مجھ پر ہن دیکھے ہی زعب پڑ گیا۔ کالا لہیا میزڈرائنگ روم میں دروازہ کھلتے ہی لگایا گیا۔

حسب توفیق برتن سجائے گئے۔ ان دنوں میرے پاس تاجدار اور رفیق ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مہمانوں کا دھیان دیا۔

میں اندر نہیں گئی۔ سنا ہے عورتوں نے آلو گوشت کی بہت تعریف کی۔ باقی سب سے تو میرا تعارف نہ ہو سکا لیکن

آگئی اور مجھ سے یوں بانی گویا برسوں کی سکھی پہنچی ہو۔

”بانو آپا! یہ آلو گوشت کیسے بنایا ہے۔ سب ٹو ہو گئی ہیں۔ ہم نے تو ایسا آلو گوشت نہ کبھی کھایا نہ پکایا۔“

میں نے سخی میں آ کر ترکیب تفصیل سے بتائی اور تب سے اب تک اس زعم میں ہمتا ہوں کہ ہمارے گھر میں

آلو گوشت کا شوربہ پکتا ہے وہ بالکل لاٹانی ہے۔

نعنی اس طرح خاں صاحب سے سرکتی سرکتی میری اور بچوں کی دوست بن گئی۔ اس کے علاوہ نسرین آفتاب مجھے

میری واقف بن گئی۔ نسرین امیر خواتین کی طرح بے مصرف زندگی گزارتے گزارتے اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ ایشیا

کو اطمینان یا سکون نہیں بخش سکتیں۔ وہ خوشی ضرور عطا کرتی ہیں لیکن یہ خوشی دیر پا نہیں ہوتی۔ جیسے کسی اچھی دوست

سفر و قیام۔ انسان چاہے لاکھ آرام سے عیش سے کسی جگہ قیام کرے لیکن اول و آخر گھر کی یاد ستانے لگتی ہے۔

نعنی ہمارے اور بھی قریب آگئی! جب فضلی نے اُسے ماؤل ناؤن میں گھر خرید دیا۔ علی اور شہیہ بڑی کلاس

ہوئے تھے اور فضلی انہیں اکھاڑ کر جدہ میں نئے سکولوں کے تجربے سے گزارنا نہ چاہتا تھا۔

اب ہمارے گھر میں ایک نیارنگ ابھرا۔ نوجوانوں میں دوستی ہوگئی اور اس میں وہ سارا جذبہ گوندھ دیا گیا جو نوجوانوں کی بلوغت کے عہد کا طرہ امتیاز ہے۔ چھٹی ڈالنا ہوئی چھٹی ڈال لی۔ لڑائی پر آمادہ ہوئے تو لڑائی کرنی لیکن رہے ہمیشہ آگے۔ اس دوستی میں بیڈمنٹن کورٹ نے بہت فائدہ پہنچایا۔

گھر کے سامنے عین کالے پھاٹک کے پیچھے دو گانا ڈسکواڈ مسابقت اور برتری جتانے کے لیے کورٹ بنایا گیا۔ اس میں وہ بے کے ڈنڈے گاڑے گئے اور ٹٹ لگایا گیا۔ ٹٹل کاک اور خوبصورت ریٹ بھی آئے۔ نہ جانے بچوں نے خود پیسے جمع کیے یا پھر کسی نے ان کی بے بسی کو سہارا دیا۔ بہر کیف ہر شام کھیل جاری رہنے لگا۔ اشیر احمد طبعاً کھلاڑی تھا۔ وہ کوئی کھیل کھیل کر کھیلے اس میں سائل اور چنگلی خدا داد صلاحیت کے باعث جلد پیدا ہو جاتی ہے۔

شام کو نینی اپنے دونوں بچوں سمیت ہمارے گھر آ جاتی۔ بیڈمنٹن چلتی۔ خوب شور و غوغا مچتا۔ ایک مرتبہ انیسویں سے کھیتے کھیتے جھگڑ پڑے اور آگے بڑھ کر اشیر کا ریٹ توڑ دیا۔ بعد میں بہت دھچکتائے اور اشیر سے چھٹی ڈال لی۔ ثنیہ اور سہیل کو کھلاڑی تھیں لیکن ان کی کھیل کوزے کے سنبھال لیتے۔

اس سیم بازی کے بعد ہم ان سب کو پانی اور شربت پیش کر دیتے۔ وہ لوگ شاذ ہی ہمارے گھر کھانا کھاتے تھے۔ کھانے کے وقت سے پہلے ہی سب تتر بتر ہو جاتے۔

انیس کی شادی ہو چکی تھی۔ دو دونوں عام طور پر سسرال چلے جاتے۔ اشیر ان دنوں پرائیویٹ ایف اے کی تیاری کر رہا تھا۔ غزال کی چھوٹی بہن صبا نے اشیر کو سوشل سٹڈیز پڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ اوپر لاہوری میں بیٹھ کر یہ دونوں پڑھتے رہتے۔ یہاں سے ایک اور اچھن پیدا ہوئی۔ ثنیہ اور صبا دونوں اشیر پر منتہنت تھیں۔ نینی اور فضلی بھی اس بات کے خواہشمند تھے کہ ثنیہ کسی طرح ہمارے گھر کی بہو بنے لیکن اشیر اور صبا وعدے وعید تک پہنچ گئے اور ثنیہ والا معاملہ ٹکٹا رہ گیا۔

لیکن بچوں کے معاملات کا ہم بڑوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نینی جب نہ تب۔ مزے دار کھانے پکا کر لاتی اور خاں صاحب جو نعمتوں کو دست بستہ قبول کرنے کے عادی تھے بڑے خضوع و خشوع اور رعبت سے انہیں کھاتے۔ نینی کی سہیلیوں کے طفیل علی اور اشیر میں بڑی دوستی ہوگئی۔ جب بھی نینی کو جدہ کا سفر درپیش ہوتا وہ ثنیہ کو تو ساتھ لے جاتی لیکن علی کے لیے پاس رہ جاتا۔

اشیر اور علی دونوں شہاب بھائی والے کاسنی کمرے میں اکٹھے ایک رضائی میں سوتے ایک تھالی سے کھاتے ایک کون سے پیتے۔ اسی نینی کے طفیل اس کے دونوں بھائی بھی ہمارے گھر کا حصہ بن گئے۔ نینی کے بھائی امجد اور نغمہ بڑے محسن محبت والے تھے۔ نغمہ کھانے پکانے کی ماہر تھی۔ یہ دونوں تب جدہ میں رہتے تھے۔ جب ہم دونوں پہلی بار عمرہ کرنے گئے تو جدہ میں ان ہی کے پاس ٹھہرے۔ نینی کے بڑے بھائی آفتاب امریکہ میں رہتے تھے۔ جب بھی لاہور آتے خاں صاحب سے ملنے ضرور آتے۔

نینی کا خاندان ٹڈل کلاس تھا۔ ان میں مشرقی اقدار تھیں۔ ہائی سوسائٹی میں گھسنے کے لیے نینی کے پاس رسورٹی اور فضلی کا پاسپورٹ تھا۔ وہ اس پاسپورٹ کو استعمال کر کے وی وی آئی پی تو ضرور بن گئی لیکن اس میں ایک عجیب

قسم کی عاجزی اور انکساری تھی جس نے اُسے کبھی زمینی حقیقتوں سے جدا نہ کیا۔

جب کبھی بچوں کو چھٹیاں ہوتیں یعنی ان کو تفریح کی غرض سے کہیں نہ کہیں لے جاتی۔ فضلی ٹکٹ اور شہر بندوبست کر دیتے اور یہ تینوں ہتے کھیلتے روانہ ہو جاتے۔

ایسے ہی ایک سفر کی داستان سنئے۔

نئی دونوں بچوں سمیت ممبئی گئی اور وہاں تاج محل ہوٹل میں ٹھہری۔ اس ہوٹل سے کچھ ہی قریب اُن دنوں کا ہارٹ بیٹ دھر میندر رہتا تھا۔ وہ عام طور پر تاج محل میں جا کر اپنے پانکھوں (fans) کو درشن دیتا۔ اُن کے ساتھ بیٹا پیتا کھانا پینا ہوتا۔ ان ہی جھرو کے درشنوں کے دوران یعنی اور اُس کے بچے دھر میندر کے بہت قریب آ گئے۔

ثنیہ فلور پر اُس کے ساتھ ناچنے لگی تو تمام تماشاخی گھیرا ڈال کر اُن دونوں کا ناچ دیکھنے لگے۔ اور ثنیہ میں خود ستائی اور خود اعتمادی کا بیج بویا گیا۔ دھر میندر نے اُنہیں اپنے گھر مدعو کیا اور اس گھر یلو دعوت نے جھرو دلوں میں اپنی بڑائی مستحکم کر دی۔ وہ اپنے آپ کو خاص اور special سمجھنے لگے۔

اور اسی خود اعتمادی کے ساتھ جب واپس لوٹے اور اترائے اترائے ہمیں ملنے آئے تو خاں صاحب نے کہا کہ یہ سفر ان بچوں کے حق میں نہیں تھا۔ دونوں بچے اپنی پڑھائیوں سے غافل ہو چکے تھے اور اُنہیں ناچنے بننے اور شو بین بزنس سے وابستہ ہونے کا شوق اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔

اگر پاکستانی معاشرہ اُس وقت الیکٹرانک میڈیا کی مہربانی سے وہاں ہوتا جہاں وہ آج ہے تو ناچنے اور اس وقت بہت اے ون ماڈل ایکٹریا کیڑوں کے ڈیزائن بن چکے ہوتے اور نام و اکرام پاتے۔ لیکن معاشرہ اقدار سے جیسا کیسا بندھا تھا اور گونئی جزییشن رشی چھڑانے کے عمل میں تھی لیکن ماں باپ سے مکمل چھٹکارا ہو گیا تھا۔

نو دس بجے کا وقت تھا۔ صبح صبح نئی اور ثنیہ گھبرائی ہوئی گھر آئیں۔ خاں صاحب دفتر جا چکے تھے۔ گھر شانت تھا۔ ثنیہ کی سانس برابر نہ تھی۔ حواس باختہ یعنی اپنے آپ کو کنٹرول کرنے میں لگی تھی۔

”بانو! پاپا علی بھاگ گیا ہے۔“

”ہیں؟“ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

”اُس نے پڑھائی چھوڑ دی ہے..... پیر آف مکھڈ کا بیٹا اُس کے ساتھ پڑھتا ہے۔ شاید..... مجھے پیر آف مکھڈ کے گھر چھپا بیٹھا ہے۔“

”گھر یہ ہے پیر آف مکھڈ کا؟“

”ہاں جی۔“

”اگر ہم میں سے کوئی گیا تو وہ کبھی نہیں آئے گا۔ آپ سے وہ محبت کرتا ہے۔ اشیر کے ساتھ کھیلتا رہا ہے۔ گہری دوستی ہے۔ آپ دونوں چلیں تو شاید بات بن جائے۔“

لیجئے جناب میں ان پریشان حال ماں بیٹی کے ساتھ پیر آف مکھڈ کے محل نما گھر کے سامنے پہنچ گئی۔ اس گھر کے

میر خوبصورت پتھروں سے آرائشی کی گئی تھی۔ گلبرگ کے مین بلیوارڈ پر اس بنگلے میں جب میں پہنچی تو میں بدحواس تھی۔ سڑک کے پاس کار میں نینی اور ثنیہ اپنی جگہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اندر جا کر مجھے تھوڑی دیر انتظار کروانے کے بعد علی آیا۔ محبت تو اس گھرانے کا خمیر ہے۔ یہ لوگ محبت میں آ کر کچھ بھی کر گزرنے والے ہیں۔

مجھے دیکھ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ”آپ مجھے فون کر دیتیں بانو آپ آپ کیوں آئیں؟“  
 ”کیوں نہ آتی؟ چلو گھر چلیں..... میری خاطر۔“

وہ چند لمحوں کے بعد آ گیا۔ ”علی چلو، شیر کی خاطر.....“ میں نے علی کو بیک میل کیا۔  
 ”پہلے آپ وعدہ کریں کہ..... کوئی مجھے پاکستان میں پڑھنے پر مجبور نہیں کرے گا۔ میں اپنی سن کا بیج نہیں جانا چاہتا۔ میں وہاں جو اب دے آیا ہوں۔“

”چلو تو سہی۔ یہاں یہ باتیں تھوڑی طے ہو سکتی ہیں۔“

”آپ وعدہ کریں۔“  
 میں نے وعدے کا تاوان ادا کیا اور علی کو ساتھ لے کر آ گئی۔ اس کے بعد علی گھر پر رہنے لگا۔ کچھ عرصہ فضل کی صحبت پر صرف ہوا کہ علی کو امریکہ بھیج کر اسے عالی شان تعلیم سے مزین کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کی تعلیم محض ترضیح اوقات ہو سکتی ہے۔

ابھی علی لاہور ہی میں تھا کہ ثنیہ ٹیگم کنیئرڈ کالج سے بی اے کر گئی۔ نینی کو اسے بی اے کی جلدی تھی۔ اچھے سے پچھلے رشتے چلے آ رہے تھے۔ ثنیہ خوبصورت، باصلاحیت لڑکی تھی۔ اپنی ماں کی طرح گھریلو خانہ داری اور کھانے پکانے کا ہنر جانتی تھی۔ ایسی لڑکی کسی گھر کا جھومر بن سکتی تھی۔

نینی ہمیشہ کی طرح خاں صاحب سے مشورہ کرنے آئی..... شکیل مسعود کا رشتہ آیا ہے خاں صاحب..... مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی۔“

”بہتر تو یہی ہے کہ ثنیہ سے پوچھ لیں۔“ خاں صاحب بولے۔

”جی وہ حسن پرست ہے۔ بس کہتی ہے مرد کو خوبصورت ہونا چاہئے۔ لڑکا لمبا ہے قبول صورت ہے۔“  
 ”او بابا خوبصورتی کو چاہنا ہے۔ پتہ نہیں ان بچوں کو کیا ہو گیا۔ ظاہری چیزوں پر ان کی جان نکلتی ہے۔ اب اُسے چھ مینڈر کہاں سے لادیں۔“

نینی بد دل ہو کر گھر چلی گئی۔ اُسے ہمارے گھر سے کوئی ترکیب استعمال نہ ملی اور اس طرح اُس نے یہاں سے مشورے لینے چھوڑ دیئے۔ لیکن ملنا جلنا جاری رکھا۔

ایک روز صبح کے وقت شکیل میرے پاس آیا۔ لمبا، قبول صورت انتہا کا برد باڈ شریف۔ گودی میں ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

”جی آپ سے ایک مشورہ لینا تھا۔“

ایک اجنبی سے میں پہلی ملاقات میں مشورہ کیا دیتی؟

”جی فرمائیے..... میں حاضر ہوں۔“

بڑی دیروہ گم سم سا رہا۔ میں بھی پہلو بدلتی رہی۔

پھر وہ بڑی شائستگی سے بولا..... ”آئی جی! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں ٹکیل مسعود ہوں..... ثنیہ کا رشتہ

میرے لیے آیا ہے۔“

”تم نے اُسے دیکھا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی..... میں اپنے والدین کے ساتھ گیا تھا۔ لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”میری والدہ کو اعتراض ہے کہ لڑکی ایکٹریس ہی لگتی ہے۔ ایسی لڑکیاں گھربار کے قابل نہیں ہوتیں۔“

”اول تو ساری خوبصورت لڑکیاں ایکٹریس ہی لگا کرتی ہیں۔ دوسرے یقین مانواتی اچھی لڑکی تمہیں کبھی نہیں

ملے گی..... خانہ داری کھانا پکانا روایات کی پاسبانی اُس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا..... میری مانو تو فوراً ہاں کر دو۔“

پتہ نہیں میری وجہ سے یا ثنیہ کی وجہ سے بات کچی ہوگی۔

اب نینی کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔

ثنیہ نے اپنے سسرال میں رہنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ گھرانہ ٹکیل کی والدہ کے گرد گھومتا تھا۔ جو اسٹوڈنٹ

سٹم کے تحت بھائی بہن اکٹھے رہتے تھے۔ بندھنی میں طرح دار بہو کے لیے کھلنے کی گنجائش نہ تھی۔ ثنیہ نے کچھ دیر تو اپنی

کوشش کی اور پھر ٹکیل کو لے کر اپنی والدہ کے گھر آ بسی۔

یہ عہد ہماری نظروں سے روپوش رہا۔ نینی گویا ہم سے کٹ گئی۔ علی امریکہ سدھارا۔ ٹکیل اور ثنیہ کو اسٹوڈنٹ

بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا کر دیا۔ ہمیں نینی کے گھر کی خبر اُڑتی اُڑتی ملتی تھی۔ ہم بھی دوستوں کے تعاقب میں اُن کی آواز

میں مغل ہونے والے لوگ نہ تھے۔ کبھی کبھار وہ ملنے آ جاتی لیکن ادھر ادھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ کبھی ڈکھ سکھ کرنے کی

نہ آتی۔

ایک روز پتہ چلا کہ ٹکیل نے بڑا خوبصورت گھر خریدا لیا ہے اور اپنے بیوی بچے لے کر وہاں شفٹ ہو گیا۔

اپنی ذاتی کار لے دی ہے اور وہ بڑے ٹھہسے کی زندگی بسر کرتی ہے۔

کچھ عرصہ گزارا تھا کہ ٹکیل ہمارے گھر آیا۔ وہ بابر کی ہائی نون ٹیکسٹائل ملز میں جنرل منیجر کی پوسٹ جو آئی

کی سوچ رہا تھا۔ ان دنوں میرا بیٹا انیس اور ٹویلہ دوسری منزل پر رہتے تھے۔ ٹکیل اُن سے مل کر باہروانی میٹریوں سے

جار ہا تھا۔ جب وہ مجھے میٹریوں پر ملا۔

”آپاجی! بابر ایک اچھا ایماندار جنرل منیجر تلاش کر رہا ہے۔ آپ اشرے سے کہیں یہاں جو آئی کر لے۔“

زیادہ کا پیکیج ہے۔“

”تم کیوں نہیں چلے جاتے ہائی نون ٹیکسٹائل میں؟“

”میں ضرور چلا جا سکتا لیکن مجھے ”خوان“ اخبار میں نوکری مل گئی ہے جو میرے مطلب کی ہے۔“

یوں تکلیف ”ڈان“ اخبار میں چلا گیا اور اشیر نے باہر کی فیکٹری سنبھال لی۔

میرا خیال تھا کہ اب راوی چین ہی چین لکھتا رہے گا لیکن زندگی کچھ جنت کا چھوٹا سا نمونہ نہیں ہے۔ یہاں بھی سنی، سوگواری، برائی، گمراہی، موت اور پیدائش غرضیکہ ان گنت آزمائشوں کا گھر ہے۔ ہر لحظہ کسی نہ کسی امتحان کا سامنا کرتا ہے۔

ہمیشہ کی طرح منی خاں صاحب کے پاس پریشان حال بیٹھی تھی اور مسئلہ بیان کر رہی تھی۔ میں نے چلے جانا چاہا تو منی صاحب نے آواز دے کر بلا لیا..... ”سنو! اس شئیہ نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔“

منی نے بتایا کہ شئیہ اب تکلیف کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور طلاق چاہتی ہے۔ کچھ دیر سے Separation چل رہی ہے۔ تکلیف اور پر دانی منزن پر رہتا ہے۔ شئیہ نیچے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔

”شئیہ کو بوجھوں سے بچوں کے مستقبل سے نہ کھیلے۔“

”آپ چل کر سمجھائیں خاں صاحب! میری کب سنتی ہے؟“

”دیکھو ایسے کرو منی! تمرا امجد اور نندہ کو بلاؤ۔ ہم بھی آجائیں گے۔ پھر شئیہ کو سمجھائیں گے۔“

صبح گیا رہ بجے کے قریب ہم تکلیف کے گھر پہنچے۔ منی اور اس کے مشیر نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی فلم کا سیٹ لگا ہے۔ شئیہ سب سے الگ تھلگ منہ تھمتھائے گم سُم نہایت پریشان لگ رہی تھی۔ تکلیف کو اوپر والی منزل سے بلایا گیا۔ وہ بھی پریشان اپنی ذات سے نالاں ڈگگاتا آیا۔

جیسے کسی بم کے پھٹنے سے پہلے فضا چارج ہوتی ہے ایسے ہی ماحول میں خطرہ تھا۔

مشکل سے ساری صورت حال سمجھائی گئی۔

میں نے ہمیشہ کی طرح آگے بڑھ کر شئیہ کا ہاتھ تھاما اور کھٹکی سے کہا..... ”پتہ ہے تم کس آگ سے کھیلنے جا رہی ہو؟ یہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ چلو پاؤں پڑ جاؤ معافی مانگو، چلو۔“

شئیہ آگے کم چل رہی تھی اور پیچھے زیادہ ہلکورے لے رہی تھی۔ تکلیف اُسے دیکھ کر سر دق کھڑا ہو گیا۔ اُس کی خاندانی شرافت سر سے پاؤں تک جھلک رہی تھی۔ میں نے بدوہدی شئیہ کو اُس کے قدموں میں انڈیل دیا تھا۔ تب تو کیا مجھے اب تک علم نہیں ہو سکا کہ انسان اگر اندر سے نہ مانے تو زبانی کھامی اعتراف کی مدت بہت کم ہوتی ہے۔

ہم یہ سمجھے کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور تکلیف اور شئیہ میں کچی دوستی ہو گئی۔ لیکن بعد ازاں پتہ لگا کہ تکلیف نے چالیس لاکھ دے کر سچے اپنے پاس رکھ لیے اور شئیہ کو طلاق دے دی۔

لیکن یہ بعد کی کہانی ہے..... اس کے درمیان علی کی داستان بھی سن لیجئے۔ وہ گیا تو پڑھنے تھا لیکن طبعاً پڑھائی کی طرف راغب نہ تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے ہاروے نامی لڑکی سے مسجد میں جا کر نکاح پڑھوا لیا۔ ادھر لڑکی کا گھر ڈانوال ڈول تھا اور منی پر یہ بجلی گری۔ بیماری ڈھس گئی۔

علی اپنی پیاری سی دراز قد ہاروے کو لے کر لاہور آ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ان دونوں کو بڑی شفقت احساس

تحفظ اور Support کی ضرورت تھی۔ یہ محبت اشفاق صاحب نے کھلے دل سے عطا کی۔ دونوں بچے عموماً صبح کے وقت ہمارے پاس آ جاتے تھے۔ ہاروے ظہر کی نماز میرے ساتھ پڑھتی۔ اجنبی دیس میں اجنبی علی کے ساتھ اجنبی کلچر میں بے جگہ بنانا آسان نہیں۔ اللہ اُس پر اور اُس کے بچوں پر ہمیشہ رحمت کا سایہ رکھے۔

شکلیں مسعود ترقی کرتے کرتے ”ڈان“ اخبار میں جنرل منجر کے عہدے پر پہنچا اور اب ”ڈان نیوز“ کا کرتا دھرتا ہے اور کراچی میں رہتا ہے۔ جب کبھی شکلیں لاہور آتا ہے وہ بچوں کو تنہی کی طرف بھیج دیتا ہے۔ یہ وقت بچوں کی ماں بیٹیوں پر قیامت کا گزرتا ہے۔ بچوں کی آمدان کی روانگی کے خوف میں ہنسم ہو جاتی ہے۔

جب سے یہ حالات ہوئے تو یلہ اور انیس نے نیٹی کا بہت ساتھ دیا۔ میری بہو ٹویڈ کو Underdog سے عشق ہے۔ وہ ٹوٹ کر ایسے لوگوں سے محبت کرتی ہے جن کو زندگی اور زندگی کے فیصلوں نے دعا دیا ہو..... گویا وہ سردھڑ کی بازی کا کرانڈہ کو قرض حسد دینے پر تمل جاتی ہے۔

لیکن زندگی اونچے نیچے کا نام ہے..... جب سے خاں صاحب اس جہاں سے سدھارے اُس سے کچھ دیر پہلے تھے چھٹم چھن ہو گئی۔ اب شکلیں سے رابطہ ضرور قائم ہے لیکن دوسری پارٹی سے ایسی صورت میں ووٹ کی امید نہیں کیونکہ کوئی عہدہ ایسے فریقین کا ساتھ نہیں بن سکتا جن میں اینٹ کتے کا ہیر ہو۔

حالات اتنے خندوش ہونے کے باوجود علی کے ساتھ رشتہ برقرار ہے۔ اُسے امریکہ میں اینق بھائی اور فرس۔ بھائی کا سہارا ہے۔ پاکستان آیا تو ہم سے مل کر گیا۔ ہم وہاں گئے تو ایک دن کے لیے اُس کے گھر رہے۔ اُن دنوں سے ہمیں پریت سے رکھا..... اب اتنے سال گزر جانے کے بعد یہ خط شکور عالم لائے ہیں۔ شکور عالم نیویارک میں ایک ٹریڈ ایجنسی چلاتے ہیں اور ہمارے بہت کام آتے ہیں۔ علی کا خط انگریزی میں تھا۔ شکور عالم نے اس کا ترجمہ کر کے مجھے دکھایا ہے۔ نیٹی کا خاندان محبت کا امیر ہے۔ خط ملاحظہ کیجئے:

پیاری بانو آنٹی!

یقین کریں مجھے لگتا ہے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ان دونوں ”بانو آنٹی“ نے میری زبان کو چومنا میرے دماغ کو وسعت اور دل کو محبت کی گرمی سے روشناس کیا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ دل کا تعلق جسمانی قرب، قلم کی بہترین تحریر یا دور حاضر کی موثر ترین برقی ایجاہات سے مرہون منت نہیں ہوتا۔

اپنے پیاروں کی یاد خیالات کی جنت کا ایک خوبصورت پھول ہے۔ جتنا اس کی گہرائی میں اتریں۔ اتنے خوشبو اور سرور اتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔

اس سے پہلے کہ ہمیں اپنے وجود کا اس کے تعلق کے حوالے سے ادراک ہو یا دوں کی یہ بہشت ایک بہت مست پھول میں ڈھل جاتی ہے۔

کل کی بات لگتی ہے کہ پچیس سال پہلے آپ نے مجھ جیسے از خود رفتہ بھٹکے ہوئے نوجوان کو ماں کی بے سکون آنکھوں سے روشناس کرایا۔ آپ کی محبت کسی بھی غرض و عنایت یا میری استطاعت سے مبرا تھی۔ آپ کی کشادہ دلی آج بھی



تو دوسے آزاد تھی۔ نہ جانے مجھ ایسے کتنے ہی علی آپ کی چوکھٹ پر پہنچے اور آپ نے سب کو بلا تخصیص اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی وقت سے نوازا۔

لیکن آنٹی! آپ مائیں یا نہ مائیں آپ کے عطا کیے ہوئے اُس وقت سے فی الحقیقت ہم سب نے سکون دل کی وہ دولت حاصل کی جس کی ہر ایک کو تلاش رہی ہے۔ ہم کہ خود اپنے ہی دشمن بن چکے تھے ہمارے لیے روح و قلب کی بے چینی کا مداوا اگر کہیں تھا تو صرف اور صرف C-121 ماڈل ٹاؤن میں تھا۔

آپ کی توجہ اور محبت نے اس احساس کو جنم دیا کہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود دنیا بھر میں ایک اور صرف ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم جیسے اپنی ذات کی کمیٹیوں سے آلودہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو ایک ماں کی محبت بھری آغوش اور ایک باپ کی شفقت ہمہ وقت منتظر ہے۔ جہاں ہمارا دکھ نہ صرف سنا جائے، کوئی تنقید نہ ہو بلکہ گاہے گاہے ہمارے درد کی آگ کو آپ اپنے آنسوؤں کی ٹھنڈ سے سرد کر دیں۔

ہماری بے سرو پا اور بے نگی داستانوں کو پوری توجہ سے سنا اور سمجھا جانے۔ اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ہم جیسے گم کردہ راہ لوگوں کے لیے آپ کا گھر زندگی کے لوق ووق صحرا میں پُر سکون سائے اور ٹھنڈے پانیوں کا سرچشمہ ثابت ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ مجھے ذاتی طور پر جن انعامات سے نوازا گیا اُن میں انکل اشفاق کی شفقت کے علاوہ نانا، نونکی بھائی، کیسی بھائی، میری، جوئی، بہن، ٹولید، جانو بھائی، رفیق بھائی، غفار بھائی اور شار بھائی کی لازوال محبت کی یاد میرے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ میں آپ کے گھر میں کس طرح آزادی سے گھوما کرتا تھا۔ اس سے بھی تعجب کی بات یہ کہ آپ مجھے اس کی بخوشی اجازت دے دیتے تھے۔ انکل اشفاق اور بانو آنٹی کے گھر میں مجھے اپنائیت کا جو احساس ہوا وہ میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ بن چکا ہے۔

اگر شعوری طور پر نہیں تو میرے لاشعور میں علم و دانش کا وہ خزانہ ہمہ وقت موجود ہے جو میں نے آپ کے ہاں چاروں طرف بکھری کتابوں اور اُن سے باہر انکل اشفاق، مشتاق جی، جناب واصف علی واصف اور ان سب کے سُرخیل مراد بریل، جناب قدرت اللہ شہاب کی پُر کیف گفتگو اور محبت سے اپنے اندر جذب کیا۔

اس عظیم سرمائے کی بدولت آج گیارہ سال گزرنے کے بعد میں اس قابل ہوں کہ اپنے اندر بھرے ہوئے دنیاوی کچرے کے ذھیروں کو نکال سکوں۔ بلاشبہ آپ کے گھر کا نام ”داستان سرائے“ کا سب سے خوش رنگ خوبصورت اور خوشبودار پھول ہیں، وہ سب خوش نصیب لوگ جن کو آپ سے ماں کی آغوش اور محبت نصیب ہوئی۔ آج بھی آپ کی لازوال قربت کی مٹھاس اور خوشبو اپنے دلوں میں لیے پھرتے ہیں۔

اُس وقت میں نے متعدد ایسی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی جو فی الحقیقت میرے لیے از حد مفید ثابت ہو سکتی تھیں نہ مجھے اس بات ہی کا ادراک تھا کہ جہاں میں زندگی کی وقتی اور ناپائیدار عیاشیوں میں مبتلا تھا۔ میرا دل ایک دوسرے ہی تجربے سے گزر رہا تھا۔ گویا اس دوران وہ اندر ہی اندر آب حیات کے لازوال چشمے سے سیراب ہو رہا تھا جو اُن تمام

عظیم ہستیوں کے فیض سے تھا، جو داستانِ سرائے سے منسلک تھیں۔

اس کے بعد میری روح ایک طویل عرصے تک نیم جان سی رہی، لیکن اُس گوشہ عافیت سے دُور ہو کر میری زندگی پھر ایک نئی راہ پر گامزن ہو گئی۔ خدا کا شکر کہ اس طویل عرصے اور دُوری کے باوجود اب حیات کا وہ چشمہ جو آپ کا عطا کردہ تھا، مکمل طور پر خشک نہیں ہوا تھا۔

دراصل اس کا ذریعہ تھا زاویہ، کھیل تماشہ، مردِ ابریشم، شہابِ نامہ، البیک، تلاش اور میری خوش بختی پیارے نونک بھائی سے مسلسل قرب اور رابطہ۔ اس فہرست میں اور کتنے ایسے نام بھی ہیں جن سے تعلق محض اس احساس کے ذریعے تھا کہ اُن سے گفتگو، تعلقات اُن کی خاموشی میں بھی مجھے ماورائی کیفیت کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اُن کے ذریعے مجھے اُن راستوں کا ادراک ہوا جن پر چلنے کی مجھے خواہش تھی اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو گامزن بھی ہو سکوں۔

مجھے یقین ہے کہ وہ دُعا کیں جو عرصہ پہلے مجھے داستانِ سرائے سے ملی تھیں میری محافظ بنی رہیں اور بالآخر مجھے اس آسِ حیات سے روشناس کر دیا۔

ان تمام عنایات کے لیے میرا دل کی گہرائیوں سے شکر یہ اور پیغامِ محبت نبول کیجئے۔  
اپنا دھیان رکھیے گا۔

علی

ڈیز آئی بانوا

میں ہر وقت آپ کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں میرے لیے آپ نے کیا کچھ نہیں کیا۔ میری رہنمائی کی دوپٹا اوڑھے آپ کا لٹین چہرہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

میرے لیے ماڈل ٹاؤن میں جنت اور دوزخ دونوں ہی موجود تھے۔ جنت صرف وہاں تھی جہاں آپ تھے۔ اشفاق انکل میرے رہہ تھے۔

آپ سے جدا ہونے سے پہلے مجھے اس بات کا بالکل علم نہیں تھا کہ علمِ وادب کی دنیا خصوصاً پاکستان میں آپ کا کتنا بڑا مقام ہے۔

میں یہ سوچ کر حیران ہوتی ہوں کہ مجھے جیسی ناچیز اور بے علم ہستی کو آپ کیوں کر اپنے سایہ عافیت اور حفاظت میں رکھتی تھیں۔ اس کے لیے میرا دل ہمیشہ آپ کا احسان مند رہے گا۔ یہ آپ کے عطا کردہ پند و نصائح ہی تھے کہ آج میں ایک خوش نصیب بیوی اور ماں بن چکی ہوں۔

آپ نے مجھے سادگی کا درس دیا۔ آپ ہی کے طفیل میں اپنے شریک حیات کی حقیقی قربت سے فیضیاب سمجھتا ہوں۔ یہ آپ ہی تھیں جنہوں نے مجھے محض ایک جمعدارنی سے وہ کچھ بنا دیا جو میں آج ہوں۔ یوں مجھے اپنے خاوند سے نصحت مضبوط کرنے میں مدد ملی۔

عمیر نے پچھلے دنوں مجھے آپ کی کتاب ”مردِ ابریشم“ سے وہ اقتباس پڑھ کر سنائے جو دراصل میری ہی کہانی

تھی۔ آپ کے قلم نے اُسے جو ندرت عطا کی اُس کا احساس مجھ پر کچی طاری کر دیتا ہے۔

میں جتنے سال بھی پاکستان میں رہی سو جیتی ہوں کہ نہ میرا کوئی دوست تھا نہ ہمدرد لوگوں میں صرف اس لیے قابل قبول تھی کہ میں علی کی بیوی تھی۔ یہ خیال میرے لیے سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ لیکن پھر آپ اور انکل اشفاق میرے والدین بن گئے۔ مجھ میں اعتماد پیدا کیا اور قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ آپ میرے خیر خواہ بنے اور یوں میرا سب کچھ بن گئے۔ میں زندگی بھر آپ دونوں کے لیے نہ تو اپنی محبت کا اظہار کر سکوں گی اور نہ آپ کے ان گنت احسانات کے بوجھ ہی سے نکل پاؤں گی۔

میں دل کی گہرائیوں سے آپ سے پیار کرتی ہوں۔

محبت کے ساتھ

باروی

یہ صفحات میں نے رہنمائی کے دو اصولوں کے پیش نظر تحریر کیے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ محبت دو طرح سے زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ محبت کرنے والا اگر دکھاوے کی محبت بھی کرتا ہو وہ اپنی شہنی برتری اور انا کی خاطر بھی محبت کا ڈھونگ رچاتا ہو تو بھی اس محبت کا اجر اُسے زیادہ ملتا ہے اور یہ سودا بھی جس میں نیت کی خرابی ہوتی ہے نفع کا باعث بنتا ہے۔ کبھی واپسی میں گھاسنے کا امکان نہیں۔

دوسری محبت جو اللہ کی مہربانی سے بالالوک خاص کر اور کوئی کوئی خوش نصیب عام طور پر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ایسی محبت کا اجر خود اس انسان کی کیمیاگری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُس کی شخصیت میں محبت دینے کی بدولت ایک سدا بہار فرحت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پُر امید زندگی پر بھروسہ کرنے والا مشکلات سے نہ گھبرانے والی روح میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُس کی شخصیت 'توانائی' تقویت اور استقامت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

ایسی دینے والی محبت عموماً ماں کے رُوپ میں دیکھنے کو ملتی ہے جو ایثارِ قربانی اور خدمت کا مظہر ہوتی ہے۔ لیکن کسی پر احسان نہیں دھرتی۔ ایسی محبت کا رُوپ اُس باپ کی صورت میں بھی نظر آتا ہے جو ساری عمر جوتیاں چٹاتا، محنتیں کرتا، بچوں کی خواہشات پر قربان ہوتا اور بیوی کی مشکلات کے آگے ذہال بنا رہتا ہے۔

ایسا مرد بھی شجاعت، روحانیت اور استقامت کی تصویر بن جاتا ہے اور لوگ مدتوں اس مثالی رول ماڈل کو یاد رکھتے ہیں اور اپنی اونا کو اُس کی مثال دے دے کر راستے کا تعین کرتے رہتے ہیں۔ محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جسے آپ آزما کر تو دیکھیں۔ آزمانا شرط ہے۔ میں نے تو نمئی اور اُس کے گھرانے کو یہ نسخہ برتتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے!

## نور الحسن

جس شخص کا نیلی ویرن سے چھوٹا سا بھی رابطہ ہے وہ نور الحسن کی شخصیت سے بخوبی نہیں تو سرسری طور پر ضرور واقف ہوگا، لیکن میں نے اس نوجوان کو ذرا مختلف انداز میں جانا ہے۔ خال صاحب سے اُن کی زندگی میں ملنا رہا لیکن میں

نے اُسے نہیں دیکھا۔ جونہی خاں صاحب اپنے گھر سدھارے، نور الحسن گر بہ پانی سے داستان سرائے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمارے برآمدے میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلتا ہے، ساتھ ہی اس کمرے کی دیوار کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ دیوار نور الحسن کی ٹیک تھی۔ وہ پتہ نہیں کیسے اور کب آجاتا، اس دیوار سے لگ کر لڑکیوں کی طرح رویا کرتا۔ ویسے بھی نور الحسن میں کم عمر لڑکیوں جیسی لجاجت اور حیا ہے..... مجھے یہ تو کبھی تو فیتن نہ ہوئی کہ میں نور الحسن کے پاس بیٹھتی اور اُس سے رابطہ قائم کر لیتی..... لیکن اشیر احمد جو روز باپ کی قبر پر جاتے اور باپ کو بلاتے رہتے تھے، انہوں نے نور کو پہچان لیا۔ اس دور میں جب باپ کو بھلا نا مشکل تھا، نور اور نکسی نے اشیر کے دل لگانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ نکسی مفتی ہرینتے لاپٹو آتے اور اشیر کے ساتھ لگ کر اُس کا سر اپنے بازو پر رکھ کر سوتے..... نور الحسن نیچے قالین پر بیٹھ کر اشیر خاں کے پنگ کے ساتھ جڑ کر اپنی پشت کو پنگ سے ٹیک لگا کر بارہ بارہ بچے تک بغیر ہمدردی جنائے دوستی کا دم بھرے بغیر نکلے رہتے۔ ایسے مہربان زندگی کے زخموں پر پچھا ہار کھنے کی بڑی اہلیت رکھتے ہیں۔

وہ گھر میں بڑی عاجزی اور انکساری سے داخل ہوتا اور ہاتھ جوڑے کندھے سکوزے رات کے اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔ میں ابھی نور کی شناخت سے محروم تھی۔ پھر ایک واقعہ ہو گیا۔ عمو تہدیلیاں لانے والے چھوٹے بچے واقعات ہی ہوا کرتے ہیں۔ پنی ٹی وی نے اپنی چھیا لیسویں ساگر و کانٹیشن اسلام آباد میں منایا۔ مجھے خاں صاحب کا ایوارڈ لینے جانا تھا۔ فرخ بشیر نے میرے ساتھ میرے قیام و طعام کا بندوبست میریت میں کر رکھا تھا۔ چونکہ میں اُن وقت بیمار تھی اس لیے میرے ساتھ اشیر بیٹے کی کنٹ اور رہنے کا انتظام بھی فرخ بشیر نے کیا۔

ہم دونوں ہوئی جہاز سے اسلام آباد پہنچے اور سیدھا نکسی مفتی کے گھر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی بہت ضروری چیز کے سلسلے میں لاہور چلے گئے ہیں۔ ہماری دیکھ ریکھ کی ذمہ داری وہ بی بی انیس اور روبینہ کو سونپ گئے تھے لیکن اشیر خاں نے واپس لاہور پہنچنے کو ترجیح دی اور مجھے بھی یہ مشورہ دیا کہ میں ہوٹل جا کر بسرام کروں اور ان دونوں خواتین کو بلا وجہ بورنہ کر دوں۔ اس تبدیلی کا پروگرام بنانے کے لیے اشیر خاں نے اپنے نور الحسن کو ٹون کیا کہ وہ میرے ساتھ ہوٹل کے ڈائننگ میں رہے۔ مجھے پروگرام کے وقت conduct کرے اور سارا وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہے۔ اشیر بیٹے نے مجھے ہوٹل میں چھوڑا اور خود ایئر پورٹ سدھارا۔ اب میں ایک اغوا شدہ بچے کی طرح نور الحسن کی تحویل میں تھی۔ ہوٹل میں پہنچ کر نور نے مجھ سے کہا ”اگر آپ چاہیں تو میں روبینہ یا پھر انیس کو آپ کے پاس چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے بھی پنی ٹی وی والوں نے مدعو کر رکھا ہے۔ میں آپ کے آس پاس ہی منڈلاؤں گا۔“

میں نے کچھ لمبے سوچ میں گزارے۔ انیس بیگم نکسی مفتی کی ماتحت ہیں اور لوک ورڈ میں ”دبستان شہبہ“ کے ساری تزئین و آرائش کی انچارج ہیں۔ دو ایک بار وہ نکسی کے ساتھ ہمارے ہاں ٹھہر چکی تھی لیکن میں نے اُسے اس کیسٹ ڈیوٹی پر بلا نا مناسب نہ سمجھا۔

روبینہ خالد مشہور و معروف رڈف خالد کی اہلیہ ہیں، لیکن اس کے علاوہ اُس کی سب سے بڑی خوبی اس کی فرسٹ اور سخاوت ہے۔ وہ اپنی ذاتی دولت کو اس خندہ پیشانی سے دوسروں پر لٹاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے..... میں نے سوچا وہ میرے پاس تحفوں سے لدی چھندی آئے گی اور میں اُس کی عنایات کا سوائے زبانی شکر یہ کرنے کے اور کچھ نہ کر سکوں گی اس لیے

نے نور سے کہا..... ”بھائی! تم اُن دونوں کو رہنے دو۔ ہم دونوں ایک رات ایک دوسرے کی کمپنی کو زہر مار کر لیں گے۔“  
 نور اپنی عاجزی اور انکساری کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جھٹ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر  
 بولا..... ”ماں جی! میرے لیے تو یہ بہت بڑا اعزاز ہے جس کے متعلق میرے بچے بھی بڑے ہو کر شیخی مارا کریں گے لیکن  
 مجھے معلوم ہے آپ کبھی کسی اجنبی کے ساتھ یوں رہی نہیں۔ کہیں آپ کے لیے مشکل نہ ہو  
 اب میں نے جھوٹ بولا..... ”ناں بھئی نور! تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو..... اشرک کا کوئی دوست میرے لیے کیسے  
 اجنبی ہو سکتا ہے؟“

نور اُلحٰسن اُس کی بیوی صائمہ بیٹی اولیس اور خالد ہمارے ہاں آتے جاتے تھے۔ صائمہ نے اشرک احمد کو اپنا بھائی  
 بنا رکھا تھا۔ جب بھی وہ آتی عموماً دوسری منزل پر یہ دونوں چلے جاتے۔ اشرک بچوں کو پا کر نہال ہو جاتا۔ اُن کے ساتھ کھیلتا۔  
 انہیں ٹافیاں لہسن ڈراپ دیتا۔ نور تو میرے قریب اس قدر نہ آ سکا لیکن صائمہ واقعی بیٹی بن گئی..... لیکن پی ٹی وی کے فنکشن  
 کے بعد نور بھی گھر کا فرد بن گیا۔

فنکشن ہوٹل کے ہال میں تھا۔ بالکل سامنے مغرب کی طرف پشت کیسے سٹیج تھا۔ اس پر فرخ بشیر اور جج صاحبان  
 رونق افروز تھے۔ دائیں بائیں میڑھیاں تھیں جن پر سے انعام لینے والوں کو اوپر جانا تھا۔ سٹیج کے دائیں جانب اُن لوگوں  
 کے ڈیسک لگے تھے جن کو انعام حاصل کرنا تھا اور سامنے قطار در قطار ملک کے دی آئی پی پرپیس کے نمائندے، صحافی دنیا  
 کے جغادری، مقبول اور معروف ایکٹر پرڈیوسرز، اکریکٹرز بیٹھے تھے۔ پھر اسلام آباد کے لوگ جو فنکشن شروع ہونے کے  
 بعد تک آتے رہے۔

نور مجھے ہوٹل کے کمرے سے نیچے لایا۔ اُس نے مجھے صاحب لوگوں کی طرح بازو کا سہارا پیش کر رکھا تھا۔ میں  
 اُس کا بازو اور ہاتھ تھامے اپنی سیٹ پر بیٹھی تو وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب میں خاں صاحب کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ  
 لینے گئی تو وہ مجھے سہارا دیے سٹیج تک لے گیا۔  
 فنکشن بہت لیٹ ہو گیا۔

جب فنکشن ختم ہوا تو ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچے۔ پتہ چلا کہ جو کوپن ہمیں دیے گئے تھے وہ تو نوبے تک  
 Valid تھے۔ اس کے بعد ہوٹل ہمارے طعام کا ذمہ دار نہ تھا۔ میں تو شاید مارے شرم کے بھوکی سو جاتی۔ یہاں پھر نور اُلحٰسن  
 نے کاؤنٹر پر جا کر کھانا آرڈر کیا اور اُس کا ہل بھی خود ہی چکایا۔

مجھے فکرتھی کہ میں شوگر کی وجہ سے بار بار غسٹخانے جاتی ہوں نور تو میری وجہ سے بار بار جاگے گا، لیکن اُس رات  
 مجھے پتہ چلا کہ نور اُلحٰسن تو بچوں کی طرح سوتا ہے۔ کوئی کھڑا دھڑکا اُسے نہیں جگاتا۔ فجر کی اذان ہوٹل کے بالکل قریب ہی  
 کسی مسجد سے آئی تو میں نے خدا کا شکر کرنے کی غرض سے کمرے میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ کئی بار کھانسی پانی کے استعمال کے  
 بعد میرا معمول ہے کہ بہت ساری چھینکیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ نور گھوڑے بیچ کر سویا رہا۔

پھر دن چڑھے ہمیں پی ٹی وی کی وین ایئرپورٹ چھوڑ گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اتنی ساری سیزھیاں کیونکر  
 چڑھوں گی۔ اس وقت بھی نور ہی آڑے آیا اور قریباً اٹھا کر اوپر اکونومی کلاس میں لا بٹھایا۔ مجھے کھڑکی والی نشست پر بٹھایا

اور خود درمیان والی سیٹ پر سکر کر بیٹھا۔ گھر آ کر اس نے ہمیشہ کی طرح گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر اجازت چاہی۔ اس کے بعد پھر اشیر کا حلقہ گوش بن گیا۔

لیکن رات کے قیام اور ساتھ نے نور کو گھر کا ایک فرد بنا دیا..... اب وہ اور صائمہ باقی بچوں کی طرح میری توجہ مطلوب بن گئے ہیں۔ صائمہ اچھے اچھے کھانے پکا کر اشیر خاں کی بیٹی زینب (مونو) کے لیے کپڑے ڈیزائن کرتی اور سوتے ہے۔ دعوتوں پر باورچی خانے میں ہاتھ بناتی اور کام کرتی ہے۔ نور جتنی بار میں کمرے میں داخل ہونے کا اسے چانس دیتا ہے۔ کھڑا ہو جاتا اور اس وقت تک کھڑا رہتا ہے جب تک میں بیٹھ نہ جاؤں..... ڈیرہن پر ایسے لوگ ملا کرتے تھے جن کے لیے ادب آداب کا یہی طریق کار تھا، لیکن ہمارے شرفاء میں یہ مبالغہ آمیز اٹھک بیٹھک خوشامد پر محمول کی جاتی ہے۔ میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ محبت کے اظہار میں اپنی جان و تکلیف دینا کچھ آسان سا کام نہیں..... لیکن سوچتی ہوں کہ ماثر آف Ceremonies بنا بھی تو کوئی عام پروفیشن نہیں..... یہ بھی تو اپنے آپ کو کمتر بنا کر دوسرے انسان کی صلاحیتوں کو تاج پہنانے کا ہی کام ہے..... البتہ کچھ کمپیئر ایسے مندر زورے اور شہ زورے بھی دیکھے ہیں جو مہمان کو کتھرے میں کھڑا کر کے اسے مجرم صورت بھی پیش کر دیتے ہیں۔

(نور الحسن نے نیلی ویرن کے لیے ایک پروگرام کیا جس میں چار رویش محمد بیگی خان، عکسی مفتی اور میں شامل ہوئے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا پیش خدمت ہے)

اشفاق صاحب بڑی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔ ان کی رنگارنگ تخلیق کاری نے مجب گل کھلائے تھے۔ چھوٹے سے تھے تو انہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ اسے وہ خود ہی لکھتے، اس کی کاپیاں بناتے اور سنٹر کے سکول میں جماعت دوستوں میں بانٹ دیتے۔

پاکستان پہنچ کر جب انہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ایم اے اے اورو کے دوران ہی ان کی پہلی کتاب "محبت سو افسانے" آگئی۔ ایم اے کرنے کے بعد دورہ چلے گئے۔ واپسی پر خاں صاحب نے جلد ہی تلقین شاہ کھنا شروع کی جو پورے 39 سال ان ایئر گیا۔ لیکن ان کی تخلیقی قوتیں تلقین شاہ کی سرحدوں کو پار کر گئیں۔ پہلے خاں صاحب نے ریڈیو ڈرامے لکھے پھر جو نیلی ویرن 1965ء میں ہماری زندگی کا حصہ بنا، انہوں نے اس میڈیا کو اپنا لیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بڑی عمدہ کمپیئرنگ کی۔ نیلی ویرن کے افتتاحی پروگرام کی کمپیئرنگ کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے موسیقی سے گہری دلچسپی نے "کھکار" جیسے پروگرام دیئے..... "زاویہ" سے تو آپ کی ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاں صاحب کی ہر دل عزیز کی مختلف طبقتوں میں اتنی ہی رنگارنگ ہے۔ ان کی شخصیت..... جو پڑھے لکھے افسانے سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ چاہتے تھے کہ خاں صاحب صرف افسانے لکھیں۔ وہ بھی "اچھے پھول" اور "ایک محبت سو افسانے" جیسے۔ "صبحانے افسانے" سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

جنہیں تلقین شاہ سے عشق تھا وہ انہیں کسی اور روپ میں دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ البتہ "زاویہ" دور دورہ میرے ایکٹروٹک میڈیا ہونے کی وجہ سے اس کی پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر چاہنے والا اپنی پسند و

جو گھر میں تھا کہ صرف وہی ٹھیک ہے۔

لیکن آج تین سال گزر جانے کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا کہ خاں صاحب سے اُن کے چاہنے والوں کی وابستگی کم نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ قارئین ناظرین کی محبت ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی کے عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی، برائی، کمی بیشی، اونچ نیچ محبت کے سامنے بے معنی ہے۔ محبت کو غالباً اسی لیے خدا کا سب سے بڑا روپ کہا جاتا ہے۔ محبت کرنے والا محبوب کی خرابیاں نہیں دیکھ پاتا بلکہ اُن کو اپنی خرابیوں کی طرح قبول کر لیتا ہے۔

ڈیروں پر اسی محبت کا مظہر نظر آتا ہے اور خاں صاحب غالباً اسی محبت کی تلاش میں بابوں کے پاس آنے جانے لگے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر زیادہ مان ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں کبڑے کی طرح کسی اور کا قد چھوٹا کر کے کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی کلا جگاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ اُن میں یقیناً انسان ہونے کے ناطے خوبی اور خرابی دونوں کے دریا ساتھ ساتھ بہتے ہوں گے۔ یقیناً اُن میں حب مال اور حب جاہ کی طلب ہوگی۔ لیکن وہ کسی صوفی کی طرح جہادِ نفس میں مبتلا رہتے تھے حصولِ نفس میں نہیں۔ اُن کی زندگی میں ضروریات کو کچھ بھی جھل کر دہکا تا ضروری نہیں۔ بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانا ناہم تھا۔

لیکن لوگوں کی محبت کے کیا کہنے۔ آج بھی تین سال گزر جانے کے بعد بھی لوگ اُن کی بشریت پر دھیان نہیں دیتے بلکہ انہیں ایک بہت بڑا آدمی، برگزیدہ صوفی، ٹیک انمول اویب سمجھتے ہیں۔ نکتہ چینی لوگ اور محنتی مہربان سب خاں صاحب کی بہتری چاہتے ہیں۔ صرف طریقہ و احوال مختلف ہے۔ مہربان لوگوں کا رویہ ماں کی طرح ستر پوشی کا ہے۔ عیب و عیب کرنے والے سچ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

پتہ نہیں خاں صاحب ان دونوں کا احسان کیسے اتار پائیں گے۔ اتنے فاصلے کیسے طے کریں گے؟

## مجیب الرحمن شامی + چودھری سردار محمد + حمید صاحب

ڈرائنگ روم کچھ کچھ زاویے کا روپ دھارنے کی کوشش میں تھا۔ کچھ لوگ خاں صاحب سے ملنے وقتاً فوقتاً آئے لگے تھے۔ ان میں مجیب الرحمن شامی، چودھری سردار محمد اور حمید صاحب عموماً اکٹھے آتے۔ میں ان کی صورتوں سے بھی واقف نہ تھی، لیکن ان کے آنے پر خاں صاحب خاص طور پر اندر آ کر کہتے:

”قدسیہ گوجھی کے پکوڑے بنا دو..... لیکن کسی اور کو تکلیف نہ دینا۔ یہ تم ہی کو پکانے ہیں۔“

یہ بڑے پُر تکلف دن تھے..... امیری اور غریبی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اسراف سے پرہیز اور فراخ دلی سے

خرچ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو رہا تھا۔

کبھی کبھی میں درمیانی دروازے تک پہنچ کر سنتی تو اندر سے تعریف کے ڈونگرے برستے سنائی دیتے۔ ان میں سب سے اونچی آواز شامی صاحب کی ہوتی۔ سردار صاحب پولی آواز میں ہاں سے ہاں ملا دیتے۔ کبھی کبھی ان کے جانے کے بعد خاں صاحب مجھ سے کہتے:

”قدسیہ! اگر کبھی تمہیں ان پر کچھ لکھنے کی حاجت پیش آئے تو اجتناب کرنا۔ یہ تم سے بڑے لکھاری اور بڑے انسان ہیں۔ میرا ان سے کتنا ہی سیاسی اختلاف کیوں نہ ہو میں ان کی بڑائی سے منکر نہیں ہو سکتا۔“

شاید اسی تنبیہ کی وجہ سے میں نے کبھی سردار صاحب کی کتابوں پر قلم نہیں اٹھایا۔

### مجیب الرحمن شامی

اب مجیب صاحب کا اپنا اخبار ہے۔ اُن کا بڑا نام ہے۔ جلد ہی آپ کو یہ اطلاع بھی ملے گی کہ ٹی وی پر ”پاکستان“ چینل کھل گیا ہے۔ اُن کا منجھلا بیٹا عمر شامی اخبار میں اُن کے ساتھ سب ایڈیٹر کے طور پر بڑی شہرت کماتا رہا ہے۔ بڑا بیٹا علی سافٹ ویئر کا اپنا کام کرتا ہے اور بیٹی کچیڑ ڈکانچ میں پڑھانے کے بعد یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ سب اپنے اپنے مقام پر مضبوطی سے مجیب الرحمن شامی کا کام اور نام روشن کر رہے ہیں۔

### چودھری سردار محمد

سردار صاحب کے بیٹے ہارون جو بینک آف پنجاب میں جنرل منیجر ہیں، انہیں بارہا فون کیا کہ سردار صاحب کو کوئی یا نوڈیٹا اُن کا کوئی شناختی مضمون بھجوائے لیکن اُن کی طرف سے چپ رہی۔ پھر میں نے ایڈن ولا میں سید امجد حسین کو فون کیے کہ سردار صاحب کی بیٹی انجم جو اس وقت اسمبلی کی رکن ہیں اور سید امجد حسین کی اہلیہ ہیں، میری رہنمائی کے لیے آگے لکھ دیں۔ لیکن رفتار کا زمانہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں اس طرح مصروف ہیں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں۔

### حمید صاحب

ان دنوں کے ہمراہ حمید صاحب تیسرے نمبر پر تھے۔ قد میں سب سے لمبے گفتگو میں آخری نمبر پر ہوا۔ تعریف کرنے میں صفر تھے۔ وہ کسی سافٹ ویئر کمپنی کو چلاتے تھے۔ مجھے خاں صاحب نے اُن کے متعلق کم کم ہی بتایا۔ لیے کچھ گوش گزار نہیں کر سکتی۔

### مسعود میاں

قریباً 1985ء یا 1986ء کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا تھا شخص مجھے ملنے آیا۔ میں نے اُسے بار بار پوچھا کہ کبھی خاں صاحب سے تو نہیں ملنا، لیکن اُس نے لجاجت سے کہا..... ”جی نہیں! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے۔“

اس مبارک شکل نوجوان سے میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے سوال کیا..... ”کوئی کام؟“

”جی نہیں کوئی کام نہیں۔“

مجیب سی بات ہے کہ آج 2008ء آ پہنچا، مسعود سے رابطہ قائم ہے لیکن اُس نے نہ کبھی کوئی فرمائش کی نہ کبھی چیز ہی مانگی..... یہ ضرور اضافہ ہوا کہ اب وہ السر کا مریض ہے۔ ڈپریشن اُس کا ساتھی بن گیا ہے اور اُس کی آنکھیں محض اعتماد اور خوشی کے بجائے اُداسی اور حیرانی کی سی کیفیت رہتی ہے جیسے وہ کسی سے پوچھنا چاہے کہ آخر میں نے کیا ہے جس کی یہ سزا ہے۔ میرا قصور کیا ہے؟



آج کے عہد میں یہ سوال بیشتر نوجوان پوچھ رہے ہیں۔ مسئلہ سارا شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی میں مضمحل ہے۔ انہیں دنیاوی ترقی اور کامیابی کا وہ مقام درکار ہے جس کو حاصل کرنے میں ایک عمر لگتی ہے۔ تیز رفتاری کے اس سفر میں اتنا لمبا انتظار ذہنی طور پر تھکا دیتا ہے۔ کبھی وہ بابوں کے ڈیروں پر دنیاوی ترقی کا تعویذ لینے جاتے ہیں۔ کبھی مسیحا کے دروازے کھٹکھٹاتے اور بے نیل و مرام واپس لوٹ جاتے ہیں۔

مسعود اُس وقت Disillusioned نہیں تھا۔

میں نے اُس سے اُس کا حدود اور بچہ پوچھا تو اُس نے لجاجت سے کہا..... ”والد صاحب نیشنل بینک میں چیف ایگزیکٹو ہیں اور کچھ ٹھیکے پر زمینداری ہے۔ اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔“  
میں نے کہا..... ”مسعود میاں! یہ کیا بات ہے کہ جو بھی بہاول نگر سے آتا ہے ہمیشہ اللہ کا شکر بجالاتا ہے۔ کیا یہ بس کے بابوں کا اثر ہے۔ بہاول الدین ذکر کیا وہاں کی مٹی میں قناعت کا بیج بو گئے ہیں کہ وہاں کے حاکم انصاف کو اس طرح نئے رہے ہیں کہ لوگوں میں شکایت کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی؟“

”یہ تو جی آپ کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ ہم تو فی الحال فکر و فاقے سے آزاد موزج میلا منار ہے ہیں۔“  
چند دن کے بعد مسعود پھر آ گیا۔ اس بار کھلا کہ اُس نے کہیں سے ”راجہ گدھ“ پڑھ لی تھی اور حسن اتفاق سے اس کے بحر میں پھنس گیا۔ اسی روز اُس نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ سا پکڑا دیا۔ میں سمجھی کہ شاید کوئی فرمائش ورج ہوگی۔ کھول کر پڑھا تو ایک نظم صاف ستھری لکھائی میں رقم تھی۔ بہت سال گزر جانے کے بعد ابھی تک مسعود کی لکھائی ویسی ہی صاف ستھری اور خوبصورت ہے۔ نظم کے شاعر کا نام معلوم نہیں بہر حال آپ نظم ملاحظہ کیجئے:

”اک کمال کی خواہش“

کس طرح سجاتے ہو  
مصلحت کی شاموں میں  
مخفلیں محبت کی اور محبتیں بھی وہ  
سال بھر مہک جن کی  
دل کی ساری گلیوں میں رقص کرتی پھرتی ہیں  
کس طرح جلاتے ہو  
آندھیوں کے موسم میں تم دیئے رفاقت کے  
تم جو جس موسم میں اک ہوا کا جھونکا ہو  
کچھ ہمیں بھی بتلاؤ کچھ ہمیں بھی سکھلاؤ  
ہم تمہارے جذبوں کے نیک سی فضاؤں میں

پھول جیسے گیتوں کی ارقص کرتی خوشبو کے  
بے قرار شاعر ہیں

اس نظم کا مجھ پر بڑا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں نے فوراً عینک بدل لی اور مسعود کو بڑے شفیق شیشوں سے دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا..... ”تمہاری تحریر سے لگتا ہے کہ تم لکھتے لکھاتے بھی ہو؟“

”کیوں کی طرح شرمناک رہو؟“ ”جی کچھ شجیدگی سے نہیں بس ایسے ہی شوقیہ۔“

کہنے کو تو مسعود نے کہہ دیا..... لیکن پتہ نہیں کیوں اُس کے چہرے پر وہ آرزو جھلکتی لگی جو تخلیقی قوتوں کے

فنکاروں میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد مسعود میاں میری زندگی سے غائب ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی زمینداری پر لوٹ گیا ہے اور مزے میں ہے۔ کافی دیر گزری کہ ایک روز مسعود میاں

وارد ہو گئے۔

میں نے تھکنا اُس تاخیر کی وجہ پوچھی۔ مسعود نے بڑی ناامیدی سے کہا ”بانو آ پا! والد صاحب نے ریٹائرمنٹ

کے بعد زمینوں کی ٹھیکیداری کے علاوہ Nestle والوں کے ساتھ کنٹریکٹ کر لیا ہے دودھ کی سپلائی کا۔ ہم مختلف جگہوں

سے دودھ اکٹھا کر کے Nestle کمپنی کو سپلائی کرتے ہیں۔“

میں نے کہا..... ”یہ تو بہت اچھا ہے۔ اس میں اتنا مایوس ہونے کی کیا بات ہے؟“

مسعود کہنے لگا..... ”بانو آ پا! مجھے خدشہ ہے کہ یہ کمپنی ہمارے لیے نہیں خدا نخواستہ ایسٹ انڈیا کمپنی

کیونکہ والد صاحب نے ساری زندگی ملازمت میں گزار دی۔ ملازمت پیشہ لوگوں کو عموماً کسی بھی طرح کے کاروبار کی

پہچان نہیں ہوتی۔ آج بھی آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ بے شمار لوگوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی جمع پونجی تاج کمپنی میں

تھی یہ سوچ کر کہ مقدس کلام چھاپنے والی کمپنی ہے۔ یہاں اُن کا سرمایہ بڑا محفوظ رہے گا لیکن اُن کے ساتھ کیا

بیچارے دروہ کی شو کریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو تاج کمپنی تھی ہم نے تو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ کنٹریکٹ کیا ہے

سوچتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔“

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا..... ”دیکھو مسعود! مایوسی کو کنٹرول کیا گیا ہے۔ اللہ سب خیر کرے گا میری

تمہارے ساتھ ہیں اور یاد رکھو ہر ناکامی سے کسی نہ کسی کامیابی کا پہلو ضرور نکلتا ہے اور ہر کامیابی کے ساتھ کوئی نہ کوئی

لگی ہوتی ہے۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں پریشان نہیں ہونا گھبرانا نہیں۔“

ایک مدت مسعود مجھے ملنے نہ آیا۔

پھر ایک روز اُس نے تجربے کے پانیوں سے سر نکالا اور مجھے آ کر بتایا..... ”آج بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے

طرفہ طور پر کنٹریکٹ منسوخ کر دیا۔ ہم نے جو سرمایہ اس کاروبار میں لگایا تھا اُسے واپس نہیں نکال سکے۔ والد صاحب

صورت حال سے بالکل مایوس نہیں ہیں۔ بقول ترقی پسندوں کا تصوف یا روحانیت صرف ایک نشہ ہے۔ ابوتی

کے بعد اس نشہ میں اور بھی زیادہ راسخ ہو چکے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں بہادر شاہ ظفر کی طرح کچھ

آپ کے سامنے موجود ہوں۔“

میں نے دلاس دینے کے انداز میں کہا..... ”چلو مسعود! جسے تم نقصان سمجھ رہے ہو وہ بھی ایک طرح کا نفع ہے۔ بڑے ادیب کو نہ کامی کا تجربہ کنڈن بنا دیتا ہے۔ تم لکھاری ہو اب تیزی سے منزل کی طرف بڑھو گے۔ اب تم بڑی سنجیدگی سے پڑھنے لکھنے کی طرف مائل ہو جاؤ گے۔“

شاید میری تھکی کا اثر تھا کہ اُس کے اندر کا ادیب جاگ گیا تھا۔ وہ لکھنے لکھانے کی طرف سنجیدگی سے مائل ہو گیا۔ تمہیں مسعود نے مجھے کبھی نہ تو سب چھپوانے کے لیے کہا نہ کسی افسانے کو لکھنے کے لیے مجھے اُس پر تبصرہ کرنے کے لیے حرا لیا۔ پھر اُس کی کہانیاں چھپنے لگیں۔ اُس کی بھولی میں کپے بیروں کی طرح خود بخود تعریف کرنے والے fan گرتے گئے۔ نوے کی دہائی میں کہیں مسعود ہمارے ساتھ منسلک ہو گیا۔ خاں صاحب کا تلفیق شاہ ستابی صورت میں edit کرنے کے لیے ایک ہمہ وقت ایڈیٹر کا رتھا۔ مسعود حاضر ہو گیا۔ اُس سے پہلے ہمارے پاس عمران موجود تھا۔ عمران وکالت کا امتحان دینا چاہ رہا تھا۔ اُسے کسی پارٹ ٹائم نوکری کی ضرورت تھی۔ وہی آ کر یہ کام کیا کرتا۔ لیکن جو نئی عمران کورٹ میں کارڈ کھینے کے قابل ہوا یہ جگہ خالی ہو گئی۔

ہمارے گھر کے سزاوہ سنگ میل پبلشرز کے پاس بطور ایڈیٹر کام کرنے لگا۔ چودھری افضل احمد اُسے میری ہوشیاں صاحب کی کتابوں کے ناؤ پر و فیئر احمد رفیق اختر کی کتابیں بھی پڑھنے کے لیے دیتے ہیں جس پر وہ بہت خوش اور مستعد ہے۔

اب مسعود کا راستہ متعین ہو گیا..... داستان سرائے سنگ میل اور ادب سے گہری شیفٹنگ!



## اشفاق احمد کی یاد میں

مسعود میاں

مجھے ساتھ والے گھر سے کسی لڑکی کی اونچی اونچی باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ ہمارے ساتھ والا گھر ایک کھلی کا تھا۔ اُس کا نام تو شمر تھا لیکن اُس کی بیوی کو ساری زندگی کوئی شمر نہیں لگا۔ جب اُن کے ہاں کوئی بچہ ہی نہیں تھا تو پھر کسی لڑکی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دن کے وقت البتہ ایک لڑکی اکثر اُن کے ہاں آیا جایا کرتی تھی۔ وہ شاید اُن کی کوئی رشتہ دار تھی۔ اُس کے بال بک کنگ میں تھے اور سامنے والے دانتوں میں خلا تھا۔ وہ اُس خلا پر مسلسل اپنی زبان پھیرتی رہتی تھی۔ دیکھنے والے کی نگاہ اُس کے دانتوں کے خلا میں اس طرح پھنس کے رہ جاتی تھی جیسے امرود کھاتے ہوئے آپ کے دانتوں میں اس کا کوئی بیج پھنس جاتا ہے۔ پھر اسے بڑی جدوجہد سے نکالنا پڑتا ہے۔ اکثر کوئی پھانس نہیں بھی نکلتی اور بڑے دنوں تک تکلیف دیتی رہتی ہے۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ 1978ء کی ایک تاریک رات تھی۔ میں اپنے گھر اور پڑوس کی سانجھی دیوار

کے ساتھ کھڑا تھا اور مجھے لڑکی کے مکالموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ لیکن یہ اس بوب کنگ والی لڑکی کی آواز نہیں تھی۔ جب میں نے دیوار کے اوپر سے دوسری جانب دیکھا تو وہاں گھر کے پچھلے برآمدے میں ایک تپائی پر بیٹھ کر بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی پڑا تھا اور اس میں اشفاق صاحب کے ڈرامے کا سین چل رہا تھا جس میں رومی بانو باغ میں پرندوں کو اڑاتی پھر رہی تھی اور پھر وہیں باغ میں لگے جھا کے سے مکالے بولنے لگتی تھی۔

میری عمر اس وقت آٹھ یا نو برس کی تھی۔ یہ میرا خال صاحب کی کسی ڈرامائی تحریر سے پہلا تعارف تھا۔ یہ 1992ء کی بات ہے۔ میرے پاس ایک جاپانی ٹیپ ریکارڈر ہوا کرتا تھا۔ ابھی چائے میڈ چیزوں کی بہتات نہیں ہوئی تھی اس لیے جاپانی چیزیں عام دیکھنے کو مل جاتی تھیں۔ اس ریکارڈر میں پلے کے بٹن کے ساتھ ساتھ سرخ رنگ کا بٹن بھی تھا۔ جب دونوں بٹنوں کو بیک وقت دباتے تو ریکارڈنگ شروع ہو جاتی تھی۔

ہر ہفتے کی رات آٹھ بجے میں اس ریکارڈر کو لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا اور اپنے پسندیدہ ڈراموں کی ریکارڈنگ کرتا۔ جب ڈرامہ ختم ہو جاتا تو پھر کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور اس ڈرامے کے ریکارڈ شدہ مکالمات کو کونکھ میں ان مکالمات کو لکھ کر یاد نہیں کرتا تھا یا پھر اداکاروں کی طرح ان کو بولنے کی پریکٹس بھی نہیں کرتا تھا اس لیے مکالمے اداکاری کا کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ اس زمانے میں میرا لکھاری بننے کا بھی کوئی خیال نہیں تھا۔

پھر میں وہ مکالمات آخر کیوں لکھا کرتا تھا۔ یہ وہ اہم سوال تھا جس کا جواب میرے لیے ابھی مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ وہ ڈرامہ اشفاق صاحب کا تحریر کردہ تھا اور اس کا نام تھا "سودا"۔

1997ء کو جب میں کراچی کینٹ سٹیشن پر اترتا تو ایک بک سٹال پر ٹک کر میں نے اخبار میں اپنے دوست نصرت فتح علی خان کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب ہم کسی سفر کے دوران دائم آباد کو جانے والے کسی مسافر کی تخریب کتنا عجیب لگتا ہے۔ اچانک دل میں ایک حسرت جاگتی ہے کہ جانے والا ہمارے ساتھ کچھ دیر اور ٹھہرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ جانے والا تو جا چکا ہوتا ہے اور ہمارے دل میں بس ایک کسک سی چھوڑ جاتا ہے۔

جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو شام کے سائے گہرے ہو کر تاریک رات میں بدل چکے تھے اور ساتھ ساتھ کمرے سے نصرت فتح علی کی آواز آرہی تھی "سُن چرے دی مٹھی مٹھی گھوک ماہیا مینوں یاد آ وندا۔"

میرا یہ کمرہ ڈرگ روڈ سٹیشن پر بسم اللہ ہوٹل کی اوپر والی منزل پر تھا۔ ہمارے کمرے میں میرے سلطان کاٹی وی کسی خرابی کے باعث بند پڑا رہتا تھا۔ سلطان اور اس پاس کے کمروں کے لوگ رات گئے تک بیٹھ رہتے۔ میں جب ان کے ساتھ رہائش پذیر ہوا تو تاش کے کھیل سے بالکل نااہل تھا۔

ایک روز چھٹی والے دن سلطان اپنے خراب ٹی وی کو کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ٹی وی میں تاش فالت ہے جسے وہ خود ہی ٹھیک کر سکتا ہے۔ وہ کہیں سے ایک کاویہ بھی لے آیا اور چھوٹے چھوٹے دو تین پوائنٹ لگانے کے بعد جب ٹی وی آن کیا تو وہ چل پڑا۔

رات ٹھیک ساڑھے دس بجے جب سب لوگ ساتھ والے کمرے میں تاش کی بازی میں مگن تھے میں

کے یا تو اُس پر ایک ڈرامہ چل رہا تھا جس میں صرف دو کردار تھے۔ ایک یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ اور دوسرا شاہ جی کا کردار۔

سٹوڈنٹ پوچھتا ہے ”شاہ جی! آپ جدی پشتی زمیندار ہیں یا آپ نے انگریزوں سے زمینیں حاصل کی

جی؟“

شاہ جی کہتے ہیں ”میں لعنت بھیجتا ہوں انگریزوں سے زمینیں لینے والوں پر۔ ہم تو جدی پشتی زمیندار ہیں۔“  
سٹوڈنٹ کہتا ہے ”وہ کیسے جی؟“

شاہ جی بتاتے ہیں ”میرے لکڑوا دا کے دوست اکبر بادشاہ کے دربار میں وزیر تھے۔ انہوں نے میرے لکڑوا دا سے کہا کہ اگر آپ دین الہی قبول کر لو تو ہم بہت سی زمینیں تمہارے نام کر دیں گے۔ میرے لکڑوا دا کیونکہ بہت پڑھے لکھے تھے اس لیے انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔“  
وہ کیوں جی؟“ سٹوڈنٹ پوچھتا ہے۔

شاہ جی بتاتے ہیں ”وہ اس لیے کہ دین الہی کو قبول کرنے کے لیے ایک ٹسٹ سے گزرنا پڑتا تھا جس میں ایک کتے کی زبان کو شہد لگا دیا جاتا تھا اور جو بھی اُس کتے کی زبان پر لگا شہد چاٹ لیتا وہ دین الہی میں داخل ہو جاتا۔ میرے دادا کیونکہ بہت پڑھے لکھے تھے اس لیے انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔“  
”پھر کیا ہوا جی؟“ سٹوڈنٹ نے پوچھا۔

”وہ وزیر کیونکہ میرے دادا کے دوست تھے اس لیے انہوں نے اس شرط میں تبدیلی کر دی وہ یہ کہ انہوں نے شہد میرے دادا کی زبان کو لگا دیا اور کتے نے میرے دادا کے کندھوں پر اپنی اگلی ٹانگیں رکھ کر دادا کی زبان پر لگا شہد چاٹ لیا۔ تو اس طرح ہم تو جدی پشتی زمیندار بن گئے اور ہم انگریزوں سے زمینیں حاصل کرنے والوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔“  
یہ تلقین شاہ کا وہ پروگرام تھا جو خاں صاحب نے ٹی وی کے لیے لکھا تھا۔ اس پروگرام کے کچھ اور حصے بھی ٹی وی پر چلے لیکن ان میں بھارت اور امریکہ کے بجائے اپنے ہی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر تنقید بڑی سخت تھی اسی لیے اس پروگرام کو جلد ہی بند کر دیا گیا۔ اس پروگرام کا لکھنے والا اگر پیسہ کمانا چاہتا تھا یا صرف شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا تو پھر وہ کڑی تنقید کرنے کے بجائے باسانی ہلکے پھلکے موضوعات کا انتخاب کر سکتا تھا، لیکن اُس نے کبھی کسی مصلحت کو فن کے آڑے نہیں آنے دیا۔

”تلقین شاہ“ سے لے کر ”من چلے کا سودا“ تک کے مکالمات میں مجھے ایک ہیرو نظر آتا ہے۔ کوئی ہیرو ہمیں کیوں اچھا لگتا ہے؟ دراصل وہ ڈر اور خوف کی حدیں پھلانگ کر ایسے ایسے کارنامے کر جاتا ہے جس کا عام زندگی میں ہم تصور تک نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں ہیرو اچھا لگتا ہے۔ ”من چلے کا سودا“ میں موجود ہیرو جہاد اکبر کرتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ میں خود اس جہاد میں حصہ لینے کے بارے سوچنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا اس لیے وہ ہیرو میرا بھی پسندیدہ ہیرو بن جاتا ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اشفاق صاحب کا مشہور ٹی وی پروگرام ”زاویہ“ کتابی صورت میں مرتب ہو رہا

تھا اور میں اس کی پروف ریڈنگ کر رہا تھا۔ مجھے اُن کی مکمل رہنمائی حاصل رہی۔ میں جب کتاب ”زاویہ“ کا پہلا نسخہ لے کر خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے ”یہاں ہر ماہ آج کل؟“ میں نے عرض کی ”خاں صاحب!“ ”زاویہ“ کی پروف ریڈنگ کر رہا ہوں۔“ بڑے خوشگوار موڈ میں فرمانے لگے ”بھی تم تو ہم پر تھانے دار لگ گئے ہو۔ ہمارا لکھا چیک کیا کرو گے اور تم نے غلطیاں پکڑا کرو گے۔“

یہ اُن کی محبت کا ایک خاص انداز تھا اور نہ ہم سب جانتے ہیں کہ غلطیاں دونوں سے ہوتی ہیں۔ کمپوزر سے بھی اور پروف ریڈر سے بھی۔ جہاں تک خاں صاحب کی غلطیوں کا معاملہ ہے تو میں نے اُن کے دست لکھے ہوئے بہت سارے مسودات دیکھے ہیں۔ پہلے لفظ سے لے کر آخری حرف تک مجھے کبھی ایک کٹنگ بھی نظر نہیں آئی اور میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ خاں صاحب نے بھی روف مسودہ تحریر نہیں کیا اس لیے بعد میں اُسے نیک کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ بات ہو رہی تھی ”زاویہ“ کے پہلے پروف کی۔ ہر بڑی تخلیق کے پیچھے اس کی ایڈیٹنگ کا بڑا عمل ہوتا ہے۔ ”ویسٹ لینڈ“ جیسی بڑی نظم بھی ایڈیٹنگ کے بعد ہی منظر عام پر آتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر بڑا ادیب اپنی ایڈیٹنگ بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ ”زاویہ“ کی پروف ریڈنگ کا اعزاز مجھے حاصل رہا لیکن اس کی ایڈیٹنگ خاں صاحب نے نہیں کی تھی۔ یہ ایک بڑا کام تھا اور اسے نیک بڑا آدمی ہی کر سکتا تھا۔

خاں صاحب کی ایڈیٹنگ کرنے کے بعد کتاب میں شامل ہر عنوان ایک مکمل قصے کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ قصے جو لطف تو افسانے کا دیتے ہیں لیکن Reality و Base پر کرتے ہیں۔ ”زاویہ“ میں تصوف کے مسائل پر بھی بحث میں بحث نہیں کی گئی بلکہ یہ زندگی کی اُن چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کے منظر نامے ہیں جن کو عام آدمی بڑی آسانی سے نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ محسوس بھی نہیں کرتا۔

بڑے فنکار کا یہ کہاں ہوا کرتا ہے کہ وہ چھوٹی اور معمولی باتوں کو ہمیشہ بڑے تناظر میں پیش کرتا ہے اور اس قصے سلیقے سے بیان کرتا ہے کہ اُسے پڑھنے کے بعد وہ حقیقت جو بڑی معمولی اور غیر اہم سی لگتی ہے آپ کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر کبھی آپ اُس حقیقت سے نظریں چرانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تب بھی اُسے احساس کرنے سے پرے دھکیلنا آپ کے لیے مشکل ضرور ہو جائے گا۔

ایک دفعہ جب خاں صاحب کی طرف جانا ہوا تو رکشے والے سے بڑی بحث ہوئی۔ 121۔ سی پہنچ کر جس سے نے کرایہ ادا کیا تو اُس کے پاس چینج نہیں تھا۔ میں نے اُس سے پانچ روپے بقایا لینے تھے۔ بڑی دیر تکرار ہوتی رہی۔ اُسے پاس کوئی دکان بھی نہیں تھی جہاں سے چینج مل سکتا۔ آخر میں اُسے صابری کی دکان پر لے گیا اور یوں بقایا پانچ روپے لے کر میں نے اُس کی جان چھوڑی۔

جب واپس خاں صاحب کے پاس حاضر ہوا تو انہیں سارا ماجرا بیان کیا۔ سُن کر فرمانے لگے:

”یار! تم نے اُس سے بقایا کا تقاضا ضرور کرنا تھا۔ وہ پانچ روپے بھی اُسے دے دیتے“ پھر فرمایا ”مگر تم نے بقایا نہ لیا کرو۔ تم نے کون سا اپنے پلے سے دینا ہوتا ہے۔ دتے میں سے ہی تو دینا ہے۔“

میں خاں صاحب کی اس بات پر ابھی تک عمل پیرا نہیں ہوسکا۔ ایک روپیہ چھوڑ دینا بھی میرے لیے بڑا دشوار سمجھتا ہے لیکن میرے دل کی یہ تمنا ضرور ہے کہ مجھ پر جلد از جلد ایسا وقت آئے کہ اس پر عمل کرنا میرے لیے آسان سمجھتا ہے۔

جب کبھی میں اپنے گھر پر اکیلا ہوتا یا اپنے دوست احباب کے ساتھ! ہم سب ”زاویہ“ دیکھتے اور سنتے تو ایک عجیب و غریب سحر میں مبتلا ہو جایا کرتے۔ ہمیں لگتا جیسے ہم سب ماضی کے قصہ گوئی کے دور میں واپس چلے گئے ہیں۔ ہم سب اپنی اس واپسی پر بڑا آئندہ محسوس کرتے تھے اور ہمیں یوں لگتا جیسے یہ داستانی طرز گفتگو ہماری جنمزمین پہلے سے کہیں موجود ہے اور خاں صاحب نے اُسے پھر سے دریافت کر لیا ہے۔ انہوں نے بڑے منفرد انداز میں ہمارے ماضی کا ورثہ ہمیں لوٹا دیا ہے۔

آج کل لینڈ مافیا کے ہاتھوں تاریخی عمارتوں کا ورثہ تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ پرانی اور تاریخی جگہوں پر پلازے اور ٹیک مال تعمیر ہو رہے ہیں۔ تاریخی ورثے کی اہمیت کو اجاگر کرنے والا کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ایسے میں خاں صاحب نے کم از کم داستان گوئی کے ورثے کو اس انداز سے اپنی تحریروں میں محفوظ کر لیا ہے کہ اب کوئی مافیا بھی اس پر قبضہ نہیں کر سکے گا۔

بہت سارے لوگ ملازمت یا دوسری مصروفیات کے باعث ”زاویہ“ میں شرکت کرنے کے لیے ٹی وی شیڈنٹس نہیں جاتے تھے شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے خاں صاحب نے اپنے گھر پر بھی ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ یہ نشست عموماً جمعرات کے روز ہوا کرتی۔ مجھے بھی وہاں حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ ہر طبقہ فکر کے لوگ وہاں آیا کرتے تھے۔ بزنس کلاس اساتذہ، خواتین، خاص کر نوجوان طبقے کی تعداد زیادہ ہوتی۔ عصر کے وقت ہم وہاں پہنچا کرتے، مغرب کے وقت نماز کا وقفہ ہوتا۔ خاں صاحب نماز کے لیے گھر کے اندر تشریف لے جاتے۔ جب وہ واپس محفل میں آتے تو سوالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ان محفلوں میں مجھے ایک بات کی بڑی کمی محسوس ہوا کرتی اور میں اکثر سوچا کرتا کہ د. اصف علی و اصف صاحب کتنے خوش نصیب تھے جن کو اشفاق صاحب جیسے سننے والے میسر رہے، لیکن خود اشفاق صاحب کی محفل میں مجھے ایسا کوئی نعمانی نہیں دیتا تھا جو ان کے Calibre کے مطابق ان سے سوال پوچھتا۔ ہم جیسے پوچھنے والوں نے اپنی ذات سے بلند ہو کر کبھی ان سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

ایک بار کسی نشست میں کوئی خاتون خاں صاحب کو بتا رہی تھی کہ اُس کا شوہر نماز کے بعد دعا نہیں مانگتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے تو یہ ظاہر ہوگا کہ میں نماز اپنے مطلب کے لیے اللہ سے مانگنے کے لیے پڑھتا ہوں۔

خاں صاحب فرمانے لگے ”بھئی آپ اُسے بتاؤ لیکن سختی سے نہیں نہایت نرمی سے بتاؤ کہ جب عام زندگی میں ضرورت پڑنے پر آدمی اپنے بھائی سے مدد مانگتا ہے یا کسی عزیز رشتے دار سے مانگتا ہے تو پھر اللہ پاک سے مانگنے میں کیسی گورنمنٹ کی۔ وہ تو خود فرماتا ہے کہ مجھ سے مانگو اور وہی سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔“

گورنمنٹ کالج کے ایک سٹوڈنٹ نے پوچھا ”سر! میں کالج میں شلوار قمیض پہن کر جاتا ہوں تو لڑکے اور لٹیچر

میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں شلوار قمیض پہننے والا جاہل ہوتا ہے۔“

اشفاق صاحب نے اُس طالب علم سے فرمایا ”یار! تم اپنے موقف پر تو ضرور کاربند رہو لیکن دوسروں کو سختی سے جواب مت دو۔ تم انہیں بڑے دھیرج اور نرمی کے ساتھ بتاؤ کہ سراسر! میں تو پینٹ شرٹ پہننا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں! گھر میں بوزھے والدین موجود ہیں جنہوں نے بڑی محنت اور محبت سے میری پرورش کی ذمہ داری نبھائی ہے۔ اب مجھے اُن کی خاطر اُن کی خواہش کے احترام کے پیش نظر مجبوراً شلوار قمیض پہننا پڑتی ہے۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں میں انہیں گھر سے نہیں نکال سکتا ہوں؟“

خال صاحب کی انہی محفلوں کی بات ہے کہ ایک روز دونو جوان آئے۔

ڈرائنگ روم کا باہر والا دروازہ کھلتے ہی سامنے جو نہیں لیپ نظر آتا ہے اُس کے ساتھ والے صوفے پر خال صاحب تشریف رکھتے تھے۔ جب وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو خال صاحب نے انہیں اپنے پاس بیٹھنے کو جگہ دی اور اپنے گفتگو کو جاری رکھا۔ وہ مختلف طرز کے موضوعات پر ایک خاص ربط باہمی کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ اُن کی باتوں سے یوں لگتا کہ اُن مختلف موضوعات کا آپس میں کوئی بہت گہرا تعلق موجود ہوتا ہے جسے کوئی قادر الکلام ہی دریافت کر سکتا ہے۔ سننے والے تو ندرت کلام کے حصار میں ہوتے تھے۔

استے میں مغرب کی نماز کا وقفہ ہو گیا اور اُس کے بعد سواات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب اُن دونوں کی باری آئی تو اُن میں سے ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”سرا! یہ میرا دوست ہے۔ بڑا چھا ہے بچارو۔ اس کے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ یہ بڑے عرصے سے مجھے کبھی نہ ملے لیکن اس کی بات کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ اس لیے آج میں خاص طور پر اسے اپنے ساتھ آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ سرا! میرے اس دوست کو مرشد کی تلاش ہے۔ یہ کسی کا مرید ہونا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ اس کی مدد فرمائیں کہ اس کو کیا کرنا چاہئے؟“

اکثر لوگ خال صاحب سے بابوں کا پتہ پوچھنے آیا کرتے تھے لیکن اُن کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ بابے کا پتہ نہیں پوچھ رہے بلکہ پانی کا گلاس مانگ رہے ہوں یا چائے کا کپ یا پھر کچھ اس طرح ”خال صاحب! فلاں کتاب کب تک شاپ سے ملے گی۔ ذرا ہمیں اُس کا پتہ تو بتائیں پلیز۔“

کسی بک شاپ کے ایڈریس میں اور کسی بابے کے پتے میں یقیناً بڑا فرق ہوتا ہے اور لوگ اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ دراصل خال صاحب کسی ایسے بابے کا پتہ جانتے ہی نہیں تھے جس نے اپنی کوئی دکان سجا رکھی ہو۔ اُن کا تعلق فقیریوں سے تھا جن کے ڈیروں پر مخلوق خدا کو سیدھے راستے پر چلنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اُن دونو جوانوں کا معاملہ البتہ مختلف تھا۔ انہوں نے تو اپنا مقصد ہی سامنے رکھ دیا تھا کہ وہ صرف پتہ ہی نہیں پوچھ رہے تھے بلکہ مرید ہونے کے بھی آرزو مند تھے۔ اس معاملے میں شہاب صاحب کا موقف قدرے سخت تھا۔ اسے کہتے تھے ”یہ زمانہ بیعت ہونے کا نہیں ہے۔“

اس بارے میں پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تبع تابعین کے ہاں مرشدین نہیں تھے۔



بھری حبیب عجمی اور بایزید بسطامی کا کوئی مرشد نہیں تھا۔ جنید بغدادی نے براہ راست کچھ درس حضرت سری سقطی سے لیے تو پہلی مرتبہ ہمیں پیر و مرشد کا ایک تعلق نظر آیا۔ تو مرشد کا ہونا لازم نہیں ہے مگر جہاں علم میں کمی ہو اور معاملات نفس پیچیدہ ہوں اور شدت جو اس غالب وہاں اُستادوں کی ضرورت اعتدال کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

وہ نوجوان اپنے آنے کا مقصد بیان کر چکے تھے۔ اب جواب کے منتظر تھے۔ اُن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باقی سب لوگوں کی تجسس بھری نگاہیں بھی خاں صاحب پر یوں مرکوز تھیں جیسے وہ کوئی بازیگر ہوں اور ابھی وہ کسی جانب ہتیارہ کریں گے تو مرشد نامی کردار سب کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔

تب خاں صاحب نے اپنے بائیں جانب بیٹھے نوجوان سے فرمایا ”بھئی! آپ آج کل کے پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ آپ تو اُستاد کا بھی ٹسٹ لینا شروع کر دیتے ہو۔ مرشد بھی ایک طرح کا اُستاد ہی ہوتا ہے جبکہ ٹسٹ لینا تو اُستاد کا کام ہوتا ہے۔ آپ اگر کسی مرشد کے پاس جاؤ گے بھی تو اُس پر تجربات کرنے لگو گے جیسے میڈیکل کے سٹوڈنٹ لیبارٹری میں فرگوش اور مینڈک وغیرہ پر تجربات کرتے ہیں۔“

خاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا ”میرے خیال میں آپ لوگ پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کرو۔ اپنی سمت درست رکھو۔ دوسروں کی نہیں بلکہ اپنے آپ کو کیونکہ جب ہم دوسروں کو ٹھیک کرنے چل پڑتے ہیں تو پھر اپنا آپ بہت پیچھے رو جاتا ہے۔ جب تمہارے عمل کی درستگی ایک خاص حد تک پہنچ جائے گی تب ایک روز عیناً آئے گا کہ مرشد خود چل کر تمہارے گھر آ جائے گا اور تمہارے دروازے کی کڑی کھڑکا کر کہے گا کہ میں آ گیا ہوں..... بیعت کرنے کے لیے۔“

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب نے ڈرائنگ روم میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ جمعرات کی محفلوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اب بھی لوگ اُن سے ملنے آتے تو اُن کو کبھی مایوس نہ لوٹنا پڑتا۔ انہیں سیدھا خاں صاحب کے بیڈروم میں لے جایا جاتا تھا جہاں وہ اپنی بیماری کے باوجود لوگوں کو اُمید بانٹتے اور حوصلہ دیتے رہتے۔

دراصل 121-سی میں لوگوں کو ایک ایسا کندھ دستیاب تھا جس پر سر رکھ کر وہ اپنے اپنے ڈکھوں پر رویا کرتے تھے اور وہاں وہ سب اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے آیا کرتے تھے۔ مگر پھر دوسروں کے آنسو سمیٹنے والا کندھا بہت بیمار ہو گیا۔ تب اُس نے اپنے بیڈروم کو ہی ڈرائنگ روم بنا لیا تھا۔

ایک روز جب میں اُس ڈرائنگ روم میں گیا تو خاں صاحب صوفے پر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے پاس ہی بٹھالیا اور پھر میرے اُس افسانے کی تعریف کرنے لگے جو میں نے اُن دنوں لکھا تھا لیکن میں حیران تھا کہ ایک نئے لکھنے والے کا افسانہ انہوں نے شدید نقابت کے باوجود پڑھا تھا اور پھر اُس کی حوصلہ افزائی بھی ضروری سمجھی۔ میرے لیے اُن کی شفقت کا یہ ایک انوکھا انداز تھا۔ پتہ نہیں اور کتنوں کے ساتھ وہ اسی طرح پیش آتے تھے یا پھر سب کے سب میری طرح ہی اُن کی محبت کو فقط اپنے لیے ہی مخصوص سمجھتے ہوں گے۔

پھر بات میرے افسانے سے نور والوں کے ذکر کی طرف چل پڑی تھی۔ میں نے عرض کی ”خاں صاحب! باباجی نور والے فرماتے ہیں ”نوٹ! دین صراط مستقیم ہے جو لوگ سیدھا

سوچتے ہیں وہ دین پر ہیں اور جو لوگ دائرے میں سوچتے ہیں وہ دین سے خارج ہیں۔“ خاں صاحب! مجھے یوں گتے سے جیسے میری سوچ دائرے میں ہی گھومتی رہتی ہے۔ سوچ کی سمت کو سیدھ میں رکھنا مجھے آتا ہی نہیں ہے۔“

خاں صاحب نے مجھ سے پوچھا ”تم جس طرف رہتے ہو وہاں سے تمہیں نہر کتنی قریب پڑتی ہے؟“ میں نے انہیں بتایا ”وحدت روڈ سے ہوتا ہوا میں فیروز پور روڈ پر آتا ہوں اور ایف سی کالج کے پل سے سر کر اس کر کے ماڈل ٹاؤن کی طرف ہولیتا ہوں۔ پل پر ٹریفک کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ نہر کو دیکھنے اور اُس کے پانی کی روانی یا تلاطم کو محسوس کرنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ مجھے اس ہجوم میں سے گزرتے ہوئے اشارہ بند ہونے سے پہلے پل کو چھو کرنے کی جلدی ہوتی ہے۔“

میرے راستے میں نہر تو ہے لیکن میں اس کے ساتھ کوئی خاص گہرا اور مضبوط تعلق استوار نہیں کر سکا۔ اس پر سے روز گزرتا ہوں پر اس سے میرا بندھن بس ایسے ہی لمحاتی اور کمزور سا ہے جو میرے احساس پر کوئی دستک نہیں دیتا اور وہاں سے بھی نہایت معمولی اور غیر محسوس آہوں پر جھلا کون سا درد ازاہ کھلتا ہے۔“

خاں صاحب میرا جواب سن کر خاموش ہو گئے جیسے وہ شاعر جس کے کلام میں نہر ایک علامت ہو اور جسے وہ اُس علامت نگاری کو سمجھتا نہ ہو۔ تو شاعر پر خاموشی کا طاری ہونا لازمی امر ہوتا ہے۔ کچھ توقف کے بعد خاں صاحب نے اس خاموشی کو یوں توڑا۔ اُن کے سامنے ٹی وی ٹرانل کے ساتھ والے میز پر لال رنگ کی مکچر سے بھرا ایک چھوٹا سا گلاس پرانے بالکل اسی رنگ کی مکچر ہمارے شہر کا ڈاکٹر منان بھی اپنے مریضوں کو دیا کرتا تھا۔ خاں صاحب نے مجھے وہ گلاس اُٹھانے کہا۔ میں نے وہ مکچر انہیں پیش کیا تو انہوں نے اُس لال رنگ کے پانی کے دو گھونٹ بھرے اور گلاس مجھے واپس دیکھتے ہوئے میرے سوال کو ڈھراتے ہوئے فرمایا ”کبھی تم اپنے ارد گرد دیکھو تو تمہیں بے شمار ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کی سوج سیدھی نہیں ہوتی لیکن انہیں ساری زندگی اس کا احساس نہیں ہوتا۔ تم اللہ کا شکر کیا کرو کہ تمہیں کم از کم احساس تو ہے۔ تم سارے دن میں کسی ایک بات پر اپنی سوچ کو سیدھا رکھنے کی کوشش کیا کرو۔ پھر دیکھو تمہارے ہر کام میں کیسے برکت ہوتی ہے۔“ پھر فرمانے لگے ”یا ز! میں اب کچھ دیر لیٹنا چاہتا ہوں“ وہ اپنے مخصوص بید پر لیٹ گئے اور میں کمرے سے باہر آ گیا۔

پھر وہ لطیف میموریل شفٹ ہو گئے۔ ایک روز جب میں شام کے وقت لطیف میموریل گیا تو وہاں بانو آ پا کے علاوہ اُن کے پاس اور کوئی نہیں تھا۔ ہسپتال سے باہر ٹریفک رواں دواں تھی۔ گھروں کو لوٹتے ہوئے سوار آہستہ رو بوڑھے ’زگ‘ زیگ موٹر سائیکل چلاتے اور اشارہ توڑنے کی کوشش کرتے لڑکے بھری ہوئی بسوں کے ساتھ لٹکے ہوئے مسافر۔ ان میں سے کسی کو خبر نہ تھی کہ اسی فیروز پور روڈ کے کنارے لطیف میموریل میں ایک ایسی نابغہ روزگار ہستی موجود ہے جس نے اردو ادب کو برسوں اعتبار بخشا ہے۔ آنے والے زمانے میں اس سے زیادہ صاحب علم تو آتے رہیں گے لیکن اس جیسی انشا پر دازی اب کون کرے گا۔ اُس جیسی نثر لکھنا کسی کے لیے کتنا بات ہی نہیں ہے۔

اُس روز خاں صاحب ہسپتال کے بید پر بیٹھے کسی خاتون کا ذکر کر رہے تھے کہ اُس کے جسم کے مختلف حصوں میں

بہت ساری پتھریاں تھیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اُن پتھریوں کی موجودگی سے اُس خاتون کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ بات وہ اس طرح سنا رہے تھے جیسے ہماری توجہ خود پر سے ہٹانا چاہتے ہوں یا پھر ہمیں حوصلہ دینا چاہتے ہوں۔ یہ میری خاں صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ اُن کے جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ کس طرح بڑے لوگ اچانک بھرا میلہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ تو میلے سے تھے ہی نہیں بلکہ میلہ اُن کے دم قدم سے آباد تھا۔ اُن کے جانے کے کچھ عرصے بعد بانو آپا نے مجھے چند کتابیں دیں اور کہا ان کو محمد خاں ٹرسٹ کو بھجوادو۔ یہ کتابیں اُن بہت سی کتابوں کا حصہ تھیں جو خاں صاحب کی موجودگی میں ہی ٹرسٹ کو بھجوائی جاتی تھیں۔ اُن باقی رہ جانے والی کتابوں کو پہچانتے ہوئے میں نے بانو آپا سے کہا کہ یہ تو وہی کتابیں ہیں جو خاں صاحب نے ذاتی مطالبے کے لیے منتخب کی تھیں۔

آپا جی کہنے لگیں ”بیٹا! جب ان کو پڑھنے والا ہی چلا گیا تو اب ان کو رکھ کر کیا کریں گے۔ تم انہیں بھی بھجوا دو۔“ اور ان کے ساتھ خاں صاحب کی تمام لائبریری جس میں اردو اور انگریزی کی ہزاروں نادر و نایاب کتب کا ایک قیمتی خزانہ تھا جو مختلف اداروں کو ڈونیٹ کر دیا گیا یہاں تک کہ ان کتب کی انماریاں بھی دے دی گئیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ منتخب لوگ جانے کے بعد بھی کس طرح دوسروں کو فیض یاب کرتے رہتے ہیں۔



اُن دنوں.....

(راجہ گدھ.... ایک تاثر)

مسعود میاں

اُن دنوں بہت سارے کرداروں سے میرا رابطہ رہا کرتا تھا۔ نائیلہ شامیلہ، جمیلہ اور پروین۔ ان سب نے بری طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ان سے تعلق کسی گہرے جذباتی سمندر کی بھری ہوئی موجوں جیسا نہیں تھا بلکہ لٹق و دق صحرا کی صورت تھا جس کے طوفانی جھکڑوں میں میں پھنس کر رہ گیا تھا اور مجھے ان سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اُن دنوں میرے پاس ویسا ہوا کرتا تھا۔ جب میں شہر میں نکلتا تو اُن میں سے کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتی۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ جاننے والوں کی نظروں سے چھپنا بہت مشکل تھا اس لیے میں اکثر و بیشتر ان کے ساتھ دن اور رات کا زیادہ وقت بند کمرے میں بسر کرتا۔ کبھی کبھار بند کمرے کی وحشت سے اکتا کر میں اُن کے ساتھ سٹیج پارک میں چلا جاتا۔ وہ چھوٹا سا پارک تھا جس کی بہت سی زمین اب بھی گھاس کے بغیر نگلی پڑی ہے اور کسی مردہ سچ کی طرح گرد اڑاتی رہتی ہے۔ جب میں پارک کی بے کار صحنوں اور ویران دوپہروں سے گھبرا کر شہر کی سڑکوں پر نکلتا تو جھلسا دینے والے گرم لو کے تھپڑوں سے بچنے کے لیے کسی زلف کا سا بان کام نہ آتا۔

نائیلہ شامیلہ میں سے کسی کو میرے ساتھ دیکھ کر لوگ معنی خیز انداز میں مسکراتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید میں کوئی رئیس زادہ ہوں۔ میرے باپ دادا کی بہت بڑی جاگیر ہے جس کا میں وارث ہوں اس لیے مجھے نہ تو ڈگریاں حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی نوکری کی فکر ہے۔

جبکہ میں ایک طرف تو ان کرداروں کا عادی ہو چکا تھا۔ میرا کوئی دن بھی ان کے بغیر نہ گزرتا اور دوسری طرف میں ان سب سے بہت بور ہو چکا تھا۔ یہ سب ایک جیسی تھیں۔ صرف نام مختلف تھے ورنہ ان سب کے نقش و نگار چال و چلن ان کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا کھانا پینا ان کا لباس سب ایک جیسے تھے۔ حتیٰ کہ یہ سب کی سب سوچتی بھی ایک ہی طرف تھیں۔ ان سے میری بوریت اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ میں نے یہ تک سوچنا شروع کر دیا کہ میں کوئی ایسا سنگین جرم کروں اور مجھے جیل ہو جائے اور جب مجھے وہاں جکل بیٹنی پڑے تو شاید اس طرح میں اس یکساںیت سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا۔

ان دنوں میں جس لائبریری میں جایا کرتا تھا اس کا نام تھا ”جاوید لائبریری“۔ یہ اردو روڈ پر واقع تھی۔ پہلی نظر میں تو یہیں لگتا کہ شاید لائبریری کا نام بھی ”جاوید نامہ“ سے متاثر ہو کر ہی رکھا گیا ہوگا لیکن جب میں نے وہاں موجود کتب کے ذخیرے پر نظر ڈالی تو وہاں غلام صاحب پرکھی گئی کتابوں کا کوئی گوشہ نہ تھا۔

اس زمانے میں کیبل کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ پی ٹی وی کی نشریات بھی رات گئے ناظرین کا ساتھ چھین جاتیں۔ اس لیے لوگ لائبریری کا رخ ضرور کیا کرتے تھے۔ اکثر لوگ وہاں آ کر کسی کتاب کو ہاتھ تک نہ لگاتے شاید اس ڈر اور خوف کی وجہ سے کہ کسی کتاب کی کوئی سطر ان کو غور و فکر میں مبتلا نہ کر دے۔ اس لیے وہ زیادہ تر وہاں سے یہ سٹی ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے لے جاتے تھے۔ وہ ان رسائل کو اپنے سر ہانے کے ساتھ رکھ لیتے اور جب رات کے وقت اس سہل پسندوں کو بڑی دیر تک کروٹیں بدلتے پر بھی نیند نہ آتی تب وہ رسالہ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے۔ پڑھتے وقت کھسکیوں یوں لگتا جیسے کسی نے ان کو کوری منہ ناشروع کر دی ہو۔ تھوڑی دیر بعد سامنے موجود عمارت ان کی نظروں میں ڈھنڈلائی لگتی اور وہ رسالہ سائیڈ پر رکھ سو جاتے۔

اس لائبریری میں خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا اور ان کے نام عموماً نائیلہ شامیلہ پروین وغیرہ نائپ کے ہوا کرتے۔ اس زمانے میں خواتین بڑی تندی اور جاں فشانی سے لکھ رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ہر ماہ کوئی نیا ناول لائبریری میں موجود ہوتا۔ میں یہ سارے ناول پڑھ چکا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں روز ہی چکر ضرور لگا تا کہ شاید کوئی نئی کتاب آئی ہو۔

لائبریری سے باہر آنے کے لیے جب میں دروازے کی طرف بڑھتا تو دروازے کے ساتھ والی بک شیلف پر اور کتابوں کے ساتھ ایک کتاب پڑی ہوتی تھی۔ میں دروازے سے باہر نکلنے وقت اسے روز دیکھتا۔ تھوڑی دیر کو اس کے قریب رکتا اسے اٹھاتا اس کو کھول کر سرسری طور پر دیکھتا اور پھر بند کر کے اسے اسی کی جگہ پر واپس رکھ دیتا۔ اس پرکھتے تھے ”راجہ گدھ“ اور نیچے لکھنے والی کا نام ”بانو قدسیہ“۔

میں نے آج تک کسی خاتون رائٹر کے ناول کا ایسا نام پڑھا ہی نہیں تھا۔ یہ میرے لیے ایک نئی اور انوکھی بات

تھی اور میں اس انوکھی بات کو جاننے کے لیے ابھی تیار نہیں تھا۔

ایک زمانے میں عصمت چغتائی سے پہلے عورتیں مردوں کے قلمی ناموں سے لکھا کرتی تھیں۔ جس زور کا میں ذکر کر رہا ہوں شاید کچھ کمرشل لکھنے والوں نے خواتین کے نام سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔

بہت دن تک جب کوئی نئی کتاب نظر نہیں آئی تو ایک روز لاہریری سے نکلتے ہوئے اُس بک شیلف کے پاس ڈک کر جس پر ”راجہ گدھ“ پڑا ہوتا تھا، میں نے فیصلہ کیا کہ اگر یہ کتاب اتنی Interesting ہوئی کہ پڑھنے والے کو مجبور کر دے اور پڑھنے والا اسے مکمل پڑھے بغیر رو نہ سکے تو میں اسے پڑھوں گا ورنہ اُسے واپس کر دوں گا بغیر پڑھے..... اور مجھ سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا کہ یہ کتاب آپ نے کیوں نہیں پڑھی۔ حتیٰ کہ مصنف بھی نہیں کیونکہ لکھنے والے کا تو یہ مسئلہ ہی نہیں ہوتا کہ کون اس کی کتاب کو پڑھتا ہے اور کون نہیں اور یہ اس کتاب کے نام سے بھی صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مصنف کو پڑھنے والوں کی اتنی فکر ہوتی تو پھر کتاب کا نام بھی..... نائیلہ، شائیلہ، باپھر“ بے وفائی کا زخم“ وغیرہ ہوتا۔

جب میں ”راجہ گدھ“ لے کر لاہریری سے باہر نکلا تو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے آس پاس موجود بے شمار قباحتیں جو مجھے دُھندلی دُھندلی دکھائی دیتی ہیں اُسے پڑھ کر اور زیادہ واضح نظر آنے لگیں گی اور لاہریری میں بسر ہونے والے شب و روز میں جو ایک بہل پسندی ہوتی ہے وہ عقرب ختم ہو جانے والی ہے۔

جب میں نے ”راجہ گدھ“ پڑھنا شروع کیا تو اُن دنوں موسم سرما اپنے عروج پر تھا۔ ہم جس خطے میں رہتے ہیں یہاں موسموں میں بڑی شدت پائی جاتی ہے اور یہی شدت پسندی جب ہمارے مزاجوں میں بھی در آتی ہے تو شاید وہیں سے دیوانگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جب کتاب کے اندر کا موسم اور اُس سے باہر کا موسم ایک جیسا ہو جائے تو پڑھنے والا لازمی طور پر خود کو کتاب کے اور زیادہ قریب محسوس کرتا ہے۔

رات کے وقت لحاف اوڑھے جب میں ”راجہ گدھ“ پڑھ رہا ہوتا تو گھر کی دوسری منزل کے کمرے میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوتا..... رات سردی اور لحاف جب نعیم اور عابدہ کی ملاقاتوں سے میل کھاتے تو مجھے لگتا کہ عابدہ میرے بستری پائنتی کی طرف بیٹھی ہے اور اُس نے لحاف کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنے سامنے موٹنگ پھلیوں سے بھرالفافہ رکھ لیتی اور جس رفتار سے وہ ہاتھیں کر رہی ہوتی اتنی ہی تیزی سے موٹنگ پھلی کھا رہی ہوتی۔ فرش موٹنگ پھلی کے چمکوں سے اور کمرہ اُس کی باتوں سے بھرتا جا رہا ہوتا۔

اُس کی باتوں کا مرکز زیادہ تر اُس کا شوہر ہی ہوتا۔ وہ اُس کی توجہ نہ ملنے اور وقت نہ دینے کا گلہ کرتی رہتی۔ اُس نے اپنے شوہر کو جس خطاب سے نوازا رکھا تھا وہ تھا ”ماں کا یار۔“ اُس کی باتیں سن کر میں سوچتا جو مرد اپنی عورتوں کو توجہ دینے میں نا انصافی کرتے ہوں گے وہ ساری عورتیں بھی اپنے مردوں کو شاید اسی قسم کے خطاب سے نوازتی ہوں گی۔

جب میں کتاب سے باہر نکل کر دیکھتا تو عابدہ جا چکی ہوتی اور میں پائنتی کی طرف سرک جانے والے لحاف کو جلدی سے اپنے اوپر کھینچ لیتا۔

ہمارے آس پاس موجود عابدہ جیسی بے شمار عورتیں ایک حوالے سے تو بہت خوش نصیب ہوتی ہیں کہ انہیں اپنے شوہروں کی گلہ گزاری کے لیے کوئی نہ کوئی مرد میسر آ جاتا ہے جبکہ مرد بے چارے اس لحاظ سے بڑے بد قسمت ہوتے ہیں

کہ وہ اپنے گھر کی بیٹھک سے لے کر دفنوں تک اور ہوٹلوں سے لے کر بازاروں تک اپنے ہی جیسے مردوں کے سامنے اپنی عورتوں کا رونا رورہے ہوتے ہیں۔

”راجہ گدھ“ کے تین مرکزی کردار

سیسی، نعیم اور آفتاب

نعیم وہ عام سا کردار ہے جسے تخلیق کار کے قلم نے زیرو سے ہیرو بنا دیا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کے تقریباً نوجوان میں اگر نعیم کی سو فیصد خصوصیات نہیں تو تنائوے فیصد ضرور پائی جاتی ہیں۔

سیسی: اُردو ادب کے چند شاہکار کرداروں میں سے ایک ہے۔ جب میں نے ”راجہ گدھ“ میں سیسی کی داستان پڑھی تو میں حیران رہ گیا اور مجھ پر ناخالصی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی کیونکہ یہ ایک آئینہ کردار ہے اور ایسے لوگ ہمیں عام طور پر اپنے آس پاس کہیں دکھائی نہیں دیتے بلکہ دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے۔ کیفیت سے فرار حاصل کرنے کا ایک راستہ تو یہ تھا کہ میں اس ناول پر شک کا اظہار کرتا اور اسے پالتا۔ مثلاً یہ دیکھ بانو قدسیہ نے لکھا ہی نہیں۔ اُسے کسی اور نے لکھا ہوگا اور انہوں نے اسے اپنے نام سے چھپوایا ہوگا لیکن پھر میں نے دیکھا کہ اس شک کو پالنے سے بھی مجھے لاجائلی کی کیفیت سے نجات نہیں ملی اور میں نامعلوم کی سولی پر بدستور لٹکا رہا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں ملتان میں بوسن روڈ کے قریب گلگشت کالونی میں رہا کرتا تھا۔ یہ 1992ء کی بات ہے۔ ایک دفعہ میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تو میں نے ہومیو پیتھک سنور سے دوائی لی مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں نے کئی کوئی خاص توجہ نہ دی اور سوچا کہ معمولی سا درد ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن جب رات کے دو بجے کا وقت تھا تو معمولی سا درد اتنا بڑھ گیا کہ میں دن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اُس وقت کوئی رکشہ نیکسی نہ ملا اور مجھے سا بنگل میں بٹھا کر ایک قریبی ڈاکٹر کے گھر پر لے جایا گیا، جس کا کلینک گھر کے اندر ہی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ یہ پیٹ کا درد نہیں بلکہ گردے کا درد ہے اور پانی کی کمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اُس نے مجھے ڈرپ لگائی اور کچھ انجکشن بھی دیے۔ تب مجھے جا کر کچھ سکون ملا۔

اسی طرح جب ”راجہ گدھ“ پڑھنے کے بعد مجھ پر لاجائلی طاری ہو گئی تو میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ یہ نامعلوم سی کسک مجھے راتوں کو تڑپانے لگے اُس کا کچھ علاج ہونا چاہئے۔ تب میں اپنے ایک دیرینہ دوست راؤ ساجد کے پاس گیا۔ اُس جیسے لوگوں سے مل کر لگتا ہے کہ اس سے پہلے کی زندگی ہم نے بے وقوفوں کی سنگت میں بیٹھ کر ریگڑا کر گزاری ہے۔

جب میں نے راؤ ساجد کے سامنے ”راجہ گدھ“ کے بارے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگے: ”تمہارے تمام شکوک بے بنیاد اور غلط ہیں۔ بانو قدسیہ فی الواقع اُردو ادب کی ایک بہت بڑی رائٹر ہیں اور ”راجہ گدھ“ ان کی فن تخلیق کی معراج ہے۔“

راؤ ساجد کیونکہ بہت سمجھدار ہے اور میں اُس کی فہم و فراست کا بہت قائل ہوں اس لیے میرے پاس اُس کی بات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پھر جب میں نے اُس سے کہا ”یار! جب سے میں نے یہ ناول پڑھا ہے تب سے ایک بے نام اُداسی ہر طرف چھائی رہتی ہے۔ یہی کے ملنے سے پہلے تک جتنے لوگ بھی مجھے ملے وہ سب عورت کی بے وفائی کے ڈسے ہوئے تھے۔ شاید ہی لیے میں عورت کو ایک بے وفا مخلوق سمجھنے لگا تھا۔ لیکن یار! یہ یہی تو بالکل ہی مختلف قسم کی لڑکی ہے۔ میں نے اس سے پہلے کسی لڑکی کو مرد کی محبت میں اس طرح دیوانہ ہوتے دیکھا نہ سنا۔ کیا مجھ پر چھایا حزن و ملال اس وجہ سے تو نہیں ہے؟ کیا یہ کسی آئیڈیل کو تلاش نہ کر سکنے کا لا حاصل احساس تو نہیں؟“

راؤ ساجد کہنے لگا..... ”تمہاری سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ تم نے نائیلہ اور شائیلہ جیسی کہانیاں پڑھتے پڑھتے لپٹاٹک ”راجہ گدھ“ جیسی بڑی کتاب کو پڑھ لیا۔ تمہیں چاہئے تھا کہ اس طرف آنے سے پہلے ممتاز مفتی جی کی ”علی پور کا ایلی“ پڑھ لیتے۔ پھر تم میں کم از کم اتنا حوصلہ پیدا ہو جاتا کہ تم اتنی بڑی کتاب کو سہا سکتے۔“

میں نے اُس سے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”یار! میں سمجھتا ہوں کہ کسی کتاب کو پڑھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اُسے ناقدانہ نظر سے پڑھیں۔ اس طرح دو ہر افائدہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح اُس کتاب کی خوبیاں اور خامیاں دونوں آپ کے سامنے آ جاتی ہیں لیکن میں اسے اس طرح نہیں پڑھ سکا۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ ”راجہ گدھ“ کے کردار آپس میں اس طرح ملتے اور پھنڑتے ہیں جیسے یہ سب کچھ اُن کی تقدیر میں لکھا ہوا تھا اور ان مختلف کرداروں کو آپس میں ملانے اور جدا کرنے میں مصنف کی اپنی کوئی خاص کوشش کو دخل نہیں تھا۔

اس ناول کی مخصوص فضا نے مجھے ایک خاص طرح کے تحیر میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے کہ جب میں پوٹھو ہار کے علاقے میں موجود ریت کے نیلوں کا منظر پڑھتا ہوں تو مجھے اپنے آس پاس موجود تارکول کی کچی سڑکوں پر بھی ریت ہی ریت اڑتی نظر آتی ہے اور میرے ارد گرد پایا جانے والا سبزہ اور ہریالی ایسی خشک جھاڑیوں میں بدل جاتی ہیں جو برسوں سے بارش کی منتظر ہوں۔“

راؤ ساجد بڑے تھل سے میری باتیں سن رہا تھا۔ یہ اُس کی بڑی خوبی تھی کہ وہ بہت اچھا سننے والا تھا۔ ورنہ اکثر کرم فرما تو سنانے والے ہی ملتے ہیں سننے والا تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔

میں نے اُس سے کہا..... ”یار! ”راجہ گدھ“ میں یہی کسے پاس جو رومال ہے نا! جسے چھپانے کے لیے اُسے کوئی جگہ نہیں ملتی، مجھے لگتا ہے وہ رومال میرے گلے کا پھندا بن گیا ہے اور اب میں زمین پر ہوں نہ آسمان پر۔ بس ہر وقت اس کے ساتھ خلا میں لٹکتا رہتا ہوں۔ پتہ نہیں اب اس پھندے سے میری نجات کب ممکن ہوگی۔“

وہ کہنے لگا..... ”پھندے سے نکلنا تو کوئی مشکل کام نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کسی نہ کسی پھندے میں بڑی خشک سے آتا ہے آدمی۔ تمہارا سفر تو شروع ہی اب ہوا ہے۔ بس پڑھتے رہنا۔ نکلنے کا تو نہیں کہہ سکتا کسی نہ کسی طرح پار ضرور لگ جاؤ گے۔“

”یار! دُعا کرو کہ یہ پھندا میرے لیے ایسا سبق نہ بن جائے کہ جسے یاد کرنے کے بعد چھٹی نہیں ملتی۔“

اسی طرح جب 1995ء میں ممتاز مفتی صاحب سے خط و کتابت شروع ہوئی تو اُنہوں نے بھی کچھ ایسے ہی شہورے سے نوازا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے..... ”پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھتے رہنا“ پھر آسانی ہو جائے گی۔“

دراصل ابھی مجھے پتہ نہیں تھا کہ سبکی کا رومال جسے میں اپنے لیے پھندا سمجھتا ہوں، ایک دن یہی رومال ہے۔ نجات کا باعث بننے والا ہے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے جب میں نے اشفاق صاحب کا ایک مضمون پڑھا جو انہوں نے ”سائیں مرنا“ پر لکھا تھا۔ یہ مضمون اُن کی کتاب ”عرضِ مصنف“ میں شامل ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر مجھے لگا کہ وہ وہ میرے گلے میں سے اُتر گیا ہے اور اب اُس نے ایک رشتی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بظاہر تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ میں نے اس رشتی کو پکڑا ہوا ہے لیکن سچی اور اصلی بات یہ ہے کہ اُس رشتی نے مجھے پکڑ رکھا ہے۔ جب میں اس رشتی کا خیال کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

بعد میں اسی رشتی کے ذریعے میں ”من چلے کا سودا“ سے گزرتے ہوئے ”زادیہ“ تک پہنچا۔

اُردو ادب میں ”راجہ گدھ“ بالکل مختلف اور منفرد ناول ہے ورنہ انتظار صاحب اور بیٹی صاحبہ کے ناول تو صاحبانِ ہجرت کے مرثیے تک محدود ہیں۔ ”راجہ گدھ“ کے موضوعاتی طور پر منفرد ہونے کی وجہ سے اُس کی کراچی سے لے کر تہہ تک دُھوم مچی ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں 1997ء میں کراچی گیا۔ وہاں تقریباً سب صاحبان نے ”راجہ گدھ“ پڑھ رکھا تھا۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ سب اس سے بے حد متاثر تھے۔ یہ نظریاتی اختلاف صرف بابوں کی وجہ سے ہو سکتا تھا۔ اگرچہ ان سب لوگوں کو بابوں کی باتیں سوچنے اور سمجھنے پر مجبور ضرور کرتی تھیں اور لوگ بابوں کی دانش بھری باتیں مانتے بھی تھے۔ بس ذرا اُن سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ بابوں کی باتوں سے اتفاق کرتے جاتے تو شاید اُن کی جدیدیت خطرے میں پڑھ جاتی۔ اس جدیدیت کی خاطر وہ مانی جانے والی بات کو بھی رد کر دیتے تھے۔

آج کل تو کراچی بھٹی کے بحران میں مبتلا ہے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں یہ پیدار شہر گھسے کی زد میں تھا اور بوری بند لاشیں ہر طرف بکھری پڑی ہوتی تھیں۔

اُن دنوں میں شارعِ فیصل پر واقع ڈرگ روڈ سٹیشن پر اُترتا اور طحا اکیڈمی میری منزل ہوا کرتی جہاں ایک کمپوزنگ سیکھنے جایا کرتا تھا۔ اکیڈمی کے ہیڈ سے اس لیے جلد دوستی ہو گئی کہ انہوں نے ”راجہ گدھ“ پڑھ رکھا تھا۔ ایک میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ چائے والا لڑکا آیا اور چائے رکھ کے چلا گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگے: ”یار! یہ لڑکا ایک دن چائے دینے آیا تو کہنے لگا سراسر! یہ جو آپ کے رسپشن پر لڑکی بیٹھی ہوئی ہے نا یہ ساری رات مجھے سونے نہیں دیتی۔ سراسر! میری تو ساری رات اس کے تصور میں ہی گزر جاتی ہے۔ بھئی اس لڑکے کی بات سے مجھے یاد آیا کہ اکثر خیند تو مجھے بھی ساری رات ”آتی“

میں نے پوچھا ”وہ کیوں سر؟“

کہنے لگے ”جب سے ”راجہ گدھ“ پڑھا ہے خاص طور پر اس میں اسلام کا جو تصویر یعنی حرام حلال کا نظریہ جسے طریقے سے بیان کیا گیا وہ بہت متاثر کن ہے۔ یارا اگر میں ”راجہ گدھ“ کے نظریے پر عمل کروں گا تو لوگ مجھے پتھر پھینکے گے اور اگر عمل نہیں کرتا تو میرا ضمیر مجھ پر سنگ باری کرتا رہتا ہے۔“

بہت بعد میں میں نے پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کی کتاب میں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے



طرح یاد کرو کو لوگ تمہیں دیوانہ سمجھیں۔

بس سٹاپ پراٹر کرا کیڈمی کو جاتے ہوئے راستے میں پہلے ڈرگ سٹیشن کی بہت سی ریلوے لائنوں کو پار کرنا پڑتا تھا۔ ان لائنوں پر مال گاڑی کے بہت سے ڈبے کھڑے رہا کرتے تھے۔ رات کے وقت جب بھی میرا ان لائنوں پر سے گزر ہوتا تو رات کے اندھیرے میں کسی پٹری پر کھڑے ڈبے کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ ضرور یاد آتا۔ دراصل وہ قصہ اس علاقے میں کسی روایت کی طرح سینہ بہ سینہ چلتا ہوا مجھ تک پہنچا تھا۔

ایک روز رات کے پچھلے پہر جب چوراہہ نمازی اپنی اپنی راہ میتے ہیں۔

پتہ نہیں وہ ریلوے پولیس کا سپاہی تھا، کوئی رات کی ڈیوٹی کا گاڑ تھا یا کوئی عام پولیس والا تھا۔ اُس نے ایک تھنی ٹین کا ڈبہ لے کر اُسے رستی سے باندھا اور مال گاڑی کی ایک بوگی کی طرف چل پڑا۔ اُس کا اندازہ تھا وہ بوگی تیل یا آئل سے بھری ہوئی ہے اور وہ ہا سانی اس میں سے ایک کنستریٹر بھر لے گا۔ بوگی کے پچھلے حصے کی طرف موجود تیل کے اخراج کا راستہ باوجود کوشش کے اُس سے کھل نہ سکا ہوگا۔ پھر وہ بوگی کے اوپر چڑھا ہوگا اور جہاں سے بوگی میں تیل ڈالا جاتا ہے وہاں لگے ہوئے چوڑے ڈھکن کو کھولنے میں وہ کامیاب ہو گیا ہوگا۔

جب اُس نے کنستریٹر بوگی میں ڈالا تو تیل کی سطح اُس کے اندازے سے کافی نیچے تھی۔ لہذا کنستریٹر کو تیل تک پہنچانے کے لیے اُسے خود بھی بوگی کے اندر چمکانا پڑا ہوگا۔ نجانے رات کا اندھیرا تھا نیند کا شمار تھا یا تیل کی پھسلن، بیچارہ سپاہی رات کی ڈیوٹی کرنے والا گاڑ دیا جو کوئی بھی وہ تھا اپنے کنستریٹر کے ساتھ خود بھی..... بوگی کے اندر پھسل گیا۔ یہ اس کی دوسری غلطی تھی۔

اس نے کنستریٹر کو پکڑنے کے لیے تو اس کے ساتھ رستی باندھ رکھی تھی لیکن خود کو کسی رستی سے باندھنا بھول گیا تھا، جس کے سہارے وہ بوگی سے باہر نکل سکتا۔ کئی دن بعد یا جب بھی کسی نے کھلے ڈھکن کا جائزہ لیا ہوگا تب جا کر اس بے پیرے کی لاش باہر نکالی جاسکی ہوگی۔ ہمارے ہاں کروڑوں اور اربوں کے گھپلے ہوتے رہتے ہیں اور کوئی نہیں پکڑا جاتا اور یہ پکڑ ہونے پر آتی ہے تو پھر ایک تیل کے کنستریٹر پر ایسی پکڑ ہو جاتی ہے۔ تیل کے بجائے لاش ہی واپس گھر جاتی ہے۔

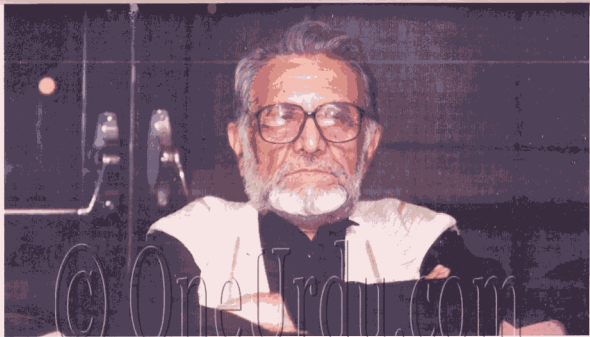
بات صرف اتنی ہے کہ کبھی کبھی کسی روز جب ہم گھر سے نکلتے ہیں تو اُس دن ہم اپنے بہت سارے رُکے ہوئے ضروری کام کامیابی سے نپٹا لیتے ہیں اور شام کو گھر واپسی پر ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ آج کا دن تو ہمارا دن تھا۔ بالکل اسی طرح جو پکڑے نہیں جاتے ان کے لیے وقت کی رستی دراز ہوتی ہے اور پکڑے جانے والے جس دن گرفت میں آ جاتے ہیں وہ دن اُن کا دن نہیں ہوتا۔

میں جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ دنیا میرے لیے ایک بہت بڑی ساری بوگی ہے اور میں اپنے لیے اور اپنے بچوں کی ضروریات کے لیے ایک کنستریٹر بھرنے کے لیے اس میں اتر ا ہوا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں نے کنستریٹر کو پکڑنے کے لیے جو رستی باندھ رکھی ہے، وہ بڑی کمزور اور پھسلنے والی ہے اس لیے باوجود کوشش کے کبھی پورا کنستریٹر بھرا ہی نہیں ہے۔ کبھی آدھا اور اکثر تو آدھے سے بھی کم پر گزارا کرنا پڑتا ہے، لیکن جس ڈور نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے وہ بڑی مضبوط ہے۔

میں اس وقت جہاں کھڑا ہوں یہ دنیاوی ضرورتوں سے بھری ایک بوگی ہے اور ان چھوٹی موٹی ضرورتوں۔ میرے چاروں طرف اندھیرا کر رکھا ہے، لیکن جب میں خود سے بندھی اُس مضبوط ڈور کے آخری سرے کی طرف نکلتا ہوں تو وہاں مجھے روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ایک دن میں اس ڈور کے سہارے خود کو اپنے ضرورتوں سے بھری بوگی کے اندھیروں سے نکالنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ یہ مضبوط ڈور ”راجہ گدھ“ سے تیار ہو کر مفتی جی کی ”لبیک“ سے ہوتی ہوئی اشفاق احمد صاحب کے ”زاویہ“ تک جاتی ہے اور اب خاں صاحب کے یہ سلسلہ موقوف نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ اب پروفیسر احمد رفیق اختر کی کتابیں اپنی روشنی سے اس سلسلے کو جاری کر رہی ہیں۔

آخر میں مجھے اُن سب ہستیوں کا شکر یہ ادا کرنا ہے جنہوں نے ایسی بصیرت افروز کتب تخلیق کیں۔ اس ساتھ ساتھ میں سنگ میل پبلشرز کے افضال احمد صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اُن لائق تحسین کتب کو پبلشرز کا موقع فراہم کیا اور سب سے بڑھ کر میں اللہ کا احسان مند ہوں کہ جس نے مجھے اُن کتب کو سمجھنے کا شعور عطا فرمایا۔





اشفاق احمد (2002ء)



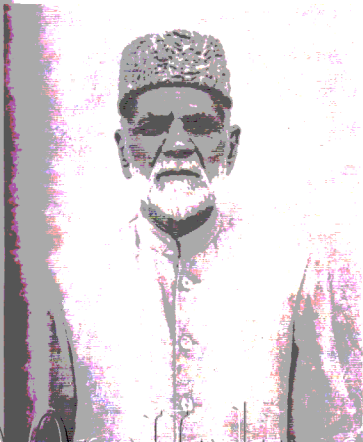
© OneUrdu.com

اشفاق احمد (بچپن)



اشفاق احمد

© OneUrdu.com



بیباچی محمد خاں (ڈوگری ڈاکٹر) — والدہ شقائق احمد



اماں جی سردار بیگم — والدہ جناب اشفاق احمد





ماسی رشیدہ (اماں جی کی چھوٹی بہن) ممتاز (ماسی رشیدہ کی بہو)  
 آنزلا (گود میں) ماسی جی کی پوتی



121 سی خاں صاحب کے دوست ماسی رشیدہ کے بیٹے نعیم احمد خاں، ممتاز (عظیم نعیم ماسی رشیدہ کی بہو)





گورنمنٹ کالج فار ویمن ماڈل ٹاؤن۔ ممتاز زہیم (پرنسپل)، خاں صاحب



جدو (جنگلی کا گھر) عمرہ کا سفر۔ جنگلی کی سب سے چھوٹی بیٹی (سمعیہ)، پانوا آغا، منجھلی بیٹی (حنا)، جنگلی (نعیم احمد خان)، شہاب صاحب، خاں صاحب، جنگلی کی بیگم (شیوہ)



عمرہ کے دوران جدو کا مقام نعیم احمد خاں، جنگلی کا گھر، جنگلی کی بیوی (شیوہ)، جنگلی کی بڑی بیٹی (ڈاکٹر ہما جہانگیر)



اماں جی، آفتاب (بھائی سب سے بڑے بیٹے) خالد آفتاب، اشتیاق احمد اور خالد آفتاب



ڈاکٹر ایوب احمد خاں (آپا فرخندہ کے شوہر) ڈاکٹر سجاد مبارک سرچن کے والد



© Onafredu.com  
آپا فرخندہ (پہلوئھی کی بیٹی)



ڈاکٹر ایوب اور آپافر خندہ کا بیٹا ڈاکٹر جواد ساجد (ہارٹ سرجن)۔ 36۔ جی۔



آپافر خندہ



آپ فرحت کی بیٹی سنی



آپ فرحت کے بیٹے جاوید طارق خاں



آپ فرحت کے بیٹے جاوید طارق کی پہلی بیوی جاوید کی بیوی صدیقہ



جاوید طارق کی پہلی بیوی (صدیقہ)



جاوید طارق کی بڑی بیٹی ثولیدہ (خاں صاحب کی بہو، بیٹے انیس کی بیگم)



اقبال بھائی سے چھوٹے بھائی اسحق خان

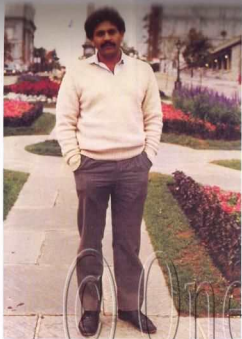




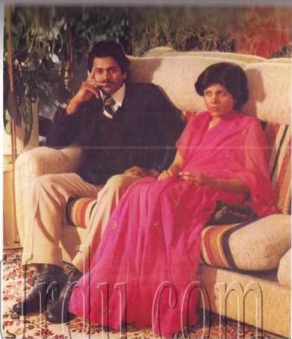
ججو بھائی کی بیگم ذکیہ



کیٹیڈا (الحق بھائی کا گھر) لوزرنو۔ بانوآ پاؤ ذکیہ جی، اعلیٰ بھائی اعجاز صاحب



اسحاق بھائی کے بیٹے واصف خاں



اسحاق بھائی (بچو کے بچے)، واصف — سہیلی سارا



آخلق بھائی کی بیٹی سارا خان



ریزی ہر معظّم، اشتیاق بہ خان صاحب، لالو (بیچھے) — 75 جی کینٹنل پارک



اشتياق، اماں، جی



اشتياق احمد خان

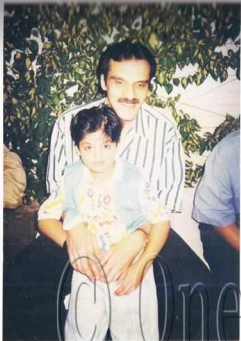
ORIENTAL CO.



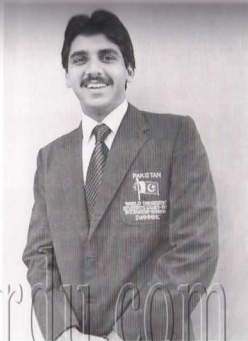
تقو کے بڑے بیٹے صائیکل (سائیکل) احمد خاں



121 سی، نہانے کے بعد تقو



تقوے کے سب سے چھوٹے بیٹے واصف احمد خاں



تقوے کے بیٹے نبیل احمد خاں

OneUrn.com



نانا، ریزی، کاسی (2 ٹمپل روڈ)



اشفاق احمد، تو مرچی (روم) — 156 این سمن آباد



جمیلہ ظفر (ٹوٹو، بانو) — لیڈی مگکین کالج



بانو کے بھائی ریزی ناموں

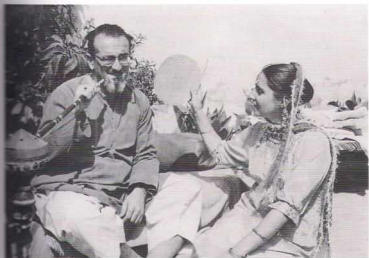




بانو قدسیہ، معظم، ریزی، خاں صاحب — 75 جی کینال پارک



د. اشفاق احمد، مفتی جی — 75 جی ماڈرن ٹاؤن



السا باؤ سانی — 75 جی ماڈل ٹاؤن



غلام محی الدین اعجاز الساندرو باؤ سانی — 75 جی ماڈل ٹاؤن



اے حمید انشا جی، منیر نیازی، اشفاق احمد — 156 این مین آباد



اے حمید خاں صاحب — 156 این مین آباد



آپا فرحت کی بیٹی، بیٹی ندیم۔ ایشیر احمد کی ساس



آپا فرحت کی سوہری بیٹی بیبا اور ایشیر خان



افتخار احمد خاں (کھاتو ۽ پیڑی)



افتخار بھائی کے بیٹے لویکا گوٹوا کمرطابق قلمی افتخار (غالب صاحب کی تصویر اور راجا جی کی مشہور تصویر یکٹھنے ہوئے)



ڈیڈی جی کی بہنوورداء، پوتنا ارسلان، پوتنا ملخان، پوتنی سویرا



ڈیڈی جی کے بڑے بیٹے (ڈاٹر طارق بن افتخار ککو) سویرا، بانو بیٹی، اشفاق بیچا، وردا (اقبال بھائی کی بیٹی) سہیل



افتخار بھائی کی بیٹی عائشہ



افتخار بھائی کے بیٹے جنید بن افتخار

© Original ©



افتخار بھائی کے بیٹے عدنان

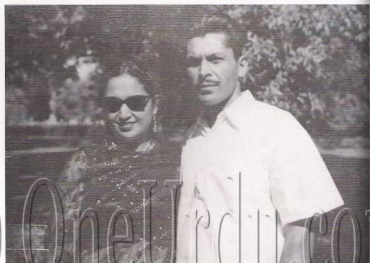


طارق سے رنگوں کے گھر (Cruz) کا پر لطف منظر۔ بانو آپا، شفاق احمد





میڈسن (امریکہ) نوکی بیٹے کے گھر مہمان



اہقبال بھائی (سیگم) ہامی ضیاء



خاں صاحب کے بڑے بھائی آفتاب بھائی (انجی جی)، اقبال بھائی، اسحاق بھائی



اقبال بھائی کی بیٹی صولت



اقبال بھائی کے بیٹے رومیو بیگم عرفات



اقبال بھائی کے بیٹے فاروق



متو، رخشندہ (ماما اکرام کی بیٹی)



اقبال سبحانی کے بیٹے رومیو، عرفات — اشیر بیٹے



آحق احمد خان



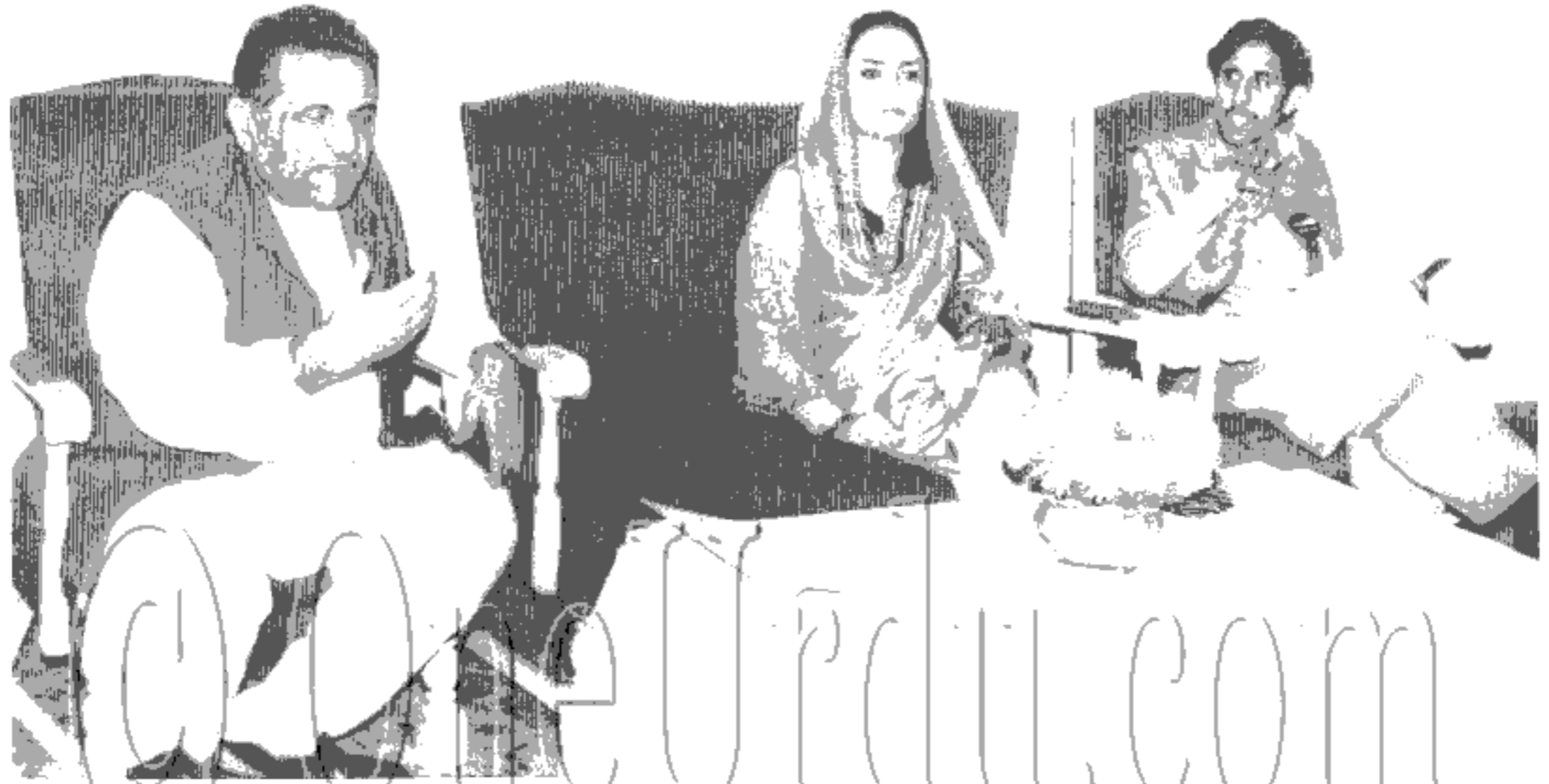
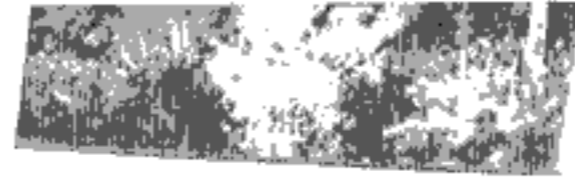
امریٹیل روٹنگائی - صدرارت فیض صاحبہ - 75 جی ماڈل ٹاؤن



اردو سائنس بورڈ



اردو بورڈ خان صاحب، اسلام کولسٹری

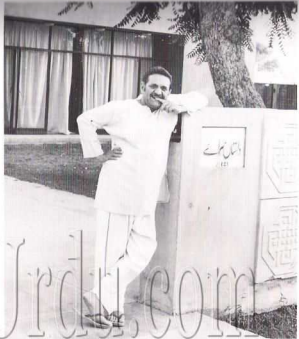


www.official.com

کوئٹہ — ثابقہ رحیم الدین اشفاق احمد



بانو آقا، 121 سی



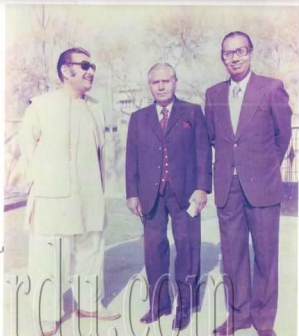
داتا گنج بخش، 121 سی

© OneUrdu.com





(کھڑے) مورلاک، خاں صاحب (بیٹھے) بانو آبا خواجہ جی - 121 سی - ماڈل ٹاؤن



انشاجی شہاب صاحب، اشفاق صاحب - 121 سی



121 سی (باہر کی لان) انشاجی، شہاب صاحب، بانو، خاں صاحب



پرانہا لکھنوی پورٹ بانو آ پام خاں صاحب



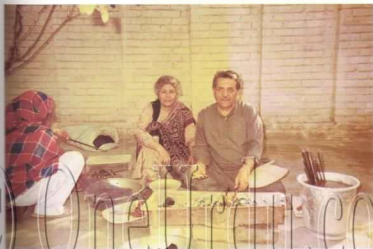
121 سی۔ بلال احمد خان، داوی (دادا کا کمرہ)



121 سی، خاں صاحب کباب پارٹی



121 سی، کباب پارتی، خاں صاحب، بانوآپا



121 سی، اشفاق احمد صاحب (کتابیہ) بانوآپا (مددگار) جیونی بھین (مددگار)



ولپ کمار خاں صاحب



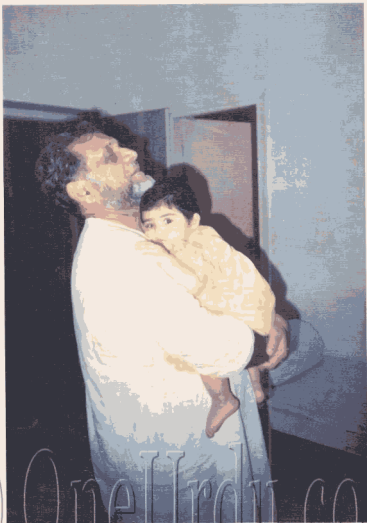
اشفاق احمد و رزہ خان عابدہ پروین اور بانو قدسیہ - 121 اسٹی - ماڈل ٹاؤن



بانو جمیلہ ہاشمی — 121 سی۔ ماڈل ٹاؤن



ناہیدہ کی بیٹی



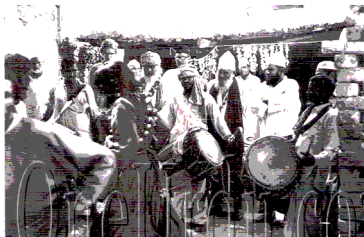


2002ء ارسالاء، انیق احمد



میڈسن - انیق کی بیٹی ارسالاء انیق







## اشفاق احمد

بابا صاحب، زاویہ 1، زاویہ 2، زاویہ 3، گذریا، ایک محبت سو افسانے، وداع جنگ، ایک ہی بولی، صحنے فسانے، تو تباہی، بندگی، طلسم ہوش افزا، اور ڈرامے، ننگے پاؤں، مہمانسرایے، من چلے کا سودا، سفر سفر، آجے مروج لاہور دے، ناہلی تھلے، حسرت تعمیر، جنگ جنگ، سفر مینا، ایک محبت سو ڈرامے، حیرت کدو، شاہلا کوٹ، کھیل تماش، گلدان، کھنیا وٹیا، دھینکا شستی، شورا شوری، ڈھنڈورا، عرض مصنف، شہر آرزو



## بانو قدسیہ

راجگدھ، شہر بے مثال، توجہ کی طالب، چہار چمن، سدھراں، آسے پاسے، دوسرا قدم، آدھی بات، دست بستہ، حوا کے نام، سورج کبھی، پیانا نام کاویا، آتش زیر پاہ، امر تیل، بازگشت، مردا برشم، سامان وجود، ایک دن، پُر و، موم کی گلیاں، لگن اپنی اپنی، تما شیل، ڈسٹ پاتھ کی گھاس، دوسرا دروازہ، ناقابل ذکر، کچھ اور نہیں، حاصل گھاٹ، پچرا چانک یوان ہوا، چھوٹا شہر بڑے لوگ، راہرواں، ہجر توں کے درمیان

Rs. 1200.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 978-9953-2-1115-6  
ISBN 978-9953-2-1115-7



www.sang-e-meel.net